انگارے

اقبال کاظمی

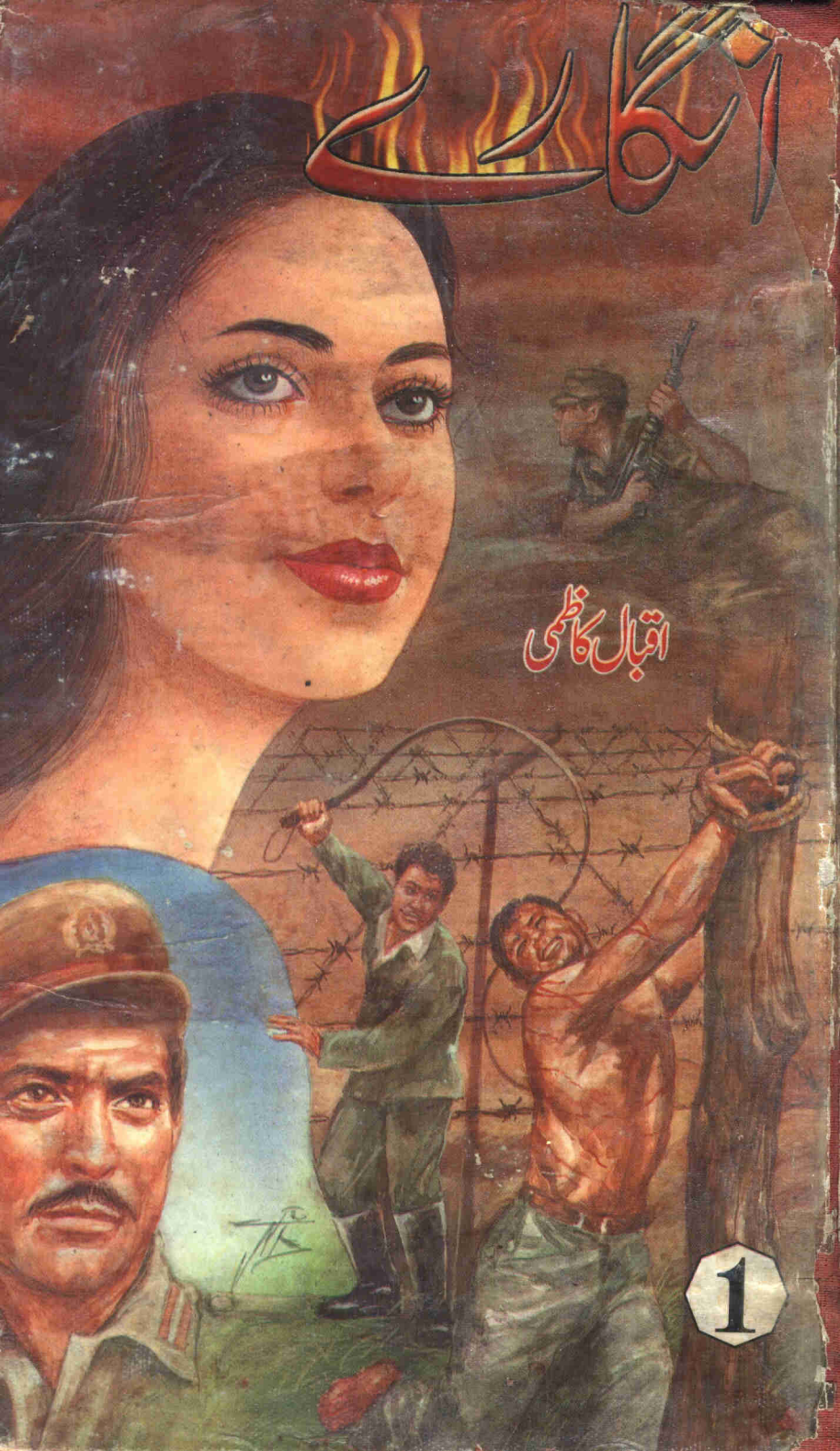

1

دُعائے مغفرت

اقبال کاظمی (مرحوم) جو اس وقت ہمارے درمیان نہیں ہیں، قلم کے دھنی تھے۔ جس موضوع پر قلم اُٹھایا اُسے تشنہ نہیں چھوڑا۔ رومان، سسپنس، جرائم، معاشرتی و سماجی جبر و استبداد، کون سا موضع ایسا تھا جسے اُنہوں نے نہ چھیڑا ہو اور پھر کون سا پہلو ان موضوعات کا ایسا تھا، جسے اُنہوں نے چھوڑا نہ ہو۔ لکھنا اُن کی زندگی تھا۔

لکھتے رہے جنون کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

وہ لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے..... پھر بہت ہی خوب لکھتے تھے۔

دن کو لکھتے تھے، رات کو لکھتے تھے، لکھتے لکھتے بیمار پڑ جاتے، پھر بیماری میں بھی لکھتے..... میں اُن سے کہتا۔ ''بیماری میں تو آپ آرام کر لیں، صحت یاب ہو کر لکھئے گا۔'' فرماتے۔ ''لکھنا تو زندگی ہے، لکھوں نہیں تو زندگی کا سامان کہاں سے فراہم کروں گا۔'' زندگی کے محاذ پر وہ اپنے گھر سے اکیلے مجاہد تھے۔ اصل میں اُن کی قلم کاری افلاس کے دیو سے ایک مسلسل جنگ تھی..... دل کے مریض تھے، لیکن دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔

دل تو اسی محبوبہ قلم کے عشوہ و ناز و ادا کا اسیر تھا۔

ڈاکٹر انہیں مکمل علاج کے لئے ہسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیتے۔

اقبال کاظمی کہتے۔ ''میں تو قلم کے زندان میں محبوس ہوں۔''

کراچی سے شائع ہونے والے ڈائجسٹوں میں اُن کی طویل سلسلہ وار کہانیاں چھپتی تھیں جو اُن سے محبت کرنے والے قارئین میں بے پناہ مقبول تھیں۔

قارئین! وہ ہمارے لئے حرفِ محبت لکھتے لکھتے گئے ہیں۔

آیئے! ہم اپنے خالق و مالک سے دُعا کریں کہ وہ اُن کے لئے مغفرت لکھ دے۔ آمین!

محمد علی قریشی

انگارے

دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے ایک نوجوان کی داستانِ شجاعت، جس کے لئے ناموسِ وطن کی حفاظت نقد جاں سے بڑھ کر عزیز تھی۔

یہ ایک ایسے نوجوان کی ہنگامہ خیز زندگی کی سرگزشت ہے جو اپنے ملک کی سرحدوں کی سلامتی کو یقینی بنانے کے لئے دشمن ملک کے شاطر ہندوؤں کی سازشوں کو ناکام بناتا رہا۔

دشمنوں کو ناکوں چنے چبواتا رہا..... سازشی ذہن رکھنے والے ہندوؤں کو اُن کی غاصبانہ فطرت کی فصل کاٹنی پڑی۔

آگ جلتی رہی، خون اُبلتا رہا..... اور وہ اپنی مجاہدانہ شان سے آگے بڑھتا رہا۔ جو ہاتھ اُس کی جانب بڑھا، کٹ کے رہا۔ دشمنوں کی ہر چال خود اُنہی کے لئے شہ مات بنی.....

محترم اقبال کاظمی کے قلم کی روانی اپنے جوبن پر ہے۔ قلم کیا ہے..... ایک تلوار ہے جو ہندوؤں کی سازشوں کے تانے بانے کو کاٹتی چلی جاتی ہے۔

محبت کی داستانوں کو رقم کرنے والے ہمارے محبوب مصنف کا قلم اس کہانی میں بھی تشنہ نہیں رہا۔

(ادارہ)

طیارے نے سینٹرل ایشیا کی نو آزاد مسلم ریاست تاجکستان کے ایک چھوٹے سے سرحدی شہر مرغاب سے ٹیک آف کیا تھا۔ مرغاب کے ایک طرف چند میل کے فاصلے پر چین کی سرحد تھی اور جنوب میں پچیس ہزار فٹ بلند پامیر کا پہاڑی سلسلہ تھا جو پاکستان کی سرحد میں داخل ہو کر عظیم قراقرم کے سلسلہ کوہ سے جا ملتا تھا۔

مرغاب چاروں طرف سے برف پوش بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا، یہاں کوئی ہوائی اڈہ نہیں تھا اس لئے جہاز نے شہر سے کئی میل دُور ایک پتھریلے میدان سے ٹیک آف کیا تھا۔ آدھی رات کے وقت گھمبیر تاریکی میں کسی ایسی جگہ سے جہاز اُڑانے کی کوشش کرنا ہی خودکشی کے مترادف تھا مگر جہاز کے پائلٹ کی مہارت کی داد دینی پڑتی ہے جس نے نہ صرف کامیابی سے ٹیک آف کیا تھا بلکہ دونوں طرف بلند پہاڑوں کے درمیان بڑی کامیابی اور مہارت سے اسے اُڑا بھی رہا تھا۔

مرغاب سے ٹیک آف کرنے والے اس جہاز کی منزل ہندوستان کے زیرِ تسلط کشمیر کا سونا مارگ نامی وہ قصبہ تھا جو سطح سمندر سے تقریباً سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع وولر جھیل کے مشرق میں تقریباً سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ دوسری طرف سرینگر سے اس قصبے کا فاصلہ صرف باون میل تھا۔

ڈکوٹا سے ملتے جلتے طاقتور جیٹ انجن والے جہاز میں صرف دو مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور یہ دونوں سیٹیں کاک پٹ میں پائلٹ کی سیٹ کے عین عقب میں تھیں۔ جبکہ جہاز کا پچھلا حصہ کارگو کے لئے مخصوص تھا اور اس وقت اس جہاز کے کارگو میں اسلحہ اور گولہ بارود کی پیٹیاں بھری ہوئی تھیں۔

جہاز کے ان دو مسافروں میں ایک میں تھا، شمروز اور دوسرا میرا ساتھی ترمیز۔ ہم دونوں کا تعلق اسی جنت نظیر خطے سے تھا جو پچھلے پچاس برسوں سے بھارتی سامراج کے ظلم کی چکی میں پس رہا تھا۔ جہاز کا پائلٹ مسٹر سلوانو اتالین تھا۔ اُس کی عمر اگرچہ تیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اُس کی مہارت کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اُسے خطرناک روٹس پر جہاز اُڑانے کا خاصا تجربہ تھا۔

طیارہ تقریباً تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا ہوا پامیر کا سلسلہ کوہ پار کر کے پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہو گیا۔ بائیں طرف قراقرم کا برف پوش سلسلہ تھا۔ رات کی تاریکی کے

باوجود سفید برف کسی اُجلی چادر کی طرح چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ پامیر کی برف پوش چوٹیاں پار کرتے ہی طیارہ بتدریج اپنی بلندی کم کرنے لگا۔

پاکستانی فضائی حدود میں داخل ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے طیارے کو غالباً کسی پاکستانی ریڈار پر دیکھ لیا گیا تھا۔ سگنل بھی موصول ہونے لگے۔ طیارے کی شناخت طلب کی جا رہی تھی لیکن مسٹر سلوانو نے کوئی جواب دینے کی بجائے وائرلیس سسٹم ہی آف کر دیا۔

پرواز سے پہلے ہمیں بریفنگ دی گئی تھی اور یہ بتا دیا گیا تھا کہ ہم کسی راڈار کی زد میں تو آ سکتے ہیں لیکن ہمیں کسی قسم کے ہوائی یا زمینی حملے کا خطرہ نہیں ہوگا۔ سیاچن کی طرف اگرچہ اینٹی ایئر کرافٹ گنیں نصب تھیں لیکن اُنہیں استعمال کرنے کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ اور پھر سیاچن سے ہم سینکڑوں میل دُور تھے۔

مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوجی دستوں سے مجاہدین کی جنگ اگرچہ برسوں سے جاری تھی مگر وہ زمینی اور چھاپہ مار جنگ تھی۔ بھارت نے مجاہدین کے خلاف ابھی تک فضائیہ استعمال نہیں کی تھی۔ مجاہدین کی طرف سے تو کسی فضائی کارروائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور پھر پاکستان کو بھی اس طرف سے کسی فضائی دراندازی کا خطرہ نہیں تھا۔ اس طرف تاجکستان اور چین جیسے دوست ممالک کی سرحدیں ملتی تھیں اس لئے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ کوئی جنگی جہاز اس طرف سے پاکستانی فضائی حدود میں داخل ہو سکتا ہے۔ البتہ اس طرف آنے والا کوئی جہاز راڈار کی آنکھ سے نہیں بچ سکتا تھا اور ہمارے جہاز کو راڈار پر دیکھ لیا گیا تھا مگر پائلٹ نے ریڈیو کا رابطہ ہی ختم کر دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ ہم تھوڑی دیر میں پاکستان کی فضائی حدود سے نکل کر بھارت کے زیرِ تسلط کشمیر کی فضائی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔

ہمارا جہاز چھبیس ہزار چھ سو فٹ بلند نانگا پربت کی برف پوش چوٹیوں کے پہلو میں پرواز کرتا ہوا بتدریج اپنی بلندی کم کر رہا تھا۔ اور پھر دفعتاً جہاز کو زوردار جھٹکے لگنے لگے۔ ہمارا جہاز ایئر پاکٹ میں آ گیا تھا۔

جہاز خزاں رسیدہ پتے کی طرح فضا میں لڑکھڑا رہا تھا۔ ہوا کا زبردست دباؤ اُسے کبھی ایک طرف دھکیل دیتا اور کبھی دوسری طرف۔

سلوانو اُسے سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن جہاز اُس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ ہمارے دونوں طرف برف پوش چٹانیں تھیں اور خطرہ تھا کہ جہاز کسی بھی وقت کسی چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے گا۔

سلوانو چیخ چیخ کر ہمیں مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ اُس کا ایک حکم یہ بھی تھا کہ ہم جہاز سے کودنے کے لئے تیار رہیں۔ پیراشوٹ ہمارے کندھوں پر بندھے ہوئے تھے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ جہاز سے چھلانگ لگانے کے بعد بھی ہم زندہ نہیں بچ سکیں گے۔ یا تو کسی چٹان سے ٹکرا کر ہمارے ٹکڑے ہو جائیں گے یا برف میں دفن ہو جائیں گے۔

مجھے کئی سال پہلے اس علاقے پر پرواز کرنے والے پی آئی اے کے ایک مسافر بردار جہاز کو پیش آنے والا حادثہ یاد آ گیا۔ وہ جہاز انہی برف پوش پہاڑوں میں گر کر ایسا لاپتہ ہوا تھا کہ آج تک اُس کا کچھ پتہ چلا تھا اور نہ ہی اُس کے مسافروں کا کوئی سراغ ملا تھا۔

میں نے ترمیز کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے بھی دل ہی دل میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے موت کا خوف نہیں تھا۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا تھا لیکن یہ سوچ کر افسوس ضرور ہو رہا تھا کہ اگر طیارے کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تو نہ صرف ہماری قربانی رائیگاں جائے گی بلکہ وہ مقصد بھی پورا نہیں ہوگا جس کے لئے ہم نے اپنی جانیں خطرے میں ڈالی تھیں۔

میں اُٹھ کر پائلٹ کی سیٹ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے سیٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ہمارے نیچے دائیں بائیں اور سامنے برف کی سفید چادر تھی جس میں جگہ جگہ کوہان اُبھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ جہاز کبھی ایک طرف جھکتا اور کبھی دوسری طرف۔ سلوانو اب بھی اُسے سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ زوردار جھٹکے لگنے سے جہاز کے مختلف حصوں سے بڑی خوفناک سی آوازیں بھی اُبھر رہی تھیں جنہیں سن کر دل دہل رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے ہوا کے شدید دباؤ سے جہاز کسی بھی وقت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر جائے گا۔

تقریباً بیس منٹ بعد جہاز ہوا کے اس طوفان سے نکل آیا۔ قدرت کی مہربانی اور کچھ پائلٹ کی مہارت کا کمال تھا کہ جہاز کسی حادثے سے محفوظ رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ موت کے جبڑوں سے نکل آئے تھے۔ لیکن سلوانو نے یہ خوفناک انکشاف کیا کہ جہاز اپنے اصل راستے سے بھٹک کر اپنی منزل سے سینکڑوں میل دُور نکل گیا تھا اور اب اُس کا رُخ سیاچن کی طرف تھا۔

سلوانو نے فوراً ہی جہاز کو سنبھال لیا اور بتدریج اُس کا راستہ تبدیل کرتا رہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ جہاز کی پرواز ہموار ہوتی جہاز کے پچھلے حصے سے ایک خوفناک آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ ایسی ہی آواز تھی جیسے کسی درخت کی بہت بڑی شاخ ٹوٹ رہی ہو..... اس خوفناک آواز کے ساتھ ہی جہاز ایک بار پھر لڑکھڑانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ ہم ایک بار پھر کسی ایئر پاکٹ میں پھنس گئے ہیں۔ سلوانو جہاز کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

''پیچھے جا کر دیکھو..... وہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔''

میں اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑا اور پھر میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... میں سمجھتا تھا کہ ہم ہوا کے اس طوفان سے بچ نکلے ہیں مگر وہ طوفان اپنا کام کر گیا تھا..... جہاز کا پچھلا دروازہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور کسی بھی وقت گر سکتا تھا..... ٹوٹے ہوئے دروازے سے اندر آنے والے طوفانی ہوا کے جھکڑ جہاز کا توازن بگاڑ رہے تھے اور جہاز کو لگنے والے جھٹکوں کے ساتھ اسلحہ کی بھاری پیٹیاں بھی اِدھر اُدھر لڑھک رہی تھیں۔

جہاز تیزی سے ایک طرف جھک رہا تھا۔ کڑک کی وہ خوفناک آواز ایک بار پھر سنائی دی اور لٹکا ہوا دروازہ جہاز سے الگ ہو کر تاریکی میں غائب ہو گیا..... اور پھر وہ خوفناک منظر دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا..... اسلحے کی بھاری پیٹیاں جہاز کے پچھلے حصے کی طرف پھسل رہی تھیں.....

جہاز کا توازن کچھ اور بگڑ گیا۔ سارا بوجھ پچھلے حصے کی طرف آ رہا تھا جس سے پچھلا حصہ آہستہ آہستہ جھک رہا تھا اور کاک پٹ والا حصہ بتدریج اُوپر کی طرف اُٹھ رہا تھا..... میں کسی نہ کسی طرح دوڑتا ہوا کاک پٹ میں پہنچ گیا۔

''جہاز کا دروازہ ٹوٹ کر گر گیا ہے اور اسلحے کی پیٹیاں پھسلتی ہوئی پیچھے جا رہی ہیں۔'' میں نے چیخ کر پائلٹ کو بتایا۔

''اب جہاز کو بچانا ممکن نہیں۔'' سلوانو نے بھی چیخ کر کہا۔ ''چھلانگ لگا دو..... ہری اپ! ورنہ جہاز کے ساتھ ہم سب کے بھی ٹکڑے ہو جائیں گے۔''

میں نے ترمیز کی طرف دیکھا، اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر ہم دونوں تیزی سے جہاز کے پچھلے حصے کی طرف لپکے۔ اسی وقت کڑکڑاہٹ کی زوردار آواز پھر سنائی دی۔ دروازے کے قریب جہاز کا فرش اس طرح ٹوٹ رہا تھا جیسے زلزلے سے زمین پھٹ رہی ہو..... اس مرتبہ پیچھے آتے ہی میری نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ اسلحے کی کئی پیٹیاں غائب ہو چکی تھیں جبکہ دو پیٹیاں دروازے کے بالکل قریب پڑی تھیں۔

ہم جہاز کی سائیڈ میں لگے ہوئے راڈ کو پکڑے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتے رہے۔ جہاز کو ایک اور جھٹکا لگا۔ وہ دونوں پیٹیاں دروازے سے نکل کر تاریک خلا میں غائب ہو گئیں.....

میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مجھے چھلانگ لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جیسے ہی راڈ کو چھوڑا خود بخود پھسلتا ہوا دروازے سے باہر گرا اور ہوا میں قلابازیاں کھانے لگا.....

اُس وقت جہاز تقریباً دس ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ دو اڑھائی ہزار فٹ تک تو میں قلابازیاں کھاتا رہا، میں بڑی تیزی سے نیچے آ رہا تھا اور یہ سوچ کر ہی رُوح فنا ہوئی جا رہی تھی کہ اگر پیراشوٹ نہ کھلا تو کسی چٹان سے ٹکرانے کے بعد میرے جسم کے کتنے ٹکڑے ہوں گے؟ میں نے دونوں ٹانگیں سمیٹ کر گھٹنے پیٹ سے لگا لئے اور ٹانگوں کو زور سے بھٹکا دیا۔ اس طرح میں جیسے ہی سیدھا ہوا مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا اور میرے گرنے کی رفتار ایک دم کم ہو گئی۔ پیراشوٹ کھل گیا تھا۔ میں نے پیراشوٹ کی رسیوں کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس وقت میری بری حالت تھی۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جہاز بہت دُور ایک پہاڑی کے پیچھے غائب ہو گیا۔ چند سیکنڈ اُس کی آواز فضا میں گونجتی رہی پھر ایک زوردار دھماکہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی پہاڑی کی دوسری طرف سے آگ کا ایک گولہ سا اُٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں بھی دھماکے ہونے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

چند سیکنڈ بعد میں نے آنکھیں کھول دیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہر سو تاریکی تھی اور میں اس تاریک خلا میں معلق اِدھر اُدھر جھول رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکے مجھے کبھی ایک طرف دھکیل دیتے اور کبھی دوسری طرف۔ پیراشوٹ ہونے کے باوجود میری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ میں تاریکی میں کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا۔ میں نے گردن جھکا کر نیچے دیکھا تو نیچے بھی تاریکی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ برفانی علاقہ نہیں تھا۔ نیچے کہیں برف ہوتی تو اُس کی سفیدی ضرور نظر آتی۔

تیز ہوا کے تھپیڑے مجھے اِدھر اُدھر جھلا رہے تھے۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں ترمیز کا خیال اُبھر آیا۔ اُس نے میرے پیچھے ہی جہاز سے چھلانگ لگائی تھی۔ ترمیز کا خیال آتے ہی میں نے آنکھیں کھول دیں اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میرے خیال میں ترمیز کو میرے قرب و جوار ہی میں کہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن گھمبیر تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے تیز ہوا اُسے اُڑا کر مجھ سے دُور لے گئی ہو یا اُس کا پیراشوٹ ہی نہ کھلا ہو۔ اس خوفناک تصور سے میں کانپ اُٹھا اور اپنے آپ کو تسلی دینے لگا کہ ترمیز کا پیراشوٹ بھی کھل گیا ہو گیا۔ وہ بھی میری طرح فضا میں تیر رہا ہو گا۔ وہ مجھے دکھائی اس لئے نہیں دے رہا تھا کہ ہوا اُسے اُڑا کر مجھ سے دُور لے گئی ہو گی۔ اس تاریکی میں تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا وہ مجھے کیسے نظر آتا؟

میں نے پائلٹ سلوانو کے بارے میں بھی سوچا۔ وہ تجربہ کار آدمی تھا۔ جہاز کی صورتحال جان کر اُس نے ہمیں چھلانگ لگانے کا مشورہ دیا تھا، وہ خود کیسے جہاز میں رہ سکتا تھا؟ عین ممکن ہے جب ہم جہاز کے پچھلے حصے کی طرف آ رہے تھے تو اُس نے ہم سے پہلے ہی کاک پٹ والے دروازے سے چھلانگ لگا دی ہو۔

تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میں ایک دم چونک سا گیا..... دائیں طرف نیچے بہت دُور کچھ دیئے ٹمٹماتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پہلے تو میں اسے اپنا واہمہ سمجھا، لیکن نہیں..... وہ میرا وہم نہیں تھا۔ وہ کوئی بستی تھی جہاں بکھری ہوئی کچھ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ فاصلہ بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ روشنیاں بہت مدھم دکھائی دے رہی تھیں۔

میں کچھ دیر تک اُن ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کو دیکھتا رہا پھر نیچے اپنے اطراف میں دیکھنے لگا۔ میں زمین کے قریب پہنچ رہا تھا۔ تاریک چٹانوں کے ہیولے کچھ واضح ہو رہے تھے جو بڑی تیزی سے قریب آ رہے تھے یا بالفاظِ دیگر میں اُن کے قریب پہنچ رہا تھا۔

میں زندگی میں پہلی بار اس قسم کے تجربے سے دوچار ہوا تھا۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ

پیراشوٹ سے چھلانگ لگانے کے بعد زمین پر کس طرح اُترا جاتا ہے؟ ایک مرتبہ ایک انگریزی فلم میں ایک جنگی جہاز کے پائلٹ کو اُترتے دیکھا تھا۔ وہ ہوا کے رُخ پر اُترا تھا۔ اُس کا پیراشوٹ اُس سے آگے تھا، زمین پر قدم ٹکتے ہی وہ اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے اسی طرف دوڑا تھا جس طرف پیراشوٹ زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ لیکن وہ ایک تجربہ کار پائلٹ تھا اُسے اس طرح اُترنے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ اور پھر وہ ہموار میدان میں اُترا تھا جہاں اُسے سنبھلنے کا موقع مل گیا تھا۔ لیکن یہاں صورتحال مختلف تھی۔ مجھے نہ تو کوئی تجربہ تھا اور نہ ہی میں کسی ہموار میدان میں اُتر رہا تھا۔ نیچے سنگلاخ چٹانیں تھیں جن سے ٹکرا کر زندہ بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے جسم کے مسام تیزی سے پسینہ اُگلنے لگے، موت تیزی سے قریب آ رہی تھی۔

اور پھر دفعتاً وہ ہوا جس کی مجھے توقع نہیں تھی..... شاید میری دُعا قبول ہوگئی تھی۔ ہوا کا رُخ بدل گیا۔ پیراشوٹ اب چٹانوں کی بجائے دائیں طرف جا رہا تھا۔ اُس طرف ٹیلوں کی نسبتاً ہموار اور ڈھلوان پہاڑیاں تھیں۔ وہ روشنیاں بھی کسی پہاڑی کے پیچھے نگاہوں سے اوجھل ہو رہی تھیں۔

میں بڑی تیزی سے زمین کے قریب پہنچ رہا تھا۔ میں نے سر کے اُوپر پیراشوٹ کی دونوں رسیوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دونوں پیر آگے کو نکال لئے۔ لیکن ایک اور خوفناک حقیقت نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ میرا پیراشوٹ جس طرف جا رہا تھا وہاں درختوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔

درخت بڑی تیزی سے قریب آ رہے تھے۔ میں ایک درخت کی شاخوں سے ٹکراتا ہوا آگے نکل گیا اور پھر مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا..... پیراشوٹ درختوں میں اُلجھ گیا تھا اور میں ایک جھٹکے سے فضا میں معلق ہوگیا۔

کئی سیکنڈ بعد میرے حواس بحال ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے آپ کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ صورتحال زیادہ سنگین نہیں تھی۔ پیراشوٹ درخت کی اُوپر والی شاخوں میں اُلجھا ہوا تھا جبکہ میں نیچے والی شاخوں میں پھنس گیا تھا اور زمین سے دس بارہ فٹ کی بلندی پر تھا۔

میں چند سیکنڈ فضا میں معلق رہا، پھر میں نے ایک ہاتھ رسی سے ہٹا لیا اور جیکٹ کی جیب سے چاقو نکال لیا۔ پیراشوٹ کی ایک رسّی کاٹنے سے میں کچھ نیچے کھسک گیا۔ میں نے ٹانگوں سے ٹٹول کر پیر نسبتاً ایک موٹی شاخ پر جما دیئے اور پیراشوٹ کی دوسری رسّی بھی کاٹ دی۔ اس کے بعد درخت سے اُترنا میرے لئے کوئی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

میں زمین پر پڑا کئی منٹ تک گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ یہ میری زندگی کا خوفناک ترین تجربہ تھا جس نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں ترمیز اور سلوانو کے بارے میں سوچنے لگا کہ اگر وہ پیراشوٹ کے ذریعے نیچے اُتر گئے ہوں گے تو کس طرف ہوں گے؟ لیکن کوئی اندازہ لگانا بالکل ممکن نہیں تھا۔ ہوا اُنہیں کہیں کا کہیں لے گئی ہوگی۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ یہاں سے بچ کر کسی محفوظ جگہ تک پہنچ

بھی سکتا ہوں یا ان پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا؟ پیراشوٹ کے ذریعے اُترتے ہوئے میں نے دُور کسی بستی کی روشنیاں دیکھی تھیں۔ ان بستی والوں نے جہاز کی آواز سنی ہوگی اور جہاز کو گر کر تباہ ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ اگر وہ کوئی عام بستی تھی تو ممکن ہے کسی نے توجہ نہ دی ہو۔ لیکن اگر وہ کوئی فوجی کیمپ تھا تو اُنہیں ضرور تشویش ہوئی ہوگی۔ رات کے وقت وادیٔ کشمیر کے کسی بھی حصے میں کسی ہوائی جہاز کے آنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ دہلی پٹھان کوٹ سے سری نگر کے لئے انڈین ایئر لائن کی پرواز دن کے وقت آتی تھی۔ اور یہی پرواز کارگل اور لیہہ کا چکر بھی لگاتی تھی۔ لیکن رات کے وقت تو کسی پرواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ روشنیاں کسی فوجی کیمپ کی تھیں تو ممکن ہے کوئی پارٹی تباہ ہونے والے جہاز کی تلاش میں روانہ بھی ہو چکی ہو یا روانہ ہونے والی ہو۔

میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر پہاڑی پر چڑھتا چلا گیا۔ ایک جگہ رُک کر میں نشیب میں دیکھنے لگا لیکن ظاہر ہے تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ترمیز کا نام لے کر پکارنے لگا۔ میری آواز پہاڑوں میں بازگشت پیدا کرتی رہی لیکن جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ ترمیز شاید مجھ سے بہت دُور نکل گیا تھا۔ میں دوسری طرف نشیب میں اُترنے لگا۔

دو گھنٹوں تک چلتے رہنے کے بعد میں رُک گیا۔ اس طرح تاریکی میں مارے مارے پھرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا۔ اس لئے میں نے دن کی روشنی پھیلنے کا انتظار مناسب سمجھا اور ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

مجھے سب سے زیادہ افسوس اپنے اس مشن کی ناکامی کا تھا۔ ہمیں اسلحہ کی وہ پیٹیاں سونا مارگ کے قریب ایک خاص مقام پر گرا کر واپس چلے جانا تھا۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق مقررہ مقام پر زمین سے ہمیں روشنی کے مخصوص سگنل ملتے۔ ہم اسلحہ کی وہ پیٹیاں جن کے ساتھ پیراشوٹ بھی تھے، جہاز سے گرا دیتے اور چکر کاٹتے ہوئے واپس چلے جاتے۔ لیکن ہمارا جہاز ایئر پاکٹ میں پھنس گیا۔ اس سے بچ کر نکلے تو انکشاف ہوا کہ ہم اپنی منزل سے بہت دُور نکل گئے تھے اور واپس آتے ہوئے وہ حادثہ پیش آیا جس سے نہ صرف اسلحہ کی پیٹیاں نیچے گر گئیں بلکہ ہمیں بھی اپنی جانیں بچانے کے لئے جہاز سے چھلانگ لگانی پڑی اور جہاز بھی کسی جگہ گر کر تباہ ہوگیا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اسلحہ کی پیٹیاں کس علاقے میں گری تھیں؟ ترمیز کہاں تھا اور میں کہاں تھا؟ لیکن سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ ہمارا مشن ناکام ہوگیا تھا اور کروڑوں ڈالر مالیت کا وہ اسلحہ بھارتی درندہ صفت فوجیوں سے برسرِ پیکار مجاہدین تک پہنچنے کی بجائے ضائع ہوگیا تھا۔ اس مشن کی ناکامی سے جہاں ایک طرف بھاری مالی نقصان ہوا تھا وہاں مجاہدین کی سرگرمیاں بھی متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔

بات کو آگے بڑھانے سے پہلے میں اپنے بارے میں مختصر طور پر بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آپ اس داستان میں میرے کردار کا صحیح تعین کر سکیں۔

میں 1966ء میں سوپور میں پیدا ہوا تھا۔ سرینگر سے تقریباً پچاس میل دُور اور وولر جھیل کے قریب یہ ایک بہت ہی خوبصورت قصبہ ہے، خدا نے اس قصبے کے لوگوں کو زندگی کی ہر نعمت سے نوازا ہے۔ زرخیز زمینیں، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے، مرغزار اور گنگناتی ہوئی شفاف پانی کی ندیاں۔ قدرتی حسن سے مالا مال یہ علاقہ ہر قسم کی پیداوار کے لئے بھی پوری وادی میں مشہور ہے۔ چاول اور زعفران کے علاوہ یہاں دنیا کی ہر نعمت موجود ہے۔ لیکن وادی کے دوسرے باشندوں کی طرح یہاں کے لوگ بھی آزادی کی نعمت سے محروم ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے لوگوں کو ظلم کی چکی میں پستے ہوئے ہی دیکھا ہے۔ بھارتی سامراج وادی کے باشندوں کو پچھلے پچاس برسوں سے جس طرح ظلم و بربریت کا نشانہ بنا رہا ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

میرے والد رسول بخش لون سوپور کی ایک مسجد کے پیش امام تھے۔ گاؤں میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ آس پاس کی بستیوں میں اُنہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کی تھوڑی بہت زمین بھی تھی جس پر وہ بڑی محنت سے کھیتی باڑی کرتے اور اُس پر پیدا ہونے والے اناج کی ساری آمدنی مجاہدین کے حوالے کر دیتے جو برسوں سے کشمیر کی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔

مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں۔ زینت دو سال اور رابعہ مجھ سے چار سال بڑی تھی۔ اُنہیں صرف پرائمری سکول تک تعلیم دلائی گئی تھی البتہ دینی تعلیم میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی تھی۔ دونوں حافظہ قرآن تھیں۔ والد صاحب نے اُنہیں فقہ و حدیث کے علم سے بھی آراستہ کیا تھا۔

والد صاحب مجھے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے لیکن بھارت کے متعصب ہندو حکمرانوں نے کشمیر کے مسلمانوں پر تو عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کا حصول ایک خواب بن کر رہ گیا تھا۔ میں قصبے کے ہائی سکول سے صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کر سکا اور اس کے بعد کھیتی باڑی سنبھال لی۔ میں جانتا تھا کہ زمین کی آمدنی کا ایک ایک پیسہ مجاہدین کو دے دیا جاتا تھا اس لئے میں نے محنت سے کبھی جی نہیں چرایا تھا۔

بعض اوقات مجاہدین کسی بھارتی فوجی دستے سے جھڑپ کے بعد پناہ لینے کے لئے ہمارے قصبے کی طرف بھی آ جاتے۔ گاؤں والوں نے اُنہیں کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ کئی کئی روز تک اُنہیں نہ صرف چھپائے رکھا جاتا بلکہ اُن کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا خیال بھی رکھا جاتا۔ ایسے معاملات میں میرے والد صاحب ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ کوئی بھی مسئلہ ہوتا اُن سے مشورہ ضرور لیا جاتا۔

مجاہدین جب ہمارے قصبے میں چھپے ہوتے تو میں اُن سے ملتا اور اُن کی باتیں سنتا۔ اُن کی ولولہ انگیز باتوں سے میرے اندر ایک تحریک سی پیدا ہوتی..... خون جوش مارنے لگا اور میرا بھی دل چاہتا کہ میں بھی ان کے ساتھ جہاد میں حصہ لوں۔ اپنی سرزمین سے ہندو بھیڑیوں کے

ناپاک وجود کو مٹانے کے لئے اُن پر گولیاں برساؤں۔ میں نے ایک دو مرتبہ اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا لیکن مجاہدین کے خیال میں، میں ابھی بہت چھوٹا تھا۔

یہ 1981ء کی بات تھی۔ کشمیر کی تحریک زور پکڑ گئی تھی۔ جوش و ولولے کی ایک نئی لہر اُٹھی تھی جس نے پوری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بھارتی فوج کا کوئی بھی دستہ مجاہدین کے حملوں سے محفوظ نہیں تھا۔ فوجی قافلوں پر حملے ہو رہے تھے۔ بھارتی فوجیوں کا کوئی بھی کیمپ مجاہدین کے حملوں سے محفوظ نہیں تھا۔ وادی کے مختلف علاقوں میں روزانہ بیسیوں فوجی مجاہدین کے ہاتھوں جہنم واصل ہو رہے تھے۔ اُن کی لاشیں جب دِلّی پہنچتیں تو کہرام سا مچ جاتا تھا۔ صف ماتم بچھ جاتی۔

بھارتی سورما مجاہدین سے تو مار کھا جاتے مگر اس کا انتقام لینے کے لئے نہتے اور بے گناہ و کمزور لوگوں کو اپنی بربریت کا نشانہ بناتے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بستیوں پر ٹوٹ پڑتے۔ بوڑھوں اور معصوم بچوں تک کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتار دیتے، بھوکے اور خونخوار بھیڑیوں کی طرح عورتوں پر ٹوٹ پڑتے۔ اجتماعی آبروریزی کے واقعات عام ہو چکے تھے۔

درندہ صفت بھارتی فوجیوں کے ان مظالم اور اوچھے ہتھکنڈوں سے وادی کے مسلمانوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ مجاہدین نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اپنی عورتوں کی بے حرمتی کا انتقام لینے کے لئے وہ قہر بن کر بھارتی فوجیوں پر ٹوٹ پڑتے، کسی فوجی قافلے کو گھیرے میں لیتے تو ایک بھی فوجی بچ کر نہ نکل پاتا۔ کسی کیمپ پر حملہ آور ہوتے تو اُسے راکھ کا ڈھیر بنا دیتے۔

میں پندرہ سال کا ہو چکا تھا۔ رائفل کا بوجھ اُٹھا سکتا تھا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ مجاہدین کے شانہ بشانہ بھارتی سامراجیوں کے خلاف لڑوں مگر قصبے کے لوگوں نے مجھے اور چند لڑکوں کو روکے رکھا تھا۔ اُن کے خیال میں فی الحال ہم قصبے میں رہ کر ہی مجاہدین کے لئے بہتر خدمات انجام دے سکتے ہیں اور جب وقت آئے گا تو وہ اپنے ہاتھوں سے ہمیں رائفلیں دے کر رخصت کریں گے۔

چھوٹی سے چھوٹی بستی میں بھی پوری وادی کی خبریں پہنچ جاتی تھیں۔ سوپور تو ایک قصبہ تھا۔ سرینگر اور مختلف شہروں میں لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ انہی لوگوں سے وادی کے حالات سن سن کر میں کڑھتا رہتا میرا خون کھولتا۔

آزادی ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور ہمارا یہ حق بھارت کے متعصب ہندو حکمرانوں نے غصب کر رکھا ہے۔ وہ طاقت کے بل بوتے پر ہمیں اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن دنیا نے بھی دیکھ لیا تھا کہ ہم غلام بن کر نہیں آزاد اور خود مختار انسانوں کی طرح جینا چاہتے ہیں اور وادی کے غیور مسلمان اپنا یہ حق چھیننے کے لئے ہی طویل عرصے سے جدوجہد کر رہے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ کشمیر کے مسئلے کو اُلجھانے میں سیاسی عوامل کارفرما ہیں۔ میں سیاست میں نہیں جاؤں گا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ وادی کے بعض بااثر مسلمان رہنما کشمیر کاز سے غداری نہ

کرتے تو آج یہ مسئلہ بڑی حد تک سلجھ چکا ہوتا۔ لیکن المیہ تو یہی ہے کہ 'شیر کشمیر' کہلوانے والوں نے اپنوں کو دھوکہ دیا اور اپنی سرزمین سے غداری کی۔ ذاتی اقتدار کے لالچ میں اُنہوں نے معصوم کشمیریوں کی پشت میں چھرے گھونپ دیئے اور اُن کی قسمت کی ڈور متعصب ہندو حکمرانوں کے ہاتھوں میں دے دی۔ لیکن بھارتی حکمرانوں کو بھی بخوبی یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ کشمیر اتنا تر نوالہ نہیں جسے آسانی سے ہضم کیا جا سکے۔

بھارتی حکمرانوں کی توسیع پسندی بھی کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ لنکا سے جو بھی نکلا باون گز کا ہی نکلا۔ بھارت میں جو بھی برسر اقتدار آیا رہنا پجاری ہی نکلا۔ زبان سے امن اور بھائی چارے کا درس دینے والے جنگی جنون میں مبتلا ہی پائے گئے۔ پچھلے پچاس برسوں میں اُنہوں نے حالات کے بل بوتے پر آس پاس کی چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں پر جس طرح قبضہ کیا اس کے بارے میں دنیا جانتی ہے۔ گورکو پرتگال سے آزادی دلانے کے بہانے بغاوت کرائی اور بالآخر طاقت کے بل بوتے پر خود گور پر قبضہ کر لیا۔ برما کی ریاست آسام پر بھی طاقت کے زور پر تسلط جمایا۔ ناگا قبائل پچاس سال گزرنے کے بعد آج بھی بھارتیوں کے لئے لوہے کا چنا بنے ہوئے ہیں۔ سکم اور بھوٹان پر طاقت کے ذریعے قبضہ کیا۔ 1971ء میں پاکستان کا ایک بازو کاٹ دیا۔ اندرا کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان کو بھی طاقت کے زور پر بھارت میں ضم کر لیا جائے گا مگر بنگالیوں نے ٹھینگا دکھا دیا۔ کشمیر پچاس سال سے سانپ کے منہ میں چھچھوندر بنا ہوا ہے اور بھارتی حکمران جان چکے ہیں کہ وادی میں بعض غداروں کی موجودگی کے باوجود کشمیر پر مکمل قبضے کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔

میں یہ سب کچھ سوچتا رہتا اور کڑھتا رہتا۔ میں اپنی سرزمین کو ان بھارتی بھیڑیوں کے ناپاک وجود سے پاک کرنا چاہتا تھا لیکن بچہ سمجھ کر میری بات کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ لیکن بالآخر ایک روز قسمت مجھ پر مہربان ہو گئی۔

ہوا یوں کہ میرے والد صاحب جن مجاہدین کو زمین کی آمدنی بھیجا کرتے تھے وہ کچھ مصروفیات کی وجہ سے نہیں آ سکے تھے۔ مجاہدین کی اُسی جماعت کے لیڈر عبدالرشید عباسی نے پیغام بھیج دیا کہ رقم سرینگر بھیج دی جائے۔ اُس نے یہ پیغام ایک عورت کے ہاتھ بھیجا تھا۔

والد صاحب کو گل ناز نامی اُس عورت پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی دو تین مرتبہ یہاں آ چکی تھی لیکن ہر مرتبہ اُس کے ساتھ کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ہوتا تھا۔ مگر اس مرتبہ وہ اکیلی آئی تھی اور والد صاحب اُس اکیلی کو اتنی بڑی رقم دے کر نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ اس لئے مجھے اور سلطان نامی ایک لڑکے کو اُس کے ساتھ جانے کو تیار کیا گیا۔

گل ناز ایک ادھیڑ عمر اور صحت مند عورت تھی۔ بس میں وہ میرے ساتھ بیٹھی تھی جبکہ سلطان ہم سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہیں کی۔

سرینگر میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں پہلے بھی کئی مرتبہ یہاں آ چکا تھا۔ لیکن آج کچھ اور بات

تھی میں ایک اہم مشن پر تھا اور اپنے آپ میں ایک عجیب سنسنی کی سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

سرینگر میں اڈے پر لاری سے اُترتے ہی میں نے شہر میں گڑبڑ کا اندازہ لگا لیا تھا۔ بس اڈے کے آس پاس کی دُکانیں بند تھیں اور فضا میں آنسو گیس کی بو رچی ہوئی تھی۔ ہم بس سے اُتر کر چند قدم ہی چلے تھے کہ ایک آدمی کسی طرف سے آ کر ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے اور سلطان نے باڈی گارڈز کی طرح گل ناز کو اپنے درمیان لے رکھا تھا۔ وہ آدمی چند قدم تک ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا، پھر شاید اُس نے ہمارے بارے میں کوئی رائے قائم کر لی تھی۔ پھر اُس نے جیسے ہی مجھے ایک طرف ہٹا کر گل ناز کے قریب آنے کی کوشش کی میں چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا اُس شخص نے گل ناز کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

''لاہوری محلے کی طرف گڑبڑ ہے۔ بند کی طرف چلی جاؤ! کمانڈر پوسٹ نمبر تین پر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

وہ شخص ہم سے الگ ہٹ گیا، میں نے اُسے تیزی سے بائیں طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر گل ناز کی طرف دیکھنے لگا۔ گل ناز کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے سرگوشی کی۔ ''پریشان مت ہو..... اپنا ہی آدمی تھا۔''

لاہوری محلہ شہر کے اندرونی علاقے میں تھا۔ مگر اُس شخص سے یہ پیغام ملنے کے بعد گل ناز نے اپنا راستہ بدل دیا۔ میں اور سلطان اب بھی اُس کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

ہم ایک طویل چکر کاٹ کر زیرو برج پر پہنچ گئے۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ دریائے جہلم سرینگر شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک طرف پرانا شہر ہے جس کی آبادی گنجان ہے۔ آڑھی ترچھی گلیاں کسی قدیم شہر کا منظر پیش کرتی ہیں۔ دریا کے دوسری طرف ماڈرن آبادی ہے۔ سیکریٹریٹ، سینٹرل پوسٹ آفس، ریذیڈنسی اور زیادہ تر سرکاری عمارتیں اُسی علاقے میں ہیں۔ سیاستدان اور وزراء کے بنگلے بھی اُسی طرف ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں تو یہ سب سے جدید اور بارونق علاقہ ہوا کرتا تھا۔ بڑے بڑے سپر اسٹور اور ہینڈی کرافٹس کی بے شمار بڑی بڑی دُکانیں اس علاقے میں ہیں۔ یہ بند کا علاقہ کہلاتا ہے۔ شہر کے دونوں حصوں کو ملانے کے لئے دریائے جہلم پر کئی پل بنے ہوئے ہیں جنہیں نمبروں یا ناموں سے پہچانا جاتا ہے۔ ہم جس پل کی طرف آئے تھے وہ زیرو برج کہلاتا تھا۔

راستے میں ہمیں ایک تانگہ مل گیا۔ دو آدمی پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آگے ایک پیچھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی عمر پچپن کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ مشت بھر سفید داڑھی، سر پر کھڑے کی سفید ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح، اُس کے چہرے پر خوف نمایاں تھا۔ خوف و دہشت کشمیر کی وادی کے باسیوں کا مقدر بن چکا تھا۔ اگر مقابلہ انسانوں سے ہوتا تو اس خوف سے نجات حاصل کی جا سکتی تھی مگر وہ تو بھیڑیئے تھے۔ درندے..... جو رحم کرنا تو جانتے ہی نہیں

تھے۔ بچہ، بوڑھا جو بھی اُن کے ہاتھ لگ جاتا اُسے بیدردی سے مار ڈالتے۔ عورتوں پر بھی بے پناہ تشدد کیا جاتا۔

گل ناز تانگے کی پچھلی سیٹ پر سفید داڑھی والے اُس بوڑھے کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں اور سلطان اگلی سیٹ پر ٹک گئے۔ تانگے میں جتا ہوا گھوڑا بھی مریل سا تھا جو بڑی مشکل سے ہمارا بوجھ کھینچ رہا تھا۔

زیرو برج پر پولیس کے ساتھ درندہ صفت فوجی بھی رائفلیں تانے کھڑے تھے جو خونخوار نظروں سے آنے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ کئی لوگوں کو پوچھ گچھ کے لئے روک رکھا تھا۔ ہمارے تانگے کو بھی روک لیا گیا۔ ایک پولیس والا اور دو فوجی تھے۔ اُنہوں نے پہلے گہری نظروں سے ہم سب کا جائزہ لیا پھر ایک فوجی نے ہمیں نیچے اُترنے کا حکم دیا۔ بوڑھے کا چہرہ خوف کی شدت سے سفید پڑ گیا تھا۔

پہلے اُس بوڑھے سے ہی کچھ سوال کئے گئے۔ پولیس والے نے اُس کی جامہ تلاشی لی اور اُسے اس طرح ایک طرف دھکا دے دیا کہ وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ پھر وہی فوجی گل ناز کی طرف متوجہ ہو گیا۔

گل ناز کی عمر چالیس اکتالیس سال رہی ہوگی۔ اُس کی نہ صرف شکل صورت بہت اچھی تھی بلکہ جسمانی طور پر بھی اُس میں بڑی کشش تھی۔ بھارتی فوجی اُس سے سوالات کرتے ہوئے اُسے اُوپر سے نیچے تک گھور رہا تھا۔ اُس کی نظروں میں ہوس جھلک رہی تھی۔ گل ناز بڑے مطمئن لہجے میں اُس کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔

''اس تھیلے میں کیا ہے.....؟'' فوجی نے اُس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

''سیب ہیں.....اسلحہ نہیں ہے۔'' گل ناز نے تھیلا اُس کے سامنے کر دیا۔

اس مرتبہ فوجی نے بڑی خونخوار نظروں سے اُس کی طرف دیکھا تھا۔ اُس نے گل ناز کے ہاتھ سے تھیلا جھپٹ لیا۔ اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح چیک کیا اور اپنے قریب کھڑے ہوئے پولیس والے کی طرف بڑھا دیا۔

''دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھاؤ!'' فوجی نے گل ناز کو حکم دیا۔

عورتوں کی جامہ تلاشی لینا اور تلاشی کے دوران بدتمیزی کرنا روز کا معمول بن چکا تھا۔ احتجاج کی پرواہ کسے تھی؟ گل ناز نے گہرے نیلے رنگ کی ٹخنوں تک لمبی چوغہ نما قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر رُومال بندھا ہوا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے۔ میرا خیال تھا کہ گل ناز نے میرے والد سے لی ہوئی رقم قمیض کے اندر کہیں چھپا رکھی تھی اور اب وہ رقم اُس فوجی کے ہاتھ لگ جائے گی۔ اُس فوجی کو شاید شبہ تھا کہ گل ناز نے ڈھیلے ڈھالے لباس کے اندر کوئی اسلحہ چھپا رکھا ہوگا اور وہ لباس کو محض تھپتھپا کر اپنا اطمینان کر لے گا۔ لیکن وہ ایک ہاتھ سے گل ناز کے

سینے کو ٹٹولنے لگا تو میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ٹھیک اُسی لمحہ گل ناز نے بھی اپنے دونوں ہاتھ نیچے گرا دیئے تھے۔

''اپنے گندے ہاتھ دُور رکھو!'' میں چیخا۔ ''اگر اس کی تلاشی لینی ہے تو کسی لیڈی کانسٹیبل کو بلاؤ!''

گل ناز نے بھی چیختے ہوئے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ گل ناز کی مزاحمت اور میرا طرزِ عمل اُس فوجی کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ اُس نے بھیڑیئے کی طرح غراتے ہوئے میرے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ میرے منہ سے بے اختیار ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا اُس نے میرے کندھے پر رائفل کا بٹ رسید کر دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ میں چیخ کر نیچے گرا تو اُس نے میرے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ میں سڑک پر لوٹ رہا تھا۔ اُس کے بوٹ کی ٹھوکریں میرے جسم کے ہر حصے پر لگ رہی تھیں۔ ہر ٹھوکر کے ساتھ میں بلبلا اُٹھتا۔

پُل پر ٹریفک رُک گیا۔ لوگ جمع ہو رہے تھے لیکن آگے کوئی نہیں آ رہا تھا۔ گل ناز چیخ چیخ کر مجھے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسرے فوجی نے گل ناز کو بازو سے پکڑ کر زوردار دھکا دیا۔ وہ بھی چیختی ہوئی ایک طرف گری۔ اُس وقت چند آدمیوں نے جرات سے کام لیتے ہوئے مداخلت کی۔ اُن بھارتی درندہ صفت فوجیوں کے کام میں مداخلت کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اتفاق سے ایک پولیس آفیسر بھی جیپ پر اُس طرف نکل آیا تھا۔ لوگوں نے اُس پولیس آفیسر کو گھیر لیا۔

گل ناز اب بھی چیخ چیخ کر ان فوجیوں کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ وہ پولیس آفیسر بھی اگرچہ ہندو ہی تھا لیکن صورتحال کی نزاکت کو تاڑ گیا تھا۔ وہ مجھے فوجی کے چنگل سے چھڑا کر ایک طرف لے گیا۔ میرے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ میں قمیض کے دامن سے خون صاف کرنے لگا۔ گل ناز بھی ہمارے قریب آ گئی۔ اُس نے سر پر بندھا ہوا رُومال کھول لیا اور میرا ہاتھ ہٹا کر ناک اور ہونٹوں سے خون پونچھنے لگی۔ ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر اُن فوجیوں کو گالیاں بھی دے رہی تھی۔

''اب تم لوگ جاؤ!'' پولیس آفیسر نے ہمارے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''میں اُس کے خلاف یونٹ میں رپورٹ کروں گا۔ اُسے اس کی سزا ضرور ملے گی۔''

''کیا سزا ملے گی؟'' گل ناز غرائی۔ ''اس کا تبادلہ کر دیا جائے گا کسی اور جگہ بھیج دیا جائے گا جہاں اسے مزید کھل کر کھیلنے کا موقع ملے گا۔ ان بھیڑیوں کو وادی سے نکلنا ہوگا۔ ہم جب تک وادی کو ان کے ناپاک وجود سے پاک نہیں کر دیں گے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ آج اس بے گناہ اور معصوم بچے کو تشدد کا نشانہ بنایا ہے کل اس کے ہاتھ میں رائفل ہوگی اور یہ انتقام لے گا.....انتقام.....''

پولیس آفیسر کا خیال تھا کہ گل ناز اسی طرح چیختی رہی تو آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بگڑ

جائیں گے اور صورتحال قابو سے باہر ہو جائے گی۔ اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر جیپ میں بٹھایا اور گل ناز کو بھی ہاتھ سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔

''چلو..... جیپ میں بیٹھو! اس لڑکے کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ضروری ہے۔ ورنہ تکلیف بڑھ جائے گی۔''

گل ناز اب بھی فوجیوں کو گالیاں بک رہی تھی۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ برج پر موجود تمام پولیس والے اور فوجی رائفلیں سنبھالے الرٹ کھڑے تھے۔ گل ناز جیپ پر بیٹھی تو اُس نے سلطان کو بھی پکڑ کر اُوپر کھینچ لیا۔ سلطان اب تک ایک طرف کھڑا رہا تھا۔ اُس کا چہرہ خوف سے دُھواں ہو رہا تھا۔ وہ تو مجھ سے زیادہ جوشیلا تھا لیکن میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ اب تک خاموش کیوں رہا تھا اور بزدلوں کی طرح ایک طرف کیوں دُبکا کھڑا رہا تھا؟ مجھے اُس پر غصہ تو آیا تھا لیکن پھر سوچا کہ اس نے الگ رہ کر عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اگر وہ مداخلت کرتا تو اُس کا حشر بھی مجھ سے مختلف نہ ہوتا۔

جیپ بند کے علاقے میں ایک شاپنگ سنٹر کے قریب رُک گئی۔ پرانے شہر میں ہنگامے کا اثر یہاں بھی ہوا تھا اور بہت ساری دُکانیں بند تھیں۔ پولیس اور فوجیوں کا گشت یہاں بھی جاری تھا۔ وہ پولیس آفیسر ہمیں جیپ سے اُتار کر ایک کلینک میں لے گیا جس کے دروازے کے اُوپر ڈاکٹر غلام نبی کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

پولیس آفیسر مجھے ڈاکٹر کے حوالے کر کے چلا گیا۔ اُس نے ڈاکٹر کو ہدایت کر دی تھی کہ ہم سے کوئی فیس نہ لی جائے۔ کلینک میں اس وقت دو تین مریض اور بھی تھے لیکن ڈاکٹر فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو گیا۔

میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ جسم کے ہر حصے پر ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ بائیں کندھے میں زیادہ تکلیف تھی۔

آدھے گھنٹے بعد ہم کلینک سے باہر نکلے تو میرے پورے جسم میں درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے اگرچہ مجھے درد رفع کرنے کی دو گولیاں کھلا دی تھیں لیکن فوری طور پر درد میں کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا بلکہ تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک مختلف سڑکوں اور گلیوں میں چلتے رہے۔ اس علاقے میں بڑے بڑے عالیشان بنگلوں اور چمچماتی کاروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کشمیریوں کی تحریک آزادی نے ان دولت مندوں کی زندگی کو کسی پہلو سے بھی متاثر نہیں کیا تھا۔ وہ پہلے بھی عیش کر رہے تھے اور آج بھی سکون و اطمینان کی زندگی گزار رہے ہیں۔ آگ اور خون کا کھیل تو غریبوں کا مقدر بن چکا ہے۔ آزادی کی لگن تو انہی لوگوں کو ہے جو ایک وقت کی روٹی سے بھی محروم ہیں۔ جو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے ہندو سامراج کو وادی سے نکالنا چاہتے ہیں۔ یہی لوگ سروں پر کفن باندھ کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر پھر رہے ہیں۔ یہی لوگ بھارتی درندوں کے ظلم و

تشدد کا شکار ہوتے ہیں۔ یہی دیوانے گولیوں کی باڑھ اپنے سینوں پر روکتے ہیں۔ انہی کے گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے۔ انہی کے معصوم بچوں کو چیر کر پھینک دیا جاتا ہے اور انہی کی عورتوں کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ کوئی دولت مند مجاہدین کی کسی تحریک میں شامل نہیں۔ ان کے نرم اور گداز ہاتھوں میں کبھی رائفل نہیں دیکھی گئی۔ یہ لوگ گھروں سے نکلتے ہیں تو درجنوں گارڈ ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ صرف دولت سمیٹتے ہیں اور بیانات جاری کرتے ہیں۔

ہم سرینگر کلب کے پیچھے سے ہوتے ہوئے ایک اور سڑک پر مُڑ گئے اور تقریباً بیس منٹ تک مختلف گلیوں میں چلتے رہنے کے بعد ایک بنگلے کے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ گیٹ کی دوسری طرف تقریباً پانچ ہزار مربع گز کھلی جگہ تھی جس میں سیب اور اخروٹ کے لاتعداد درخت تھے۔ خودرو جھاڑیوں اور بے ترتیب گھاس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس جگہ کی دیکھ بھال پر توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ ایک طرف بنگلے کی عمارت تھی۔ عمارت کی حالت دیکھ کر اسے بڑی آسانی سے آثارِ قدیمہ میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ برسوں پہلے شاید رنگ و روغن کیا گیا ہو گا۔ اب تو دیواروں کا پلستر بھی جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا تھا۔ برآمدے کے سامنے اخروٹ کے دو بہت اُونچے درخت تھے جن کی گھنی شاخوں نے بنگلے کی چھت پر سایہ کر رکھا تھا۔ برآمدے کے سامنے تین کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں اور برآمدے کا فرش جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا تھا۔ برآمدے کے ستونوں کا پلستر بھی اُکھڑا ہوا تھا۔

برآمدے میں ہمارا استقبال ایک بوڑھی عورت نے کیا۔ گل ناز کے ساتھ مجھے اور سلطان کو دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ میرے ہونٹ اور ناک پر بینڈیج دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں تشویش اُبھر آئی۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گئی جہاں بچھی ہوئی دری پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

اُن میں سے ایک کی داڑھی، سر کے بال بھی بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ سر پر چترالی ٹوپی تھی۔ اُس نے سرمئی رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور اُوپر سیاہ رنگ کی واسکٹ تھی۔ اُس کے قریب ہی فرش پر سب مشین گن اور گولیوں سے بھرا ہوا بیلٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنے مجاہدین کی تنظیم کا کمانڈر عبدالرشید عباسی تھا۔ اُس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ دوسرے کی عمر بھی پچیس چھبیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ کلین شیو تھا۔ کمانڈر رشید کئی مرتبہ سوپور آ چکا تھا، اُس نے فوراً ہی مجھے پہچان لیا۔ میری حالت دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں تشویش اُبھر آئی۔

''کیا ہوا اسے..... اس کی یہ حالت کیسے ہوئی؟'' اُس نے پوچھا۔

''بتاتی ہوں۔'' گل ناز دری پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر زیرو برج پر پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ''میرے پاس پستول ہوتا تو اُس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیتی، لیکن افسوس تو یہی ہوا کہ اُس وقت میں خالی تھی۔

''گھبراؤ نہیں شمروز!'' کمانڈر رشید میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم پر بھارتی بھیڑیوں

کا یہ پہلا حملہ ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے اس کا بدلہ تو میں لوں گا۔ لیکن تم اس مار کو نہیں بھولو گے۔ ایک ایک چوٹ کو یاد رکھو گے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم بھی ہاتھ میں رائفل اُٹھا لو!''

''ہاں..... اب مجھ سے بھی زیادہ برداشت نہیں ہوتا۔'' میں نے جواب دیا۔

ہم باتیں کر رہے تھے اور گل ناز نے اپنی چوغہ نما قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر نوٹوں کے بنڈل کمانڈر رشید کے سامنے رکھ دیئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اُس نے نوٹ کہاں چھپائے تھے حالانکہ میرے سامنے اُس فوجی نے تلاشی لی تھی۔ گل ناز نے مسکرا کر میری طرف دیکھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اُس نے نوٹ لباس میں کہاں چھپائے تھے؟

''صبح جب میں گئی تھی تو شہر کے حالات بالکل پُرسکون تھے۔'' گل ناز نے کمانڈر رشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا گڑبڑ ہو گئی؟ پرانے شہر میں ہنگامے ہو رہے ہیں۔''

''ان ہنگاموں کی وجہ سے ہی مجھے یہاں آنا پڑا اور اپنا ایک آدمی بھی لاری اڈے پر بھیج دیا تھا تاکہ تمہیں اُس طرف جانے سے منع کر دیا جائے۔'' کمانڈر رشید نے کہا۔ ''پولیس نے آج صبح سویرے اسٹوڈنٹ لیڈر عبدالشکور کو اُس کے گھر سے گرفتار کر لیا تھا۔ دس بجے کے قریب یہ خبر پھیل گئی کہ اُسے فوجی کیمپ میں تشدد کر کے ہلاک کر دیا گیا ہے۔ اسٹوڈنٹس نے احتجاجی جلوس نکالا تو پولیس نے پہلے لاٹھی چارج کیا اور پھر گولی چلا دی جس سے دو لڑکے اور شہید ہو گئے۔ پرانے شہر میں ابھی ہنگامے ہو رہے ہیں لیکن کل کے لئے پوری وادی میں ہڑتال کی کال دے دی گئی ہے۔ یہ لڑکے.....'' اُس نے میری اور سلطان کی طرف دیکھا۔ ''یہ دونوں بھی تین چار دن تک واپس نہیں جا سکیں گے۔ انہیں یہیں رہنا ہو گا۔ میں آج ہی مولوی رسول بخش کو پیغام بھجوا دیتا ہوں کہ وہ پریشان نہ ہو۔''

اس دوران اُس بوڑھی عورت نے ہمارے سامنے چائے لا کر رکھ دی۔ کشمیری چائے کا کچھ اپنا ہی مزہ ہوتا ہے لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ایسی خوش ذائقہ اور لذیذ چائے میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں پی تھی۔

''اماں فاطمہ! یعقوب کہاں ہے.....؟'' کمانڈر رشید نے بوڑھی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''باہر گیا ہوا ہے..... ابھی آ جائے گا تھوڑی دیر میں۔'' فاطمہ نے جواب دیا۔

''وہ آ جائے تو میرے پاس بھیج دینا۔'' کمانڈر رشید نے کہا۔

بوڑھی فاطمہ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد گل ناز بھی خالی پیالیاں لے کر کمرے سے چلی گئی۔ کمانڈر رشید ہم سے باتیں کرنے لگا۔ وہ وادی کے مختلف علاقوں میں درندہ صفت بھارتی فوجیوں کے ظلم و تشدد کی باتیں سنا رہا تھا۔ یہ کوئی فرضی یا من گھڑت کہانیاں نہیں تھیں۔ سب کچھ اسی طرح ہو رہا تھا جس طرح کمانڈر رشید بتا رہا تھا۔ اس کی ایک مثال تو میں خود تھا جسے اُس بھیڑیا صفت نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ میرا جرم کیا تھا؟ میں نے اُسے ایک عورت کو چھونے سے منع کیا تھا۔ اور آج صبح پرانے شہر میں ہونے والے ہنگامے، فوجیوں نے ایک اسٹوڈنٹ کو تشدد کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ احتجاج کرنے پر دو اور لڑکوں کو گولیوں سے اُڑا دیا گیا تھا۔

یہ بات اب میری سمجھ میں بھی آ گئی تھی کہ ظلم مظلوم کو سر اُٹھانے پر مجبور کیوں کر دیتا ہے۔ اور یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ آزادی کی تڑپ تھی۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا یہی سب کچھ دیکھتا ہوا آ رہا تھا۔ میرے اندر بچپن سے جو چنگاری سلگ رہی تھی وہ اب شعلہ بن کر بھڑکنے والی تھی۔ میری ناک اور ہونٹوں پر بینڈیج، جسم کے ہر حصے میں اُٹھنے والی ٹیسیں میرے جوش اور جذبے کو مہمیز کر رہی تھیں۔ کمانڈر رشید نے ٹھیک کہا تھا مجھے یہ چوٹیں یاد رکھنی ہوں گی اور ان کا درد محسوس کرنا ہو گا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں بھی ہاتھوں میں رائفل اُٹھا لوں۔

آدھے گھنٹے بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا۔ وہ فاطمہ کا شوہر یعقوب تھا۔ کمانڈر رشید نے اُسے یہ پیغام دے کر سوپور بھیج دیا کہ میں اور سلطان تین چار دن تک یہیں رہیں گے۔ ہمارے گھر والوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یعقوب اسی وقت روانہ ہو گیا۔

میں اس ویران بنگلے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور جب میں نے کمانڈر رشید سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ یہ وسیع و عریض بنگلہ دو دولت مندوں کے درمیان جھگڑے کی بنیاد بنا ہوا ہے۔ ان میں ایک ہندو سیٹھ ہے اور دوسرا مسلمان۔ اُن میں پچھلے دس سال سے بنگلے کی ملکیت کا مقدمہ چل رہا ہے۔ عدالت نے یہ بنگلہ اپنی تحویل میں لے رکھا ہے۔ یعقوب اس بنگلے کا چوکیدار ہے جو دس سال سے یہاں رہ رہا ہے۔ وہ مجاہدین کی بعض تنظیموں کے لئے انفارمر کا کام بھی کرتا ہے۔ مجاہدین اُس سے ملنے کے لئے یہاں بھی آتے رہتے ہیں۔ کسی کو آج تک یعقوب یا اُس کے مہمانوں پر شبہ نہیں ہو سکا۔ اسی طرح یہ ویران بنگلہ مجاہدین خصوصاً کمانڈر رشید کی تنظیم کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز بھی بنا ہوا ہے۔

کمانڈر رشید کے اس خفیہ ٹھکانے کے بارے میں اُس کے دو چار آدمی ہی جانتے تھے۔ اور پھر یہ کوئی ایک خفیہ ٹھکانا نہیں تھا۔ شہر کے اندر اور نواح میں کئی ایسی جگہیں تھیں جنہیں وہ ضرورت کے وقت استعمال کرتے تھے۔

کمانڈر رشید اُس وقت بنگلے سے چلا گیا تھا۔ میرے اور سلطان کے علاوہ اس بنگلے میں گل ناز، فاطمہ رہ گئے تھے۔ یعقوب سوپور چلا گیا تھا اور کل دوپہر سے پہلے اُس کی واپسی کی توقع نہیں تھی۔

وہ رات میں نے بڑی اذیت میں گزاری۔ میرے جسم پر جگہ جگہ نیل پڑے ہوئے تھے اور درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ گل ناز نے مضروب جگہوں پر مالش بھی کر دی تھی اور ڈاکٹر کی دی ہوئی گولیاں بھی کھلا دی تھیں مگر تکلیف کم نہیں ہوتی تھی۔ گل ناز اور فاطمہ رات بھر میرے پاس بیٹھی رہی تھیں۔ سلطان بھی خاصا پریشان تھا۔

یعقوب اگلے روز دوپہر کے بعد واپس آیا تھا۔ اُس سے باہر کے حالات بھی معلوم ہوئے۔ پوری وادی میں ہڑتال تھی۔ سرینگر شہر میں جگہ جگہ پولیس اور سٹوڈنٹس میں جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ مجاہدین بھی اس لڑائی میں شامل ہو گئے تھے۔ سرینگر سے بتیس میل دُور بارہ مولا شہر میں دو پولیس والے اور تین فوجی مجاہدین کے ہاتھوں مارے گئے تھے جس پر فوجی مزید مشتعل ہو گئے تھے۔ وہ مجاہدین کی تلاش میں گھروں میں گھس کر عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔

ہنگامے بڑھتے جا رہے تھے۔ چار دن بعد کچھ سکون ہوا تو سلطان کو یعقوب کے ساتھ سوپور بھیج دیا گیا۔ مجھے تکلیف کی وجہ سے اسی بنگلہ ہی میں روک لیا تھا۔

میں مزید ایک ہفتہ اُس بنگلے میں رہا۔ اس دوران کمانڈر رشید دو مرتبہ تھوڑی دیر کے لئے وہاں آیا تھا۔ گل ناز ہر لحاظ سے میرا خیال رکھے ہوئے تھی۔ وہ دن میں دو تین مرتبہ ہلدی تیل سے میری مالش کرتی رہی جس سے میری اندر کی چوٹیں ٹھیک ہو رہی تھیں اور تکلیف بھی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔

اور پھر ایک روز کمانڈر رشید مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اُس روز سرینگر شہر کے حالات کسی قدر پُرسکون تھے۔ دُور تک دریا کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں چلتے رہے اور بالآخر ایک جگہ رُک گئے۔

ایک گھنٹے بعد ایک اور آدمی وہاں پہنچ گیا۔ وہ کچھ دیر تک سرگوشیوں میں کمانڈر رشید سے باتیں کرتا رہا پھر ہم اُس کے ساتھ چل پڑے۔ اُونچے نیچے پہاڑی راستوں پر دو گھنٹے چلتے رہنے کے بعد ہم پھر ایک جگہ پر رُک گئے۔ یہاں دو آدمی ہمارے منتظر تھے۔

''کیا رپورٹ ہے بالے؟'' کمانڈر رشید نے علیک سلیک کے بعد اُن میں سے ایک کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''خبر ہے کہ بھارتی فوجیوں کا ایک کانوائے آج رات گلمرگ کی طرف جانے والا ہے۔ کمانڈر فیض علی نے اُس فوجی قافلے پر حملے کی تیاری مکمل کر لی ہے۔ اُس نے پیغام بھیجا تھا کہ آپ کو اطلاع دے دی جائے۔'' بالے نے جواب دیا۔

''کمانڈر فیض علی کہاں ہے..... اُس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟'' کمانڈر رشید نے پوچھا۔

''وہ آٹھ مجاہدوں کے ساتھ پوائنٹ تھری پر آپ کا منتظر ہے۔'' بالے نے کہا۔

''فوجی کانوائے کے بارے میں کوئی اطلاع..... گاڑیوں اور فوجیوں کی تعداد کیا ہے؟'' کمانڈر رشید نے پوچھا۔

''یہ ساری تفصیل آپ کو کمانڈر فیض علی سے ہی معلوم ہو گی۔'' بالے نے جواب دیا۔ ''ویسے میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ فوجی قافلہ رات آٹھ بجے وہاں سے گزرنے والا ہے۔''

کمانڈر رشید اس مرتبہ فوری طور پر جواب دینے کی بجائے چند سیکنڈ تک کچھ سوچتا رہا۔ اُس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔

''ٹھیک ہے.....'' وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ''تمہاری پھٹ پھٹی کہاں ہے؟''

''وہ اُدھر..... اُس چٹان کے پیچھے درختوں کے نیچے کھڑا ہے۔'' بالے نے ایک طرف اشارہ کیا۔

کمانڈر رشید نے دوسرے جوان کو کچھ ہدایات دے کر وہاں سے رُخصت کر دیا اور ہم بالے کے ساتھ اُس چٹان کی طرف چل پڑے۔ میں چلتے ہوئے بار بار کن انکھیوں سے بالے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی عمر بیس اکیس سال رہی ہو گی۔ سر کے بال اور شیو بڑھا ہوا تھا، قد میں وہ مجھ سے تھوڑا ہی نکلتا ہوا تھا لیکن صحت قابل رشک تھی۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کشمیر کے یہ بیٹے وادی کے سپوت جو وادی میں بھارتی غاصبوں سے برسرِ پیکار تھے کئی کئی وقت فاقوں میں گزار دیتے تھے۔ اپنے گھروں کو تو شاید وہ بھول ہی گئے تھے۔ اُن کے دن بھارتی بھیڑیوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں میں اور راتیں کھلے آسمان تلے گزرتی تھیں۔ وادی میں پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہنے والے لوگ اُن کی مدد کرتے تھے۔ لیکن وہ کبھی کسی جگہ ٹک کر نہیں رہے تھے۔ آج یہاں کل وہاں..... وہ بھارتیوں کے لئے چھلاوہ تھے جو اچانک ہی کسی جگہ نمودار ہوتے اور کسی فوجی کیمپ یا قافلے پر تباہی نازل کر کے آناً فاناً غائب ہو جاتے۔

وہ چٹان وہاں سے تقریباً سو گز دُور تھی۔ ہم اُس کے اُوپر سے گھومتے ہوئے چنار کے درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچ گئے جہاں ایک پرانی سی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔

''ہم تینوں اس پر بیٹھ جائیں گے نا؟'' کمانڈر رشید نے قریب پہنچ کر سوالیہ نگاہوں سے بالے کی طرف دیکھا۔

''اس نے مجھے کبھی دھوکہ نہیں دیا کمانڈر!'' بالے نے موٹر سائیکل کی سیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اُس نے موٹر سائیکل کو اسٹینڈ سے اُتار کر کک لگائی۔ موٹر سائیکل پہلی ہی کک پر سٹارٹ ہو گئی۔ وہ موٹر سائیکل پر آگے کو ہو کر اس طرح بیٹھ گیا کہ پٹرول والی ٹینکی آدھی سے زیادہ اس طرح چھپ گئی۔

''چل بھئی شمروز..... بیٹھ جا!'' کمانڈر رشید نے مجھے اشارہ کیا۔ آج اس پھٹ پھٹی کا بھی امتحان ہے اور تیرا بھی۔''

میرے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اُن کی باتوں سے تو میں سمجھ گیا تھا کہ کسی چھاپہ مار کارروائی کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ اور یہ سوچ کر میں عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا تھا کہ میں بھی اس معرکے میں حصہ لینے والا تھا۔

میں بالے کے پیچھے بیٹھ گیا اور کمانڈر رشید میرے پیچھے۔ بالے کے گلے میں آٹومیٹک رائفل لٹکی ہوئی تھی جس کی نال میرے چہرے کے عین سامنے تھی۔ میں اُس فولادی نال کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس سے نکلنے والی گولیوں نے اب تک کتنے بھارتی سورماؤں کو ڈھیر کیا ہو گا۔

موٹر سائیکل حرکت میں آ گئی اور پتھریلے راستوں پر اُچھلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ کچھ دیر تک ہم دریا کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور پھر موٹر سائیکل کا رُخ چٹانوں کی طرف مُڑ گیا۔ ایک تو راستہ غیر ہموار اور پتھریلا تھا اور ستم یہ کہ موٹر سائیکل پر ہم تین آدمی سوار تھے اس لئے رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔

موٹر سائیکل کی آواز چٹانوں میں بازگشت سی پیدا کر رہی تھی اور میں دُور بلند پہاڑوں پر قطار در قطار ایستادہ چنار کے فلک بوس درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان درختوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وادی کے محافظ چاق و چوبند اور مستعد کھڑے ہوں..... میں بھی چشم تصور سے اپنے آپ کو ایک ایسے مجاہد کے رُوپ میں دیکھ رہا تھا جو دونوں ہاتھوں میں رائفل تھامے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر گولیاں برساتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھستا چلا جا رہا ہو۔

یہ سوچ ہی سنسنی خیز تھی کہ آج میں بھی ایک مجاہد کی طرح وادی کے دشمنوں پر موت برسانے جا رہا تھا۔ رائفل میرے لئے اجنبی نہیں رہی تھی۔ مجاہدین کسی کارروائی کے بعد پناہ لینے کے لئے ہمارے گاؤں میں آتے رہتے تھے۔ میں نے اُن سے رائفل چلانا سیکھ لی تھی۔ کمانڈر رشید بھی کئی مرتبہ ہمارے گاؤں آ چکا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے مجھے رائفل اُٹھانا سکھائی تھی۔ اُس نے بتایا تھا میگزین کس طرح لوڈ کیا جاتا ہے، نشانہ کس طرح لیا جاتا ہے اور ٹرائیگر کیسے دبایا جاتا ہے؟ اور آج وہی کمانڈر رشید مجھے ایک محاذ پر لے جا رہا تھا۔

موٹر سائیکل پتھریلے راستوں پر اُچھلتی ہوئی چلتی رہی اور میں تصورات میں دشمن پر بجلی بن کر ٹوٹتا رہا..... کشتوں کے پشتے لگاتا دشمن کی صفوں کو روندتا آگے بڑھتا رہا۔

اور پھر میرے تصورات کا یہ تسلسل ٹوٹ گیا..... موٹر سائیکل اس قدر زور سے اُچھلی تھی کہ میں جھٹکا لگنے سے ایک طرف جھکتا چلا گیا۔ میرے پیچھے بیٹھا ہوا کمانڈر رشید اگر مجھے نہ سنبھال لیتا تو میں اُسے بھی ساتھ لے کر نیچے گرتا۔ ہمیں اُن پہاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ ایک موقع پر ہم پہاڑیوں سے باہر آ گئے۔ دائیں طرف نشیب میں پھیلی ہوئی وادی میں بل کھاتی ہوئی ایک سرمئی سی لکیر چمک رہی تھی۔ یہ وہ سڑک تھی جو سرینگر سے گلمرگ کی طرف چلی گئی تھی۔

○○○

یہاں میں آپ کو تھوڑا سا گلمرگ کے بارے میں بتاتا چلوں۔ سرینگر سے بتیس میل دُور شمال مغرب میں سطح سمندر سے آٹھ سو ساٹھ فٹ کی بلندی پر یہ نہایت خوبصورت وادی ہے۔ میلوں دُور تک پھیلے ہوئے مرغزار، صنوبر اور چنار کے درختوں کے جھنڈ، پھل دار درختوں کے باغات اور اُن کے پس منظر میں سپید برف سے ڈھکے ہوئے سر بہ فلک پہاڑ۔

کچھ عرصہ پہلے تک یہ خوبصورت وادی بھارتی فلم انڈسٹریز کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ کوئی بھی بھارتی فلم کشمیر میں شوٹنگ کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جب تحریک آزادی نے زور پکڑا تو ہندوستانی سیاحوں اور فلم انڈسٹری والوں نے کشمیر کا خیال ذہن سے نکال دیا۔

گلمرگ میں بھارتی فوج کی ایک چھاؤنی بھی تھی۔ پہلے یہ چھاؤنی بہت محدود ہوا کرتی تھی لیکن جیسے جیسے مجاہدین کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں یہ چھاؤنی بھی پھیلتی گئی۔

سرینگر اور گلمرگ کے درمیان فوجی قافلوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ یہ قافلے عام طور پر دن کے وقت سفر کرتے تھے۔ رات کے وقت بھارتی فوج کا کوئی قافلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر نہیں کرتا تھا۔ لیکن پچھلے دو اڑھائی مہینوں سے اس علاقے میں مجاہدین کی کوئی کارروائی دیکھنے میں نہیں آئی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ اب کشمیر میں ہائی کمان نے رات کے وقت بھی اس طرح کوئی قافلہ بھیجنے کا پروگرام بنایا تھا جس کی اطلاع مجاہدین کو مل گئی تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک مزید سفر کرنے کے بعد بالے نے موٹر سائیکل ایک چٹان کے پیچھے لے جا کر درختوں میں روک لی۔ یہاں شفاف پانی کی ایک ندی بھی بہہ رہی تھی۔

کمانڈر رشید کے فوراً ہی بعد میں بھی موٹر سائیکل سے اُتر گیا۔ میں اس قسم کے سفر کا عادی نہیں تھا۔ مسلسل جھٹکوں اور سیدھا بیٹھے رہنے سے میری کمر اکڑ گئی تھی۔ کمانڈر رشید نے مُڑ کر میری طرف دیکھا اور میری پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

''ایسی باتوں کا عادی ہو جاؤں گا پھر کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔'' میں نے اپنے کندھے پر لٹکی ہوئی سب مشین گن درست کرتے ہوئے کہا۔

بالے نے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کر دی اور ہم اُس کی رہنمائی میں چلتے ہوئے ایک تنگ سے راستے میں داخل ہو گئے۔ راستہ بتدریج بلندی کی طرف چلا گیا تھا۔ میں انہی وادیوں میں پلا تھا..... پہاڑی راستوں کی اُونچ نیچ میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ میں بے تکان چلتا رہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ایک ایسے غار کے دہانے پر پہنچ گئے جو بہت بڑے پتھروں اور درختوں سے ڈھکا ہوا تھا اور اِردگرد اُونچی جھاڑیاں تھیں۔ غار کا دہانہ اس طرح چھپا ہوا تھا کہ اُسے نہ تو فضا سے دیکھا جا سکتا تھا اور نہ ہی وادی سے۔

میرے اندازے کے مطابق اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ چٹانوں پر دُھوپ چمک رہی تھی۔

ہم جیسے ہی غار کے قریب پہنچے دو آدمی کہیں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ اُن دونوں کے پاس سب مشین گنیں تھیں اور اُن دونوں کے حلیے بھی بالے سے مختلف نہیں تھے۔ بڑھے ہوئے شیو، لمبے اور بے ترتیب بال اور لباس بھی خاصے میلے اور مسلے ہوئے تھے۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کئی دنوں سے یہ کپڑے اُن کے جسموں سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اُنہیں نہ تو کپڑوں کی پرواہ تھی اور نہ اپنے حلیوں کی۔ اُنہیں اپنے آپ سے نہیں اپنے کاز سے محبت تھی۔ کشمیر کی آزادی، اس وادی جنت نظیر کو غاصب اور درندہ فطرت ہندوؤں کے ناپاک وجود سے پاک کرنا۔ اُن کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ اپنی جانیں تو قربان کر دیں گے لیکن اس کاز سے منہ نہیں موڑیں گے۔

اُن دونوں نے بڑی گرمجوشی سے ہم تینوں سے ہاتھ ملایا پھر ایک تو وہیں کھڑا رہا اور دوسرا ہمیں اشارہ کرتا ہوا غار میں داخل ہو گیا۔ یہ تنگ سا غار تھا جو کئی فٹ تک سیدھا چلا گیا تھا۔ آگے کسی جگہ مدھم سی روشنی ہو رہی تھی اور اُس جگہ سے یہ غار دائیں طرف مُڑ گیا تھا۔ اس طرف سے یہ غار خاصا کشادہ تھا۔

اُس غار کو دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ فرش پر دو تین چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف بڑے سے پتھر پر رکھا ہوا سپرٹ لیمپ مسلسل جل رہا تھا۔ اُس کے قریب ہی مٹی کے تیل کا ایک چولہا اور کچھ برتن وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ تین کنستر اور کچھ ڈبے بھی رکھے ہوئے تھے جن میں غالباً راشن تھا۔ ایک کونے میں لکڑی کی تین پیٹیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

وہ سات آدمی تھے جو چٹائیوں پر نیم دراز تھے یا بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کا اسلحہ بھی اُن کے قریب پڑا ہوا تھا۔ وہ سب ہمیں دیکھ کر اُٹھ گئے اور بڑی گرمجوشی سے ہم تینوں سے ہاتھ ملایا۔ میں نے کمانڈر فیض علی کو پہچان لیا۔ وہ صحت مند اور دراز قامت آدمی تھا۔ بال اور شیو بڑھا ہوا، آنکھوں میں سرخی تھی جیسے کئی راتوں سے نہ سویا ہو۔

کمانڈر فیض علی بھی کئی مرتبہ ہمارے گاؤں آ چکا تھا۔ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اُس نے مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''تو مولوی رسول بخش لون کا بیٹا بھی ہماری صف میں شامل ہو گیا۔''

''ہاں بھئی..... اب یہ اس قابل ہو گیا ہے کہ دھرتی کے دشمنوں پر کاری ضرب لگا سکے۔'' کمانڈر رشید نے جواب دیا۔ ''ہمیں ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جن میں دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ ہو۔ اور اس میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک مجاہد میں ہونی چاہئیں۔

''ماشاءاللہ.....'' کمانڈر فیض علی بولا۔

اپنے بارے میں کمانڈر رشید کی رائے جان کر جو خوشی ہوئی اس کا اندازہ صرف میں ہی لگا سکتا ہوں۔

ہم لوگ چٹائیوں پر بیٹھ گئے۔ یہ مجاہدوں کی زندگی تھی۔ یہاں نہ کوئی بستر تھا نہ کوئی دوسری آسائش۔ پتھریلا فرش ہی اُن کا بستر تھا۔ کمانڈر فیض علی نے ایک لڑکے کو اشارہ کیا اُس نے اُٹھ کر مٹی کے تیل والا چولہا جلایا اور کیتلی میں چائے کا پانی رکھ دیا۔ کیتلی دُھویں سے بالکل سیاہ ہو رہی تھی۔

کمانڈر رشید، فیض علی کو سرینگر کے حالات سے آگاہ کر رہا تھا۔ اور میں اُن کی باتوں سے اندازہ لگا رہا تھا کہ فیض علی نہ صرف سرینگر بلکہ وادی کے دوسرے علاقوں کے حالات سے بھی بخوبی واقف تھا۔ اُن دنوں اننت ناگ اور پہل گام کی طرف بھارتی فوجیوں اور مجاہدین میں کچھ جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ ان کے بارے میں اُسے پوری معلومات حاصل تھیں۔ کس جھڑپ میں بھارتیوں کا کتنا نقصان ہوا، کتنے فوجی مجاہدین کے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے اور کتنے مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔

میں بڑے غور سے اُن کی باتیں سنتا رہا۔ اس دوران چائے بھی تیار ہو گئی۔ بغیر دودھ کا قہوہ بڑے ناپ تول سے بنایا گیا تھا اور بے حد خوش ذائقہ تھا۔

''ہاں..... اب بتاؤ! کیا صورتحال ہے؟ وہ فوجی کانوائے کس وقت پہنچ رہا ہے اور اس میں کیا کچھ شامل ہے؟'' کمانڈر رشید نے قہوے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

''گولہ بارود سے بھرے ہوئے چار ٹرک جن کی حفاظت کے لئے دو ٹرکوں پر مسلح فوجی بھی ہوں گے۔ ایک ٹرک آگے اور ایک پیچھے۔ اُن دونوں ٹرکوں پر لائٹ مشین گنیں فٹ ہوں گی۔'' کمانڈر فیض علی نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''پہلے اطلاع یہ تھی کہ یہ قافلہ آٹھ بجے یہاں سے گزرے گا لیکن اب تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ وہ قافلہ رات کو ٹھیک بارہ بجے سرینگر چھاؤنی سے روانہ ہو گا اور ایک بجے کے قریب اس جگہ سے گزرے گا۔ مصدقہ اطلاع ہے۔'' فیض علی نے جواب دیا۔ ''قافلے کے آگے پیچھے دو ٹرکوں پر چوبیس فوجی ہوں گے۔ بارہ آگے والے ٹرک پر اور بارہ پیچھے والے ٹرک پر۔''

''تم نے حملے کے لئے کون سی جگہ منتخب کی ہے؟'' کمانڈر رشید نے پوچھا۔

''یہاں سے چار میل آگے تقریباً ڈیڑھ سو گز طویل ایک تنگ سا راستہ ہے جس کے اختتام پر برساتی نالے کا پل ہے۔'' فیض علی نے جواب دیا۔ ''ہم اُس قافلے کو اُس راستے ہی میں گھیر لیں گے۔ اس طرح اُنہیں آگے یا پیچھے جانے کا موقع نہیں ملے گا۔''

''اچھا آئیڈیا ہے۔'' کمانڈر رشید نے سر ہلایا۔ ''لیکن کیا تمہارے پاس آدمی کم نہیں ہیں؟''

''آٹھ ہم لوگ ہیں اور تین آپ لوگ۔'' فیض علی نے جواب دیا۔ ''ہمارا ہر مجاہد دس دس بھارتی فوجیوں پر بھاری ہے۔ تم جانتے ہو ہم نفری کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ جنگ کے لئے نفری سے زیادہ جذبے اور شوق شہادت کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمارا ہر مجاہد اس جذبے سے سرشار ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس وادی میں مٹھی بھر مجاہدوں نے اپنے سے کئی گناہ طاقتور دشمن کو خاک وخون میں لوٹایا ہے۔''

''جانتا ہوں میرے بھائی۔'' کمانڈر رشید نے کہا۔ ''یہ جذبہ جہاد اور آزادی کی لگن ہی تو ہمیں آگے بڑھا رہی ہے۔ اگر یہ لگن اور جذبہ نہ ہوتا تو تحریک بہت عرصہ پہلے دم توڑ چکی ہوتی۔ لیکن اب وہ وقت دُور نہیں جب ہم ان غاصبوں کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے۔''

''انشاءاللہ.....'' قریب بیٹھے ہوئے مجاہدین نے بیک زبان کہا۔

''آپ سب لوگ ایک بات سن لیں!'' فیض علی نے مجاہدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کانوائے پر حملے کی منصوبہ بندی اس جگہ پر پہنچ کر کی جائے گی اور آپ سب لوگ کمانڈر رشید کے احکامات کے پابند ہوں گے اور اس مہم میں جام شہادت نوش کرنے والا ہم میں سب سے زیادہ خوش نصیب ہوگا۔'' وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوا پھر بولا۔ ''ایک بات آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ جنگ ہم اپنے کسی ذاتی مفاد کے لئے نہیں لڑ رہے۔ ہم آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ زنجیریں توڑ دینا چاہتے ہیں جن میں ہمیں برسوں سے جکڑ کر رکھا گیا ہے۔ ہم آزاد پیدا ہوئے ہیں اور آزاد رہیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں غلام نہیں بنا سکتی۔'' وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اُس کی نظریں مجاہدین کے چہروں پر پھسل رہی تھیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اُس کی آواز میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ہندو بنیئے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ طاقت کے بل بوتے پر ہمیں اپنا غلام بنالیں گے۔ ہماری قوم پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ بچوں اور بوڑھوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، نوجوانوں کو گولیوں سے چھلنی کیا جا رہا ہے اور ہماری ماؤں اور بہنوں کی عصمتیں تار تار کی جا رہی ہیں۔ لیکن اب یہ سب کچھ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ماؤں اور بہنوں کے دوپٹوں کی طرف اُٹھنے والا ہر ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ہمارے نوجوان اپنے سے کئی گناہ زیادہ طاقتور دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو رہے ہیں۔ نفری اور سامان کے حوالے سے ہمارا اُن کا کوئی مقابلہ نہیں لیکن ہمارے پاس جہاد کا جذبہ ہے۔ شوقِ شہادت ہے اور آزادی کی لگن ہے۔ یہی ہمارے وہ ہتھیار ہیں جن کا دشمن مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی جذبے نے ہمیں پہلے بھی کامیابیاں بخشی ہیں اور آج بھی ہم کامیاب وکامران ہوں گے۔ انشاءاللہ۔''

''انشاءاللہ.....!'' میرے منہ سے بھی بے اختیار نکلا۔

''ایک بات اور۔'' کمانڈر فیض علی بولا۔ ''اس کارروائی کے بعد کم از کم ایک ہفتے تک کوئی اس طرف کا رُخ نہیں کرے گا۔ یہ غار ہمارے چند محفوظ ترین ٹھکانوں میں سے ایک ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ دشمنوں کی نظروں میں آجائے۔ کارروائی کی تکمیل کے بعد سب لوگ مختلف علاقوں میں نکل جائیں گے اور آج سے ٹھیک آٹھویں دن ہم یہاں جمع ہوں گے۔''

سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ غار کے کونے میں رکھی ہوئی وہ تینوں پیٹیاں کھول لی گئیں۔ اُن میں ایمونیشن بھرا ہوا تھا۔ فیض علی مجاہدین میں ایمونیشن اور دستی بم تقسیم کرنے لگا۔

کمانڈر رشید نے ایک بیلٹ میری کمر پر باندھ دیا۔ اُس نے پہلے ایک سب مشین گن اُٹھائی اور مجھے اُس کے استعمال کا طریقہ سمجھانے لگا۔ سب مشین گن میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ پھر وہ ایک دستی بم اُٹھا کر مجھے سمجھانے لگا۔

''تمہارا ہاتھ اس پتری کے اُوپر ہونا چاہئے۔'' اُس نے ہینڈ گرنیڈ پر اُوپر سے نیچے کی طرف لگی ہوئی ایک فولادی پتری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''گرفت بہت مضبوط ہونی چاہئے۔ یہ پن کھینچنے کے بعد گرفت ڈھیلی ہوئی تو بم تمہارے ہاتھ میں ہی پھٹ جائے گا اور تمہارے پرخچے اُڑ جائیں گے۔'' وہ صحیح پن کھینچنے اور بم پھینکنے کا طریقہ سمجھانے لگا۔

مجھے دو ہینڈ گرنیڈ دیئے گئے تھے جو میں نے بیلٹ کے ہکوں میں اڑس لئے۔ سب مشین گن لوڈ تھی، چار فاضل میگزین بھی مجھے دے دیئے گئے۔ مجاہدین روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ سب سے آخر میں غار سے نکلنے والے مجاہد نے اسپرٹ لیمپ بجھا دیا تھا۔ میں جتنی دیر تک غار میں بیٹھا رہا اُن مجاہدین کی شکلیں دیکھتا رہا تھا۔ کمانڈر فیض علی کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی جبکہ دوسروں میں سے کسی کی عمر بھی چوبیس پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک لڑکا میرا تقریباً ہم عمر تھا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اور میں بھی اُس سے کچھ بے تکلف ہوگیا تھا۔ وہ دو سال سے چھاپہ مار کارروائیوں میں حصہ لے رہا تھا اور مجھے اپنے پچھلے کارناموں کے بارے میں بتا رہا تھا۔

راستہ بہت ہی کٹھن اور دُشوار تھا۔ ہم تقریباً تین گھنٹے تک چلتے رہے۔ فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن ہم پہاڑیوں میں طویل چکر کاٹتے ہوئے چل رہے تھے اور بالآخر اُس جگہ پہنچ گئے جو کمانڈر فیض علی نے فوجی قافلے پر حملے کے لئے منتخب کی تھی۔

کسی قافلے کو گھیرنے کے لئے یہ واقعی بہت آئیڈیل اور لاجواب جگہ تھی۔ وہ تنگ سا راستہ تقریباً ڈیڑھ سو گز طویل تھا۔

کمانڈر رشید اور فیض علی کچھ دیر تک اُس راستے، اُس کے گرد ونواح کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر کمانڈر رشید مجاہدین کو مختلف جگہوں پر تعینات کرنے لگا۔ کچھ مجاہدین کو سڑک کے دوسری طرف بھیج دیا گیا تھا۔ دو لڑکوں کو راستے کے اختتام پر برساتی نالے کے پل کے دونوں طرف تعینات کر دیا گیا تھا۔ جبکہ دو مجاہدین نے راستے کے دوسری طرف پوزیشنیں سنبھال لیں تاکہ واپسی کا راستہ بھی مسدود کیا جا سکے۔

راستے کو پوری طرح گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔ قافلے کے اس راستے میں داخل ہونے کے بعد کسی کے زندہ بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تمام مجاہدین کو سختی سے یہ ہدایت کر دی گئی

تھی کہ جب تک کمانڈر رشید سگنل نہ دے کوئی بھی فائر نہ کھولے۔ میں کمانڈر رشید کے ساتھ تھا۔ ہم نے بیٹھنے کے لئے سڑک سے تقریباً آٹھ فٹ اُوپر پتھروں میں ایسی جگہ منتخب کی تھی کہ اگر سڑک پر سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپ کی روشنی بھی پڑ جاتی تو ہم نظروں میں نہیں آسکتے تھے۔

ہمارے چاروں طرف گہری تاریکی اور سناٹا تھا۔ کمانڈر رشید تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُچک کر سڑک کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا اور پل پر کسی گاڑی کے انجن کی مدھم سی آواز سن کر میں چونک گیا۔ کمانڈر رشید نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔ وہ ایک بار پھر اُچک کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ ایک سے زیادہ گاڑیوں کی آوازیں تھیں جو کبھی تو قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتیں اور کبھی ہوا کے دوش پر بہت دُور چلی جاتیں۔ اور پھر بہت دُور متحرک روشنیاں دکھائی دینے لگیں..... اُس طرف سڑک غالباً بل کھائی ہوئی تھی جس کی وجہ سے روشنیوں کے زاویئے بھی بار بار بدل رہے تھے۔ میں پوزیشن لے کر بیٹھ گیا اور سب مشین گن کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ وہ روشنیاں بتدریج قریب آتی جا رہی تھی۔ اُس وقت مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ سنسنی کی لہریں پورے بدن پر برقی رو کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ رائفل پر میری گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی..... کمانڈر رشید نے میری طرف دیکھا، میرا کندھا تھپتھپایا اور مجھ سے چند گز دُور چلا گیا۔

روشنیاں قریب آتی جا رہی تھیں۔ اور پھر یہ قافلے کا پہلا ٹرک راستے میں داخل ہو گیا۔ پچھلے ٹرک کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ایک ٹرک پر سوار بھارتی فوجی صاف نظر آ رہے تھے۔ ایک لائٹ مشین گن ٹرک کے سامنے کے رُخ پر نصب تھی، ایک دائیں اور ایک بائیں طرف۔ گن مین مستعد کھڑے تھے۔ باقی فوجی بھی سب مشین گنیں سنبھالے چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔

پچھلے چار ٹرکوں پر ترپالیں پڑی ہوئی تھیں۔ سب سے آخر والے ٹرک پر بھی اُسی طرح چاروں طرف لائٹ مشین گنیں فٹ تھیں۔ پہلا ٹرک راستے کے اختتام کی طرف بڑھ رہا تھا کہ آخری ٹرک بھی راستے میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈر رشید کی چنگھاڑتی ہوئی آواز فضا میں گونج اُٹھی۔

''فائر.....''

فضا ایک دم فائرنگ اور دھماکوں کی آواز سے گونج اُٹھی..... کانوائے کے ٹرکوں پر چاروں طرف سے آگ برسنے لگی۔ برساتی نالے کے پل کے ساتھ تعینات مجاہدین کی فائرنگ سے قافلے کے اگلے ٹرک کے ٹائر دھماکوں سے پھٹ گئے۔ وہ ٹرک لڑکھڑایا اور پیچھے آنے والے ٹرک ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے.....

ہماری طرف سے اچانک فائرنگ شروع ہوتے ہی ٹرکوں کے ڈرائیور گڑبڑا گئے تھے۔ ٹرک بے قابو ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے تو ٹرکوں پر سوار فوجی بھی اس اچانک افتاد پر بدحواس

ہو گئے۔ مجاہدین کی طرف سے اس قسم کی کوئی کارروائی اُن کے لئے غیر متوقع نہیں رہی ہو گی۔ وہ یقیناً بہت محتاط تھے مگر ہمارا یہ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ اُنہیں فوری طور پر سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور جب وہ سنبھلے تو اُن کے کئی ساتھی جہنم رسید ہو چکے تھے۔

میں سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔ رائفل پر میری گرفت بہت مضبوط تھی۔ میں نے ٹرائیگر دبا دیا..... تڑتڑاہٹ کی آواز میرے کانوں کے قریب گونجتی چلی گئی۔ میری رائفل سے نکلنے والے انگارے ٹرکوں کی طرف لپک رہے تھے۔ ایک ٹرک کا ڈرائیور نیچے اُترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے رائفل کا رُخ اُس طرف موڑ دیا کئی گولیاں اُس کے جسم میں پیوست ہو گئی تھیں..... وہ ٹرک کے کھلے ہوئے دروازے سے قلابازی کھاتا ہوا نیچے گرا اور خاک و خون میں لوٹنے لگا۔

وہ میرا پہلا شکار تھا۔ اس پہلی کامیابی پر میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا۔

ٹرکوں پر نصب مشین گنیں بھی اب لڑکھڑا رہی تھیں۔ کئی گولیاں میرے سر کے اُوپر سے گزرتی ہوئی چٹان میں لگ رہی تھیں۔ پتھر کے ٹکڑے اُڑ اُڑ کر میرے اُوپر گر رہے تھے۔

کمانڈر رشید فائرنگ کرتا ہوا مجھ سے کئی گز دُور نکل گیا تھا۔ میں اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ بھارتی فوجی اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ایک گنر نے میری پوزیشن کا اندازہ لگا کر اپنی گن کا رُخ اس طرف موڑ دیا اور لاتعداد گولیاں میرے پاس بڑے پتھروں پر لگنے لگیں۔ پتھر کا ایک اُڑتا ہوا ٹکڑا بائیں کندھے سے ذرا نیچے میرے بازو پر لگا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نے اُس ہاتھ سے اپنا زخمی بازو تھام لیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید گولی لگی ہے۔ لیکن اگر گولی لگتی تو میرا بازو حرکت کے قابل نہ رہتا۔ گولیاں اب بھی میرے چاروں طرف برس رہی تھیں۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ دل کی دھڑکن قابو سے باہر ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اُٹھ کر یہاں سے بھاگ جاؤں۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تو میرا جسم گولیوں سے چھلنی ہو جائے گا۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف فضا میں انگارے سے ناچتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے کمانڈر رشید کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے ایک بار پھر قدرے زور سے پکارا۔ میری آواز حلق میں اٹکی ہوئی سی تھی لیکن اس مرتبہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ کمانڈر رشید کی چیختی ہوئی آواز چند گز کے فاصلے سے سنائی دی۔ ''ٹھہرو..... ری ٹریٹ۔'' وہ چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''پیچھے ہٹتے جاؤ! اُوپر جانے کی کوشش کرو!''

میں نے رائفل سنبھال لی اور رینگتا ہوا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اب مجھے پتہ چلا تھا کہ جنگ کا محاذ کیا ہوتا ہے اور ہمارے مجاہدین کس طرح اپنی زندگیاں داؤ پر لگا کر آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں؟ اب مجھے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ آزادی کس طرح حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے لئے خون بہانا پڑتا ہے۔ نسلیں قربان کرنی پڑتی ہیں۔

میں سینے کے بل رینگتا ہوا پتھروں کی آڑ میں تقریباً دس گز پیچھے چلا گیا۔ اب آگے ایسی جگہ تھی کہ کھڑے ہونا ضروری تھا۔ اور جیسے ہی میں نے اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کی ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے کان کے قریب سے گزر گئی۔ میں ایک دم نیچے گر گیا۔ میرا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا تھا۔ موت مجھ سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی تھی لیکن میں اب بھی محفوظ نہیں تھا۔

دفعتہً ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا..... ہمارے کسی مجاہد نے ہینڈ گرنیڈ پھینکا جو ایک ٹرک کے قریب سڑک پر گر کر پھٹا لیکن وہ بم ٹرک کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکا تھا۔ مجھے بھی دستی بم کا خیال آ گیا۔ میرے پاس دو دستی بم تھے۔ میں نے ایک بم بیلٹ سے نکال لیا، رائفل کو زمین پر رکھ دیا۔ سیدھے ہاتھ میں بم کو مضبوطی سے گرفت میں لیا۔ اُلٹے ہاتھ کی اُنگلی پن کے رنگ میں ڈال کر اُسے ایک جھٹکے سے باہر کھینچا۔ بم پر میری گرفت اور مضبوط ہو گئی تھی۔ میرے جسم کے مسام بڑی تیزی سے پسینہ اُگل رہے تھے۔ پھر میں نے بم کو پوری قوت سے ایک ٹرک کی طرف اُچھال دیا..... فولادی پتری کے بم سے الگ ہونے سے ایک آواز اُبھری۔ میں دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر نیچے جھک گیا اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا..... اس دھماکے میں کئی انسانی چیخیں بھی شامل تھیں۔

میرا پھینکا ہوا ہینڈ گرنیڈ اُس ٹرک پر گرا تھا جس پر مشین گنیں فٹ تھیں۔ میرے بم نے نہ صرف اُن کی مشین گنیں خاموش کرا دیں بلکہ اُس ٹرک میں موجود فوجیوں کے بھی چیتھڑے اُڑا دیئے۔ میں نے اپنی رائفل اُٹھائی اور پہاڑی پر اُوپر کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ اور پھر ایک اور زوردار دھماکہ ہوا..... اور پھر یوں لگا جیسے اُس جگہ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو..... پے در پے دھماکے ہونے لگے..... دھرتی کانپ اُٹھی۔

میں لڑکھڑا کر گرا، لیکن دوسرے ہی لمحہ سنبھل کر چٹانوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ گولہ بارود سے لدے ہوئے چاروں ٹرک دھماکوں سے پھٹ پڑے تھے۔ ٹرکوں پر لدے ہوئے گولہ بارود آتش بازی کی طرح پھٹ کر چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ راکٹ چل رہے تھے..... آگ کے شعلے چاروں طرف اُترتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

میں ایک چٹان نما پتھر کی آڑ میں رُک کر نیچے دیکھنے لگا۔ بہت دُور کئی روشنیاں متحرک نظر آئیں۔ گولہ بارود سے لدے ہوئے یہ ٹرک اُس طرف سے آئے تھے۔

''شمروز! کہاں ہو تم؟'' چند قدم کے فاصلہ پر کمانڈر رشید کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میں یہاں ہوں کمانڈر!'' میں نے بھی چیخ کر جواب دیا۔

چند سیکنڈ بعد ہی کمانڈر رشید دوڑتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔

''بھاگو شمروز!'' وہ چیخا۔ ''اس طرف.....''

پے در پے دھماکے بدستور ہو رہے تھے۔ آسمان پر بھی شعلے پھیلتے جا رہے تھے پہاڑیوں لرز رہی تھیں..... میرے اُوپر کچھ ایسی دہشت سی طاری ہوئی تھی کہ مجھ سے دوڑا ابھی نہیں جا رہا تھا۔ اور پھر کمانڈر رشید نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا اُس کے ساتھ دوڑتا رہا۔

''بھارتی فوجیوں کا ایک اور کانوائے سرینگر کی طرف سے آ رہا ہے۔'' کمانڈر رشید دوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''اُس کانوائے میں گولہ بارود کا کوئی ٹرک نہیں ہو گا۔ صرف فوجی ہوں گے۔ رات کو تو وہ کچھ نہیں کر سکیں گے مگر صبح کی روشنی ہوتے ہی چاروں طرف پھیل جائیں گے۔ اُس وقت تک ہمیں یہاں سے بہت دُور نکل جانا ہو گا۔''

''اور ہمارے دوسرے ساتھی کمانڈر!'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''وہ لوگ نکل جائیں گے۔ تم اُن کی فکر مت کرو!'' کمانڈر رشید نے کہا۔

دھماکے بدستور ہو رہے تھے۔ چار ٹرکوں میں بھرا ہوا گولہ بارود پھٹ رہا تھا۔ آسمان پر پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ اور پھر ایک فائر کی آواز سنائی دی جو اُن دھماکوں سے مختلف تھی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا ایک گولی روشنی کی لکیر سی چھوڑتی ہوئی بلندیوں کی طرف جا رہی تھی۔ اور پھر وہ گولی بہت اُوپر جا کر پھٹ گئی۔ میرا خیال تھا کہ چنگاریاں سی پھوٹیں گی اور پھر تاریکی چھا جائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

وہ لائٹ فائر تھا۔ زرد روشنی کا ایک پنڈولہ سا جو آسمان پر تیرنے لگا تھا۔ روشنی کافی تیز تھی۔ آس پاس کی پہاڑیاں روشن ہو گئیں اور پھر فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بعد میں آنے والے بھارتی فوجی لائٹ فائر کی روشنی میں آٹو میٹک ہتھیاروں سے فائرنگ کرتے ہوئے پہاڑیوں پر چڑھ رہے تھے۔

مگر کمانڈر رشید کا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ بھارتی فوجی رات کے وقت کچھ نہیں کر سکیں گے۔ فائرنگ ایک ہی جگہ پر محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ بزدل بھارتیوں نے پہاڑیوں میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں کمانڈر رشید کے ساتھ دوڑتا رہا۔ اب اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور میں اُس سے چند گز پیچھے رہ گیا تھا۔ ایک گھنٹے تک مسلسل دوڑتے رہنے سے میرا سانس پھول گیا اور قدم لڑکھڑانے لگے۔ میں کمانڈر رشید کا ساتھ دینے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور دھڑام سے پتھروں پر گرا.....

میرے گرنے کی آواز سن کر کمانڈر رشید رُک گیا۔ اُس نے پہلے مُڑ کر دیکھا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

''کیا ہوا شمروز؟'' وہ مجھے اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''اب مجھ سے بالکل نہیں چلا جاتا کمانڈر!'' میں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ ''چند منٹ..... صرف چند منٹ یہاں رُک جاؤ!''

''یہاں نہیں.....'' کمانڈر رشید نے جواب دیا۔ ''یہاں سے کچھ آگے ایک چشمہ ہے۔ ہم

وہاں تھوڑی دیر کے لئے رُک جائیں گے۔''

مگر میری ٹانگوں میں تو کھڑے رہنے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ چلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری یہ حالت دیکھ کر کمانڈر رشید کو چند منٹ وہاں رُکنا پڑا اور وہ بھی ایک پتھر پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ مسلسل بھاگتے رہنے سے میرے پھیپھڑے جیسے پھٹے جا رہے تھے۔ سینے میں درد ہونے لگا تھا۔ منہ سے کف بہہ رہا تھا..... میں تقریباً پانچ منٹ تک بے سدھ سا پڑا گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔

میری حالت کسی قدر سنبھلی تو میں نے آستین کے ساتھ منہ سے بہنے والا کف صاف کیا اور رائفل سنبھالتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کمانڈر رشید نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور ہم ایک بار پھر چلنے لگے۔

وہ چشمہ تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ دُور دُور تک چنار کے درخت تھے۔ چشمہ کے آس پاس کچھ پھل دار درخت بھی تھے لیکن رات کی تاریکی میں اُن درختوں کی شناخت ممکن نہیں تھی۔ چشمے کے کنارے پر بیٹھ کر میں نے پہلے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور پھر جی بھر کے پانی پیا اور ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

کمانڈر رشید چشمہ کے کنارے پر بیٹھا منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ سبزے کی وجہ سے خنکی بڑھ گئی تھی۔ مجھے کچھ ٹھنڈی لگنے لگی۔

''بیٹھے رہو گے تو سردی لگے گی..... چلتے رہو گے تو خون میں کچھ گرمی پیدا ہو گی۔'' کمانڈر رشید نے کہا۔ میں اُس کا مطلب سمجھ گیا اور اُٹھ کر اُس کے ساتھ چلنے لگا۔

دو گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ہم نشیب میں پھیلی ہوئی ایک وادی میں نکل آئے۔ تھوڑی دیر کے لئے ایک جگہ پر رُکے اور پھر چلنے لگے۔

ایک بڑی خوشگوار سی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہمارے آس پاس دھان کے کھیت ہیں۔ جس کا مطلب تھا کہ کوئی آبادی بھی قریب ہی تھی۔

مگر ڈیڑھ گھنٹے تک مزید چلتے رہنے کے بعد بھی کسی آبادی کے آثار دکھائی نہیں دیئے۔ ہم رُکے بغیر چلتے رہے۔

صبح کا اُجالا پھیلنے لگا۔ اب کچھ فاصلے کی چیزیں دکھائی دینے لگیں۔ روشنی نمایاں ہوتی گئی۔ ہمارے چاروں طرف دھان کے کھیت تھے اور اُن کھیتوں میں کہیں کہیں درخت بھی کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ بہت دُور ایک جگہ سے دُھویں کی سرمئی لکیر سی اُٹھتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ میں نے کمانڈر رشید کو اُس کی طرف متوجہ کیا تو وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''وہی ہماری منزل ہے.....''

''میں سمجھا نہیں.....؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے کمانڈر رشید کی طرف دیکھا۔

''اُس پہاڑی کے پیچھے ایک مکان ہے۔ اور وہ مکان ہی ہماری منزل ہے۔'' کمانڈر رشید نے جواب دیا۔

اُس منزل تک پہنچنے کے لئے ہمیں مزید ایک میل کا فاصلہ طے کرنا پڑا۔ وہ پہاڑی ایک ٹیلے کی طرح تھی جیسے کوئی بہت بڑا پیالہ اوندھا کر کے رکھ دیا گیا ہو۔ اس کے دوسری طرف ڈھلان پر لکڑی کا ایک مکان بنا ہوا تھا۔ اُس سے ذرا ہٹ کر بہت بڑی جگہ کانٹے دار جھاڑیوں کی باڑ سے گھری ہوئی تھی، جس کے ایک حصے میں دو خچر اور ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ جبکہ دوسرے حصے میں لاتعداد بھیڑیں اور چند بکریاں نظر آ رہی تھیں۔

مکان کے آس پاس اخروٹ اور خوبانی کے چند درخت تھے۔ اخروٹ کے درخت کے نیچے ایک گدھا بھی بندھا ہوا تھا۔ مکان دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ سنگل تھا اور دوسرا ڈبل سٹوری۔ سنگل حصے کی چھت پر ایک جگہ چمنی سے دُھواں خارج ہو رہا تھا۔

ہم جیسے ہی آگے بڑھے پتہ نہیں کہاں سے ایک کتا نکل کر خونخوار انداز میں بھونکتا ہوا ہماری طرف لپکا۔ میں ایک دم گھبرا سا گیا۔ وہ خاصا قد آور کتا تھا اور دیکھنے میں بھی بڑا خوفناک اور خونخوار لگ رہا تھا۔

کمانڈر رشید کتے سے بالکل خوفزدہ نہیں ہوا، اُس نے ٹائیگر کہہ کر کتے کو پچکارا، کتے نے بھونکنا بند کر دیا اور کمانڈر رشید کے قریب پہنچ کر اُس کے آگے پیچھے دُم ہلانے لگا۔ البتہ میری طرف دیکھ کر وہ اب بھی ہولے ہولے غرانے لگتا تھا۔

مکان کا دروازہ دوسری طرف تھا۔ اُس طرف عقبی کھڑکیاں تھیں۔ کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر اندر سے کسی نے کھڑکی کھول کر جھانکا اور پھر کھڑکی بند ہو گئی۔

ہم مکان کے دوسری طرف آ گئے۔ ایک طرف مکان سے کچھ فاصلے پر بہت بڑا شیڈ بنا ہوا تھا جس میں بھوسے کی بوریاں اور کھیتی باڑی میں استعمال ہونے والے آلات رکھے ہوئے تھے۔ میں اُس شیڈ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ بوڑھا مکان سے نکل کر باہر آ گیا۔ اُس کی عمر ساٹھ سے کچھ اُوپر ہی ہو گی۔ سفید نوک دار داڑھی، سر کے بال بھی برف کی طرح سفید تھے جو سیاہ کپڑے کی ٹوپی سے جھانک رہے تھے۔

اُس بوڑھے نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں اندر لے گیا۔ اندر ایک ادھیڑ عمر عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ اُس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہو گی۔ ڈھیلا ڈھالا سا لباس پہن رکھا تھا، سر پر سیاہ رنگ کا ایک تکونا اسکارف بندھا ہوا تھا۔ عمر سے قطع نظر جسمانی طور پر وہ خاصی پُرکشش تھی۔

وہ ہمیں اُس مکان کے ایک ایسے کمرے میں لے آئے جہاں فرش پر بھیڑ کے بالوں سے بنے گدے بچھے ہوئے تھے۔ ایک طرف سات آٹھ سال کا ایک بچہ سو رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔

ایک طرف آتش دان میں آگ روشن تھی۔ قریب ہی چائے کی ایک کیتلی رکھی ہوئی تھی اور پیالوں میں چائے بھی موجود تھی۔ میرا خیال ہے وہ دونوں ہمارے آنے سے پہلے چائے پی رہے تھے۔ ہم اُن کے ساتھ آتش دان کے سامنے گدے پر بیٹھ گئے۔ عورت نے ہمارے سامنے پیالیاں رکھ کر اُن میں چائے اُنڈیل دی۔

ہمارا یہاں جس طرح استقبال ہوا تھا اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ کمانڈر رشید اُن لوگوں کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ کمانڈر رشید نے میرا بھی اُن سے تعارف کرا دیا اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ بوڑھا میرے والد مولوی رسول بخش کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

''بہت عرصہ ہو گیا رسول بخش سے ملے ہوئے۔'' اُس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب تو بوڑھا ہو گیا ہو گا میری طرح۔''

''جی ہاں..... آپ نے ٹھیک کہا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہم نے نویں اور دسویں جماعتیں سرینگر کے مسلم ہائی سکول میں اکٹھے ہی پڑھی تھیں۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''اس کے بعد میں دِلّی چلا گیا اور وہ سوپور کا ہو کر رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں دِلّی میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کروں گا لیکن یہاں ایک حادثے میں میرے والد کا انتقال ہو گیا اور مجھے واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد بھی رسول بخش سے چند ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ مگر اب تو کئی برسوں سے ہم نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔''

وہ عبدالغنی تھا۔ دیر تک پرانے وقتوں کی یادیں تازہ کرتا رہا۔

''جب ہندوستان اور پاکستان کا بٹوارہ ہوا تو میں تمہاری عمر کا تھا۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''کشمیری مسلمان پاکستان سے الحاق کرنا چاہتے تھے۔ مگر مہاراجہ گلاب سنگھ تو کشمیر کا سودا پہلے ہی کر چکا تھا۔ اگر کشمیر کے مسلمانوں میں اُس وقت اتحاد ہوتا تو آج کشمیر اور جموں بھی پاکستان کا حصہ ہوتا۔ مگر بعض کشمیری لیڈر ہی غدار نکلے۔ اپنے ذاتی مفاد اور اقتدار کے لئے وہ ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگاتے اور ہندو لیڈروں کی چاپلوسی کرتے رہے۔ اُن کشمیری مسلمان لیڈروں کی غداری کی وجہ سے آج یہ وادی جل رہی ہے۔ یہ تو نسل در نسل غدار ہیں۔ ان کی اولاد آج بھی اپنے اقتدار کے لئے ہندوؤں کی غلامی کر رہی ہے۔ وہ کشمیر کے سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ مگر کشمیری اب بیدار ہو چکے ہیں۔ اب وہ کسی فریب میں نہیں آئیں گے۔ اب تو آزادی سے کم کسی بات پر سمجھوتہ نہیں ہو گا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم جیسے نوجوان آزادی کی اس تحریک میں شامل ہیں۔ جذبہ زندہ ہو تو منزل تک پہنچنا مشکل نہیں ہوتا۔''

عبدالغنی کے بارے میں انکشاف ہوا کہ وہ خود بھی ماضی میں تحریک آزادی کا سرگرم کارکن رہ چکا ہے۔ اُس کے جسم پر زخموں کے کئی نشان تھے۔ تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوئے وہ کئی مرتبہ پکڑا گیا تھا۔ بے پناہ تشدد برداشت کیا تھا مگر اپنے کاز سے غداری نہیں کی تھی۔

عبدالغنی میں بھاگ دوڑ کی سکت نہ رہی تو اُس نے اپنے دو جوان بیٹے تحریک کے سپرد کر دیئے۔ دونوں کئی برسوں تک بھارتی بھیڑیوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ چند سال پہلے بڑا بیٹا ایک چھاپہ مار کارروائی میں شہادت کے رتبے پر فائز ہوا اور تین سال پہلے چھوٹا بیٹا بھی ایسی ہی ایک کارروائی میں وطن کی آن پر قربان ہو گیا۔

سکینہ عبدالغنی کی بہو تھی۔ اور بستر پر گہری نیند سویا ہوا چھ سات سال کی عمر کا وہ بچہ اُس کا پوتا تھا۔ عبدالغنی بڑی بے چینی سے اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب اپنے پوتے کے ہاتھ میں بندوق تھما کر بھارتی غاصبوں کے گندے وجود سے اس دھرتی کو پاک کرنے کے لئے اپنی دُعاؤں کے سائے میں رخصت کر سکے۔

چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد سکینہ نے ناشتہ بنا دیا۔ اس دوران وہ بچہ بھی جاگ گیا تھا۔ سکینہ اُسے اُٹھا کر باہر لے گئی، وہ پندرہ منٹ بعد اُسے منہ دُھلا کر واپس لے آئی۔ عبدالغفور نام کا وہ بچہ کمانڈر رشید سے بھی خاصا بے تکلف تھا۔ وہ اُس کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔

رات بھر جاگنے اور بھاگ دوڑ میں بری طرح تھک گیا تھا۔ نیند کے جھونکے آ رہے تھے مگر میں بڑی مشکل سے آنکھیں کھولے بیٹھا تھا۔

یہ میری زندگی کا خوفناک ترین تجربہ تھا۔ مجاہدین اور بھارتی فوجیوں کی جھڑپوں کے بارے میں تو آئے دن سنتا ہی رہتا تھا۔ یہ بھی پتہ چلتا رہتا تھا کہ کس جھڑپ میں کتنے بھارتی فوجی مجاہدین کے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے اور کتنے مجاہدین شہید ہوئے اور گزشتہ رات میں خود ایک ایسی چھاپہ مار کارروائی میں شریک تھا جس کے بارے میں خبر وادی میں پھیل گئی ہو گی۔

ہم نے بھارتی فوج کے اُس قافلے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا۔ گولہ بارود کے لدے ہوئے چار ٹرک تباہ ہوئے تھے اور کم از کم چوبیس فوجی تھے جو سب کے سب ختم ہو گئے تھے۔ ممکن ہے ایک دو فوجی بچ بھی گئے ہوں۔

میں اپنے آپ میں فخر و انبساط کی ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اس قسم کی کسی چھاپہ مار کارروائی میں حصہ لینے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ میرے چاروں طرف موت برس رہی تھی اور میں نے کسی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور پہلا بھارتی فوجی تھا جو میری گولیوں کا نشانہ بنا تھا اور پھر میرے پھینکے ہوئے ہینڈ گرنیڈ نے ٹرک سے مجاہدین پر فائرنگ کرنے والے کئی فوجیوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔

''تمہیں نیند آ رہی ہے۔'' سکینہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرے ساتھ اُوپر آؤ! اُوپر کمرہ خالی ہے۔ آرام سے سو جانا۔''

میں نے کمانڈر رشید کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر سکینہ کے ساتھ چل پڑا۔ میں نے اپنی رائفل بھی اُٹھا لی تھی۔ اُوپر جانے کے لئے سیڑھیاں مکان کے اندر ہی سے تھیں۔ سکینہ مجھے جس کمرے میں لے کر آئی اُس کی کھڑکیاں مشرق کی طرف تھیں جو کھلی ہوئی تھیں اور باہر دُھوپ

چمک رہی تھی۔ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ بستر پر گرتے ہی سو گیا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر تک سویا ہوں گا کہ سکینہ نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔

''اُٹھو..... جلدی کرو!'' وہ مجھے بازو سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے چیخی۔ ''وہ درندے اِس طرف آ رہے ہیں۔''

میں ایک جھٹکے سے اُٹھ گیا۔ کھڑکی کے باہر دیکھا تو بہت دُور ایک ٹیلے کی ڈھلان سے دُھول اُڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ دو جیپیں تھیں جو دُھول اُڑاتی ہوئی ٹیلے کی ڈھلان سے اُتر رہی تھیں۔ میرے خیال میں فاصلہ نصف میل سے کچھ زیادہ ہی تھا۔

میں نے جلدی سے اپنے جوتے پیروں میں پھنسائے، بیلٹ اُٹھا کر کمر سے باندھا اور رائفل اُٹھاتے ہوئے سکینہ کے ساتھ دروازے کی طرف لپکا اور تیزی سے سیڑھیاں اُترنے لگا۔

جب ہم مکان سے باہر نکلے تو کمانڈر رشید اور بوڑھا عبدالغنی سامنے والے شیڈ میں ایک جگہ رکھی ہوئی بھوسے کی بوریاں ہٹا رہے تھے۔ سکینہ بھی اُن کی مدد کرنے لگی۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

بھوسے کی بوریوں کے نیچے ایک تخت تھا جسے عبدالغنی اور کمانڈر رشید نے ہٹا دیا۔ اُس تختے کے نیچے تنگ سی سیڑھیاں تھیں۔ پہلے میں نیچے اُترا اور پھر کمانڈر رشید اندر آ گیا۔ عبدالغنی نے تختہ اُوپر رکھ دیا اور پھر شاید وہ اور سکینہ بھوسے کی بوریاں تختے کے اُوپر رکھنے لگے۔

تہہ خانہ بہت بڑا تھا اور یہ جگہ بھی کمانڈر رشید کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ کیونکہ سیڑھیوں سے اُترتے ہی اُس نے ایک طرف رکھی ہوئی لالٹین جلا لی تھی۔ ہم دونوں تہہ خانے کے آخری حصے میں چلے آئے۔ یہاں اسلحے سے بھری ہوئی سات آٹھ پیٹیاں دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہم دونوں ایک بار پھر سیڑھیوں کے قریب آ کر کھڑے ہوئے۔ رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تیار تھیں۔

کمانڈر رشید کے کہنے کے مطابق یہ تہہ خانہ اگرچہ محفوظ تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ اگر بھارتی فوجیوں کو اس کا پتہ چل گیا تو یہ ہمارے لئے چوہے دان ثابت ہوگا۔

بند ہونے کے باوجود اس تہہ خانے میں گھٹن کا احساس نہیں تھا۔ کہیں نہ کہیں ہوا کی آمد و رفت کا راستہ ضرور تھا۔

تقریباً دو گھنٹے گزر گئے۔ باہر کی کوئی آواز ہمیں سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ اُوپر کیا ہو رہا ہے؟ اور پھر اپنے سروں پر آہٹ سن کر ہم چونک گئے۔ ہم دونوں نے سیڑھیوں کے دونوں طرف پوزیشن سنبھال لی۔ میں دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔ میری رائفل کا رُخ اُوپر کی طرف تھا۔

آہٹ کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو رہی تھی۔ رائفل پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ اُنگلی ٹریگر پر جمی ہوئی تھی اور نظریں اُوپر تختے پر تھیں۔

تختہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے حرکت کرنے لگا اور پھر سکینہ کی آواز سنائی دی۔

''بابا! تم چھوڑ دو..... میں اُٹھا رہی ہوں۔''

اُس کی آواز پُرسکون تھی جس کا مطلب تھا کہ اُوپر صورتحال نارمل تھی اور خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ تختہ اُوپر سے پوری طرح ہٹ گیا اور روشنی اندر تک آئی۔

''باہر آ جاؤ..... وہ لوگ چلے گئے۔'' سکینہ کی آواز سنائی دی۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور رائفل پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ کمانڈر رشید نے مجھے اشارہ کیا۔ میں دوڑ کر لالٹین اُٹھا لایا اور اُسے سیڑھیوں کے قریب رکھ دیا..... ہم دونوں باہر آ گئے۔ تختہ برابر کر کے اُس پر ایک بار پھر بھوسے کی بوریاں رکھ دی گئیں۔

عبدالغنی اور سکینہ کی حالت دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ عبدالغنی کی دائیں آنکھ کے نیچے سیاہ دھبہ سا نظر آ رہا تھا۔ سکینہ کی قمیض دائیں کندھے سے پھٹی ہوئی تھی اور اُس کا ایک جبڑا بھی سوجا ہوا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہمارے بارے میں پوچھنے کے لئے اُنہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

''عبدالغفور کہاں ہے؟'' میں نے بے اختیار پوچھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''وہ محفوظ ہے بیٹا! تم اُس کی فکر مت کرو۔'' عبدالغنی نے جواب دیا۔

ہم مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ عبدالغنی ہمیں اُن فوجیوں کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگے۔ اُن فوجیوں کو ایسے اگروادیوں (دہشت گرد) کی تلاش تھی جنہوں نے گزشتہ رات سرینگر گلمرگ ہائی وے پر ایک کانوائے پر حملہ کر کے ایک میجر سمیت اُنتیس فوجیوں کو ہلاک اور گولہ بارود کے چار ٹرکوں کو تباہ کر دیا تھا۔

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس قافلے میں چوبیس فوجی شامل تھے اور پانچ ڈرائیوروں کو ملا کر اُن کی تعداد اُنتیس ہو جاتی تھی جو سب کے سب جہنم واصل ہو چکے تھے۔

ہمارا کوئی مجاہد نہ تو زخمی ہوا تھا نہ شہید۔ کمانڈر رشید نے قافلہ پر حملہ کی پلاننگ اس طرح کی تھی کہ ہمارے کسی آدمی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ سب کے سب محفوظ ٹھکانوں پر پہنچ چکے ہوں گے۔ لیکن یہ بھارتی درندے جس طرح ہماری تلاش میں بستیوں میں گھوم رہے تھے اس سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ کئی بے گناہ اُن کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ یہ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو بھی نہیں بخشیں گے۔ اُنہیں بھی تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا۔ عبدالغنی اور سکینہ کی مثال تو میرے سامنے تھی۔ اُنہیں مارا پیٹا گیا تھا۔ سکینہ کی زبان پر حرف شکایت تک نہیں آیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد عبدالغفور بھی آ گیا۔ وہ ذہین بچہ تھا۔ بھارتی فوجیوں کی آمد پر سکینہ نے اُسے کھیتوں کی طرف بھگا دیا تھا اور وہ اپنے کتے کے ساتھ اڑھائی تین گھنٹوں تک کھیتوں میں چھپا رہا تھا۔

عبدالغنی کی اپنی زندگی جہاد کرتے ہوئے گزری تھی۔ اُس نے اپنے دو بیٹے بھی وطن کی آزادی کے لئے قربان کر دیئے تھے۔ اُس کا جذبہ جہاد اب بھی کم نہیں ہوا تھا۔ وہ مجاہدین کو پناہ دیتا رہتا تھا اور ہر ممکن طور پر اُن کی مدد کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اپنے شیڈ والے تہہ خانے میں اسلحہ بھی جمع کرتا رہتا تھا جو وقتاً فوقتاً مجاہدین تک پہنچا دیا جاتا تھا۔

ہمیں تین دن تک وہاں رہنا پڑا۔ اس دوران اُس طرف آنے والے مختلف لوگوں سے ہمیں خبریں ملتی رہیں۔ اُس معرکہ میں حصہ لینے والا کوئی بھی مجاہد تو بھارتیوں کے ہاتھ نہیں آیا البتہ بھارتی درندے بے گناہوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بناتے رہے۔

اور پھر چوتھے روز ہمیں یہ افسوس ناک اطلاع ملی کہ سرینگر سے پانچ میل دُور ایک چھوٹی سی بستی میں کمانڈر فیض علی اور اُس کے دو ساتھی بھارتی فوجیوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں شہید ہو گئے تھے..... شہادت سے پہلے اُنہوں نے مقابلہ کرتے ہوئے آٹھ بھارتی فوجیوں کو جہنم رسید کر دیا تھا۔

بھارتی فوجی وہ بھیڑیئے تھے جن کے منہ کو انسان کا خون لگ چکا تھا اور وہ وادیٔ کشمیر میں انسانوں کا شکار کھیل رہے تھے۔ لیکن میرے خیال میں اب وہ وقت زیادہ دُور نہیں رہا جب وادی کو اُن کے گندے وجود سے پاک کر دیا جائے گا۔

اس دوران دو دن اور گزر گئے۔ اب فوجیوں سے مجاہدین کی جھڑپیں اننت ناگ اور پہلگام کی طرف ہو رہی تھیں۔ وہ علاقے سرینگر کے دوسری طرف تھے۔ گلمرگ کی طرف قدرے سکون ہو گیا تھا۔

مجھے گھر سے نکلے ہوئے دو ہفتے ہو چکے تھے اور اب مجھے گھر کی یاد ستانے لگی تھی۔ کمانڈر رشید نے بھی میری اس کیفیت کو بھانپ لیا۔

''اب اس طرف کے حالات قدرے پُرسکون ہیں۔'' ایک روز کمانڈر رشید نے مجھ سے کہا۔ ''تم سوپور چلے جاؤ! تمہاری ضرورت ہوگی تو تمہیں پیغام بھیج دیا جائے گا۔''

اور پھر اگلے روز میں صبح سویرے ہی خچر پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نے رائفل اور ہر چیز وہیں چھوڑ دی تھی جس سے میرا مجاہدین سے کوئی تعلق ثابت ہو سکتا۔ میں نے عبدالغنی کے دیئے ہوئے ڈھیلے ڈھالے سے کپڑے پہن رکھے تھے اور حلیے سے میں کوئی کاشتکار ہی لگتا تھا۔

وہاں سے تقریباً آٹھ میل دُور ایک بستی میں پہنچ کر میں نے سلمان احمد نامی اُس آدمی کو تلاش کیا جس کے بارے میں عبدالغنی نے بتایا تھا۔ میں نے خچر اُس کے حوالے کر دیا اور تقریباً ایک گھنٹے بعد گلمرگ کی طرف جانے والی بس پر سوار ہو گیا۔

دو گھنٹے بعد میں گلمرگ پہنچ گیا۔ لیکن اُس روز میں آگے نہ جا سکا۔ عبدالغنی نے مجھے گلمرگ کے ایک دُکاندار کا پتہ بتایا تھا۔ شہر کی آدھی سے زیادہ دُکانیں بند تھیں۔ حمید نامی اُس شخص کی دُکان بھی بند تھی مگر ایک آدمی نے مجھے اُس کے گھر پہنچا دیا۔

حمید نے مجھے صبح آگے نہیں جانے دیا۔

''آگے کچھ گڑبڑ ہے۔'' اُس نے بتایا۔ ''قدم قدم پر فوجی دندناتے پھر رہے ہیں۔ تم آج کا دن یہاں رُک جاؤ! کل صبح چلے جانا۔''

مجھے وہ دن اور وہ رات بھی گلمرگ میں گزارنی پڑی اور پھر اگلی صبح میں بس کے ذریعے سوپور کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرے گھر اور قصبے والوں کو پتہ چل چکا تھا کہ ایک ہفتہ پہلے مجاہدین کی جس پارٹی نے سرینگر گلمرگ روڈ پر فوجی قافلے کو تباہ کیا تھا اُس میں، میں بھی شامل تھا۔ میرے گھر والے تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ قصبے کے لوگ بھی چوری چھپے میرے گھر آ کر میرے والدین کو مبارکباد دیتے رہے۔

تین دن سکون سے گزر گئے۔ میں بھی معمولات میں مصروف ہو گیا۔ چوتھے روز تین مجاہدین ہمارے قصبے میں داخل ہوئے۔ وہ بارہ مولا کی طرف کوئی کارروائی کر کے فرار ہوئے تھے۔ اُن کی اس کارروائی میں چار بھارتی فوجی مارے گئے تھے جبکہ اُن کا ایک ساتھی بھی شہید ہوا تھا۔

مجاہدین کو فوراً ہی مختلف گھروں میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے بھی اُن سے جا کر ملاقات کی تھی۔

اور پھر اُس روز عصر سے ذرا پہلے پورے قصبے میں یہ سنسنی خیز خبر پھیل گئی کہ تین فوجی ٹرک بڑی تیز رفتاری سے قصبے کی طرف آ رہے ہیں..... ہمارے قصبے میں بھارتی فوجیوں کا آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ مجاہدین کی تلاش کے بہانے یہاں آتے رہتے تھے اور لوٹ مار کر کے چلے جاتے تھے۔ لیکن آج بات کچھ اور تھی۔ تین مجاہدین قصبے میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ چوتھا میں خود تھا۔

تین ٹرکوں پر فوجیوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اُن سے مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گاؤں والوں کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ وہ مجاہدین ہمارے قصبے میں پناہ لئے ہوئے تھے اُن کے پاس اگرچہ رائفلیں موجود تھیں مگر تین رائفلیں کیا کر سکتی تھیں؟

دو فوجی ٹرک قصبے کے باہر مختلف جگہوں پر اور ایک قصبے کے مرکزی چوک پر پہنچ کر رُک گیا۔ اُس ٹرک سے ڈیڑھ درجن فوجی اُتر کر اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ ایک لیفٹیننٹ نے میگا فون پر یہ اعلان کیا کہ قصبے میں چھپے ہوئے مجاہدین کو اُن کے حوالے کر دیا جائے ورنہ قصبے کو جلا کر راکھ کر دیا جائے گا۔

تیسری مرتبہ دہرایا جانے والا یہ اعلان ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ کسی مکان کی چھت سے فائرنگ شروع ہو گئی..... ایک فوجی ڈھیر ہو گیا، تین چار زخمی ہو کر گرے۔ بھگدڑ مچ گئی۔ اور پھر بھارتی فوجیوں نے بھی فائر کھول دیا۔ وہ اندھا دُھند چاروں طرف گولیاں برسا رہے تھے۔ فائرنگ کے ساتھ چاروں طرف چیخوں اور آہ و فغاں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

قصبے کے باہر سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرے والد اس سے چند منٹ پہلے ہی عصر کی اذان دینے کے لئے مسجد کی طرف گئے تھے۔ میں نے بھی گھر سے نکل کر مسجد کی طرف دوڑ لگا دی۔ ابھی میں مسجد کے پہلو والے دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ فضا اللہ اکبر کی صدا سے گونج اُٹھی۔ میرے والد اذان شروع کر چکے تھے۔

اُس وقت مسجد کے مرکزی گیٹ کی طرف فائرنگ ہونے لگی۔ ادھر سے میں پہلو والے دروازے سے مسجد میں داخل ہوا اور ادھر تین بھارتی فوجی جوتوں سمیت دندناتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے اور اندھا دُھند فائر کھول دیا۔

اُس وقت مسجد میں پانچ چھ نمازی تھے۔ وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گرے۔ ایک فوجی نے رائفل کا رُخ میرے والد کی طرف کر دیا۔ کئی گولیاں اُن کے جسم میں پیوست ہو گئیں..... وہ تیورا کر گرے۔ اُن کے جسم سے خون کے کئی فوارے پھوٹ پڑے تھے..... اُن کے منہ سے نکلنے والی آخری آواز ''اللہ اکبر'' تھی۔

میں اپنی جگہ سے اُچھلا اور ہوا میں اُڑتا ہوا ایک فوجی پر جا گرا اور اُسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اُس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی اور تینوں بھارتی فوجیوں کو ڈھیر کر دیا۔

دوسرے ہی لمحے میں مسجد کے دروازے کی طرف لپکا۔ پہلو والی گلی سے نکلتے ہی میں ٹھٹھک گیا۔ دو عمارتوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ فضا میں پٹرول کی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ آگ اتفاقیہ نہیں لگی تھی بلکہ جان بوجھ کر لگائی گئی تھی..... چاروں طرف فائرنگ اور چیخوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں اپنے گھر کی طرف دوڑا اور گلی کے موڑ پر پہنچ کر رُک گیا۔ میرے مکان اور اُس کے ساتھ دوسرے دو مکانوں سے آگ کے شعلے اُٹھ رہے تھے۔

دو فوجی ایک لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے جا رہے تھے۔ لڑکی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ وہ رابعہ تھی..... مجھ سے دو سال بڑی میری بہن.....

میں نے فوجیوں کا نشانہ لے کر رائفل کا ٹرائیگر دبا دیا..... رائفل کھٹ کھٹا کر رہ گئی۔ وہ خالی ہو چکی تھی..... میں دھاڑتا ہوا اُن فوجیوں کی طرف لپکا اور اُسی وقت مجھے یوں لگا جیسے میری ایک ٹانگ میں انگارے بھر گئے ہوں..... میں لڑکھڑاتا ہوا سنبھل کر آگے دوڑتا رہا۔ میرے چاروں طرف آگ تھی اور گولیاں برس رہی تھیں..... مگر میں رُکا نہیں، آگے بڑھتا رہا۔ ایک فوجی نے مجھے دیکھ لیا اور اپنی رائفل کا رُخ میری طرف موڑ دیا.....!

○○○

میں رائفل کی زد پر تھا اور ہمارے درمیان فاصلہ بھی چند منٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ رائفل کسی بھی لمحے شعلے اُگل سکتی تھی۔ اور یہ شعلے میرے دل میں پیوست ہو کر میری زندگی کا چراغ گل کر سکتے تھے۔ میں نے مسجد میں چھینی ہوئی بھارتی فوجی کی رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ لیا اور دائیں پیر پر زور دے کر پوری قوت سے اُچھلا۔

سامنے والے فوجی کی رائفل کا رُخ میری طرف تھا۔ مجھے اس طرح اُچھلتے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی..... چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔ میں کسی پرندے کی طرح ہوا میں اُڑتا ہوا اُس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اور پھر میں نے دھاڑتے ہوئے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی رائفل کو لٹھ کی طرح گھما دیا.....

رائفل کا بٹ اُس فوجی کے سر پر لگا۔ اُس کے منہ سے عجیب سی آواز خارج ہوئی۔ وہ اُس کی آخری آواز تھی۔ رائفل کے بٹ کی ضرب سے اُس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔ رائفل ابھی تک اُس کے ہاتھوں میں تھی اور یہ شاید اُس کے جسم میں پیدا ہونے والے تشنج کا نتیجہ تھا کہ ٹرائیگر دب گیا..... رائفل کا رُخ اُس وقت اُوپر کی طرف تھا۔ نال سے نکلنے والی گولیاں آسمان کو چھونے کی کوشش کرنے لگیں۔ وہ فوجی کٹے ہوئے درخت کی طرح لہرایا اور ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی کھوپڑی سے خون فوارے کی طرح اُچھلنے لگا۔ بھیجہ بھی پانی کی طرح کھوپڑی سے بہہ نکلا۔

دوسرا فوجی میری بہن رابعہ کو گھسیٹتا ہوا چند گز دُور جا چکا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اپنے ساتھی کی چیخ سن کر اُس نے مُڑ کر دیکھا اور پھر اُس کا چہرہ بھی خوف کی شدت سے دُھواں ہو گیا۔ اُس نے رابعہ کو چھوڑ دیا اور رائفل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر میری طرف سیدھی کرنے لگا لیکن میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور ایک بار پھر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتا ہوا پوری قوت سے اپنی جگہ سے اُچھلا۔

یہ اُس نعرۂ تکبیر کا اثر تھا کہ وہ بھارتی فوجی دہشت زدہ ہو گیا۔ وہ اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے مجھے چھلنی کر سکتا تھا۔ لیکن وہ بزدل تھا۔ بری طرح بدحواس ہو کر چیختا ہوا ایک طرف بھاگ نکلا۔ وہ اس قدر خوفزدہ ہوا تھا کہ رائفل بھی ایک بوجھ سمجھ کر پھینک دی تھی۔

میں چھلانگ لگا کر رابعہ کے قریب گرا۔ رابعہ اب بھی بری طرح چیخ رہی تھی۔ اُس کی قمیض ایک کندھے سے پھٹ گئی تھی اور وہ وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

رابعہ باجی! بھاگ جاؤ..... اُس گلی میں..... چاچی زلیخا کے گھر کی طرف.....'' میں نے چیخ کر کہا مگر رُکا نہیں اور اُس فوجی کے پیچھے دوڑ لگا دی جو اپنی جان بچانے کے لئے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ فوجی دوسری گلی میں مُڑ چکا تھا۔ مگر میں نے اُسے زیادہ دُور نہیں جانے دیا۔ میں نے چند فٹ دُور ہی سے چھلانگ لگا دی اور نیچے گرتے ہوئے اپنی ایک ٹانگ اُس کی ٹانگوں میں اُلجھا دی۔ بھارتی فوجی چیختا ہوا لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر پھر گرا۔ اس دوران میں سنبھل چکا تھا۔ وہ رائفل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی جسے میں نے ایک بار پھر لٹھ کی طرح نال کی طرف سے پکڑ لیا اور فوجی کے جسم پر ضربیں لگانے لگا۔

پہلی ضرب اُس کے بائیں کندھے پر لگی۔ وہ بری طرح بلبلا اُٹھا۔ دوسری ضرب اُس کی پسلیوں پر لگی..... توقف کئے بغیر تیسری ضرب اُس کے دائیں گھٹنے پر لگائی۔ وہ چیختا ہوا زمین پر لوٹنے لگا۔ لیکن اُس کی چیخوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میرے ہاتھ نہیں رُکے۔ مجھ پر جنون سا طاری تھا۔ اس وادی میں روزانہ ہماری معصوم خواتین اور بچوں کی چیخیں گونجا کرتی تھیں..... یہ بے رحم درندے جب ان بے گناہوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتے تھے تو اُن کی چیخوں سے آسمان تھرا اُٹھتے تھے۔ زمین کانپ اُٹھتی تھی۔ لیکن اُن خونخوار بھیڑیوں پر ان معصوموں کی چیخوں اور آہ و فغاں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا تو میں اس درندے کی چیخوں سے کیسے متاثر ہو سکتا تھا؟

مجھ پر جنون سا طاری تھا۔ نجانے میرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ میرے ہاتھ مشینی انداز سے چل رہے تھے۔ رائفل کے بٹ کی ہر ضرب سے وہ بھیڑیا پہلے سے بھی زیادہ شدت سے بلبلا اُٹھتا۔

وہ اُس وقت اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میرے ہاتھ بھی ایک بار پھر حرکت میں آ گئے تھے۔ اس مرتبہ ضرب اُس کے جبڑے پر لگی۔ اُس کا جبڑا ٹوٹ گیا..... منہ سے خون بہہ نکلا اور وہ زمین پر اُس بکرے کی طرح تڑپنے لگا جس کے گلے پر چھری پھیر کر چھوڑ دیا گیا ہو۔

میں نے ایک بار پھر رائفل اُوپر اُٹھائی لیکن اُس وقت ایک نسوانی چیخ کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ رابعہ کی چیخ تھی..... میں نے ہاتھ روک لیا۔ چنگاریاں برساتی ہوئی نظروں سے خاک میں تڑپتے ہوئے بھارتی فوجی کی طرف دیکھا۔ وہ خون میں لت پت تھا اور اُٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھنے کے قابل چھوڑا ہی نہیں تھا۔ دونوں گھٹنے توڑ دیئے تھے۔ دو چار پسلیاں بھی ٹوٹ گئی ہوں گی۔ ہنسلی کی ایک ہڈی بھی رائفل کی ضرب کا شکار ہوئی تھی اور جبڑا ٹوٹ جانے سے وہ منہ بھر کر خون اُگل رہا تھا۔ ایسی صورت میں تو اُس کا زندہ بچ جانا بھی ایک معجزہ ہی کہلاتا۔

رابعہ کی چیخ دوبارہ سنائی دی تو میں مُڑ کر اُس طرف دوڑا۔ یہ چیخ اُس گلی کی طرف سے آئی تھی جہاں چاچی زلیخا کا گھر تھا۔ میں اُس طرف مُڑتے ہی رُک گیا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

وہ دو فوجی تھے۔ جن میں ایک نے رابعہ کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ رائفل اُس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ دوسرے نے رائفل کندھے پر لٹکا رکھی تھی اور رابعہ کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے بری طرح مچل رہی تھی۔ اس کھینچا تانی میں اُس کی قمیض تار تار ہو چکی تھی اور اُس کا بالائی جسم برہنہ ہو رہا تھا۔

میں چنگھاڑتا ہوا اُن کی طرف لپکا۔ رائفل کو اس مرتبہ بھی میں نے نال کی طرف سے لٹھ کی طرح پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں فوجی میری چنگھاڑ سن کر میری طرف مُڑے۔

ایک فوجی نے رابعہ کے بال چھوڑ دیئے اور رائفل کو دونوں ہاتھوں میں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس سے پہلے ہی میں اُس سے ٹکرا گیا اور اُسے گھسیٹتا ہوا دُور تک لے گیا۔ رائفل اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی اور اتفاق سے میری رائفل بھی میرے ہاتھ سے گر گئی۔ دوسرا فوجی اب رابعہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا تھا۔ وہ شاید موقع سے فائدہ اُٹھا کر رابعہ کو وہاں سے نکال لے جانا چاہتا تھا۔

میرے حریف فوجی نے سنبھل کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ اُس کے وزنی بوٹ کی ٹھوکر میری پنڈلی پر لگی۔ میں بے اختیار چیخ اُٹھا اور لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا..... میری سنبھلنے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اُس کے بوٹ کی ٹھوکریں میرے جسم کے مختلف حصوں پر پڑتی رہیں۔ ہر ٹھوکر کے ساتھ میں چیخ اُٹھتا۔ لیکن بالآخر مجھے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔

فوجی نے اُس وقت میرے منہ پر زوردار گھونسہ جما دیا..... میرا جبڑا ہل کر رہ گیا۔ دانتوں سے خون بہہ نکلا..... اپنے منہ میں ہی خون کا ذائقہ محسوس کر کے مجھ پر جنون ما طاری ہو گیا۔

میں تو ابھی نوعمر ہی تھا۔ اس میں شبہ نہیں جسمانی لحاظ سے میں اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی لگتا تھا۔ مگر وہ مجھ سے زیادہ قد آور اور کہیں طاقتور تھا۔ اگر وہ میری گردن پکڑ لیتا تو شاید ہڈی ٹوٹ جاتی۔ میرا اور اُس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ لیکن میرے اندر نجانے اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ ایک جذبہ تھا، جنون تھا جو میرے اندر چھپی ہوئی قوت کو تقویت دے رہا تھا.....

میں نے نتائج کی پرواہ کئے بغیر اُس ہٹے کٹے بھارتی سورما پر چھلانگ لگا دی اور اُسے رگیدتا ہوا دُور تک لے گیا۔ یہ گلی تنگ سی تھی۔ وہ ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر اُس کے پیٹ میں سر سے زوردار ٹکر مار دی۔ وہ چیختا ہوا دوہرا ہو گیا۔ اُس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی تو میں نے سر کی دوسری ٹکر اُس کے چہرے پر ماری۔ وہ ایک بار پھر بلبلا اُٹھا۔ اُس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ میں نے تیسری ٹکر مارنا چاہی تو وہ بی تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا میں اپنی جھونک میں دیوار سے ٹکرایا مگر فوراً سنبھل گیا۔

پتھر کی مورتیوں کو بھگوان مان کر اُن کی پوجا کرنے والے اُس سورما کی بانہوں میں شاید دم نہیں رہا تھا۔ اُس نے مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے زمین پر پڑی ہوئی اپنی رائفل کی طرف

چھلانگ لگا دی۔ لیکن میں نے اُسے رائفل تک پہنچنے نہیں دیا۔ میں نے اپنی جگہ سے اُچھل کر اُس کے کولہے پر زوردار ٹھوکر لگا دی۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ میں رائفل کی طرف لپکا۔ اُس فوجی نے بھی بڑی پھرتی سے سنبھل کر رائفل پر قبضہ کرنے کی ایک اور کوشش کی تھی۔ لیکن میں اس سے پہلے رائفل پر ہاتھ ڈال چکا تھا۔

رائفل کے آگے سنگین لگی ہوئی تھی۔ وہ بھارتی سورما جیسے ہی میری طرف جھپٹا میں نے رائفل کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پوری قوت سے سنگین اُس کے پیٹ میں گھونپ دی..... اُس بھارتی سورما کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے رائفل پیچھے کھینچ لی۔ وہ پیٹ پکڑ کر دوہرا ہو گیا..... تکلیف اور خوف کی شدت سے اُس کی آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑ رہی تھیں۔

رابعہ کی چیخوں کی آوازیں اب دوسری گلی سے آ رہی تھیں۔ دوسرا فوجی رابعہ کو گھسیٹتا ہوا دوسری گلی میں مُڑ گیا تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس طرف سے کچھ اور لوگوں کے چیخنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں دوڑتا ہوا گلی کے موڑ پر پہنچ گیا۔

اُس طرف کی صورتحال بہت سنگین تھی۔ تقریباً پچاس گز آگے ایک مکان کو آگ لگی ہوئی تھی۔ عورتیں، بچے اور مرد چیختے ہوئے باہر آ رہے تھے۔ اُس جلتے ہوئے مکان سے فائرنگ کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

تین بھارتی فوجی فائرنگ کرتے ہوئے اُس مکان سے باہر آ گئے۔ اُن میں سے ایک نوعمر لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لا رہا تھا۔

میرے خون کی گردش خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ وہ چاچی زلیخا کا مکان تھا اور وہ لڑکی چاچی زلیخا کی بیٹی تھی..... چاچی زلیخا سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا لیکن ایسا رشتہ ضرور تھا جو خونی رشتوں سے بھی زیادہ مقدس اور مضبوط ہوتا ہے۔ انسانیت اور مذہب کا رشتہ..... وہ ہم میں سے ایک تھی۔ اُس کا شوہر کئی سال پہلے کشمیر کی آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔ پندرہ سالہ شمو اُس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بے حد حسین۔ اُس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا اور اس وقت خونخوار بھیڑیوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔

رابعہ بھی اُن بھیڑیوں کے چنگل میں تھی۔ میں نے رائفل سیدھی کر لی اور اُس فوجی کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا جس نے شمو کو بالوں سے جکڑ رکھا تھا۔

مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ گولی اُس فوجی کے سر میں لگی اور اُس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ اُس کی گرفت سے نجات ملتے ہی شمو دروازے کے اندر کی طرف گری۔

بھیڑیا صفت فوجیوں نے اندھا دُھند فائر کھول دیا۔ بستی کے لوگ اپنے آپ کو بچانے کی جدوجہد تو کر رہے تھے مگر وہ نہتے تھے اور بھارتی فوجیوں کو اس قسم کی جوابی کارروائی کی توقع نہیں تھی کہ رائفل کی گولی سے اُن کے ایک ساتھی کی کھوپڑی اُڑا دی جائے گی۔

جس فوجی نے میری بہن رابعہ کو دبوچ رکھا تھا وہ بھی رابعہ کو چھوڑ کر دوڑتا ہوا آگے جا کر اپنے ساتھیوں سے مل گیا تھا۔

اُن کی رائفلیں آگ برسا رہی تھیں۔ میں نے چاچی زلیخا اور ایک بوڑھے آدمی کو گولیوں سے چھلنی ہو کر گرتے دیکھا اور پھر کسی فوجی کی ایک گولی نے معصوم شمو کو بھی چاٹ لیا.....

میں بھی ایک مکان کے دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ کھڑا فائرنگ کر رہا تھا۔ مگر میرے مقابلے پر تین چار فوجی تھے جو پوزیشن لے کر فائرنگ کر رہے تھے۔

میں جس دیوار کے سہارے کھڑا تھا اُس کا ایک حصہ آگے کو نکلا ہوا تھا جس سے مجھے کچھ آڑ مل گئی تھی۔ گولیاں میرے آس پاس سے گزر رہی تھیں۔ اس دوران میرے قریب والا دروازہ بڑی آہستگی سے کھلا اور ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''شمروز! اندر آ جاؤ..... جلدی کرو۔''

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ چاچی زینب تھی۔ میرا گھر اسی محلے میں تھا۔ سب ایک دوسرے کے شناسا تھے۔ گھروں میں آنا جانا تھا۔ میں ادھیڑ عمر مردوں کو چاچا اور عورتوں کو چاچی کہا کرتا تھا۔

''نہیں چاچی..... تم اندر جاؤ اور دروازہ بند کر لو!'' میں نے جواب دیا اور مُڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

ایک آٹھ نو سال کی عمر کا بچہ اور ایک ادھیڑ عمر عورت بھی بھارتی سورماؤں کی بربریت کا شکار ہو چکی تھی۔ اُس معصوم بچے کو دو گولیاں لگی تھیں۔ خون بہہ رہا تھا اور وہ مرغِ بسمل کی طرح خاک میں لوٹ رہا تھا۔

اور پھر میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... میری بہن رابعہ نے اُٹھ کر ایک مکان کے دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی مگر چیختی ہوئی ڈھیر ہو گئی اور خاک میں لوٹنے لگی..... اُس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا.....

میں سناٹے میں آ گیا۔ ایک لمحہ کو سوچنے سمجھنے کی قوتیں جیسے سلب ہو گئیں۔ دماغ پر برف سی جم گئی۔ میں پھٹی پھٹی سی نظروں سے خاک میں تڑپتی ہوئی رابعہ کو دیکھتا رہا..... میری نظریں کبھی تڑپتے ہوئے اُس معصوم بچے کی طرف اُٹھ جاتیں اور کبھی رابعہ کی طرف۔ اور پھر جیسے میں ہوش میں آ گیا۔ میں نے رائفل کو آگے نکال کر ٹرائیگر دبا دیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں ایک فوجی کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ میں نے ٹرائیگر سے اُس وقت تک اُنگلی نہیں ہٹائی جب تک میگزین خالی نہیں ہو گیا۔

دوسری طرف سے بھی گولیاں برسائی جا رہی تھیں..... میں نے خالی رائفل ایک طرف پھینک دی اور نتائج سے بے نیاز ہو کر آڑ سے نکل کر رابعہ کی لاش کی طرف دوڑنا چاہتا تھا کہ پیچھے کھڑی ہوئی چاچی زینت نے مجھے قمیض کے کالر سے پکڑ کر دروازے میں کھینچ لیا۔

''پاگل ہو گئے ہو.....؟'' وہ چیخی۔ ''تم دو قدم بھی آگے نہیں جا سکو گے۔ وہ تمہیں چھلنی کر

دیں گے۔''

''اُنہوں نے رابعہ کو مار دیا چاچی..... معصوم خالد کو خاک و خون میں لوٹا دیا..... چاچی زلیخا کو مار ڈالا..... شمو کو گولی سے اُڑا دیا..... مجھے چھوڑ دو چاچی! میں اُن وحشیوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

''پاگل مت بنو شمروز!'' چاچی زینب نے چیخ کر کہا۔ ''تم رابعہ اور دوسروں کی اب کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ وہ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔ لیکن یاد رکھو! تمہیں زندہ رہنا ہے۔ اس خون کا حساب لینا ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے اس خاک میں جذب ہو رہا ہے۔ وادی کی سرزمین کو ان خونخوار بھیڑیوں کے گندے وجود سے پاک کرنا ہے۔ اور یہ سب کچھ تم زندہ رہ کر ہی کر سکتے ہو اس طرف سے چھت پر چڑھ کر دوسری طرف نکل جاؤ! یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ دیر مت کرو!'' چاچی زینب نے مجھے اندر کھینچ کر دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ مگر چاچی زینب کی بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چاچی زینب نے ٹھیک کہا تھا۔ میں رابعہ، خالد، چاچی زلیخا یا اُن لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا جو بھارتی فوجیوں کی گولیوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ میں زندہ رہ کر ہی اُن کے خون کا بدلہ لے سکتا تھا اور اس سرزمین کو بھارتیوں کے گندے وجود سے پاک کرنے کے لئے ان مجاہدین کے لئے مددگار ثابت ہو سکتا تھا جنہوں نے اس مقصد کے لئے اپنی زندگیاں داؤ پر لگا رکھی تھیں۔ میں فرار کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

''اُس طرف.....'' چاچی زینب چیخی۔ ''سیڑھیوں پر چڑھ کر عباسی بھائی کی چھت پر کود جاؤ۔ اُس طرف سے تمہیں بھاگنے کا راستہ مل جائے گا۔''

گلی میں فائرنگ کے ساتھ اب دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں صحن میں سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔

سیڑھیاں لکڑی کے تختوں کی تھیں..... ابھی میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ باہر سے دروازے پر ضربیں لگائی جانے لگیں۔ وہ لوگ شاید رائفلوں کے بٹ مار مار کر دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں رُک کر پیچھے دیکھنے لگا۔

''بھاگ جاؤ..... جلدی کرو!'' چاچی زینب چیخی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے دروازے پر دباؤ ڈال رکھا تھا تاکہ بھارتی فوجیوں کو زیادہ سے زیادہ دیر تک روکا جا سکے۔

دروازے پر زوردار ضربیں لگائی جا رہی تھیں۔ میں سیڑھیوں پر دوڑنے لگا۔ اور پھر چاچی زینب کی چیخ سنائی دی۔ دروازہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ پشت کے بل گری تھی.....

''کہاں چھپایا ہے تم نے اُس اگروادی کو؟ بتاؤ..... جلدی کرو!''

میرے سامنے اُس وقت تین چار سیڑھیاں رہ گئی تھیں۔ یہ گرجدار آواز سن کر میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ چاچی زینب پشت کے بل زمین پر پڑی تھی۔ ایک فوجی نے اپنا پیر اُس کے پیٹ پر رکھا ہوا تھا اور دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی رائفل کی سنگین اُس کے سینے سے لگا رکھی تھی۔

''نہیں..... نہیں بتاؤں گی کچھ بھی۔'' چاچی زینب نے جواب دیا۔ اُس کے لہجے میں تھرتھراہٹ تھی لیکن اُس میں خوف کا عنصر شامل نہیں تھا۔

ایک لمحہ کو میرا دل چاہا کہ میں سیڑھیوں پر سے اُن درندوں پر چھلانگ لگا دوں..... لیکن اس طرح میں چاچی زینب کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا بلکہ خود اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔

سیڑھیوں کے ایک طرف مکان کی دیوار تھی اور دوسری طرف پتلی سی دیوار ہی کی طرح ڈھائی تین فٹ اُونچی ریلنگ تھی۔ میں اُس کی آڑ میں آہستہ آہستہ اُوپر چڑھنے لگا۔ ابھی آخری سے پہلے والی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ فائر کے ساتھ چاچی زینب کی چیخ سنائی دی..... میں بے اختیار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اُس بے رحم بھارتی فوجی نے چاچی زینب کے سینے پر گولی چلا دی تھی..... چاچی زینب کے سینے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ فوجی نے اپنا پیر اُس کے پیٹ سے ہٹا لیا۔ چاچی تڑپنے لگی۔

''وہ رہا..... چھت پر۔'' ایک فوجی کی چیختی ہوئی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ اُس فوجی نے مجھے دیکھ لیا تھا اور چیختے ہوئے رائفل سیدھی کر لی۔ میں نے آخری سیڑھی پر قدم رکھ کر چھت پر چھلانگ لگا دی۔ ایک فائر ہوا اور ایک دہکتا ہوا انگارہ میری پنڈلی میں اُترتا چلا گیا..... میری بائیں ٹانگ پہلے ہی زخمی تھی۔ اور اب بھی وہی ٹانگ زد میں آئی تھی۔ گولی پنڈلی کا گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی.....

میں منہ کے بل گرا لیکن دوسرے ہی لمحے اُٹھ کر لنگڑاتا ہوا چھت کے دوسرے کنارے کی طرف دوڑا۔

چھت پر دوڑتے ہوئے میں نے ایک طائرانہ نظر اپنے اطراف میں بھی ڈالی تھی۔ چاچی زلیخا کے گھر سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے..... میرا گھر بھی اب مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں تھا۔ بستی کے دوسرے کئی گھروں سے اُٹھنے والے شعلے اور سیاہ دُھویں کے بادل آسمان سے باتیں کرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

لکڑی کے تختوں کی سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی..... میں چھت کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ اُس طرف ایک تنگ سی گلی تھی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا، بھارتی فوجی کا سر سیڑھیوں پر نمودار ہو رہا تھا..... میں نے مُڑ کر چھت سے چھلانگ لگا دی۔

چھت تقریباً پندرہ فٹ اُونچی اور نیچے گلی کچی تھی۔ میں بھد کی آواز کے ساتھ گرا مگر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ایک طرف لڑھکتا چلا گیا.....

میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اُدھر دیکھا..... گلی سنسان پڑی تھی۔ چند گز آگے بائیں طرف ایک تنگ سی گلی تھی۔ میں نے اُٹھ کر اُس طرف دوڑنے کی کوشش کی مگر

کراہ کر رہ گیا۔ میری بائیں ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ تکلیف بڑھ رہی تھی اور ٹانگ پر بوجھ نہیں پڑ رہا تھا۔ لیکن یہاں رُکنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ وہ بھیڑیا صفت فوجی کسی بھی لمحے چھت کے اُس کنارے پر پہنچ سکتے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی فائر کھول دیتے۔

میں اُٹھ کر لنگڑاتا ہوا اگلے موڑ کی طرف دوڑا..... میں اپنی انہی پیچ وخم کھاتی ہوئی تنگ سی گلیوں میں پل کر جوان ہوا تھا۔ ان گلیوں سے میں اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح واقف تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں اگلی گلی میں داخل ہو جاؤں تو میرا تعاقب کرنے والے فوجی مجھے تلاش نہیں کر سکیں گے۔

گلی کا وہ موڑ تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ میں لنگڑاتا ہوا اُسی طرف دوڑتا رہا۔ بستی میں ہر طرف فائرنگ اور چیخ و پکار، آہ وفغاں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

موڑ کے قریب پہنچ کر میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ چاچی زینب والے مکان کی چھت پر اب دو فوجی نظر آ رہے تھے۔ وہ رائفلیں سنبھالے گلی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اور پھر اُن میں سے ایک نے مجھے دیکھ لیا اور رائفل سیدھی کرتے ہوئے فائر کھول دیا.....

میں نے دوسری گلی میں چھلانگ لگا دی۔ لاتعداد گولیاں میرے پیروں کے آس پاس زمین پر لگیں۔ دُھول اُڑنے لگی..... میں نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا، لنگڑاتا ہوا ایک طرف دوڑتا رہا اور چند گز آگے ایک اور گلی میں داخل ہو گیا..... آگے بھی فائرنگ اور چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ان پیچ وخم کھاتی ہوئی گلیوں میں دوڑتا رہا۔

میری ٹانگ کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن میں رُکا نہیں۔ کہیں رُکنے کا مطلب موت تھا..... صرف موت.....

ایک اور گلی میں مُڑتے ہی میں ٹھٹھک کر رُک گیا..... آگے کشادہ بازار تھا۔ سڑک کے دوسری طرف ایک فوجی جیپ کھڑی تھی جس کے قریب ایک میجر اور دو فوجی کھڑے تھے۔ دونوں فوجی آٹو میٹک رائفلوں سے مکانوں کی چھتوں کی طرف فائرنگ کر رہے تھے۔ میجر کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ یہ جیپ غالباً بعد میں قصبے میں آئی تھی۔

قصبے میں ہر طرف فوجی دندناتے پھر رہے تھے۔ اُن کے بھاری بوٹوں کی دھمک اور گونج چاروں طرف سنائی دے رہی تھی۔ آگ اور خون کا یہ شیطانی کھیل اپنے عروج پر پہنچ رہا تھا..... یہ وحشی بھیڑیئے اس قصبے کو پوری طرح تباہ کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔

''ارے وہ اُس لڑکے کو پکڑو..... اُس گلی میں۔'' میجر کی چیختی ہوئی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں مُڑ کر گلی میں دوڑنے لگا۔ دو فوجی میرے پیچھے آ رہے تھے۔

ٹانگ سے بہت زیادہ خون بہہ رہا تھا جس سے میں نقاہت سی محسوس کرنے لگا تھا..... وہ پیر بھی پوری طرح زمین پر نہیں پڑ رہا تھا۔ لیکن میں مینڈک کی طرح پھدکتا ہوا دوڑنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر ایک موڑ گھومتے ہی میں ٹھٹھک کر رُک گیا.....

سامنے والی گلی سے بھی دو فوجی دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے..... میرے سامنے بھی موت تھی اور پیچھے بھی فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ گلی میں تمام گھروں کے دروازے بند تھے۔ کہیں پناہ ملنے کی توقع نہیں تھی۔ میرا پیچھا کرنے والے فوجی بھی اُس گلی میں آ گئے۔ اُن سب کے پاس رائفلیں تھیں۔ وہ بڑی آسانی سے مجھے چھلنی کر سکتے تھے۔ ایک فوجی نے رائفل سیدھی بھی کی تھی لیکن مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر اُس نے فائر کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور چنگھاڑتا ہوا میری طرف لپکا۔

میں دونوں طرف سے گھر چکا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ لوگ مجھے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ میں نے بھی اُن سے بھڑ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ زندہ پکڑے جانے کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ جو مجاہدین یا نوجوان لڑکے شبے میں پکڑے جاتے تھے، اُنہیں اس طرح تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا کہ وہ مرنے کی دُعائیں مانگتے تھے مگر اُنہیں مرنے بھی نہیں دیا جاتا تھا۔

سامنے سے آنے والا ایک فوجی جیسے ہی قریب پہنچا میں نے اُس پر چھلانگ لگا دی اور اُسے ساتھ لیتا ہوا نیچے گرا۔ میں نے گرتے ہی دونوں ہاتھ اُس کے گلے پر رکھ کر پوری قوت سے اُس کا نرخرہ دبانے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش ہو گئی.....

تینوں فوجی میرے جسم پر ٹھوکریں برسا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اُن کے منہ سے غلیظ گالیاں بھی نکل رہی تھیں۔ ایک فوجی نے رائفل کا بٹ میرے کندھے پر مارا۔ میرا یہ کندھا پہلے ہی زخمی تھا۔ میں تکلیف سے چیخ اُٹھا لیکن اپنے نیچے دبے ہوئے فوجی کا گلا نہیں چھوڑا۔

میرے جسم پر ٹھوکریں برستی رہیں..... کندھے پر پڑنے والی ایک اور ضرب سے میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور پھر دو فوجیوں نے مجھے کھینچ کر الگ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے جسم پر ٹھوکروں کی بارش میں شدت آ گئی۔ میں چیختے ہوئے اپنے بچاؤ کی کوشش کرتا رہا۔ اور پھر سر پر پڑنے والی ایک ٹھوکر سے میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ پہلے تو میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرتی رہیں، پھر دُھند سی چھانے لگی جو بتدریج دبیز ہوتی چلی گئی.....

میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ مجھے پیروں سے پکڑ کر مُردہ کتے کی طرح گھسیٹا جا رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا..... تاریکی نے میرے ذہن کو مکمل طور پر لپیٹ میں لے لیا تھا۔

آنکھ کھلی تو میں پتھریلی زمین پر پڑا ہوا تھا..... ہوش میں آنے کے بعد بھی کچھ دیر تک میری آنکھوں کے سامنے دبیز دُھند سی چھائی رہی۔ میں نے سر کو ایک دو جھٹکے دیئے۔ دماغ میں ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ لیکن آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دُھند بتدریج چھٹتی چلی گئی۔

میں نے اپنے آپ کو حرکت دینے کی کوشش کی تو بے اختیار بلبلا اُٹھا۔ میرا پورا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ پورے بدن میں درد کی لہریں بجلی کے کوندے کی طرح لپک رہی تھیں۔ بائیں ٹانگ لکڑی کے تختے کی طرح اکڑی ہوئی تھی اور شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ چند منٹ بعد میں نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں اور حرکت کئے بغیر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ماحول پر ملگجا اُجالا تھا۔ میں پچھلے واقعات یاد کرنے لگا..... میرے دماغ میں اگرچہ دھماکے ہو رہے تھے مگر ایک ایک بات مجھے یاد آ رہی تھی۔ درندہ صفت بھارتی فوجیوں نے جب قصبے پر حملہ کیا تو عصر کا وقت تھا۔ میرے والد کو مسجد میں اذان دیتے ہوئے شہید کر دیا گیا تھا اور پھر وہ شیطانی کھیل شروع ہو گیا تھا جسے دیکھ کر آسمان بھی کانپ اُٹھا ہو گا۔ ایک ایک واقعہ میری آنکھوں کے سامنے گھومتا چلا گیا۔ میری بہن رابعہ، چاچی زلیخا، اُس کی بیٹی شمو، معصوم خالد اور چاچی زینب..... اُن سب کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا۔ بستی کے نجانے اور کتنے گھروں کو جلا کر راکھ کیا ہو گا؟ مجھے وہ آخری لمحات بھی یاد تھے جب میں اُن فوجیوں سے بھڑ گیا تھا۔ اور پھر ہوش و حواس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

وحشت اور بربریت کا یہ کھیل عصر کے وقت شروع ہوا تھا اور میرا خیال تھا کہ اب شام ہو رہی تھی۔ میں شاید کسی فوجی کیمپ میں تھا اور میرے چاروں طرف پہرہ ہو گا۔

میں نے گردن گھما کر دائیں طرف دیکھا۔ اور پھر میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا..... یہ فوجی کیمپ نہیں تھا..... مجھے اُس طرف نہ تو کوئی فوجی نظر آیا اور نہ ہی کیمپ کی کوئی حفاظتی باڑ وغیرہ دکھائی دی تھی۔ مجھے ہوش میں آئے ہوئے تین چار منٹ ہو چکے تھے اور اس دوران کوئی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ میں نے گردن گھما کر دوسری طرف دیکھا، اُس طرف بھی دُور تک کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دی جس سے سمجھا جاتا کہ میں بھارتی فوجیوں کی قید میں ہوں۔

میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس بے احتیاطی کا نتیجہ مجھے کندھے اور بدن کے دوسرے حصوں میں شدید ٹیسوں کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہ خارج ہو گئی۔ میں نے تکلیف ضبط کرنے کے لئے دانت بھینچ لئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

تقریباً ایک منٹ بعد میں نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں اور زخمی ٹانگ گھسیٹ کر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا لئے تھے۔ اس اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں اپنی جگہ پر گھوم گیا تھا اور پھر سامنے نظر پڑتے ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ چند لمحوں تک تو میں اس طرح بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا تھا جیسے پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو گیا ہوں..... اور پھر تکلیف کی پرواہ کئے بغیر ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑا خوفناک منظر تھا..... میرے سامنے پتھریلی زمین پر دو جوان لڑکیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اُن کے جسموں پر ایک چیتھڑا تک نہیں تھا..... اُن کے کپڑے اِدھر اُدھر جھاڑیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

ایک لڑکی کی لاش پشت کے بل پڑی تھی۔ اُس کی ٹانگیں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ چہرے پر خوف و دہشت کے تاثرات جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے..... آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے

وہ پھٹی پھٹی سی نظروں سے آسمان کو دیکھ رہی ہو۔

وہ قصبے کے ایک دُکاندار احمد علی کی بیٹی نیلم تھی..... اُس کی عمر سترہ کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ دو مہینے پہلے ہی اُس کی منگنی ہوئی تھی اور اگلے مہینے تو اُس کی شادی ہونے والی تھی۔ بھارتی بھیڑیوں نے اُسے بربریت کا نشانہ بنا کر اُس کی زندگی کا چراغ ہی گل کر دیا تھا.....

دوسری لاش اوندھی پڑی تھی۔ اُس کا چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنی زخمی ٹانگ کو گھسیٹتا ہوا اُس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بالکل برہنہ تھی اور میں اُسے ہاتھ لگاتے ہوئے جھجک رہا تھا.....

میں چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا، پھر جھک کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے پلٹ دیا..... اس کے ساتھ ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... مجھے اُبکائی آ گئی اور میں بڑی مشکل سے قے روک سکا۔

وہ حمیدہ تھی۔ اُس کا باپ عرصہ پہلے انتقال کر چکا تھا اور بڑا بھائی بھی کچھ عرصہ پہلے وطن کی آن پر قربان ہو گیا تھا۔ حمیدہ کی عمر بھی اُنیس بیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ بہت زیادہ حسین تو نہیں تھی لیکن قبول صورت کہا جا سکتا تھا۔ اُس کے فگر غیر معمولی طور پر بڑے تھے۔ وہ جب چلتی تو جسم کا بالائی حصہ تھل تھل کرتا اور لوگ مُڑ مُڑ کر اُس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتے۔

حمیدہ کا پیٹ چاک تھا۔ آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں..... چھاتیوں پر بھی زخم تھے، جیسے دانتوں سے بھنبھوڑا گیا ہو..... اُس کی ٹانگیں بھی خون آلود تھیں۔

میں زیادہ دیر تک اُس کی طرف نہ دیکھ سکا اور اپنا رُخ بدل لیا۔ مجھ پر اس وقت عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ جسم میں جیسے جان نہیں رہی تھی۔ اس صورت حال نے نڈھال سا کر دیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے ایک ٹانگ پر جسم کا بوجھ اُٹھائے کھڑا تھا۔ دوسرا پیر تو زمین پر رکھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے مینڈک کی طرح پھدکتے ہوئے جھاڑیوں میں اٹکے ہوئے اُن کے کپڑے اُٹھائے اور لاشوں پر ڈال دیئے۔ میں اس وقت اس کے علاوہ اُن کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

اب تک میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ بھارتی بھیڑیوں نے چونکہ عصر کے وقت قصبے پر حملہ کیا تھا اور اب شام ہونے والی تھی۔ لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شام کا اندھیرا گہرا ہونے کی بجائے اُجالا پھیل رہا تھا۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ شام نہیں صبح ہو رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ میں رات بھر یہاں اس ویرانے میں بے ہوش پڑا رہا تھا۔

میرے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ جب میں قصبے کی ایک گلی میں اُن بھارتی درندوں کے ساتھ آخری بار گتھم گتھا ہوا تھا تو اُس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے اُٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ قصبے کی دو معصوم لڑکیوں کو بھی اُٹھا لائے تھے اور شاید رات بھر اُنہیں بربریت کا نشانہ بناتے رہے تھے۔ وہ چیخی ہوں گی، چلائی ہوں گی..... مگر اس ویرانے میں ان کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن مجھے حیرت تو اس

بات پر تھی کہ میں بھی رات بھر بے ہوش پڑا رہا تھا۔ مجھے ایک لمحے کو بھی ہوش نہیں آ سکا تھا۔

وادی میں پھیلے ہوئے لاکھوں بھارتی فوجیوں کے ظلم اور بربریت میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پچاس سال سے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ عورتوں کی اجتماعی آبرو ریزی روز کا معمول بن چکی تھی۔ معصوم بچوں کو سنگینوں پر ٹانگ دیا جاتا تھا۔ بوڑھوں کو گھائل کر کے اُنہیں پتھروں پر گھسیٹا جاتا اور نوجوانوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے جاتے۔ جو زندہ پکڑا جاتا اُسے اس طرح تشدد کا نشانہ بنایا جاتا کہ وہ موت کی دُعائیں مانگنے لگتا۔

معصوم اور بے گناہ کشمیریوں پر بھارتی غاصبوں کا یہ ظلم کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ پوری دنیا ظلم کی ان داستانوں سے واقف ہو چکی تھی۔ مگر انسانیت کے ٹھیکیداروں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ انسانوں کی فلاح و بہبود کا دعویٰ کرنے والے اقوام عالم کے نمائندے بہرے ہو گئے تھے۔ معصوم اور مظلوم کشمیری عورتوں اور بچوں کی چیخیں اُن کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ اس کے برعکس انڈونیشیا کے مشرقی صوبے تیمور میں آباد عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کا تصادم ہوا تو پوری دنیا چیخ اُٹھی۔ اقوام متحدہ کے ادارے میں جیسے طوفان آ گیا..... پوری دنیا میں انڈونیشیا کے مسلمان حکمرانوں کی مذمت کی جانے لگی۔ مشرقی تیمور کے مسلمانوں کو ظالم، جابر اور غاصب قرار دیا جانے لگا۔ اقوام متحدہ نے تیمور کے عیسائیوں کی مدد کے لئے امن فوج بھیج دی اور بالآخر عیسائی آبادی کی اکثریت کی بنیاد پر مشرقی تیمور کو انڈونیشیا سے الگ کر کے وہاں عیسائیوں کی خودمختار حکومت قائم کر دی۔

یہ سب کچھ چند مہینوں بلکہ چند ہفتوں کے اندر اندر ہو گیا۔ مشرقی تیمور کے عیسائیوں کا درد پوری دنیا نے محسوس کیا۔ اقوام متحدہ نے جس تیزی سے مشرقی تیمور کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے ''ظلم'' سے نجات دلانے کے لئے کارروائی کی تھی اُس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ لیکن گزشتہ نصف صدی سے کشمیری مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے غاصب ہندوؤں کے مظالم پر اس اقوام متحدہ نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

میں اس ویرانے میں پڑی ہوئی دو معصوم لڑکیوں کی نچی ہوئی برہنہ لاشوں کے قریب کھڑا یہ سب کچھ سوچتا رہا۔ کب کسی کے دل میں ہمارا درد جاگے گا؟

میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا کچھ آگے بڑھ گیا اور پھر ایک جگہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔ نشیب میں بہت دُور سیاہ دُھواں اُٹھتا ہوا نظر آیا تو میں چونک گیا۔ وہ میرا گاؤں تھا جہاں اب بھی جلتے ہوئے مکانوں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ جگہ قصبے سے تقریباً تین میل دُور سرینگر جانے والی سڑک سے ذرا ہٹ کر تھی۔ اب مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ گزشتہ شام بھارتی فوجی اُن لڑکیوں کو اور مجھے اُٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ اُن کی تعداد کیا ہو گی؟ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ رات بھر خونخوار بھیڑیوں کی طرح اُن لڑکیوں کو نوچتے اور بھنبھوڑتے رہے

تھے اور صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے چلے گئے تھے۔ میں چونکہ رات بھر بے ہوش پڑا رہا تھا اور شاید وہ مجھے مُردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔

میں خاموش کھڑا بستی سے اُٹھتے ہوئے دُھویں کو دیکھتا رہا۔ مشرقی اُفق پر سرخی پھیلنے لگی۔ وہ طلوع ہونے والے سورج کی نہیں بلکہ اُن بے گناہوں کے خون کی سرخی تھی جو بھیڑیا صفت اور متعصب ہندو فوجیوں کی بربریت کا شکار ہوئے تھے۔

بستی سے اُٹھنے والے دُھویں کی طرف دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ بستی کے کتنے لوگ مارے گئے ہوں گے اور کون کون بچا ہو گا؟ میرا باپ مسجد میں میرے سامنے شہید کر دیا گیا تھا۔ میری بہن رابعہ کو بستی کی ایک گلی میں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا۔ اپنی ماں اور دوسری بہن ثمینہ کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ دونوں زندہ بھی تھیں یا..... میں نے سر جھٹک دیا۔ میں اس سے آگے نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

سورج اب پہاڑی کی بلندی سے جھانکنے لگا تھا۔ سنہری کرنیں وادی پر نچھاور ہونے لگیں۔ میں رات بھر سردی میں بے ہوش پڑا رہا تھا۔ میرا جسم اکڑا ہوا تھا۔ جیسے رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہو..... اور مجھے حیرت تھی کہ میں اب تک زندہ کیسے تھا اور نقل و حرکت کس طرح کر رہا تھا؟

دُھوپ کی حرارت سے مجھے اپنے بدن میں خون کی روانی محسوس ہونے لگی۔ میں اس وقت بھی اس جگہ پر کھڑا ویران سی نظروں سے نشیب میں دیکھ رہا تھا۔ جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے سوگز نیچے سڑک دکھائی دے رہی تھی۔ قصبے کی طرف سے آنے والی یہ سڑک اسی پہاڑی کے اُوپر سے گھومتی ہوئی سرینگر کی طرف چلی گئی تھی۔

میں نے مُڑ کر حمیدہ اور نیلم کی لاشوں کی طرف دیکھا۔ میں نے اُن لاشوں کو کپڑوں سے ڈھک دیا تھا مگر ہوا کے جھونکوں سے کپڑے اُڑ کر دُور چلے گئے تھے اور لاشیں برہنہ ہو گئی تھیں جن پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں دُور ہی سے نظر آ رہی تھیں۔

میں نے رُخ پھیر لیا اور ڈھلان پر آہستہ آہستہ نیچے اُترنے کی کوشش کرنے لگا۔ یوں تو میرا پورا جسم بری طرح دُکھ رہا تھا مگر کندھے اور بائیں ٹانگ میں شدید تکلیف تھی۔ پیر زمین پر نہیں رکھا جا رہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے زخمی ٹانگ کو گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی طرح سڑک پر پہنچ جاؤں۔ کوئی نہ کوئی وہاں سے ضرور گزرے گا تو اُنہیں اُن لاشوں کے بارے میں بتاؤں گا۔ لیکن سوگز کا یہ فاصلہ بھی مجھے سو میل سے زیادہ لگ رہا تھا اور محسوس ہو رہا تھا جیسے میں یہ فاصلہ کبھی طے نہ کر سکوں گا۔

ڈھلان خاصی عمودی تھی۔ میں بہت سنبھل کر نیچے اُتر رہا تھا۔ لیکن دفعتہً ایک چھوٹے پتھر پر میرا پیر رپٹ گیا اور مجھے یوں لگا جیسے زمین میرے قدموں کے نیچے سے نکل گئی ہو..... میں ایک پیر پر لڑکھڑا کر رہ گیا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور نیچے گر کر بڑی تیزی سے ڈھلان پر لڑھکنے لگا.....

گرتے ہوئے میرے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ میں ڈھلان پر کانٹے دار جھاڑیوں میں بڑی تیزی سے قلابازیاں کھاتا ہوا لڑھک رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے جھاڑیوں کو گرفت میں لینے کی کوشش بھی کی تھی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور لڑھکتا چلا گیا۔

اور پھر میرا سر ایک پتھر سے ٹکرا گیا..... کھوپڑی کے پچھلے حصے پر چوٹ بڑی زوردار لگی تھی۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی ناچنے لگیں اور پھر میرا سر تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا.....

O

اس مرتبہ میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ایک نرم بستر پر پڑے ہوئے پایا۔ آنکھوں کے سامنے کچھ دُھندسی چھائی ہوئی تھی جو بتدریج چھٹتی چلی گئی۔ میں آنکھیں میچ کر سامنے دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنے گھر میں ہوں۔ لیکن وہ میرا گھر نہیں تھا۔ وہ ایک غار تھا جس میں شاید کسی طرف رکھا ہوا سپرٹ لیمپ جل رہا تھا۔ وہ سپرٹ لیمپ تو نظر نہیں آ رہا تھا مگر اُس کی روشنی میں غار کی ناہموار چھت دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو کراہ اُٹھا۔ درد کی لہریں پورے بدن میں برقی رو کی طرح پھیلتی چلی گئی تھیں۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش ترک کر دی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا جسم کمبل سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور کمبل کے نیچے میرے جسم پر لباس نہیں تھا۔ میں نے کمبل کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا تو پتہ چلا کہ میرے جسم پر صرف نیکر تھی۔ اور وہ بستر بھی کوئی پلنگ یا چارپائی نہیں تھی۔ فرش پر پیال پھیلی ہوئی تھی جس پر ایک کمبل بچھا ہوا تھا۔ میں نے گردن کو حرکت دینا چاہی تو سر میں شدید ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ میرا ایک ہاتھ بے اختیار سر پر پہنچ گیا۔ کھوپڑی کے پچھلے حصے پر ایک بڑا سا گومڑہ اُبھرا ہوا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ تھی اور میں یہاں کیسے آ گیا تھا؟ مجھے یہ تو یاد آ گیا کہ اُس پہاڑی ڈھلان سے اُترتے ہوئے میں گر پڑا تھا اور لڑھکتے ہوئے میرا سر ایک پتھر سے ٹکرا گیا تھا۔ سر پر لگنے والی شدید چوٹ کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ مگر مجھے اس غار میں کون لایا تھا.....؟

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ قدموں کی ہلکی سی آہٹ سن کر چونک گیا۔ اُس وقت میں کمبل کے اندر ہاتھ ڈالے اپنے جسم پر لپٹی ہوئی پٹیوں کو ٹٹول رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کمبل سے باہر نکال لیا اور آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ قدموں کی آہٹوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ دو یا دو سے زیادہ آدمی تھے۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند سیکنڈ بعد ہی تین افراد غار کے دوسرے حصے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ اُن میں ایک ادھیڑ عمر عورت تھی اور دو آدمی۔ ایک ادھیڑ عمر تھا اور دوسرا جوان۔ اُن دونوں کے کندھوں پر آٹومیٹک رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں اور تینوں چہرے میرے لئے اجنبی تھے۔

وہ تینوں میرے قریب آ کر رُک گئے۔ چند لمحے کھڑے کھڑے میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر دونوں آدمی گھٹنوں کے بل میرے سامنے بیٹھ گئے۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' ادھیڑ عمر شخص نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ اُس کے لہجے میں شفقت نمایاں تھی۔

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ حالانکہ میں ٹھیک نہیں تھا۔ یہ جملہ تو اخلاقاً کہا تھا۔ بخار میں تپتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے جسم کے ساتھ میں اپنے آپ کو ٹھیک کس طرح کہہ سکتا تھا؟

میں گہری نظروں سے اُس شخص کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ لمبا قد اور مضبوط ہاتھ پیر۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال آپس میں تقریباً ملے ہوئے تھے جس سے منہ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ سر کے بال بھی بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ کتھئی رنگ کی گالف کیپ اُس کی پیشانی کے قریب سر پر ٹکی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھی۔ چہرے پر سختی کے تاثرات اس بات کی عکاسی کر رہے تھے کہ وہ بڑی کٹھن زندگی گزار رہا ہے۔

اُس نے نظریں ہٹا کر میں نے دوسرے آدمی کی طرف دیکھا۔ اُس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اُس کا بھی شیو اور سر کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ اُس نے کمر پر کپڑے کا ایک پٹکا سا باندھ رکھا تھا جس میں آٹومیٹک رائفل کے چار میگزین اڑسے ہوئے تھے۔ میری نظریں عورت کی طرف اُٹھ گئیں جو اُس کے قریب کھڑی تھی۔ اُس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ لمبے قد کی مالک وہ عورت خاصی حسین تھی۔ اُس نے ڈھیلا ڈھالا سا چوغہ پہن رکھا تھا اور سر پر سیاہ رُومال بندھا ہوا تھا۔ میں اُس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر ادھیڑ عمر شخص کی طرف دیکھنے لگا۔

''گھبراؤ نہیں..... تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔'' اُس شخص نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''ایک مجاہد کی زندگی میں ایسے لمحات ایک بار نہیں بار بار آتے ہیں۔ مجاہد گھبراتا نہیں۔ ایسے واقعات تو اُس کے جذبات کو مہمیز کرنے کے لئے رُونما ہوتے ہیں۔ اور پھر ہر مرتبہ وہ ایک نئے جوش، ولولے اور عزم کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑتا ہے۔''

''نہ میرے جذبات سرد ہوئے ہیں اور نہ ہی حوصلہ کم ہوا ہے۔ لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ کون ہیں اور یہ کون سی جگہ ہے؟ میں یہاں کیسے پہنچا؟''

''آفرین.....'' وہ شخص میرے حوصلے کی داد دیتے ہوئے بولا۔ ''چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا۔ ''میں کمانڈر محب اللہ ہوں۔ یہ محمد اعظم ہے اور یہ مریم ہے۔'' اُس نے اپنے ساتھی اور اُس عورت کا تعارف کرایا۔ ''ہم بھی اس وادی کو آزاد کرانے کے لئے بھارتی سامراج سے برسرِ پیکار ہیں۔ ہمارے مجاہدین پوری وادی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جہاں بھی موقع ملتا ہے دشمن پر کاری ضرب لگا دی جاتی ہے۔''

میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ کمانڈر محب اللہ بھارتی درندوں کے خلاف برسرِ پیکار مجاہدین

میں ایک معتبر نام تھا۔ وہ وادی میں چھلاوہ کے نام سے مشہور تھا۔ اور وہ واقعی چھلاوہ تھا۔ اگر وہ رات دس بجے بارہ مولا کے آس پاس بھارتی فوجیوں کے خلاف کوئی چھاپہ مار کارروائی کرتا تو چند گھنٹوں بعد وہاں سے میلوں دُور سرینگر کے دوسری طرف اننت ناگ میں کسی فوجی دستے پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑتا۔ بعض اوقات کئی مقامات پر بیک وقت ہونے والی چھاپہ مار کارروائیوں میں بھی اُس کا نام لیا جاتا۔

یوں تو کشمیر کی آزادی کے لئے مجاہدین کی کئی تنظیمیں بھارتی سامراج کے خلاف برسرِ پیکار تھیں۔ ہر تنظیم اپنی جگہ نہایت اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ ہر مجاہد بھارتی فوجیوں کے لئے خوف کی علامت بنا ہوا تھا۔ لیکن کمانڈر محبّ اللہ کے نام میں وہ دہشت تھی جس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ بھارتی فوجی اُس کا نام سن کر ہی تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ اور وہی کمانڈر محبّ اللہ اُس وقت میرے سامنے بیٹھا ہوا بڑی محبت اور شفقت بھرے لہجے میں میری خیریت دریافت کر رہا تھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟ میں تو.....''

''میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان چکا ہوں۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے میری بات کاٹ دی۔ گزشتہ رات میں بارہ مولا میں تھا جب مجھے تمہارے قصبے پر بھارتی فوجیوں کے حملے کی اطلاع ملی۔ میں اپنے ساتھ چند مجاہدین کو لے کر فوراً ہی روانہ ہو گیا۔ لیکن بارہ مولا کے قریب ہی ایک فوجی دستے سے تصادم ہو گیا۔ ہمارا مقابلہ تقریباً دو گھنٹوں تک جاری رہا۔ اس تصادم میں ہم نے اسلحہ سے لدا ہوا ایک ٹرک تباہ کرنے کے علاوہ ایک میجر اور بارہ فوجیوں کو جہنم رسید کر دیا جبکہ ہمارا ایک مجاہد شہید اور ایک زخمی ہوا۔ ہم صبح سے ذرا پہلے تمہارے قصبے میں پہنچے تھے۔ بھارتی سور ماوہاں سے جا چکے تھے لیکن اپنے پیچھے تباہی اور بربادی کی ایک المناک داستان چھوڑ گئے تھے۔ یہ کوئی بات نہیں خونخوار درندوں سے کسی بھلائی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ مگر یہ سب کچھ دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ معصوم اور بے گناہ لوگوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ ایک نہ ایک دن ہم بھی اس سرزمین کو غاصب ہندوؤں کے ناپاک وجود سے پاک کرا لینے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر دھیمے لہجے میں قصبے کی تباہی کے بارے میں بتانے لگا۔

کمانڈر محبّ اللہ کے کہنے کے مطابق قصبے میں اڑتالیس افراد کو شہید کیا گیا تھا جن میں عورتیں، بوڑھے مرد اور بچے شامل تھے۔ پیشتر کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا تھا جبکہ بعض لوگوں کو اذیتیں دے کر سنگینوں سے ہلاک کیا گیا تھا۔ ستائیس مکان جلا کر راکھ کر دیئے گئے تھے جن میں میرا مکان بھی شامل تھا۔ مسجد کو بھی آگ لگا کر شہید کر دیا گیا تھا۔ قصبے کی چھ جوان لڑکیاں لاپتہ تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ انہیں بھارتی فوجی اُٹھا کر لے گئے تھے۔

''دو لڑکیوں کی اُدھڑی ہوئی لاشیں.....''

''لاپتہ ہونے والی چھ لڑکیاں اُن دو کے علاوہ ہیں جن کے بارے میں تم بتانا چاہتے

ہو۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ دو لاشیں ہم نے اُس پہاڑی پر دفن کر دی تھیں۔''

''اوہ..!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''لیکن آپ لوگوں کو اُن لاشوں کا پتہ کیسے چلا؟''

''صبح ہم تمہارے قصبے سے واپس جا رہے تھے۔ ہماری جیپ اُس پہاڑی کے قریب سے گزر رہی تھی کہ ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں نے جیپ رُکوائی اور محمد اعظم کو صورتحال معلوم کرنے کے لئے اُس طرف بھیج دیا۔ اُس نے تمہیں ڈھلان پر جھاڑیوں میں بے ہوش پڑے دیکھا تو اُٹھا لایا۔ تمہاری حالت دیکھ کر میں بھی کانپ اُٹھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید تم گزشتہ رات قصبے پر بھارتی فوجیوں سے جھڑپ میں زخمی ہو کر پناہ لینے کے لئے اس طرف آ گئے تھے۔ اور ہو سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہو۔ یہ سوچ کر میں جیپ کو اُوپر سے گھما کر اُس پتھریلے میدان کی طرف لے آیا اور تب ہم نے اُن دونوں لڑکیوں کی لاشوں کو دیکھا۔ اُن لڑکیوں کے حوالے سے تو میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اُن وحشیوں نے اُن کے ساتھ کیا کیا تھا۔ لیکن تم.....''

''میں پناہ کی تلاش میں قصبے سے نہیں بھاگا تھا کمانڈر!'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اُسے قصبے پر بھارتی فوجیوں کے حملہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا۔ ''وہ شیطان اُن معصوم لڑکیوں کے ساتھ مجھے بھی اُٹھا لائے تھے۔ میں چونکہ رات بھر بے ہوش رہا تھا اس لئے شاید وہ مجھے مُردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر ہوش میں آنے کے بعد کی تفصیل بتانے لگا۔

''وہ تمہاری ہی چیخ تھی جو میں نے سنی تھی۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے میرے خاموش ہونے پر کہا۔ ''بیشک تم بہت حوصلہ مند، آہنی اعصاب کے مالک اور بڑی مضبوط قوتِ ارادی کے مالک ہو۔ تمہاری ٹانگ میں دو گولیاں لگی تھیں۔ بدن پر اور بھی کئی زخم تھے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو بہت پہلے دم توڑ چکا ہوتا۔ مگر تم نے بڑی ہمت کا ثبوت دیا اور تمہارے سانس کی ڈور کو ٹوٹنے سے بچانے کے لئے ڈاکٹر مریم نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔'' اُس نے قریب کھڑی ہوئی عورت کی طرف اشارہ کیا جس کا تعارف اُس نے پہلے صرف مریم کے نام سے کرایا تھا۔

''ڈاکٹر.....؟'' میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں.....'' کمانڈر محبّ اللہ مسکرا دیا۔ ''مریم فزیشن اور سرجن ہے۔ کئی سال پہلے اس نے پاکستان کے ایک میڈیکل کالج سے طب اور سرجری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ دو سال پہلے یہ پونچھ کے ہسپتال میں خدمات انجام دے رہی تھی۔ ایک روز تین زخمی مجاہدین کو اُس ہسپتال میں پہنچایا گیا۔ اُن میں سے دو کو تو بچا لیا گیا مگر تیسرے کا بہت زیادہ خون ضائع ہو چکا تھا وہ نہیں بچ سکا۔ مریم نے اُسی روز فیصلہ کر لیا کہ وہ مجاہدین کے لئے کام کرے گی۔ یہ پونچھ کے ہسپتال کی نوکری چھوڑ کر چوری چھپے کنٹرول لائن پار کر کے دلیہ نامی ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گئی۔ اتفاق سے میں اُس روز اُس بستی میں موجود تھا۔ ڈاکٹر مریم کی باتیں سن کر میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ

سکا۔ لیکن مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ یہ غاصب بھارتیوں کی کوئی چال تو نہیں تھی۔ بھارتی فوجی مجاہدین کے ٹھکانے معلوم کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اُن کی ایک سازش ہو سکتی تھی۔ یہ مجاہدین کی خدمت کے بہانے ہمارے ساتھ رہتی اور بھارتی فوجیوں کو ہمارے بارے میں معلومات فراہم کر سکتی تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ بارہ مولا لے گیا اور اپنے ایک دوست کی فیملی کے حوالے کر دیا اور اُس کے بارے میں پونچھ اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں تحقیقات کے لئے ایک آدمی بھیج دیا۔ میں اگرچہ مریم کے بارے میں ملنے والی رپورٹوں سے خاصا مطمئن تھا لیکن تین مہینوں تک میں نے کوئی خدمت اس کے سپرد نہیں کی اور خود بھی اس سے دُور ہی رہا۔

بالآخر مجھے یقین ہو گیا کہ مریم واقعی کشمیر کی آزادی کے لئے لڑنے والے مجاہدین کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ یہ اپنے ساتھ جراحی کے بہت سے آلات بھی لے کر آئی تھی جو شروع ہی سے میرے قبضے میں تھے۔ مطمئن ہونے کے بعد ہم دونوں نے مل کر ایک باقاعدہ منصوبہ بنایا اور وادی میں کئی مقامات پر ایسے ہی غاروں میں ایسے انتظامات کر دیئے کہ ان علاقوں میں زخمی ہونے والے مجاہدین کو فوری طور پر طبّی امداد فراہم کی جا سکے۔ ڈاکٹر مریم نے واقعی اپنی زندگی مجاہدین کے لئے وقف کر رکھی ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مریم کا تعلق لاہور کے ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ یہ اگر چاہتی تو عیش و آرام کی زندگی گزار سکتی تھی لیکن مجاہدین کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس نے سب کچھ تج دیا۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ ان پہاڑوں میں اسے کتنی تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہوں گی۔ اس نے ہمارے ساتھ کئی کئی روز فاقے بھی کئے ہیں لیکن کبھی اُف تک نہیں کیا۔ یہ بے سروسامانی کی حالت میں مجاہدین کی جس طرح مسیحائی کر رہی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ دواؤں کی کمی کی شکایت رہتی ہے لیکن پاکستان میں ہمارے ہمدرد اور دوست وقتاً فوقتاً ضروری دوائیں ہمیں مختلف ذرائع سے بھیجتے رہتے ہیں۔'' میں توصیفی نظروں سے ڈاکٹر مریم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

''یہ غار کہاں پر ہے.....؟'' میں نے پوچھا۔ ''سوپور کے آس پاس تو میں نے ایسا کوئی غار نہیں دیکھا۔

''یہ غار بارہ مولا سے تقریباً دس میل دُور دریائے اوری کے قریب واقع ہے۔'' کمانڈر محب اللہ نے جواب دیا۔ ''یہ غار ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔ کسی عام آدمی کے لئے اسے تلاش کر لینا ممکن نہیں۔ اور ویسے بھی ہم نے اس کی حفاظت کا معقول انتظام کر رکھا ہے۔ جب کوئی اجنبی اس طرف آتا ہے تو ہمیں فوراً اطلاع مل جاتی ہے۔''

میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ لوگ مجھے سوپور کے قریب سے اُٹھا کر میلوں دُور بارہ مولا لے آئے تھے اور یہاں میرا علاج کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر مریم نے بتایا کہ پنڈلی میں لگنے والی گولی گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی جبکہ ران میں لگنے والی گولی اندر ہی رہ گئی تھی جسے مریم نے آپریشن کر کے نکال دیا تھا۔ اور میرے جسم کے دوسرے حصوں پر بھی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔

ڈاکٹر مریم نے یہ انکشاف بھی کیا کہ مجھے دوپہر کے قریب بے ہوشی کی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ اُس وقت میرا بدن تیز بخار سے پھنک رہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد میں چند منٹ کے لئے ہوش میں ضرور آیا تھا مگر حواس میں نہیں تھا۔ اُس نے مجھے انجکشن لگا دیا تھا جس کے بعد میں پھر بے ہوش ہو گیا تھا یا گہری نیند سو گیا تھا۔ یہ انکشاف بھی میرے لئے خاصا دلچسپ ثابت ہوا کہ اس وقت آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔

آخر وہ سوال بھی میری زبان پر آ ہی گیا جو میں بہت دیر پہلے اُس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ کمانڈر محب اللہ نے پہلے ڈاکٹر مریم کی طرف دیکھا، پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''مجھے افسوس ہے..... تمہارے گھر کے حوالے سے میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔'' اُس نے ایک بار پھر مریم کی طرف دیکھا اور پھر مدھم لہجے میں گویا ہوا۔ ''قصبے کے جو اڑتالیس افراد گزشتہ شام شہادت کے رُتبے پر فائز ہوئے ہیں اُن میں تمہاری والدہ بھی شامل ہیں.....''

میرے سینے پر گھونسا سا لگا۔ والد اور بہن کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے گولیوں سے چھلنی ہوتے دیکھا تھا۔ اور اب والدہ کے بارے میں بھی یہ خبر سن لی تھی کہ وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہیں۔

''اور میری بہن ثمینہ.....؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ یہ سوال کرتے ہوئے میرا دل ایک بار پھر پوری شدت سے دھڑک اُٹھا تھا۔

○○○

''ثمینہ لا پتہ ہے۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے نظریں جھکا کر پہلے سے بھی زیادہ دھیمی آواز میں جواب دیا۔'' وہ بھی اُن چھ لڑکیوں میں شامل ہے جن کے بارے میں شبہ ہے کہ اُنہیں فوجی اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ جب قصبے پر حملہ ہوا تھا تو یہ لڑکیاں اپنی عزت اور جان بچانے کے لئے قصبے سے بھاگ کر کھیتوں میں چھپ گئی ہوں یا کسی اور قریبی بستی میں پہنچ گئی ہوں۔ اُنہیں بہر حال تلاش کیا جا رہا ہے اور اچھی اُمید رکھنی چاہئے۔''

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں جانتا تھا کہ اُس نے آخری الفاظ میری دلجوئی کے لئے کہے تھے۔ ورنہ وہ بھی جانتا تھا کہ حقیقت کیا ہو سکتی ہے۔ میں نے صرف رابعہ کو اپنے گھر والی گلی میں فوجیوں کے چنگل میں دیکھا تھا۔ اُس وقت صورتحال ایسی تھی کہ فوجیوں نے گلیوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ کسی کو بھاگنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ثمینہ یا دوسری لڑکیاں بھاگ کر کہاں جا سکتی تھیں؟

دو لڑکیوں کی نچی اور کھسوٹی ہوئی لاشیں میں نے قصبے سے تین میل دُور اُس پہاڑی پر دیکھی تھیں جہاں میں بھی رات بھر بے ہوش پڑا رہا تھا۔ ثمینہ اور دوسری لڑکیاں شاید فوجیوں کی دوسری پارٹی کے ہاتھ لگ گئی تھیں اور وہ اُنہیں دوسری طرف لے گئے تھے۔

اُن دو لڑکیوں کی لاشیں دیکھ کر میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ ثمینہ اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ کیا ہوا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کی نچی کھچی لاشیں بھی پہاڑیوں میں کہیں پڑی ہوں۔

میں اندر سے کانپ رہا تھا اور ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ہچکیاں میرے قابو میں نہیں رہیں اور نہ ہی میں آنسوؤں پر قابو پا سکا۔ میرا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔

مریم میرے قریب بیٹھ گئی۔ اُس نے مجھے سہارا دے کر اُٹھایا اور اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اُس وقت میں اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔

''بس مائی سن!'' مریم نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور میرے رخساروں پر بہنے والے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''تم ایک بہت دلیر اور حوصلہ مند نوجوان ہو۔ مجاہد..... اور مجاہد رویا نہیں کرتے..... تم ایک بہت بڑے مقصد کے لئے لڑ رہے ہو۔ اور جب مقصد بڑا ہو تو ایسی قربانیاں دینی ہی پڑتی ہیں۔ اس وقت کے بارے میں سوچو جب تم ان خونخوار بھیڑیوں کو وادی سے نکال پھینکو گے۔ اُن کے غلیظ وجود کے بغیر وادی کتنی حسین لگے گی..... کتنا سکون ہو گا یہاں..... پھر یہاں کسی کا خون نہیں بہے گا۔ کسی لڑکی کی عزت نہیں لٹے گی۔ آنے والی نسلیں یاد کریں گی اُن

لوگوں کو جنہوں نے اپنی عزت و آبرو اور جان کے نذرانے پیش کر کے اُنہیں آزادی کا تحفہ دیا۔ تم ایک باہمت نوجوان ہو..... حوصلہ ہار گئے تو یہ قربانیاں ضائع ہو جائیں گی۔ نہیں مائی سن..... تم ان قربانیوں کے امین ہو۔ انہیں ضائع نہیں ہونے دو گے۔''

مریم مجھے اپنے سینے سے لگائے بار بار میرا منہ چوم رہی تھی۔ کبھی میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگتی۔ گاہے بگاہے کمانڈر محبّ اللہ اور محمد اعظم کے ہمدردانہ بول بھی میری سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ میری ہچکیاں سسکیوں میں بدل گئیں اور پھر میں بتدریج پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ مریم کافی دیر تک مجھے اپنی آغوش میں لئے بیٹھی رہی پھر اُس نے آہستگی سے مجھے دوبارہ بستر پر لٹا دیا اور اُٹھ کر غار کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ کمانڈر محبّ اللہ اپنی جگہ سے سرک کر میرے اور قریب آ گیا اور ہمدردانہ باتیں کرنے لگا۔

تقریباً بیس منٹ بعد مریم بغیر دودھ کی چائے بنا کر لے آئی۔ مٹی کے مگ تھے۔ کثرت استعمال سے ان کا رنگ بھی اُڑ چکا تھا۔ ایلومینیم کی کیتلی بھی دُھویں سے بالکل کالی ہو رہی تھی۔ اُس نے چائے انڈیل کر ایک ایک مگا کمانڈر محبّ اللہ اور محمد اعظم کو دے دیا اور مجھے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ وہ ایک ہاتھ سے مجھے سہارا دیئے رہی اور دوسرے ہاتھ سے قہوے کا مگا میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

قہوے میں الائچی کی خوشبو تھی۔ پتی اور چینی کا تناسب بھی بہت مناسب تھا جس سے چائے خوش ذائقہ ہونے لگی۔ چائے پلانے کے بعد مریم نے مجھے لٹا دیا اور خود چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ کمانڈر محبّ اللہ اور محمد اعظم تقریباً دو گھنٹے وہاں رہے اور پھر اگلے روز آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ مریم غار کے دہانے تک اُن کے ساتھ گئی تھی اور پھر واپس آ کر میرے پاس بیٹھ گئی اور دیر تک باتیں کرتی رہی۔ پھر کچھ فاصلے پر بچھی ہوئی پیال پر لیٹ گئی۔ اُس کے قریب ہی دیوار کے ساتھ ایک سب مشین گن بھی ایستادہ تھی۔

میرا خیال تھا کہ ہم دونوں یہاں اکیلے رہ گئے ہیں۔ لیکن مریم نے بتایا کہ تین آدمی غار کے باہر مختلف جگہوں پر موجود ہیں۔

مریم کافی دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اور پھر میری پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکنے لگیں۔ مریم کی آواز مجھے بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو سات بج رہے تھے۔ وقت مریم نے بتایا تھا۔ غار کے اندر میرے لئے تو یہ اندازہ لگانا ہی ممکن نہیں تھا کہ دن کا وقت ہے یا رات کا؟ مریم نے مجھے اُٹھا کر منہ ہاتھ دُھلایا، اس دوران دو اور آدمی غار میں آ گئے تھے۔ اُن دونوں کی عمریں پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوں گی۔ دونوں کے قد لمبے اور ہاتھ پیر مضبوط تھے۔ دونوں کے کندھوں پر سب مشین گنیں لٹکی ہوئی تھیں۔ دونوں کی آنکھیں سرخ تھیں اور شیو بڑھے ہوئے تھے۔ اُن دونوں نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔

اُن میں سے ایک کا نام ضیغم تھا اور دوسرا چن پیر۔ وہ رات کو غار کے باہر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ اُن کا ایک ساتھی اب بھی باہر موجود تھا۔

مریم غار کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ اُس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اُس نے چائے کی کیتلی اور مگے میرے قریب ہی فرش پر رکھ دیئے اور دوسرے ہاتھ میں میلا سا دستر خوان بھی فرش پر ہی رکھ دیا جس میں روٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ مریم نے مگوں میں قہوہ اُنڈیل کر دستر خوان کھول دیا۔

روٹیاں موٹی موٹی تھیں اور آٹے میں نمک بھی ملا ہوا تھا۔ قہوے کے ساتھ یہ نمک والی روٹیاں واقعی مزہ دے گئیں۔ مجھے تو قہوے کے ساتھ نمک ملی روٹی کھانے میں مزہ آ رہا تھا، اس لئے کہ میں پہلی بار کھا رہا تھا۔ لیکن مجاہدین تو عرصہ سے اس چیز پر گزارہ کر رہے تھے۔ یہی اُن کے لئے من وسلویٰ تھا اور یہ خوراک کبھی کبھی اُنہیں نصیب ہوتی تھی اور کبھی دو دو دن فاقے کرنے پڑتے تھے۔

ضیغم اور چن پیر ناشتہ کر کے میرے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے، پھر ایک طرف فرش پر پڑ کر سو گئے۔ اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد اُن کا تیسرا ساتھی بھی آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ بارہ مولا سے دو لڑکے آ گئے ہیں جنہوں نے غار کے باہر ڈیوٹی سنبھال لی ہے۔ وہ نوجوان بھی ناشتہ کر کے سو گیا۔

ڈاکٹر مریم نے برتن سنبھالے اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ وہ دھیمے لہجے میں مجھے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی مجاہدین کے لئے وقف کر دی تھی۔ ان پچھلے دو برسوں کے دوران اُسے بڑے سنگین تجربات سے گزرنا پڑا تھا۔ کئی مرتبہ موت سے آمنا سامنا بھی ہوا تھا۔ ایک مرتبہ وہ خود بھی زخمی ہوئی تھی۔ اور پھر ایک اور موقع پر وہ اس سے بھی زیادہ سنگین صورتحال میں پھنس گئی تھی۔ اس موقع پر کمانڈر محب اللہ نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ پاکستان واپس چلی جائے۔ مگر مریم نے صاف انکار کر دیا تھا کہ مجاہدین کو اس کی ضرورت ہے اور وہ اُنہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ جس طرح مجاہدین کی تنظیموں کے بعض لیڈر بھارتی فوج کو سب سے زیادہ مطلوب تھے، اسی طرح ڈاکٹر مریم بھی موسٹ وانٹڈ تھی۔

بھارتی فوج کی کشمیری ہائی کمان کو پتہ چل گیا تھا کہ مریم نام کی ایک عورت زخمی ہونے والے مجاہدین کی مسیحائی کر رہی ہے۔ اُنہیں نئی زندگی دے رہی ہے اور وہی مجاہدین صحت یاب ہو کر بھارتی فوجیوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ فوج کی ہائی کمان نے بعض مجاہدین کے ساتھ ڈاکٹر مریم کے سر کی قیمت مقرر کر رکھی تھی۔

لیکن ڈاکٹر مریم اس صورتحال سے خوفزدہ نہیں تھی۔ اُس نے نہ تو کبھی یہاں سے بھاگنے کا سوچا تھا اور نہ ہی کہیں چھپ کر بیٹھی تھی۔ وہ کسی ایک جگہ ٹک کر بھی نہیں بیٹھتی تھی۔ ہر جگہ اُس کی ضرورت رہتی تھی۔ کبھی وہ بارہ مولا میں ہوتی، کبھی گلمرگ میں، کبھی پہل گام اور کبھی اننت ناگ میں، کبھی سرینگر اور کبھی جموں میں، جہاں اُس کی ضرورت ہوتی وہ پہنچ جاتی۔ ان علاقوں میں بعض غار تو ایسے تھے جو چھوٹے چھوٹے ہسپتالوں کا منظر پیش کرتے تھے۔ کہیں تین زخمی مجاہدین زیر علاج تھے اور کہیں اُن کی تعداد نصف درجن سے بھی زیادہ ہوتی۔ یوں اُن زخمی مجاہدین کی دیکھ بھال کے لئے ہر جگہ کوئی نہ کوئی موجود ہوتا۔ مگر ڈاکٹر مریم بھی بلاخوف وخطر ان علاقوں کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ اور ڈاکٹر مریم کے حق میں ایک اچھی بات یہ تھی کہ بھارتیوں کے پاس اُس کی کوئی شناخت نہیں تھی۔

''میں ایک مرتبہ بڑی دلچسپ صورتحال سے دوچار ہو گئی تھی۔'' ڈاکٹر مریم مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔ ''میں اُن دنوں پہلگام گئی ہوئی تھی۔ اُس علاقے میں سکھوں کی آبادی کچھ زیادہ ہے۔ لیکن وقتاً فوقتاً وہ بھی بھارت کے متعصب ہندو فوجیوں کے عتاب کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ دو دن پہل گام میں رہنے کے بعد اننت ناگ کی طرف جا رہی تھی کہ راستے میں ہماری بس روک لی گئی۔ بھارتی فوج کی ہائی کمان کو اطلاع ملی تھی کہ مجاہدین اس طرف کوئی بڑی کارروائی کرنے والے ہیں اس لئے پہلگام سے اننت ناگ تک فوجی پارٹیاں جگہ جگہ بسوں کو چیک کر رہی تھیں۔ ہمیں جس پارٹی نے روکا تھا اُس میں آٹھ فوجی شامل تھے جن کا انچارج ایک نوجوان سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ اُن کی جیپ سڑک کے عین وسط میں کھڑی تھی۔ مسلح فوجیوں نے بس کو گھیرے میں لے لیا اور تمام مسافروں کو نیچے اُترنے کا حکم دیا اور اُنہیں لائن میں کھڑا کر کے تلاشی لی جانے لگی۔

بس کے مسافروں میں میرے ساتھ کچھ اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ فوجی بلا لحاظ اُن کے جسموں کو بھی ٹٹول رہے تھے کہ اُنہوں نے اپنے لباس کے نیچے کوئی اسلحہ تو نہیں چھپا رکھا؟ میرے کندھے پر کپڑے کا ایک میلا سا تھیلا لٹکا ہوا تھا جس میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ کچھ ضروری ادویات اور انجکشن وغیرہ بھی تھے۔ میں مسافروں کی قطار میں ساتویں نمبر پر تھی۔ نوجوان ہندو لیفٹیننٹ چند گز دُور کھڑا بڑی ہوس بھری نظروں میں قطار میں کھڑی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری باری بھی آ گئی۔ میرے سامنے کھڑے ہوئے فوجی نے تلاشی لینے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ لیفٹیننٹ اچانک ہی کراہ اُٹھا اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر جھکتا چلا گیا۔ تمام فوجی اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

لیفٹیننٹ پہلے نیچے بیٹھا اور پھر سڑک پر لیٹ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے ہوئے تھا۔ چہرے پر بے پناہ کرب کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اُسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ دو فوجی اُسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ بری طرح پیر پٹخ رہا تھا۔

''کیا تم میں کوئی ڈاکٹر ہے؟'' ایک فوجی نے بس کے مسافروں کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر کہا۔ میں غیر ارادی طور پر آگے بڑھ گئی۔ لیفٹیننٹ کی حالت واقعی بہت ابتر تھی۔ سینے میں بہت شدید درد اُٹھا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سینے کو دبائے ہوئے دوہرا ہوا جا رہا تھا۔

میں نے اُس کے قریب جھک کر چند سوال کئے جن کا جواب اُس نے بڑی مشکل سے کراہتے ہوئے دیا تھا۔ اُس کی باتوں سے مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ وہ انجائنا کا مریض تھا لیکن اُس نے کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ تاہم اس قسم کی ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لئے اُس کی جیب میں اینجی سڈ کی گولیاں موجود رہتی تھیں۔

میں نے اُس کی جیب سے ایک گولی نکال کر اُس کی زبان کے نیچے رکھ دی اور اپنا تھیلا کندھے سے اُتار کر ٹٹولنے لگی۔ اتفاق سے تھیلے میں والٹران کے دو انجکشن موجود تھے۔ میں نے ایک انجکشن اُس کی وین (نس) میں لگا دیا۔ ایک فوجی میری مدد کر رہا تھا۔

میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بھارتی فوج کا لیفٹیننٹ ہے۔ یہی بھیڑیئے ہمارے مجاہدین پر گولیاں برساتے ہیں اور ان کے جسموں میں انگارے بھر دیتے ہیں۔ بس کی تلاشی کے دوران بھی یہ کسی بے گناہ نوجوان کو تشدد کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ اُس کے سینے میں اُٹھنے والا درد جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اگر چاہتی تو اُسے تڑپ تڑپ کر مر جانے دیتی۔ مگر میں ڈاکٹر ہوں۔ مسیحائی میرا کام ہے۔ میں زندگی دیتی ہوں چھینتی نہیں۔ اور پھر طب کا پیشہ دین دھرم نہیں دیکھتا۔ میں اُس ہندو لیفٹیننٹ کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اسے ہسپتال پہنچانا ضروری ہے۔'' میں نے ایک فوجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دل کا دورہ پڑا ہے۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے مگر صرف یہ انجکشن کافی نہیں ہے۔''

بات اُن فوجیوں کی سمجھ میں آ گئی۔ اُنہوں نے اپنے آفیسر کو اُٹھا کر جیپ کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ لیفٹیننٹ اُس وقت اگرچہ کسی حد تک پُرسکون ہو چکا تھا مگر اُس کی حالت تشویش ناک تھی۔ تکلیف دوبارہ شدت اختیار کر سکتی تھی۔

''دیوی جی.....!'' وہی فوجی جس نے انجکشن لگانے میں میری مدد کی تھی میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی بڑی کرپا ہے۔ وقت پر کام آ گئیں۔ لیکن اگر راستے میں ہمارے صاحب کو تکلیف ہو گئی تو ہم کیا کریں گے؟ آپ کی مہربانی ہو گی دیوی جی! آپ ہمارے ساتھ چلیں۔''

میں نے بس کے دوسرے مسافروں کی طرف دیکھا۔ بعض کے چہروں پر شدید ناگواری کے تاثرات تھے لیکن میں کسی کو اس طرح بے بسی کی موت مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لئے اپنا تھیلا سنبھال کر خاموشی سے جیپ میں بیٹھ گئی۔ وہ بڑی جیپ تھی۔ تمام فوجی اُس میں لد گئے اور جیپ حرکت میں آ گئی۔ اُس کا رُخ انت ناگ کی طرف تھا جو وہاں سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر تھا اور یہ دس میل بڑے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ کسی بھی موڑ پر کسی بھی وقت مجاہدین کی کوئی پارٹی اُس جیپ پر حملہ کر سکتی تھی۔ ایسی صورت میں، میں بھی لپیٹ میں آ جاتی۔

فاصلہ اگرچہ دس میل تھا مگر پہاڑوں میں بل کھاتا ہوا راستہ بڑا خوفناک تھا اس لئے جیپ کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ راستے میں ہمیں دو اور فوجی ٹرک ملے۔ وہاں سے ایک راستہ پہاڑیوں میں کسی دوسری طرف نکلتا تھا۔ اُس طرف سے مجاہدین کے حملے کا زیادہ خطرہ تھا اس

لئے فوجی ٹرک اُس راستے کی ناکہ بندی کئے ہوئے تھے۔ ہماری جیپ ایک منٹ کو اُن ٹرکوں کے پاس رُکی اور پھر آگے روانہ ہو گئی۔ اور تقریباً ایک گھنٹے میں دس میل کا فاصلہ طے کر کے ہم انت ناگ کے چھوٹے سے ہسپتال میں پہنچ گئے۔

لیفٹیننٹ کو فوراً ہی ایمرجنسی میں پہنچا دیا گیا۔ دو ہندو ڈاکٹر فوراً ہی اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں اُنہیں بتا رہی تھی کہ میں نے لیفٹیننٹ کو ٹریٹمنٹ دیا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''یہ انجکشن تو کوئی ڈاکٹر ہی دے سکتا ہے۔ اور پھر تمہارے پاس وہ انجکشن کہاں سے آیا؟'' اُس ڈاکٹر کی آنکھوں میں شبے کی جھلک تھی۔

''میں بھی ڈاکٹر ہوں.....'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بعض ادویات اپنے پاس رکھتی ہوں۔ کسی ایسے ہی موقع پر کسی کی زندگی بچانے کے کام آ جاتی ہیں۔''

ڈاکٹر کو مجھ پر شبہ ہو چکا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ سوالات کرتا رہا۔ مجھ پر کچھ گھبراہٹ سی طاری ہو رہی تھی۔ مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔ اور پھر موقع پاتے ہی میں ہسپتال سے نکل گئی۔

میں خیریت سے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئی۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ پورے شہر میں میری تلاش ہو رہی تھی۔ فوجی پارٹیوں نے محض شبہ کی بناء پر کئی گھروں پر چھاپے مارے تھے اور میرے بارے میں پوچھ گچھ کے لئے عورتوں اور بچوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اُنہیں ڈاکٹر مریم کی تلاش تھی جو کشمیر کی آزادی کے لئے لڑنے والے مجاہدین کی مددگار تھی اور جس کے سر کی قیمت مقرر کی جا چکی تھی۔''

مریم خاموش ہو گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ کہہ رہی تھی۔ ''دیکھا تم نے..... یہ ہندو کس گندی فطرت اور گندی ذہنیت کے مالک ہیں۔ میں نے اُن کے ایک آفیسر کو موت کے منہ سے بچایا تھا اور وہ مجھے تلاش کر رہے تھے میرا جسم گولیوں سے چھلنی کرنے کے لئے۔''

میں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا..... یہ بنیا قوم واقعی بڑی گندی فطرت کی مالک تھی۔ احسان فراموش اور محسن کش۔

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ غار کے دوسرے حصے سے بھاری قدموں کی آواز سن کر اُس طرف دیکھنے لگا۔ مریم بھی اُس طرف دیکھ رہی تھی۔ قدموں کی آواز قریب آ رہی تھی۔ اور پھر دو آدمی سامنے آ گئے۔ ایک کمانڈر محب اللہ تھا اور دوسرا کمانڈر رشید۔

کمانڈر رشید کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کمانڈر رشید نے جھک کر بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے قریب ہی زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میری خیر خیریت دریافت کی اور میرے اُوپر سے کمبل ہٹا کر میرے زخم دیکھنے لگا۔ میری حالت دیکھ کر اُس کے جبڑے بھنچ گئے تھے۔ قریب بیٹھے ہوئے کمانڈر محب اللہ نے بھی اُس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔

''بڑا حوصلہ مند اور آہنی اعصاب کا مالک ہے یہ نوجوان۔'' اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جب یہ ہمیں بے ہوشی کی حالت میں ملا تھا تو مجھے اُمید نہیں تھی کہ یہ زندہ بچے گا۔ لیکن اس کے حوصلے اور قوتِ ارادی کی داد دینی پڑتی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ نوجوان آگے چل کر بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے گا۔''

اس کا حوصلہ میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔'' کمانڈر رشید نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''سرینگر گلمرگ شاہراہ پر فوجی کانوائے تباہ کرنے میں اس نے جس طرح ہمارا ساتھ دیا تھا وہ قابل تعریف ہے۔ اس کے حوصلے کی داد دینی چاہئے۔ اتنا بڑا صدمہ جس طرح جھیل گیا ہے وہ بڑے جگرے کی بات ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے قصبے میں جو کچھ بھی ہوا ہے اُسے یاد رکھنا اور اُن لوگوں کو بھی یاد رکھنا جو وادی میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ پر غاصب بھارتیوں کے ظلم وستم کا شکار ہو رہے ہیں۔ اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنا کہ آزادی قربانی کی بانہوں میں ملتی ہے۔ اگر تم یہ سب کچھ یاد رکھو گے تو ہمارے ان بہن بھائیوں، بزرگوں اور بچوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔''

''میں یاد رکھوں گا کمانڈر!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ کیسے بھلا سکتا ہوں؟''

''شاباش.....!'' کمانڈر رشید نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ اُس نے ہاتھ میرے مضروب کندھے پر مارا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اپنی تکلیف کو ضبط کر سکا تھا۔

ڈاکٹر مریم مہمان نوازی کی رسم پوری کرتے ہوئے قہوہ بنا لائی۔ کمانڈر قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے مریم سے میرے بارے میں دریافت کرنے لگا۔

''کسی بیمار کے صحت یاب ہونے میں اس کی اپنی قوتِ ارادی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔'' مریم نے جواب دیا۔ ''اور شمروز تو بہت ہی مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر تو میں سمجھی تھی کہ یہ کئی ہفتوں تک اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکے گا۔ لیکن آج دوسرا ہی دن ہے اور یہ خود سے اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔'' وہ چند لمحے کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''زخم مندمل ہونے میں چند روز لگیں گے۔ اس کے بعد بھی چند روز آرام کی ضرورت محسوس ہو گی۔ لیکن مجھے یقین ہے یہ آرام نہیں کرے گا۔'' بات ختم کرتے ہوئے اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''ہاں.....!'' کمانڈر محبّ اللہ بھی مسکرا دیا۔ ''میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ اس کے ہاتھ رائفل اُٹھانے کے لئے بے چین ہو رہے ہیں۔''

میں خاموش بیٹھا دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔ اپنے بارے میں ان تجربہ کار اور کہنہ مشق مجاہدین کی آراء سن کر مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ میں واقعی ایک بار پھر رائفل اُٹھانے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔

اور پھر اُن کی گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

''بھارتی درندوں نے سوپور میں جو تباہی پھیلائی ہے اُس کی جوابی کارروائی کے لئے تم نے کیا سوچا ہے محبّ اللہ؟'' کمانڈر رشید نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔ مگر میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے جواب دیا۔ ''تم جانتے ہو یہ بھارتی فوجی اس قسم کی کوئی بڑی کارروائی کرنے کے بعد بہت محتاط ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم ان کے فوجی کیمپوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ یوں تو فوجی کیمپوں کے اردگرد اُن کا پہرہ بڑا سخت ہوتا ہے لیکن ایسے موقعوں پر وہ کچھ زیادہ ہی محتاط ہو جاتے ہیں اور کسی اجنبی کو کیمپ کے آس پاس دیکھتے ہی گولی سے اُڑا دیتے ہیں اس لئے ہمیں جلد بازی سے کام لینے کی بجائے چند روز انتظار کرنا پڑے گا۔''

''ویسے تمہارے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟'' کمانڈر رشید نے پوچھا۔

''گلمرگ.....!'' کمانڈر محبّ اللہ نے جواب دیا۔ ''تم جانتے ہو گلمرگ ایک بہت بڑی چھاؤنی بن چکا ہے۔ یہ چھاؤنی شہر کے مشرق میں پہاڑ کے دامن تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ اور شاید اس طرف وہ مزید آگے نہیں بڑھنا چاہتے اس لئے وہ شہر کے جنوب کی پہاڑیوں میں بھی ایک بہت بڑا کیمپ بنا رہے ہیں۔ ایک مہینہ پہلے میں نے ان چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بہت دُور تک اُنہیں خاردار تاریں لگاتے دیکھا تھا۔ خاردار تاروں کی اُس باڑ میں جگہ جگہ نگران چوکیاں بھی بنا رہے ہیں تاکہ کیمپ کے باہر دُور تک نگاہ رکھی جا سکے۔ اُس طرف کی پہاڑیاں زیادہ اُونچی نہیں ہیں۔ کیمپ بنانے کے لئے وہ یقیناً بہت اچھی جگہ ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میرے آدمی اُس علاقے پر مسلسل نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور مجھے ان کی رپورٹس بھی ملتی رہتی ہیں۔ مجھے ملنے والی اطلاعات کے مطابق اُس کیمپ میں فوجی ٹرکوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی ہے۔ لیکن ہمیں چند روز اور انتظار کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ وہاں اُن کی سرگرمیاں کیا رُخ اختیار کرتی ہیں؟''

''اس طرف سے میں بھی غافل نہیں ہوں۔'' کمانڈر رشید نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''میرے آدمی بھی علاقے پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور مجھے ملنے والی اطلاعات کے مطابق وہاں اسلحہ اور گولہ بارود کا ڈپو قائم کیا جا رہا ہے۔''

''یہ بڑی تشویشناک خبر ہے۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے کہا۔ ''گلمرگ کی چھاؤنی پہلے ہی ہمارے لئے بہت بڑا خطرہ بنی ہوئی ہے۔ اُس چھاؤنی کی وجہ سے اس علاقے میں ہماری سرگرمیاں محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ اگر یہ ڈپو بن گیا تو ہمارے لئے مزید مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اس لئے ہمیں جلد سے جلد اس کا حل سوچنا ہو گا۔'' وہ خاموش ہو کر داڑھی کھجانے لگا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا منصوبہ یہی تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں کوئی کیمپ قائم کیا جا رہا ہے۔ اور میں اس کے خلاف کارروائی کے لئے چند روز انتظار کرنا چاہتا تھا۔ انتظار تو اب بھی کرنا پڑے گا۔ میرے

خیال میں ابھی وہاں اسلحہ جمع ہونا شروع نہیں ہوا۔ ہمیں اس علاقے کی نگرانی سخت کر دینی چاہئے۔ اور جیسے ہی وہاں گولہ بارود جمع ہونا شروع ہو، ہلہ بول دینا چاہئے۔''

''میں نے بھی یہی سوچ رکھا ہے اور اس کے لئے اپنے طور پر تیاری بھی شروع کر دی ہے۔'' کمانڈر رشید نے کہا۔

''کیسی تیاری؟'' محب اللہ نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اُس علاقے کے آس پاس اسلحہ جمع کرنے کی۔'' کمانڈر رشید نے کہا۔ ''ہم رائفلوں یا سب مشین گنوں سے اُس کیمپ کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس کے لئے ہمیں ایسی چیزوں کی ضرورت پڑے گی جس سے گولہ بارود کے اُس ڈپو کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جا سکے۔''

''مثلاً.....؟'' کمانڈر محب اللہ نے پوچھا۔

''راکٹ.....'' کمانڈر رشید نے جواب دیا۔ ''میرے پاس بھارتی فوجیوں ہی سے چھینے گئے تین بزوکا (کندھے پر رکھ کر راکٹ فائر کرنے والا لانچر) اور پانچ راکٹ موجود ہیں۔ لیکن ان سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں زیادہ راکٹوں کی ضرورت ہوگی۔ اس کے علاوہ اگر دو تین ایل ایم جی (لائٹ مشین گنیں) بھی مل جائیں تو ہمارے لئے آسانی ہو جائے گی۔''

''ایک ایل ایم جی میرے پاس ہے۔ لانچر اور راکٹ کون سے ہیں؟'' محب اللہ نے پوچھا۔

''روسی ساخت کے ہیں۔'' کمانڈر رشید نے کہا اور راکٹوں کے بارے میں بتانے لگا۔

''ٹھیک ہے.....'' کمانڈر محب اللہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں بھی ان چیزوں کا بندوبست کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ کارروائی اس طرح بھرپور انداز میں ہونی چاہئے کہ وہ لوگ گلمرگ سے اپنی چھاؤنی اُٹھانے پر بھی مجبور ہو جائیں۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' کمانڈر رشید بولا۔ ''ایک نہ ایک روز گلمرگ تو کیا انہیں وادی میں ہر جگہ سے اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑے گا۔''

چند لمحے خاموشی رہی اور پھر وہ لوگ وادی کی مجموعی صورتحال کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ میں بڑی توجہ سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ دوپہر کے وقت وہ دونوں واپس چلے گئے۔ اُن کے جانے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد اسی غار میں ایک طرف ننگے فرش پر سوئے ہوئے ضیغم اور چن پیر بھی جاگ گئے۔ اُنہوں نے رات بھر غار کے باہر پہرے کی ڈیوٹی دی تھی اور اس قدر گہری نیند سوئے تھے کہ اُنہیں محب اللہ اور کمانڈر رشید کے آنے اور جانے کا بھی پتہ نہیں چلا تھا۔

ڈاکٹر مریم نے اُن کے لئے روٹیاں دستر خوان میں لپیٹ کر رکھی تھیں۔ البتہ قہوہ تازہ بنا دیا۔ وہ لوگ روٹی کھا کر چار بجے کے قریب اپنی رائفلیں سنبھال کر باہر چلے گئے۔ کیونکہ اُن کی جگہ جو مجاہد ڈیوٹی دے رہے تھے اُنہیں شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے بارہ مولا واپس پہنچنا تھا۔

ڈاکٹر مریم مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ وہ نہ صرف زخمی مجاہدین کی مسیحائی کرتی تھی بلکہ اُن کے لئے کھانا بھی وہی پکاتی تھی۔ کھانے میں وہی نمک والی روٹیاں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی مجاہد بارہ مولا سے گوشت وغیرہ بھی لے آتا تھا یا کہیں دُور جا کر کوئی جانور شکار کر لیا جاتا تھا۔ اسطرح کبھی کبھار گوشت بھی کھانے کو مل جاتا۔

دن گزرتے رہے۔ میں ڈاکٹر مریم کی مسیحائی اور کچھ اپنی ول پاور کی بدولت بڑی تیزی سے روبصحت ہو رہا تھا۔ جسم کے مختلف حصوں پر بعض چھوٹے زخم تو بالکل ٹھیک ہو چکے تھے۔ ٹانگ کے دونوں زخم بھی مندمل ہو رہے تھے۔ البتہ کندھے کی تکلیف میں کچھ زیادہ کمی نہیں آئی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ ہڈی میں فریکچر نہ ہو گیا ہو۔ اُس غار میں ایکسرے کا تو ظاہر ہے کوئی بندوبست نہیں تھا مگر ڈاکٹر مریم ایک ماہر اور تجربہ کار سرجن تھی۔ وہ کئی برسوں تک آزاد کشمیر اور پاکستان کے مختلف ہسپتالوں میں خدمات انجام دے چکی تھی اور دو سال سے مجاہدین کی مسیحائی کر رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ہڈی میں فریکچر نہیں تھا کیونکہ اُس کے خیال میں فریکچر ہوتا تو میں اپنے کندھے یا اُس بازو کو بھی حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

آٹھ دن بعد میں اُٹھ کر آہستہ آہستہ غار ہی میں تھوڑا بہت چلنے پھرنے لگا تھا۔ اور پھر ایک روز ڈاکٹر مریم کو بڈگام جانا پڑ گیا۔ یہ قصبہ بارہ مولا سے تقریباً چالیس میل اور سرینگر سے چند میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ بڈگام کی نواحی پہاڑیوں میں بھی ایک ایسا ہی خفیہ غار تھا جہاں زخمی مجاہدین کا علاج اور دیکھ بھال کی جاتی تھی۔

بارہ مولا سے بڈگام تک جانے کے لئے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ پہلے سرینگر جایا جائے اور وہاں سے بڈگام کا رُخ کیا جائے۔ اور دوسرا راستہ کروڑ اور ماگام نامی قصبوں سے ہو کر جاتا تھا۔ اس راستے سے فاصلہ نسبتاً کم تھا۔ اس طرف کوئی باقاعدہ اور پختہ سڑک بھی نہیں تھی۔ پتھریلے راستے تھے جن پر کھٹارہ سی بسیں یا جیپیں چلتی تھیں۔ لیکن اس طرف بھی بھارتی فوجیوں کے دستے پیٹرولنگ کرتے رہتے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وادی کشمیر کا کوئی بھی علاقہ اُن کے ناپاک قدموں سے محفوظ نہیں تھا۔ مگر فوجیوں کی کڑی پیٹرولنگ کے باوجود مجاہدین اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔

بارہ مولا سے بڈگام پہنچنے کا ایک تیسرا راستہ بھی تھا جسے باقاعدہ راستہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی تنگ سی پگڈنڈیاں تھیں جن پر پیدل یا صرف خچروں پر سفر کیا جا سکتا تھا۔ اور کوئی سواری ان راستوں پر سفر نہیں کر سکتی تھی۔ مجاہدین عام طور پر ایسے ہی راستوں پر پیدل، خچروں پر یا پھر کبھی کبھار موٹر سائیکل پر سفر کیا کرتے تھے۔ ایسے راستے مجاہدین کے لئے سب سے زیادہ محفوظ تھے کیونکہ بھارتی سورما ان تنگ راستوں کی طرف آنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر مریم نے یہی تیسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ اُسے لینے کے لئے ایک موٹر سائیکل سوار مجاہد غار میں پہنچ گیا تھا۔

ڈاکٹر مریم نے اپنا کپڑے کا میلا سا تھیلا کندھے پر لٹکا لیا۔ میرے قریب بیٹھ کر کئی منٹ تک ہدایات دیتی رہی میں زیادہ نہ چلوں پھروں، کندھے کو زیادہ حرکت نہ دُوں وغیرہ

وغیرہ..... اُس نے چن پیر اور ضیغم کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ میرا ہر طرح سے خیال رکھیں۔

ڈاکٹر مریم کے جانے کے بعد اُن دونوں نے واقعی میرا بہت خیال رکھا۔ مجھے وقت پر روٹی اور چائے ملتی رہی۔ ضیغم باقاعدگی سے صبح شام میرے کندھے کی مالش بھی کرتا رہا۔ تیسرے روز چن پیر بہت دُور جا کر ایک پہاڑی بکرا شکار کر لایا تھا۔

اُس نے بڑی مہارت سے بکرے کی کھال اُتاری اور گوشت کے بڑے بڑے پارچے بنا ڈالے۔ یہ کام وہ اس غار کے دوسرے حصے میں کر رہا تھا اور میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے قریب آ گیا تھا۔

چن پیر نے بکرے کی دونوں رانیں الگ کر لیں اور باقی گوشت نمک لگا کر اس طرح سنبھال کر رکھ دیا کہ کم از کم ایک ہفتے تک خراب نہ ہو سکے۔ اُس نے غار کے ایک کونے میں آگ جلا لی اور رانیں بھوننے لگا۔ لکڑیوں کا دُھواں اُوپر جا کر غار کی چھت میں کہیں غائب ہو رہا تھا۔

میں الاؤ کے قریب ایک پتھر پر بیٹھا بڑی دلچسپ نظروں سے روسٹ ہوتی ہوئی بکرے کی رانوں اور کبھی ضیغم کی طرف دیکھتا رہا۔

مریم چار دن بعد لوٹی تھی۔ وہ بڈگام سے واپسی پر سرینگر بھی ہو کر آئی تھی جہاں سے کچھ دوائیں وغیرہ خریدی تھیں۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ اس دوران کمانڈر محب اللہ بھی دو تین چکر لگا چکا تھا۔ اُس سے مجھے وادی کے مختلف مقامات پر مجاہدین کی سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ بھارتی وحشیوں کے خلاف اُن کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ بھارتی فوجیوں سے چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں جن میں بھارتیوں کو قابلِ قدر جانی و مالی نقصان پہنچایا جا رہا تھا۔ مجاہدین چھاپہ مار کارروائی مکمل کر کے پہاڑوں میں روپوش ہو جاتے اور بھارتی فوجی اُن کی تلاشی کے بہانے قرب و جوار کی بستیوں پر ہلہ بول دیتے اور بے گناہ بوڑھوں، معصوم بچوں اور عورتوں کو تشدد کا نشانہ بناتے۔ عورتوں کے ساتھ زیادتی اُن کا معمول بن چکا تھا۔ اس قسم کی خبریں بھی ملتی رہتی تھیں کہ فلاں بستی سے بھارتی فوجی کسی عورت کو اُٹھا کر لے گئے اور اجتماعی آبروریزی کے بعد اُسے جنگل میں پھینک کر چلے گئے۔ اس قسم کی خبریں سن کر میرا خون کھول اُٹھتا۔ میں نیلم اور حمیدہ کی نچی ہوئی لاشیں دیکھ چکا تھا جنہیں اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا۔ میری بہن زینب لا پتہ تھی۔ اُس کے بارے میں بھی میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ اُسے بھی ہوس کا نشانہ بنا کر یا تو ختم کر دیا گیا ہو گا اور یا اُن کی قید میں پڑی سسکیاں بھر رہی ہو گی۔

میں اب غار میں پڑے پڑے اُکتا چکا تھا۔ میری ٹانگ اور دوسرے زخم بالکل ٹھیک ہو چکے تھے۔ مجھے اب چلنے پھرنے یا حرکت کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ تاہم کندھے میں کچھ تکلیف ابھی باقی تھی۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اپنی معمول کی سرگرمیاں شروع کر دوں گا تو یہ

تکلیف بھی ختم ہو جائے گی۔

اُس روز ایک اور خبر نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ گزشتہ رات ایک جھڑپ میں بھارتی فوج کا ایک میجر اور سات فوجی مجاہدین کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اس جھڑپ میں دو مجاہد بھی شہید ہوئے تھے۔ جبکہ دوسرے مجاہدین پہاڑیوں میں روپوش ہو گئے تھے۔

بھارتی فوجیوں کا ایک دستہ شہید ہونے والے مجاہدین کی لاشیں لے کر پتن پہنچ گیا۔ پتن زیادہ بڑا قصبہ نہیں تھا۔ بھارتیوں نے مجاہدین کی لاشیں قصبے کے مرکزی چوک پر ڈال دیں اور اعلان کر دیا کہ یہاں پناہ لینے والے مجاہدین کو اُن کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر کسی مجاہد نے پتن کا رُخ نہیں کیا تھا۔

بھارتی فوجیوں نے سنگدلی اور بربریت کا ایک اور مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں شہید مجاہدین کی آنکھیں نکال دیں اور سنگینوں سے اُن کے پیٹ چاک کر دیئے اور لاشوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر چوک میں گھسیٹنے لگے۔

مجاہدین کی لاشوں کی یہ بے حرمتی قصبے والوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھی مگر وہ سب نہتے تھے۔ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن دو نوجوانوں کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے بھارتی فوجیوں پر ٹوٹ پڑے۔ بھارتی فوجی یہ سمجھے کہ گاؤں میں چھپے ہوئے مجاہدین نے اُن پر حملہ کر دیا ہے۔ فوجیوں نے اندھا دُھند فائر کھول دیا۔ اُن پر جھپٹنے والے دونوں نوجوان چھلنی ہو کر گر پڑے۔ اندھا دُھند برسائی جانے والی گولیوں نے کئی اور بیگناہوں کو بھی چاٹ لیا۔ بھارتی درندے کئی بے گناہوں کی لاشیں گرا کر بھاگ گئے۔

اس قسم کے واقعات روز کا معمول بن چکے تھے۔ میری قوت برداشت بھی اب جواب دیتی جا رہی تھی۔ اور اُس روز جب کمانڈر محب اللہ کچھ دیر کے لئے آیا تو میں نے اُس پر اپنی اُکتاہٹ اور بیزاری کا اظہار کر ہی دیا۔ کمانڈر نے سوالیہ نگاہوں سے ڈاکٹر مریم کی طرف دیکھا۔

''اب یہ بالکل ٹھیک ہے..... اور میرا خیال ہے کہ آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔'' ڈاکٹر مریم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی اور میں اُچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''میرے خیال میں تمہیں کچھ اور آرام کی ضرورت تھی۔ لیکن ایک اہم مشن میں مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اس لئے مریم کی بات بھی مان لیتا ہوں۔ تم تیار ہو جاؤ! ہم آدھے گھنٹے بعد یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔'' کمانڈر محب اللہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے جسم پر اُس وقت ایک لمبا سا کرتہ اور گھٹنوں تک نیکر تھی۔ مجھے یاد تھا کہ ایک مہینے پہلے جب بھارتی فوجیوں نے ہمارے قصبے پر حملہ کیا تھا تو میں نے پینٹ اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ جبکہ میری ٹانگ کے زخموں کی مرہم پٹی کرنے کے لئے میری پتلون کو کاٹ کر نیکر بنا دیا گیا تھا۔ بعد میں، میں نے ایک ساتھی مجاہد کا کرتہ پہن لیا تھا جبکہ جسم کے نچلے حصے پر وہی نیکر تھی۔

''ایک منٹ..... میں تمہیں ضیغم کے کپڑے دیتی ہوں..... وہ پہن لو!'' مریم کہتے ہوئے غار کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی چل پڑا۔ یہ غار بہت بڑا اور کئی حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصے میں راشن اور ضروریات کا دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ ایک حصہ کچن بنا ہوا تھا۔ اُس طرف کی چھت اور دیواریں دُھویں سے کالی ہو رہی تھیں۔ باقی دو حصے رہائش کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ یہ غار اگرچہ پہاڑ کے اندر خاصی گہرائی میں تھا لیکن یہاں گھٹن کا احساس بالکل نہیں تھا۔ تازہ ہوا کسی نہ کسی طرف سے آتی رہتی تھی۔ میں ڈاکٹر مریم کے ساتھ غار کے جس حصے میں آیا تھا وہ مجاہدین کی رہائش کے لئے استعمال ہوتا تھا اور یہ حصہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ یہاں فرش پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ چند رائفلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اُن میں دو ایس ایم جی بھی تھیں۔ اُن کے قریب ہی فاضل میگزینز کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اُس دیوار پر ٹھکی ہوئی کیلوں پر کپڑوں کے تین چار جوڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر مریم نے ایک جوڑا اُتار کر میری طرف بڑھا دیا۔ کپڑا کھدر کی طرح موٹا اور کھردرا تھا۔

''یہ کپڑے میں نے کل ہی دھو کر یہاں ٹانگے تھے۔ یہ پہن لو! اور تمہیں رائفل کی بھی ضرورت ہوگی۔'' اُس نے یہ کہتے ہوئے رائفلوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان میں سے جو رائفل تمہیں پسند ہو لے لینا اور میگزین بھی۔ تم تیار ہو جاؤ! میں چائے بناتی ہوں۔'' ڈاکٹر مریم باہر چلی گئی۔ میں نے کپڑے بدلے اور رائفلیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ مجھے ایک ایس ایم جی پسند آ گئی۔ گلمرگ شاہراہ پر جب ہم نے فوجی قافلے پر حملہ کیا تھا تو اُس وقت بھی میرے پاس سب مشین گن ہی تھی۔

ایس ایم جی چیک کرنے کے بعد میں نے دو میگزین بھی اُٹھا لئے اور غار کے اُس حصے میں آ گیا جہاں کمانڈر محبّ اللہ بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایس ایم جی دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر مریم قہوہ لے کر آ گئی۔ قہوہ پینے کے دوران زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔ کمانڈر محبّ اللہ نے قہوہ کا آخری گھونٹ بھرا اور خالی مگا فرش پر رکھتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں بھی اُٹھ گیا اور قریب پڑی ہوئی ایس جی ایم اُٹھا کر کندھے پر لٹکا لی۔

ڈاکٹر مریم غار کے دہانے تک ہمارے ساتھ آئی تھی۔ اُس نے میری پیشانی پر بوسہ دے کر اس طرح رخصت کیا جیسے ماں اپنے بیٹے کو اپنی دُعاؤں کے سائے میں محاذِ جنگ پر جانے کے لئے رخصت کرتی ہے۔

میں دو تین مرتبہ پہلے بھی غار کے دہانے تک آ چکا تھا لیکن اس سے آگے کبھی نہیں گیا تھا۔ غار کا دہانہ بہت تنگ اور خاصی بلندی پر تھا۔ اُس کے سامنے چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں جن کے درمیان بہت تنگ سا راستہ تھا جس میں سے ایک آدمی بمشکل گزر سکتا تھا۔

اُن چٹانوں اور تنگ سے راستے کی وجہ سے یہ غار خاصا پوشیدہ ہو گیا تھا۔ ایک تو کسی اجنبی

کے اس طرف آنے کا امکان نہیں تھا۔ اگر کوئی آ بھی جاتا تو غار تک پہنچ جانا ممکن نہ ہوتا۔ لیکن مجھے حیرت تھی کہ مجاہدین نے یہ غار کس طرح تلاش کیا تھا؟ یہ اُن کے لئے محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔

غار کے باہر ڈیوٹی دینے والے مجاہدین بھی اس طرح اپنی کمین گاہوں میں کھڑے تھے کہ وہ تو کسی کی نظروں میں نہیں آ سکتے تھے البتہ وہ خود نشیب میں دُور دُور تک دیکھ سکتے تھے۔

کمانڈر محبّ اللہ آگے تھا اور میں اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ راستہ خاصا دُشوار گزار تھا۔ کبھی کسی چٹان پر چڑھنا پڑتا اور کبھی نہایت خطرناک تنگ راستوں پر نشیب میں اُترنا پڑتا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ زخمی مجاہدین کو غار تک کس طرح لے جاتے ہوں گے؟

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک اُن پہاڑیوں میں چلتے رہے اور پھر ایک جگہ رُک گئے۔ تقریباً دو سو گز نشیب میں دریا بہہ رہا تھا۔ ہم ایک بلند چٹان پر کھڑے تھے جس سے آگے عمودی ڈھلان تھی۔ تیز ہوا مجھے دھکیل رہی تھی اور میں بڑی مشکل سے چٹان پر قدم جمائے کھڑا تھا۔ کمانڈر محبّ اللہ میرے قریب کھڑا متجسس نگاہوں سے نشیب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمارے چاروں طرف چنار اور یوکلپٹس کے فلک بوس درخت تھے جو تیز ہوا میں جھوم رہے تھے۔ نشیب میں بہتا ہوا دریا، جھومتے ہوئے درخت اور سبزے کے فرش پر مسکراتے ہوئے رنگ برنگے خود رو پھول..... خدا نے اس وادی کو جی بھر کر حسن دیا تھا۔ اس کا اعتراف تو غیر ملکی سیاحوں نے بھی کیا تھا کہ یہ دنیا کی حسین ترین وادی تھی۔ لیکن متعصب اور غاصب ہندوؤں کے گندے وجود نے اس وادی کے حسن کو گہنا دیا تھا۔ اُن کا وجود اس وادی کے حسن پر ایک بدنما دھبہ تھا اور کشمیر کے غیور عوام وادی کو ان کے گندے وجود سے پاک کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اور مجھے خوشی تھی کہ اب میں بھی آزادی کی اس جدوجہد میں شریک ہو گیا تھا۔

کمانڈر محبّ اللہ اب بھی چٹان پر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ راستہ بھول گیا ہو۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا تو جیسے اُس نے میرا ذہن پڑھ لیا ہو۔ مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں راستہ نہیں بھولا ہوں۔ ان پہاڑی راستوں سے تو میں اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح واقف ہوں۔'' اُس نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''عام طور پر ہم دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں جو قدرے طویل ہے۔ تمہاری وجہ سے آج میں اس طرف سے آیا ہوں۔ یہ راستہ کٹھن ضرور ہے مگر آدھے کا فرق پڑ جاتا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔''

وہ چٹان کی عمودی ڈھلان سے نیچے اُترنے لگا۔ میں بھی سنبھل کر اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ ڈھلان ختم ہو گئی مگر ہم سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں میں مسلسل نشیب کی طرف جا رہے تھے اور بالآخر تقریباً آدھے گھنٹے بعد چٹانوں سے نکل کر ہم دریا کے سامنے پہنچ گئے۔

دریا کا منہ زور پانی بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتا، اُچھلتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ پتھروں کی آڑ میں چلتے رہے۔ اور پھر بتدریج کنارے سے دُور ہٹتے ہوئے ایک بار پھر

چٹانوں میں داخل ہو گئے۔ اس مرتبہ ہمیں چٹانوں میں زیادہ اندر تک نہیں جانا پڑا۔ محبّ اللہ چٹانوں میں ایک تنگ سی دراڑ کے قریب رُک گیا۔ اُس نے مُڑ کر میری طرف دیکھا اور اُس دراڑ میں داخل ہو گیا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔

دراڑ اتنی تنگ تھی کہ ایک آدمی بمشکل اس میں سے گزر سکتا تھا۔ میری کمر دیوار کے ساتھ رگڑ کھا رہی تھی۔

تقریباً دس گز آگے جا کر دراڑ بائیں طرف مُڑ گئی۔ اس جگہ دونوں طرف کی دیواریں ایک دوسرے سے دُور ہٹ گئی تھیں اور راستہ کافی کشادہ ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے میں نے سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا اور میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... اُوپر سے دونوں چٹانیں ایک دوسرے سے اس قدر قریب تھیں کہ اُن کے بیچ میں ایک فٹ چوڑی روشن لکیر سی نظر آ رہی تھی۔ لیکن روشنی زمین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

''یہاں اندھیرا ہے..... مگر راستہ بالکل صاف ہے۔ میرے پیچھے پیچھے چلتے آؤ!'' کمانڈر محبّ اللہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور میں اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

راستہ مسلسل ڈھلوان تھا اور پھر میں نے محسوس کیا کہ اندھیرا کچھ بڑھ گیا تھا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا، اُوپر بلندی پر روشنی کی وہ لکیر بھی اب نظر نہیں آ رہی تھی۔ محبّ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ میرے چلنے کے انداز میں جھجک سی تھی جیسے اندیشہ ہو کہ میرا کوئی قدم مجھے حادثے سے دوچار نہ کر دے۔ لیکن اس کے برعکس کمانڈر محبّ اللہ بلا جھجک چلتا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں یا تو بلی کی طرح اندھیرے میں بھی دیکھ لینے کی صلاحیت موجود تھی یا وہ اس راستے سے اتنی اچھی طرح واقف تھا کہ گہری تاریکی میں بھی قدم اُٹھانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

کمانڈر محبّ اللہ ایک جگہ رُک گیا۔ اُس جگہ ایک مانوس سی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ میں غور سے اُس آواز کو سننے لگا جیسے آس پاس کہیں پانی بہہ رہا ہو۔

محبّ اللہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا مگر تاریکی اس قدر گہری تھی کہ مجھے اپنے بالکل ساتھ کھڑا ہوا کمانڈر محبّ اللہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اور پھر دفعتہً میرے قریب ہی روشنی چمک اُٹھی۔ میں اُچھل پڑا..... پھر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ روشنی محبّ اللہ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی تھی۔ وہ اب تک اندھیرے میں چلتا رہا تھا۔ اُس کے قدم اُٹھانے میں ذرا بھی جھجک نہیں تھی۔ لیکن اب شاید آگے راستہ مخدوش تھا جس وجہ سے اُسے ٹارچ روشن کرنی پڑی تھی۔

ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر حرکت کر رہی تھی۔ میں گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے روشنی کے ساتھ ساتھ دیدے گھما رہا تھا۔ ہم ایک تنگ سی دراڑ کے راستے چٹانوں میں داخل ہو کر مسلسل نشیب کی طرف چلتے رہے تھے۔ اب یہ جگہ ایک بہت کشادہ سرنگ کا منظر پیش کر رہی تھی اور سماعت سے ٹکرانے والی اُس آواز کے بارے میں شبہ درست نکلا۔

یہ سرنگ تقریباً ڈیڑھ سو فٹ کشادہ تھی۔ اور اُس کے آدھے سے زیادہ حصے میں جو نسبتاً نشیب کی طرف تھا، پانی بہہ رہا تھا اور اُس کی گنگناہٹ کی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

کمانڈر محبّ اللہ نے اشارہ کیا اور ہم ایک بار پھر سرنگ کی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگے۔ اُس راستے میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے۔ اور اندھیرے میں یہ گڑھے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے اور اسی لئے کمانڈر محبّ اللہ نے ٹارچ روشن کر لی تھی۔

راستہ مسلسل نشیب کی طرف جا رہا تھا اور مجھے لگتا تھا جیسے ہم تحت الثریٰ میں اُتر رہے ہوں۔

''یہ اس دریا کا حصہ ہے جس کے قریب سے ہم گزر کر آئے ہیں۔'' کمانڈر محبّ اللہ بتا رہا تھا۔ ''یہ دریا صدیوں سے یہاں بہہ رہا ہے اور یہ چٹانیں بھی صدیوں سے یہاں موجود ہیں۔ کسی جگہ پانی نے چٹانوں کو کاٹ کر راستہ بنا لیا ہے۔ چٹانوں کو کاٹنے کا یہ عمل بھی سال دو سال میں نہیں صدیوں میں پایہ تکمیل کو پہنچا ہو گا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یہ غار یا سرنگیں بھی صدیوں سے یہاں موجود ہیں۔ ان کے اندر اب بھی شکست و ریخت ہوتی رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی یہ چھت بیٹھ جائے اور یہ پراسرار غار بھی عام لوگوں کی نظروں میں آ جائیں۔ لیکن فی الحال تو یہ صرف مجاہدین کے استعمال میں ہیں۔ شاید قدرت نے صدیوں پہلے یہ غار ہمارے لئے ہی بنائے تھے۔''

میں کمانڈر کی باتیں سنتا ہوا خاموشی سے اُس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ چٹانوں کے نیچے پھیلے ہوئے یہ غار ایسے تھے کہ اُن میں فوج کی پوری بٹالین چھپائی جا سکتی تھی یا مجاہدین اپنا اڈہ بنا سکتے تھے۔ لیکن شاید یہ سرنگیں ان دونوں مقاصد کے لئے مناسب نہیں تھیں اسی لئے یہاں کوئی خفیہ پناہ گاہ قائم کرنے کی بجائے ان سرنگوں کو محض گزرگاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

''یہ سرنگیں صرف ہمارے علم میں نہیں ہیں..... بھارتی فوجی بھی ان سے واقف ہیں۔'' کمانڈر محبّ اللہ جیسے میرے دل کی بات جان کر کہہ رہا تھا۔ ''لیکن وہ صرف ایک راستے سے واقف ہیں اور اس طرف سے بھی وہ کبھی زیادہ اندر تک نہیں آئے کیونکہ اس دہانے سے تقریباً پچاس گز آگے پانی خاصا گہرا ہے۔ وہ اس دہانے میں چند گز آگے آ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اُن کے خیال میں فرار ہونے والے مجاہدین اس طرف نہیں آ سکتے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مجاہدین نے بھی فرار کے ایسے ایسے راستے تلاش کر رکھے ہیں جن کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور یہ راستے تقریباً چالیس سال سے مجاہدین کے استعمال میں ہیں۔ ہمارے خفیہ دہانے کے آس پاس کئی مرتبہ اِکا دُکا مجاہدین پکڑے بھی گئے ہیں۔ اُن پر بے پناہ تشدد بھی کیا گیا لیکن اُنہوں نے اپنی جان تو دے دی لیکن یہ راز فاش نہیں کیا۔''

ہم ان پراسرار سرنگوں میں تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور مجھے حیرت ہو رہی تھی

کہ یہ سرنگیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ نصف میل کا مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ سرنگ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ غلیل کے دو شاخ کی طرح ہم دائیں طرف والی سرنگ میں مُڑ گئے۔

اُس طرف سامنے بہت دُور روشنی کا ایک نقطہ سا نظر آ رہا تھا۔ کمانڈر محبّ اللہ نے ٹارچ بجھا دی اور تاریکی میں اُس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وہ سامنے اس سرنگ کا وہ دہانہ ہے جس کے بارے میں بھارتی فوجی بھی جانتے ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''آگے چند گز تک راستہ ذرا دُشوار ہے لیکن خطرناک نہیں..... دیوار کا سہارا لے کر چلتے رہو!''

گہری تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہاں پانی دیوار کے ساتھ تھا۔ میرے پیر ٹخنوں تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں دونوں ہاتھوں سے دیوار کا سہارا لے کر ٹٹول ٹٹول کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ سامنے سرنگ کے دہانے کا وہ روشن نقطہ شیطان کی آنکھ کی طرح مجھے گھورتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

تقریباً بیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ سرنگ ایک بار پھر دائیں طرف مُڑ گئی۔ میں بھی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا اُس طرف مُڑ گیا تھا۔ کمانڈر محبّ اللہ نے ٹارچ روشن کر لی۔ وہ مجھ سے چند گز آگے تھا۔

اُس سرنگ میں زیادہ پانی نہیں تھا۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے پانی کم ہوتا جا رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس مرتبہ ہم نشیب کی بجائے بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ اب آگے پانی بھی نہیں رہا تھا اور سرنگ بھی بتدریج تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

کمانڈر محبّ اللہ ایک بار پھر رُک گیا۔ آگے سرنگ بند ہوگئی تھی۔ دیوار ناہموار تھی۔ پتھر باہر کو اُبھرے ہوئے تھے۔ وہ چند لمحے ٹارچ کی روشنی میں اُن پتھروں کو دیکھتا رہا پھر بڑی پھرتی سے اُن پتھروں کے سہارے اُوپر چڑھتا چلا گیا۔ تقریباً پندرہ فٹ اُوپر جا کر وہ آگے کو نکلی ہوئی ایک کارنس پر ٹک گیا اور ٹارچ کا رُخ نیچے کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''آ جاؤ..... ڈرو نہیں! تمہیں اُوپر آنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔''

میں نے کندھے پر لٹکی ہوئی رائفل کو درست کیا اور اُبھرے ہوئے پتھروں کا سہارا لے کر اُوپر چڑھنے لگا۔ مجھے واقعی کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔ سکول کے زمانے میں، میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتا ہوا قصبے کے باہر پہاڑیوں پر چلا جاتا تھا۔ خطرناک چٹانوں پر چڑھنا میری ہابی تھی۔ ہم دوستوں میں شرطیں لگ جاتیں کہ کون پہلے چٹان کی چوٹی پر پہنچتا ہے؟ میں کبھی پہلے نمبر پر آتا اور کبھی دوسرے نمبر پر۔ میرا وہ تجربہ اب میرے کام آ رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ آئندہ بھی بچپن اور لڑکپن کے وہ تجربات میرے کام آتے رہیں گے۔

میں کافی اُوپر پہنچ چکا تھا۔ کارنس پر گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے کمانڈر محبّ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اُوپر کھینچ لیا۔ اس سے آگے بھی ہم چٹان کے سینے میں واقع ان گھپ پہاڑوں میں

اُوپر چڑھتے رہے۔ اب تازہ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ ہم کھلی جگہ پر نکلنے والے ہیں۔

اور پھر ویسی ہی ایک تنگ سی دراڑ سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گئے..... ہمارے چاروں طرف سبزہ تھا اور درختوں کے جھنڈ تھے۔ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر تقریباً سو گز آگے ہم ایک چٹان کے قریب رُک گئے۔ سامنے نشیب میں بہت دُور بارہ مولا شہر تھا۔ میرے خیال میں اس چٹان سے شہر کا فاصلہ دو میل کے لگ بھگ ضرور ہوگا۔

''اگر ہم دوسرے راستے سے آتے تو اس طرف نکلتے۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے نیلے پتھروں والی ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ ''لیکن اس طرف سے فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ جبکہ ہم نے اس راستے سے آ کر آدھا وقت بچا لیا ہے۔ وہ سامنے بارہ مولا ہے..... لیکن ہم شہر کی طرف نہیں جائیں گے۔ اس طرف آ جاؤ!''

میں کمانڈر محبّ اللہ کے ساتھ دائیں طرف کی چٹانوں پر اُترنے لگا۔ نوکدار چٹانوں کا سلسلہ جلد ہی ختم ہوگیا۔ آگے ڈھلوان سبزہ زار تھا جس کے اختتام پر نشیب میں دُور تک خوبصورت وادی پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں باغات بھی تھے اور کھیت بھی جن میں کہیں کہیں اِکا دُکا مکان بھی نظر آ رہے تھے۔ ہم اُس ڈھلان پر اُترتے ہوئے بارہ مولا شہر سے بائیں طرف ہٹتے جا رہے تھے۔

ہم کھیتوں اور باغوں میں سے گزرتے ہوئے ایک مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ دو آدمی اچانک ہی کسی طرف سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے..... وہ ادھیڑ عمر تھے مگر اُن کے ہاتھ پیر خاصے مضبوط تھے۔

''باقی لوگ کہاں ہیں غفورے.....؟'' کمانڈر محبّ اللہ نے اُن میں سے ایک سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں.....'' غفور نامی اُس شخص نے جواب دیا۔ ''دراصل ایک گھنٹہ پہلے پولیس کی ایک جیپ ادھر آئی تھی۔ میں نے لڑکوں کو کھیتوں میں اِدھر اُدھر نکال دیا۔''

''پولیس..... کیوں؟'' محبّ اللہ کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔

''ایک ملزم پولیس کی حراست سے بھاگ نکلا تھا۔'' غفورے نے جواب دیا۔ ''تقریباً چار ہفتے پہلے اُسے اپنے ایک دوست کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ آج اُسے پہلی مرتبہ عدالت میں پیش کرنے کے لئے لے جایا جا رہا تھا کہ راستے میں موقع ملتے ہی ایک پولیس والے کو زخمی کر کے بھاگ نکلا۔ وہ پولیس کی رائفل بھی لے گیا تھا۔ پولیس والوں کا کہنا ہے کہ اُسے فرار ہو کر اس طرف آتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ پہاڑوں کی طرف نکل گیا ہوگا۔ اور ظاہر ہے پولیس والے اس کے پیچھے ان پہاڑوں میں نہیں جا سکتے۔ یہیں سے پوچھ کر دوسری طرف چلے گئے۔''

''ہوں.....'' کمانڈر محبّ اللہ ہنکارہ بھر کر رہ گیا۔

غفور اور اُس کا ساتھی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن محب اللہ نے اُن سے میرا تعارف کرانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ مکان کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تم ہمارے لئے چائے بناؤ! اور تم لڑکوں کو اطلاع کر دو کہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی یہاں جمع ہو جائیں۔ ہمیں آج رات گلمرگ کی طرف جانا ہے۔''

غفور سر ہلاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ اُس نے محبّ اللہ کا پیغام دوسرے آدمی کے گوش گزار کر دیا جو کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد غفور اچائے بنا کر لے آیا۔ میں اُس وقت فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کٹھن سفر نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ اگر مہینہ بھر بیمار نہ رہا ہوتا تو مجھے اس سفر کی پرواہ بھی نہ ہوتی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ چائے کے ساتھ ایک پلیٹ میں تلے ہوئے بھیڑ کے گوشت کے قتلے بھی تھے۔

کئی روز بعد دودھ کی چائے نصیب ہوئی تھی۔ گوشت کے تلے ہوئے قتلے بھی مزیدار تھے۔ ہم اپنے ٹھکانے سے دوپہر بارہ بجے کے قریب روانہ ہوئے تھے اور اس وقت چار بجنے والے تھے۔ بھوک لگ رہی تھی اس لئے میں نے خوب پیٹ بھر کر گوشت کھا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیٹ بھرتے ہی مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور میں وہیں ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔

شدید تھکن کی وجہ سے میں نیند میں بھی بے چین سا رہا اس لئے زیادہ دیر تک سو بھی نہ سکا۔ جب میری آنکھ کھلی تو اُس وقت کمرے میں کمانڈر محبّ اللہ کے پاس دو اور آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں ایک کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی جبکہ دوسرا پچیس چھبیس سال سے زیادہ کا نہیں تھا۔ دونوں نے لمبے لمبے چوغے پہن رکھے تھے اور سروں پر ٹوپیاں تھیں۔ محبّ اللہ اُن سے شاید کوئی پروگرام طے کر رہا تھا۔ اس وقت وہ اُن دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تم دونوں اسی وقت ماندر کی طرف روانہ ہو جاؤ! کمانڈر رشید کے آدمی وہاں انتظار کر رہے ہوں گے۔ اُن سے کہنا کہ کمانڈر رشید کو میرا پیغام پہنچا دیں کہ ہم صبح چار بجے طے شدہ مقام پر ملیں گے۔''

وہ دونوں اُٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں نے محبّ اللہ کا وہ ایک جملہ سنا تھا جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ ایک مہینہ پہلے گلمرگ کے قریب جس بھارتی فوجی کیمپ کے بارے میں بات ہوئی تھی اُس پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا گیا ہے۔

''میں تمہیں اس لئے ساتھ لایا ہوں.....'' کمانڈر محبّ اللہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک مہینہ پہلے تم نے میری اور کمانڈر رشید کی باتیں سنی تھیں۔ گلمرگ کے قریب اُس ڈپو میں اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگنا شروع ہو گئے ہیں۔ یہی گولہ بارود وادی کے بے گناہ اور معصوم کشمیری عوام پر برسایا جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان شیطانوں کو گولہ بارود استعمال کرنے کا موقع ملے ہم اُس ڈپو کو تباہ کر دیں گے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یوں تو اس وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے کیمپ پر حملہ کرنے کے لئے بہت سے آدمیوں کی ضرورت ہوگی لیکن میں نے اور کمانڈر رشید نے طے کیا ہے کہ زیادہ بھیڑ بھاڑ اکٹھی نہیں کی جائے گی۔ صرف گنتی کے چند نوجوان ہوں گے جن کا انتخاب ہم دونوں نے کیا ہے اور اُن میں تمہارا نام بھی شامل ہے۔ تمہارا انتخاب اگرچہ میں نے کیا تھا مگر تمہارے نام کی سفارش کمانڈر رشید اور عبدالغنی لون نے بھی کی تھی۔''

''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ.....''

''ایک منٹ..... پہلے میری پوری بات سن لو!'' کمانڈر محبّ اللہ نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''ہم نے کیمپ پر حملہ کرنے کے لئے جو پارٹی تیار کی ہے اُسے ڈیتھ اسکواڈ کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا اس کارروائی میں خود اپنے زندہ بچ جانے کے امکانات بھی ایک فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔ بالفاظ دیگر تم لوگ موت کے منہ میں چھلانگ لگانے جا رہے ہو۔ اس لئے اگر تم.....''

''میں سمجھ گیا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں کمانڈر!'' اس مرتبہ میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''لیکن اس حقیقت سے آپ بھی بخوبی واقف ہیں کہ مجاہد کا اُٹھا ہوا قدم پیچھے نہیں ہٹتا۔ وہ آگے اور صرف آگے بڑھنا جانتا ہے۔ اگر میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے اُن بھیڑیوں کے بھٹ کو تباہ کر کے اپنے لوگوں کو اور وادی کو ایک بڑی تباہی سے بچا لوں تو میں سو مرتبہ موت کے منہ میں کودنے کو تیار ہوں۔ میں اپنا نام واپس نہیں لوں گا کمانڈر!''

کمانڈر محبّ اللہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اُس نے بے اختیار ہو کر میری پیشانی چوم لی۔ ''تم جیسے نوجوانوں میں یہ جذبہ ہو تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی اور ہماری منزل ہے آزادی..... وہ زنجیریں ایک روز ضرور ٹوٹیں گی جنہوں نے کشمیریوں کی آزادی سلب کر رکھی ہے۔ ہم اس جنت سے اُن شیطانوں کو نکالنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔''

''انشاءاللہ.....'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اسی لمحہ تین اور آدمی کمرے میں داخل ہوئے..... اُنہوں نے بھی کاشتکاروں کی طرح موٹے کپڑے کے لمبے لمبے چوغے پہن رکھے تھے۔ وہ ہم دونوں سے ہاتھ ملا کر ہمارے قریب بیٹھ گئے۔ وہ دونوں گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''یہ شمروز ہے.....'' کمانڈر محبّ اللہ نے اُن سے میرا تعارف کرایا۔ اس کا نام تم لوگوں کے لئے اجنبی نہیں ہے۔ یہ بھی اس مشن میں ہمارے ساتھ ہوگا۔ مقبول اور حسن!'' اُس نے باری باری دونو جوانوں کی طرف دیکھا۔ ''تم دونوں کھانا کھا کر شمروز کے ساتھ گلمرگ کی طرف روانہ ہو جاؤ! لیکن تم لوگوں کو گلمرگ نہیں جانا۔ بسال پور بستی میں ہمارا انتظار کرو گے۔ ہم بھی رات کے پچھلے پہر وہاں پہنچ جائیں گے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے

کہنے لگا۔ ''ایسی کوئی توقع تو نہیں..... لیکن اگر کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو گلمرگ کے اُوپر سے ہوتے ہوئے فیروز پور پہنچنے کی کوشش کرنا۔''

''سمجھ گیا کمانڈر!'' مقبول نامی نوجوان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور موسیٰ تم.....'' کمانڈر محبّ اللہ نے تیسرے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی کھانا کھا کر رحمن کو ساتھ لے کر عبدالغنی لون کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ تمہیں معلوم ہے عبدالغنی لون سے کہاں ملاقات ہوگی۔''

''جانتا ہوں کمانڈر!'' موسیٰ نے بھی گردن ہلا دی۔

میں تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر باہر آ گیا۔ شام کا دھندلکا سا پھیلنے لگا۔ مکان سے تقریباً بیس گز آگے شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ میں ندی کے کنارے پر بیٹھ گیا اور جوتے اُتار کر پیر پانی میں ڈال دیئے اور آگے جھک کر منہ پر پانی کے چھپکے مارنے لگا۔

مکان کے ساتھ دائیں طرف ایک سائبان سا بنا ہوا تھا اور شاید وہاں باورچی خانہ تھا۔ چاول اُبالے جا رہے تھے۔ اُس وقت بڑی اشتہا آمیز خوشبو آ رہی تھی۔

میں کافی دیر تک ندی کے کنارے پر بیٹھا رہا۔ سبزے دار تاریکی کی وجہ سے مچھر مجھے مالِ غنیمت سمجھ کر نوچ رہے تھے۔ میں اُٹھ کر اندر آ گیا جہاں اب کیروسین لیمپ روشن کر دیا گیا تھا۔ وہ تینوں نوجوان اب بھی کمانڈر کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں بھی خاموشی سے بیٹھ گیا اور اُن کی باتیں سننے لگا۔

آٹھ بجے کے قریب غفور نے ہمارے سامنے دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا۔ اُبلے ہوئے چاول اور مسور کی پتلی سی دال تھی لیکن یہ دال چاول کھا کر بھی مزہ آ گیا۔ کھانے کے بعد چائے بھی پی گئی اور پھر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں، مقبول اور حسن روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ محبّ اللہ نے بڑی گرمجوشی سے ہمیں رخصت کیا تھا۔

ہم تینوں کھیتوں میں ایک پگڈنڈی پر چل پڑے۔ مقبول آگے تھا، میں بیچ میں اور حسن پیچھے۔ ان دونوں کے ڈھیلے چوغوں کے نیچے بھی آٹو میٹک رائفلیں چھپی ہوئی تھیں۔

بارہ مولا سے گلمرگ کا فاصلہ بیس بائیس میل کے لگ بھگ تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ شاید یہ فاصلہ ہمیں پیدل ہی طے کرنا ہوگا۔ لیکن تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کر کے ہم رُک گئے۔ سامنے ایک جگہ لالٹین کی مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ بہت بڑا چھپر تھا جس کے نیچے بھیڑوں اور بکریوں کا ایک بہت بڑا باڑہ تھا۔ اور ایک طرف چند خچر بھی بندھے ہوئے تھے۔ لالٹین زمین میں گڑھی ہوئی لکڑی کی بلی کی ایک کھونٹی پر ٹنگی ہوئی تھی۔ ہم جیسے ہی وہاں پہنچے ایک آدمی تاریکی سے نکل کر سامنے آ گیا..... یہ وہی آدمی تھا جسے میں نے شروع میں غفور کے ساتھ دیکھا تھا۔ ہماری آوازیں سن کر بھیڑیں اور بکریاں بھی ممیانے لگی تھیں اور پھر ایک خچر بھی ہنہنا اُٹھا۔ اُس نے شاید بھیڑوں اور بکریوں کو اس طرح شور مچانے پر سرزنش کی تھی اور حیرت انگیز طور پر

بھیڑیں اور بکریاں خاموش ہو گئیں۔

''خچر تیار ہیں..... تم لوگ روانہ ہو جاؤ!'' اُس شخص نے مقبول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہاں کئی خچر تھے۔ اُس شخص نے تین خچروں کی رسیاں کھول کر ہمارے حوالے کر دیں۔ یہی رسیاں لگام کا بھی کام دے رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ خچروں پر پوری زینیں کسی ہوئی ہوں گی۔ مگر ہر خچر کی پیٹھ پر نمدے یا پرانے کمبل کا ایک ایک ٹکڑا پڑا تھا اور دونوں طرف رقابیں لٹکی ہوئی تھیں۔ مجھے تو خچر کی ننگی پیٹھ پر بھی سفر کرنے کا تجربہ تھا۔ میں اُچھل کر اپنے خچر پر سوار ہو گیا اور لگام تھام لی۔

ہماری فارمیشن وہی تھی۔ یعنی آگے مقبول، اُس کے پیچھے میں اور آخر میں حسن۔ خچر خاصے صحت مند تھے۔ شروع میں تو رفتار کچھ کم رہی، پھر مقبول نے خچر دوڑانا شروع کر دیا۔ ان علاقوں میں جہاں دن کے وقت قدم قدم پر بھارتی فوجیوں کی کسی نہ کسی گشتی پارٹی سے آمنا سامنا ہو جاتا تھا مجاہدین کے لئے رات کے وقت سفر کرنا زیادہ محفوظ تھا۔ بھارتی فوجی رات کے وقت اپنی چھاؤنیوں اور کیمپوں سے باہر نکلنے کی حماقت نہیں کرتے تھے۔ جبکہ مجاہدین بلا خوف و خطر اپنی نقل و حرکت جاری رکھتے تھے۔ بھارتی فوجی کیمپوں پر اُن کی چھاپہ مار کارروائیاں بھی رات ہی کو ہوتی تھیں۔ وہ بھارتی فوجیوں پر موت برسا کر رات کی تاریکی میں پہاڑوں میں روپوش ہو جاتے تھے۔

بعض مقامات ایسے تھے جہاں بھارتی فوجیوں نے چوکیاں قائم کر رکھی تھیں۔ لیکن یہ چوکیاں آبادیوں کے قریب عام گزرگاہوں پر تھیں۔ جبکہ ہم پہاڑیوں میں ایسے تنگ راستوں پر سفر کر رہے تھے جہاں کسی فوجی پارٹی سے آمنا سامنا ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔

راستہ اگرچہ خاصا کٹھن تھا لیکن ہماری رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ اس طرح ہم ساڑھے گیارہ بجے کے قریب بسال پور پہنچ گئے۔

بسال پور گلمرگ سے تقریباً پانچ میل دُور تیس چالیس گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ پہاڑ کے دوران میں آباد اس بستی کے اطراف میں گھنا جنگل تھا۔ ایک طرف کی زمین کاشت کے قابل تھی جہاں موسم کے مطابق فصلیں اُگائی جاتی تھیں۔ مختصر سی کھیتی باڑی کے علاوہ جنگل کی کٹائی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اصل کمائی تو اُن لوگوں کی تھی جو جنگل کی کٹائی کا ٹھیکہ لیتے تھے۔ مقامی لوگ تو بیچارے دن رات محنت کر کے بمشکل دو وقت کی روٹی کھاتے تھے۔

بستی کے باہر دُور تک کٹے ہوئے درختوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دو تین دیو قامت آرا مشینیں تھیں جن پر صبح سے شام تک کام ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت ہر طرف سناٹا تھا۔ بستی میں داخل ہوتے ہوئے بھی مقبول کا خچر آگے تھا۔ اور بالآخر وہ ایک مکان کے دروازے پر رُک گیا۔ ہلکی سی دستک کے جواب میں دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جس نے ہاتھ میں لالٹین اُٹھا رکھی تھی۔ ہم خچروں سے اُتر آئے

تھے۔ اُس عورت نے لالٹین کی روشنی میں ہمارے چہرے دیکھے۔ مقبول اور حسن کو تو وہ شاید پہچانتی تھی لیکن میری طرف دیکھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔

''پریشان نہ ہو ماسی ..... یہ ہمارا ہی ساتھی ہے۔'' مقبول نے اُس کی اُلجھن کو تاڑتے ہوئے بتایا۔

عورت نے اندر کی طرف دیکھ کر ہلکی آواز میں کسی کو پکارا۔ فوراً ہی ایک آدمی دروازے پر پہنچ گیا۔ وہ بھی اُس کی طرح ادھیڑ عمر تھا۔

''نور محمد!'' عورت اُس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''حسن اور تینوں خچروں کو احمد بھائی کی طرف لے جاؤ! اور تم دونوں اندر آ جاؤ۔'' آخری الفاظ اُس نے مجھے اور مقبول کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔ نور محمد تینوں خچروں اور حسن کو لے کر گلی میں آگے چلا گیا۔ میں اور مقبول مکان میں داخل ہو گئے۔ اُس عورت نے دروازہ بند کر دیا اور ہمیں اشارہ کرتے ہوئے صحن میں ایک طرف چلنے لگی۔ صحن خاصا وسیع و عریض تھا۔ سامنے دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ بائیں طرف تھا۔ ''ایل'' شکل کے بنے ہوئے ان کمروں کے سامنے کشادہ برآمدہ بھی تھا۔

ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر اندر کی طرف اُٹھ گئی۔ سامنے ہی فرش پر ایک جوان اور خوبصورت لڑکی بیٹھی مٹی کے تیل کے لیمپ کی روشنی میں کپڑے پر کڑھائی کر رہی تھی۔ میں رُکے بغیر دروازے کے سامنے سے گزرتا ہوا ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ ادھیڑ عمر عورت بھی ہمارے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اُس نے لالٹین کمرے کے ایک کونے میں رکھ دی۔

''تم لوگ کھانا کھاؤ گے یا چائے پیو گے؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہ کھانا نہ چائے۔'' مقبول نے جواب دیا۔ ''بہت تھکے ہوئے ہیں ماسی! اس وقت تو سو جانا چاہتے ہیں۔''

عورت واپس چلی گئی۔ میں کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ فرش کے آدھے حصے پر دری بچھی ہوئی تھی اور آدھے حصے پر چٹائی تھی۔ دری پر ایک بستر بھی بچھا ہوا تھا اور دو کمبل پڑے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی میلے سے تکیے بھی رکھے ہوئے تھے۔ دیوار پر لگی ہوئی کھونٹیوں پر چند کپڑے ٹنگے ہوئے تھے جن میں دو زنانہ جوڑے بھی تھے۔ بستر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اہل خانہ کو ہماری آمد کی اطلاع پہلے سے تھی اور ہمارے لئے سونے کا بندوبست کر رکھا تھا۔

میں نے اپنے کندھے پر لٹکی ہوئی ہوئی ایس ایم جی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی، جوتے اُتار کر ایک طرف ڈالے اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ خچر پر تقریباً چار گھنٹوں کے سفر نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ میں لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو کھلے ہوئے دروازے کے باہر آنگن میں دُھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ مقبول کمرے میں موجود نہیں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میری ایس ایم جی غائب تھی اور

مقبول کی رائفل بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر باہر سے مقبول کی آواز سن کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ مقبول اُس ادھیڑ عمر عورت سے باتیں کر رہا تھا۔ عورت نے میری طرف دیکھا اور پھر صحن کے باہر والے دروازے کی طرف چلی گئی۔ میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا مقبول کے قریب پہنچ گیا۔

''مقبول..... ہماری رائفلیں غائب ہیں۔'' میں نے اُس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔

○○○

''پریشان مت ہو..... رائفلیں محفوظ ہیں۔'' مقبول نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''دن میں بھارتی فوجیوں کی کوئی نہ کوئی پارٹی اس طرف آ جاتی ہے۔ اور وہ لوگ اسلحہ کی تلاش میں گھروں کی تلاشی بھی لیتے ہیں۔ ہماری رائفلیں بھی چھپا دی گئی ہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تم منہ ہاتھ دھولو! کھانا تیار ہو رہا ہے۔''

مقبول کمرے میں چلا گیا اور میں صحن میں اس طرف چلا گیا جہاں پانی کا ڈرم رکھا ہوا تھا۔ قریب ہی پانی سے بھری ہوئی ایک بالٹی اور پلاسٹک کا لوٹا بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے نل کی ٹونٹی کھول دی اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے قمیض کے دامن ہی سے منہ صاف کیا اور جیسے ہی مُڑا میرے دماغ میں ایک جھماکہ سا ہوا..... سانس کی رفتار تیز ہو گئی اور دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ لڑکی ہمارے کمرے سے نکل رہی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے رات کو میں نے لیمپ کی روشنی میں کڑھائی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ رات کو تو دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس پر صرف ایک نظر ڈالی تھی اور اب وہ تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے سامنے کھڑی تھی..... لمبا قد، سڈول جسم، گلاب جیسی رنگت، غزال جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جن میں ستاروں جیسی چمک تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ تھی۔

اُس نے کالے رنگ کا ٹخنوں تک لمبا کرتا پہن رکھا تھا۔ وی شیپ کے گلے پر سفید اور پیلے دھاگے کی کڑھائی تھی۔ اُس کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ رہی ہو گی لیکن جوانی کا ثمر خاصا نمایاں تھا۔ سینے پر سے کرتا تنا ہوا تھا۔ سیاہ بالوں کی دو چوٹیاں تھیں اور دونوں چوٹیاں سینے پر جھکی ہوئی تھیں۔

''میں نے کھانا رکھ دیا ہے۔ مقبول بھائی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

مجھے یوں لگا جیسے میرے کانوں میں چاندی کی ننھی ننھی سی گھنٹیاں گنگنا اُٹھی ہوں۔ میں نے چونک کر ایک بار پھر اُس کی طرف دیکھا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

وہ انگوری تھی۔ خادم حسین کی بیٹی جو تین سال پہلے بڈگام کے قریب بھارتی فوجیوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں شہید ہو گیا تھا۔ انگوری کی ماں عائشہ نے بڑی محنت سے اُسے پالا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ شوہر کی شہادت کے بعد عائشہ اپنی جوان بیٹی کو لے کر کہیں دبکی رہتی اور خاموشی سے زندگی بتا دیتی۔ مگر وہ کشمیر کی بیٹی تھی۔ وطن کی آزادی کی لگن نے اُسے بھی تڑپا رکھا تھا۔ وہ

دشمن کے خلاف رائفل نہیں اُٹھا سکتی تھی مگر مجاہدین کا ساتھ بھرپور انداز میں دے رہی تھی۔

خادم حسین جب زندہ تھا تو ٹھیکیدار کے پاس کام کیا کرتا تھا۔ وہ شام تک آراء مشین پر کٹے ہوئے درختوں کے تنوں کو کانٹ چھانٹ کر کے بڑے بڑے شہتیروں میں ڈھالتا رہتا۔ یہ شہتیر ٹرکوں میں لاد کر سرینگر بھیج دیئے جاتے جہاں سے ہندوستان کے مختلف شہروں کو روانہ کر دیئے جاتے۔ خادم حسین کی شہادت کے بعد آمدنی کا یہ ذریعہ ختم ہو گیا۔ عائشہ اور انگوری کشیدہ کاری کا کام کرنے لگیں جس سے اُن کا گزارہ ہو رہا تھا۔

وادی کشمیر کو اللہ تعالیٰ نے قدرتی حسن سے تو نوازا ہی ہے یہاں کے باسیوں کو بھی ایسی صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اغیار اُن کی صلاحیتوں اور ہنرمندی سے تو بھرپور فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور وہ خود فاقہ کشی کا شکار ہیں۔

قالین، دھسے اور شالیں اس نفاست سے تیار کی جاتی ہیں کہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ قالین، دھسے اور شالوں کی تیاری گھریلو صنعت کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کام فیکٹریوں میں نہیں چھوٹی چھوٹی بستیوں کے گھروں میں ہوتا ہے۔

زخمی بھیڑوں کی اُون پشمینہ سے دنیا کی بہترین شالیں تیار ہوتی ہیں جو شاہ توش کہلاتی ہیں۔ یہ شالیں بہت مہنگی ہوتی ہیں اور اس قدر نفیس اور باریک ہوتی ہیں کہ انگوٹھی میں سے گزاری جا سکتی ہیں۔ گھروں میں اُون کے نمدے بھی بڑے خوبصورت تیار ہوتے ہیں۔ اور اخروٹ کی لکڑی سے اس قدر خوبصورت اور نازک نقش فرنیچر تیار ہوتا ہے جس کی دنیا بھر میں مثال نہیں ملتی۔

ہنرمندی میں کشمیری خواتین بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ یہ کام زیادہ تر گھروں میں خواتین نے سنبھال رکھا ہے۔ کپڑوں پر کشمیری کشیدہ کاری کی مانگ تو پوری دنیا میں ہے۔ کاروباری لوگ وادی کی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں خواتین سے یہ کام کرواتے ہیں۔ خود تو وہ لاکھوں کماتے ہیں لیکن کیروسین لیمپ کی مندمل روشنی میں دیدوں کا پانی نچوڑنے والی ہنرمند خواتین کو معاوضہ برائے نام ہی دیا جاتا ہے۔

میں اور مقبول دیر تک کمرے میں لیٹے باتیں کرتے رہے۔ پھر اُٹھ کر باہر آ گئے۔ ماسی عائشہ اُس وقت باہر سے آئی تھی۔ اُس نے بغل میں ایک پوٹلی دبا رکھی تھی۔

''کھانا کھا لیا بیٹا؟'' اُس نے ہمارے قریب آ کر باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

''ہاں ماسی.....'' مقبول نے جواب دیا۔ ''میں ذرا عبدالحق سے ملنے جا رہا ہوں۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں واپس آؤں گا۔ وہ آرے پر ہی ہو گا نا؟''

''ہاں..... میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی اُسے اُس طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔'' ماسی نے جواب دیا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اور بیٹا تم اُدھر پچھلی طرف چلے جاؤ۔ وہاں درخت کا سایہ بھی ہے۔ لیکن اگر تم کمرے میں آرام کرنا چاہو تو تمہاری مرضی۔''

ماسی عائشہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مقبول، عبدالحق سے ملنے کے لئے چلا گیا۔ عبدالحق کا کمانڈر محب اللہ اور کمانڈر رشید جیسے مجاہد لیڈروں سے رابطہ رہتا تھا۔ یہاں مجاہدین کو پیغام بھی اُس کے توسط سے ملتے تھے اور مقبول یہی معلوم کرنے جا رہا تھا کہ کمانڈر محب اللہ کی طرف سے کوئی پیغام آیا یا نہیں؟

اُس کے جانے کے بعد میں تنہا صحن میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ میری نظریں انگوری کو تلاش کر رہی تھیں۔ نجانے کیا بات تھی کہ صبح اُسے دیکھنے کے بعد سے میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ بقول شخصے جب میں اُس کے بارے میں سوچتا تو دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا تھا۔ میں بار بار اُس کمرے کی طرف دیکھتا جہاں ماسی عائشہ گئی تھی۔ لیکن نہ تو ماسی کمرے سے باہر آئی اور نہ ہی انگوری کی صورت دکھائی دی۔

کمروں کے پچھلی طرف بھی ایک صحن تھا۔ اُس طرف جانے کا راستہ دائیں طرف سے تھا۔ اُس طرف جانے کے لئے میں جان بوجھ کر ماسی عائشہ والے کمرے کے سامنے سے گزرا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے اندر جھانکا لیکن مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ کمرے میں ماسی عائشہ کسی کام میں مصروف تھی لیکن انگوری دکھائی نہیں دی۔ وہ شاید گھر میں ہی نہیں تھی۔

میں کمروں کے اُوپر سے گھوم کر پہلو کی طرف آ گیا۔ دائیں طرف تقریباً آٹھ فٹ اُونچی کچی بونڈری وال تھی۔ اس طرح یہاں ایک گلیارہ سا بن گیا تھا۔ اس گلیارے سے گزر کر میں جیسے ہی دوسری طرف پہنچا ٹھٹھک کر رُک گیا۔ سامنے ہی اخروٹ کے بہت بڑے درخت کے گھنیرے سائے میں بچھے ہوئے لکڑی کے تخت پر بیٹھی ہوئی وہ کسی کپڑے پر کڑھائی کر رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی سینے میں میرا دل مچل اُٹھا اور دھڑکن بے قابو ہو گئی۔

انگوری نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سر جھکائے سوئی سے کپڑے پر ٹانکے بھرتی رہی۔ اور پھر شاید سوئی میں دھاگہ ختم ہو گیا تھا۔ اس وقت اُس نے جیسے ہی چہرہ اُوپر اُٹھایا مجھے سامنے دیکھ کر اُس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی اور اسی وقت عقب سے مجھے ماسی عائشہ کی آواز سنائی دی تھی۔

''ارے بیٹا! تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ بیٹھ جاؤ نا وہاں جا کر۔ دوسرا تخت خالی پڑا ہے۔''

میں تصورات کی دنیا سے باہر آ گیا اور ماسی عائشہ کے ساتھ ہی آگے بڑھ گیا۔

یہ عقبی آنگن بھی بہت کشادہ تھا۔ اخروٹ کا درخت بہت اُونچا اور بہت پھیلا ہوا تھا۔ اُس کے گھنیرے سائے نے آنگن کے بیشتر حصے کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ چار پائی سائز کے لکڑی کے تین تخت قریب قریب پڑے ہوئے تھے۔ ایک پر انگوری بیٹھی کڑھائی کر رہی تھی۔ قریب ہی سوئی دھاگوں والا ڈبہ رکھا ہوا تھا اور کچھ کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ دوسرے دونوں تخت خالی تھے۔

انگوری نے سوئی کپڑے میں کھونچ دی، کپڑے کو ایک طرف رکھا اور اُٹھ کر دوسرے تخت پر چادر بچھا دی۔

''بیٹھ جایئے!'' اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اُس کی نظریں فوراً ہی جھک گئیں..... اُس کی جھکی جھکی سی پلکیں مجھے بہت اچھی لگیں۔ میں پیر لٹکا کر تخت پر بیٹھ گیا۔ انگوری بھی اپنی جگہ پر بیٹھ چکی تھی۔ اُس کا رُخ میری طرف تھا اور میں کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سر پر رُومال باندھ رکھا تھا اور بالوں کی دونوں چوٹیاں اس وقت بھی اُس کے سینے پر دونوں طرف ٹکی ہوئی تھیں۔ اُسے شاید چوٹیاں آگے ڈالے رکھنے کی عادت تھی۔

انگوری کی کیفیت بھی اس وقت شاید مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ اُس کے چہرے پر سرخی گہری ہو گئی تھی اور سینے کا زیر و بم نمایاں ہو رہا تھا۔ کپڑے پر ٹانکا بدلتے ہوئے اُس نے جھکی جھکی سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے ہونٹوں سے سی کی آواز نکل گئی۔ سوئی اُس کی اُنگلی میں چبھ گئی تھی۔ میں بھی بے چین سا ہو اُٹھا۔ مجھے لگا جیسے سوئی انگوری کی اُنگلی میں نہیں میرے دل میں چبھی ہو۔ وہ اُنگلی کو منہ میں داب کر چوسنے لگی۔

''اے لڑکی دھیان سے.....'' قریب بیٹھی ہوئی ماسی عائشہ نے اُسے گھورا۔

انگوری نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

ماسی عائشہ نے وہ پوٹلی کھول لی جو وہ باہر سے لے کر آئی تھی۔ اُس میں بن سلے زنانہ کپڑے اور رنگ برنگے ریشمی دھاگوں کی لچھیاں تھیں۔ ان کپڑوں پر ڈیزائن بھی ٹریس کئے ہوئے تھے۔ ماسی عائشہ کپڑے کے ساتھ دھاگوں کی لچھیاں بھی الگ الگ کر کے رکھتی رہی اور اس کے ساتھ ہی وہ انگوری سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''شمروز بیٹا! تمہیں پہلی بار دیکھا ہے۔ اپنے بارے میں کچھ بتاؤ! کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''یہ پوری وادی میرا گھر ہے ماسی!'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے میری پیدائش سوپور کی ہے۔ وہیں پلا بڑھا اور میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ میرے والد رسول بخش لون قصبے کی مسجد کے پیش امام تھے۔ ہماری تھوڑی بہت زمین بھی تھی لیکن ایک روز.....'' میں ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر قصبے پر بھارتی فوجی دستے کے حملے اور اُن کی قتل و غارت کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا۔ ''میں بھی اس جھڑپ میں شدید زخمی ہوا تھا۔ بھارتی فوجی مجھے مُردہ سمجھ کر پھینک گئے۔ ہوش آیا تو اپنے قریب قصبے کی دو لڑکیوں کی نچی ہوئی لاشیں دیکھیں۔'' میں ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اس مرتبہ خاموشی کا وقفہ قدرے طویل تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹی افسردہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''اتفاق سے کمانڈر محب اللہ اپنے آدمیوں کے ساتھ اُس طرف آ نکلا اور مجھے اُٹھا لایا۔ میں شاید مر ہی چکا ہوتا مگر ڈاکٹر مریم نے مجھے نئی زندگی دی۔ اگر وہ نہ ہوتی تو.....''

''مریم تو فرشتہ ہے بیٹے!'' ماسی عائشہ نے کہا۔ ''اُس نے تو اپنے آپ کو مجاہدین کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ جہاں اُس کی ضرورت ہوتی ہے پہنچ جاتی ہے۔ گھر کا عیش و آرام

چھوڑ کر اُس نے پہاڑوں میں خطرناک زندگی اپنائی ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ اُس نے بھی مجاہدین کی طرح اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے۔ بڑی دلیر لڑکی ہے۔''

''حوصلے اور جذبے کی بات ہے ماسی!'' میں نے کہا۔ ''اور انشاء اللہ یہ جذبہ ہی ہمیں آزادی کی منزل تک لے جائے گا۔''

''انشاء اللہ.....'' انگوری کی آواز سن کر میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اس بار وہ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر شرمائی نہیں۔ اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بھی واضح ہوگئی تھی۔ اس وقت مجھے اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی تھی۔ ایسی چمک تو میں نے اُن مجاہدوں کی آنکھوں میں دیکھی تھی جو مادرِ وطن کی آزادی کے لئے بھارتی درندوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔

میں نے اور ماسی عائشہ نے بھی بیک وقت انشاء اللہ کہا تھا۔

''ارے بیٹی جا، چائے تو بنا کر لا! بڑا جی چاہ رہا ہے۔'' ماسی عائشہ نے انگوری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

انگوری نے سوئی دھاگہ اور کپڑا سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور تخت سے اُتر کر میری طرف دیکھتی ہوئی گلیارے میں چلی گئی۔ ماسی عائشہ اپنا کام کرتے ہوئے مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اُس نے بھرپور انداز میں میرے قصبے کی تباہی اور میرے گھر والوں کی شہادت پر اظہار ہمدردی کیا تھا۔

تقریباً بیس منٹ بعد انگوری گلیارے کی طرف سے نمودار ہوئی۔ اُس نے پلاسٹک کی ایک ٹرے اُٹھا رکھی تھی جس میں شیشے کے دو چھوٹے گلاس قہوے سے بھرے ہوئے رکھے تھے۔ میں گہری نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اگرچہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے ہوئے چل رہی تھی لیکن ڈھیلے ڈھالے کرتے کے اندر اُس کے گداز سینے کے اُبھار اس طرح متحرک تھے جیسے جوانی چھلک رہی ہو۔

قریب آ کر اُس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اُس کی نظریں جھک گئیں۔ اُس نے ایک گلاس میرے قریب تخت پر رکھ دیا اور دوسرا ماں کی طرف بڑھا دیا۔

''تو اپنے لئے چائے بنا کر نہیں لائی؟'' ماسی عائشہ نے کہا۔

''نہیں ماں... میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' انگوری کہتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور سوئی دھاگہ سنبھال کر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

چائے پیتے ہوئے بھی میں بار بار انگوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کا ہاتھ بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ کپڑا اُس کے گھٹنے پر پھیلا ہوا تھا۔ بڑی نفیس اور عمدہ کڑھائی ہو رہی تھی۔

ابھی میری چائے ختم نہیں ہوئی تھی کہ مقبول بھی آ گیا۔ وہ بھی میرے قریب ہی تخت پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

''چائے پیو گے مقبول بھائی؟'' انگوری نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم جانتی ہو میں چائے سے تو انکار نہیں کر سکتا۔'' مقبول نے جواب دیا۔ انگوری مسکراتے ہوئے اُٹھ کر گلیارے کی طرف چلی گئی۔

''پیغام آ گیا ہے۔'' مقبول نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم شام پانچ بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔ کچھ اور لوگ بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اُنہوں نے روانگی کی تیاری شروع کر دی ہے۔''

''تیاری؟ میں سمجھا نہیں۔'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''سمجھ جاؤ گے۔'' مقبول مسکرا دیا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ انگوری مقبول کے لئے قہوہ لے آئی۔ وہ دونوں جس طرح آپس میں بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ مقبول اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد تین چار لڑکیاں پوٹلیاں اُٹھا کر پچھلے دروازے سے اندر آ گئیں۔ یہ گاؤں کی لڑکیاں تھیں جو یہاں بیٹھ کر کڑھائی کیا کرتی تھیں۔ میں اور مقبول اُٹھ کر کمرے میں آ گئے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں سو گیا لیکن ڈھول اور نفیریوں کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ اُس وقت ساڑھے چار بجے تھے۔ مقبول دروازے میں کھڑا تھا۔ اس وقت انگوری ہمارے لئے قہوہ لے آئی۔ میں نے کمرے سے باہر آ کر ڈرم سے منہ ہاتھ دھویا اور پھر کمرے میں آ گیا۔ چائے پیتے ہوئے مقبول بتا رہا تھا کہ بستی والے روانگی کی تیاری کر رہے ہیں۔

چند منٹ بعد جب ہم ماسی عائشہ کے گھر سے رخصت ہوئے تو انگوری اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں بے پناہ اُداسی تھی۔

اب میری سمجھ میں آ گیا کہ صبح مقبول نے کس تیاری کی بات کی تھی۔ گاؤں کے چوراہے پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ دو تین آدمی ڈھول اور نفیریاں بجا رہے تھے۔ کچھ ادھیڑ عمر آدمی قلندرانہ رقص کر رہے تھے۔ ایک بوڑھے نے سبز کرتا پہن رکھا تھا اور اُس کے سر پر ٹوپی بھی ہرے رنگ کی تھی۔ چار پانچ آدمیوں نے ہرے رنگ کے جھنڈے اُٹھائے ہوئے تھے۔ ایک جھنڈے پر گوٹے سے کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ باقی جھنڈوں کے کناروں پر گوٹا لگا ہوا تھا۔

بستی سے جو قافلہ روانہ ہوا اُس میں میرے اور مقبول سمیت بیس بائیس افراد تھے جن میں مرد بھی تھے، عورتیں اور بچے بھی۔ یہ قافلہ گلمرگ کے نواح میں پیر بابا کی درگاہ پر جا رہا تھا۔ ہر چاند کی پہلی جمعرات کو پیر بابا کی درگاہ پر میلے کا سا سماں ہوتا تھا۔ اور آج پہلی جمعرات تھی۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ہمیں گلمرگ مطلوبہ مقام تک پہنچانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ اور ظاہر ہے یہ پلاننگ بہت پہلے اور بہت سوچ سمجھ کر کی گئی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہمارا قافلہ ڈھول تاشے بجاتا گلمرگ شہر سے ایک میل دُور اُس وسیع و عریض قبرستان میں پہنچ گیا جہاں پیر بابا کا مزار تھا۔ وہاں پہلے ہی سے بہت سے لوگ جمع تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہاں پولیس یا فوج کے آدمی بھی ہوں گے مگر دُور دُور تک کوئی وردی والا نظر نہیں آ رہا تھا۔

شام ہوگئی تھی۔ مزار پر بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں تھا۔ جگہ جگہ زمین میں گڑھی ہوئی لکڑیو
پر لالٹینیں لٹکی ہوئی تھیں۔ اچھا خاصا رش تھا۔ قوالی کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ لوگ جوق در جو
مزار پر دُعا مانگنے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ پیر بابا کی قبر جس حجرے میں تھی اُس کا دروا
بھڑا ہوا تھا۔ ایک آدمی مجھے دھکیلتا ہوا اُس دروازے کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں اِدھر اُد
دیکھ رہا تھا۔ مقبول بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ آدمی مجھے دھکیلتا ہوا دروازے کے اندر لے
اور پھر دروازہ بند ہو گیا.....

میں نے مُڑ کر اُس شخص کی طرف دیکھا اور چونک گیا۔ وہ کمانڈر رشید تھا.....

مزار کے اس حجرے کے اندر طاقچوں میں سرسوں کے تیل کے دیئے جل رہے تھے اور
دان میں اگر بتیاں بھی سلگ رہی تھیں۔ حجرے میں چراغوں اور اگر بتیوں کا دُھواں بھرا ہوا تھا
کمانڈر رشید مجھے قبر کے سنگ مرمر کے تعویذ کے پاس لے آیا۔ اُس نے نیچے جھک کر
جگہوں پر قبر میں لگے ہوئے سنگر مرمر کے ٹکڑوں کو مخصوص انداز میں دبایا اور پھر قبر کے تعویذ
دونوں ہاتھوں سے ایک طرف دھکیلنے لگا۔ قبر کا تعویذ صندوق کے ڈھکنے کی طرح اُوپر اُٹھتا
گیا۔ اُس کے نیچے خلا تھی جس کے اندر سیڑھیاں تھیں۔

کمانڈر رشید نے مجھے اشارہ کیا، میں جھک کر اُس خلا میں اُتر گیا اور ڈھکنا بند ہو گیا۔

نیچے کہیں مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں محتاط انداز میں سیڑھیاں اُترتا چلا گیا اور پھر
پہنچ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ یہ بہت وسیع و عریض تہہ خانہ تھا جس میں
کی کئی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں اور اُن کے قریب ہی کمانڈر محبّ اللہ، عبدالغنی لون اور تین آد
کھڑے تھے۔ اُن سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

کمانڈر محبّ اللہ نے دونوں بانہیں پھیلا دیں اور میں دوڑ کر اُن سے لپٹ گیا۔

○

وہ بہت وسیع و عریض تہہ خانہ تھا اور ایک طرف لکڑی کی بڑی بڑی کم و بیش بیس بائ
پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں جن میں مختلف قسم کا اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ ان پیٹیوں کے پیچھے تین لائٹ مشی
گنیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ اُن مشین گنوں کو کندھوں پر لاد کر آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگ
منتقل کیا جا سکتا تھا۔ ان کے قریب ہی چار بزوکا (کندھے پر رکھ کر راکٹ فائر کر
لانچر) بھی پڑے ہوئے تھے۔ یہ لانچر رُوسی ساخت کے تھے۔ اُن کے قریب ہی ایک کھلی ہو
پیٹی میں ایک درجن راکٹ رکھے ہوئے تھے۔ یہ راکٹ بھی رُوسی ساخت کے تھے اور اسی کلی
کے تھے جس کلیبر کے لانچر تھے۔ کئی پیٹیوں میں سب مشین گنیں تھیں۔ کم از کم چار پیٹیا
ایمونیشن سے بھری ہوئی تھیں۔ سب مشین گنوں کی گولیاں کھلی بھی تھیں اور بھرے ہوئے میگزی
بھی۔ ایک پیٹی میں گولیوں سے بھرے ہوئے لائٹ مشین گنوں کے بیلٹ بھی تھے۔

یہ تمام اسلحہ مجھے کمانڈر محبّ اللہ نے دکھایا تھا اور میرے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ س
کا سب اسلحہ بالکل نیا تھا جسے ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

''یہ اسلحہ مختلف چھاپہ مار کارروائیوں کے دوران بھارتی فوجیوں سے چھینا گیا ہے۔''
کمانڈر محبّ اللہ کی یہ بات سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ میرے دل کی بات کیسے جان لیتا تھا؟
''اور یہ راکٹ.....'' اُس نے راکٹوں والی پیٹی کی طرف اشارہ کر کے بات جاری رکھی۔ ''یہ
راکٹ بھارتی فوجی کے ایک لیفٹیننٹ سے خریدے گئے ہیں۔''

''خریدے گئے ہیں.....؟'' میں اُچھل پڑا۔ ''بھارتی فوجی ہمارے بدترین دشمن ہیں۔
ہماری بستیوں کو تباہ و برباد کر رہے ہیں اور بے گناہوں کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتار
رہے ہیں۔ اسلحہ کی تلاش کے لئے وہ ہمارے گھروں پر چھاپے مارتے ہیں۔ ہمیں ہر طرح سے
نہتا کر دینا چاہتے ہیں تاکہ ہم اُن کے مقابلہ پر نہ آ سکیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے
ہاتھوں میں کسی بھی قسم کا اسلحہ اُن کی موت کا پیغام بن جائے گا۔ ایسی صورت میں کوئی بھارتی
فوجی مجاہدین کے ہاتھ اپنا اسلحہ کیسے فروخت کر سکتا ہے؟

کمانڈر محبّ اللہ خاموشی سے میری تقریر سنتا رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

''ہم ایک مقصد کے لئے لڑ رہے ہیں اور وہ مقصد ہے آزادی۔ اس عظیم مقصد کے حصول
کے لئے ہمیں اپنی جانوں کی بھی پرواہ نہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''لیکن بھارتی فوجیوں کے پیش نظر
کوئی مقصد نہیں ہے۔ وہ ایک بے مقصد جنگ لڑ رہے ہیں۔ وہ تو سرکار کے ملازم ہیں جن کے
ہاتھوں میں بندوق تھما کر جنگ میں جھونک دیا گیا ہے۔ وہ ہر مہینے ملنے والی پگھار کے لئے
بندوق اُٹھانے پر مجبور ہیں۔ اگر وہ انکار کر دیں تو اُنہیں فوج کی نوکری سے نکال دیا جائے گا اور
اُن کے بال بچے بھوکے مر جائیں گے۔ وہ اس لئے لڑنے پر مجبور ہیں کہ اُنہیں اپنی جان بچانی
ہے اور جان بچانے کے لئے وہ جدید ترین اسلحہ بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن.....'' وہ
چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''لیکن جنگ نہ تو اسلحے سے لڑی
جاتی ہے اور نہ ہی نفری کسی کو فتح دلا سکتی ہے۔ جنگ تو جذبے سے لڑی جاتی ہے۔ جذبہ جو یہاں
ہوتا ہے۔'' اُس نے میرے سینے پر ہاتھ مارا۔ ''کوئی مقصد ہو گا تو جذبہ بھی پیدا ہو گا اور جب
کوئی مقصد ہی سامنے نہ ہو تو کیسا جذبہ.....اور نفری یا تعداد سے کیا ہوتا ہے۔ بھارت سرکار نے
سات لاکھ فوج کشمیر کی اس جنگ میں جھونک رکھی ہے۔ لیکن اب تک کیا کر لیا ہے اُنہوں نے؟
مظلوموں اور بے گناہوں کو بربریت کا نشانہ بنانے کے لئے اُنہوں نے کیا، کیا ہے؟ نہتے اور
پُرسکون لوگوں کی بستیوں پر آگ برسا کر اُنہیں خاکستر کر دینے کے علاوہ کیا تیر مارا ہے ان
سات لاکھ سورماؤں نے؟ کیا بے گناہوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دینے سے
ہنستی بستی بستیوں کو اُجاڑ دینے اور جلا کر راکھ کر دینے سے آزادی کی یہ تحریک ختم ہو جائے گی؟
فیور کشمیریوں کے جذبہ آزادی کو کچل دیا جائے گا؟ نہیں میرے دوست.....!'' اُس کی نظریں
میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میں نے پہلی مرتبہ اُسے اس طرح بولتے دیکھا تھا۔ ''نہیں میرے

دوست!'' اُس نے ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ ''جذبہ کبھی نہیں مرتا اور آزادی کی
تحریک کو کبھی نہیں کچلا جا سکتا۔ اس کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ زیادہ دُور جانے
ضرورت نہیں۔ افغانستان کو دیکھ لو..... غیور افغانیوں نے دنیا کی اُس وقت کی سب سے
طاقت سوویت یونین کو افغانستان سے بوریا بستر گول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور یہ افغانستان
عبرتناک شکست کا نتیجہ تھا کہ سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا۔ ہمیں ویتنام اور الجزائر کو بھی
بھولنا چاہئے۔ اُنہوں نے طویل عرصہ تک اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقتور دشمنوں کے خلاف
لڑی اور بالآخر اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ بوسنیا اور چیچنیا کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ آزا
کے متوالے بے سروسامانی کی حالت میں طاقتور دشمنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ نفری اور جد
ترین اسلحہ سے کوئی جنگ نہیں جیتی جا سکتی۔ جنگ جیتنے کے لئے جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے
بھارتی فوجیوں میں یہ جذبہ مفقود ہے۔ وہ تو تنخواہ کے لئے بندوق اُٹھانے پر مجبور ہیں۔ اور ایک
بات اور تمہیں بتا دُوں، یہ بنیا قوم جو ہے نا، صرف پیسے کو پوجتی ہے..... پیسہ ہی ان کا دین دھ
ہے۔ بڑی بے ضمیر قوم ہے یہ۔ اور یہ اسلحہ ہم نے ایسے ہی بھارتی فوجیوں سے خریدا ہے جنہیں
اپنے قومی مفاد سے زیادہ اپنا ذاتی مفاد عزیز ہے۔''

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور چند لمحوں بعد بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''بھار
سینا میں ایسے بہت سے سورما موجود ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ جب کشمیر میں اپنی ڈیوٹی پوری
کے واپس جائیں تو اُن کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی ہوں۔ اُن میں معمولی سپاہی سے لے
بریگیڈیئر تک کے اعلیٰ افسران بھی شامل ہیں۔ اور وہ بیوقوف یہ نہیں سمجھتے کہ پیسے کے لالچ
جو اسلحہ وہ ہمارے ہاتھ فروخت کرتے ہیں وہی اسلحہ اُن کے خلاف استعمال ہو گا اور وہ خود
مارے جائیں گے۔ جس لیفٹیننٹ نے ہمارے آدمی کے ہاتھ یہ راکٹ فروخت کئے
تیسرے ہی روز وہ ہندو لیفٹیننٹ پتن میں مجاہدین کے ساتھ ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں کمانڈر!'' میں نے جواب دیا۔ ''مقصد اور جذبہ یہی دو چیزیں ہیں
منزل تک پہنچاتی ہیں اور.....'' میں بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔ ڈھول اور تاشوں کے
کی آواز میری سماعت سے ٹکرانے لگی تھی۔

کمانڈر محب اللہ دو تین قدم اُٹھا کر آگے بڑھ گیا۔ میں بھی سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا
اُوپر سے ڈھول اور نفیریوں کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر وہ آواز دفعتہً بند ہو
اور چند سیکنڈ بعد دو آدمی سیڑھیوں والے راستے سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔

اس کے پانچ منٹ بعد دو آدمی اور اندر آئے تھے۔ اُس وقت بھی ڈھول وغیرہ کی آواز سنا
دی تھی۔ میں سمجھ گیا جب کسی کے اندر آنے کے لئے حجرے میں واقع قبر کا سنگ مرمر والا تعو
ڈھکنے کی طرح اُٹھایا جاتا تھا تو باہر کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے
اس تہہ خانے میں چودہ آدمی جمع ہو چکے تھے۔ اُن سب کے حلیے بڑے عجیب تھے۔ کئی کئی

کے بڑھے ہوئے شیو، سر کے بال بھی بے تحاشہ بڑھے ہوئے۔ کپڑوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کئی
روز سے جسم سے جدا نہ ہوئے ہوں۔ ایک آدمی تو ایسا تھا جس کے کرتے پر دو جگہ پیوند لگے
ہوئے تھے۔

اُن سب کے حلیے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ بھکاری ہوں۔ لیکن وہ بھکاری نہیں تھے۔ یہ تو کسی
کروڑ پتی سے بھی زیادہ دولت مند تھے۔ ان کے پاس تو جذبے کی بے پناہ دولت تھی۔ ان کے
پاس حوصلہ کی قوت تھی۔ یہ اس وادی کے امین تھے جس پر غاصبوں نے قبضہ جما رکھا تھا اور یہ اُن
غاصبوں کو یہاں سے نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ یہ تو ہیروز تھے۔ کشمیر کے مظلوم عوام
کی اُمیدوں کا مرکز تھے۔

مقبول اور حسن، بسال پور سے میرے ساتھ آئے تھے۔ لیکن وہ اس تہہ خانے میں نظر نہیں آ
رہے تھے۔ میں نے اُن دونوں کو اُوپر ہجوم کے ساتھ قلندرانہ رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا اور میرا
خیال تھا کہ وہ بھی کچھ دیر میں یہاں پہنچنے والے تھے۔

میں تہہ خانے میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اس تہہ خانے میں انسانی کوششوں کا کوئی عمل دخل
نہیں تھا۔ اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ اس تہہ خانے کے معرض وجود
میں آنے میں بھی پانی کا کمال تھا۔ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں اُونچے پہاڑوں سے آنے والا پانی
اس جگہ کوئی راستہ پا کر زمین کے اندر داخل ہو گیا ہو اور پھر اندر ہی اندر چٹانوں کو اس طرح کاٹتا
رہا ہو کہ یہاں زیر زمین غار بن گئے تھے۔ یہ عمل بھی صدیوں بعد پایہ تکمیل کو پہنچا ہو گا۔

دیواریں ناہموار اور کٹی پھٹی تھیں۔ کئی جگہوں پر تنگ سی دراڑیں نظر آ رہی تھیں۔ فرش بھی
ناہموار اور اُونچا نیچا تھا۔ قبرستان کے نیچے یہ قدرتی تہہ خانہ جیسا بھی تھا مجاہدین کے لئے ایک
بہترین پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔

عبدالغنی لون اُس وقت میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے اس تہہ خانے کے بارے میں
دریافت کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔

''میری معلومات کے مطابق ساٹھ سال پہلے یہاں پہلی قبر بنی تھی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''پرانا
قبرستان گلمرگ شہر کے دوسری طرف ہے۔ وہاں جگہ نہ بچی تو یہاں قبرستان بنا لیا گیا۔
ہندوستان کے بٹوارے کے بعد کشمیر کا مسئلہ پیدا ہوا تو اس قبرستان کی آبادی میں بھی اضافہ
ہونے لگا۔ آزادی کی تحریک جیسے جیسے زور پکڑتی گئی یہ قبرستان بھی پھیلتا چلا گیا۔ تقریباً تیس
سال پہلے.....'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تقریباً تیس
سال پہلے یہاں ایک قبر کھودی جا رہی تھی تو زمین کے نیچے کی مٹی بیٹھتی چلی گئی اور قبرستان کے
نیچے اس وسیع و عریض غار کا انکشاف ہوا۔ اس غار کو راز میں رکھا گیا اور یہاں ایک حجرہ تعمیر کر
کے ایک ضعیف العمر آدمی کو بٹھا دیا گیا۔ وہ بڑا اللہ لوک تھا۔ کچھ لوگ اُس کے پاس اُٹھنے بیٹھنے
لگے۔ اس طرح وہ پیر بابا کے نام سے مشہور ہو گیا۔ دس سال پہلے پیر بابا کا انتقال ہوا تو اُس کی

قبر پر بھی ایک حجرہ تعمیر کر دیا گیا۔ اس دوران یہ پختہ قبر بھی تعمیر کر لی گئی۔ تہہ خانے کے راستے
چھپانے کا یہی ایک بہتر طریقہ تھا۔ یوں تو بھارتی وحشی فوجی جنازوں پر فائرنگ کرتے ہیں او
کوئی شبہ ہونے پر قبریں تک کھود ڈالتے ہیں لیکن اس مزار پر اُنہیں آج تک کوئی شبہ نہیں ہو سکا
یہ تہہ خانہ مجاہدین کے لئے پچھلے دس پندرہ سال سے ایک چھوٹے سے اسلحہ ڈپو کا کام دے
ہے۔ یہاں جمع ہونے والے اسلحے کو روکا نہیں جاتا، وقتاً فوقتاً مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے
ضرورت کے وقت مجاہدین یہاں پناہ بھی لے لیتے ہیں۔ گلمرگ اور اس کے قرب و جوار میں
چھاپہ مار کارروائیوں میں ہمارا پلہ اس لئے بھی بھاری رہتا ہے کہ یہاں سے ہمیں ضرورت
اسلحہ مل جاتا ہے اور بھارتی فوجی آج تک یہ سراغ نہیں لگا سکے کہ اُن کی ناک کے عین نیچے
بہت بڑی چھاؤنی سے محض ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہمارا یہ اڈہ موجود ہے۔''

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''لیکن جب سے شہر کے
جنوب میں بھارتی فوج کا وہ کیمپ اور گولہ بارود کا ڈپو بننا شروع ہوا ہے اس علاقے میں ہماری
سرگرمیاں محدود ہو کر رہ گئی ہیں اور آج اس ڈپو کے خلاف کارروائی کا پروگرام ہے۔''

یہ تو مجھے پہلے ہی علم ہو چکا تھا کہ اس بھارتی فوجی کیمپ کے خلاف کارروائی میں جو مجاہد
شریک ہوں گے اُن میں میرا نام بھی شامل ہے۔ اور اس لئے مجھے یہاں لایا بھی گیا تھا
دوسرے مجاہدین کو بھی اسی طرح خفیہ طور پر یہاں جمع کیا جا رہا تھا۔ لیکن اپنے آپ کو ایک بڑی
کارروائی کے اس قدر قریب دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں.....

اس دوران چار آدمی اور آ چکے تھے۔ اور پھر کمانڈر محبّ اللہ نے مجھے اشارے سے اپنے
قریب بلا کر ایک نوجوان مجاہد کے حوالے کر دیا۔

''آج کی کارروائی کے دوران تم لائٹ مشین گن سنبھالو گے۔ اکبر کے ساتھ جاؤ! یہ تمہیں
ایل ایم جی چلانا سکھا دے گا۔ زیادہ مشکل نہیں ہے تم چند منٹ میں سیکھ لو گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آٹو میٹک رائفل اور سب مشین گن کے استعمال میں تو
خاصی مہارت ہو چکی تھی اور اب لائٹ مشین گن۔ میرے بدن میں برقی لہریں سی کوندنے لگیں۔

اکبر نے ایک لائٹ مشین گن اُٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ اُس کے آگے نال کے ساتھ
کی طرف ایک سٹینڈ لگا ہوا تھا جس سے گن کی نال کچھ اُوپر اُٹھ گئی تھی۔ لیکن اپنی مرضی
مطابق اسے حرکت دی جا سکتی تھی۔

''یہ گن زیادہ وزنی نہیں ہے۔'' اکبر بتا رہا تھا۔ ''اسے کندھے پر رکھ کر بڑی آسانی
ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا ہے اور اس کا استعمال بھی زیادہ مشکل نہیں ہے۔''

چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر مجھے گن کے پیچھے پوزیشن میں بٹھا دیا اور اُس کے استعمال کے بارے
میں بتانے لگا کہ کس طرح بیلٹ لوڈ کیا جاتا ہے، لاک، ٹرائیگر اور گرپ کہاں ہونی چاہئے وغیرہ
وغیرہ۔

ایسے اسلحہ کی ٹریننگ کے لئے اگرچہ خاصا وقت درکار ہوتا ہے لیکن مجاہدین کے پاس نہ تو
کوئی ٹریننگ کیمپ تھا اور نہ ہی اتنا وقت۔ وہ ہر قسم کے اسلحے کا استعمال چند منٹوں میں سیکھ لیتے
تھے اور دشمن کے خلاف چھاپہ مار کارروائیاں ہی اُن کی اصل ٹریننگ تھی۔

میں نے آدھے گھنٹے میں ایل ایم جی کا استعمال سیکھ لیا اور بیلٹ چڑھا کر بھی دکھایا اور
دوسرے فنکشنز کے استعمال کا بھی مظاہرہ کیا۔

''گڈ .....!'' اکبر مسکرا دیا۔ ''تم واقعی ذہین آدمی ہو۔ اس کا بیلٹ عام طور پر پیٹی میں ہوتا
ہے اور گنز کے ساتھ اس کا ایک ہیلپر بھی ہوتا ہے جو بیلٹ کے فنکشن کا خیال رکھتا ہے۔ لیکن
ہمارے پاس زیادہ آدمی نہیں ہوں گے۔ گولیوں والا بیلٹ بھی تمہیں ہی اُٹھانا پڑے گا۔ اس
طرح.....'' اُس نے پیٹی میں سے گولیوں سے بھرا ہوا بیلٹ نکال کر اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور پھر
میں نے بھی اُسے بیلٹ اپنے جسم پر لپیٹ کر دکھایا۔

ہزار گولیوں کا بیلٹ تھا اور خاصا وزنی تھا..... لیکن میرا خیال تھا کہ میں بیلٹ اور ایل ایم جی
اُٹھا کر پہاڑیوں میں کئی میل تک بے تکان چل سکتا تھا۔

اکبر میری کارکردگی سے مطمئن ہو گیا اور پھر کچھ دوسری باریکیاں سمجھانے لگا۔ اُس سے
باتیں کرتے ہوئے میں وقتاً فوقتاً اِدھر اُدھر بھی دیکھ رہا تھا۔ بعض دوسرے آدمیوں کو بھی ایل ایم
جی اور راکٹ چلانے کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔

ایک بڑی کارروائی سے پہلے یہی وہ مختصر لمحات تھے جب ان مجاہدین کو وہ اسلحہ چلانے کی
تربیت دی جا رہی تھی جو اُنہوں نے پہلے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ اور یہاں پر موجود کمانڈرز اُن
کی اس تربیت سے مطمئن تھے۔

اسی دوران تہہ خانے کے ایک کونے میں جا کر ایک آدمی نے کیراسین آئل کے چولہے پر
بغیر دُودھ کی چائے بنائی۔ یہاں اس سے پہلے شاید اس سے بھی زیادہ تعداد میں مجاہدین آتے
رہتے تھے اس لئے مگوں اور پیالوں کی کمی نہیں تھی۔ چائے تقسیم کرنے کے ساتھ اُس نے زمین
پر چادر بچھا کر ایک بڑی سی پوٹلی کھول دی تھی جس میں نمک ملے آٹے کی روٹیوں کا ڈھیر لگا ہوا
تھا۔ ہر شخص اپنے اپنے حصے کی روٹی لے کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی ایک روٹی لے
لی اور نوالے توڑ توڑ کر قہوہ کے ساتھ کھانے لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر کمانڈر محبت اللہ، کمانڈر رشید اور عبدالغنی لون اکٹھے بیٹھ گئے۔ ہم
لوگ بھی اُن کے گرد جمع ہو گئے۔ کمانڈر محبت اللہ زمین پر بھارتی فوجی کیمپ کی لوکیشن کا نقشہ بنا
کر حملے کے پروگرام کو فائنل ٹچ دینے لگا۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ اس کارروائی میں کمانڈروں
سمیت چوبیس مجاہدین حصہ لینے والے تھے۔ اٹھارہ تو اس تہہ خانے میں موجود تھے جبکہ باقی چھ
کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ بھارتی فوجی کیمپ کے آس پاس مختلف جگہوں پر پہنچ چکے ہیں جو
ہمارے سگنل سن کر اس سے آگے ہماری رہنمائی کریں گے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق کیمپ پر حملہ تین مختلف اطراف سے کیا جانا تھا۔ اس طر
مجاہدین بھی تین پارٹیوں میں تقسیم ہو جاتے۔ ہر پارٹی میں آٹھ مجاہدین ہوتے۔ ایک پارٹی
کمانڈر محب اللہ تھا، دوسری پارٹی کی کمان کمانڈر رشید کو سونپی گئی جبکہ تیسری پارٹی کی قیاد
عبدالغنی لون کے سپرد کی گئی تھی۔ ہر پارٹی کو کارروائی مکمل کرنے کے بعد مختلف سمتوں میں فر
ہو جانا تھا۔

میں کمانڈر محب اللہ کی پارٹی میں تھا اور ہمیں انتہائی جنوب کی طرف سے کیمپ پر حملہ آور
تھا۔ یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ ہر پارٹی کسی سگنل کا انتظار کئے بغیر ٹھیک چار بجے اپنی کارروا
شروع کر دے گی۔

وہ فوجی کیمپ اُسی قبرستان سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ راستہ پہاڑی اور خار
دُشوار گزار تھا جسے طے کرنے میں کچھ وقت لگ سکتا تھا۔ کمانڈر محب اللہ کا حکم سنتے ہی ہم تیار
گئے۔ میں نے لائٹ مشین گن کی گولیوں والا بیلٹ اس طرح اپنے سینے اور باقی جسم پر لپیٹا
کہ ضرورت کے وقت جسم سے الگ کر کے استعمال کیا جا سکے۔ ایل ایم جی میں نے دائیں
کندھے پر لاد لی۔ کمر پر بندھے ہوئے پٹکے میں، میں نے ایک پستول اور اُس کے چند میگزی
بھی اڑس لئے تھے۔ ہر پارٹی میں ایک ایک راکٹ لانچر بردار بھی شامل تھا اس طرح چار
راکٹ بھی ان تینوں کے حصے میں آئے تھے۔ انہوں نے راکٹ چادروں میں لپیٹ کر پشت
لاد لئے تھے۔ ہر پارٹی میں دو دو لائٹ مشین گنیں تھیں۔ پستول یا ریوالور ہر ایک کے پا
تھے۔ ان کے علاوہ کسی کے پاس سب مشین گن تھی اور کسی کے پاس آٹو میٹک رائفل۔ بعض
لوگوں کی بیلٹوں میں ہینڈ گرنیڈ بھی اڑسے ہوئے تھے۔

ہم لوگ ٹھیک ایک بجے حجرے میں واقع قبر کے راستے اُس تہہ خانے سے رخصت ہ
شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے کمانڈر رشید کی پارٹی وہاں سے روانہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد
عبدالغنی لون پندرہ منٹ کے وقفے سے اپنی پارٹی لے کر رخصت ہو گیا۔ اس کے مزید پند
منٹ بعد کمانڈر محب اللہ کی رہنمائی میں ہم بھی ایک ایک کر کے باہر آ گئے۔

حجرے میں ایک بوڑھا درویش بیٹھا ہوا تھا۔ آخری آدمی کے باہر آتے ہی اُس نے قبر بند
کر دی اور ہمارے ساتھ ہی حجرے سے باہر آ گیا۔

ہر طرف گہرا سناٹا تھا اور تاریکی تھی۔ یہ چاند کی پہلی جمعرات تھی اور غالباً چار تاریخ تھی لیکن
چوتھی کا چاند بہت پہلے آسمان سے رخصت ہو چکا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں آدھی رات کے
وقت قبرستان میں آنے کی ہمت بھی نہ کر پاتا۔ لیکن اب صورتحال دوسری تھی۔ اس تاریکی اور
سناٹے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں تھا۔

ہم قبرستان کے پچھلی طرف سے نکل کر پہاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے ایک
مرتبہ مُڑ کر بائیں طرف دیکھا تقریباً ڈیڑھ میل دُور نشیب میں گلمرگ شہر نیند کی آغوش میں تھا
شہر میں کہیں کہیں بتیاں جھلملاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ شہر سے پرے قدرے بائیں جانب
بھارتی فوجیوں کی چھاؤنی تھی۔

ہم مسلسل جنوب کی طرف ہٹتے ہوئے پہاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ کمانڈر محب اللہ سب
سے آگے تھا۔ میں اُس کے پیچھے چوتھے نمبر پر تھا۔ انہی پہاڑیوں میں چلتے ہوئے ہمیں تقریباً
پانچ میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ ہم مناسب رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایل ایم جی خاصی
وزنی تھی۔ میں اُسے کبھی ایک کندھے پر منتقل کرتا اور کبھی دوسرے کندھے پر۔ شروع میں تو یہ
مجھے کچھ وزنی لگی تھی لیکن اب میں اس کا عادی ہو گیا تھا۔

تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک کشادہ ندی میں اُتر گئے۔ ندی اگرچہ
گہری تھی لیکن جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ہم اُن پتھروں پر اُچھلتے ہوئے ندی
پار کر گئے۔ کچھ دُور تک ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر پہاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ اس
مرتبہ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔

راستہ بڑا کٹھن تھا اور وہ ٹکڑا تو بہت خطرناک تھا جو ایک عمودی چٹان کے ساتھ واقع تھا۔
چٹان کے ساتھ تین چار فٹ چوڑی کگر سی باہر کو نکلی ہوئی تھی جس کے دوسری طرف ڈھائی تین سو
فٹ گہرا کھڈ تھا۔ ذرا سی لغزش موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔

میں نے ایک ہاتھ سے بائیں کندھے پر لدی ہوئی ایل ایم جی کو سنبھال رکھا تھا اور دوسرا
ہاتھ چٹان پر جمائے محتاط انداز میں قدم اُٹھاتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ تیز ہوا مجھے بار
بار پیچھے دھکیل رہی تھی۔ میں چٹان کے ساتھ لگا آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا اور بالآخر سات
منٹ میں پل صراط کی طرح وہ خطرناک راستہ طے کر کے دوسری طرف پہنچ گیا۔

ہم رُکے بغیر مسلسل چلتے رہے۔ میرے جسم پر لپٹا ہوا گولیوں کا بیلٹ بھی خاصا وزنی تھا اور
کندھے پر لدی ہوئی ایل ایم جی بھی بھاری تھی۔ اُونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے میرا سانس
پھولنے لگا، اور میرا خیال ہے تقریباً ڈھائی گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ہم ایک جگہ
رُکے تھے۔ یہاں چنار کے چند اُونچے درخت تھے۔ تیز ہوا سے اُن کی شاخیں جھکی جا رہی تھیں
اور پتوں کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہونے والی آوازوں سے یوں لگتا تھا جیسے سینکڑوں
پرندے بیک وقت پھڑ پھڑا رہے ہوں۔

میرے تمام ساتھی پتھروں پر بیٹھ گئے تھے۔ میں بھی ایل ایم جی کندھے سے اُتار کر ایک
پتھر پر بیٹھ گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ کمانڈر محب اللہ ہم سے چند گز آگے چلا گیا تھا۔
وہ کچھ دیر تک تاریکی میں گھورتا رہا۔

پھر یکدم بھیڑیئے کی آواز سن کر میں اُچھل پڑا..... لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ آواز سن کر میں
سمجھا تھا کہ کوئی بھیڑیا اچانک ہی کہیں سے اس طرف نکل آیا ہے۔ لیکن پھر اپنی اس حماقت پر
مسکرائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ وہ کمانڈر محب اللہ تھا جو منہ سے بھیڑیئے کی آواز نکال کر کسی کو مخصوص

سگنل دے رہا تھا۔

کمانڈر محبّ اللہ کے خاموش ہونے پر بھیڑیئے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ یہ آواز کچھ دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ کمانڈر محبّ اللہ نے جواب دیا۔ دوسری طرف سے بھی جواب ملا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ مگر یہ خاموشی زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکی تھی۔ دو منٹ بعد ہی چھوٹے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ صاف لگ رہا تھا کہ کوئی آدمی محتاط انداز میں چل رہا ہے۔ اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی وہ شخص سامنے آ گیا۔

وہ مقبول تھا۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ مقبول اور حسن خان بابا کی درگاہ پر آنے کے بعد کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اُنہیں غالباً ہراوّل دستے کے طور پر آگے بھیج دیا گیا تھا اور اس مقررہ جگہ پر سگنل پا کر مقبول سامنے آ گیا تھا جبکہ میرے خیال میں حسن بھی قرب و جوار میں کہیں موجود ہوگا۔

مقبول نے سیاہ لمبا چوغہ قسم کا کرتا پہن رکھا تھا۔ سر پر ٹوپی بھی کالی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی اور کمر پر بندھے ہوئے پٹکے میں کئی فاضل میگزین اڑسے ہوئے تھے۔

''کیا صورتحال ہے.....؟'' کمانڈر محبّ اللہ نے پوچھا۔ اُس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

''سب ٹھیک ہے.....'' مقبول نے جواب دیا۔ ''ہمارا وہ راستہ بالکل محفوظ ہے اور کیمپ میں بھی کوئی غیر معمولی سرگرمی دکھائی نہیں دیتی۔ نگران چوکیوں پر بھاری مشین گنیں نصب ہیں اور ہر چوکی پر دو دو فوجی بیٹھے ہوئے ہیں۔ نگران چوکیوں پر سرچ لائٹس بھی جل رہی ہیں جن سے خاردار باڑ کے ساتھ ساتھ اندر اور باہر چند فٹ تک کا علاقہ روشن ہے۔ اس روشنی کی وجہ سے باڑ تک پہنچنا ممکن نہیں۔''

''ناممکن کا لفظ ہماری لغت میں نہیں ہے۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے کہا۔ ''آگے بڑھو! ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

کمانڈر کا اشارہ پا کر ہم سب اپنی جگہوں سے اُٹھ گئے اور مقبول کے پیچھے پیچھے ایک قطار میں چلنے لگے۔

درختوں کے جھنڈ سے نکل کر ایک بڑی چٹان کے دوسری طرف آتے ہی میں چونک گیا۔ بائیں طرف کسی قدر نشیب میں روشنیوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ یہ روشنیاں کہیں زیادہ بلندی پر تھیں اور کہیں کسی قدر نیچے۔ یہ سرچ لائٹس اُن ٹاور نما نگران چوکیوں پر نصب تھیں جو باڑ کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنی ہوئی تھیں۔

تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک دراڑ میں داخل ہو گئے۔ یہ دراڑ اس قدر کشادہ تھی کہ اس میں دو آدمی پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ یہ دراڑ دراصل آبی گزرگاہ تھی۔ برسات کے دنوں میں پہاڑوں کی بلندی سے آنے والا پانی ایک نالے کی صورت میں یہاں

سے گزرتا تھا۔

ہم مسلسل نشیب میں اُترتے رہے اور پھر بلندی کی طرف جانے لگے اور بالآخر ایک جگہ رُک گئے۔ یہاں دائیں بائیں بھی کھڈ تھے جن میں آسانی سے چھپا جا سکتا تھا۔

کمانڈر محبّ اللہ نے بڑے محتاط انداز میں سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا، پھر نیچے جھک کر نہایت مدھم آواز میں ہمیں ہدایات دینے لگا۔ سب اپنا اپنا اسلحہ تیار کرنے لگے۔ اس قدر احتیاط سے کام لیا جا رہا تھا کہ معمولی سی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی معمولی سی آواز بھی ہوا کے دوش پر دشمن کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔

میں نے ایل ایم جی کندھے سے اُتار لی تھی لیکن بیلٹ ابھی نہیں اُتارا تھا کیونکہ گن کو اس جگہ فٹ نہیں کرنا تھا۔ میں نے بہت محتاط انداز میں سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑنے لگیں.....

ہم سے تقریباً پچاس گز آگے اُونچی جگہ پر وہ خاردار باڑ تھی جس کے ساتھ واچ ٹاورز بنے ہوئے تھے اور اُس باڑ کے دوسری طرف کسی قدر نشیب میں کئی فوجی بیرکیں نظر آ رہی تھیں۔ کئی خیمے بھی تھے۔ ایک طرف لاتعداد ٹرک بھی کھڑے تھے۔ اس وسیع و عریض علاقے میں جگہ جگہ بتیاں جل رہی تھیں۔ ان کی روشنی ہی کی وجہ سے وہ سب کچھ دیکھنا ممکن ہو سکا تھا۔

ایک واچ ٹاور ہمارے بالکل سامنے تھا۔ اُس کی بلندی تقریباً پندرہ فٹ تھی۔ اُس کی چھت پر بھی ایک بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں ٹاور پر نصب بھاری مشین گن صاف نظر آ رہی تھی۔ دو فوجی تھے جن میں ایک گن کے سامنے مستعد بیٹھا تھا اور دوسرا اُس کے قریب کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اُس کے کندھے پر بھی سب مشین گن لٹکی ہوئی تھی۔

کمانڈر محبّ اللہ نے ہم سب کو سمجھا دیا تھا کہ کس کو کیا کرنا ہے؟ اور پھر اُس نے مقبول کو اشارہ کیا۔ وہ کھڈے میں زمین پر جھکتا ہوا بائیں طرف چلتا چلا گیا۔

میرے دل کی دھڑکن خوفناک حد تک تیز ہو گئی تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب ہم نے سرینگر گلمرگ روڈ پر کسی جگہ بھارتی فوجی قافلے پر حملہ کیا تھا۔ وہ صورتحال کچھ اور تھی۔ ہم نے ٹرکوں کے چلتے قافلے پر گھات لگا کر حملہ کیا تھا۔ بھارتی فوجیوں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ یہاں صورتحال مختلف تھی۔ دشمن مستعد بیٹھا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مشین گنیں تیار تھیں۔ یہاں زبردست مقابلے کی توقع تھی۔

کمانڈر محبّ اللہ میرے ساتھ ہی تھا اور بار بار کلائی پر بندھی ہوئی ریڈیم ڈائل والی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ میرے بالکل سامنے ہونے کی وجہ سے اُس کی گھڑی مجھے بھی دکھائی دے رہی تھی۔ چار بجنے میں ایک منٹ باقی تھا.....

اور پھر ٹھیک چار بجے خاموش فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اُٹھی..... یہ فائرنگ اُس طرف سے ہوئی تھی جس طرف مقبول گیا تھا۔ حسن پہلے سے وہاں موجود تھا۔ چار بجتے ہی اُنہوں نے

فائر کھول دیا تھا.....

اُن دونوں کی طرف سے پہلا برسٹ فائر ہوتے ہی واچ ٹاور سے بھاری مشین گن کا فائر کھول دیا گیا..... گولیوں کی بارش اُس طرف ہو رہی تھی جہاں ہم سے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر مقبول اور حسن فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم کمانڈر محبّ اللہ کے حکم کے انتظار میں بالکل تیار بیٹھے تھے۔ تقریباً اُسی وقت ہمارے دو سو گز دائیں اور اور اتنے ہی فاصلے پر بائیں طرف بھی زبردست فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ عبدالغنی لون اور کمانڈر رشید کی پارٹیوں نے بھی کارروائی شروع کر دی تھی۔

مشین گن سے زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ اور پھر ایک دم اُس طرف تاریکی چھا گئی۔ مقبول یا حسن کی کسی گولی نے سرچ لائٹس توڑ دی تھیں۔ ٹاور کیبن کی چھت پر بلب جل رہا تھا اور وہ دونوں فوجی صاف نظر آ رہے تھے۔

کمانڈر محبّ اللہ نے بھی آڑ لے کر سب مشین گن سے فائر کھول دیا..... ٹاور پر مشین گن سے فائر کرنے والا اپنی جگہ سے اُچھلا اور ڈھیر ہو گیا۔ مشین گن خاموش ہو گئی۔ دوسرا فوجی اپنی سب مشین گن چھوڑ کر ہیوی مشین گن کی طرف لپکا لیکن اس سے پہلے کہ وہ مشین گن پر ہاتھ رکھتا مقبول یا حسن کی گولی نے اُسے چاٹ لیا اور وہ اُچھل کر چیختا ہوا ٹاور سے نیچے گرا۔

''مقبول! ٹاور پر پہنچو..... ہری اپ!'' کمانڈر محبّ اللہ چیخا پھر اُس نے ہمیں حکم دیا۔ ''باڑ کے قریب پہنچو اور فائر کھول دو.....''

اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی اُچک کر گڑھے سے باہر نکل گیا۔ میں نے ایل ایم جی اُوپر رکھ دی اور اُچک کر گڑھے سے باہر نکل آیا اور گن اُٹھا کر خاردار تاروں والی باڑ کی طرف دوڑا۔

اُس کیمپ کے بارے میں ہمارے کمانڈروں کے اندازے کچھ غلط نکلے تھے یا اُنہیں پوری معلومات حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ میرا اندازہ بھی یہی تھا کہ باڑ کے ساتھ والے واچ ٹاورز پر گنوں کے علاوہ مزید حفاظتی انتظامات نہیں ہوں گے۔ لیکن بھارتی فوجی اتنے بیوقوف تو ہرگز نہیں تھے کہ اتنے بڑے اسلحہ ڈپو کو محض نگران چوکیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے۔

باڑ سے تقریباً سو گز اندر کی طرف کئی جگہوں پر مٹی کی بوریاں رکھ کر مورچے بنے ہوئے تھے جن میں بھاری مشین گنیں نصب تھیں۔ دن کے وقت دُھوپ سے بچنے کے لئے اُن مورچوں پر سائبان تنے ہوئے تھے جن کی وجہ سے اُن کی نشاندہی ہو رہی تھی۔

پہاڑیاں ہیوی، لائٹ اور سب مشین گنوں کی فائرنگ سے گونج رہی تھیں..... کمانڈر رشید اور عبدالغنی لون کی پارٹیوں نے بھی بھرپور حملہ کیا تھا اور وہ بھی باڑ کی دو نگران چوکیوں پر قبضہ کر چکے تھے اور اُن کے آدمیوں نے ہیوی مشین گنوں کا رُخ کیمپ کی طرف موڑ دیا تھا۔ مقبول بھی سامنے والے ٹاور پر پہنچ گیا تھا۔ اُس نے سب سے پہلے تو اُوپر لگے ہوئے بلب کو اُڑا دیا اور پھر گن کا رُخ موڑ کر کیمپ پر آگ برسانے لگا۔

میں باڑ سے چند فٹ کے فاصلے پر رُک گیا۔ ایل ایم جی کو اپنے سامنے رکھا اور بڑی پھرتی سے اپنے جسم پر لپیٹا ہوا گولیوں والا بیلٹ اُتار کر زمین پر پھیلا دیا اور بیلٹ کا ایک سرا گن میں فٹ کرنے لگا۔ اس سارے عمل میں مجھے ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ لیکن میں ابھی گن کے سامنے پوزیشن نہیں لے پایا تھا کہ کیمپ کے اندر سے گولیوں کی بارش ہونے لگی..... سرخ دہکتے ہوئے انگارے موسلا دھار بارش کی طرح ہماری طرف لپک رہے تھے..... کئی گولیاں میرے سر کے اُوپر سے گزر گئیں۔

میں بڑی پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا اور گن سنبھال لی اور ٹرائیگر کھینچ لیا..... تڑتڑاہٹ کی خوفناک آواز سے گن انگارے اُگلنے لگی.....

دشمن کی چلائی ہوئی گولیاں میرے آس پاس گر رہی تھیں جسے ایک بڑے پتھر کی آڑ حاصل تھی۔ کئی گولیاں اُس پتھر پر لگی تھیں اگر میرے سامنے وہ پتھر نہ ہوتا تو میں چھلنی ہو چکا ہوتا۔

محاذ پوری طرح گرم ہو چکا تھا..... میرے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ دشمن سے اس طرح باقاعدہ مقابلے کا یہ میرے لئے پہلا موقع تھا اور حیرت کی بات تھی کہ میں اپنے آپ میں سنسنی تو محسوس کر رہا تھا لیکن ذہن پر کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔

''ناصر.....! راکٹ فائر کرو..... وہ سامنے دائیں طرف والی بیرکوں پر۔'' کمانڈر محبّ اللہ کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے بائیں طرف دیکھا ناصر مجھ سے پانچ گز کے فاصلے پر تھا۔ اُس نے لانچر میں راکٹ لوڈ کیا، بزوکا کندھے پر رکھا اور اس طرح پوزیشن لے کر بیٹھ گیا کہ ایک گھٹنا زمین پر ٹکا ہوا تھا اور دوسرا گھٹنا کھڑا تھا۔

وہ نشانہ لینے کے لئے لانچر کو آہستہ آہستہ حرکت دے رہا تھا کہ سامنے سے زبردست فائر آیا اور لاتعداد گولیاں میرے سر کے اُوپر سے گزر گئیں..... ناصر بھی بڑی پھرتی سے نیچے گر گیا تھا۔

''فائر!'' کمانڈر محبّ اللہ چیخا۔ ''ناصر! راکٹ فائر کرو! اور زبیر! تم ٹرکوں کو نشانہ بناؤ۔''

بھارتی کیمپ میں اب بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ فوجیوں نے بدحواس ہو کر اندھا دُھند فائرنگ شروع کر دی تھی۔ وہ اس طرف بھی فائرنگ کر رہے تھے جہاں اُن کے مقابلے پر کوئی نہیں تھا۔

ناصر ایک بار پھر پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔ اس مرتبہ اُس نے راکٹ فائر کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اُس کی یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی۔ راکٹ ایک بیرک پر لگا۔ ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور شعلوں کا ایک مہیب بادل آسمان کی طرف اُٹھتا ہوا نظر آیا جو اُوپر جا کر پھیلتا چلا گیا۔

زبیر نے بھی راکٹ فائر کر دیا تھا۔ اُس کا راکٹ حرکت کرتے ہوئے ایک ٹرک پر لگا۔ ٹرک کے پرخچے اُڑ گئے۔ اُس کے جلتے ہوئے ٹکڑوں نے چند اور ٹرکوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا..... ہماری دوسری پارٹیاں بھی کیمپ پر راکٹ برسا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اس بھارتی

فوجی کیمپ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو..... راکٹ اپنا کام دکھا رہے تھے۔ کیمپ میں اسلحہ کے ذخیرے تباہ ہو رہے تھے..... لگ رہا تھا جیسے کیمپ میں کئی آتش فشاں بیک وقت پھٹ پڑے ہوں۔ مسلسل دھماکوں سے پہاڑیاں لرز رہی تھیں۔

ہمارے سامنے مورچوں سے اب بھی ہیوی مشین گنوں سے بڑی زبردست فائرنگ ہو رہی تھی جس کی وجہ سے ہمیں آگے بڑھنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

مقبول بھی واچ ٹاور پر نصب مشین گن پر قبضہ کرنے کے بعد سامنے مورچوں پر فائر کر رہا تھا۔ دشمن اپنے سامنے مٹی کی بوریوں کی وجہ سے محفوظ تھے۔ ہماری چلائی ہوئی گولیاں اُن کو کچھ نہیں بگاڑ رہی تھیں۔

اور پھر ایک خوفناک چیخ سن کر میں چونک گیا..... میں نے اُس طرف دیکھا اور پھر میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... واچ ٹاور پر مقبول کو کئی گولیاں لگی تھیں اور وہ مشین گن کے ساتھ ڈھیر ہو گیا تھا..... سامنے والے مورچوں سے اب فائرنگ میں شدت آ گئی تھی۔ کمانڈر محبّ اللہ نے بیلٹ میں اڑسا ہوا ہینڈ گرنیڈ نکال کر اُس کی پن کھینچی اور بم کو پوری قوت سے مورچے کی طرف اُچھال دیا.....

بم مورچے سے چند گز آگے گرا۔ گرد و غبار کا ایک بادل اُٹھا..... میں نے دو فوجیوں کو مورچے کے پچھلی طرف سے نکل کر ایک طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اپنی گن کا رُخ اُن کی طرف موڑ دیا۔ وہ دونوں ڈھیر ہو گئے۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھل پڑا۔ اس معرکے میں دشمن کے پہلے دو آدمی میرا شکار بنے تھے۔

کیمپ میں جگہ جگہ دھماکے ہو رہے تھے۔ اسلحہ اور گولہ بارود کے کئی ذخیروں میں آگ لگ گئی تھی۔ آتش فشاں پھٹ رہے تھے۔ فوجی اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

ہمارے عقب میں ایک زوردار دھماکہ ہوا تو میں اُچھل پڑا..... وہ مارٹر گن کا گولہ تھا جو ہم سے تقریباً تیس چالیس گز پیچھے گر کر پھٹا تھا لیکن ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اپنی مشین گنوں کے ناکام ہونے کے بعد بھارتیوں نے مارٹر گنوں کا استعمال شروع کر دیا تھا..... ہماری طرف سے بھی مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہماری دوسری پارٹیاں بھی اپنے محاذ پر جمی ہوئی تھیں۔

مارٹر گنوں کے گولے ہمارے آس پاس پھٹ رہے تھے..... مارٹر گنوں کے ساتھ بھارتیوں نے اب راکٹ برسانا بھی شروع کر دیئے تھے۔ مگر یہ راکٹ ہمیں کوئی نقصان پہنچائے بغیر ہمارے سروں کے اُوپر سے گزرتے رہے۔

ناصر کے پاس چار راکٹ تھے اور وہ چاروں راکٹ فائر کر چکا تھا..... ایک آخری راکٹ اُس نے سامنے والے مورچے پر داغا تھا جہاں سے بھاری مشین گن سے زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ مورچہ تہس نہس ہو گیا..... مشین گن بھی خاموش ہو گئی۔ ناصر نے راکٹ لانچر نیچے رکھ دیا اور سب مشین گن اُٹھا کر دھاڑتا ہوا آگے کی طرف دوڑا۔ لیکن وہ چند گز سے زیادہ آگے

نہیں جا سکا۔ بائیں طرف کے مورچے سے آنے والی گولیوں کی بوچھاڑ نے اُسے چھلنی کر دیا اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

رات بیت رہی تھی۔ اندھیرا رُخصت ہو رہا تھا اور دن کا بہت ہلکا سا اُجالا پھیلنے لگا تھا۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک گھنٹے میں کارروائی مکمل کر کے ٹھیک پانچ بجے تینوں پارٹیوں کو کسی سگنل کا انتظار کئے بغیر وہاں سے نکل جانا تھا۔

کیمپ میں افراتفری اب صاف نظر آ رہی تھی۔ دھماکے اب بھی ہو رہے تھے۔ دُھویں اور شعلوں کے بادل آسمان کی طرف اُٹھتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

کمانڈر محبّ اللہ نے مجاہدوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ میں اپنی گن اُٹھانا ہی چاہتا تھا کہ کسی طرف سے آنے والی ایک گولی میری گن کی نال کے اگلے حصہ پر لگی۔ میرے ہاتھ کو زوردار جھٹکا لگا۔ گن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میں زمین پر لیٹ کر تیزی سے پیچھے کی طرف رینگنے لگا۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے اور دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ موت میرے قریب سے آ کر گزر گئی تھی۔ اگر گن کی نال رکاوٹ نہ بنتی تو وہ گولی میرے سینے میں پیوست ہوتی۔

گولی لگنے سے گن کی نال ٹوٹ گئی تھی اور اس طرح گن بیکار ہو گئی تھی۔ میں نے دوبارہ گن کو اُٹھانے کی کوشش نہیں کی اور پیچھے کی طرف رینگتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

تمام مجاہدین پسپائی اختیار کرتے ہوئے گڑھے میں اُتر رہے تھے۔ ہمارے آس پاس مارٹر گنوں کے گولے اب بھی پھٹ رہے تھے۔ میں نے اس وقت کھڈ میں چھلانگ لگائی تھی کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی کمانڈر محبّ اللہ کی چیخ سنائی دی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا گر گیا۔

مارٹر کے گولے کا ایک ٹکڑا اُس کی ٹانگ میں لگا تھا اور خون بہہ نکلا تھا۔ میں نے اُسے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا..... بم کا ٹکڑا اُس کی بائیں ٹانگ میں گھٹنے سے کچھ اُوپر ران میں لگا تھا۔

''میری فکر مت کرو..... تم لوگ نکل جاؤ!'' کمانڈر محبّ اللہ نے دانت بھینچ کر تکلیف ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''ہم آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں کمانڈر؟'' میں نے کہا۔

اُسی وقت اکبر دوڑتا ہوا ہمارے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اکبر اور محبّ اللہ سے اُن کی رائفلیں لے لیں۔ اکبر نے جھک کر محبّ اللہ کو اپنے کندھے پر لادا اور کھائی میں ایک طرف دوڑنے لگا۔

ہمارے اطراف میں اب بھی مارٹر گنوں کے گولے پھٹ رہے تھے اور راکٹ سروں پر سے گزر رہے تھے لیکن ہم کھائی میں ہونے کی وجہ سے محفوظ تھے۔ لیکن ایک راکٹ ہمارے سامنے ایک اُونچی چٹان پر لگ کر پھٹا تو ہم ایک لمحے کو رُک گئے۔ چٹان کے چھوٹے چھوٹے پتھر ٹوٹ

کر ہمارے اُوپر گر رہے تھے.....

دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ ہم اُس کھائی کے نشیب میں اُتر رہے تھے۔ اور پھر چٹانوں میں دوسری طرف مُڑ گئے۔ کمانڈر محبّ اللہ کو اب دوسرے مجاہد نے کندھے پر لاد لیا تھا۔ بھارتی فوجی کیمپ میں اب بھی مسلسل دھماکے ہو رہے تھے جن سے آس پاس کی پہاڑیاں لرز رہی تھیں۔

ہم پہاڑیوں میں اُونچے نیچے دُشوار گزار راستوں پر دوڑتے رہے۔ دھماکوں کی آوازیں کچھ مدھم اور کم ہو گئی تھیں۔ ہم وہاں سے بہت دُور نکل آئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ بھارتیوں کا یہ کیمپ اگر پوری طرح تباہ نہیں ہوا تھا تو اُنہیں اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا۔

دُھوپ نکل آئی تھی۔ سورج جیسے جیسے اُوپر آ رہا تھا چٹانیں تپنے لگی تھیں۔ ہم ایک جگہ چٹانوں کے سائے میں رُک گئے۔ کمانڈر محبّ اللہ کو زمین پر بٹھا دیا گیا۔ زخم سے خون بہہ رہا تھا اور محبّ اللہ نے تکلیف ضبط کرنے کے لئے دانت بھینچ رکھے تھے۔

اکبر نے اپنی کمر پر بندھا ہوا پٹکا کھول لیا اور اُس کی ایک لمبی سی پٹی پھاڑ کر زخم سے ذرا اُوپر کس کر باندھ دی۔ پہاڑیوں میں فائرنگ کی آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں۔ بھارتی فوجی یقیناً ہمارے تعاقب میں ہوں گے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ ان پہاڑوں میں زیادہ اندر آنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

چند منٹ ریسٹ کرنے کے بعد ہم پھر چل پڑے۔ محبّ اللہ کو پھر اکبر نے کندھے پر لاد لیا تھا۔ ہماری منزل فیروز پور نامی قصبے کے قریب پہاڑیوں میں وہ غار تھا جس کے بارے میں پہلے ہی سے طے کر لیا گیا تھا کہ کارروائی مکمل کرنے کے بعد ہماری پارٹی کے مجاہدین وہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

یہاں میں آپ کو ایک بات بتا چلوں تاکہ آپ کو صورتحال سمجھنے میں کچھ آسانی ہو سکے۔ فیروز پور نام کا قصبہ سرینگر سے پونچھ کی طرف جانے والی شاہراہ کے سنگم پر واقع ہے جہاں سے یہ گلمرگ سے ہوتی ہوئی بارہ مولا کی طرف چلی گئی ہے۔

پونچھ تو اب آزاد کشمیر کا حصہ ہے۔ کنٹرول لائن کے قریب یہ سڑک بند کر دی گئی ہے۔ اگر آپ سرینگر سے اس شاہراہ پر سفر شروع کریں تو چند میل آگے ماگام کا قصبہ ہے۔ اس سے آگے دو اور چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں جن کے بعد سرینگر سے تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر فیروز پور ہے۔ یہیں سے ایک سڑک گلمرگ کی طرف نکلتی ہے۔ اگر سڑک سے سفر کیا جائے تو فیروز پور سے گلمرگ کا فاصلہ تقریباً دس میل بنتا ہے لیکن مجاہدین کے لئے سڑک پر سفر کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس شاہراہ پر بھارتی فوجیوں کے قافلوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔

ہم لوگ سڑک سے تقریباً ایک میل دُور ہٹ کر دُشوار گزار پہاڑوں میں سفر کر رہے تھے۔ ہمیں کوئی خطرہ بھی نہیں تھا اور فاصلہ بھی کم سے کم ہو کر چھ میل رہ جاتا۔

کمانڈر محبّ اللہ کو ہم لوگ باری باری کندھوں پر اُٹھا کر سفر کر رہے تھے۔ اس طرح ہماری

رفتار اگرچہ کم ہو گئی تھی لیکن ہم نے بے تکان اپنا سفر جاری رکھا۔

ایک موقع پر ہم پہاڑی پر ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے سڑک نظر آ رہی تھی۔ سرینگر کی طرف سے چند فوجی ٹرک بڑی تیز رفتاری سے گلمرگ کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ٹرکوں پر ہیوی مشین گنیں نصب تھیں۔

ہم اُس پہاڑی پر تقریباً دو ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور اس وقت تک چٹانوں کی آڑ میں کھڑے رہے جب تک وہ فوجی ٹرک پہاڑوں میں ایک موڑ گھوم کر ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ ہم چٹانوں میں سفر کرتے ہوئے ایک بار پھر شاہراہ سے دُور ہٹتے چلے گئے اور تقریباً نو بجے کے قریب چٹانوں میں پوشیدہ ایک غار میں پہنچ گئے۔ اس غار میں ڈاکٹر مریم کو دیکھ کر میں اُچھل پڑا۔

○

میرے لئے یہ انکشاف دلچسپی سے خالی نہیں تھا کہ ڈاکٹر مریم گزشتہ شام یہاں پہنچ گئی تھی۔ یہاں اُس کی آمد اتفاقیہ نہیں طے شدہ پروگرام کے مطابق تھی۔ کیونکہ یہ قریب ترین جگہ تھی جہاں زخمی مجاہدین کو طبی امداد فراہم کی جا سکتی تھی۔

ہم سے پہلے عبدالغنی لون کی پارٹی بھی یہاں پہنچ چکی تھی۔ اُس کی پارٹی کے دو مجاہد زخمی ہوئے تھے جن میں سے ایک کے بازو میں گولی لگی تھی اور دوسرے کی پنڈلی میں۔ ڈاکٹر مریم ہمارے آنے سے پہلے اُن کی ڈریسنگ کر چکی تھی۔ اور اب وہ فوری طور پر کمانڈر محبّ اللہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

محبّ اللہ کو لگنے والا بم کا تازہ ٹکڑا گوشت کے اندر بھی رہ گیا تھا جسے نکالنا بہت ضروری تھا۔ اس قسم کے آپریشن کرنے کے لئے مریض کو بے ہوش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہاں انستھیزیا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تاہم ڈاکٹر مریم کے پاس ایک ایسا سپرے تھا جس سے گوشت وقتی طور پر سن ہو جاتا تھا۔

عبدالغنی لون اور میں کمانڈر محبّ اللہ کے قریب موجود تھے۔ ڈاکٹر مریم نے پہلے زخم کا معائنہ کیا پھر اُس کے اطراف میں اسپرے کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد اُس نے زخم کے قریب ٹانگ پر چٹکی بھر کر دیکھا۔ محبّ اللہ نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

ڈاکٹر مریم نے آپریشن شروع کر دیا۔ نشتر اور ایک دوسرے آلہ جراحت کی مدد سے وہ زخم کو اندر سے پھیلاتی چلی گئی۔ میں اُس منظر کو زیادہ دیر تک نہیں دیکھ سکا..... اور نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔

تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ ڈاکٹر مریم زخم کو اندر تک کھولتی چلی گئی۔ اسپرے کا اثر اب زائل ہونے لگا تھا اور محبّ اللہ کے چہرے پر بھی کرب کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔

''حوصلہ رکھو کمانڈر.....!'' مریم نے کہا۔ ''بس ایک منٹ۔ میں جانتی ہوں آپ کو اس

وقت بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے لیکن.....''

وہ خاموش ہو گئی۔ اُس کی تمام تر توجہ زخم کی طرف تھی۔ وہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی چمٹی کو زخم کے اندر حرکت دے رہی تھی۔ اور پھر اُس نے چمٹی کو باہر کھینچ لیا۔ لوہے کا وہ ٹکڑا تقریباً آدھا انچ کے قریب تھا جسے مریم نے ایک طرف ڈال دیا۔ کمانڈر محب اللہ اس وقت بری طرح ٹانگ رگڑ رہا تھا۔ میں نے اور عبدالغنی لون نے اُسے مضبوطی سے جکڑ لیا اور ڈاکٹر مریم بڑے انہماک سے اپنے کام میں مصروف رہی۔

چند منٹ اور لگ گئے اور پھر ڈریسنگ کر دی گئی۔ کمانڈر محب اللہ کے چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات نمایاں تھے۔ اُس نے تکلیف ضبط کرنے کے لئے جبڑے بھینچ رکھے تھے مگر منہ سے اُف تک نہیں نکلی تھی اور یہ واقعی ہمت کی بات تھی۔ ہوش میں رہتے ہوئے آپریشن برداشت کر لینا بڑے حوصلے کا کام تھا۔

مریم نے اُسے ایک گولی بھی کھلا دی تھی۔ ڈریسنگ کے کچھ دیر بعد محب اللہ پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ اور پھر شاید یہ اُسے کھلائی جانے والی گولی کا اثر تھا کہ وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

ہم لوگ غار کے دوسرے حصے میں آ گئے۔ مریم ہاتھ دھو کر قہوہ بنا لائی۔ اُس وقت غار میں ہم بارہ آدمی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ہماری پارٹی کے دو مجاہدین شہید ہوئے تھے۔ حسن لاپتہ ہو گیا تھا اُس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ شہید ہو گیا تھا یا ہم سے بچھڑ کر پہاڑوں میں کسی طرف روپوش ہو گیا تھا۔

عبدالغنی لون کی پارٹی کا ایک مجاہد شہید ہوا تھا اور دو زخمی ہوئے تھے جنہیں یہاں لا کر ٹریٹمنٹ دے دیا گیا تھا۔ کمانڈر رشید یا اُس کی پارٹی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ وہ لوگ کسی اور طرف نکل گئے تھے۔

بھارتیوں کے فوجی کیمپ کے بارے میں بھی کوئی اطلاع نہیں تھی کہ اُن کا کتنا نقصان ہوا تھا؟ لیکن میرا خیال تھا کہ ہم نے اُنہیں اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا۔

یہ غار بھی بارہ مولا والے غار کی طرح کشادہ اور اندر سے کئی حصوں پر مشتمل تھا۔ چائے پینے کے بعد ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر میں ڈاکٹر مریم کے ساتھ غار کے ایک اور حصہ میں آ گیا۔ یہ جگہ بھی ایک بڑے ہال نما کمرے کی طرح بہت کشادہ تھی۔ اُس کے آخر میں تقریباً چار فٹ کی بلندی پر دو فٹ چوڑا ایک پتھر دیوار سے آگے کو نکلا ہوا تھا۔ یہ پتھر اتنا چوڑا تھا کہ دو آدمی آسانی سے اس پر بیٹھ سکتے تھے۔ اُس پتھر سے تین فٹ اُوپر ایک تنگ سرنگ تھی۔ ایک صحت مند آدمی آسانی سے اُس سرنگ میں سے گزر سکتا تھا۔

''آؤ..... تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔'' ڈاکٹر مریم کہتے ہوئے پتھر کی طرح آگے کو نکلے ہوئے کارنس کے قریب پہنچ گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھ پتھر پر ٹکا دیئے اور پھر اس طرح اچک کر پتھر پر چڑھ گئی کہ مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی تھی۔ لیکن میرے خیال میں اس میں حیرت کی کوئی

بات نہیں تھی۔ وہ دو سال سے ان پہاڑوں میں رہ رہی تھی اور اس طرح اچک اُچھل کر چٹانوں پر اُترنے چڑھنے کی عادی ہو گئی تھی۔

''آؤ..... اُوپر آ جاؤ.....!'' مریم نے مجھے اشارہ کیا۔

میں بھی مریم کی طرح اُچک کر پتھر پر چڑھ گیا۔ اس سے تین فٹ اُوپر تنگ سی سرنگ سے ہوا آ رہی تھی۔ مریم نے دونوں ہاتھ سرنگ کے دہانے کے نچلے کنارے پر جما دیئے اور اپنے جسم کو آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھانے لگی۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ پہلے اُس کے جسم کا بالائی حصہ سرنگ میں غائب ہوا اور پھر اُس کے پیر بھی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

''آؤ..... میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ!'' مریم کی آواز سن کر میں بھی اچک کر اُس سرنگ میں داخل ہو گیا اور سینے کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ سرنگ میں تازہ ہوا کی آمد و رفت تو تھی لیکن تاریکی اس قدر گہری تھی کہ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

چند گز آگے جا کر مریم رُک گئی۔ میرا سر اُس کے پیروں سے ٹکرا گیا۔

'میں اس لئے رُک گئی تھی کہ تم بھی رُک جاؤ۔'' مریم کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''آگے ذرا خیال سے آنا، سرنگ دائیں طرف مُڑ رہی ہے۔ ایسا نہ ہو تمہارا سر سامنے والی دیوار سے ٹکرا جائے۔''

مریم پھر آگے بڑھنے لگی۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے رینگتا رہا تھا۔ اُس کے خبردار کرنے کے بعد میں نے ایک ہاتھ آگے کو نکال لیا تھا۔ میرا ہاتھ سامنے والی دیوار سے ٹکرایا اور میں ٹٹولتا ہوا دائیں طرف مُڑ گیا۔ اس طرف تقریباً پندرہ گز آگے مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں جگہ بھی قدرے کشادہ تھی۔ وہاں سے سرنگ ایک بار پھر دائیں طرف مُڑ گئی تھی اور روشنی اسی طرف سے آ رہی تھی۔ میں جب اُس طرف مُڑا تو مریم دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ ہم تقریباً دو سو فٹ اُوپر آ گئے تھے۔ سینے کے بل رینگتے ہوئے میری سانس بھی پھول گئی تھی۔ مریم میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

میں نے پہلے اِدھر اُدھر اور پھر سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا تو مجھے سینے میں اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا..... ہم اس وقت ایک تنگ سے کنویں میں کھڑے تھے۔ دیواروں کا درمیانی فاصلہ تین فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ دیواروں میں چھوٹے بڑے پتھر بھی اُبھرے ہوئے تھے۔ اُوپر..... بہت اُوپر روشن آسمان نظر آ رہا تھا۔ میرے خیال میں یہ کنواں تقریباً پچاس فٹ گہرا تھا۔

''اُوپر چلو.....'' مریم نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''اُوپر.....؟'' میں نے اس طرح اُس کی طرف دیکھا جیسے اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔

○○○

''ہاں.....اصل نظارہ تو اُوپر ہے۔'' مریم کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

پہلے تو میں سمجھا کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ لیکن پھر اُس کا اشارہ پا کر میں اُوپر چڑھنے لگا۔ میں نے بانہیں پھیلا کر دونوں ہاتھ دیواروں پر ٹکا دیئے اور اسی طرح پیر بھی پھیلا لئے۔ اس طرح پتھروں پر پیر ٹکا کر اُوپر چڑھتے ہوئے میرا سانس پھول گیا۔

تقریباً نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے نیچے دیکھا۔ مریم بھی میرے پیچھے ہی پیچھے اُوپر آ رہی تھی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اگر میرا پیر پھسل گیا تو مریم کو بھی اپنے ساتھ لے مروں گا۔ لہٰذا میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو کر اُوپر چڑھنے لگا۔

اُوپر آ کر میں نے دونوں ہاتھ اُس کنویں کے کناروں پر جما دیئے اور محتاط انداز میں اچک کر باہر آ گیا۔ میرا سانس اگرچہ بری طرح پھولا ہوا تھا مگر میں نے جھک کر مریم کو اُوپر کھینچا اور ایک طرف اوندھا ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ ڈاکٹر مریم بھی میرے قریب بیٹھ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اور پھر اُس کی آواز سن کر میں سیدھا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا سانس سینے میں رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا.....

یوں تو کشمیر کی پوری وادی ہی جنت کا ٹکڑا تھی مگر ایسا حسین منظر میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ہم اس وقت ایک پہاڑی کی چوٹی پر تھے۔ ہمارے پچھلی طرف بیس پچیس فٹ اُونچی ایک چٹان تھی۔ دائیں بائیں دُور تک چنار اور یوکلپٹس کے درخت پھیلے ہوئے تھے اور سامنے تا حدِ نشیب میں جیسے سبز مخمل کا فرش پھیلا ہوا تھا جس میں رنگ برنگے پھول ستاروں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ نیچے پھیلی ہوئی وادی میں بہت دُور دُور تین مکان تھے۔ ایک مکان کی چمنی سے دُھواں اُٹھ رہا تھا اور سرمئی لکیر کی طرح اُوپر اُٹھ کر آسمان کی وسعتوں میں پھیل کر معدوم ہو رہا تھا۔

اس وادی کے دوسری طرف بہت اُوپر برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی چوٹیاں تھیں۔ تیز دُھوپ میں برف پوش چوٹیاں اس طرح چمک رہی تھیں کہ اُن پر نگاہ ٹکانا مشکل ہو رہا تھا۔

انہی برف پوش پہاڑوں کے دامن میں غالباً چیڑ کا جنگل تھا جو دائیں بائیں دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ فضا میں بڑی خوشگوار سی مہک تھی۔ میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''یہ جو وادی میں سبزہ نظر آ رہا ہے نا.....'' مریم سامنے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''دھان کے کھیت ہیں۔ اور دائیں طرف وہ جو چمکتی ہوئی لکیر سی نظر آ رہی ہے وہ وولر جھیل سے نکلنے والا ایک چھوٹا دریا ہے جو سرحد پار کر کے پونچھ کی طرف نکل جاتا ہے۔ اور اُس دریا کے دائیں طرف وہ جہاں درختوں کا جھنڈ نظر آ رہا ہے وہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلہ پر فیروز پور قصبہ ہے۔ لیکن ان نیلی پہاڑیوں کی وجہ سے قصبہ یہاں سے نظر نہیں آئے گا۔''

''لگتا ہے تمہیں وادی کے بارے میں بہت سی معلومات ہیں۔'' میں نے کہتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔

''میں دو سال سے مجاہدین کے ساتھ ان پہاڑوں میں ہوں۔ اور وادی کے چپے چپے سے واقف ہوں۔'' مریم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اور یہ کون سی جگہ ہے؟.....میرا مطلب ہے یہ غار۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ غار فیروز پور قصبے سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہے اور ہم اس وقت تقریباً تین ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔'' مریم نے کہا۔ ''اس غار تک آنے کا راستہ تم دیکھ چکے ہو بہت دُشوار گزار مگر محفوظ ہے۔ بھارتی فوجی مجاہدین کا تعاقب کرتے ہوئے بھی کبھی پہاڑیوں میں زیادہ اندر تک نہیں آتے۔ اُنہیں اپنے گھیرے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہ غار اگرچہ محفوظ ہے لیکن قدرت بھی ہماری مدد کرتی ہے۔'' وہ خاموش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اُس نے ہم کا لفظ استعمال کیا تھا اور وہ اپنے آپ کو مجاہدین سے الگ نہیں سمجھتی تھی۔

''اگر کبھی اتفاق سے بھارتی وحشی اس غار تک پہنچ بھی گئے تو قدرت نے ہمیں اپنے بچاؤ کا دوسرا راستہ بھی دکھا رکھا ہے۔ غار کے اندر وہ تنگ سی سرنگ اور یہ کنواں نما راستہ۔'' وہ کنویں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ وہ راستہ ہے جو ہنگامی صورتحال میں ہم اپنے بچاؤ کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس طرف سے بھی یہ راستہ محفوظ ہے۔ اوّل تو کسی بھارتی فوجی کے یہاں تک آنے کا امکان ہی نہیں اور اگر اتفاق سے کوئی یہاں پہنچ بھی جائے تو اس گہرے کنویں کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یہاں سے غار تک راستہ جاتا ہے۔''

''ہاں واقعی.....'' میں نے کہا۔ ''قدرت ہم پر مہربان ہے جو ہمارے لئے اس طرح کے وسیلے پیدا کر رہی ہے۔''

مریم نے فوری طور پر کچھ نہیں کہا۔ چند لمحے خاموش رہی اور پھر وہ مجھ سے گزشتہ شب کی کارروائی کے بارے میں دریافت کرنے لگی۔ میں اُسے تفصیل سے سب کچھ بتاتا رہا۔ اپنے بعض ساتھیوں کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے میں افسردہ سا ہو گیا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ساتھیوں کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔'' میں آخر میں کہہ رہا تھا۔ ''ہم نے اگرچہ اُس کیمپ کی حد تک بھارتی فوجیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ہم نے اُنہیں کتنا نقصان پہنچایا ہے۔''

''آج شام تک یا کل دن میں کسی وقت یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔'' مریم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور میرا خیال ہے اب چلنا چاہئے۔ کافی دیر ہو گئی۔''

ہم تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے۔ میں نے اُٹھ کر چاروں طرف دیکھا اور پھر مریم سے

پہلے کنویں میں اُترنے لگا۔ اُس وقت احساس ہوا کہ کنویں کی دیواروں پر چڑھنا آسان تھا لیکن نیچے اُترنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ میں بڑی احتیاط سے ہاتھ اور پاؤں جما جما کر نیچے اُترنے لگا۔

اس سے زیادہ مشکل مرحلہ سرنگ میں اُترنا تھا۔ اس مرتبہ بھی مریم میرے آگے تھی اور میں پیچھے۔ ہم سینے کے بل اُلٹا لیٹے نیچے کی طرف پھسل رہے تھے۔ اور بالآخر یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔

جب ہم غار میں پہنچے تو اکبر کے سوا سب لوگ سو رہے تھے۔ اکبر سب مشین گن سنبھالے غار کے دہانے پر بیٹھا ہوا تھا۔ سب لوگ رات بھر کے جاگے ہوئے اور پہاڑوں میں طویل سفر کر کے تھکے ہوئے تھے مگر حیرت کی بات تھی کہ مجھے نہ تو تھکن کا احساس ہو رہا تھا اور نہ ہی نیند آ رہی تھی۔

''اکبر بھائی..... تم بھی رات بھر جاگے ہو اور تھکے ہوئے ہو۔ سو جاؤ! میں یہاں ڈیوٹی دیتا ہوں۔'' میں نے اُس کے قریب پہنچ کر کہا۔ میں نے اکبر سے سب مشین گن لے لی اور اُس کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اکبر اُٹھ کر چند گز دُور عبدالغنی لون کے قریب فرش پر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد اُس کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔

''میں تمہارے لئے قہوہ بنا کر لاتی ہوں۔ تمہیں اس وقت یقیناً طلب ہو رہی ہو گی۔'' مریم نے کہا۔

''ہاں..... طلب تو ہو رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

مریم غار کے دوسرے حصے کی طرف چلی گئی۔ میں غار سے باہر دیکھنے لگا۔ یہاں سے دور کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا جو میں نے اُوپر سے دیکھا تھا۔ غار کا دہانہ دوسرے رُخ پر تھا۔ اس کے سامنے قد آدم خودرو جھاڑیاں اور چٹان نما بڑے بڑے پتھر پھیلے ہوئے تھے جن کی وجہ سے زیادہ دُور تک نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد مریم قہوہ بنا کر لے آئی۔ اُس نے ایک مگ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور دوسرا خود لے کر سامنے بیٹھ گئی۔ قہوے کی چسکیوں کے ساتھ ہم سرگوشیوں میں باتیں بھی کرتے رہے۔ انہی باتوں سے مریم کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی میرے سامنے آیا۔ وہ لاہور کے ایک زمیندار گھرانے کی فرد تھی۔ اُن کی زمینیں لاہور کے نواح میں تھیں جبکہ لاہور کے سب سے مہنگے علاقے ماڈل ٹاؤن میں بھی ان کی ایک شاندار کوٹھی تھی۔ وہ میڈیکل کی تعلیم سے جیسے ہی فارغ ہوئی تو والدین کو اُس کی شادی کی فکر ہوئی لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا کہ فی الحال اس کا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

اس کی منگنی اگرچہ بچپن ہی میں اپنے عم زاد سے ہو چکی تھی اور وہ بھی انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ مریم نے اپنے منگیتر سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اس کا خیال دل سے نکال دیا جائے۔ مریم کے منگیتر نے بڑی شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے اُس سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور مریم کو یہ پیشکش بھی کی کہ وہ شادمان ٹاؤن میں اپنے دس کنال

پلاٹ پر اُسے ہسپتال کی عمارت تعمیر کر کے دینے کو تیار ہے اور وہ بے وقت ہو کر ہر طرح سے اُس کی معاونت بھی کرتا رہے گا۔ لیکن مریم نے اُس کی اس پیشکش کو بھی ٹال دیا تھا کہ فی الحال اسے تجربے کی ضرورت تھی۔ وہ سرکاری ملازمت کے دوران پونچھ کے ہسپتال میں آ گئی اور مجاہدین کی حالت دیکھ کر اُس نے زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر لیا اور پونچھ سے کشمیر آ گئی اور پچھلے دو سال سے وہ مجاہدین کی خدمت کر رہی تھی۔

ہم دیر تک غار کے دہانے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اور پھر مریم اُٹھ کر دوسرے حصے میں چلی گئی۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا باہر تکتا رہا۔

مریم نے روٹیاں پکا لی تھیں۔ دوپہر کے کھانے کے وقت سب کو جگا دیا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد مجھ پر تھکن کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اب مجھ پر نیند بھی حملہ آور ہو رہی تھی۔ زبیر نامی نوجوان نے میری جگہ ڈیوٹی سنبھال لی اور میں فرش پر لیٹتے ہی سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو غار کے باہر بھی شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ غار کے دوسرے حصے میں لالٹین جل رہی تھی جس کی مدھم سی روشنی اس طرف پہنچ رہی تھی۔

چند لمحوں تک تو میرے دماغ پر نیند کا خمار طاری رہا اور جب حواس بحال ہوئے تو یہ جان کر حیران رہ گیا کہ میرے قریب حسن بیٹھا ہوا تھا۔ کمانڈر محبّ اللہ دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے نیم دراز تھا اور مریم اُس کے قریب بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ اُن کے علاوہ غار میں اور کوئی نہیں تھا۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد مجھے پتہ چلا کہ تمام مجاہدین شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی اپنے مختلف ٹھکانوں کی طرف جا چکے تھے۔

حسن کے بڑے دلچسپ انکشافات ہوئے تھے۔ وہ ہماری کارروائی مکمل کرنے کے بعد انہی اطراف کے پہاڑوں میں چھپ گیا تھا۔ اُس کے کہنے کے مطابق شہر کی شمالی چھاؤنی سے کئی فوجی ٹرک وہاں پہنچ گئے تھے لیکن وہ کیمپ سے دُور ہی رُک گئے تھے۔ فوجی دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کی پہاڑیوں پر پھیل گئے۔

''وہ کیمپ بالکل تباہ ہو چکا ہے۔'' حسن بتا رہا ہے۔ ''میں پانچ بجے تک اپنی کمین گاہ میں چھپا رہا۔ اُس وقت تک کیمپ میں اِکا دُکا دھماکے ہو رہے تھے اور دُھویں کے بادل اُمڈ رہے تھے۔ مجھے یقین ہے اس کیمپ میں درجنوں فوجی جہنم رسید ہو چکے ہوں گے اور کچھ نہیں بچا ہو گا وہاں۔''

کیمپ کے نقصان کے بارے میں صحیح اطلاع نہیں تھی۔ بہرحال مجھے خوشی تھی کہ ہم نے بھارتی فوج کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا۔

اگلے روز ایک اور مجاہد غار میں پہنچ گیا۔ اُس کی اطلاع کے مطابق بھارتی فوجی مجاہدین کی تلاش میں آس پاس کی بستیوں کو تہس نہس کر رہے ہیں۔ ان بستیوں کے کئی گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ کئی بے گناہ بوڑھوں کو اذیتیں دے کر ہلاک کیا گیا اور عورتوں کو زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔

اُس بھارتی فوجی کیمپ کی تباہی کے بارے میں مختلف اوقات میں مختلف اطلاعات مل رہی تھیں۔ ایک اطلاع یہ تھی کہ وہ کیمپ مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا اور ستاون فوجی جہنم واصل ہوئے تھے جن میں چند اعلیٰ افسران بھی شامل تھے۔ کیمپ کی تباہی اور اپنے آدمیوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے بے گناہوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ شبے میں پکڑے جانے والوں کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

اُسی شام ایک اور خوفناک اطلاع ملی۔ فوجیوں نے گلمرگ کے ایک مکان سے دو نوجوانوں کو پکڑ لیا تھا۔ اُن میں ایک بیمار تھا۔ اُس میں چلنے کی سکت نہیں تھی اور کئی روز سے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ دوسرا اُس کا دوست تھا جو اُس کی مزاج پرسی کے لئے آیا ہوا تھا۔ وہ میٹرک کا سٹوڈنٹ تھا اور اُس کی عمر سولہ کے لگ بھگ تھی۔

بھارتی فوجی اُن دونوں کو پکڑ کر شہر کے مرکزی چوراہے پر قائم کیمپ میں لے گئے۔ تقریباً دو گھنٹوں تک مجاہدین کے بارے میں پوچھ گچھ کے لئے اُن پر تشدد کیا جاتا رہا۔ پھر بیمار نوجوان کے جسم پر بم باندھ کر اُسے چوک میں چھوڑ دیا گیا اور جب بم پھٹا تو اُس نوجوان کے چیتھڑے اُڑ گئے۔ جبکہ دوسرے نوجوان کو مزید تفتیش کے لئے چھاؤنی میں بھیج دیا گیا اور پھر اُس کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔

بیمار نوجوان کو بم سے اُڑائے جانے کی خبر آناً فاناً پوری وادی میں پھیل گئی..... نہتے بے بس اور مجبور کشمیری احتجاج کرنے کے لئے سڑکوں پر نکل آئے۔ کئی شہروں میں اُن کے پُر امن احتجاجی جلوسوں پر بھارتی فوجیوں نے گولیاں برسائیں اور چند اور لاشیں گرا دیں۔ بے گناہ کشمیریوں نے مزید احتجاج کے لئے پوری وادی میں ہڑتال کی کال دے دی۔ وادی کشمیر میں بھارتی مظالم کے خلاف ہڑتال روز کا معمول بن چکا تھا لیکن بھارتی حکمرانوں پر ان پُر امن احتجاجات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اس کے برعکس نقصان کشمیری عوام ہی کا ہوتا تھا۔ تمام کاروبار ٹھپ ہو رہے تھے۔ شہروں میں رہنے والے بھی فاقہ کشی کر رہے تھے۔

ایک ہفتہ بعد ایک اور سنسنی خیز اطلاع ملی..... بھارتی فوج کے ایک دستے نے بسال پور پر ہلہ بول دیا تھا۔ اُنہیں اطلاع ملی تھی کہ کیمپ پر مجاہدین کے حملے سے ایک روز پہلے دو مجاہدین اس بستی میں آئے تھے اور پورا دن یہاں گزار کر گئے تھے۔ یہ اطلاع میرے اور مقبول کے بارے میں تھی۔

ہمارے بارے میں پوچھ گچھ کے لئے بستی والوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور جب بستی والوں نے احتجاج کیا تو بھارتی وحشیوں نے کئی گھروں کو نذرِ آتش کر دیا اور اندھا دُھند فائرنگ شروع کر دی۔

بھارتی فوجیوں کو اطلاع یہ ملی تھی کہ مجاہدین نے ماسی عائشہ کے گھر میں پناہ لی تھی۔ ماسی عائشہ کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اُسے تشدد اور ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد اُس کی چھاتیاں

کاٹ دی گئیں اور سنگینوں سے وار کر کے اُس کا پیٹ چاک کر دیا گیا اور اُس کے گھر کو جلا کر راکھ کر دیا گیا.....

میں اُس بستی کے بارے میں کچھ اور سننا چاہتا تھا۔ اور پھر یہ سنسنی خیز خبریں کہ میری رُوح کانپ اُٹھی کہ بسال پور کی چار جوان لڑکیاں لاپتہ تھیں اور اُن میں انگوری بھی تھی.....

جب میں نے انگوری کو دیکھا تھا تو میرے سینے میں ایک ہلچل سی مچ اُٹھی تھی۔ اُس سے حالانکہ میری کوئی بات چیت بھی نہیں ہوئی تھی لیکن میں اُس کے لئے اپنے اندر عجیب سے جذبات محسوس کرنے لگا تھا۔ اُس کے بارے میں سوچتا تو میرے پورے بدن میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ اور اب اس رُوح فرسا خبر نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا..... میری رُوح تک کانپ اُٹھی تھی۔ خبر لانے والے کی اطلاع کے مطابق دو تین لڑکیاں فوجیوں کے قبضے میں تھیں اور دو تین لڑکیوں کو شام کے اندھیرے میں بستی سے بھاگتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

ہو سکتا ہے انگوری بھی اُن لڑکیوں میں شامل ہو جو بھارتی فوجیوں سے بچ کر بستی سے بھاگ گئی تھیں..... ایک موہوم سی اُمید تھی اور میں اس اُمید کے سہارے اُسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔

اور جب میں نے ڈاکٹر مریم سے بات کی تو وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''ٹھیک ہے.....'' وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''کمانڈر محبّ اللہ سے بات کر لو! وہ تمہیں نہیں روکے گا۔''

کمانڈر محبّ اللہ نے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور حسن کو بھی میرے ساتھ کر دیا۔ ہم اُسی شام اُن سے رُخصت ہو کر غار سے روانہ ہو گئے۔ ہم رات بھر پہاڑوں میں چھپ کر سفر کرتے رہے۔ صبح سویرے بسال پور کے نواح میں پہنچ گئے لیکن بستی کا رُخ کرنے کی بجائے جنگل میں چھپے رہے۔ پورا دن ہم نے جنگل میں گزار دیا اور شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد جنگل سے نکل کر بستی میں آ گئے۔

کئی گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا..... یہ بھارتی فوجی چنگیز اور ہلاکو سے زیادہ سنگدل اور ظالم تھے۔ جس بستی میں نکل جاتے اُسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے۔

''اُس روز بھارتی فوجی دو تین لڑکیوں کو اُٹھا کر لے گئے تھے۔'' میرے پوچھنے پر گاؤں کے ایک بوڑھے نے بتایا۔ ''انگوری دو تین لڑکیوں کے ساتھ بستی سے بھاگ گئی تھی۔ کل یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ اُسے پتن کی طرف کسی جگہ پر دیکھا گیا ہے۔ یہ تصدیق نہیں ہو سکی کہ وہ انگوری ہی تھی یا کوئی اور۔''

میرے دل میں اُمید کی کرن کچھ اور روشن ہو گئی۔ میں اور حسن اُسی رات پتن کی طرف روانہ ہو گئے۔ بارہ مولا سرینگر شاہراہ پر واقع پتن نام کا قصبہ بسال پور سے تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر تھا۔ اگر ہم بارہ مولا کی طرف سے ہو کر جاتے تو یہ فاصلہ کم سے کم بیس میل بڑھ جاتا۔ ہم نے وہ راستہ اختیار کیا جس پر بھارتی فوجیوں کے تصادم کا زیادہ خطرہ بھی نہیں تھا۔

ہمیں بستی سے خچر مل گئے تھے۔ ہم راتوں رات دُشوار گزار پہاڑی راستوں پر سفر کرتے ہوئے صبح چار بجے کے قریب پتن بارہ مولا ہائی وے کے قریب پہنچ گئے۔

سڑک ہمارے سامنے تھی۔ ہم پہاڑیوں سے نکل کر سڑک پر آنا چاہتے تھے کہ گرر گرر کی آواز سن کر رُک گئے.... وہ بھاری ٹرکوں کی آواز دی۔ ہم خچروں سے اُتر کر کچھ آگے نکل گئے اور ایک چٹان کی آڑ سے سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس جگہ بڑے بڑے چٹان نما پتھر تھے اور درختوں کی بھی بہتات تھی۔ اس لئے سڑک کی طرف سے ہمیں دیکھ لئے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔

وہ دو فوجی ٹرک تھے جن پر سامنے اور دائیں بائیں مشین گنیں نصب تھیں اور فوجی مستعد کھڑے تھے۔

سڑک ہم سے تقریباً پندرہ فٹ نیچے تھی۔ میں اور حسن پتھروں کی آڑ میں کھڑے اُنہیں اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ میرا خیال تھا کہ ٹرک نکل جائیں تو ہم سڑک پار کر کے دوسری طرف کی پہاڑیوں میں چلے جائیں گے۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پہاڑیاں تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھیں..... میں اُچھل پڑا۔ ہم سے کچھ آگے شاید کچھ مجاہدین گھات لگائے بیٹھے تھے اور اُنہوں نے ٹرکوں پر فائر کھول دیا تھا۔

میں نے حسن کی طرف دیکھا، اور پھر ہم دونوں بھی ٹرکوں پر فائرنگ کرنے لگے۔ اگلے ٹرک کے دو گنر دوسرے مجاہدین کی فائرنگ سے جہنم واصل ہو چکے تھے۔ اُن کی جگہ دوسرے فوجیوں نے سنبھال لی تھی اور مشین گنوں کا فائر کھول دیا تھا۔

نصف درجن فوجی ٹرکوں سے کود کر سڑک کے کنارے پتھروں کے پیچھے پوزیشن سنبھال چکے تھے اور سب مشین گنوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ دوسرے مجاہدین کون تھے لیکن اُن کی ہمت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ سامنے سے مشین گنوں کی شدید فائرنگ کے باوجود اپنی جگہ پر ڈٹے ہوئے تھے۔

اور پھر کان پھاڑ دینے والا ایک دھماکہ ہوا..... مجاہدین میں سے کسی نے اگلے ٹرک پر دستی بم پھینکا تھا۔ ٹرک کے پرخچے اُڑ گئے۔ سڑک کے کنارے پتھروں میں پوزیشن لئے ہوئے بھارتی فوجیوں کی فائرنگ میں شدت آ گئی تھی۔ ہم اپنی جگہ بدل کر فائر کر رہے تھے۔ سامنے سے فائرنگ میں بھی شدت آ گئی تھی۔ میں اور حسن دوڑتے ہوئے وہاں سے دُور نکل گئے۔ اُس طرف سے بھی دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر دو آدمی دوڑتے ہوئے سامنے آ گئے۔ اُنہوں نے ہمیں دیکھتے ہی رائفلیں سیدھی کر لی تھیں..... لیکن دوسرے ہی لمحوں رائفلوں کے رُخ بدل گئے۔

میں دوڑتا ہوا جیسے ہی ایک پتھر کے دوسری طرف مُڑا اُس طرف سے آنے والا ایک مجاہد مجھ سے ٹکرا گیا۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ چیخ سن کر میں بھی چونک گیا تھا۔

اُس مجاہد نے ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر کالا رومال بندھا ہوا تھا..... چہرے پر نقاب تھا۔ اکثر مجاہدین بھارتی فوجیوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائیاں کرتے ہوئے چہروں پر نقاب باندھ لیتے تھے تاکہ اُنہیں شناخت نہ کیا جا سکے۔

مجھ سے ٹکرا کر وہ مجاہد لڑکھڑا گیا۔ میں نے اُسے سنبھالنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اتفاق سے میرا ہاتھ اُس کے چہرے سے ٹکرایا اور نقاب اُس کے چہرے سے ہٹ گیا..... اور اُس سیاہ پوش مجاہد کا چہرہ دیکھ کر میں اُچھل پڑا۔ وہ انگوری تھی.....

''انگوری تم.....؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ مجھے یاد آ گیا جب میں نے ایک دن اُن کے گھر میں قیام کیا تھا تو میری طرف دیکھتے ہوئے اُس کے چہرے پر سرخی چھا جاتی تھی اور حیا سے نظریں جھک جاتی تھیں۔ لیکن اس وقت مجھ سے ٹکرانے کے بعد وہ میرے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان صرف چند انچ کا فاصلہ تھا۔ لیکن نہ تو اُس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیلی تھی اور نہ ہی اُس کی نظریں جھکی تھیں۔ اس کے برعکس اُس کی موٹی موٹی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ میں نے اُس کے ہاتھوں کی مخروطی اُنگلیوں کو سوئی کی مدد سے کپڑے پر رنگین دھاگوں سے نازک سے بیل بوٹے بناتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت اُس کے ہاتھوں میں سب مشین گن تھی جو صرف انگارے اُگلنا جانتی تھی۔

تمہارے ہاتھوں میں رائفل دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''اوہ.....!'' انگوری کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''عورت کھیتوں میں اناج اُگانے کے لئے ہل چلا کر زمین کا سینہ چیر سکتی ہے۔ سڑکیں بنانے کے لئے پتھر کوٹ سکتی ہے۔ مزدوری کرنے کے لئے سر پر بوجھ اُٹھا سکتی ہے تو ہاتھوں میں رائفل کیوں نہیں اُٹھا سکتی؟ اور میں تو کشمیر کی بیٹی ہوں..... اب وقت آ گیا ہے کہ کشمیر کی ہر عورت اپنی عزت و ناموس کے تحفظ اور وادی کے تقدس کے لئے ہاتھوں میں رائفل اُٹھا لے۔ لیکن.....'' گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔ بھارتی فوجی فائرنگ کرتے ہوئے پیش قدمی کر رہے تھے۔

''انگوری بھاگو..... اس طرف.....!'' انگوری کے ایک ساتھی نے چیختے ہوئے کہا۔ یہ بھی نسوانی آواز تھی جس نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا..... میں نے پہلی بار اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ وہی مجاہد تھا جس نے پہلے مجھ پر رائفل تانی تھی۔ گول مٹول سا چہرہ، چمکتی ہوئی موٹی موٹی آنکھیں اور ڈھیلا ڈھالا کرتا۔ اُس کے سر پر بھی کالا رومال بندھا ہوا تھا اور وہ بھی لڑکی تھی۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''یہ باتوں کا وقت نہیں ہے..... بعد میں تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟'' انگوری نے کہا۔

''صرف ایک.....'' میں نے جواب دیا اور حسن کی طرف اشارہ کیا جو چند گز دُور ایک بڑے پتھر کی آڑ سے بھارتی فوجیوں کی فائرنگ کا جواب دے رہا تھا۔

''اوہ!'' انگوری کے منہ سے ایک بار پھر نکلا۔ ''اُن وحشیوں کا ایک ٹرک ہم نے تباہ کر دیا ہے۔ زندہ بچ جانے والے فوجی اب صرف اپنے آپ کو بچانے کے لئے فائرنگ کر رہے ہیں۔ ان پہاڑوں میں ہمارے پیچھے نہیں آئیں گے۔ اس طرف نکل چلو اور نوری تم.....'' اُس نے اپنی ساتھی کی طرف دیکھا۔ ''عبداللہ کو لے کر اُس طرف سے نکل جاؤ۔ ہم لوگ چشمے پر ملیں گے۔''

وہ لڑکی نوری فوراً ہی اپنے تیسرے ساتھی کی طرف دوڑ گئی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ اُن کے ساتھ کم از کم ایک مرد تو تھا۔ میں نے حسن کو اشارہ کیا اور انگوری کے ساتھ ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ حسن بھی رُک رُک کر بھارتی فوجیوں کی فائرنگ کا جواب دیتا ہوا ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ بھارتی فوجیوں کے ٹرکوں پر حملہ کرنے والی مجاہدین کی اس پارٹی میں صرف تین افراد تھے۔ دو عورتیں اور ایک مرد۔ اور اُن کی یہ کارروائی بڑی کامیاب رہی تھی۔ اُنہوں نے ایک ٹرک کو تباہ کر دیا تھا اور میرے اندازے کے مطابق اُس ٹرک کے ساتھ کم از کم آٹھ فوجیوں کے بھی پرخچے اُڑ گئے تھے۔

ہم بلندی کی طرف دوڑتے رہے۔ نوری اور عبداللہ کسی اور طرف نکل گئے تھے۔ اُس طرف سے بھی وقفے وقفے سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں انگوری کو بہت نازک اندام سمجھتا تھا لیکن وہ جس طرح اُونچے نیچے پتھروں پر پھلانگتی ہوئی بلندی کی طرف دوڑ رہی تھی اس پر مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی۔ بعض اوقات تو مجھ سے بھی آگے نکل جاتی۔ یہ پہاڑیاں سبزے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ مخملی گھاس اور جھاڑیاں بھی تھیں اور اُونچے درخت بھی۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑی عمودی چٹان تھی۔ اُس طرف دوڑتے ہوئے انگوری کا پیر رپٹ گیا اور وہ کراہتی ہوئی زمین پر گری۔

انگوری کا اس طرح گرنا اُس کی زندگی کا ضامن بن گیا تھا..... کیونکہ ٹھیک اُسی لمحہ لاتعداد تڑتڑاتی ہوئی گولیاں اُس کے سر کے اُوپر سے گزرتی ہوئی سامنے والی چٹان میں لگی تھیں۔ میں نے بھی ایک طرف چھلانگ لگا دی اور زمین پر گرتے ہی پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ دو بھارتی فوجی اُوپر آ گئے تھے اور سب مشین گنوں سے اندھا دُھند فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ انگوری اُن کی گولیوں کی زد میں آتے آتے رہ گئی تھی۔

میں نے ایک پتھر کی آڑ لے کر رائفل کا ٹرائیگر دبا دیا..... رائفل کھٹ کھٹا کر رہ گئی۔ میگزین خالی ہو چکا تھا۔ میں نے خالی میگزین نکال کر پھینک دیا اور کمر پر بندھے ہوئے پٹکے میں اڑسا ہوا دوسرا میگزین نکال کر فٹ کرنے لگا۔ گن میں رائفل فٹ کرتے ہوئے میں نے انگوری کی طرف دیکھا وہ بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر ایک پتھر کی آڑ میں چلی گئی تھی۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اُس کی رائفل کو شعلے اُگلتے ہوئے دیکھا۔

ایک فوجی چنگھاڑتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر ایک طرف چھلانگ لگا دی لیکن وہ بھی اپنے آپ کو نہ بچا سکا۔ حسن کی رائفل کی گولیوں نے اُسے چھلنی کر دیا تھا اور مجھے رائفل استعمال کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

حسن دوڑتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ میں لپک کر انگوری کے قریب پہنچ گیا اور ایک ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رائفل اُس کے دائیں ہاتھ میں تھی۔

سڑک کی طرف سے زبردست فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بھارتی فوجی ہوا سے ہلتی ہوئی جھاڑیوں پر بھی اندھا دُھند فائرنگ کر رہے تھے۔

ہم تینوں اُس عمودی چٹان کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے اور رُکے بغیر مسلسل دوڑتے رہے۔ ہمارا رُخ بلندی کی طرف تھا۔ انگوری جس طرح دوڑنے میں ہمارا ساتھ دے رہی تھی وہ قابل تعریف تھا۔ فائرنگ کی آوازیں اب بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ اور پھر فائرنگ رُک گئی۔ بھارتی فوجیوں کو شاید یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ ہوا میں گولیاں چلا رہے ہیں۔

کچھ اور فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کرنے کے بعد ہم گنجان درختوں میں رُک گئے۔ یہاں بڑے بڑے پتھر بھی پڑے ہوئے تھے۔ انگوری ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اُس نے سب مشین گن زمین پر ڈال دی اور گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے دوہری ہو گئی۔ بلندی کی طرف مسلسل دوڑتے ہوئے اُس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ میری اور حسن کی کیفیت بھی اُس سے مختلف نہیں تھی۔ میں نے بھی ایک پتھر سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا لی تھیں۔ جبکہ حسن گھاس پر لیٹ گیا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ پچھلے کئی روز بھاگ دوڑ ہی میں گزرے تھے۔ میں نے دوڑتے ہوئے میلوں کا فاصلہ بھی طے کر لیا تھا لیکن ایسی کیفیت پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس وقت ہم مسلسل بلندی کی طرف دوڑتے رہے تھے۔ اگر راستہ ہموار یا نشیب کی طرف ہوتا تو شاید میری یہ حالت نہ ہوتی۔

دو تین منٹ بعد میں نے آنکھیں کھول کر انگوری کی طرف دیکھا۔ اُس نے بھی دونوں ٹانگیں آگے کو پھیلا رکھی تھیں۔ دونوں بانہیں بھی پہلو میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سر کسی قدر پیچھے کو جھکا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ ڈھیلے ڈھالے کرتے میں تناؤ سا تھا جس کے نیچے اُس کا سینہ ہتھوڑی کی طرح پھول اور پچک رہا تھا۔

انگوری نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اور پھر وہ ٹانگیں سمیٹ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ حسن بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''میں تو تمہیں بہت نازک سی لڑکی سمجھتا تھا لیکن تم تو مردوں سے بھی زیادہ دلیر اور حوصلہ مند ثابت ہوئی ہو.....'' میں نے انگوری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نزاکتیں دکھانے کا وقت اب گزر چکا ہے۔'' انگوری نے جواب دیا۔ ''غاصب بھیڑیوں نے وادی کی مظلوم اور بے گناہ عورتوں کو ہمیشہ اپنے لئے ایک کھلونا سمجھا۔ اُنہیں تشدد اور زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا رہا، معصوم عورتوں کی اجتماعی آبروریزی روز کا معمول بن چکا ہے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ کشمیر کی عورت اپنی جان تو دے دے گی لیکن کوئی ہاتھ اپنے جسم تک پہنچنے نہیں دے گی۔ وہ ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے۔'' چند لمحوں کو وہ خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''اب عورت گھر میں بیٹھ کر صرف روٹیاں نہیں پکائے گی۔ اب کشمیر کی ہر بیٹی کے ہاتھوں میں رائفل نظر آئے گی۔ کشمیر کی عورت اپنے سہاگ، اپنے بھائیوں اور اپنے بیٹوں کو محاذ پر رُخصت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے تو اس میں مردوں کے پہلو بہ پہلو لڑنے اور دشمن سے پنجہ آزمائی کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔''

میں خاموشی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر باتوں کا رُخ بدل دیا۔ ہم تقریباً بیس منٹ تک وہاں بیٹھے رہے اور پھر انگوری اپنی سب مشین گن سنبھالتی ہوئی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''اب چلنا چاہئے.....'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اُن پٹے ہوئے بھارتی سورماؤں میں اتنا حوصلہ نہیں کہ اتنی دُور تک ہمارا پیچھا کر سکیں۔ لیکن فوجی ٹرک اُس شاہراہ پر گشت کرتے رہتے ہیں۔ اگر اُنہیں ٹوہ مل گئی تو ممکن ہے وہ اُوپر آنے کی کوشش کریں اس لئے ہمیں اب یہاں سے چل دینا چاہئے۔''

میں اور حسن بھی اُٹھ گئے۔ میں نے اپنی رائفل کندھے پر لٹکا لی۔ ہم گھنے درختوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گئے۔ جس وقت یہ معرکہ ہوا تھا اُس وقت رات کا اندھیرا رُخصت ہونا شروع ہوا تھا اور دن کا بہت ہلکا سا اُجالا پھیلنے لگا تھا۔ اور اب سورج طلوع ہو چکا تھا اور دُھوپ پھیل رہی تھی۔ ہم تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اب بھی مسلسل بلندی کی طرف سفر کرتے رہے۔ میں نے انگوری سے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں جانا ہے کیونکہ میں نوری سے اُس کی باتیں سن چکا تھا۔ اُس نے نوری سے کہا تھا کہ وہ عبداللہ کے ساتھ چشمے پر پہنچ جائے جس کا مطلب تھا کہ اُن کے پاس کوئی محفوظ ٹھکانہ موجود تھا۔ نوری اور عبداللہ دوسری طرف نکل گئے تھے۔

''تمہارے بارے میں تو سنا تھا کہ تم فیروز پور کے نواح میں کمانڈر محب اللہ کے ساتھ کسی غار میں ہو۔ اس طرف کیسے آ گئے؟'' انگوری نے میرے ساتھ چلتے ہوئے پُوچھا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کمانڈر محب اللہ کے ساتھ تھا؟'' میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''میں تمہارے بارے میں معلوم کرتی رہتی تھی۔'' انگوری نے جواب دیا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

میرے سینے میں ہلچل سی مچ اُٹھی..... میں صرف چند گھنٹے اُن کے گھر پر رہا تھا۔ ہم نے نظر بھر کر ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا، ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کی تھی۔ ان کی بستی سے جانے کے بعد میں نے ایک لمحہ کو بھی انگوری کا خیال ذہن سے نہیں نکالا تھا۔ اور اب میرے لئے یہ انکشاف بڑا ہی سنسنی خیز ثابت ہو رہا تھا کہ انگوری بھی میرے تصور کو دل میں بسائے ہوئے تھی۔

''فوجی کیمپ پر تم لوگوں کی کارروائی بڑی کامیاب رہی۔ کوئی بھی نہیں بچا وہاں۔'' انگوری کہہ رہی تھی۔ ''ہمیں مقبول بھائی کی شہادت کی اطلاع بھی مل گئی تھی اور کمانڈر محب اللہ کے زخمی ہونے کی بھی۔ اب وہ کیسے ہیں؟''

''اُن کی ٹانگ میں بم کا ٹکڑا لگا تھا۔ اب پہلے سے بہت بہتر ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ہم دونوں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے اور یہ بے تکلفی اس واقعہ کا نتیجہ تھی جو اتفاقاً پیش آیا تھا۔ اگر بھارتی فوجیوں کے خلاف اُس چھاپہ مار کارروائی میں ہم لوگ نہ ملتے تو شاید ہمارے درمیان تکلف کا پردہ عرصہ تک حائل رہتا اور ہم ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے بھی جھجکتے۔

''تم نے بتایا نہیں یہاں کیسے پہنچ گئے؟'' انگوری نے اپنا سوال دہرایا۔

''کل صبح مجھے اطلاع ملی تھی کہ بھارتی درندوں نے کیمپ کی تباہی کا بدلہ لینے کے لئے آس پاس کی بستیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بسال پور میں جو کچھ بھی ہوا مجھے اُس کا افسوس ہے۔ ماسی عائشہ کی شہادت رائیگاں نہیں جائے گی۔ ہم شہداء کے خون کے ایک ایک قطرے کا اُن درندوں سے حساب لیں گے۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مجھے یہ بھی خبر ملی تھی کہ وہ بھارتی وحشی بستی کی کچھ لڑکیوں کو اُٹھا کر لے گئے ہیں اور تم بھی لاپتہ ہو۔ میں نے کمانڈر محب اللہ سے اجازت لے لی اور حسن کے ساتھ کل رات بسال پور پہنچ گیا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ تم بستی سے بھاگ گئی تھیں اور تمہیں پتن کی طرف دیکھا گیا ہے۔ ہم رات ہی کو بسال پور سے روانہ ہو گئے اور جب یہاں پہنچے تو ان دو فوجی ٹرکوں کو دیکھ کر رُک گئے کہ وہ گزر جائیں تو ہم سڑک پار کر کے دوسری طرف نکل جائیں۔ مگر اسی وقت تم لوگوں نے ٹرکوں پر حملہ کر دیا اور دوسری طرف سے ہم بھی اس کارروائی میں شریک ہو گئے۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے بات جاری رکھی۔ ''میرا خیال تھا کہ مجاہدین کی کوئی بڑی پارٹی ہوگی جس نے فوجی ٹرکوں پر حملہ کیا تھا میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس پارٹی میں صرف تین افراد ہوں گے۔ ایک مرد اور دو لڑکیاں۔ اور یہ تو میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ ان لڑکیوں میں ایک تم ہوگی۔''

''عورت جب ہتھیار اُٹھا لیتی ہے تو زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے۔'' انگوری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر اُس کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''گلمرگ والے کیمپ کی تباہی کے بعد بھارتی فوجی بری طرح جھنجھلا گئے تھے۔ اُنہوں نے بدلہ لینے کے لئے قرب و جوار کی بستیوں کو تہس نہس کرنا شروع کر دیا۔ اُنہیں ان مجاہدین کی تلاش تھی جنہوں نے کیمپ کی تباہی میں حصہ لیا تھا لیکن وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ

مجاہدین ان بستیوں میں نہیں ملیں گے۔ وہ تو محض اپنا غصہ اور جھنجھلاہٹ اُتار رہے تھے..... بیگناہوں کو بربریت کا نشانہ بنا رہے تھے، اُن کے گھروں کو جلایا جا رہا تھا، احتجاج کرنے والوں کو سنگینوں سے چھلنی کیا جا رہا تھا اور اُن کی لاشیں راستوں پر گھسیٹی جا رہی تھیں۔ اور وہ درندے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ جو بھی احتجاج کرے گا اُس کا یہی حشر ہوگا۔ اور پھر اُس روز.....'' وہ خاموش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''اور پھر اُس روز شام ہونے سے ذرا پہلے دو جیپوں اور دو ٹرکوں پر سوار تقریباً تیس پینتیس فوجی ہماری بستی میں گھس آئے۔ اُنہوں نے آتے ہی لوٹ مار شروع کر دی۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ اُنہیں نہ جانے کس طرح یہ پتہ چل گیا تھا کہ کیمپ کی تباہی سے ایک روز پہلے دو مجاہدین نے چند گھنٹوں کے لئے اس بستی میں قیام کیا تھا۔ اور اُنہیں یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ مجاہدین عائشہ کے گھر میں ٹھہرے تھے۔ چار فوجی ہمارے گھر آ گئے۔ اماں نے مجھے پچھلے دروازے سے نکال دیا۔ میں گلی کے سرے پر چاچی رشیدہ کے گھر میں چھپ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ فوجی اماں کو مارتے پیٹتے اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بستی کے چوک پر لے آئے۔ چاچی رشیدہ کے گھر والوں نے مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ اماں کی چیخیں میرے کانوں سے ٹکراتی رہیں۔ میں باہر نکلنا چاہتی تھی مگر چاچی رشیدہ کے گھر والوں نے مجھے کمرے سے نہیں نکلنے دیا۔ بستی میں شور بڑھتا جا رہا تھا۔ بھارتی فوجیوں نے ہمارے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ بستی کے کچھ اور گھروں کو بھی جلا دیا تھا۔ میں جس کمرے میں بند تھی اُس کی کھڑکی سے شعلے اور دُھویں کے بادل اُٹھتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ فوجی اب گھروں میں گھس کر جوان لڑکیوں کو باہر نکال رہے تھے۔ چاچی رشیدہ کا بھائی مجھے اور اپنی جوان بیٹی طاہرہ کو لے کر چھپتا چھپاتا بستی سے نکل آیا اور کہا کہ ہم جنگل میں جا کر چھپ جائیں۔ اور جب یہ بھیڑیئے واپس چلے جائیں تو ہم بھی واپس آ جائیں۔ میں اور طاہرہ بستی سے نکل کر گلمرگ کی طرف جانے والے راستے کے قریب اُونچی جھاڑیوں میں چھپ گئیں۔ راستے کے قریب چھپنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم ان فوجیوں کو واپس جاتے ہوئے دیکھ سکیں اور جب وہ دُور چلے جائیں تو ہم بستی میں واپس آ جائیں۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ بستی کے کئی مکانوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اور پھر ہمیں دو فوجی ٹرک آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں اور طاہرہ جھاڑیوں میں چھپی اُنہیں دیکھتی رہیں۔ اُس وقت ہم دونوں خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ایک جیپ اور دو ٹرک ہمارے سامنے سے گزر گئے۔ آخر میں آنے والی جیپ ہمارے عین سامنے سڑک پر رُک گئی۔ میں اور طاہرہ خوف کے مارے ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ میرا خیال تھا کہ اُنہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ جیپ خراب ہو کر رُکی تھی۔ ڈرائیور بار بار اِنجن سٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا، پھر نیچے اُتر کر اُس نے اِنجن کا ڈھکنا اُٹھایا اور خرابی تلاش کرنے لگا۔ جیپ بغیر چھت

کی تھی۔ پچھلے حصے میں دو فوجی بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے ایک لڑکی کو دبوچ رکھا تھا۔ اُس لڑکی کے کراہنے کی آوازیں ہمارے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

دوسری جیپ اور ٹرک بہت آگے نکل چکے تھے۔ میں نے اور طاہرہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ہم میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ ہم نے ایک نہایت خطرناک فیصلہ کر لیا۔ ہم دونوں بہت محتاط انداز میں جھاڑیوں سے نکلیں اور چیختے دھاڑتے ہوئے جیپ پر حملہ کر دیا۔ ہماری چیخوں سے جیپ پر بیٹھے ہوئے فوجی بدحواس ہو گئے۔ ہم نے اُن کی رائفلوں پر قبضہ کر لیا۔ پہلے لڑکی کو اُن کے شکنجے سے چھڑا کر جیپ سے اُتارا اور پھر ان دونوں فوجیوں کو گولیوں سے بھون دیا۔ ڈرائیور نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن طاہرہ نے اُسے بھی ڈھیر کر دیا۔

جس لڑکی کو ہم نے فوجیوں کے قبضے سے چھڑایا وہ نوری تھی۔ ہم نے تینوں فوجیوں کی رائفلوں پر قبضہ کر لیا اور جیپ میں رکھے ہوئے کئی فالتو میگزین بھی اُٹھا لئے۔ اسی دوران ایک ٹرک واپس آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم نے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ ہمارا پیچھا کر کے ہمیں گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ ہم سڑک سے ذرا ہٹ کر جھاڑیوں اور پتھروں میں چھپ گئے۔ اب ہمارے دلوں سے خوف مٹ چکا تھا۔ حوصلے بڑھ گئے تھے۔ مجاہدین ہماری بستی میں آ کر ٹھہرتے رہتے تھے۔ مقبول بھائی تو اکثر ہمارے گھر میں ٹھہرتے تھے۔ میں نے مقبول بھائی سے رائفل چلانا سیکھ لی تھی۔ بستی کی دوسری بہت سی لڑکیاں بھی بستی میں آنے والے مجاہدین سے شوقیہ طور پر رائفل چلانا سیکھ چکی تھیں۔ لیکن اُس روز عملی طور پر ہمیں رائفل اُٹھانے کا موقع پہلی بار ملا.....'' وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ مسلسل بلندی پر چڑھتے رہنے سے ہمارے سانس ایک بار پھر پھولنے لگے تھے۔ انگوری بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ٹرک جیپ سے چند گز کے فاصلے پر رُک گیا اور تقریباً نصف درجن فوجی ٹرک سے اُتر کر جیپ کی طرف دوڑے۔ اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر اُن کے چہروں پر ہوائیاں سی اُڑنے لگیں۔ وہ ٹرک کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تھے اور مکمل طور پر ہماری زد میں تھے۔ اُنہوں نے رائفلیں سنبھال لیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ صورتحال کو پوری طرح سمجھ سکتے ہم نے فائر کھول دیا۔ تین فوجی ڈھیر ہو گئے اور باقی ٹرک کی طرف دوڑے۔ وہ لوگ شاید یہ سمجھے تھے کہ مجاہدین کی کوئی پارٹی یہاں پہنچ گئی ہے۔ ٹرک مُڑ کر تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑنے لگا۔ اُس پر سوار فوجی اندھیرے میں اندھا دُھند فائرنگ بھی کر رہے تھے۔

جیپ پر وہ فوجی نوری کو راستے بھر نوچتے آئے تھے۔ اُس کی قمیض تار تار ہو رہی تھی۔ ہم لوگ بستی میں واپس آ گئے۔ کئی اور گھروں کی طرح میرا گھر بھی شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ میری ماں کی لاش چوک میں پڑی تھی..... بستی کے لوگ خوفزدہ اور سراسیمہ تھے۔ کچھ لوگ میری ماں کی لاش کے قریب بھی جمع تھے۔

نوری کی ماں کا تو عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ جنگل

کا منے والے ٹھیکیدار کے یہاں مزدوری کرتا تھا۔ لیکن آج وہ بھی اُن درندوں کی بربریت کا شکار ہو گیا تھا..... بستی میں تین اور لاشیں بھی اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔ اُن تمام لاشوں کو صبح ہونے سے پہلے پہلے دفن کر دیا گیا۔ میں نے اُن کی قبروں پر کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی کہ اُن کے خون کے ایک ایک قطرے کا بدلہ لوں گی۔

رات تو خیریت سے گزر گئی۔ یہ بھارتی فوجی بڑے بزدل ہیں۔ اُنہیں اپنی جان کا بڑا خوف رہتا ہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد یہ اپنی چھاؤنیوں یا کیمپوں سے باہر نہیں نکلتے۔ رات کو انہوں نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی تھی۔ اُن کے پانچ ساتھیوں کی لاشیں رات بھر بستی کے باہر سڑک پر پڑی بھیڑیوں کی خوراک بنتی رہیں تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ صبح ہوتے ہی فوجی بھاری تعداد میں ایک بار پھر بستی پر حملہ آور ہوں گے اس لئے میں نے دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ طاہرہ کو چاچی رشیدہ رات ہی کو چند میل دُور ایک اور بستی میں اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں لے گئی تھی۔ نوری میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ اور پھر عبداللہ بھی ہمارے ساتھ ہو گیا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے منگیتر ہیں۔

ہم نے ایک محفوظ ٹھکانہ تلاش کر لیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ دن کے وقت فوجی گاڑیاں شاہراہ پر گشت کرتی رہتی ہیں۔ پہلے روز ہم نے ایک اکیلی جیپ کو نشانہ بنایا۔ وہ جیپ پتن سے بارہ مولا کی طرف جا رہی تھی۔ اُس میں ڈرائیور سمیت چار فوجی تھے۔ ہم گھات لگائے بیٹھے تھے۔ وہ چاروں ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ اس جیپ سے ہمیں بہت سا ایمونیشن اور کئی دستی بم مل گئے۔ پچھلے تین روز سے ہم اُس شاہراہ کے مختلف مقامات پر اسی قسم کی چھاپہ مار کارروائیاں کر کے بھارتی فوجیوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ آج بھی ہم رات کے آخری پہر تین بجے اس جگہ گھات لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ اور جیسے ہی ہم نے ٹرکوں پر حملہ کیا دوسری طرف سے فائرنگ کی آواز سن کر میں سمجھی تھی کہ مجاہدین کی کوئی بڑی پارٹی اس طرف آ نکلی ہے۔ ہمارے حوصلے بڑھ گئے لیکن.....''

''کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔'' میں نے اُس کی بات پوری کر دی۔ انگوری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ فضا میں جیسے نقرئی گھنٹیاں سی بج اُٹھیں۔

''لیکن تم دو نے تبھی ہمیں بڑا حوصلہ دیا تھا۔'' انگوری نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''دو طرف سے حملہ ہوا تو بھارتی سورما یہی سمجھے تھے کہ مجاہدین کی کسی بڑی پارٹی نے حملہ کیا ہے۔ اور پھر عبداللہ نے بروقت ہینڈ گرنیڈ پھینک کر بڑا کام کر دکھایا۔''

''میں تم لوگوں کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔'' میں نے چلتے چلتے انگوری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا لیکن نہ تو کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ ''کیا گولیاں چلاتے اور خون بہتے دیکھ کر تمہیں خوف نہیں آتا؟''

''خوف اور ڈر..... یہ چیزیں اب میرے لئے بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔'' اُس نے جواب

دیا۔ ''میرا ڈر تو اُس روز دُور ہو گیا تھا جب میں نے اور طاہرہ نے نوری کو فوجیوں کے شکنجے میں دیکھ کر جیپ پر حملہ کر دیا تھا۔ اور پھر میں نے اپنوں کا خون بہتے دیکھا ہے۔ اُن بھارتی بھیڑیوں کا خون بہتے دیکھ کر مجھے خوف کیوں محسوس ہونے لگا؟ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب میں کسی بھارتی فوجی کو گولی کھا کر گرتے اور اُس کے جسم سے خون کے فوارے اُبلتے دیکھتی ہوں تو مجھے عجیب سا سکون ملتا ہے۔''

میں نے انگوری کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ ہم ایک بار پھر رُک گئے۔ حسن ہم سے چند گز پیچھے چل رہا تھا۔ وہ بھی ہمارے قریب آ کر ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ہم پہاڑ کی چوٹی پر تھے، دوسری طرف نشیب میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا جو دُور تک چلا گیا تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک بیٹھے رہے اور پھر اُٹھ کر ایک تنگ سے راستے میں داخل ہو گئے۔ یہاں ہوا بہت تیز تھی جو ہمیں مسلسل پیچھے کی طرف دھکیل رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم کھلی جگہ پر پہنچ گئے۔ بڑی حسین جگہ تھی۔ دُور تک درختوں کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ مخملی گھاس میں مسکراتے ہوئے رنگ برنگے جنگلی پھول بہار دکھا رہے تھے۔

ہم ایک بار پھر ایک چھوٹی سی ندی پر رُک گئے۔ شفاف پانی اُچھلتا اور گنگناتا ہوا بہہ رہا تھا۔ میں نے جی بھر کر ٹھنڈا پانی پیا اور منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔

ہم صرف چند منٹ وہاں رُکے اور ندی کے ساتھ ساتھ اُوپر کی طرف چلنے لگے۔ اس مرتبہ ہمیں زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً سو گز آگے ایک سرسبز چٹان کے ساتھ گھومتے ہی ہم رُک گئے۔ درختوں کے جھنڈ کے نیچے ایک بڑا تالاب تھا۔ وہ ندی اسی تالاب سے نکل کر بہہ رہی تھی۔ یہی وہ چشمہ تھا جس کا پانی تالاب کی صورت میں جمع ہو رہا تھا۔ اس تالاب کے بائیں طرف گھاس پھونس کا ایک جھونپڑا بنا ہوا تھا اور ایک بوڑھا آدمی جھونپڑے کے سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھا رسّی بٹ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اُس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ضرور رہی ہو گی۔ داڑھی اور سر کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ ہمیں دیکھ کر رسّی والی چرخی اُس نے نیچے رکھ دی اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''آ گئیں بیٹی.....!'' وہ انگوری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ دونوں ہیں تو اپنے ہی شیر مگر ان کے نام بتا دو بیٹی تاکہ انہیں مخاطب کرنے میں آسانی رہے۔'' اُس نے کہتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔

''یہ شمروز ہے اور یہ حسن۔'' انگوری نے ہمارا تعارف کرایا۔ ''آج اتفاق سے یہ بھی اُسی شکار پر جھپٹے تھے جو ہمارا نشانہ تھا۔''

''پھر تو اُس بدبخت شکار کے چیتھڑے اُڑ گئے ہوں گے۔'' بوڑھا مسکرا دیا۔

''ہاں بابا..... یہی سمجھ لو! چیتھڑے ہی اُڑ گئے اُن کے۔'' انگوری بھی مسکرا دی۔

''نوری اور عبداللہ تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔'' بابا نے کہا۔

''وہ بس آتے ہی ہوں گے.....'' انگوری نے جواب دیا۔ ''پر ہمیں تو بہت بھوک لگ رہی ہے بابا!''

''تم لوگ بیٹھو میں ابھی چاول اُبال لیتا ہوں۔'' وہ سفید ریش بوڑھا کہتے ہوئے جھونپڑے کے پچھلی طرف چلا گیا۔

حسن تو چٹائی پر لیٹ گیا۔ میں اور انگوری ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ میں بار بار انگوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سر پر بندھا ہوا رُومال کھول دیا تھا۔ اُس روز میں نے اُسے دو چوٹیاں باندھے ہوئے دیکھا تھا۔ سینے پر لہراتی ہوئی وہ دو چوٹیاں بھی مجھے اچھی لگی تھیں اور بکھرے ہوئے سیاہ ریشمی بال بھی بہت اچھے لگ رہے تھے۔ مجھے اپنی طرف اس طرح گہری نظروں سے گھورتے ہوئے دیکھ کر انگوری کے چہرے پر ہلکی سی سرخی پھیل گئی اور نگاہیں جھک گئیں۔ میں بے اختیار مسکرا دیا۔ اس وقت میرے سامنے وہی انگوری بیٹھی تھی جسے میں نے پہلی بار اُس کے گھر میں دیکھا تھا۔ شرمائی، لجائی اور جھجکی ہوئی سی لڑکی.....

تھوڑی ہی دیر بعد نوری اور عبداللہ بھی پہنچ گئے۔ وہ کچھ زیادہ تھکے ہوئے تھے۔ نوری نے اپنی سب مشین گن ایک طرف ڈال دی، سر پر بندھا ہوا رُومال کھول دیا اور چٹائی پر لیٹ کر اپنا سر انگوری کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ انگوری پیار سے اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگی۔

فضا میں چاولوں کی خوشگوار سی مہک پھیل گئی۔ جھونپڑے کے پچھلی طرف وہ بابا چاول اُبال رہا تھا۔ اُن کی اشتہا آمیز خوشبو سے میری بھوک چمک اُٹھی تھی۔

''یہ بابا کون ہے اور یہاں اس ویرانے میں کیوں رہ رہا ہے؟ میرا خیال ہے قرب و جوار میں کوئی بستی بھی نہیں ہے۔'' میں نے انگوری سے پوچھا۔

''اس کا نام عبدالفتح ہے۔'' انگوری نے بتایا۔ ''برسوں پہلے اس کا نام بھارتی فوجیوں کے لئے خوف و دہشت کی علامت بنا ہوا تھا۔ یہ اپنے مجاہدین کے ساتھ جس چوکی یا کیمپ پر حملہ کرتا وہاں لاشوں کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ بھارتی فوج کے بعض جنرل بھی اس کا نام سن کر تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ عبدالفتح اپنی زندگی میں کم از کم تین مرتبہ پکڑا گیا لیکن بھارتیوں کی بنائی ہوئی کوئی بھی زنجیر اسے پابند سلاسل نہیں کر سکی۔ یہ ہر مرتبہ بھاگ نکلا۔ اس کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ یہ مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہے۔ بھارتی فوجیوں کو یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ عبدالفتح کو گرفتار کرنے کی بجائے دیکھتے ہی گولی سے اُڑا دیا جائے۔ بابا عبدالفتح کے بدن پر زخموں کے لاتعداد نشان ہیں۔ کم از کم سات مرتبہ گولیوں کا نشانہ بنا۔ بے پناہ تشدد برداشت کیا مگر زندہ رہا..... آزادی کی لگن نے اسے زندہ رکھا۔ عبدالفتح تیس سال تک بھارتیوں کے لئے ہوا بنا رہا۔ پھر اس کے قویٰ جواب دینے لگے۔ یہ چھاپہ مار کارروائیوں میں عملی طور پر حصہ لینے کی بجائے مجاہدین کو تربیت دینے لگا۔ اور پھر گوشہ نشین ہو گیا۔ عبدالفتح نے پچھلے تین سال سے

یہاں ڈیرہ جما رکھا ہے۔ اللہ اللہ کرتا ہے اور وطن کی آزادی کی دُعائیں مانگتا رہتا ہے۔ یہ درخت، پودے، گنگناتی ہوئی ندی، چہچہاتے ہوئے پرندے اور قدرتی نظارے اس کے ساتھی ہیں۔ یہاں سے تقریباً پانچ کوس کے فاصلے پر اس پہاڑ کے پیچھے ایک بستی ہے۔ بابا عبدالفتح ہر دو ہفتے بعد اُس بستی میں جا کر اپنی ضرورت کی چیزیں لے آتا ہے۔ بستی کا کوئی بھی دُکاندار اس سے پیسے لینے کو تیار نہیں ہوتا مگر یہ بغیر قیمت کے کوئی چیز نہیں لیتا۔ یہاں بیٹھا رسیاں بٹتا رہتا ہے جنہیں بیچ کر ضرورت کی چیزیں خرید لیتا ہے۔''

غازی عبدالفتح کا نام میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ بچپن میں کئی مرتبہ یہ نام سنا تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا یہ کئی مرتبہ سوپور بھی آ چکا تھا اور مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ آج مجھے اس عظیم مجاہد کے نیاز ہوا جس نے اپنی زندگی وطن کی آزادی کے لئے لڑتے ہوئے گزار دی تھی۔ اور آج بھی بھارتی فوج کے جنرلوں اور کشمیر کے کٹھ پتلی حکمرانوں کو اس کی تلاش تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد بابا عبدالفتح نے چاولوں کی پتیلی اور چند پلیٹیں ہمارے سامنے چٹائی پر رکھ دیں۔ نوری اور حسن بھی اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

''جس نے جتنا کھانا ہو خود ہی نکال لو بیٹا!'' بابا عبدالفتح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

انگوری نے ایک پلیٹ میں چاول نکال کر وہ پلیٹ بابا کے سامنے رکھ دی اور پھر ہمیں پلیٹوں میں نکال نکال کر دینے لگی۔ گرم گرم چاولوں سے اُٹھنے والی خوشبو میری بھوک بڑھا رہی تھی۔ لیکن مجھے چاولوں کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ نمک ملے ہوئے یہ چاول بہت اچھے لگ رہے تھے۔ چاول کھاتے ہوئے میں بابا عبدالفتح سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

''آپ سوپور بھی تو آ چکے ہیں..... میں اُس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن کئی مرتبہ آپ کے بارے میں سنا تھا۔''

''میں کئی مرتبہ سوپور جا چکا ہوں۔ مجھے اب بھی سب کچھ یاد ہے۔'' بابا عبدالفتح نے کہا۔ ''احمد علی عباس، غلام اکبر دُکاندار اور رسول بخش لون اُنہوں نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا۔ اُنہوں نے کبھی بندوق نہیں اُٹھائی لیکن میرے نزدیک اُس کا رُتبہ بھی غازیوں اور مجاہدوں سے کم نہیں۔ تم بھی سوپور کے رہنے والے ہو۔ کس کے بیٹے ہو؟''

''رسول بخش لون کا۔'' میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ..... مجاہد کا بیٹا مجاہد ہی ہوتا ہے۔'' اُس نے آگے بڑھ کر میرا ماتھا چوم لیا..... ''کیسا ہے تمہارا باپ؟ اب تو وہ.....''

''وہ شہید ہو گئے.....!'' میں نے کہا۔

''اوہ.....'' بابا عبدالفتح کا ہاتھ منہ کی طرف جاتے جاتے رُک گیا۔ اُس نے نوالہ پلیٹ میں ڈال دیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ کب کی بات ہے.....؟''

○○○

''تقریباً دو مہینے پہلے۔'' میں نے کہا۔ اور پھر سوپور پر بھارتی فوجیوں کے حملے کی تفصیل بتانے لگا۔ انگوری نے مجھی ہاتھ کا نوالہ چھوڑ دیا تھا اور وہ بھی پوری توجہ سے میری باتیں سن رہی تھی۔ ''میری زندگی تھی جو میں بچ گیا۔'' میں کہہ رہا تھا۔ ''وہ لوگ مجھے مُردہ سمجھ کر پھینک گئے تھے۔ اتفاق سے کمانڈر محبّ اللہ اور اُس کے ساتھیوں کا اس طرف سے گزر ہوا اور وہ لوگ مجھے بے ہوشی کی حالت میں اُٹھا کر لے گئے۔'' میں ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اور چند لمحوں کے وقفے کے بعد اپنی بقیہ کہانی سنانے لگا۔

''وہ تمہاری آزمائش تھی۔'' میرے خاموش ہونے پر بابا عبدالفتح نے کہا۔ ''قدرت انسان کا امتحان لیتی ہے۔ اگر وہ آزمائش میں کامیاب ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اُسے منزل پر پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ تم بھی اس آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلے ہو۔ یہ غاصب بھارتی حکمران اب تمہارا راستہ نہیں رک سکتے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''مجھے انگوری نے بتایا تھا کہ کمانڈر محبّ اللہ کی قیادت میں مجاہدین نے گلمرگ کے دوسری طرف نئے قائم ہونے والے اسلحہ ڈپو کو اُڑا دیا ہے۔ مجھے بھی اُس ڈپو کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ اگر وہ ڈپو قائم رہتا تو اس علاقے میں بھارتی فوج کی گرفت مضبوط ہو جاتی۔ مگر تم لوگوں نے اُن کی کمر توڑ دی ہے۔ اب وہ طویل عرصہ تک سنبھل نہیں سکیں گے۔''

''آپ کے خیال میں کشمیر کے سیاسی لیڈروں کو وطن کی آزادی کے لئے کوئی کردار ادا نہیں کرنا چاہئے؟'' میں نے موضوع بدل دیا۔

''سیاسی لیڈر.....!'' بابا عبدالفتح کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''کشمیر کے سیاسی لیڈروں کا آزادی کی اس تحریک میں کوئی کردار نہیں ہے۔ یہ جنگ تم جیسے نوجوانوں کو ہی لڑنی پڑے گی۔ ہمارے لیڈر تو ہندو سامراج کے آلہ کار ہیں۔ وہ سرینگر کے عالیشان بنگلوں میں شاندار ڈرائنگ رُومز میں بیٹھ کر کشمیریوں کی بے بسی اور مظلومیت کا رونا روتے ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ عوام ان کو بھولنے لگی ہے تو بھارتی حکمرانوں یا فوج کے مظالم کے خلاف ایک زوردار بیان جاری کر دیتے ہیں جس پر حکومت اُنہیں گرفتار کر لیتی ہے اور وہ جیل میں بھی عیش کرتے ہیں اور چند روز بعد وہ پھر رہا ہو کر اپنی عیاشیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہمارے سیاسی لیڈر کشمیر کی آزادی کے لئے کیا کریں گے؟ یہ لوگ کشمیری عوام کے ہمدرد نہیں۔ نہ انہیں آزادی سے کوئی دلچسپی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لیڈر تحریک آزادی کی راہ میں رُکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر یہ لیڈر نہ ہوتے تو کشمیر بہت عرصہ پہلے آزاد ہو چکا ہوتا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ایک زمانے میں شیر کشمیر کے نام کا بہت چرچا تھا۔ وہ تحریک آزادی کا ہیرو کہلانے لگا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے اور دنیا جانتی ہے کہ کشمیر کاز کو سب سے زیادہ نقصان اسی شیر کشمیر نے پہنچایا تھا۔ کرسی کی خاطر اُس نے کشمیری عوام سے غداری کی، کشمیر کاز سے غداری کی اور پھر یہ روایت بن گئی۔ اقتدار سے محروم ہو کر یہ شیر کشمیر کشمیری عوام پر بھارتی حکمرانوں اور فوج کے مظالم کا رونا روتا اور جب اُسے وزارت اعلیٰ کی مسند پر بٹھا دیا جاتا تو اُس کی زبان اُنہی کشمیری عوام کے خلاف زہر اُگلنے لگتی۔

شیر کشمیر مر گیا۔ اُس کی گدی اُس کی اولاد نے سنبھال لی۔ یہ تو غدار ابن غدار ہیں۔ کشمیر کاز کو سب سے زیادہ نقصان اسی خاندان نے پہنچایا ہے۔ دوسرے لیڈر بھی یہی سب کچھ کر رہے ہیں۔ وہ چٹے اُجلے کپڑے اور اُونچی ٹوپیاں پہن کر بیانات جاری کرنے کے لئے تصویریں بنواتے ہیں۔ اُن کی دلچسپی صرف اپنی سیاست چمکانے تک محدود ہے۔ آزادی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ وادی میں ہر جگہ پولیس اور فوج سے کشمیری عوام کی جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ نہتے عوام پولیس کی لاٹھیاں کھاتے ہیں، فوج کی گولیوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ ان کے گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے، ان کی عورتوں کو سڑکوں پر گھسیٹا جاتا ہے، ان کی جوان بیٹیوں کو اجتماعی آبروریزی کا نشانہ بنایا جاتا ہے، انہیں ہر طرح سے رُسوا کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا کسی لیڈر کے بارے میں ایسا سنا ہے کہ اس کے جسم پر کوئی معمولی سا بھی زخم لگا ہو؟ اُن کے گھروں کو آگ لگائی گئی ہو یا اُن کی عورتوں کو ہاتھ لگایا گیا ہو؟ نہیں میرے دوست! یہ سب کچھ تو ان نہتے اور بے گناہ کشمیری عوام کے ساتھ ہو رہا ہے جو اس حسین وادی کو بھارتی سامراج سے آزاد کروا کر امن و آشتی کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں۔ آزادی کے متوالوں کو جب گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہوتا ہے، اُن کے گھروں سے آگ کے مہیب شعلے اُٹھ رہے ہوتے ہیں اور اُن کی عورتوں کو سڑکوں پر گھسیٹا جا رہا ہوتا ہے اُس وقت ہمارے یہ لیڈر اپنی کوٹھیوں کے عالیشان ڈرائنگ رُومز میں بیٹھ کر سیاست بگھار رہے ہوتے ہیں اور یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ معصوم کشمیریوں کے جسموں سے بہنے والے خون سے وہ ذاتی طور پر زیادہ سے زیادہ کتنا اور کس طرح فائدہ اُٹھا سکتے ہیں؟'' بابا عبدالفتح چند لمحوں کو خاموش ہو گیا۔ اُس کی ان باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کشمیر کے سیاسی لیڈروں سے کس قدر بد دِل تھا۔

''یہ سب کچھ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ.....'' وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں ان لیڈروں سے مایوس ہو چکا ہوں۔ اُنہیں صرف اپنی سیاسی دُکان سے دلچسپی ہے جسے وہ چمکائے رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کشمیر کی آزادی نہیں چاہتے بلکہ اس معاملے کو اُلجھائے رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے کردار بہت گھناؤنے ہیں۔ تم ان کے اندر جھانک کر دیکھو تو تمہیں بھی ان سے نفرت ہو جائے گی۔ میں تمہیں ایک لیڈر کی بات بتاؤں۔'' وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے

لگا پھر بولا۔ ''یہ اپنے آپ کو کشمیری عوام کا بہت بڑا ہمدرد اور بہت بڑا لیڈر سمجھتا ہے۔ اُس کے بیانات سن کر لگتا ہے کہ بھارتی فوجیوں نے مظلوم کشمیریوں پر مظالم بند نہ کئے تو وہ اپنی جان دے دے گا۔ لیکن اُس کے اصل کردار کے بارے میں جان کر تمہیں اُس سے نفرت ہو جائے گی۔'' وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ میں اُس کے چہرے پر تاثرات کے اُتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''چند سال پہلے جب بھارتی فوجیوں کے خلاف میری سرگرمیاں عروج پر تھیں تو اس لیڈر نے کم از کم دو مرتبہ مجھ سے رابطہ کیا تھا اور یہ پیشکش کی تھی کہ میں بھارتی سامراج کے خلاف اپنی سرگرمیاں ختم کر دُوں تو مجھے بہت ساری مراعات دی جا سکتی ہیں۔ ہندوستان کے کسی بھی شہر میں یا پاکستان میں مجھے بہت بڑی کوٹھی دی جائے گی۔ شاندار کار دی جائے گی اور کم از کم پانچ لاکھ روپے ماہانہ اخراجات کے لئے دیئے جائیں گے۔ یہ مراعات مجھے زندگی کی آخری گھڑیوں تک ملتی رہیں گی۔ لیکن میں نے اُس کی پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں یہ جنگ اپنے ذاتی مفاد کے لئے نہیں اُن مظلوم اور بے گناہ بہن بھائیوں کے لئے لڑ رہا ہوں جو پچھلے باون برسوں سے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ تو یہ ہے ہمارے لیڈروں کا کردار۔'' وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ''سب لیڈر ایسے بے ضمیر نہیں ہیں۔ بعض لوگوں کے دل میں واقعی کشمیری عوام سے ہمدردی ہے۔ وہ بھی بھارتی تسلط سے وادی کو آزاد کرانا چاہتے ہیں لیکن اُنہیں آگے نہیں آنے دیا جاتا، اُنہیں اپنی بات کہنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ لیڈروں نے مجھے بڑا مایوس کیا ہے۔ لیکن میں کشمیر کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ کشمیر ضرور آزاد ہو گا اور سیاسی لیڈر نہیں بلکہ تم جیسے سرپھرے نوجوان آزادی دلائیں گے۔ میں سیاست کا طالب علم نہیں ہوں۔ میں نے تو صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ زمانہ تعلیم کے دوران بھی مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن یہ دیکھ دیکھ کر میرا دل کڑھتا تھا کہ غاصب اور ظالم ہندوؤں نے ہماری آزادی سلب کر رکھی ہے۔ وہ طاقت کے بل بوتے پر ہمیں دبائے رکھنا چاہتے ہیں۔''

کمانڈر رشید اور دوسرے مجاہدین ہمارے قصبے میں آتے رہتے تھے۔ میں اُن کی باتیں سنتا تھا۔ ہر رات قصبے کے کچھ لوگ ہمارے گھر آ جاتے تھے اور بیٹھک میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ لیڈروں کے بیانات پر تبصرے ہوتے، کٹھ پتلی حکمرانوں کے کردار کا تجزیہ کیا جاتا اور پھر اپنے والدین کی شہادت کے بعد میں نے رائفل اُٹھائی تو مجاہدین کی باتیں سن کر مجھے پتہ چلا کہ سیاست کیا ہوتی ہے۔ مگر اُس وقت بھی میں نے زیادہ گہرائی میں جانے کی کوشش نہیں کی تھی اور آج بابا عبدالفتح کی باتوں نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کشمیر کو بھارتی تسلط سے آزادی سیاسی لیڈر نہیں بلکہ مجاہدین ہی دلائیں گے۔ آزادی کے متوالے یہ وہ لوگ تھے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں کٹھن ترین زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہی لوگ اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ کر بجلی کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑتے تھے اور اُنہیں تہس نہس کر کے پہاڑوں میں روپوش ہو جاتے تھے۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اب میں بھی ان سرفروشوں میں شامل تھا اور تحریک آزادی میں اپنے حصے کا کردار ادا کر رہا تھا۔

اگرچہ ہم سب کو شدید بھوک لگی ہوئی تھی مگر ان باتوں سے ہماری بھوک مر چکی تھی۔ نوری نے چاولوں کی پتیلی اُٹھا کر جھونپڑی میں رکھ دی اور پلیٹیں دھونے کے لئے ندی پر لے گئی۔ بابا عبدالفتح ایک بار پھر چھوٹی سی چرخی گھما کر رسّی بٹنے لگا تھا۔

''میرے ہاتھوں میں اب رائفل اُٹھانے کی سکت نہیں رہی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''لیکن اس اُمید پر زندہ ہوں کہ اپنی آنکھوں سے اس وادی کی فضاؤں میں آزادی کا پرچم لہراتے دیکھ سکوں۔''

''انشاء اللہ آپ ضرور دیکھیں گے۔'' میں نے کہا۔

عبداللہ اور حسن بھی اُٹھ کر ہم سے کچھ دُور درختوں کے نیچے گھاس پر جا بیٹھے تھے۔ میں بظاہر باتیں تو بابا عبدالفتح سے کر رہا تھا مگر میرا دھیان انگوری کی طرف تھا جو بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

''ارے بیٹی انگوری! تم جا کر سو جاؤ..... بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔'' بابا عبدالفتح نے انگوری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

انگوری اُٹھ کر جھونپڑے میں چلی گئی۔ میں کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جھونپڑے میں چٹائی پر نمدے بچھے ہوئے تھے اور چند کمبل بھی تہہ کر کے ایک طرف رکھے ہوئے تھے۔ وہ ایک کونے میں لیٹ گئی۔ نوری بھی پلیٹیں وغیرہ دھونے کے بعد عبداللہ اور حسن کے قریب جا بیٹھی تھی۔ میں کچھ دیر بابا عبدالفتح سے باتیں کرتا رہا اور پھر چٹائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔

دن سوتے ہوئے گزرا اور رات کو نیند آنکھوں سے دُور رہی۔ حسن، عبداللہ اور نوری تو جلد ہی سو گئے تھے۔ انگوری میری طرح دن میں اپنی نیند پوری کر چکی تھی۔ وہ بھی میری طرح بابا عبدالفتح کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ بابا عبدالفتح اپنی جوانی کے قصے سنا رہا تھا۔ عبدالفتح کے بارے میں، میں نے بھی بچپن میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور اب اسی غازی سے اُس کے معرکتہ الآرا، کارناموں کی تفصیل سن رہا تھا۔ بابا نے باتیں کرتے کرتے قمیض اُوپر اُٹھا دی۔

''یہ دیکھو.....'' وہ سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ زخم نہیں میڈل ہیں جو میری بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے بھارتی فوجیوں نے میرے سینے پر سجائے تھے۔ اور یہ دیکھو!'' اس نے گھوم کر برہنہ پشت میری طرف کر دی۔ ''میری پشت پر تمہیں ایسا کوئی نشان نظر نہیں آئے گا۔ بہادری کے میڈم ہمیشہ سینے پر سجائے جاتے ہیں پشت پر نہیں۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا پھر قمیض درست کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں یہ سب کچھ اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم بھی یہ میڈل سینے پر ہی سجانا تمہاری پشت کبھی دشمن کی طرف نہیں ہونی چاہئے۔''

''ایسا ہی ہو گا بابا.....'' میں نے کہا۔

''تم محب اللہ کے ساتھ رہے ہو۔'' بابا عبدالفتح نے کہا۔ ''وہ ایک ذہین اور بہادر مجاہد ہے۔ اُس کی زندگی کا بیشتر حصہ بھی جہاد کرتے ہوئے گزرا ہے۔ اُس کے ساتھ رہ کر تمہیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔''

''مجھے ایک تجربہ ہو چکا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''گلمرگ والے فوجی کیمپ کی تباہی میں، میں اُن کے ساتھ تھا۔ اُن کی رہنمائی اور تجربے سے ہم نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔''

''وہ تجربہ کار آدمی ہے۔ دشمن پر متعدد بار کاری ضربیں لگا چکا ہے۔ اُس سے مجھے بہت توقعات وابستہ ہیں۔'' بابا نے کہا۔

''کمانڈر محب اللہ ہی نہیں وادی کا ہر مجاہد آپ کی توقعات پر پورا اُترے گا اور آپ دیکھیں گے کہ ہم ان غاصبوں کو ایک نہ ایک دن بوریا بستر گول کرنے پر مجبور کر دیں گے۔'' میں نے کہا۔

''انشاء اللہ.....'' انگوری بول اُٹھی۔

باہر جھاڑیوں کی سرسراہٹ کی آواز سن کر میں چونک گیا اور اُس طرف دیکھنے لگا۔ جھونپڑے کے دروازے کے سامنے لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ اُس کی روشنی میری آنکھوں میں پڑ رہی تھی اور باہر اندھیرا تھا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ لیکن ایک منٹ بعد آواز دوبارہ سنائی دی۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی بہت محتاط انداز میں جھاڑیوں میں چلنے کی کوشش کر رہا ہو..... میں نے لپک کر اپنی سب مشین گن اُٹھالی۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... کوئی جانور ہوگا۔'' بابا عبدالفتح نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''جانور پانی پینے کے لئے چشمے پر آتے رہتے ہیں۔''

میں نے رائفل ہاتھ سے نہیں چھوڑی اور آنکھیں پھاڑ کر باہر اندھیرے میں گھورتا رہا۔ اور پھر ایک مانوس آواز سن کر میں بھی مطمئن ہو گیا۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی پہاڑی بکرا یا ایسا ہی کوئی جانور پانی پی رہا ہو۔ میں نے رائفل رکھ دی۔

''یہ جگہ بہت محفوظ ہے۔'' بابا عبدالفتح نے پھر کہا۔ ''دونوں طرف سڑک کم سے کم پانچ پانچ کوس کے فاصلے پر ہے اور راستہ اتنا دشوار گزار ہے کہ بھارتی فوجی سڑک سے اِدھر آنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ دو سال پہلے ایک مرتبہ اُنہوں نے ایسی کوشش کی تھی لیکن مجاہدین کے گھیرے میں آ گئے۔ اُن میں سے کوئی بھی واپس نہیں جا سکا تھا۔ بھیڑیئے کئی روز تک اُن کی لاشوں کی ضیافت اُڑاتے رہے تھے۔''

ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بابا عبدالفتح کے ہاتھ میں رسّی بٹنے کی چرخی مسلسل چل رہی تھی۔ وقت بہت دھیرے دھیرے بیت رہا تھا۔ انگوری بھی اب اونگھنے لگی تھی۔ اس وقت سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ میں نے ایک کمبل اُٹھا کر اپنے اوپر ڈال لیا۔

تھوڑی دیر بعد انگوری، نوری کے قریب لیٹ کر سو گئی۔ بابا عبدالفتح بھی ایک طرف چٹائی پر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد اُس کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں رائفل اُٹھا کر جھونپڑے کے دروازے کے قریب بیٹھ گیا اور تاریکی میں گھورتا رہا۔ وقفے وقفے سے جنگلی جانور بھی پانی پینے کے لئے چشمے یا ندی پر آ رہے تھے۔ جھونپڑے کے پاس اگرچہ لالٹین روشن تھی لیکن وہ تمام جانور بے ضرر تھے کسی نے بھی جھونپڑے کی طرف آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کبھی کبھار دُور کہیں سے کسی بھیڑیئے کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔

سردی سے بچنے کے لئے میں نے کمبل اوڑھ لیا تھا۔ وقت جیسے تھم کر رہ گیا تھا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں جیسا طویل لگ رہا تھا۔ اور بالآخر میری ہمت بھی جواب دے گئی اور پہلے تو میں وہیں بیٹھا اونگھتا رہا، پھر دروازے کے اندر ایک طرف ہٹ کر چٹائی پر لیٹ گیا اور دروازے کے سامنے ٹنگا ہوا ٹاٹ کا پردہ نیچے گرا دیا۔

صبح میں دیر تک سویا رہا۔ سب لوگ مجھ سے پہلے ہی جاگ چکے تھے مگر مجھے کسی نے نہیں جگایا تھا۔

وہ دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ ہم کبھی تو اُٹھ کر گھومتے ہوئے کچھ دُور چلے جاتے اور کبھی جھونپڑے کے سامنے چٹائی پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے۔ انگوری اب پھر وہی پہلے والی انگوری تھی جسے میں نے پہلی مرتبہ اُس کے گھر میں دیکھا تھا۔ وہ کبھی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتی اور کبھی مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر اُس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔

انگوری کو دیکھ کر میرے اندر عجیب سی ہلچل ہونے لگتی۔ لطیف سی گدگدی کا احساس پورے جسم میں سرایت کر جاتا۔ میں اُس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ بہت سی باتیں..... لیکن وہ میرے قریب رہتے ہوئے بھی مجھ سے دُور تھی۔

میں نے سنا تھا کہ محبت نام کی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ایسی بہت سی داستانیں بھی سنی تھیں۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے؟ کیسے کی جاتی ہے؟ لیکن شاید میری یہ سوچ غلط تھی۔ محبت کی نہیں جاتی محبت تو ہو جاتی ہے۔ اور شاید یہ محبت ہی تھی کہ یہاں سے میلوں دُور مریم اور کمانڈر محب اللہ کے پاس غار میں جب میں نے یہ سنا کہ انگوری کو بھارتی فوجی اُٹھا کر لے گئے تھے یا وہ لاپتہ ہو چکی ہے تو میں تڑپ اُٹھا تھا اور پہاڑوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا بسال پور پہنچ گیا تو جہاں مجھے یہ پتہ چلا کہ انگوری کو پتن کی طرف کسی جگہ دیکھا گیا تھا۔ اگرچہ اس کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی لیکن میں ایک منٹ صبر نہیں کر سکا تھا اور راتوں رات پہاڑوں پر سفر کرتا ہوا پتن کے نواح میں پہنچ گیا جہاں بالکل غیر متوقع اور حیرت انگیز طور پر انگوری سے سامنا ہو گیا۔

انگوری ایک نئے رُوپ میں میرے سامنے آئی تھی۔ کشیدہ کاری کرنے والے نازک سے ہاتھوں میں رائفل تھی جس سے میں نے اُسے دشمن پر موت برساتے ہوئے دیکھا تھا۔ دشمن کے خلاف اُسی مشترکہ چھاپہ مار کارروائی کے دوران ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ ہمارے درمیان حائل تکلف کے پردے اُٹھ گئے تھے اور میں نے ہمت کر کے چلتے چلتے اُس کا

ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ میری اس حرکت پر اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں غصہ نہیں تھا ایک عجیب سی چمک اُبھر آئی تھی۔ اور اُس نے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اتنا قریب آنے کے بعد وہ ایک بار پھر مجھ سے دُور ہو گئی تھی۔ کبھی اُسے اپنی طرف متوجہ پا کر مجھے عجیب سی بے چینی ہونے لگتی اور جب وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی تو میرے سینے میں طوفان سا اُچھلنے لگتا۔ کیا اس کیفیت کو محبت کا نام دیا جا سکتا ہے؟ کیا انگوری بھی میرے بارے میں اسی طرح سوچتی ہے؟

مجھے اپنے دل سے ملنے والا جواب ہاں میں تھا۔ میں اُس کے گھر میں صرف چند گھنٹے مہمان رہا تھا۔ اس دوران تو ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہمارے درمیان ایک رسمی جملے کا تبادلہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہم نے تو نظر بھر کر ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ لیکن میرے جانے کے بعد وہ میرے لئے فکر مند تھی۔ کیمپ پر ہماری چھاپہ مار کارروائی کے بعد اُس نے کسی نہ کسی ذریعے سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ میں خیریت سے ہوں۔

وہ شام سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ میں چشمے سے ذرا آگے ندی میں پیر لٹکائے بیٹھا یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ چھپاک چھپاک کی آواز سن کر چونک گیا..... میں نے گردن گھما کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں اپنی سوچوں میں اس قدر غرق تھا کہ مجھے یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ انگوری کب میرے قریب آ کر بیٹھی تھی؟ وہ پیروں کو پانی میں ڈالے حرکت دے رہی تھی اور چھپاک چھپاک کی آواز سن کر ہی میں چونکا تھا۔

''یہاں اکیلے بیٹھے کیا سوچ رہے ہو؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کیا..... میرے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟'' اُس نے خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اُس کی بھنویں تن گئی تھیں۔

''اوہ..... کک..... کچھ نہیں۔'' میں گڑبڑا سا گیا۔

''ابھی تم نے اعتراف کیا ہے کہ میرے بارے میں سوچ رہے تھے۔'' اُس نے ایک بار پھر مجھے گھورا۔ ''بتاؤ نا! کیا سوچ رہے تھے تم میرے بارے میں؟'' آخری جملہ کہتے ہوئے اُس کے لہجے نے عجیب انداز اختیار کر لیا تھا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ.....'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے رُک رُک کر کہا۔ ''میری طرح تمہارا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ تم اپنی زندگی کس کے سہارے گزارو گی؟''

''میں ایسا نہیں سمجھتی.....'' انگوری نے جواب دیا۔ ''میرا مطلب ہے میں اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھتی۔ کیا وادی میں رہنے والے میرے نہیں ہیں؟ کیا تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟ ویسے اب میرے ہاتھوں میں رائفل آ گئی ہے۔ یہ رائفل میرا ساتھ دے گی اور تم..... تم میرے ساتھ ہو تو

مجھے کس بات کی پرواہ ہو سکتی ہے؟''

''کک..... کیا؟'' میں ایک بار پھر بدحواس ہو گیا۔ میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک پھیل گئی۔ ''کیا واقعی تم ایسا سمجھتی ہو کہ.....''

''کیوں نہیں.....'' انگوری کی آنکھوں میں شوخی تیر گئی۔ ''کیا ہم دونوں ساتھ نہیں رہ سکتے؟ ہمارے ساتھ نوری اور عبداللہ بھی ہوں گے۔ ہم چاروں بھارتی غاصبوں کے لئے قیامت بن جائیں گے..... اُنہیں یہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیں گے۔''

میرے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ میں اُس کے بارے میں نجانے کیا سوچ رہا تھا اور اُس کی سوچ کا انداز مجھ سے مختلف تھا۔

دو دن اور گزر گئے۔ اس دوران انگوری سے بار بار میرا آمنا سامنا ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اُس کے قریب رہنا چاہتا تھا، اُسے دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔ اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بھی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہتی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں پڑے پڑے ہماری صلاحیتوں کو زنگ لگ رہا ہے۔'' ایک روز اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہئے..... یہاں کھیتی باڑی شروع کر دی جائے؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''میرا خیال ہے کہ صبح سویرے اس طرف والی سڑک پر ایک چھوٹی سی کارروائی کر کے بھارتیوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلا دینا چاہئے۔'' انگوری نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہاں میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ پتن سے بارہ مولا کی طرف جانے والی سڑک اُن پہاڑوں کے اُوپر سے گھومتی ہوئی جاتی ہے۔ اس طرح سڑک کا ایک حصہ مشرق کی طرف اور دوسرا دوسری طرف تھا۔ درمیان میں یہ جگہ تھی جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔

مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ نوری، عبداللہ اور حسن کو بھی آگاہ کر دیا گیا۔ اور پھر رات ایک بجے کے قریب ہم بابا عبدالفتح کی دُعاؤں کے سائے میں رُخصت ہو گئے۔ اُس طرف سے وہ سڑک چار کوس کے لگ بھگ تھی۔ مگر راستہ نہایت دُشوار گزار اور خطرناک تھا۔ یہ غنیمت تھی کہ آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور مدھم سی چاندنی میں راستہ طے کرنے میں ہمیں کوئی دُشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

ایک جگہ میں رُک گیا۔ ہمارے سامنے تقریباً بیس فٹ چوڑا نالہ بہہ رہا تھا۔ وہ نالہ اگرچہ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ شفاف پانی کی تہہ میں پتھر صاف نظر آ رہے تھے۔ پانی زیادہ سے زیادہ ہماری پنڈلیوں تک آتا تھا لیکن پانی کا بہاؤ اس قدر تیز تھا کہ قدم جمانا مشکل ہو جاتا۔

''اس طرف آؤ..... مجھے راستہ معلوم ہے۔'' انگوری نے ایک طرف اشارہ کیا۔ تقریباً سو گز

آگے پہنچے تو ایسی تیز آواز سنائی دینے لگی جیسے بلندی سے کوئی آبشار گر رہا ہو۔ اور پھر ہم نالے کے ساتھ ایک چٹان کے اُوپر سے گھوم کر پہنچے تو میں رُک گیا۔ اُس جگہ پانی کی چادر تقریباً بیس فٹ کی بلندی سے گر رہی تھی۔ نیچے ایک بہت بڑا تالاب سا بن گیا تھا جس کا پانی اُس نالے میں بہہ رہا تھا۔ بلندی سے گرنے والی پانی کی وہ چادر تقریباً دس فٹ چوڑی تھی اور جس چٹان سے وہ آبشار گر رہا تھا وہ باقی حصے سے بہت آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ اس طرح اُس آگے کو نکلی ہوئی چٹان نے ایک سائبان سا بنا دیا تھا۔ پانی کی گرتی ہوئی چادر کے پیچھے اندر کی طرف آٹھ دس فٹ کی جگہ تھی۔ وہاں کی زمین پانی کے تالاب سے دو ڈھائی فٹ اُونچی تھی۔

لگتا تھا انگوری اور اُس کے ساتھیوں نے ہمارے آنے سے پہلے تین چار روز میں یہ علاقہ اچھی طرح چھان ڈالا تھا۔ انگوری مجھے اشارہ کرتی ہوئی آبشار کے پیچھے اُس سائبان کے نیچے گھس گئی۔ اُس پتھریلی جگہ پر خاصی پھسلن ہو رہی تھی۔ ایک مرتبہ تو میں گرتے گرتے بچا تھا۔ آبشار کا پانی بارش کی پھوار کی طرح اندر بھی آ رہا تھا۔ دوسری طرف پہنچتے پہنچتے میرے کپڑے گیلے ہو چکے تھے۔

ہم ایک بار پھر بلندی طے کرنے لگے، اور پھر اس سے آگے ہم مسلسل ڈھلان پر اُترتے رہے۔ پتھروں، چٹانوں اور گڑھوں نے جگہ جگہ راستہ روک رکھا تھا اور دُشواریاں پیدا کر رکھی تھیں..... بالآخر مزید ایک گھنٹے بعد ہم رُک گئے۔ ہمارے سانس بری طرح پھول گئے تھے۔ چند منٹ اپنی حالت پر قابو پانے میں گزر گئے۔

وہ رات کا آخری پہر تھا اور غالباً ساڑھے تین بجے کا وقت تھا۔ ہمیں یہاں تک پہنچنے میں ڈھائی گھنٹے لگے تھے۔ جس جگہ ہم رُکے تھے وہاں جا بجا بڑے بڑے چٹانی پتھر پھیلے ہوئے تھے اور قد آدم جھاڑیاں تھیں۔ اس سے آگے بالکل عمودی ڈھلان تھی۔ اور اس ڈھلان کے اختتام پر تقریباً تیس گز آگے سڑک تھی۔ سڑک کے دوسری طرف ایک ہموار سی میدان نما وادی تھی جو نشیب اختیار کرتی ہوئی دُور تک چلی گئی تھی۔

''میرے خیال میں یہ جگہ مناسب رہے گی۔'' انگوری نے ایک جگہ پتھروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے تنقیدی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ دونوں طرف دُور تک سڑک نظر آ رہی تھی۔ ہم کسی بھی طرف سے آنے والی ہر گاڑی کو دیکھ سکتے تھے۔ لیکن پتھروں اور جھاڑیوں کی وجہ سے ہم کسی کی نگاہوں میں نہیں آ سکتے تھے۔ انگوری نے واقعی بہترین جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ اور پھر یہاں سے میں نے کمان سنبھال لی۔ ظاہر ہے ہم چاروں ایک ہی جگہ پر نہیں رہ سکتے تھے۔ میں نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف جگہوں کا انتخاب کر کے ہر ایک کو سمجھا دیا کہ کس کو کس جگہ پوزیشن سنبھالنی ہے۔ ہر پوزیشن سے سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔

چاند آسمان سے غائب ہو چکا تھا۔ رات کے آخری پہر کے اندھیرے نے فضا کو اپنی لپیٹ

میں لے لیا۔ اس کھلی جگہ پر تیز ہوا میں بڑی کاٹ تھی۔ ہم سب ٹھنڈی ہوا کے براہِ راست ٹکراؤ سے بچنے کے لئے ایک چٹان نما پتھر کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں انگوری تھی اُس کے ساتھ نوری جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر عبداللہ اور پھر میں۔ حسن میرے بائیں طرف تھا۔ ہم مدھم لہجے میں باتیں کر رہے تھے اور ظاہر ہے اس وقت ہمارا موضوع موسم کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ وقت بہت مدھم رفتار سے گزر رہا تھا۔

بالآخر رات کا اندھیرا رُخصت ہونے لگا۔ اس کی جگہ بہت مدھم سا اُجالا پھیل رہا تھا جو بتدریج واضح ہوتا چلا گیا۔ اب دُور دُور تک کی چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

''اب اپنی اپنی پوزیشن پر پہنچ جاؤ!'' میں نے اپنی سب مشین گن سنبھالتے ہوئے کہا۔

وہ چاروں بھی اُٹھ گئے۔ ہم سب کے پاس سب مشین گنوں کے علاوہ چار چار فاضل میگزین بھی تھے۔ ہینڈ گرنیڈ صرف دو تھے ایک حسن کے پاس اور دوسرا عبداللہ کے پاس۔

ہم تقریباً ڈیڑھ سو گز کے ایریا میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس طرح دشمن کو یہ تاثر ملتا کہ حملہ آور زیادہ تعداد میں ہیں۔ دائیں طرف سب سے آخر میں حسن تھا، اس کے بعد میں، مجھ سے آگے انگوری اور نوری اور بائیں طرف عبداللہ سب سے آخر میں تھا۔

ہم اپنی اپنی جگہ پر پوزیشن لے کر بیٹھے رہے۔ میری نظریں سڑک پر اور کان کوئی آواز سننے کے منتظر تھے۔ وقت گزرتا رہا لیکن سڑک سنسان رہی اور کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

سورج طلوع ہو رہا تھا جب کسی بھاری گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دینے لگی..... ہوا کے دوش پر یہ آواز کبھی بہت قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتی اور کبھی بہت دُور سے۔ ہم سب اپنی اپنی سب مشین گنیں سنبھال کر ہوشیار ہو گئے۔ اور پھر دو منٹ بعد وہ گاڑی ہماری نظروں کے سامنے آ گئی..... وہ پتن سے بارہ مولا کی طرف جانے والی بس تھی۔ میں نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دیا کہ بس پر فائرنگ نہ کی جائے۔

وہ بس ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ اور پھر اس کے فوراً ہی بعد پتن ہی کی طرف سے آتی ہوئی ایک فوجی جیپ دکھائی دی۔ اُس کے پیچھے دو ٹرک تھے۔

''ہوشیار.....!'' میں نے چیخ کر کہا اور خود بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ جیپ اور ٹرکوں کی رفتار خاصی تیز تھی۔ جیپ پر بھی ایک مشین گن نصب تھی اور گنر گن پر ہاتھ رکھے مستعد کھڑا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ایک آفیسر اور پچھلی سیٹوں پر چار فوجی تھے جن کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں اور اُن سب کا رُخ پہاڑیوں کی طرف تھا۔ پچھلے دو ٹرکوں کی صورتحال بھی ایسی ہی تھی۔ اُن پر لگی ہوئی ہیوی مشین گنوں کا رُخ بھی پہاڑیوں ہی کی طرف تھا۔

وہ جیسے ہی زد میں آئے میں چیخ اُٹھا۔

''فائر.....!''

اور پھر خاموش اور پرسکون فضا سب مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھی۔ میں

نے جیپ کو آگے نکلنے دیا تھا اور درمیان والے ٹرک کو نشانہ بنایا تھا۔

آگے نکل جانے والی جیپ کو نوری اور انگوری نے نشانہ بنایا۔ ان میں سے کسی کی گولی جیپ کے ڈرائیور کو لگی۔ جیپ لڑکھڑاتی ہوئی سڑک سے اُتر کر بڑی تیزی سے نشیب کی طرف لڑھکنے لگی۔ جیپ سے مشین گن کا ایک برسٹ مارا گیا تھا۔ عبداللہ کی گولیاں جیپ کا تعاقب کر رہی تھیں۔ آفیسر نے جیپ سے چھلانگ لگا دی وہ جھاڑیوں میں ایک طرف دوڑ رہا تھا مگر عبداللہ کی گولیوں نے اُسے ڈھیر کر دیا۔ عبداللہ کا نشانہ واقعی بہت اچھا تھا۔

اب ہمارا نشانہ وہ دونوں ٹرک تھے۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی آگے والے ٹرک کے ڈرائیور نے بدحواس ہو کر پوری قوت سے بریک دبا دیا تھا۔ ٹرک ٹائروں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ آڑھا ترچھا ہو کر رُک گیا۔ دوسرا ٹرک ڈرائیور سے بے قابو ہو کر ایک زوردار دھماکے سے اگلے ٹرک سے ٹکرا گیا۔ فوجی چیختے ہوئے ٹرکوں میں لڑھک گئے۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے مگر اس دوران کم سے کم تین فوجی ہماری گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔

ایک فوجی کو مشین گن سنبھالنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے فائر کھول دیا مگر ہماری پوزیشن ایسی تھی کہ مشین گن کی گولیاں ہمارا کچھ بگاڑے بغیر ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر گئیں۔

عبداللہ نے ہینڈ گرنیڈ کی پن کھینچ کر اُسے ٹرکوں کی طرف اُچھال دیا۔ مگر وہ دستی بم ٹرکوں سے کچھ فاصلے پر گرا۔ چند اور فوجی سنبھل چکے تھے اور سب مشین گنوں سے اندھا دُھند فائرنگ کر رہے تھے۔

فائرنگ میں مزید شدت آئی تو حسن نے دستی بم اُچھال دیا۔ یہ بم آگے والے ٹرک کے اندر گرا۔ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ بہت سی چیخیں سنائی دیں۔ ٹرک کے ساتھ اُس میں موجود فوجیوں کے بھی پرخچے اُڑ گئے تھے۔ دوسرے ٹرک کے بچے ہوئے فوجی اندھا دُھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ہمارے سامنے چونکہ بالکل عمودی ڈھلان تھی اور سڑک نیچے تھی اس لئے نہ اُن فوجیوں کی گولیاں ہمارا کچھ بگاڑ رہی تھیں اور نہ ہی ہماری گولیاں اُن کا کچھ بگاڑ سکتی تھیں۔

حسن اپنی پوزیشن سے اُٹھ کر دوڑتا ہوا آگے نکل گیا تاکہ ڈھلان کے کنارے پر پہنچ کر نیچے سڑک پر فوجیوں کو نشانہ بنا سکے۔ میں نے چیخ کر اُسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ فائرنگ کرتا ہوا دوڑتا چلا گیا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ سامنے سے چلائی جانے والی کئی گولیاں اُس کے سینے میں لگیں..... وہ چیختا ہوا گرا اور ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کی طرف دوڑا لیکن پھر ایک جھٹکے سے رُک گیا۔ گولیوں سے چھلنی حسن ڈھلان کے کنارے پر پہنچ چکا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ عمودی ڈھلان کے دوسری طرف گر کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

اور پھر پتن ہی کی طرف سے دو اور فوجی ٹرکوں کو دیکھ کر میں اُچھل پڑا..... وہ ٹرک ابھی بہت دُور تھے۔ میں نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو خطرے سے آگاہ کیا اور دوسرے ہی لمحے ہم بھاگ کھڑے ہوئے.....

عبداللہ اور نوری ہم سے آگے تھے۔ انگوری میرے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں میں بار بار اُس کے پیر رپٹ رہے تھے۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دوڑتے رہے۔ مجھے یقین تھا کہ تازہ دم فوجی ہمارا تعاقب شروع کر دیں گے اور پہاڑیوں میں ہمیں گھیرنے کی کوشش کریں گے لیکن وہ ٹرک ابھی کافی دُور تھے اور مجھے اطمینان تھا کہ ہم اُن کے آنے سے پہلے کافی دُور نکل جائیں گے۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ہمارے سانس پھول گئے تھے مگر ہم رُک نہیں سکتے تھے۔ ہم اُس جگہ سے اگرچہ کافی دُور نکل آئے تھے مگر وہاں فائرنگ کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

ہم بہت دُور نکل آئے..... اب فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ انگوری دوڑتے دوڑتے ایک بار پھر گر گئی۔ اُس کے گھٹنے پر پتھروں سے رگڑ لگ گئی تھی اور وہ کافی تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ مگر میں اُس کا ہاتھ پکڑے دوڑتا رہا۔ ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں ہوئے تھے۔

نوری اور عبداللہ اب بھی ہم سے آگے تھے۔ اور پھر نوری بھی دوڑتے دوڑتے گر گئی۔ عبداللہ جھک کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم بھی اُن کے قریب رُک گئے۔ انگوری نے رائفل پھینک دی اور دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ اُس کے منہ سے کف جاری تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ نوری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھی۔ عبداللہ بھی نوری کے پاس بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ میں بھی انگوری کے قریب ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں زندگی میں اتنا تیز کبھی نہیں دوڑا تھا۔ لیکن جب موت بھیانک رُوپ میں تعاقب میں لگی ہوئی ہو تو جسم کی تمام تر قوتیں ٹانگوں میں سمٹ آتی ہیں۔ ہم خطرے سے ابھی زیادہ دُور نہیں ہوئے تھے۔ صرف پانچ چھ منٹ وہاں رُکے اور پھر دوڑنے لگے۔ گھٹنے کی تکلیف سے انگوری کو دوڑنے میں خاصی تکلیف ہو رہی تھی لیکن وہ بڑی باہمت لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ میرے ساتھ قدم ملا کر دوڑتی رہی۔

بالآخر ہم اُس آبشار کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت تک ہم پھر ہانپنے لگے تھے۔ انگوری اور نوری ندی کے کنارے پر گر گئیں۔ میں اور عبداللہ بھی قریب بیٹھ کر ہانپنے لگے۔

جب سانس کی رفتار کسی حد تک نارمل ہوئی تو میں ندی کے کنارے پر سینے کے بل لیٹ کر کسی جانور ہی کی طرح پانی پینے لگا۔ ٹھنڈے اور شیریں پانی کے چند گھونٹ بھرنے کے بعد ہی میرے حواس بحال ہونے لگے تھے۔ ان تینوں نے بھی پانی پیا اور وہیں بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ نوری اور عبداللہ ہم سے کچھ دُور تھے۔ انگوری گھٹنے کے قریب اپنی ٹانگ دبا رہی تھی۔ پھر اُس نے ڈھیلا ڈھالا کرتا اُوپر کھینچ لیا اور شلوار کا پائنچہ آہستہ آہستہ اُوپر کھینچنے لگی۔ اُس کے

گھٹنے پر کھال چھل گئی تھی۔ خون تو نہیں نکلا تھا مگر وہ جگہ سرخ ہو گئی تھی۔ میری نظریں اُس کے زخمی گھٹنے کو نہیں اُس کی سڈول گلابی پنڈلی کو دیکھ رہی تھیں۔ میرا سانس بے قابو ہونے لگا۔

انگوری نے میری نگاہوں کے مرکز اور میری کیفیت کو تاڑ لیا اور جلدی سے پائنچہ نیچے کھینچ لیا۔ اُس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔ اپنا گھٹنا دیکھنے کے لئے اُس نے بے خیالی میں پائنچہ اُوپر کر لیا تھا لیکن اب شرم کے مارے اُس کے چہرے کی رنگت بدلی جا رہی تھی۔

''اب چلنا چاہئے۔'' اُس نے میری طرف سے نظریں چرا کر کہا اور رائفل سنبھال کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ہم اگرچہ خطرے کی حد سے نکل آئے ہیں مگر کوئی بھروسہ نہیں کہ وہ بھیڑیئے ہمارا تعاقب کرتے ہوئے کسی طرح یہاں بھی پہنچ جائیں۔''

آبشار کے نیچے سے گزر کر ہم تیزی سے چلتے رہے۔ راستہ اگرچہ یہاں بھی بڑا کٹھن تھا مگر ہماری رفتار میں کمی نہیں آئی۔ ایک چٹان پر سے کودتے ہوئے انگوری بے اختیار کراہ اُٹھی اور گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر دوہری ہو گئی۔

''اگر چلنے میں تکلیف ہو رہی ہو تو میں کندھے پر اُٹھا لوں؟'' میں نے اُس کے قریب رُک کر سرگوشی کی۔ اُس نے گھور کر میری طرف دیکھا مگر نظروں میں غصہ نہیں تھا۔

انگوری کی وجہ سے ہم نے رفتار کم کر دی۔ وہ لنگڑاتی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

مزید ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ نوری اور عبداللہ اُس وقت ہم سے کافی پیچھے رہ گئے تھے اور گنجان درختوں اور جھاڑیوں میں وہ نظر بھی نہیں آ رہے تھے۔ اس لئے میں نے بے تکلفی سے انگوری کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

بابا عبدالفتح عام طور پر جھونپڑے کے سامنے بیٹھا رہتا تھا مگر اس وقت وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جھونپڑے کا پردہ بھی گرا ہوا تھا۔

''بابا.....!'' انگوری نے پکارا۔ اس وقت ہم جھونپڑے سے دس گز کے فاصلے پر تھے۔ ''ہم آ گئے بابا! بڑے زور کی بھوک لگی ہے ہمیں۔''

جھونپڑے کا پردہ ہلا اور دوسرے ہی لمحے میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... جھونپڑے سے بابا عبدالفتح نہیں دو بھارتی فوجی برآمد ہوئے تھے..... اور اُن کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سب مشین گنوں نے ہمیں زد پر لے رکھا تھا.....

میرے پورے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ سینے میں سانس رُکنے لگا۔ وہ دونوں فوجی شکلوں ہی سے وحشی اور درندے لگ رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ حقیقت ہے یا کوئی خواب؟

جھونپڑے کا پردہ ایک بار پھر ہلا۔ دو فوجی اور اندر سے برآمد ہوئے۔ اُنہوں نے اپنے درمیان بابا عبدالفتح کو گرفت میں لے رکھا تھا۔

بابا عبدالفتح کی حالت دیکھ کر میں لرز اُٹھا۔ اُس کا لباس خون آلود تھا۔ داڑھی اور سر کے سفید

بال بھی خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ ناک سے بھی خون بہہ رہا تھا اور پیشانی بھی زخمی تھی جس سے بہنے والا خون چہرے کو تر کرتا ہوا گلے تک چلا گیا تھا۔

وہ دونوں فوجی جنہوں نے بابا عبدالفتح کو دونوں طرف سے بانہوں کی گرفت میں لے رکھا تھا اُن میں ایک لانس نائیک اور دوسرا لیفٹیننٹ تھا۔ لانس نائیک کی رائفل اُس کے دوسرے ہاتھ میں تھی جبکہ لیفٹیننٹ کا ریوالور اُس کے ہولسٹر میں اڑسا ہوا تھا۔ ہولسٹر کا فلیپ کھلا ہوا تھا۔

اُن دونوں نے بابا عبدالفتح کو آگے دھکیل دیا۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ اُس کی بائیں ٹانگ پنڈلی سے سوج کر کپا ہو رہی تھی۔ بابا عبدالفتح کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اُس کی ٹانگ کی ہڈی بھی توڑ دی گئی تھی۔ مگر آفرین ہے اس بوڑھے پر اُس کے منہ سے میں نے ابھی تک ایک ہلکی سی کراہ بھی نہیں سنی تھی۔ اس کے برعکس اُس کا چہرہ پُرعزم اور بوڑھی آنکھوں میں پراسراری چمک تھی۔

میں ابھی تک انگوری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ لیکن پھر اُس کا ہاتھ اس طرح میری گرفت سے چھوٹا کہ مجھے احساس تک نہیں ہو سکا..... انگوری چیختی ہوئی بابا عبدالفتح کی طرف لپکی لیکن ایک فوجی کی ٹھوکر کھا کر پیچھے پلٹ گئی۔ اُس کے منہ سے بڑی خوفناک چیخ نکلی تھی۔ فوجی نے اُس کی پسلیوں پر ایک اور ٹھوکر رسید کر دی..... وہ ایک بار پھر چیخی۔ فوجی نے تیسری ٹھوکر ماری چاہی تو لیفٹیننٹ نے اُسے روک دیا۔

''نہیں رتن لال.....'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اگر یہ مر گئی تو ہمارے کسی کام کی نہیں رہے گی۔ ذرا دیکھو تو اسے..... لگتا ہے بھگوان نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہو۔ یہ ٹھوکریں مارنے کے لئے نہیں، پیار کرنے کے لئے ہے۔''

اُس نے اپنی بیلٹ میں اڑسا ہوا خنجر نکال لیا اور انگوری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی مگر ایک فوجی نے بڑی تیزی سے آ کر رائفل کی نال میرے سینے پر رکھ کر مجھے پیچھے دھکیل دیا۔

لیفٹیننٹ انگوری کے سامنے کھڑا اُس کے چہرے کو گھور رہا تھا۔ انگوری نے اُس کے منہ پر تھوک دیا۔ لیفٹیننٹ غصے سے آگ بگولا ہو گیا..... اُس نے خنجر کی نوک انگوری کے سینے پر رکھ کر نیچے کی طرف زور سے جھٹکا دیا۔ انگوری کی چیخ سن کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ایک لمحے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو میں ایک بار پھر لرز کر رہ گیا..... انگوری کی قمیض اُوپر سے نیچے تک کٹ گئی تھی اور اُس کا سینہ برہنہ ہو رہا تھا.....

''شاید تم اپنی بہن کو بھی دوسروں کے سامنے اسی طرح ننگا کر چکے ہو۔'' انگوری نے غراتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں خوف نام کو بھی نہیں تھا۔

لیفٹیننٹ نے اُس کے سینے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ انگوری چیختی ہوئی نیچے گر گئی۔

''ابھی تو میں نے صرف تمہاری چھاتیوں کو ننگا کیا ہے۔'' لیفٹیننٹ بھیڑیئے کی طرح غراتے

ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں یہ سارا لباس تمہارے جسم سے الگ کر دُوں گا اور اس کے بعد تمہارے ساتھ جو کچھ ہوگا اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ میرے یہ آدمی کئی مہینوں سے اپنے گھروں سے دُور ہیں۔ عورت کو ترس گئے ہیں۔ تم جیسی ناری کو تو یہ لوگ چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔ لیکن.....'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم لوگوں کے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں اور کہاں چھپے ہوئے ہیں؟''

''ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں۔ اگر ہوتے تو اب تک آ چکے ہوتے۔'' انگوری نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ میں اب تک اُسے ایک کمزور سی لڑکی سمجھ رہا تھا۔ رائفل چلانا اور بات تھی اور اس طرح تشدد کا سامنا کرنا دوسری بات۔ اس نے کسی طرح اپنے آپ کو کمزور ثابت نہیں کیا تھا۔

''تم بتاؤ..... تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟'' لیفٹیننٹ میری طرف گھوم گیا۔ ''اس بڈھے کا انجام دیکھ رہے ہو۔ اس نے بھی کچھ بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ صرف ایک ہی بات پر اڑا رہا کہ یہاں اس کے سوا کوئی نہیں رہتا۔ اگر یہ ہمیں سب کچھ بتا دیتا تو اس کا یہ حشر نہ ہوتا۔ مگر بڑا سخت جان بڈھا ہے ابھی تک زندہ ہے۔ میرا خیال ہے تم ایسی مار برداشت نہیں کر سکو گے۔ جب شریر پر چوٹ پڑتی ہے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اگر تم اس تکلیف سے بچنا چاہتے ہو تو اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتا دو! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اور اس کبوتری کو زیادہ تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی۔''

میں انگوری کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں نے لیفٹیننٹ کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے ساتھ کوئی اور نہیں ہے۔ اگر کوئی ہوتا بھی تو تمہیں نہ بتاتا کہ وہ کتنے لوگ ہیں اور کہاں چھپے ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح تشدد کا نشانہ بنا کر تم ہمارے حوصلے پست کر سکو گے؟ یاد رکھو آفیسر! اس وادی کا بچہ بچہ اپنی جان تو دے سکتا ہے مگر تحریک سے غداری نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی قربانی اس وادی کو تم جیسے بھیڑیوں سے نجات دلا سکتی ہے۔''

''بڑا گھمنڈ ہے تمہیں۔'' لیفٹیننٹ غرایا۔ ''دیکھتا ہوں تم زبان کیسے نہیں کھولتے۔ ابھی فرفر بولنے لگو گے۔''

اُس نے دو فوجیوں کو اشارہ کیا۔ وہ انگوری کو بانہوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے جانے لگے۔ میں کانپ اُٹھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ میری زبان کھلوانے کے لئے کیا کرنے والے تھے؟ میں متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جب ہم اس طرف آ رہے تھے تو نوری اور عبداللہ ہم سے پیچھے رہ گئے تھے اور میرا خیال تھا کہ اُنہوں نے دُور سے ہی یہ صورتحال دیکھ لی تھی اور کہیں چھپ گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی کارروائی ضرور کریں گے۔ لیکن میں پریشان ہو رہا تھا کہ اُنہیں دیر ہو گئی تو کارروائی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

دونوں فوجی انگوری کو بانہوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہے تھے اور انگوری اپنے آپ کو چھڑانے

کی جدوجہد کر رہی تھی۔ لیفٹیننٹ ایک طرف کھڑا دلچسپ نظروں سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انگوری کی قمیض پھٹ گئی تھی جسے ایک فوجی نے کھینچ کر اُس کے بدن سے الگ کر دیا۔

میں نے ایک بار پھر اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی مگر میرے سامنے کھڑے ہوئے فوجی نے رائفل کی نالی زور سے میرے سینے پر ماری۔ میں لڑکھڑا کر گر گیا۔ اُس فوجی نے ایک پیر میرے سینے پر رکھ دیا اور رائفل کی نالی میری کھوپڑی سے لگا دی۔ اُس کی اُنگلی ٹرائیگر پر تھی۔

میری نظر زمین پر پڑے ہوئے بابا عبدالفتح کی طرف اُٹھ گئی۔ اب تک وہ بے حس و حرکت پڑا تھا لیکن اب اُس کے جسم میں حرکت پیدا ہوتے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔

لیفٹیننٹ بابا عبدالفتح کے قریب ہی اُس کی طرف پشت کئے کھڑا تھا اور بابا عبدالفتح دونوں ہاتھ زمین پر ٹکائے آہستہ آہستہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جس فوجی نے مجھے دبا رکھا تھا اُس کی پشت بھی بابا عبدالفتح کی طرف تھی۔ وہ بھی اُسے حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں کن انکھیوں سے کبھی بابا عبدالفتح کی طرف دیکھتا اور کبھی اُس فوجی کی طرف۔

''آرام سے پڑا رہ..... حرکت کی تو کھوپڑی اُڑا دُوں گا۔'' فوجی مجھے گھورتے ہوئے بھیڑیئے کی طرح غرایا۔

میں نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے بابا عبدالفتح کی طرف دیکھا۔ وہ اس پوزیشن میں آ چکا تھا جیسے چیتا اپنے شکار پر جھپٹنے کو تیار ہو۔ میں نے صرف ایک نظر انگوری کی طرف دیکھا جو اب بھی چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اُس نے ایک فوجی کو لات مار کر دُور گرا دیا تھا۔

اور اسی لمحے بابا عبدالفتح بھی چیتے ہی کی طرح اپنی جگہ سے اُچھلا..... اُس کا ہاتھ لیفٹیننٹ کے ہولسٹر پر پڑا اور جب لیفٹیننٹ اُچھل کر مُڑا تو ریوالور بابا عبدالفتح کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ خوف و دہشت سے لیفٹیننٹ کا چہرہ دُھواں ہو گیا۔ بابا عبدالفتح ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر ریوالور کا ٹرائیگر دباتا چلا گیا۔ ریوالور سے نکلنے والی گولیاں یکے بعد دیگرے لیفٹیننٹ کے پیٹ اور سینے میں پیوست ہوتی رہیں۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا مگر اُس نے خنجر بابا عبدالفتح کی طرف اُچھال دیا۔

لیفٹیننٹ کے اُچھلنے اور چیخنے کی آواز سن کر وہ فوجی بھی تیزی سے مُڑا جس نے مجھے دبا رکھا تھا۔ میری طرف سے اُس کی توجہ ایک لمحے کو ہی ہٹی تھی۔ میں نے رائفل پر ہاتھ ڈال کر اُسے ایک جھٹکے سے اپنی پیشانی سے ہٹایا اور پھر دوسرا ہاتھ بھی رائفل پر ڈال کر ایک اور زوردار جھٹکا دیا۔ وہ فوجی لڑکھڑا کر دائیں طرف گرا۔ تیسرے جھٹکے سے رائفل میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں بڑی تیزی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور رائفل کا رُخ اُس فوجی کی طرف کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ کئی گولیاں اُس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ اسی وقت درختوں کی طرف سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میں بابا عبدالفتح کی طرف لپکا لیکن میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ لیفٹیننٹ کا پھینکا ہوا خنجر اُس کے حلق میں پیوست تھا اور وہ بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔

میں نے دوڑ کر ایک درخت کی آڑ میں پوزیشن لے لی۔ پہلے میں سمجھا تھا کہ جو فوجی انگوری کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے فائرنگ اُنہوں نے کی تھی لیکن یہ فائرنگ سامنے درختوں میں چھپے ہوئے نوری اور عبداللہ کر رہے تھے۔

انگوری نے جس فوجی کو لات مار کر دُور گرایا تھا وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عبداللہ کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ دوسرا فوجی انگوری کو چھوڑ کر دوڑتا ہوا ایک درخت کی آڑ میں پوزیشن لے کر بیٹھ گیا تھا اور نوری کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔

نوری نے حماقت یہ کی کہ فائرنگ کرتے ہوئے چیختی ہوئی آگے کی طرف دوڑ پڑی جہاں انگوری پڑی ہوئی تھی۔ لیکن وہ چند قدم سے زیادہ آگے نہیں آ سکی۔ بھارتی فوجی کی ایک گولی اُس کی پیشانی پر لگی اور وہ چیختی ہوئی گری۔ عبداللہ درخت کی آڑ سے نکل کر اُس کی طرف لپکا تو وہ بھی بھارتی فوجی کی گولیوں کا نشانہ بن گیا.....

میرا دماغ گھوم رہا تھا..... آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور پھر انگوری کی چیخ سن کر میں ہوش میں آ گیا۔ وہ چیختی ہوئی میری طرف دوڑی آ رہی تھی۔ اور پھر وہ ٹھوکر کھا کر منہ کے بل جھاڑیوں میں گری۔ اس لمحے گولیوں کی ایک بوچھاڑ انگوری کے اُوپر سے گزر گئی تھی۔ اگر وہ ٹھوکر کھا کر نہ گرتی تو بھارتی فوجی کی گولیاں اُسے بھی چھلنی کر دیتیں۔

انگوری پر فائرنگ کرنے کے لئے اُس بھارتی فوجی کو درخت کی آڑ سے نکلنا پڑا تھا۔ اس طرح وہ میرے سامنے آ گیا اور میں نے فائر کھول دیا۔ بھارتی فوجی نے بھی ٹرائیگر دبایا مگر اُس کی رائفل خالی ہو چکی تھی۔ اُس نے رائفل پھینک دی اور اُٹھ کر خوفزدہ انداز میں چیختا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر زیادہ دُور نہیں جا سکا۔ میری رائفل سے نکلنے والی لاتعداد گولیاں اُس کی پشت میں پیوست ہو گئیں اور وہ اوندھے منہ ڈھیر ہو گیا۔ میں اُٹھ کر انگوری کی طرف لپکا۔ وہ بھی اُٹھ کر میری طرف دوڑی۔ وہ وحشیانہ انداز میں چیختے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بھی اُسے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ چند لمحے چیختی رہی اور پھر یکایک خاموش ہو کر میری بانہوں میں جھول گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

میں نے انگوری کو آہستگی سے نیچے لٹا دیا۔ وہ اُوپر کے دھڑ سے برہنہ تھی اور اُس کے سینے پر ایک چھوٹا سا زخم بھی تھا جس سے خون رِس رہا تھا۔ میں کچھ دیر تک متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ انگوری کی پھٹی ہوئی قمیض ایک طرف جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں نے وہ قمیض اُٹھا کر جیسے تیسے کر کے اُس کے جسم پر اس طرح ڈال دی کہ برہنگی چھپ گئی۔

میں دوڑتا ہوا عبداللہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ چند گز پرے نوری کی لاش پڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہی

ہو کہ معصوم اور بے گناہ کشمیری عوام پر ڈھایا جانے والا یہ ظلم کب ختم ہو گا؟ ظالموں کے ہاتھ کون روکے گا.....؟ مظلوموں کی دادرسی کون کرے گا؟

میں نے اُس کی آنکھیں بند کر دیں اور دوبارہ انگوری کے پاس چلا آیا تھا۔ وہ ایک جرأت مند لڑکی تھی میں نے اُس کی بہادری کا مظاہرہ دیکھا تھا۔ میں نے اُسے غاصب دشمن پر موت برساتے ہوئے دیکھا تھا۔ دشمن پر گولیاں برساتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھی تھی جو عزم و ہمت کا مظہر ہوتی ہے۔ وہ بزدل نہیں تھی لیکن اس وقت وہ خونخوار بھیڑیوں میں اس طرح گھر گئی تھی کہ اُس کے حواس جواب دے گئے تھے۔ اُس نے آخری دم تک اُن بھیڑیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اپنی آبرو بچانے کے لئے وہ ہوش و حواس کی آخری حد تک مزاحمت کرتی رہی تھی اور جب وہ میری طرف دوڑی تو اُس کے حواس جواب دے گئے تھے اور وہ مجھ سے لپٹ کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

میں گھٹنوں کے بل انگوری کے پاس جھک گیا اور اُس کے گال تھپتھپا کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا لیکن کامیابی نہ ہوئی تو دوڑ کر ندی پر پہنچ گیا۔ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھرا اور انگوری کے قریب پہنچ کر پانی اُس کے منہ میں ٹپکانے لگا۔ کچھ چھینٹے اُس کے چہرے پر بھی ڈالے۔ مجھے دوسری مرتبہ پھر چلو میں پانی لانا پڑا۔

اس مرتبہ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ وہ پہلے تو کسمسائی، پھر آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے متوحش سی نگاہوں سے میرے چہرے کو تکتی رہی۔ پھر اُسے سب کچھ یاد آ گیا اور وہ اُچھل کر چیختی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ جھٹکے سے جب اُٹھی تو قمیض اُس کے جسم پر سے ہٹ گئی تھی لیکن اُسے ابھی اپنی برہنگی کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔

صورتحال نہایت سنگین ہونے کے باوجود میں اس سے چشم پوشی نہ کر سکا۔ اُس روز جب میں نے پہلی مرتبہ انگوری کے گھر میں اُسے دیکھا تھا تو قمیض کے نیچے اُبھاروں کو دیکھ کر میرا دل عجیب طرح سے مچلا تھا اور میں جتنی دیر وہاں رہا تھا کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ پھر میں گلمرگ چلا گیا۔ میں کئی روز اُس سے دُور رہا لیکن اُس کی تصویر ایک لمحے کو بھی میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ اور جب وہ دوبارہ ملی تو بھی میں اُسے دیکھتا رہتا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی واپس آتے ہوئے وہ ایک مرتبہ پیر رپٹ جانے سے گر گئی تھی اور میں اُسے اُٹھانے کے لئے جھکا تھا تو میری نظریں اُس کے گریبان کے اندر تک رینگ گئی تھیں اور میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی سنسنی محسوس کرنے لگا تھا..... اور اب وہ برہنہ حالت میں مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ اُس کی برہنہ پشت پر تھے لیکن میرے اندر نہ تو کسی جذبے نے سرکشی کی تھی اور نہ ہی خون کی گردش میں تیزی آئی تھی۔ البتہ زندگی کے جس سنسنی خیز اور خوفناک ترین تجربے سے اس وقت ہم گزرے تھے اُس سے میرے دماغ میں بھی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

انگوری میرے ساتھ لپٹی سسکیاں بھر رہی تھی۔ زندگی کے اس خوفناک تجربے نے اُس پر

زیادہ اثر کیا تھا۔ وہ خونخوار بھیڑیوں کی ہوس اور موت کا شکار ہوتے ہوتے بچی تھی۔

''ہوش میں آؤ انگوری.....'' میں نے اُس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''سب کچھ ختم ہو گیا۔ اب اپنے آپ کو سنبھالو! ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔''

اُس نے اب بھی مجھے بانہوں کے حلقے میں کس رکھا تھا۔ وہ گرفت ڈھیلی کر کے ذرا سا پیچھے ہٹی تو اُسے اپنی برہنگی کا احساس ہو گیا۔ وہ چیختی ہوئی اُچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں ہاتھ پیٹ پر لپیٹ لئے اور متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اُس کی پھٹی ہوئی قمیض قریب ہی پڑی تھی۔ میں نے قمیض اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

''اسے تم پہن نہیں سکتیں۔ فی الحال ایسے ہی لپیٹ لو!'' میں اُٹھ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ انگوری نے وہ پھٹی ہوئی قمیض کس طرح اپنی برہنگی چھپانے کے لئے جسم پر لپیٹی تھی میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ البتہ دو تین منٹ بعد وہ میرے قریب کھڑی تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے نظریں جھکا لیں اور جسم چھپانے لگی۔ وہ برہنگی پوری طرح نہیں چھپا سکی تھی۔

○○○

آنسو اُس کے رُخساروں کو تر کر رہے تھے۔

''یہ..... یہ کیا ہو گیا شمروز؟'' اُس نے سسکی بھرتے ہوئے اپنا سر میرے سینے پر ٹکا دیا۔

''حوصلہ رکھو انگوری! تم تو بہت باہمت لڑکی ہو۔'' میں نے اُس کا کندھا تھپتھپایا۔ ''پہلے ہمیں ان لاشوں کا بندوبست کرنا ہو گا۔ اس کے بعد کوئی اور بات کریں گے۔'' وہ جیسے ہی پیچھے ہٹی تو کپڑا پھر اُس کے بدن پر سے سرک گیا۔ میں رُخ بدل کر کھڑا ہو گیا اور اپنا کرتہ اُتار کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ''فی الحال یہ پہن لو! بعد میں دیکھیں گے کہ بابا کے جھونپڑے سے تن ڈھانپنے کی کوئی چیز مل جائے۔''

اُس نے میرے ہاتھ سے کرتہ لے لیا اور تین منٹ بعد کرتا پہن کر سامنے آ گئی۔ اُس کے سینے پر معمولی سا زخم تھا جس سے خون رِس رہا تھا۔ میرا خیال ہے جب وہ بھارتی فوجیوں سے نبرد آزما تھی تو یہ زخم اُس وقت لگا ہو گا یا جب وہ گری تھی تو کوئی نوک دار پتھر لگ گیا ہو گا۔ اور جب وہ مجھ سے لپٹی تھی تو خون کا معمولی سا دھبہ میرے کرتے پر بھی لگ گیا تھا اور میرا کرتا پہن لینے کے بعد تو وہ سرخ دھبہ کچھ پھیل بھی گیا تھا لیکن انگوری کو ابھی تک شاید چوٹ کی تکلیف کا احساس نہیں ہوا تھا۔

ہم دونوں نوری اور عبداللہ کی لاشیں اُٹھا کر جھونپڑے کے قریب لے آئے اور اُنہیں بھی بابا عبدالفتح کی لاش کے قریب لٹا دیا۔ بھارتی فوجیوں کی لاشیں اُٹھا کر وہاں سے دُور ڈال دیں۔ میں نے تمام رائفلیں بھی ایک جگہ جمع کر لی تھیں۔

اب سب سے بڑا مسئلہ ان لاشوں کی تدفین کا تھا۔ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے قبر کھودی جاتی۔ اگر کوئی چیز ہوتی بھی تو پتھریلی زمین پر قبر کھودنا ممکن نہیں تھا۔

میں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ چشمے کے دوسری طرف چند گز آگے ایک گڑھا نظر آ گیا۔ میں نے انگوری کو بھی وہیں بلا لیا اور اُس گڑھے کے بارے میں مشورہ کرنے لگا۔ پھر میں گڑھے میں اُتر کر نیچے پتھر صاف کرنے لگا۔

گڑھا کافی بڑا تھا۔ نوری کی لاش کو ایک نمدے میں لپیٹ کر ایک کونے میں ڈال دیا گیا۔ اُس کے ساتھ عبداللہ کی لاش کو بھی ایک چادر میں لپیٹ کر لٹا دیا گیا۔ دوسری طرف بابا عبدالفتح کی لاش کو بھی چادر ہی میں لپیٹ کر ڈال دیا گیا۔ درختوں کی موٹی موٹی شاخوں سے گڑھے کو ڈھانپ کر اُوپر پتھر رکھ دیئے تاکہ جنگلی جانور انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔

اور پھر میرے ساتھ انگوری نے بھی دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے۔ دُعا مانگتے ہوئے اُس کی ہچکی
جاری تھیں۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔

اس کے آدھے گھنٹے بعد ہم جھونپڑے کے سامنے چٹائی پر بیٹھے صورتحال کا جائزہ لے رہے
تھے۔ شروع میں جب ہمیں گھیرا گیا تھا تو میں سمجھا تھا کہ ان فوجیوں کے اور ساتھی بھی ہو
گے۔ لیکن میرا یہ خدشہ بے بنیاد نکلا۔ صرف وہی چاروں تھے جو مہم سر کرنے نکلے تھے۔

''یہ بھارتی فوجی زیادہ تعداد میں بھی پہاڑوں کے اندر تک نہیں جاتے۔ حیرت ہے صرف
یہ چاروں یہاں تک کیسے آ گئے تھے؟'' انگوری نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بابا عبدالفتح بہت عرصہ سے یہاں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ایک مجاہد کی حیثیت سے اس نے
ماضی میں بھارتیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا..... وہ وادی کشمیر میں بھارتیوں کو سب
سے زیادہ مطلوب تھا۔ ہوسکتا ہے کسی نے اُس کی مخبری کر دی ہو۔ بھارتی فوج کی ہائی کمان
اور سرینگر کی کٹھ پتلی حکومت نے اُس کے سر کی لاکھوں روپے قیمت مقرر کر رکھی تھی..... ہوسکتا
ہے اس لیفٹیننٹ کو اُس کے بارے میں اطلاع ملی ہو اور وہ صرف تین آدمیوں کو لے کر بابا
عبدالفتح کو پکڑنے کے لئے یہاں آ گیا تھا تاکہ بہادری کے اس کارنامے پر سرکار سے انعام
حاصل کر سکے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' انگوری بولی۔ ''لیکن انہیں کیسے پتہ چلا کہ بابا عبدالفتح کے علاوہ یہاں
کوئی اور بھی موجود ہے؟''

''یہاں بہت سی ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں ایک
سے زیادہ افراد رہائش پذیر ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ صرف بابا عبدالفتح کو پکڑنے کے
لئے آئے ہوں گے لیکن یہاں پہنچ کر انہیں اندازہ ہوا ہوگا کہ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ بابا عبدالفتح
نے بے پناہ تشدد برداشت کر لیا لیکن ہمارے بارے میں زبان نہیں کھولی۔ اور پھر اتفاق سے
اس وقت ہم بھی پہنچ گئے اور ہماری آوازیں سن کر وہ جھونپڑے میں چھپ گئے اور اس طرح
اُن کے گھیرے میں آ گئے۔''

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بابا عبدالفتح کے بارے میں مخبری کس نے کی ہوگی؟ اس بستی
کے تو سب لوگ..... اوہ.....'' انگوری کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

''کوئی خاص بات؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''رستم..... مجھے اُس پر شبہ ہے۔'' انگوری نے کہا۔

''رستم کون؟'' میں نے پوچھا۔

''بستی کا ایک دُکاندار ہے۔'' انگوری نے جواب دیا۔ ''بابا عبدالفتح نے ایک روز بتایا تھا کہ
رستم تقریباً چار مہینے پہلے بستی میں آیا تھا۔ وہ زخمی تھا اور بہت بری حالت میں تھا۔ اُس کی کہانی
اُس کی حالت سے بھی زیادہ دردناک تھی۔'' انگوری چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری
رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بابا عبدالفتح کے کہنے کے مطابق سرینگر میں رستم کے ہاتھوں ایک فوجی
مارا گیا تھا۔ سرینگر کے شہری اُس روز سرینگر کی پولیس اور فوج کے مظالم کے خلاف لال چوک پر
مظاہرہ کر رہے تھے۔ پولیس نے پُرامن مظاہرین پر لاٹھی چارج کر دیا جس پر مظاہرین بھڑک
اُٹھے اور پولیس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ فوج نے پولیس کی حمایت میں مظاہرین پر گولی چلا دی۔
دو بے گناہ کشمیری شہید ہو گئے۔ مظاہرین میں رستم بھی شامل تھا۔ اور اُس کی جیب میں پستول
بھی موجود تھا۔ اُس نے گولی چلا دی جو ایک فوجی کی پیشانی میں لگی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ رستم وہاں
سے بھاگ نکلا۔ لیکن اُسی رات فوجیوں نے اُس کے گھر کو گھیرے میں لے لیا۔ رستم نے مکان کی
چھت سے فوجیوں پر پستول سے فائرنگ کر دی۔ وہ تو کسی فوجی کا کچھ نہ بگاڑ سکا البتہ فوجیوں
نے اُس کے مکان کو آگ لگا دی۔ رستم تو زخمی ہو کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اُس کی بیوی
اور دونوں بچے ہلاک ہو گئے اور مکان کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئے۔

رستم کسی نہ کسی طرح اس بستی میں پہنچ گیا۔ بستی والے اُس کی کہانی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں
رہ سکے تھے۔ وادی کا ہر دوسرا شخص بھارتیوں کے ایسے ہی ظلم و ستم کا شکار ہے۔ وہ سب حسب
توفیق ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔ بستی والوں نے رستم کی بھی مدد کی۔ اُسے رہنے کے
لئے دو کمروں کا ایک مکان دے دیا اور تھوڑے بہت پیسے جمع کر کے اُسے بستی کے چوک پر
پنساری کی دُکان کھلوا دی۔

بابا عبدالفتح بھی اُس سے مل چکا تھا اور پتہ نہیں رستم پر بابا کو کیوں شبہ ہونے لگا؟ بابا کے کہنے
کے مطابق آخری مرتبہ جب اپنی ضرورت کی چیزیں لینے کے لئے بستی گیا تو رستم کی دُکان بند
تھی۔ ایک آدمی سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ سرینگر گیا ہوا ہے۔ بابا عبدالفتح کے کہنے کے مطابق
رستم پر اُن کا شبہ کچھ اور بھی قوی ہو گیا کیونکہ اُس آدمی سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اس بستی میں
آنے کے بعد رستم تین چار مرتبہ سرینگر جا چکا ہے۔''

انگوری خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ''تم لوگوں کے آنے
سے پہلے بابا نے مجھ سے کہا تھا کہ اُسے رستم پر شبہ ہے۔ کیونکہ جس آدمی نے سرینگر میں ایک
فوجی کو قتل کیا ہو، خود اُس کے گھر اور بیوی بچوں کو جلا کر راکھ کر ڈالا گیا ہو وہ اس طرح بار بار
سرینگر کیسے جا سکتا ہے؟ بابا نے کہا تھا کہ اب وہ بستی جائے گا تو اس بارے میں تحقیقات کرے
گا لیکن.....'' وہ خاموش ہو کر سسکیاں بھرنے لگی۔

''بابا عبدالفتح کا شبہ غلط نہیں ہو سکتا۔'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''اس کا
مطلب ہے کہ اب ہمیں پہلے اس بستی ہی کا رُخ کرنا چاہئے۔ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ بابا کے
مخبری اس نے ہی کی تھی تو میں بستی کے چوک پر اُسے پھندے سے لٹکا دوں گا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اب تم اس بستی میں جاؤ گے؟'' انگوری نے اُلجھی ہوئی نظروں سے
میری طرف دیکھا۔

''ہاں.....'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''غداروں کا پتہ لگنا ضروری ہے۔ بابا عبدالفتح جیسے لوگ ہمارا سرمایہ ہیں۔ اُن کا نقصان ہمارے لئے نا قابل تلافی ہے۔ اگر مخبر کا پتہ نہ لگایا گیا تو وہ اندر ہی اندر ہماری جڑیں کاٹتا رہے گا۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''ایک زمانہ تھا جب مسلمان آدھی سے زیادہ دنیا پر حکومت کرتے تھے۔ لیکن پھر اپنوں ہی کی غداریوں کی وجہ سے اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھرتا گیا اور آج مسلمان دنیا بھر میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں اپنوں کا زیادہ ہاتھ ہے۔ اس وقت وادی میں آزادی کی تحریک زوروں پر ہے۔ مجاہدین چھاپہ مار کارروائیوں میں بھارتی فوج کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ بھارتی سورما ہمارے مجاہدین کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اب وہ وہی ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ غداروں کے ذریعے ہمارے کاز کو نقصان پہنچانے اور ہمارے حوصلے پست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان غداروں کو اُن کے انجام تک پہنچانا ضروری ہے۔ اگر انہیں چھوٹ مل گئی تو مجاہدین کو جگہ جگہ بھاری جانی نقصان پہنچے گا اور ہماری تحریک دم توڑ دے گی۔ ہمیں آج ہی بستی پہنچنا ہوگا۔''

''لیکن اگر رستم بے قصور نکلا تو؟'' انگوری بولی۔

''بابا عبدالفتح تجربہ کار مجاہد تھا۔ اُس کی زندگی جہاد کرتے ہوئے گزری ہے۔ اگر اُسے رستم پر غداری کا شبہ تھا تو یہ غلط نہیں ہو سکتا۔ لیکن بالفرض.....'' میں نے انگوری کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن بالفرض رستم پر شبہ غلط نکلا اور وہ بے قصور ثابت ہوا تو بھی ہم اُس غدار کو تلاش کریں گے۔ یہ صرف کسی مخبری ہی کا نتیجہ ہے کہ صرف چار فوجی بابا کو پکڑنے کے لئے یہاں آئے تھے۔ اگر اُنہیں یہاں مجاہدین کے کسی ٹھکانے کا شبہ ہوتا تو صرف چار فوجی نہ آتے، پوری پلٹن آتی۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' انگوری بولی۔ ''ابھی چلیں؟''

''ابھی نہیں.....'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم یہاں سے اس طرح روانہ ہوں گے کہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد بستی میں داخل ہوں۔ ویسے وہ کون شخص تھا جس نے بابا کو رستم کے سرینگر آنے جانے کے بارے میں بتایا تھا؟''

''بابا نے اُس کا نام ولی محمد بتایا تھا..... وہ بستی میں بڑھئی کا کام کرتا ہے۔'' انگوری نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم بابا کی ساری چیزیں احتیاط سے سمیٹ کر رکھ دو! ہو سکتا ہے ہمارے بعد مجاہدین کی کوئی پارٹی اس طرف نکل آئے تو یہ سب کچھ اُن کے کام آ جائے۔ ویسے تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟''

''ہاں کہو!'' انگوری سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''بابا عبدالفتح تو اب اس دنیا سے رُخصت ہو گیا۔ اس کی یہ چیزیں میرا مطلب ہے اگر ہم

اس کے دو کرتے لے لیں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

انگوری چند لمحے خاموش رہی، پھر افسردہ سی آواز میں بولی۔ ''میرا خیال ہے یہ چوری نہیں ہوگی۔ ویسے ایک روز مجھے اپنے کپڑے دھونے تھے۔ میں نے پہننے کے لئے بابا سے ایک کرتہ مانگا تو اُنہوں نے کہا کہ سب کچھ تم ہی لوگوں کا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف استعمال کرلو، پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر ہم بابا کے کپڑے استعمال کر لیں تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ویسے بھی میں اُن کے ٹرنک سے مرہم کی ڈبیہ نکالنا چاہتی ہوں۔ میں جب اس درندے سے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگی تھی تو گرنے سے کوئی نوک دار پتھر چبھ گیا تھا۔ زخم تو معمولی سا ہے مگر اب تکلیف ہو رہی ہے۔''

میں انگوری کی برداشت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اتنی دیر خاموش رہی تھی اور اب اُس نے اپنی تکلیف کا اظہار کر ہی دیا تھا۔

ہم دونوں اُٹھ کر ٹرنک کے قریب گئے جو جھونپڑے کے ایک کونے میں پڑا ہوا تھا۔ انگوری نے لرزتے ہاتھوں سے وہ پرانا سا ٹرنک کھولا۔ اُس میں تین چار جوڑے دُھلے ہوئے رکھے تھے۔ انگوری نے ایک جوڑا مجھے دے دیا۔ نیلے رنگ کی قمیض اور اُس سے ذرا ہلکے رنگ کی شلوار۔ قمیض کندھوں اور پشت پر سے گھسی ہوئی تھی۔

''تم بھی زخم پر مرہم لگا کر کپڑے بدل لو! میں باہر جا رہا ہوں چشمے پر..... پانی میں ایک حصہ لگا لوں گا تو دماغ کی تپش بھی کم ہوگی۔'' میں نے کہا اور کپڑے لے کر جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ میں نے ایک سب مشین گن بھی اُٹھا لی اور وہاں سے تقریباً پندرہ گز دُور چشمے پر پہنچ گیا۔ گن کنارے پر رکھی، اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کپڑے اُتارے اور پانی میں کود گیا۔

پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ ایک لمحہ کو تو کپکپی سی چھڑ گئی۔ میں نے پانی میں بیٹھ کر جسم کو ملا، دو تین غوطے لگائے اور باہر آ گیا۔ کپڑے پہن کر جب میں واپس آیا تو انگوری جھونپڑے کے سامنے کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے..... تم نے کپڑے نہیں بدلے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بھی نہانا چاہتی ہوں..... اب تم یہاں بیٹھ جاؤ اور میں.....''

''تم زخمی ہو۔ پانی پڑنے سے.....'' میں نے انگوری کی بات کاٹی تھی اُس نے میری بات کاٹ دی۔

''کچھ نہیں ہوتا۔'' وہ بولی۔ ''ان درندوں کے غلیظ ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے مجھے کراہت محسوس ہو رہی ہے۔ اور ہاں۔'' وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''بابا کا خیال تھا کہ ہم دن کی روشنی پھیلتے ہی آ جائیں گے اور ہمیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ اُنہوں نے ہمارے لئے چاول پکا رکھے تھے۔ پتیلی جھونپڑے کے پیچھے چولہے کے قریب رکھی ہوئی ہے۔''

''ٹھیک ہے..... تم آؤ تو کچھ کھا لیں گے۔ بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

میں گن سنبھالے جھونپڑے کے سامنے بیٹھا رہا۔ میری نظر بار بار چشمے کی طرف اُٹھ رہی تھی اور میں اپنے آپ کو اس حرکت پر سرزنش بھی کر رہا تھا۔ چشمہ بلندی پر تھا اور اُس کے کنارے پر بیٹھے ہوئے کسی شخص کو بھی یہاں سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا مگر میرے خیال میں اس طرح دیکھنا بھی غیر اخلاقی حرکت تھی اور اس غیر اخلاقی حرکت سے بچنے کے لئے میں رُخ بدل کر بیٹھ گیا۔

انگوری تقریباً آدھے گھنٹے بعد آئی تھی۔ اُس نے بابا عبدالفتح کے ٹرنک سے نکالا ہوا جوڑا پہن رکھا تھا۔ میرون رنگ کی شلوار اور اُسی رنگ کا لمبا سا کرتا جس کا گلا خاصا فراخ تھا۔ انگوری نے اگرچہ بال جوڑے کی طرح باندھ لئے تھے مگر اُن سے نچڑنے والا پانی گردن پر بہتا ہوا کرتے میں جذب ہو رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں مرہم کی وہ ڈبیہ تھی جو اُس نے بابا کے سوٹ کیس میں سے نکالی تھی۔

''یہ مرہم بہت اثر انگیز ہے۔'' وہ ڈبیہ دکھاتے ہوئے بولی۔ ''عبداللہ کی ٹانگ پر چوٹ لگی تھی تو بابا نے یہی مرہم لگایا تھا۔ وہ دو دن میں ٹھیک ہو گیا تھا۔''

اُس نے ڈبیہ کرتے کے پہلو کی جیب میں رکھ لی اور جھونپڑے کے پیچھے جا کر پتیلی اُٹھا لائی۔ پتیلی اُوپر تک چاولوں سے بھری ہوئی تھی اور پانچ چھ آدمی پیٹ بھر کے کھا سکتے تھے۔

اس وقت شاید بارہ بج رہے ہوں گے۔ سورج عین سر پر چمک رہا تھا۔ بھوک سے واقعی بری حالت ہو رہی تھی۔ انگوری نے ایک ہی پلیٹ میں چاول نکالے تھے۔ وہ پلیٹ ہم دونوں کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی۔ انگوری اُنگلیوں میں چاول اُٹھاتی، نوالہ منہ میں رکھنے کے لئے ذرا سا آگے کو جھکتی تو میری گستاخ نظریں اُس کے فراخ گریبان کے اندر تک رینگ جاتیں..... اس وقت میں بھول گیا تھا کہ ہم کس قسم کی صورتحال سے دوچار ہیں۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اور کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔

''کیا بات ہے..... چاول کیوں نہیں کھا رہے؟''

انگوری کی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ ''اوہ..... کچھ نہیں.....'' میں نے کہا اور اُس کے سامنے سے پلیٹ اُٹھا کر وہاں سے دُور ہٹ گیا۔ ''تم پتیلی میں ہی کھا لو۔ میں تمہارے سامنے بیٹھ کر نہیں کھا سکتا۔'' میری بات کا مطلب سمجھ کر انگوری کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ نظریں جھک گئیں اور پھر اُس نے پتیلی اپنی طرف کھینچ لی۔

کھانا کھانے کے بعد انگوری نے میرے والی پلیٹ دھو کر اور پتیلی ڈھک کر رکھ دی اور اس کے بعد ہم دونوں جھونپڑے میں گھس کر بابا عبدالفتح کی چیزیں سمیٹنے لگے۔ تمام کپڑے تہہ کر کے ٹرنک میں رکھ دیئے۔ ٹرنک میں کچھ رقم بھی موجود تھی جسے ہم نے نہیں چھوا۔ باقی چیزیں بھی ٹرنک کے قریب ہی رکھ دی گئیں۔ میں باہر سے بھارتی فوجیوں کی تمام رائفلیں بھی اُٹھا لایا۔ لیفٹیننٹ والا ریوالور میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ دو رائفلیں ہم نے اپنے لئے منتخب کر لیں۔ اُن کے میگزین چیک کئے اور ایک ایک فاضل میگزین اپنے لباس میں چھپا لیا۔ یہ آٹو میٹک رائفلیں دراصل سب مشین گنیں تھیں جن سے طوفانی بارش کی طرح گولیوں کی بوچھاڑ کی جا سکتی تھی۔

سارے کاموں سے فارغ ہو کر ہم جھونپڑے کے باہر چٹائی پر بیٹھ گئے۔ مجھے اچانک ہی خیال آیا۔ میں نے قمیض کے نیچے شلوار کے نیفے میں اڑسا ہوا ریوالور نکال کر کھولا اُس میں صرف تین گولیاں تھیں۔ میں اُٹھ کر لیفٹیننٹ کی لاش کے قریب چلا گیا جو جھاڑیوں میں اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے پیر سے اُسے سیدھا کیا اور اُس کے ہولسٹر کے فلیپ پر لگی ہوئی گولیاں نکال کر ریوالور میں بھرنے لگا۔ لاشوں پر لاتعداد مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں تحقیر آمیز نظروں سے لاشوں کو دیکھتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ پر آ گیا۔

پانچ بجے کے قریب ہم روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ تینوں شہداء کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی اور بابا عبدالفتح کے جھونپڑے پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے ایک طرف چل پڑے۔

''اُس بستی کو راستہ اس طرف سے جاتا ہے۔ چٹانوں کے اندر۔'' انگوری نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم اُس طرف مُڑ گئے۔ وہ بستی تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر تھی۔ راستہ خاصا دُشوار گزار تھا اور میرا خیال تھا کہ ہم شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک تو ہم اُونچی نیچی چٹانوں پر اُترتے چڑھتے رہے۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنا بوڑھا ہونے کے باوجود بابا عبدالفتح یہ خطرناک راستہ کیسے طے کیا کرتا تھا؟

بالآخر ہم چٹانوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گئے۔ سامنے نشیب میں وسیع و عریض سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی اور مغرب کی طرف جھکتے ہوئے سورج کی دُھوپ میں ایک سرمئی لکیر بھی چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ کوئی چوڑی ندی تھی جس کا پانی دُھوپ میں چمک رہا تھا۔

چنار اور یوکلپٹس کے درخت بکثرت تھے۔ قد آدم جھاڑیاں تھیں۔ ہم سنبھل سنبھل کر ان جھاڑیوں میں نشیب کی طرف اُترتے رہے۔

وادی میں اُترتے ہی دھان کے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں کی بالیاں اگرچہ ابھی ہری تھیں مگر خوشبو سے پوری فضا مہک رہی تھی۔ کاشتکاروں کو فصل پکنے کے لئے ابھی کم از کم دو ہفتے انتظار کرنا تھا۔ میرا تعلق بھی کاشتکار گھرانے سے تھا اور میں جانتا تھا کہ کشمیر کے کاشتکاروں کو زمین کا سینہ چیر کر اناج اُگانے میں کتنی دُشواریاں پیش آتی ہیں۔ اور اس جیسے علاقوں میں تو بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ کوئی میدانی علاقہ نہیں تھا جہاں کھیتوں کا تسلسل ہو۔ ایک آدھ کھیت کی جگہ قابل کاشت ہوتی اس کے بعد پتھریلا میدان۔ پھر تھوڑی سی جگہ جہاں بیج ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ دھان کے کھیت بھی ایسے ہی تھے۔ کوئی اُونچی جگہ پر اور کوئی بہت نشیب میں۔

ہم اُن کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے ایک چٹان کے ساتھ دائیں طرف گھوم گئے۔ ہمارے سامنے ایک گہری ندی تھی۔ اُس کا پاٹ دو سو فٹ کے قریب ضرور ہو گا اور چٹانوں میں سے پچاس فٹ نیچے ندی کا پانی پُرشور آواز کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ندی میں اُترنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

ندی کے دوسری طرف سیبوں کا باغ تھا اور اُس کے پیچھے وہ بستی تھی جو بلندی سے تو ہمیں نظر آ رہی تھی لیکن اب گنجان درختوں کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''ہم دوسری طرف کیسے جائیں گے؟ یہاں تو ندی میں اُترنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔'' انگوری نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی راستہ تو ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس طرف کھیت ہیں اور بستی دوسری طرف۔ کاشتکار یہاں کسی راستے سے تو آتے ہوں گے۔ آؤ اس طرف چلتے ہیں کوئی راستہ ضرور ہوگا۔''

دائیں طرف تقریباً سوگز آگے ندی چٹانوں میں گھوم گئی تھی۔ چند گز آگے ہمیں ایک پگڈنڈی مل گئی اور جب ہم اُس پگڈنڈی پر چلتے ہوئے دوسری طرف پہنچے تو میرا اندازہ درست نکلا۔ یہاں ندی کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا اور آمد و رفت کے لئے ایک راستہ بھی موجود تھا۔ وہ ایک ڈولی سی تھی جس کا پلیٹ فارم لکڑی کا تھا اور اُوپر رسوں سے کٹہرا سا بنا دیا گیا تھا جس میں تین چار آدمی کھڑے ہو سکتے تھے۔

چٹان پر پلیٹ فارم سا بنا ہوا تھا جس پر لکڑی کی دو موٹی موٹی بلیاں ستونوں کی طرح گڑھی ہوئی تھیں۔ ایک بلی ان پر اُفقی رُخ پر ٹکی ہوئی تھی جس میں لوہے کی ایک ریل بھی پھنسی ہوئی تھی اور ایک موٹا رسا اُس ریل پر لپٹا ہوا تھا۔ وہ ڈولی اُس رسے کے نچلے حصے میں لٹکی ہوئی تھی۔

آہنی ریل سے لپٹ کر یہ رسہ دو رسوں کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ایک اُوپر اور ایک نیچے اور یہ دونوں راستے ندی کے دوسرے کنارے تک چلے گئے تھے جہاں ایک چٹان پر کچھ ایسا ہی انتظام تھا۔

وادی کشمیر میں رہنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وادی میں ندی نالے اور بعض مقامات پر دریا پار کرنے کے لئے رسوں کے پل بنائے گئے ہیں۔ اس قسم کی ڈولیاں بنائی گئی ہیں۔ ہم دونوں اُس ڈولی میں بیٹھ گئے۔ انگوری کٹہرے کے رسے کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے اُوپر والے رسے کو پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا ڈولی حرکت میں آ گئی۔

میں رسے کو کھینچتا رہا، رسہ دونوں طرف آہنی ریلوں پر گھوم رہا تھا اور ڈولی آہستہ آہستہ دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہاں ہوا تیز تھی جس سے ڈولی بری طرح ہلکورے لے رہی تھی۔ بعض اوقات تو یوں لگتا کہ ڈولی اب اُلٹی کہ تب اُلٹی۔ انگوری نے بڑی مضبوطی سے رسوں کو پکڑ رکھا تھا۔

بالآخر ڈولی دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ میں نے پہلے انگوری کو چٹانی پلیٹ فارم پر اُتارا اور پھر خود بھی چھلانگ لگا کر چٹان پر پہنچ گیا۔ ہم سیبوں والے باغ کے اُوپر سے گھومتے ہوئے ایک جگہ رُک گئے۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہم قدرے بلندی پر تھے اور بستی نشیب میں۔ ابھی غروب ہوتے ہوئے سورج کی کچھ روشنی باقی تھی اور ہم دن کی روشنی میں بستی میں

داخل نہیں ہونا چاہتے تھے۔

میرے اندازے کے مطابق وہ بستی ڈھائی تین سو گھروں پر مشتمل ہوگی۔ سامنے ہی ایک گلی سی نظر آ رہی تھی اور فاصلہ تقریباً دو سو گز ہونے کے باوجود گلی میں لوگوں کی آمد و رفت دکھائی دے رہی تھی۔

ہم ایک اُونچی جگہ پر پودوں کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے اس لئے ہمیں دیکھ لئے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ دراصل میں اندھیرا گہرا ہونے کے بعد بستی میں داخل ہونا چاہتا تھا تاکہ کم سے کم لوگوں سے آمنا سامنا ہو سکے۔

ہم تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے اور پھر بستی میں داخل ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہاں کس قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑے گا؟ رائفلیں ہم دونوں کے کندھوں پر تھیں اور ایک لمحہ کے نوٹس پر رائفلیں کندھوں سے اُتر کر ہمارے ہاتھوں میں آ سکتی تھیں۔

اُونچے نیچے راستے پر اندھیرے میں ٹھوکر لگنے کا اندیشہ تھا اس لئے میں نے انگوری کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اُس نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ بستی کے پہلے مکان کے قریب پہنچ کر ہم رُک گئے۔ مکان کے آنگن سے بکریوں کے ممیانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ میں نے اب بھی انگوری کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ گلی میں چلتے رہے۔ اتفاق سے اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ لیکن پھر اچانک ہی ایک گھر کا دروازہ کھلا اور تین چار بچے برآمد ہوئے اور شور مچاتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے چلے گئے۔ اُنہوں نے ہماری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ غالباً تاریکی کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکے تھے کہ ہم اجنبی ہیں۔ اور پھر سامنے سے دو عورتیں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ ایک نے کسی شیر خوار بچے کو گود میں اُٹھا رکھا تھا اور دوسری نے ٹوکری ہاتھ میں لٹکا رکھی تھی۔ وہ ہمارے بالکل قریب سے گزریں۔ ایک لمحے کو وہ ٹھٹکیں اور پھر اپنے راستے پر چلتی رہیں۔

ہم بھی آگے بڑھتے رہے۔ اور پھر چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد رُک گئے۔ وہ غالباً کوئی دُکان تھی جس کے دروازے سے روشنی دکھائی دے رہی تھی اور اندر سے دو تین آدمیوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں دروازے کے سامنے آ گئے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ ایک چھوٹی سی دُکان ہی تھی۔ دُکان کا سامان کافی پیچھے تھا۔ آگے کچھ کھلی جگہ تھی جہاں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک خالی کنستر پر ٹکا ہوا تھا اور دوسرا لکڑی کی اُونچی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دُکاندار اپنے سامان کے دوسری طرف ایک کنستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹین کے کنستر، بوریاں، شیشے کے مرتبان اور ایسی ہی چیزیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ کسی بھی کنستر یا بوری میں زیادہ سامان نہیں تھا۔ دُکان کی اس اُجڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر دُکاندار کی مالی پوزیشن کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ایک اُونچے سٹول پر لالٹین جل رہی تھی۔ یہی لالٹین دُکان میں روشنی کا واحد ذریعہ تھی۔ دُکان کی پچھلی دیوار میں کوئی دروازہ بھی

تھا جس کے سامنے ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ سامنے والے حصے میں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کے بیچ میں ایک حقہ بھی موجود تھا۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جب ہم دُکان میں داخل ہوئے تو ایک آدمی پشاوری طرز کے اُس حقے سے جسے چلم کہا جاتا ہے کش لگا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اُس نے حقہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ تینوں آدمی ہمیں دیکھ کر کچھ گھبرا سے گئے اور پریشان نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''گھبرائیے نہیں.....'' میں نے باری باری اُن تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم آپ کے لئے کسی پریشانی کا باعث نہیں بنیں گے۔ ہم دراصل یہاں بابا عبدالفتح سے ملنے آئے ہیں۔ کیا آپ لوگ بتا سکتے ہیں کہ اُن سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟''

میرے اس استفسار پر انگوری نے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''بابا عبدالفتح.....؟'' دُکاندار چونک گیا۔ ''کون ہو تم لوگ اور کہاں سے آئے ہو؟''

باقی دونوں آدمی بھی مشتبہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

''ہم پر شک نہ کریں۔'' میں نے باری باری اُن تینوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنے اور انگوری کے بارے میں بتانے لگا۔ ہم نے اُنہیں اس امر کی ہوا تک نہیں لگنے دی تھی کہ ہم دس بارہ دن بابا عبدالفتح کے مہمان رہے ہیں اور آج اُسے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتار کر آ رہے ہیں۔

''اوہ.....تو تم مولوی رسول بخش لون کے بیٹے ہو۔'' کنستر پر بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ ''مگر تم تو کمانڈر محبّ اللہ کے ساتھ تھے؟''

''ہاں.....'' میں نے جواب دیا۔ ''گلمرگ والے کیمپ پر کارروائی کے بعد مجھے پتہ چلا کہ بھارتی فوجیوں نے انگوری کی بستی پر ہلہ بول دیا تھا۔ کئی افراد کو قتل اور تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد کئی گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا۔ میں انگوری کی تلاش میں اس طرف آ گیا تھا۔''

''یہ تو روز کا معمول بن چکا ہے۔'' اُس شخص نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بے گناہوں کو تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا جاتا ہے اور گھروں کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ تم لوگ بابا عبدالفتح سے ملنے آئے ہو مگر وہ تو بستی میں نہیں ہے۔ اُس کا ٹھکانہ تو یہاں سے دُور پہاڑوں میں ہے۔ وہ کبھی کبھی یہاں آتا ہے۔''

''ولی محمد تو بستی میں ہوگا۔ وہ اس بستی کا بڑھئی ہے۔ ہمیں اُس سے ملوا دو۔'' میں نے کہا۔

''ولی محمد میرا ہی نام ہے۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' کنستر پر بیٹھے ہوئے شخص نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''پہلے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد آپ دونوں بھی ہماری گفتگو میں شامل ہو سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم انہیں گھر لے کر چلو ہم آتے ہیں تھوڑی دیر میں۔'' دوسرے آدمی نے ولی محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ!'' ولی محمد کہتے ہوئے اُٹھ گیا۔

ہم دُکان سے نکل رہے تھے کہ ایک بوڑھا کوئی سودا لینے کے لئے آ گیا۔ اُس نے عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا تھا۔

ہم دُکان سے نکل کر ولی محمد کے ساتھ اُس گلی میں آگے چلتے رہے اور پھر ایک اور تنگ سی گلی میں مُڑ گئے۔ اُس گلی میں زیادہ تاریکی تھی مگر ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ ولی محمد نے رُک کر ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ تقریباً دو منٹ بعد دروازہ کھلا۔ ولی محمد اندر داخل ہو گیا۔ چند لمحے سرگوشیوں میں کسی سے سے باتیں کرتا رہا، پھر ہمیں اندر بلا لیا۔ میں نے ایک سایہ آنگن میں دائیں طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ولی محمد ہمیں ایک کمرے کے سامنے چھوڑ کر خود بھی اُسی طرف چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک جلتی ہوئی لالٹین لے آیا۔ کمرہ کھول کر ہمیں اندر بٹھایا اور لالٹین رکھ کر باہر چلا گیا۔ ولی محمد اگرچہ بڑھئی تھا مگر اُس کے گھر میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ فرش پر بوری اور پرانے سے نمدے بچھے ہوئے تھے۔ ہم نے رائفلیں ایک طرف رکھ دیں اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

ولی محمد تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہمارے لئے کھانا لے آیا۔ ایک پلیٹ میں اُبلے ہوئے چاول اور پیالے میں پانی کی طرح پتلی سی دال تھی۔ چاول کی پلیٹ میں دو چمچے بھی لگے ہوئے تھے۔

''تم لوگ شاید بہت دُور سے آئے ہو۔ پہلے کھانا کھا لو پھر بات ہوگی۔ میں پانی لے کر آتا ہوں تم لوگ شروع کرو۔'' ولی محمد ایک بار پھر باہر چلا گیا۔ اس مرتبہ اُس کی واپسی دو منٹ میں ہی ہو گئی تھی۔ اُس نے پانی سے بھرے ہوئے ایلومینیم کے دو گلاس ہمارے قریب رکھ دیئے اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ کھانے کے دوران ہم وادی کے حالات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس بستی کے لوگ بھارتی فوجیوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں کے حوالے سے میرے نام سے واقف ہو چکے تھے۔

کھانے کے فوراً ہی بعد ولی محمد بکری کے دُودھ کی چائے بھی لے آیا۔ اس کے دوسرے دونوں ساتھی ابھی نہیں آئے تھے اور میں اُن کے آنے سے پہلے پہلے ولی محمد سے بات کر لینا چاہتا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح شروع کروں؟

''تم کچھ کہنا چاہتے تھے۔'' ولی محمد نے کہا۔

''ہاں ملنا تو میں تم سے ہی چاہتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ.....'' میں نے چائے کا گھونٹ بھر کر پیالہ نیچے رکھ دیا۔ چند لمحے خاموش رہا اور پھر مدھم لہجے میں اُسے سب کچھ بتانے لگا۔

ولی محمد کا چہرہ دُھواں ہو رہا تھا۔ اور پھر اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''میرا خیال ہے کہ رستم پر بابا عبدالفتح کا شبہ درست تھا۔'' میں کہہ رہا تھا۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں مخبری کے بغیر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ بھارتی فوجی تو ویسے بھی پہاڑوں کے اندر تک جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ مگر وہ لیفٹیننٹ اپنے تین آدمیوں کو لے کر پہنچ گیا۔ اُن کے لئے ہماری

موجودگی کا انکشاف تو بعد میں ہوا تھا۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہم نہ تو بابا عبدالفتح کے کسی کا
سکے اور نہ ہی عبداللہ اور نوری کو بچا سکے۔'' کئی لمحوں تک خاموشی رہی۔ ولی محمد کے چہرے
کرب کے آثار نمایاں تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس صدمے کو برداشت کرنے کی کوشش
رہا تھا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اُسے صبر اور ضبط کی تلقین کرنے لگا۔

''اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' بالآخر ولی محمد نے پوچھا۔

''آج رات.....'' میں نے جواب دیا۔ ''رستم کے گھر پر چھاپہ مارنا ہے۔ اس کے ساتھ او
کون کون ہے؟''

''وہ اکیلا ہی رہتا ہے۔'' ولی محمد نے جواب دیا۔ ''اُس کا مکان بستی کے دوسری طرف ذرا
ہٹ کر ندی کے کنارے پر ہے۔ وہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی اپنی دُکان بند کر کے چلا جاتا ہے
اور پھر گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ اُس سے کوئی ملنے بھی جاتا ہے تو ٹال دیتا ہے۔'' وہ چند لمحوں
خاموش ہوا پھر بولا۔ ''اب تو مجھے بھی اُس پر شبہ ہونے لگا ہے۔ اُس کے آنے سے پہلے بھی
مجاہدین پناہ لینے کے لئے بستی میں آتے رہتے تھے اور ایک آدھ دن گزار کر چلے جاتے تھے۔ مگر
پچھلے چار مہینوں کے دوران تین مرتبہ مجاہدین پناہ لینے کے لئے یہاں آئے اور ہر مرتبہ یہی ہوا
کہ چند گھنٹوں بعد ہی بھارتی فوجی بستی کو گھیر لیتے۔ اس طرح کم از کم سات مجاہدین اس بستی میں
بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں اور تین گھروں کو جلا کر راکھ کیا گیا ہے۔''

دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے اُس کو ہدایت کر دی کہ بابا کی
شہادت کے بارے میں تو بے شک اپنے ساتھیوں کو بتا دے لیکن رستم کا نام اُس کی زبان پر نہیں
آنا چاہئے۔ ولی محمد اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

وہ دونوں اُس کے ساتھی تھے۔ ولی محمد نے اُنہیں بابا کے بارے میں بتانے میں زیادہ دیر
نہیں لگائی تھی۔ اُن دونوں کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں واپس چلے گئے اور ولی محمد ہمارے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا
اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد مختلف لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔

رات گیارہ بجے کے قریب تین اور آدمی آئے۔ اُن میں ایک قدرے بھاری بھر کم آدمی بھی
شامل تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ گول داڑھی جس کے آدھے سے زیادہ بال سفید
ہو چکے تھے۔ سر پر سفید کپڑے کی گول ٹوپی، ہاتھ میں تسبیح اور کندھوں پر سرخ چیک دار رومال
پھیلا ہوا تھا۔

''یہ بابا رستم ہیں۔'' ولی محمد نے اُس کا تعارف کرایا۔ ''بہت نیک، پرہیز گار اور شریف آدمی
ہیں۔ بھارتی فوجیوں نے ان کے بیوی بچوں کو شہید کر دیا۔ گھر جلا ڈالا۔ یہ پچھلے چند مہینوں سے
یہاں رہ رہے ہیں۔''

رستم نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ اُس نے عجیب سی نظروں سے انگوری کی
طرف بھی دیکھا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اُسے کسی طرح بابا عبدالفتح کی شہادت
کی خبر مل گئی تھی اور وہ تصدیق کرنے آیا تھا۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ جو چار بھارتی فوجی
بابا کو پکڑنے آئے تھے وہ ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے
تاثرات اُبھر آئے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد رستم چلا گیا۔ اُس کے ساتھ آنے والے بھی
تھوڑی دیر بعد رُخصت ہو گئے۔

''اب میں اسے موقع نہیں دینا چاہتا۔'' میں نے ولی محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا پروگرام ہے؟'' اُس نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''ابھی چلتے ہیں۔ اگر ہمارا شبہ درست نکلا تو اُسے معاف نہیں کیا جائے گا۔'' میں نے
جواب دیا۔

انگوری بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم ولی محمد کے گھر سے نکل
آئے۔ بستی کی گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ کہیں کہیں کتوں نے بھونک کر ہمارا راستہ روکنے کی
کوشش کی مگر ولی محمد نے اُنہیں ڈانٹ کر بھگا دیا۔

رستم کا مکان بستی سے تقریباً سو گز دُور ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے پر تھا۔ مکان کے
قریب پہنچ کر ہم بہت زیادہ محتاط ہو گئے۔

چار دیواری زیادہ اُونچی نہیں تھی۔ ہم بہت احتیاط سے اندر کود گئے۔ یہ دو کمروں کا مکان
تھا۔ ایک کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی کھڑکی تھی جس کے پٹ بند تھے لیکن اُس میں بہت
معمولی سی درز تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس جھری سے آنکھ لگا دی۔ اور پھر اندر کا منظر دیکھ کر
میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا.....

سامنے ہی لکڑی کی ایک چوکی رکھی ہوئی تھی۔ چوکی پر ایک طرف لالٹین تھی اور اُس کے
ساتھ ہی دس بائی آٹھ انچ کے لکڑی کے فریم میں کالی دیوی کی تصویر رکھی ہوئی تھی اور رستم چوکی
کے سامنے زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا سر کسی قدر جھکا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ جوڑ
رکھے تھے۔

صرف ایک منٹ بعد ہی اُس نے تصویر دوسری طرف پڑے ہوئے ٹرنک میں احتیاط سے
کپڑوں کے نیچے رکھ دی اور اُس ٹرنک میں سے چار بائی چھ انچ حجم کا ایک ڈبہ نکال کر اپنے
سامنے رکھ لیا۔

میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں اور دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ ٹرانسمیٹر تھا۔

میں نے بڑی آہستگی سے اپنی جگہ سے حرکت کر کے ولی محمد کو اشارہ کیا، اُس نے جھک کر
کھڑکی کی جھری سے آنکھ لگا دی اور پھر ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ انگوری بھی ہمارے قریب
کی کھڑکی تھی اُس نے بھی کھڑکی کی جھری سے آنکھ لگا کر اندر کا منظر دیکھ لیا۔

صورتحال کچھ یوں تھی کہ وہاں سناٹا تھا۔ اگر ہم سرگوشی میں بھی بات کرتے تو آواز اندر تک

پہنچ سکتی تھی۔ ولی محمد نے مجھے اشارے سے بتایا کہ اس کمرے کے پچھلی طرف بھی ایک کھڑکی ہے۔ میں نے انگوری کو اُس طرف بھیج دیا تاکہ اگر رستم اُس کھڑکی کے راستے فرار ہونے کی کوشش کرے تو اُسے روکا جا سکے۔ انگوری کے پاس رائفل تھی اور وہ اس سے کام لینا بھی جانتی تھی۔ دوسری رائفل میرے پاس تھی۔ ولی محمد خالی ہاتھ تھا۔

میں نے ایک بار پھر کھڑکی کی جھری سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ رستم ہاتھ میں پکڑے ہوئے اُس ڈبے کا ڈھکنا کھول چکا تھا۔ اُس نے پہلے ریڈیو انٹینا کی طرح کا ایک اِنچ لمبا راڈ باہر نکالا اور انٹینا ہی کی طرح اُسے کھینچ کر کھولتا چلا گیا۔ وہ پتلا سا انٹینا راڈ تقریباً دو فٹ اُوپر تک چلا گیا۔ اب وہ ڈبے کے اندر دو باریک سی تاروں کو آپس میں جوڑنے لگا۔

میرے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ ٹرانسمیٹر پر کسی کو بابا عبدالفتح کی موت اور بستی میں ہماری موجودگی کی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ اب ایک بھی لمحہ ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں دروازے کے سامنے گیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کندھے کی ایک بھرپور ٹکر دروازے پر ماری۔ اندر سے لگا ہوا دروازے کا کنڈا زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ پہلی ہی ٹکر میں دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔

دروازے کے دھماکے کی آواز سن کر رستم اُچھل پڑا۔ ٹرانسمیٹر اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چارپائی پر گر گیا۔ وہ بری طرح بدحواس ہو گیا تھا لیکن میں دل ہی دل میں اُس کے مضبوط اعصاب کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس اچانک افتاد پر سکتے میں آ جاتا اور کچھ دیر تک اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل نہ رہتا۔ لیکن رستم نے تیس سیکنڈ سے بھی کم وقت میں نہ صرف اپنے حواس پر قابو پا لیا بلکہ اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کرتے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا.....

دروازے کو ٹکر مارتے ہوئے میں نے رائفل کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ جھٹکا لگنے سے میں بھی لڑکھڑایا تھا لیکن سنبھل گیا اور اس کے ساتھ ہی رائفل کو بھی گھما دیا۔ رائفل کا بٹ رستم کے ریوالور والے ہاتھ پر لگا۔ اُس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ ریوالور ہوا میں اُڑتا ہوا دروازے کے پٹ سے ٹکرا کر دہلیز کے قریب گرا۔

رستم نے کھڑکی کی طرف چھلانگ لگا دی۔ میں رائفل کو اسی طرح پکڑے کھڑا رہا۔ آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

''تمہارا راز کھل چکا ہے رستم..... تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو!'' میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے کہا۔

''اگر تم نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو اس بستی پر ایسی تباہی نازل ہو گی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکو گے۔'' اُس نے کھڑکی کی چٹخنی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اُس کا خیال تھا کہ مجھے باتوں میں لگا کر کھڑکی کے راستے فرار ہو جائے گا۔ میں بھی اطمینان سے اپنی جگہ پر کھڑا

تھا۔ ''تم میرا راستہ نہیں روک سکتے۔ کوئی میرا راستہ نہیں روک سکتا۔ کالی مائی میری رکھشا کر رہی ہے۔ جو بھی میرا راستہ روکے گا جل کر بھسم ہو جائے گا۔''

اُس نے کھڑکی کھول لی۔ میں اس وقت اطمینان سے کھڑا تھا۔ رستم کا خیال تھا کہ میں اُس کی کالی مائی کے نام سے ڈر گیا ہوں اس لئے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہا۔

اُس نے دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکا دیئے اور دوسری طرف کودنے کے لئے اُچھلا۔ لیکن اُسی لمحہ وہ بھیانک انداز میں چیختا ہوا اندر کی طرف گرا۔ باہر کھڑی ہوئی انگوری نے رائفل کا بٹ پوری قوت سے اُس کے کندھے پر رسید کر دیا تھا اور وہ کتے کی طرح بلبلا اُٹھا تھا۔

''کیوں رستم.....'' میں نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری کالی مائی کا جادو اُلٹا کیوں ہو گیا؟''

''تت..... تم لوگ..... تم لوگ بچ نہیں سکو گے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔ اسی دوران ولی محمد بھی کمرے میں آ گیا اور اُس نے جھک کر رستم والا ریوالور بھی اُٹھا لیا تھا۔ عقبی کھڑکی کے باہر انگوری کھڑی تھی اور اُس نے رائفل کی نال کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکا کر رستم کو زد پر لے لیا تھا۔

''بابا عبدالفتح کا شبہ تم پر درست تھا۔'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ وادی میں جو کچھ بھی کر رہے ہو، بے گناہ لوگوں کو جس طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے ہو اس کا حساب تو تم لوگوں سے لیا ہی جائے گا لیکن اس وقت تو اس بستی والے تم سے حساب لیں گے۔ انہوں نے مظلوم سمجھ کر تمہیں پناہ دی، رہنے کو مکان اور کام دھندے کو پیسے جمع کر کے دیئے۔ یہ نیکی اگر وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کے ساتھ کرتے تو ان کی آئندہ نسلیں بھی ان کی شکر گزار رہتیں۔ مگر تم..... تمہارے دھرم میں وفا نام کی تو کوئی چیز ہی نہیں۔ تم ان کا دیا کھاتے رہے اور انہی کے ساتھ غداری کرتے رہے۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''بابا عبدالفتح کو تو شبہ تھا لیکن ہمیں اب یقین ہو چکا ہے کہ تم باقاعدہ پلاننگ کے تحت یہاں آئے تھے یا تمہیں بھیجا گیا تھا۔ اس کے لئے ایک کہانی گھڑی گئی۔ کشمیر کے مسلمانوں کے ساتھ تو برسوں سے یہ ظلم ہو رہا ہے۔ کسی معمولی سی بات پر ان کے گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے، ان کے بیوی بچوں کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے اور اس بستی والوں کی سادہ لوحی تو دیکھو..... تم نے یہاں آ کر انہیں ایک دردناک جھوٹی کہانی سنائی اور انہوں نے یقین کر لیا۔ تحقیق کرنے کی ضرورت شاید اس لئے نہیں سمجھی کہ وادی میں ہر جگہ مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ انہوں نے تمہاری کہانی پر بھی یقین کر لیا۔ اور تم ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اُٹھا کر اپنا کام کرتے رہے۔

''تمہارا اصل مشن شاید بابا عبدالفتح کا سراغ لگانا تھا۔ اس کے لئے تم نے پہلے بہت نیک اور شریف انسان اور پکا مسلمان بن کر بستی والوں کا اعتماد حاصل کیا۔ بابا عبدالفتح بستی میں آتا

رہتا تھا۔ تم اُن کا اعتماد بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور بستی کے بعض لوگوں سے بھی ان کے ٹھکانے کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن بستی کے لوگ غدار نہیں ہیں۔ وہ اپنے ہیرو کا ٹھکانہ کیسے بتا دیتے؟ اسی دوران تم نے اپنی دوسری سرگرمیاں جاری رکھیں اور وقتاً فوقتاً بستی میں پناہ لینے والے مجاہدین کے بارے میں اپنے آقاؤں کو اطلاع دیتے رہے۔

مجھے نہیں معلوم تم نے بابا عبدالفتح کا ٹھکانہ کس طرح معلوم کر لیا تھا؟ ہو سکتا ہے بستی کے کسی شخص کے منہ سے غلطی سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہو جس سے تمہیں بابا کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا اور تم نے اپنے آقاؤں کو اطلاع دے دی۔ بابا عبدالفتح نے مجاہدانہ زندگی گزاری تھی۔ اُس نے ایک مجاہد ہی کی طرح موت کو گلے لگایا۔ وہ تو شہادت کے رُتبے پر فائز ہوا اور ہر مجاہد کی خواہش یہی ہوتی ہے۔ لیکن وہ جو چار بھیڑیئے اُسے گھیرنے کے لئے آئے تھے اُن میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہیں جا سکا۔ وہ چاروں جہنم واصل ہو چکے ہیں۔ اُن کی لاشیں بھیڑیوں کی خوراک بن چکی ہوں گی۔'' میں خاموش ہو گیا۔ میری نظریں رستم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ فرش پر خاموش بیٹھا ابھی تک کندھا سہلا رہا تھا جہاں انگوری کے رائفل کے بٹ کی ضرب لگی تھی۔

''تمہیں شاید کسی طرح ہمارے بستی میں آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔'' میں نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''اور شاید تمہیں بابا عبدالفتح کی شہادت کا بھی پتہ چل گیا اور تم تصدیق کرنے کے لئے ولی محمد کے گھر پہنچ گئے۔ لیکن تم زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھے۔ تصدیق ہوتے ہی واپس آ گئے اور ٹرانسمیٹر پر اپنے آقاؤں کو اطلاع دینے جا رہے تھے۔''

''تم نے جو کہنا تھا کہہ چکے۔'' رستم نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا، اس وقت اُس کے چہرے پر اور لہجے میں اطمینان کی جھلک دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''تو گویا تمہارے پاس بھی کہنے کو کچھ ہے۔'' میں نے اُسے گھورا۔

''ہاں.....'' اُس نے جواب دیا۔ ''یہ جو کچھ بھی ہوا کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ اسی وادی کی مٹی سے جنم لیا ہے۔ میں بھی اس زمین کا اتنا ہی وفادار ہوں جتنے تم یا کوئی اور مسلمان ہو سکتا ہے۔ میں اس سرزمین سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تمہیں شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم اگر آرام سے بیٹھ کر بات کرو تو میں اپنے مؤقف کو سچ ثابت کر سکتا ہوں کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔''

''تو پھر تم نے بھاگنے کی کوشش کیوں کی تھی؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''ہر کشمیری مسلمان کی طرح میں بھی ڈرا ہوا ہوں۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ خوف کے سائے میں گزرتا ہے۔ میری کہانی تم سن چکے ہو۔ وہ غلط نہیں ہے۔ میرے ساتھ واقعی ظلم ہوا ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''سرینگر میں میرے ساتھ جو ظلم ہوا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ تم سرینگر کے لاہوری محلے میں جا کر تصدیق کر سکتے ہو۔ میرے ہاتھوں ایک بھارتی فوجی مارا گیا تھا۔ میں چھپ کر یہاں زندگی گزار رہا ہوں۔ تم نے جب ٹکر مار کر دروازہ کھولا تو میں یہی سمجھا تھا کہ بھارتی فوجیوں کو میرے بارے میں پتہ چل گیا ہے اور وہ مجھے پکڑنے کے لئے آئے ہیں۔ اسی لئے میں نے بھاگنے کی کوشش کی۔

''اور وہ ٹرانسمیٹر؟'' میں نے زمین پر پڑے ہوئے ٹرانسمیٹر کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ ٹرانسمیٹر نہیں ٹرانسسٹر ہے۔'' رستم نے جواب دیا۔ ''میں خبریں سننے کے لئے ریڈیو آن کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تم.....''

''اس وقت کسی ریڈیو سٹیشن سے خبریں نہیں آتیں۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''آل انڈیا ریڈیو سے تقریباً ہر گھنٹے بعد خبروں کا بلیٹن نشر ہوتا ہے جس سے حالات کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں مسلمان ہوں اور.....''

''کیسے مسلمان ہو؟'' میں نے ایک بار پھر اُس کی بات کاٹ دی۔ ''مسلمان خدا کے سوا کسی اور سے مدد نہیں مانگتا۔ کسی مشکل کے وقت بھی اُس کے منہ سے خدا ہی کا نام نکلتا ہے۔ اور تم کیسے مسلمان ہو کہ مجھے اپنی کالی دیوی کے عذاب سے ڈرا رہے تھے؟''

''میں سرینگر میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا ہوں.....'' رستم نے جواب دیا۔ وہ بلاشبہ آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے باوجود اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا اور اس واقعہ کو کوئی اور رنگ دینے کی کوشش کر رہا تھا اور میرے خیال میں اُس کی بات سن لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ''ہمارے محلے میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ میں بچپن ہی سے اُن کے بیچ میں رہا ہوں..... ہندی شبد (الفاظ) بولنے اور ہندو دیوی دیوتاؤں کے نام لینے کی عادت ہو گئی ہے۔''

''ایسے مسلمان کو تو ڈوب مرنا چاہئے جو پتھر کی مورتیوں کو بھی خدا مان کر اُن کا نام زبان پر لاتا ہو۔'' میں نے اُسے گھورا۔ ''تم ہندوؤں کے بیچ پلے بڑھے ہو لیکن کیا آج تک تم نے کسی ہندو کے منہ سے اللہ کا نام نکلتے سنا ہے..... کیا کبھی کسی ہندو کو بسم اللہ یا ماشاءاللہ یا انشاءاللہ کہتے سنا ہے؟ نہیں رستم! تمہاری یہ کہانی ایک دلچسپ لطیفہ تو ہو سکتی ہے مگر اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر تمہارے اس ٹرنک میں تمہاری اُس کالی مائی کی فریم شدہ تصویر تمہارے اس بیان کی نفی کر رہی ہے۔''

''کیسی تصویر؟'' اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔ میری بات سن کر اُس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا لیکن اُس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا تھا۔ میں نے جھک کر چارپائی کے نیچے سے ٹرنک باہر کھینچ لیا، ابس کا ڈھکن اُٹھایا اور کپڑے کے نیچے سے وہ فریم نکال لیا۔

''یہ ہے تمہاری کالی مائی کی تصویر جس کی تم ہمارے آنے سے پہلے پوجا کر رہے تھے۔'' میں نے تصویر اُس کے سامنے پھینک دی۔

''یہ..... یہ تصویر.....'' وہ پہلی مرتبہ ہکلایا۔ مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔ ''تقریباً بیس دن پہلے بھارتی فوجیوں نے مجاہدین کی تلاش میں اس بستی پر ریڈ کیا تھا۔ اُن کے ٹرک اس طرف سے

گزرے تھے۔ واپسی پر یہ فریم شاید کسی ٹرک سے گر گیا تھا۔ تم جانتے ہو ہندو فوجی اپنے دیوی دیوتاؤں کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں یا اُن کی تصویریں اپنے پاس رکھتے ہیں۔ یہ تصویر بھی شاید ٹرک پر لگی ہوگی جو جھٹکا لگنے سے گر گئی اور میں اسے اُٹھا کر لے آیا تھا۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔'' میں نے کہا۔ ''میں آخری حد تک تمہاری بات سننے کو تیار ہوں۔ ایک جھوٹ نبھانے کے لئے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور ان میں تسلسل قائم نہیں رہتا۔ میں ہر طرح سے ثابت کر سکتا ہوں کہ تم مسلمان نہیں ہندو ہو اور ایک پلاننگ کے تحت مخبری کے لئے یہاں آئے ہوئے تھے۔''

''تمہیں میری بات کا یقین کرنا پڑے گا..... میں مسلمان.....''

میں نے ولی محمد کو اشارہ کیا۔ وہ نپے تلے قدم اُٹھاتا ہوا رستم کے پیچھے چلا گیا۔ میں جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کے لئے انگوری کی موجودگی مناسب نہیں تھی۔ میں نے اُسے اشارہ کیا، وہ کھڑکی سے ایک طرف ہٹ گئی۔

ولی محمد نے اچانک ہی رستم کو پیچھے سے بانہوں میں جکڑ لیا۔ رستم بھی شاید سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ وہ مزاحمت کرنے لگا جس کے نتیجہ میں وہ دونوں فرش پر گر گئے۔ ولی محمد کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر گر گیا تھا مگر اُس نے رستم پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دی۔

میں بھی آگے بڑھ آیا۔ رستم بری طرح لاتیں چلا رہا تھا لیکن میں اُس کے پاجامے کا بند کھولنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اب کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہندو تھا۔

''چھوڑ دو اسے۔'' میں نے ولی محمد کو اشارہ کیا۔

ولی محمد اُس کو چھوڑ کر الگ ہٹا ہی تھا کہ اُس نے اپنی برہنگی کی پرواہ کئے بغیر بڑی تیزی سے پستول کی طرف چھلانگ لگا دی۔ پستول ہاتھ میں آتے ہی اُس نے فائر کر دیا..... گولی میرے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی اور اس سے پہلے کہ رستم کو دوسری گولی چلانے کا موقع ملتا کھڑکی کی طرف سے فائر ہوا اور رستم چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا.....

انگوری کی چلائی ہوئی گولی رستم کے ریوالور والے بازو پر کلائی سے ذرا اُوپر لگی تھی اور ہڈی توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ریوالور اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا جسے ولی محمد نے جھپٹ کر اُٹھا لیا۔ رستم کے بازو سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی اور وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ ولی محمد نے آگے بڑھ کر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

''تم نے ہمارے کئی مجاہدوں کو دھوکے سے مروا دیا۔ ہمارے بابا عبدالفتح کو شہید کروا دیا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بتا کون ہے تو..؟'' ولی محمد اُس پر ٹھوکریں برساتا ہوا چیخ رہا تھا۔

''اسے چھوڑ دو ولی محمد۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اس طرح نہیں بتائے گا۔ اس کے لئے دوسرا طریقہ اختیار کرنا ہوگا اور اسے سزا تو ایسی دی جائے گی کہ آئندہ وہ لوگ اپنا کوئی جاسوس کسی بستی میں بھیجنے کی جرأت نہیں کریں گے۔''

ولی محمد نے اُسے چھوڑ دیا۔ اسی دوران انگوری بھی کمرے میں آ گئی تھی۔ رستم کا نچلا دھڑ برہنہ تھا۔ انگوری رُخ بدل کر کھڑی ہو گئی اور ولی محمد نے رستم کا پاجامہ اُوپر کھینچ کر کمر بند باندھ دیا۔ میں رستم کے سامنے آ گیا۔

''مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ تمہیں کس نے بھیجا تھا یا تمہارا نام کیا ہے۔'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ ''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اب تک تم ایسے کتنے متن پایہ تکمیل تک پہنچا چکے ہو اور تمہاری وجہ سے ہمارے کتنے مجاہدین تمہارے سورماؤں کے ہاتھوں شہید ہوئے ہیں؟ کتنے گھر جلائے ہیں اور کتنے بے گناہوں کو ظلم کا نشانہ بنایا ہے؟''

رستم زبان کھولنے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن میں بھی خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے کمرے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی ایک چھڑی مل گئی۔ شہتوت کی یہ چھڑی تقریباً تین فٹ لمبی تھی۔ میں نے وہ چھڑی اُٹھا کر دیکھی، پھر ولی محمد کو اشارہ کیا۔

ہم دونوں نے رستم کو چارپائی پر سیدھا لٹا کر رسّی سے باندھ دیا اور میں چھڑی اُٹھا کر پائینتی کی طرف آ گیا۔ رستم کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔

''ہم بھی تشدد کے کچھ طریقے جانتے ہیں۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ ہم لوگوں نے تشدد کے طریقے تم ہی لوگوں سے سیکھے ہیں۔ تم لوگ ہمارے پکڑے جانے والے مجاہدین اور بے گناہ شہریوں پر تشدد کے جو حربے استعمال کرتے ہو ان میں سے صرف ایک ہی تم پر آزماؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے کوئی دوسرا طریقہ استعمال کرنے کا موقع نہیں دو گے۔'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

میں چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر چھڑی زور سے اُس کے پیروں کے تلوؤں پر ماری۔ وہ چیخ اُٹھا..... مگر میں رُکے بغیر چھڑی سے ضربیں لگاتا رہا۔ اگر اُس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے نہ ہوتے تو وہ یقیناً فرش پر گر کر پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگتا۔ مگر رسّی کی بندشوں نے اُسے ایسا موقع نہیں دیا۔

''ٹھہرو..... ٹھہرو..... میں بتاتا ہوں.....'' وہ چیخ اُٹھا۔

○○○

میں نے ہاتھ روک لیا۔ اُس کا بازو پہلے ہی زخمی تھا۔ انگوری کی چلائی ہوئی گولی ہڈی توڑتی ہوئی نکل گئی تھی اور اب پیروں پر لگنے والی ضربوں نے اُسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اُس کا نام چندر پال تھا۔ وہ سرینگر ہی کا رہنے والا تھا۔ پہلے پولیس کے لئے مخبر کی حیثیت سے کام کرتا رہا تھا۔ اُس کی فراہم کردہ اطلاعات پر پولیس نے کئی بے گناہوں کو پکڑ کر تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور اس تشدد سے دو آدمی شہید بھی ہو گئے تھے۔ شہر میں رہتے ہوئے اُس کا سب سے مکروہ اور سیاہ کارنامہ وہ تھا جب اُس نے اپنے ہی محلے کی ایک خوبصورت مسلمان لڑکی کے خلاف پولیس میں مخبری کی تھی۔ وہ لڑکی پہلگام کی رہنے والی تھی اور مہینے میں ایک دو مرتبہ اپنے ماموں کے گھر آیا کرتی تھی جو اُسے کپڑوں پر کڑھائی کا کام لے کر دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ چندر پال نے اُسے چھیڑ دیا تھا جس پر لڑکی نے اُسے تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ اُس وقت گلی سنسان تھی۔ اگر کوئی مسلمان چندر پال کو لڑکی کو چھیڑتے ہوئے دیکھ لیتا تو چندر پال زندہ نہ بچتا۔

چندر پال نے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لئے پولیس کو اُس کے خلاف یہ جھوٹی اطلاع فراہم کر دی کہ یہ لڑکی دراصل مجاہدین کی مخبر ہے جو سرینگر میں اپنے ماموں سے پولیس اور فوج کی سرگرمیوں کی رپورٹس لے کر مجاہدین کو پہنچاتی ہے۔

پولیس نے اُسی رات عبدالستار نامی اُس شخص کے گھر چھاپہ مار کر عبدالستار اور اُس کی بھانجی زرینہ کو گرفتار کر لیا۔ عبدالستار کو پوچھ گچھ کے دوران اس قدر تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ زندگی بھر کے لئے مفلوج ہو گیا اور زرینہ نامی اُس لڑکی کو اجتماعی طور پر ہوس کا شکار بنایا گیا۔ جب اُسے چھوڑا گیا تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ دوسرے ہی روز اُس نے زیرو برج سے دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ چندر پال کئی سال تک سرینگر شہر میں پولیس کے لئے مخبری کرتا رہا، پھر فوج تک پہنچ گیا۔ اب وہ فوج کے لئے مخبر کا کام کرنے لگا۔ اُسے ہر مرتبہ نئی کہانی دے کر کسی ایسی بستی میں بھیج دیا جاتا جہاں مجاہدین کی خفیہ سرگرمیوں کا شبہ ہوتا۔

چندر پال مسلمان کے بھیس میں اس بستی میں پہنچ جاتا اور بھارتی فوجیوں کے ظلم کی فرضی کہانی سنا کر بستی والوں کی ہمدردیاں حاصل کر لیتا اور وہاں رہ کر اُنہی کی جڑیں کھوکھلی کرنے لگتا۔

چار پانچ مہینے پہلے فوج کے ڈیفنس انٹیلی جنس کے ایک کرنل نے اُسے ایک نیا مشن سونپا تھا۔ اُس کرنل کو اپنے ذرائع سے اطلاعات ملی تھیں کہ عبدالفتح اس بستی کے آس پاس کہیں روپوش زندگی گزار رہا ہے لیکن کوشش کے باوجود اُس کے ٹھکانے کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔

چندر پال کو یہ مشن دے کر یہاں بھیجا گیا۔ بابا عبدالفتح نے ماضی میں بھارتی فوجیوں کو ناقابل تلافی نقصانات پہنچائے تھے۔ اُس کی گرفتاری پر فوج کی طرف سے اور سرینگر کی کٹھ پتلی سرکار کی طرف سے لاکھوں روپے کے انعام مقرر کئے گئے تھے۔ چندر پال سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر اُس کی فراہم کردہ اطلاع پر عبدالفتح گرفتار ہو گیا تو تمام انعامی رقوم اُسے دے دی جائیں گی۔

چندر پال کے کہنے کے مطابق وہ ایک مہینے کے اندر اندر بستی والوں کا اعتماد حاصل کر چکا تھا۔ وہ اُس کی موجودگی میں مجاہدین کی سرگرمیوں کے بارے میں کھل کر بات کرتے لیکن بابا عبدالفتح کے بارے میں اُنہوں نے کبھی زبان نہیں کھولی حالانکہ بابا عبدالفتح خود بھی ہفتے دو ہفتے کے بعد بستی کا چکر لگاتا رہتا تھا۔

چندر پال کو یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ بابا عبدالفتح کا بستی والوں سے تعلق ہے اور وہ یہاں آتا بھی ہے لیکن اُس کا اصل ٹھکانہ کوشش کے باوجود اُسے معلوم نہیں ہو سکا۔ اُس کا بستی میں آنے کا کوئی دن بھی مقرر نہیں تھا ظاہر ہے وہ کرنل کو اُس کے بارے میں کوئی حتمی اطلاع نہیں دے سکتا تھا۔ اور پھر وہ بستی کے ایک شخص سے بابا عبدالفتح کا ٹھکانہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے ٹرانسمیٹر پر اپنے کرنل کو اطلاع دے دی۔ چندر پال کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بابا عبدالفتح کے اس خفیہ ٹھکانے پر کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔ اُس نے کرنل کو یہی بتایا تھا کہ بابا عبدالفتح اکیلا رہتا ہے۔ اُس کی اطلاع پر کرنل نے صرف چار فوجیوں پر مشتمل ایک ٹیم اُن پہاڑوں میں بھیج دی۔ اُس کے خیال میں ایک آدمی کو گرفتار کرنے کے لئے چار فوجی کافی تھے۔ لیکن اُن چاروں کی موت ہی اُنہیں گھیر کر وہاں لے گئی تھی۔

چندر پال کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بابا عبدالفتح کے خفیہ ٹھکانے پر ریڈ کس دن ہو گا۔ چندر پال عام طور پر بستی کی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد گھر آ جاتا تھا۔ لیکن آج گھر آنے کے بعد وہ سگریٹ لینے کے لئے بستی واپس چلا گیا تھا۔ اس وقت تک ہم بستی میں پہنچ چکے تھے اور بابا عبدالفتح کی شہادت کی اطلاع بھی بستی کے بیشتر لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔ چندر پال جس دُکان پر سگریٹ لینے کے لئے گیا تھا اُسے بھی یہ اطلاع وہیں سے ملی تھی۔ وہ کافی دیر تک وہیں بیٹھا گپیں کرتا رہا اور پھر دو تین آدمیوں کے ساتھ ولی محمد کے مکان پر آ گیا۔ وہ اپنے آقاؤں کو اطلاع دینے سے پہلے خود تصدیق کر لینا چاہتا تھا لیکن ہمارے ہتھے چڑھ گیا۔ اگر ہمیں یہاں پہنچنے میں چند منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو وہ ٹرانسمیٹر پر اپنے آقاؤں کو اطلاع دے چکا ہوتا۔

"ٹھیک ہے....." میں نے چندر پال کے خاموش ہونے پر کہا۔ "یوں تو تم نے پوری وادی کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ بابا عبدالفتح بھی پوری وادی کے لوگوں کا ہیرو تھا۔ تمہیں اُسے اس بستی سے خاص لگاؤ تھا۔ اس بستی کو بھی تم ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکے ہو۔ تمہیں وقتاً فوقتاً پناہ لینے والے مجموعی طور پر آٹھ مجاہدین کے علاوہ بستی کے دو بے گناہ نوجوان بھی شہید کئے جا چکے ہیں اس لئے تمہاری تقدیر کا فیصلہ بھی بستی والے کریں گے۔"

چندر پال کا چہرہ دُھواں ہو گیا۔

اسی دوران باہر سے شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لگتا تھا جیسے بہت سے لوگ جمع ہوں۔ اور پھر باہر والا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی رستم کا نام لے کر پکار رہا تھا۔

میں نے ولی محمد کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُس کی واپسی چند منٹ بعد ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ بستی کے تین چار آدمی بھی تھے۔ کسی کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، کسی کے ہاتھ میں کلہاڑی، ایک کے ہاتھ میں رائفل بھی تھی۔

اور پھر اُن کی بات سن کر اُن لوگوں کے یہاں جمع ہونے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ بستی والوں نے دو گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔ پہلے وہ سمجھے کہ بھارتی فوجیوں کے کسی دستے نے بستی پر حملہ کر دیا ہے لیکن اس کے بعد فائرنگ کی آواز سنائی نہیں دی۔ البتہ چندر پال کی چیخوں کی آواز اُن تک پہنچ گئی تھی۔ بستی والے یہ سمجھے تھے کہ شاید کوئی چور وغیرہ رستم کے گھر میں گھس گئے ہیں۔ فوجیوں کے بارے میں اُن کا شبہ ختم ہو گیا تھا کیونکہ بستی میں یا باہر بھی فوج کی کوئی گاڑی وغیرہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''یہ ہے تمہارا رستم.....'' میں نے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کا اصل رُوپ یہ ہے۔'' میں نے زمین پر پڑی ہوئی کالی دیوی کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ مسلمان کے بھیس میں ہماری بستیوں میں جا کر مخبری کرتا رہا۔ کئی مجاہدین اس کی وجہ سے شہید ہوئے۔ کئی معصوم عورتوں کی عزت لوٹی گئی۔ کئی گھر جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ آج ہمارا بابا عبدالفتح بھی اس کی وجہ سے شہید ہوا۔ نوری اور عبداللہ کی زندگیوں کے چراغ بھی اسی کی وجہ سے گل ہوئے۔ یوں تو یہ وادی کے تمام مسلمانوں کا مجرم ہے لیکن اسے سزا دینے کا حق تم لوگوں کو ہے۔ اس بستی کے لوگ ہی اس کے لئے سزا تجویز کریں گے۔''

ایک دو آدمی چندر پال کو مارنے کے لئے لپکے تھے لیکن میں نے اُنہیں روک دیا۔ اور بھی کئی لوگ اندر آ گئے تھے۔ اُنہوں نے کالی کی تصویر بھی دیکھ لی تھی اور ٹرانسمیٹر بھی۔ اس کے علاوہ ٹرنک سے ایک دو مزید ایسی چیزیں برآمد ہوئی تھیں جنہیں چندر پال کے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔

وہ تمام چیزیں میں نے اپنے قبضے میں لے لیں اور چندر پال کو بستی میں لے آئے۔ اُس کے مکان کو تالا لگا دیا گیا تھا۔ اگرچہ آدھی رات بیت چکی تھی۔ گاؤں، دیہاتوں اور ایسی بستیوں میں شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی سناٹا چھا جاتا تھا مگر رستم کے پکڑے جانے کی خبر رات کو بھی جنگل کی آگ کی طرح پوری بستی میں پھیل گئی تھی اور بہت سے لوگ بستی کے مرکزی چوراہے پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ سب لوگ چندر پال کے خلاف غصے کا اظہار کر رہے تھے اور کئی لوگ اُسے مارنے کو لپک رہے تھے۔

چندر پال کو باندھ کر ولی محمد کے گھر کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ صبح فجر کی نماز کے فوراً ہی بعد بستی کے لوگ ایک بار پھر مرکزی چوراہے پر جمع ہو گئے اور چندر پال کو بھی وہاں پہنچا دیا گیا۔ بستی والوں نے چندر پال کے خلاف اپنا فیصلہ سنا دیا۔

چوراہے پر اخروٹ کے درخت کی اُونچی شاخ پر رسا باندھ کر چندر پال کو پھندے پر لٹکا دیا گیا اور اُس کی لاش دوپہر تک درخت پر جھولتی رہی اور پھر گاؤں کے چند لڑکوں نے وہ لاش پھندے سے اُتار کر بستی سے بہت دُور کھیتوں میں لے جا کر پھینک دی۔

بستی والے میرے اور انگوری کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ ہم تو اُسی روز جانا چاہتے تھے مگر اُنہوں نے ہمیں روک لیا۔ دو آدمی بابا عبدالفتح کے پہاڑی ٹھکانے پر چلے گئے تھے۔ اُن کی واپسی تقریباً چار گھنٹوں بعد ہوئی تھی اور وہ لوگ بھارتی فوجیوں کی تمام رائفلیں اُٹھا لائے تھے۔

ہمارا خیال تھا کہ بابا عبدالفتح کے خفیہ ٹھکانے پر ریڈ کرنے والے فوجیوں کے واپس نہ پہنچنے اور چندر پال کی طرف سے بھی کوئی اطلاع نہ ملنے پر کوئی نہ کوئی فوجی دستہ اس بستی پر ہلہ بول دے گا۔ مگر وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ اگلے روز بھی کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ اُس روز بھی ہم نہیں جا سکے۔ اس سے اگلی رات شبہ تھا کہ بھارتی فوجیوں کی طرف سے کوئی نہ کوئی کارروائی ضرور ہو گی۔ بستی والوں کے پاس اب چار پانچ سب مشین گنیں آ چکی تھیں۔ پہلے بھی اُن کے پاس دو چار تھری ناٹ تھری کی رائفلیں موجود تھیں جنہیں ہمیشہ چھپا کر رکھا جاتا تھا۔ اور اب وہ رائفلیں بھی باہر نکل آئی تھیں۔ چند لوگوں نے رات کے وقت بستی کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اُن میں انگوری بھی شامل تھی اور میں بھی۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ اگر رات کو بھارتی فوجیوں کی کوئی گاڑی بستی میں داخل ہو تو اُن پر چاروں طرف سے فائر کھول دیا جائے اور اُن فوجیوں کو جہنم رسید کر کے اُن کے اسلحہ پر قبضہ کر لیا جائے لیکن..... اُس رات بھی کچھ نہیں ہوا۔

رات کے آخری پہر مجھے اور انگوری کو کچھ دیر سونے کا موقع مل گیا تھا اس لئے صبح ہم کسی قدر تازہ دم تھے۔ ناشتہ ہم نے ولی محمد کے گھر پر ہی کیا تھا۔ اور بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔

میں گلمرگ کی طرف جانا چاہتا تھا تاکہ کمانڈر محب اللہ یا کمانڈر رشید سے کسی طرح رابطہ کیا جا سکے۔ وہ اُس طرف بھارتی فوجیوں کے خلاف چھاپہ مار سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ لیکن انگوری ہندواڑہ جانا چاہتی تھی جہاں اُس کی خالہ رہائش پذیر تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ دو چار روز ہندواڑہ میں رہنے کے بعد ہم بارہ مولا کی طرف آ جائیں گے اور وہاں سے گلمرگ کی طرف نکل جائیں گے۔

ہمیں بستی سے دو خچر مل گئے۔ ہم بستی والوں سے رخصت ہو کر پہاڑوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ بستی والوں نے ہمیں کچھ کھانا بھی دے دیا تھا جو کم از کم دو وقت ہمارے کام آ سکتا تھا۔ بستی کے دو آدمی تقریباً تین میل تک ہمارے ساتھ آئے تھے پھر اُنہوں نے ہمیں آگے جانے کا راستہ سمجھا دیا۔ ہمیں واپس جانے کے لئے بھی وہ دریا پار کرنا تھا جس پر سے رسے کا پل پار کر

کے ہم اس طرف آئے تھے لیکن ہمیں جو راستہ بتایا گیا تھا اور جہاں سے دریا پار کرنے کو کہا گیا تھا وہاں سے دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا اور ہم خچروں سے اُترے بغیر دریا پار کر سکتے تھے۔

ہم بتائے ہوئے راستے پر دھان کے کھیتوں میں چلتے رہے۔ بالآخر کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ہم پہاڑوں میں داخل ہو گئے۔ دوپہر تک ہمارا سفر جاری رہا۔ اب ہم دریا کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے دریا کا پاٹ بتدریج چوڑا ہوتا جا رہا تھا۔

مسلسل کئی گھنٹوں تک خچر کی پشت پر بیٹھے بیٹھے میری کمر اکڑ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ انگوری بھی خچر پر بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے بار بار سینہ بھی سہلا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح اکڑ کر مسلسل کئی گھنٹوں تک بیٹھے رہنے اور جھٹکوں کی وجہ سے اُس کے سینے کے زخم میں تکلیف شروع ہو گئی تھی۔

اب ہم دریا میں اُتر چکے تھے۔ یہاں دریا کا پاٹ تقریباً ہزار گز چوڑا تھا۔ اس طرح پانی بھی پھیلا ہوا تھا۔ وسط میں ممکن ہے اس کی گہرائی دو ڈھائی فٹ کے قریب ہو مگر کنارے کے ساتھ ساتھ پانی ٹخنوں سے زیادہ گہرا نہیں تھا۔

میری نظر سامنے بہت دُور درختوں کے ایک جھنڈ پر مرکوز تھی۔ وہ جھنڈ دریا کے کنارے کے بالکل ساتھ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ وہاں پہنچ کر کچھ دیر آرام کر لیا جائے گا۔

ہم تقریباً بیس منٹ میں وہاں پہنچ سکتے تھے۔ وہ خوبانی کے درخت تھے۔ پھول جھڑ رہے تھے اور پھل ابھی آنا شروع ہوا تھا۔ میں اپنا خچر روک کر نیچے اُتر آیا اور انگوری کو بھی سہارا دے کر نیچے اُتار لیا۔ انگوری خچر سے اُترتے ہی چھوٹے چھوٹے پتھروں میں اُگی ہوئی مخملی گھاس پر لیٹ گئی۔ وہ ایک ہاتھ سے مسلسل سینے کو سہلا رہی تھی۔

''زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟'' میں نے اُس کے قریب بیٹھ کر پوچھا۔

''ہاں.....'' اُس نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''اکڑ کر بیٹھے رہنے اور جھٹکے لگنے سے درد ہو رہا ہے۔''

''مرہم والی وہ ڈبیہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جیب میں رکھی ہے۔ ابھی ذرا سانس درست ہو جائے تو میں نکالتی ہوں۔'' انگوری نے جواب دیا۔

''لاؤ..... نکالو ڈبیہ میں لگاؤں مرہم۔'' میں نے روانی میں کہہ دیا۔ اس میں میری بدنیتی کو کوئی دخل نہیں تھا اور میرے ذہن میں ایسا کوئی خیال بھی نہیں تھا۔

''کیا.....؟'' انگوری نے مجھے گھورا۔ ''کیا تم.....؟''

''سوری انگوری!'' میں گڑبڑا گیا۔ ''میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔'' مجھے اپنی بات پر شرمندگی ہو رہی تھی۔ میں اُٹھ کر چند گز دُور چلا گیا جہاں ٹخنوں تک گہرا پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے پہلے جی بھر کے پانی پیا پھر جوتے اُتار کر پیر پانی میں ڈال دیئے اور مُڑ کر انگوری کی طرف دیکھنے لگا۔

اُس کا ایک ہاتھ کرتے کے اندر تھا۔ شاید وہ زخم پر مرہم لگا رہی تھی۔ میں پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

چند منٹ بعد انگوری بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے قریب آ گئی۔

''ناراض ہو گئے؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیوں..... میں تم سے ناراض کیوں ہونے لگا؟'' میں نے کہا۔

''میں نے تمہیں ڈانٹ دیا تھا نا.....'' وہ میرے قریب ہی پتھر پر بیٹھ گئی اور جھک کر ہاتھ دھونے لگی۔

''میں نے تمہاری ڈانٹ کا برا نہیں مانا۔ غلطی میری ہی تھی۔ مجھے ایسی بات کہنی ہی نہیں چاہئے تھی۔ میں تو.....''

''میں جانتی ہوں۔'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''مجھے تمہاری نیت پر کوئی شبہ نہیں۔ اچھا بس، اب اس بات کو ختم کرو..... مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

بھوک تو مجھے بھی لگ رہی تھی۔ ہم جس جگہ بیٹھے ہوئے تھے درختوں کا سایہ وہاں تک پہنچ رہا تھا۔ میں وہ پوٹلی اُٹھا لایا جس میں ولی محمد کی بیوی نے کھانا باندھ دیا تھا۔ چاول کے آٹے کی موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔ ایک اور پوٹلی میں بھنے ہوئے چاول بھی تھے جن میں گڑ ملا ہوا تھا۔ روٹیوں پر مرچوں کا اچار رکھا ہوا تھا۔ میں نے کپڑے کو وہیں دسترخوان کی طرح بچھا دیا اور ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر اچار کے ساتھ روٹی کھانے لگے۔

''اگر تمہیں دو تین دن آرام مل جائے تو تمہارا زخم ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اور اگر اسی طرح بھاگ دوڑ کرتی رہی تو زخم کے پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہندواڑہ میں خالہ کے ہاں شاید آرام کا موقع مل جائے۔'' انگوری نے منہ میں نوالہ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن میں نے طے کر رکھا ہے کہ اب زندگی بھر آرام سے نہیں بیٹھوں گی۔ ان خونخوار بھیڑیوں کے خلاف لڑتی رہوں گی جو ہماری سرزمین پر قابض ہیں اور ہمارے بہن بھائیوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔''

''میرا بھی یہی مشن ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بابا عبدالفتح کی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ یوں تو ہر کشمیری مسلمان کا مشن یہی ہے کہ ان غاصب اور متعصب ہندوؤں کو اس وادی سے نکال دیا جائے، اس وادی کی فضاؤں میں آزادی کا پرچم لہرائے۔ اب تک ساٹھ ہزار سے زیادہ کشمیری مسلمان اسی کاز کے لئے اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ بابا عبدالفتح زندگی بھر بھارتی سامراج کے خلاف برسرپیکار رہا۔ اُس نے بھی اپنی جان دے دی۔ اُس کے مشن کو میں آگے بڑھاؤں گا اور وطن کی آزادی کے لئے لڑتے ہوئے جان دے دُوں گا۔''

انگوری خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور پھر ہم دیر تک بابا عبدالفتح ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

تقریباً ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ہم روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ ہمارے خچر گھاس چرتے ہوئے کچھ دُور چلے گئے تھے۔ میں اُنہیں پکڑ لایا۔ انگوری کو سہارا دے کر اُس کے خچر پر بٹھایا اور خود بھی اپنے خچر پر سوار ہو گیا۔

ولی محمد نے ہمیں بتایا تھا کہ یہ راستہ اگرچہ بہت طویل پڑے گا مگر اس لحاظ سے محفوظ ہے کہ اس طرف بھارتی فوج کی کسی گشتی پارٹی سے آمنا سامنا ہونے کی توقع نہیں۔ اور ہم دوپہر کے بعد سنگرام پہنچ جائیں گے۔

سنگرام ایک بڑا قصبہ تھا اور میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہ قصبہ ان شاہراہوں کے سنگم پر واقع تھا جہاں سے ایک سڑک بارہ مولا کی طرف، دوسری سرینگر اور تیسری سڑک سوپور سے ہوتی ہوئی ہندواڑہ کی طرف چلی گئی تھی۔

سوپور..... میرا گھر..... میری جائے پیدائش..... میرا وہ قصبہ جسے بھارتی غاصبوں نے جلا کر راکھ کر دیا تھا، میرے ماں باپ کو شہید کر دیا تھا، میری ایک بہن گولیوں سے چھلنی ہو گئی تھی اور دوسری بہن لاپتہ ہو گئی تھی..... سوپور میں میرے خاندان کے کئی لوگ تھے۔ ہم کسی کے ہاں بھی ٹھہر سکتے تھے۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ ہم اس وقت خطرناک پہاڑی راستوں پر سفر کر رہے تھے۔ خچر بڑے نستعلیق قسم کے تھے اور بڑے آرام سے چل رہے تھے۔ اُن کی سست رفتاری کی وجہ سے بھی ہمارا سفر طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔

اور پھر ایک جگہ ہمیں رُک جانا پڑا۔ ہمارے سفر کا خطرناک ترین مرحلہ ہمارے سامنے تھا اور ولی محمد نے اُس کے بارے میں ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ وہ راستہ بہت ہی خطرناک تھا۔ ایک طرف بالکل عمودی چٹان تھی۔ اُس کے ساتھ تقریباً چار فٹ چوڑی ایک پٹی سی تھی جس کے دوسری طرف سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ تھے اور نیچے بہت دُور دریا کا پانی دُھوپ میں چمک رہا تھا۔

یہ خطرناک راستہ تقریباً پچاس گز طویل تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ایک کارنس سی عمودی چٹان سے باہر کو نکلی ہوئی ہو۔ ہم دونوں اپنے اپنے خچروں سے اُتر آئے۔ وہاں ہوا بھی تیز تھی۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا، اُس کے چہرے پر خوف کے تاثرات اُبھرے ہوئے تھے۔

''یہ تو بڑی خطرناک جگہ ہے۔ کوئی اور راستہ نہیں؟'' انگوری نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میلوں دُور تک تو ہم تنگ سے درّے میں سفر کرتے آئے ہیں کوئی اور راستہ تو نظر نہیں آیا۔'' میں نے جواب دیا۔ اور اس خطرناک راستے کو دیکھنے لگا۔

''میرا خیال ہے کہ راستہ پار کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ بس ذرا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''خچروں پر سوار ہو کر تو ہم اس راستے پر نہیں جا سکتے۔ تم خچر کی لگام پکڑ کر چٹان کے ساتھ ساتھ چلتی رہنا۔ میں آگے چلتا ہوں اور تم میرے پیچھے رہنا۔''

انگوری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ متوحش سی نظروں سے اس راستے کو دیکھ رہی تھی۔ ایک انجانا سا خوف میرے ذہن میں بھی تھا۔ اُس پل صراط سے گزرتے ہوئے کوئی معمولی سی لغزش ہمیں تحت الثریٰ میں پہنچا سکتی تھی۔

ہم دونوں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ پہلے میں آگے بڑھا۔ میں نے خچر کی لگام اپنے ہاتھ میں پکڑ لی اور چٹان کے ساتھ رگڑ کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں نے لگام ایک طرف سے دبا رکھی تھی تاکہ خچر بھی چٹان کے قریب ہی رہے۔

''ڈرو مت انگوری.....'' میں نے انگوری کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''بس اسی طرح چٹان کے ساتھ ساتھ آ جاؤ!''

انگوری بڑی ہچکچاہٹ کے بعد خچر کی لگام پکڑے چٹان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ میں اُس سے تقریباً دس گز آگے تھا۔ تیز ہوا ہمیں پیچھے دھکیل رہی تھی۔ نیچے سینکڑوں فٹ گہرائی تھی اور اس طرف دیکھتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔ میں اُس طرف دیکھنے سے بھی کترا رہا تھا اور چیخ چیخ کر انگوری کو بھی ہدایات دیتا جا رہا تھا۔

ہم نے تقریباً چالیس گز کا فاصلہ طے کر لیا۔ آگے صرف دس گز فاصلہ رہ گیا تھا۔ لیکن آگے چند فٹ تک وہ راستہ مزید تنگ ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہاں سے اُس راستے کی چوڑائی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ ہمارے اس سفر کا کٹھن ترین مرحلہ تھا۔

میں نے انگوری کو پیچھے ہی رُکنے کو کہہ دیا اور خود بہت محتاط انداز میں دیوار کے ساتھ چپک کر آگے سرکنے لگا۔ خچر کو بھی میں نے چٹان کی طرف رکھا تھا۔ آٹھ دس فٹ کا یہ فاصلہ بہت قیامت خیز ثابت ہوا۔ باقی راستہ طے کرنے میں مجھے زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ خچر کو کھلی جگہ پر آگے ہانک کر میں واپس آ گیا۔ ابھی میں اُس تنگ راستے سے چند فٹ دُور ہی تھا کہ انگوری کے خچر کے ہنہنانے کی آواز سن کر چونک گیا۔ پتہ نہیں کس وجہ سے خچر مچل گیا تھا اور سر کو جھٹکے دے کر انگوری سے لگام چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ انگوری نے لگام کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا اور خچر کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''انگوری! لگام چھوڑ دو۔''

خچر کے ہنہنانے کے شور میں میری آواز انگوری کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اُس نے لگام چھوڑ دی۔ لگام چھوٹتے ہی خچر مزید پیچھے ہٹا۔ اُس کا ایک پیر کھڈ کے کنارے سے اُتر گیا اور پھر دوسرا پیر بھی.....

انگوری بھی لگام چھوڑتے ہی لڑکھڑا گئی تھی۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی اور انگوری کو ساتھ لیتا ہوا عمودی چٹان کے قریب گرا۔ انگوری میرے نیچے تھی اور میں نے اُسے بانہوں میں دبوچ رکھا تھا۔

خچر کے آگے والے دونوں پیر ایک لمحہ کو اُوپر اُٹھتے ہوئے نظر آئے اور پھر وہ کھڈ کی عمیق

گہرائیوں میں غائب ہو گیا.....

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ انگوری کو جب میں ساتھ لے کر گرا تھا تو اُس کے منہ سے ایک سی چیخ نکل گئی تھی اور میرے نیچے دبی وہ اب بھی ہولے ہولے چیخ رہی تھی لیکن میں نے اُسے دبوچ رکھا۔

بالآخر جب میں نے محسوس کیا انگوری پُرسکون ہو گئی ہے تو میں اُس کے اُوپر سے ہٹ گیا لیکن اُس کا ایک ہاتھ تھامے رکھا۔ انگوری کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ چکا تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی۔ اُس نے ایک نظر کھڈ کی طرف دیکھا، پھر اُس کی نظریں میری طرف اُٹھ گئیں اور دوسرے ہی لمحے وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی..... وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ میں نے اُسے اپنی بانہوں میں سمو لیا۔

○

کئی منٹ گزر گئے..... میں انگوری سے الگ ہو گیا اور اُسے سہارا دے کر اُٹھا دیا۔ اُس نے نیچے جھانک کر دیکھا اور میرے ساتھ جڑ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اب بھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ میں نے بھی نیچے جھک کر دیکھا سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں خچر کا کہیں نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں انگوری کا ہاتھ تھامے چٹان کے ساتھ ساتھ سرکتا رہا۔ تیز ہوا ہمیں پیچھے دھکیل رہی تھی۔ انگوری نے نیچے کی طرف دیکھا اور پھر ایک ہاتھ سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔

''نیچے مت دیکھو..... چکر آ جائے گا۔'' میں نے کہا اور اُس کا ہاتھ تھامے کھڑا رہا۔

انگوری کی وجہ سے وہ پل صراط عبور کرنے میں کئی منٹ لگ گئے۔ اس خوفناک ترین راستے کے اختتام پر کھلی جگہ تھی۔ چند گز آگے دو تین درخت تھے۔ میرا خچر اُس طرف گھاس چر رہا تھا۔ میں انگوری کو لے کر ان درختوں کے نیچے آ گیا۔ انگوری ایک پتھر پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میں اُس کے قریب کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ کچھ دُور کہیں بلندی سے پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں خچر کو پکڑ کر لے آیا۔ انگوری کو سہارا دے کر خچر پر بٹھایا اور خود لگام پکڑ کر پیدل چلنے لگا۔ ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ بیس پچیس گز آگے ایک موڑ گھومتے ہی ہم رُک گئے۔ سامنے دس بارہ فٹ کی بلندی سے پانی کی ایک چار پانچ فٹ چوڑی چادر سی گر رہی تھی۔ نیچے جمع ہونے والا پانی ایک ندی کی صورت میں مخالف سمت میں بہہ رہا تھا۔ اس آبشار کے آس پاس رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

انگوری خچر سے اُتر آئی۔ جی بھر کر پانی پینے کے بعد ہم چند منٹ وہاں رُکے اور پھر آگے چل پڑے۔ انگوری میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اُس نے خچر پر بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔

''تم اُس وقت دوڑے کیوں تھے..... اگر تمہارا پیر پھسل جاتا تو.....؟'' انگوری نے چلتے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہوتا.....؟'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''خچر سے پہلے میں اُس کھڈ میں پہنچ جاتا۔''

''آئندہ ایسی کوئی بات منہ سے مت نکالنا۔'' انگوری نے مجھے گھورا۔

''اگر میں دوڑ نہ لگاتا تو خچر کے ساتھ تم بھی پاتال میں پہنچ چکی ہوتیں۔ تم تو خچر کی لگام چھوڑنے کو تیار ہی نہیں تھیں۔'' میں نے کہا۔

''تو تم نے میری خاطر اپنی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی تھی۔'' انگوری نے کہتے ہوئے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دل کی بات زبان پر لانے کی ہمت نہ کر سکا۔

''تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا؟'' انگوری بولی۔

''خاموشی ہی بعض باتوں کا بہترین جواب ہوتی ہے۔'' میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''تم تھک جاؤ گی۔ خچر پر بیٹھ جاؤ!''

''اور تم.....؟'' اُس نے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''لگام پکڑے پیدل چلتے رہو گے؟''

''ہاں..... میں پیدل چلنے کا عادی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

پھر یہ طے ہوا کہ ہم دونوں خچر پر بیٹھ جائیں۔ میں نے ایک بڑے پتھر کے قریب خچر روک لیا۔ پہلے خود سوار ہوا اور پھر انگوری بھی پتھر پر چڑھ کر میرے پیچھے بیٹھ گئی۔ خچر کی کاٹھی کافی مضبوط تھی۔ وہ ہمارا بوجھ اُٹھائے آرام سے چلتا رہا۔

نیلے پتھروں کی سنگلاخ چٹانیں دُھوپ میں تپ رہی تھیں لیکن سبزے کی کثرت اور ہوا کی وجہ سے گرمی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ہم چٹانوں کے بیچ بل کھاتے ہوئے تنگ راستے پر سفر کرتے رہے۔ کئی جگہوں پر ہمیں خچر سے اُتر کر پیدل چلنا پڑا تھا۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ ولی محمد نے کہا تھا کہ دوپہر کے تھوڑی دیر بعد ہم شگرام پہنچ جائیں گے۔ لیکن ہم مسلسل اُونچے پہاڑوں میں سفر کر رہے تھے اور آبادی کا کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا..... میرے دل میں اب طرح طرح کے خدشے سر اُبھارنے لگے تھے۔ کہیں ہم راستہ تو نہیں بھٹک گئے.....؟

تھوڑی ہی دیر بعد انگوری نے بھی اس خدشے کا اظہار کیا۔

''اگر ہم راستہ بھول گئے تو ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہیں گے اور ہمیں رات بھی یہیں گزارنی پڑے گی۔'' انگوری نے کہا۔

''پہاڑوں میں رات گزارنے سے ڈرتی ہو؟'' میں بولا۔

''ڈر اور خوف.....'' انگوری نے جواب دیا۔ ''یہ دونوں چیزیں تو میں نے اُسی روز ذہن

سے نکال دی تھیں جب ہاتھوں میں رائفل اُٹھائی تھی۔'' انگوری نے جواب دیا۔

''اس وقت ہم دونوں خچر پر سوار تھے۔ انگوری میرے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک جگہ چھوٹا گڑھا تھا۔ خچر نے گڑھا پار کرنے کے لئے ہلکی سی چھلانگ لگائی تو انگوری اپنی جگہ پر اُچھلی اور پھر وہ آگے کو جھک کر میرے ساتھ جڑ گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھ میری بغلوں کے نیچے سے نکال کر میرے سینے پر لپیٹ لئے تھے۔

اپنی پشت پر انگوری کے بدن کا گداز لمس محسوس کر کے میں اپنے آپ میں عجیب سی سنسنی محسوس کرنے لگا۔ میرا خیال تھا انگوری پہلے کی طرح سنبھل کر بیٹھ جائے گی لیکن اُس نے تو اپنا سر بھی میرے شانے پر ٹکا دیا تھا۔

میں نے خچر روک لیا۔ انگوری سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہم واقعی راستہ بھول گئے ہیں۔'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''اب کیا ہوگا؟'' انگوری کے لہجے میں وحشت سی تھی۔

''راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بصورت دیگر اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے ہمیں کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنی پڑے گی۔'' میں نے کہا۔

ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ خچر بھی تھک گیا تھا۔ اُس کے چلنے کی رفتار بھی بہت کم ہو گئی تھی۔ ایک جگہ ہم دونوں خچر سے اُتر آئے۔ میں نے خچر کی لگام پکڑ لی..... ہم پیدل چلتے رہے۔ ہم اپنا یہ سفر مزید ایک گھنٹے سے زیادہ جاری نہیں رکھ سکے۔

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ پانی کے ایک جھرنے کے قریب ہمیں ایک مناسب جگہ بھی مل گئی جہاں رات گزاری جا سکتی تھی۔ وہ ایک کھوہ سی تھی جو چٹان میں پانچ چھ فٹ اندر کی طرف چلی گئی تھی۔ اُس کھوہ میں ہم ہوا سے بھی محفوظ رہ سکتے تھے۔

ہم نے وہیں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اندھیرے میں ان چٹانوں میں سفر جاری رکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ کھانے والی پوٹلی میرے والے خچر کی زین کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ اگر وہ پوٹلی دوسرے خچر کے ساتھ ہوتی تو ہمیں بھوکے رہنا پڑتا۔ میں نے وہ پوٹلی اُتار لی اور خچر کو کھلا چھوڑ دیا۔

ہم نے جھرنے کے قریب بیٹھ کر کھانا کھایا، پھر میں نے اس کھوہ کا جائزہ لیا۔ اندر کافی کشادہ جگہ تھی۔ ایک طرف کونے میں جلی ہوئی لکڑیاں اور کوئلے بھی نظر آئے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کسی وقت یہاں کوئی ٹھہرا ہوگا۔

خچر کی لگام میں نے درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ کے ساتھ باندھ دی اور ہم دیر تک اُس کھوہ کے سامنے پتھروں پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے سردی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ہم اُٹھ کر کھوہ

کے اندر آ گئے۔ میں دہانے کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ٹانگیں آگے کو پھیلا لیں۔ انگوری بھی میرے ساتھ ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

گہری تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وحشت سی ہو رہی تھی۔ غار کے اندر اگرچہ تیز ہوا سے بچ گئے تھے مگر سردی بہرحال تھی۔ انگوری میرے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ اور پھر اُس نے اپنا سر میرے کندھے پر ٹکا دیا۔

انگوری سے میری ملاقات کو کئی روز ہو چکے تھے اور اس وقت سے ہم ساتھ ہی رہے تھے۔ شروع میں تو ہمارے درمیان باتوں میں بھی کچھ تکلف رہا تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ ہم غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ جس طرح ہم دونوں نے ایک ہی خچر پر سفر کیا تھا اور جس طرح اب وہ میرے کندھے سے سر ٹکائے بیٹھی تھی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ انگوری بھی غیر محسوس انداز میں میرے اور اپنے بیچ فاصلہ کم کر رہی تھی۔

سردی بڑھ گئی تھی۔ ہوا سے بچنے کے لئے ہم غار کے آخری سرے پر چلے گئے۔ انگوری میرے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ سو گئی۔ اُس کا سر بار بار میرے کندھے سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے سہارا دے کر اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

دن بھر خچر کی سواری اور پیدل چلنے سے میں بھی بری طرح تھک گیا تھا۔ میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور میرا سر بھی بار بار سینے پر جھک رہا تھا۔ میں جاگتے رہنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہ ہو سکا اور بالآخر میں بھی نیند کی وادی میں اُتر گیا۔

میری آنکھ کھلی تو میں گڑبڑا سا گیا۔ باہر دُھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اندر بھی روشنی ہو رہی تھی۔ انگوری اب بھی میری گود میں سر رکھے سو رہی تھی۔ اُس نے ٹانگیں اس طرح سمیٹ رکھی تھیں کہ گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے۔ میرا ایک ہاتھ اُس کے سینے پر تھا اور انگوری کا ہاتھ میرے سر پر..... میں اس صورتحال پر گڑبڑا سا گیا۔ میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ ہٹانا چاہا تو انگوری نے اپنے ہاتھ سے میرا ہاتھ دبا لیا۔ وہ نیند میں تھی۔

''انگوری.....'' میں نے ہولے سے اُسے پکارا۔ ''دن چڑھ آیا ہے۔ اب اُٹھ جاؤ!''

''اونہوں..... سونے دو نا! نیند آ رہی ہے۔'' وہ نیند ہی میں بڑبڑائی۔

''دن چڑھ آیا ہے..... اب اُٹھ جاؤ!'' میں نے کہا۔ ''ہم سارا دن اس ویرانے میں نہیں بیٹھ سکتے۔''

انگوری نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے میرا ہاتھ اب بھی اپنے سینے پر دبا رکھا تھا۔ آنکھیں کھولنے کے بعد بھی دیر تک اُس کے دماغ پر نیند کا خمار طاری رہا۔ وہ خمار آلود سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ لیکن پھر حقیقت کا ادراک ہوتے ہی اُس نے میرا ہاتھ ہٹایا اور ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اوہ..... میں شاید گہری نیند سو گئی تھی۔'' وہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔ اُس کے چہرے

پر سرخی سی پھیل گئی تھی۔

میں چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر غار سے باہر آ گیا۔ دُھوپ خاصی تیز تھی۔ چند منٹ بعد انگوری بھی باہر آ گئی۔

''ارے..... خچر کہاں گیا؟'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

میں اُچھل پڑا..... میں نے خچر کی عدم موجودگی کا خیال ہی نہیں کیا تھا۔ میں درخت کی اُس شاخ کی طرف دیکھنے لگا جس سے خچر کی لگام باندھی تھی۔ وہاں سے کچھ پتے ٹوٹے ہوئے تھے جس سے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ رات کو یا صبح کسی وقت خچر نے وہاں سے دُور ہٹنے کی کوشش کی ہوگی جس سے لگام اس شاخ سے نکل گئی ہو۔

میں خچر کو اِدھر اُدھر تلاش کرتا رہا مگر اُس کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آیا۔ میرا خیال تھا وہ چٹانوں میں کہیں دُور نکل گیا تھا اور اب اُسے تلاش کرنا بیکار تھا۔ میں جھرنے کے قریب واپس آ گیا۔ انگوری اس وقت کچھ قدآدم جھاڑیوں سے باہر آ رہی تھی۔

ہم نے جھرنے کے قریب بیٹھ کر بچی ہوئی روٹی کھائی۔ جی بھر کے پانی پیا اور اپنی رائفلیں سنبھال کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ نہایت دُشوار راستہ تھا۔ چٹانوں پر اُترنے چڑھنے سے انگوری بری طرح ہانپ گئی تھی۔ اُس کی وجہ سے بار بار رُکنا پڑ رہا تھا۔

ایک موقع پر میں نے انگوری کا ہاتھ پکڑا تو چونک گیا..... اُس کا ہاتھ گرم ہو رہا تھا۔ میں نے اُس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔

''تمہیں گرمی کی وجہ سے ایسا محسوس ہو رہا ہے..... میں ٹھیک ہوں۔'' انگوری نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

لیکن اُس کی یہ حرارت موسم کی گرمی کی وجہ سے نہیں تھی۔ رات کی سردی، اُس کے سینے کے زخم اور تھکن کی وجہ سے اُسے حرارت ہو گئی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ سورج سر پر چمک رہا تھا۔ انگوری نڈھال ہو رہی تھی۔ اب اُس کے لئے چلنا بھی دوبھر ہو رہا تھا.....

ایک چھوٹی سی ندی کے قریب ہم رُک گئے۔ انگوری پانی کے چند گھونٹ پی کر ندی کے کنارے ہی گھاس پر لیٹ گئی اور میں اِدھر اُدھر پھر کر کوئی راستہ تلاش کرنے لگا مگر کوئی راستہ نہیں ملا۔

میں انگوری کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ بخار تیز ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ انگوری ایک ہاتھ سے بار بار سینہ سہلا رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اُسے بخار بھی سینے کے اس زخم کی وجہ سے چڑھا تھا۔

''ایک بات کہوں انگوری..... برا تو نہیں مانو گی؟'' میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

''کہو.....!'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمہیں بخار سینے کے زخم کی وجہ سے چڑھا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ انفیکشن نہ ہو گیا ہو۔ اگر تم

اجازت دو تو.....'' میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی، پھر آنکھیں بند کر لیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر سینے پر رکھ لیا۔

میں نے بڑی آہستگی سے انگوری کی قمیض اُوپر اُٹھا دی۔ مجھ پر اس وقت عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی.....

انگوری کے سینے پر دائیں طرف زخم تھا۔ زخم زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس کے آس پاس کی جلد سرخ ہو رہی تھی۔ میں نے انگوری کی جیب سے مرہم کی ڈبیہ نکالی اور اُنگلی پر مرہم نکال کر اُس کے زخم پر لگانے لگا۔ میرا ہاتھ واضح طور پر کانپ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

انگوری نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہٹا دیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اُس کی قمیض نیچے کر دی اور اُس کے چہرے کو تکنے لگا۔

''تمہیں مناسب آرام اور علاج کی ضرورت ہے.....'' میں نے کہا۔ ''دُعا کرو ہمیں ان پہاڑوں سے نکلنے کا راستہ مل جائے۔ کسی بستی میں پہنچ جائیں تو سب سے پہلے.....''

''میرا علاج کراؤ گے۔'' انگوری نے میری بات مکمل کر دی۔

''ہاں.....'' میں نے جواب دیا۔

ہم تقریباً آدھے گھنٹے تک وہاں رُکے اور ایک بار پھر آگے چلنے لگے۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ انگوری سے اب بالکل نہیں چلا جا رہا تھا۔ وہ بار بار لڑکھڑا رہی تھی۔ اب اُسے آگے لے جانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں نے دونوں رائفلیں اپنے ایک کندھے پر لٹکا لیں اور انگوری کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

''میری پشت پر بیٹھ جاؤ..... اب تم سے چلا نہیں جا رہا۔''

انگوری کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ انکار کرتی رہی مگر میں نے اُسے زبردستی اپنی پشت پر لاد لیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ میرے سینے پر لپیٹ لئے اور میں نے دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر اُسے سہارا دیئے رکھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم اُن چٹانوں سے نکل آئے۔ نیچے نشیب میں پھیلی ہوئی وادی میں ایک جگہ سے دُھویں کی لکیر اُٹھتی دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ میں نے انگوری کو آہستگی سے نیچے اُتار دیا۔

''وہ دیکھو انگوری.....'' میں نے اِشارہ کیا۔ ''وہ..... وہاں کوئی مکان ہے۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ بس چند منٹ رُک جاؤ..... پھر چلتے ہیں۔''

انگوری کے چہرے پر بھی رونق سی آ گئی تھی..... وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس

لینے لگی۔ میں بھی اُس کے قریب بیٹھ کر اپنے بے ضبط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔
پندرہ بیس منٹ گزر گئے اور پھر اپنے عقب میں ایک غراتی ہوئی آواز سن کر ہم دونوں اُچھل پڑے.....

''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا..... ورنہ گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے۔''

مجھے سینے میں اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا..... میں نے کن انکھیوں سے انگوری کی طرف دیکھا اُس کا چہرہ سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اور پھر رائفل کی نال میری پشت کو چھونے لگی..... میں نے اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے اور آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگا.....

○○○

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں.....

اُس غراتی ہوئی آواز نے جس طرح مجھے ہینڈز اَپ کروایا تھا اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ بھارتی فوجی تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ ہم کسی بستی کے قرب و جوار میں تھے اور یہاں کوئی فوجی چوکی یا نیا کیمپ بھی تھا۔ اور یہ فوجی گشت کرتے ہوئے اس طرف آ گئے تھے۔

چند منٹ پہلے انگوری کو بٹھانے کے بعد میں نے اپنے کندھے پر لٹکی ہوئی دونوں رائفلیں بھی زمین پر رکھ دی تھیں اور رائفل تک ہاتھ بڑھانے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میرے لئے تو کوئی معمولی سی حرکت کرنا بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔

رائفل کی نال گردن سے ہٹ کر اب میری پشت پر ٹک گئی تھی۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ میں اب بھی موت کے بھیانک جبڑوں میں تھا۔

دفعتہً ویرانہ فائر کی آواز سے گونج اُٹھا..... اور رائفل کی یہ گولی ہمارے پیچھے کئی گز کے فاصلے پر چلائی گئی تھی۔ پہاڑیوں میں دیر تک فائر کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ اس کے فوراً ہی بعد ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میں نے فائر کرنے کو منع کیا تھا..... یہ گولی کس نے چلائی ہے؟''

لہجہ اور الفاظ سو فیصد کشمیری تھے۔ کوئی بھارتی فوجی اس طرح خالی کشمیری لہجے میں بات نہیں کر سکتا تھا۔

''غلطی سے ٹرائیگر دب گیا تھا.....'' جواب میں ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ لہجہ بھی خالص کشمیری تھا۔

اب میں سمجھ گیا کہ یہ بھارتی فوجی نہیں تھے۔ جس نے فائر ہونے پر جواب طلبی کی تھی اُس شخص نے رائفل میری پشت سے لگا رکھی تھی۔ ایک لمحے کے لئے رائفل میری پشت سے ہٹ گئی تھی اور اس طرح مجھے گردن گھما کر پیچھے دیکھنے کا موقع مل گیا۔

وہ درمیانے قد کا دُبلا پتلا سا آدمی تھا۔ سر کے بال بکھرے ہوئے اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں سرخی تھی۔ اُس نے پرانی سی جینز اور میلی سی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کمر پر رائفل کی گولیوں سے بھرا ہوا بیلٹ تھا جس میں دو میگزین بھی اڑسے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی جس کا رُخ میری طرف تھا۔

جس شخص نے انگوری کو رائفل کی زد پر لے رکھا تھا وہ قدرے دراز قامت اور بھاری بھرکم

آدمی تھا۔ اُس کی عمر بھی تیس سے زیادہ نہیں تھی۔

''تم لوگ کون ہو اور ہمیں اس طرح.....''

''پہلے تو ہم تم سے پوچھیں گے کہ تم لوگ کون ہو؟'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''اور ان پہاڑوں میں کس طرح پہنچے؟'' اُس نے میری طرف دیکھا اور پھر انگوری کی طرف دیکھنے لگا۔

انگوری کو میں نے پتھر سے ٹیک لگا کر بٹھایا تھا اور وہ پھسلتی ہوئی ذرا نیچے ہوگئی تھی۔ اُس نے مردانہ کپڑے پہن رکھے تھے اُس کا چہرہ بھی دوسری طرف تھا اس لئے وہ لوگ ابھی تک اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے گی۔

''میرا نام شمروز ہے..... اور یہ میری ساتھی انگوری ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم کروڑ سے سنگرام کی طرف جا رہے تھے۔ وہاں سے سوپور سے ہوتے ہوئے ہندواڑہ کی طرف جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن پہاڑوں میں راستہ بھٹک گئے۔''

''شمروز.....'' اُس شخص کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔ وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ''تم لوگ کروڑ میں ولی محمد کے پاس تو نہیں ٹھہرے ہوئے تھے کیا؟''

''ہاں ہاں.....'' میں نے جلدی سے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''ہم ولی محمد کے پاس ہی تھے اور وہاں ہم نے ایک بھارتی ایجنٹ کو بھی ٹھکانے لگایا تھا جو.....''

''جو بابا عبدالفتح کی شہادت کا ذمہ کا ذمہ دار تھا۔'' وہ شخص بولا۔

''ہاں..... وہ مسلمان کے بھیس میں کئی مہینوں سے اُس گاؤں میں رہ کر مجاہدین کے خلاف جاسوسی کر رہا تھا اور بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔'' میں نے جواب دیا۔

اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی۔ اُس نے اپنی رائفل ایک پتھر کے سہارے کھڑی کر دی اور دونوں بانہیں پھیلا دیں۔

''معاف کرنا دوست.....'' وہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ''تمہارا نام تو پوری وادی میں گونج رہا ہے۔ تمہیں اگرچہ بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے لیکن سب نے تم سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ چند روز پہلے کمانڈر محب اللہ سے تمہارے بارے میں سنا تھا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج تم سے ملاقات ہوگئی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اپنے اس رویئے پر معذرت کرتے ہوئے بولا۔

''بھارتی فوجی اور اُن کے ایجنٹ کشمیری مجاہدین کا بھیس بدل کر مجاہدین کے ٹھکانوں کا سراغ لگانے کے لئے پہاڑوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ ہم اُن لوگوں سے کچھ نقصان بھی اُٹھا چکے ہیں۔ اس لئے ہمیں محتاط رہنا پڑتا ہے۔''

اُس کا نام گل فراز تھا۔ وہ لوگ کل شام ہی کو کروڑ نامی اُس بستی سے ہو کر آئے تھے جہاں ہم نے رستم نامی مسلمان کے بھیس میں ہندو ایجنٹ کو ٹھکانے لگایا تھا۔ کروڑ میں ابھی تک سکون تھا۔ بھارتی فوجیوں کو ابھی تک اپنے ایجنٹ کے مارنے جانے کی خبر نہیں پہنچی تھی۔

''میری ساتھی انگوری کو بہت تیز بخار ہے۔'' میں نے گل فراز کو بتایا۔ ''اس کے سینے پر معمولی سا زخم ہے جس کی وجہ سے بخار ہو گیا ہے۔ اسے فوری طور پر طبّی امداد کی ضرورت ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اب اتفاق سے تم لوگوں سے ملاقات ہوگئی ہے۔ شاید تم لوگ ہماری کچھ مدد کر سکو۔''

''کیوں نہیں.....'' گل فراز نے جواب دیا اور آگے بڑھ کر انگوری کی پیشانی چھو کر دیکھنے لگا۔ اور دوسرے ہی لمحے ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ ''بخار تو بہت تیز ہے..... میرے پاس اسپرین کی گولی ہے۔ فوری طور پر تو یہی دی جا سکتی ہے۔ اسے فوری طور پر بستی میں پہنچانا ہوگا۔''

''ہم نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا۔'' میں نے کہا۔ ''خالی پیٹ کوئی بھی دوا انگوری کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔''

گل فراز نے ایک پوٹلی کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ اُس میں تین چار موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔

''انگوری بہن! تھوڑی سی روٹی کھا لو..... پھر یہ گولی کھا لینا۔'' اُس نے کہتے ہوئے قمیض کی جیب سے پیراسیٹامول کی گولیوں کا پتا نکال کر اُس میں سے ایک گولی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

گل فراز کے ساتھی بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے اور ہماری طرح ان پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے ہندواڑہ کی طرف ہی جا رہے تھے۔ ایک آدمی نے پانی کی چھاگل بھی کندھے سے اُتار کر ہمارے قریب رکھ دی۔

انگوری دو تین نوالوں سے زیادہ نہیں کھا سکی تھی۔ میں نے اُسے گولی بھی کھلا دی اور روٹی کے دو چار نوالے خود بھی کھائے۔

گل فراز بتا رہا تھا کہ ہم سنگرام سے بہت دُور نکل چکے ہیں۔ اُس طرف جانا اب بیکار ہے۔ البتہ پانزل وہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں انگوری کو طبّی امداد بھی مل جائے گی اور ہم دو چار روز وہاں آرام بھی کر سکیں گے۔

انگوری سے اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اُسے پھر پشت پر لاد لیا اور اس طرح ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ گل فراز اور اُس کا ایک ساتھی آگے تھا۔ اُن کے پیچھے میں اور دو آدمی ہمارے پیچھے تھے۔ ہماری رائفلیں بھی گل فراز ہی کے ایک آدمی نے اُٹھا رکھی تھیں۔ راستہ خاصا خطرناک اور آڑھا ترچھا تھا۔ ہم مسلسل نشیب کی طرف جا رہے تھے۔ کوئی معمولی سی غلطی ہمیں کسی حادثے سے دوچار کر سکتی تھی۔

ایک جگہ میں نے انگوری کو ایک پتھر پر بٹھا دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ گل فراز نے پیشکش کی تھی کہ کچھ دُور تک وہ انگوری کو اپنے کندھے پر اُٹھا لیتا ہے لیکن انگوری نے نفی میں سر ہلا دیا۔

پندرہ منٹ بعد ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ اس مرتبہ کچھ زیادہ فاصلہ طے کر لیا لیکن بالآخر

درختوں کے ایک جھنڈ میں رُک گئے۔ چند منٹ آرام کرنے کے بعد گل فراز اور اُس کے ساتھی درختوں سے موٹی اور باریک شاخیں توڑنے لگے۔ اُن درختوں کی پتلی شاخیں بہت لچک دار اور گھنے پتوں والی تھیں۔

گل فراز نے دو موٹی شاخیں تقریباً دو فٹ کے فاصلے پر ایک دوسرے کے متوازی زمین پر رکھ دیں اور پتلی اور لچکدار شاخوں سے باندھنے لگے۔ میں توجہ سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد آرام دہ سٹریچر تیار ہو چکا تھا۔ انگوری کو اُس سٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ گل فراز کے دو ساتھیوں نے سٹریچر کو آگے پیچھے سے اُٹھایا اور ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

ہم مسلسل نشیب میں اُترتے ہوئے بالآخر ایک وادی میں پہنچ گئے جہاں بہت دُور ایک بستی دکھائی دے رہی تھی۔ بعض گھروں کی چمنیوں سے دُھواں بھی اُٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

گل فراز رُک گیا۔ سٹریچر بھی آہستگی سے نیچے رکھ دیا گیا۔ میں سٹریچر کے قریب بیٹھ گیا۔ انگوری کی پیشانی کو چھو کر دیکھا مجھے کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ پیشانی بدستور تپ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھی بخار کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ میں انگوری سے باتیں کرتے ہوئے اُسے تسلیاں دیتا رہا۔ انگوری کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''تم میرے لئے بہت پریشان ہو؟'' اُس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے مدھم سی آواز نکلی۔

''فطری بات ہے..... مجھے تمہارے لئے پریشان ہونا ہی چاہئے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیوں.....؟'' اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''اس لئے کہ تم کشمیر کی بیٹی ہو۔ اور تم نے اس دھرتی کی آن کے لئے اپنی جان و آبرو داؤ پر لگا رکھی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ.....'' اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''صرف اس لئے کہ.....''

''تمہارے لئے پریشان ہونے کی اور بھی بہت سی وجوہات ہیں۔'' میں نے کہتے ہوئے اُس کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر ہولے سے دبایا۔ ''پہلی بار جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو میرے سینے میں پہلی مرتبہ ایک عجیب سا احساس جاگ اُٹھا تھا۔ اور جب میں تمہاری بستی سے رُخصت ہوا تھا تو کچھ عجیب سی کیفیت طاری تھی مجھ پر..... اور اس کے بعد ہماری ملاقات عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ تمہارے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ اب کوئی غاصب کشمیر کی کسی بیٹی کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اُس کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے بات جاری رکھی۔

''جب میں تمہاری بستی سے رُخصت ہوا تو میرے ذہن میں صرف ایک بات تھی کہ شاید دوبارہ تمہیں نہ دیکھ سکوں۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم دوبارہ اس طرح ملیں گے کہ ہمیں موت ہی ایک دوسرے سے جدا کر سکے گی۔ اب تم سمجھ گئی ہو کہ میں تمہارے لئے پریشان

کیوں ہوں۔''

انگوری کی سرخ آنکھیں چمک اُٹھیں۔ چہرے پر رونق سی آ گئی۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اُس نے میرا ایک ہاتھ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور کچھ کہے بغیر میرے چہرے کو تکتی رہی۔

چند منٹ اور گزر گئے۔ گل فراز اور اُس کے ساتھ روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ اس مرتبہ سٹریچر کو پچھلی طرف سے میں نے اُٹھا لیا۔ انگوری سٹریچر پر اس طرح لیٹی ہوئی تھی کہ اُس کا چہرہ میری طرف تھا اور میں اُس سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

بستی سے دو فرلانگ دُور ہم گنجان درختوں میں رُک گئے۔ گل فراز کا ایک ساتھی درختوں میں چھپتا ہوا بستی کی طرف چلا گیا اور ہم سب اپنی اپنی رائفلیں اُٹھا کر مختلف جگہوں پر پوزیشن لے کر بیٹھ گئے۔

ہمارے سامنے پانزل نام کی وہ بستی تھی جو میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یہ بستی سوپور سے اٹھارہ بیس میل کے فاصلے پر تھی اور میں بچپن میں اپنے والد کے ساتھ کئی مرتبہ یہاں آ چکا تھا۔ نیلے پہاڑوں میں گھری ہوئی اس بستی کے چاروں طرف کی زمین بڑی زرخیز تھی۔ یہاں سیب اور خوبانی کے باغات تھے اور یہاں دنیا کا بہترین زعفران بھی پیدا ہوتا تھا۔ تھوڑی بہت گیہوں کی کاشت بھی ہوتی تھی البتہ چاول یہاں کی مرکزی فصل تھی اور یہ فصل سال میں دو مرتبہ حاصل کی جاتی تھی۔

پانزل نام کی یہ بستی سوپور سے بارہ مولا کی طرف جانے والی شاہراہ سے تین چار میل ہٹ کر تھی۔ یوں تو کشمیر کی کوئی بھی بستی بھارتی فوجیوں کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں تھی لیکن پانزل کے بارے میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ شاہراہ سے ہٹ کر ہونے کی وجہ سے بھارتی فوجیوں کی آمد کی خبر ہو جاتی تھی اور یہاں پناہ گزین مجاہدین کو بھارتی فوجیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی بستی سے نکال کر پہاڑوں میں کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دیا جاتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا ایک مرتبہ چند مجاہدین نے اس بستی میں پناہ لے رکھی تھی۔ بستی سے تین میل دُور سڑک کی نگرانی کے لئے دو آدمی بٹھا دیئے گئے تھے۔ اُن کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ وہ جس جگہ بیٹھے تھے وہاں سے دوسری طرف دُور تک سڑک کو دیکھ سکتے تھے۔ اس طرف سے کوئی فوجی گاڑی آتے دیکھ کر وہ موٹر سائیکل پر بستی میں پہنچ کر اطلاع دے دیتے۔ لیکن نجانے کیا ہوا کہ وہ دونوں پکڑے گئے تھے اور فوج کے دستے نے بستی پر بلہ بول دیا تھا.....

فوج کے اس طرح اچانک سر پر پہنچ جانے سے بستی والے اور بستی میں چھپے ہوئے مجاہدین گڑبڑا گئے تھے۔ اُنہوں نے بستی سے نکل جانے کی کوشش کی مگر وہ فوجی دستے کے گھیرے میں آ چکے تھے۔

خون کے پیاسے بھارتی فوجیوں نے نہ صرف اُن مجاہدین کو گھیرے میں لے کر گولیوں سے

بھون ڈالا بلکہ بستی کو بھی جلا کر راکھ کر دیا۔ بستی کے سات آدمی شہید ہوئے تھے اور درجنوں زخمی۔

اس وقت نظر آنے والی بستی اگرچہ پُرسکون تھی۔ کسی گڑبڑ کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر گل فراز احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور اُس نے اپنے ایک ساتھی کو صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے بستی کی طرف بھیج دیا۔

اُس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ اُنہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہم سب سے ہاتھ ملایا۔ اُن کی اطلاع کے مطابق کئی روز سے سکون تھا اور کسی بھارتی فوجی نے ادھر کا رُخ نہیں کیا تھا۔ اُنہی دونوں آدمیوں نے انگوری کا سٹریچر اُٹھا لیا اور ہم لوگ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔

بستی کے کئی مکان اب بھی خاکستر ملبے کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ یہ اُن غریب کاشتکاروں کے مکان تھے جو انہیں دوبارہ تعمیر کرانے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ وادی کی معیشت تباہ ہو چکی تھی۔ شہروں میں ہر قسم کا کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا۔ کھیتی باڑی بھی تباہ ہو چکی تھی۔ بعض علاقوں میں بھارتی فوجی کھڑی فصلیں تباہ کر جاتے تھے۔ کسان بھی بدحالی کا شکار تھے۔ اُن کے پاس پیٹ بھر کر کھانے کو اناج تک نہیں تھا نئے مکان کیسے تعمیر کرتے؟ وہ لوگ یا تو جھونپڑوں میں وقت گزار رہے تھے یا دوسروں کے گھروں میں پڑے ہوئے تھے۔

ہمیں غلام دین نامی ایک شخص کے گھر میں پہنچا دیا گیا۔ ہماری آمد کی خبر آناً فاناً پوری بستی میں پھیل گئی۔ یہاں چند دلچسپ انکشافات بھی ہوئے۔ بستی کے لوگوں کو یہ پتہ چل گیا کہ میں سوپور کے مولوی رسول بخش لون کا بیٹا ہوں۔ اور دوسرا دلچسپ انکشاف یہ ہوا کہ بستی کے لوگ میرے اور انگوری کے کارناموں سے بھی واقف تھے۔ اس حوالے سے بھی وہ ہمیں دیکھنے کے لئے آ رہے تھے۔

غلام دین اُس بستی کا سب سے معتبر آدمی تھا۔ میرے والد کی طرح وہ بھی مجاہدین کی مالی اور اخلاقی امداد کرتا رہتا تھا۔ یوں تو بستی کے سب ہی لوگ مجاہدین کے ہمدرد تھے مگر مجاہدین کی کوئی پارٹی جب بھی اس طرف آتی، اُن کا قیام خواہ بستی کے کسی بھی گھر میں ہوتا وہ مہمان غلام دین ہی کے ہوتے تھے۔

انگوری کی حالت دیکھ کر غلام دین نے فوراً ہی ایک آدمی کو ڈاکٹر کو بلانے کے لئے بھیج دیا۔ سیف اللہ کئی سال پہلے سرینگر کے ایک سرکاری ہسپتال میں کمپاؤنڈر تھا۔ اُس نے نوکری چھوڑ دی اور گاؤں واپس آ گیا۔ یہاں اُس کی تھوڑی بہت آبائی زمین تھی جو اُس نے غلام دین کو دے رکھی تھی۔ غلام دین اُسے تھوڑا بہت حصہ دے دیتا تھا۔

سیف اللہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اُس نے گاؤں میں اپنے مکان کے ایک حصے میں چھوٹا سا کلینک کھول لیا تھا۔ وہ بہت جلد ڈاکٹر کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اُس کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں کو علاج معالجے کے سلسلے میں بڑی سہولتیں حاصل ہو گئی تھیں۔ سیف اللہ نے کئی سال تک

ہسپتال میں کام کیا تھا۔ ڈاکٹر نہ ہونے کے باوجود اُسے ڈاکٹروں سے زیادہ تجربہ تھا۔

سیف اللہ کو اطلاع مل چکی تھی کہ بستی میں آنے والے مجاہدین کے ساتھ ایک زخمی بھی ہے۔ اطلاع ملتے ہی وہ اپنا تھیلا اُٹھا کر یہاں آنے کے لئے چل پڑا تھا۔ غلام دین کے بھیجے ہوئے آدمی سے اُس کی ملاقات راستے ہی میں ہو گئی تھی۔

اُس نے تمام لوگوں کو کمرے سے نکال دیا اور انگوری کا معائنہ کرنے لگا۔ میں اُس کے ساتھ کمرے ہی میں موجود تھا۔ انگوری کا ٹمپریچر دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں تشویش اُبھر آئی تھی۔ وہ تھیلے میں سے انجکشن نکال کر تیار کرنے لگا۔ انگوری بے چین سی ہو گئی۔

''بالکل تکلیف نہیں ہو گی۔'' سیف اللہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''انجکشن لگانا ضروری ہے۔ اگر بخار دماغ کو چڑھ گیا تو معاملہ سنگین ہو جائے گا۔''

انگوری نے آنکھیں بند کر لیں۔ بازو میں سوئی چبھی تو اُس کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔

''اس کے سینے پر ایک زخم ہے۔'' میں نے انجکشن لگنے کے بعد سیف اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''زخم اگرچہ معمولی سا ہے لیکن میرا خیال ہے انفیکشن ہو گیا ہے اور بخار اسی وجہ سے چڑھا ہے۔''

سیف اللہ زخم دیکھنا چاہتا تھا اور انگوری ہچکچا رہی تھی۔

''ایک کہاوت ہے کہ ڈاکٹر اور وکیل سے کچھ چھپانا اپنے لئے ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔'' سیف اللہ نے کہا۔

اُس نے بڑے سلیقے سے اپنی بات کی وضاحت کر دی تھی۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے خود ہی اپنی قمیض اُوپر اُٹھا دی۔

ڈاکٹر سیف اللہ نے جھک کر زخم کا معائنہ کیا اور پھر تھیلے میں سے ایک ٹیوب نکال کر زخم کے سپرٹ سے صاف کرنے کے بعد کریم لگا کر بینڈیج لگا دی۔ سپرٹ لگنے سے شدید قسم کی جلن ہوئی تھی اور انگوری نے سختی سے دانت بھینچ لئے تھے۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے.....'' ڈاکٹر نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔

''دو چار دن آرام کرے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ کریم دن میں دو مرتبہ لگانی ہے۔ اور یہ گولیاں.....'' اُس نے تھیلے میں سے ایک پلسٹر اسٹرپ نکال لیا۔ ''شاید اس کے لئے بچی رہ گئی ہیں۔ چند ہفتے پہلے کسی کے پاس پاکستان سے کچھ دوائیں آئی تھیں۔ جن میں سے کچھ مجھے مل گئی تھیں۔ اور یہ گولیاں اتفاق سے بچی رہ گئی تھیں۔ ان میں ایک گولی اور بخار کے لئے میں بہت بھیج دُوں گا۔ ویسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج رات ہی کو بخار اُتر جائے گا۔''

میں نے ٹیوب اور گولیوں کا پتا لے لیا۔ اُس میں Stresstabs نام کی چھ سو ایم جی کی چھ گولیاں تھیں۔ چار اس سے پہلے استعمال ہو چکی تھیں۔ یہ گولیاں عام بیماری سے پیدا ہونے والی کمزوری، انفیکشن اور سرجری کے علاج کے دوران استعمال کے لئے بہترین تھیں۔

ڈاکٹر سیف اللہ کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد انگوری سو گئی۔ یہ شاید انجکشن کا اثر تھا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ بستی کے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ لوگ مجھے اور انگوری کو دیکھنے کے لئے آ رہے تھے۔ انگوری کے پاس کسی کو نہیں جانے دیا گیا البتہ میں بستی کے لوگوں سے ملاقاتیں کرتا رہا۔

گل فراز اور اُس کے ساتھی اگلے روز سہ پہر کے قریب بستی سے چلے گئے۔ مجھے اور انگوری کو اس وقت تک یہاں رہنا تھا جب تک وہ مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو جاتی۔ اور ڈاکٹر سیف اللہ نے بتایا تھا کہ ہمیں کم از کم پندرہ دن یہاں رُکنا پڑے گا۔ گل فراز نے بستی سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے کہہ دیا تھا کہ میں جب بھی ہندواڑہ پہنچوں وہاں شرافت حسین نامی ایک دُکاندار سے ضرور مل لوں۔

پہلے تین چار دن تو انگوری کی حالت تشویش ناک رہی۔ بخار کبھی ہلکا ہو جاتا اور کبھی تیز۔ ڈاکٹر سیف اللہ دن میں دو تین بار اُسے دیکھنے کے لئے ضرور آتا۔ شروع کی تین راتیں تو اُس نے بھی میرے ساتھ انگوری کے پاس بیٹھ کر گزاری تھیں۔ اُسے بھی خاصی تشویش تھی۔ وہ اپنے وسائل کے مطابق انگوری کا علاج کر رہا تھا۔ اُس نے دو مرتبہ دوا بدلی تھی۔ اور بالآخر پانچویں روز انگوری کی طبیعت سنبھلنا شروع ہوئی۔ اب تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ انگوری کا چارج اب گھر کی عورتوں نے سنبھال لیا تھا جس سے میری پریشانی بھی کچھ کم ہو گئی تھی۔

اور پھر اُس روز بستی کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ دو فوجی ٹرک بستی کی طرف آ رہے ہیں..... بستی والوں کے پاس اتنا اسلحہ نہیں تھا کہ بھارتی فوجیوں کا مقابلہ کر سکتے۔ چند لوگوں کے پاس تھری ناٹ تھری کی فرسودہ سی رائفلیں تھیں لیکن ظاہر ہے کہ ان چند دقیانوسی رائفلوں سے جدید ترین سب مشین گنوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بھارتی فوجی یا تو مجاہدین کی موجودگی کی اطلاع پر کسی بستی پر ہلہ بولتے تھے یا اسلحہ کی تلاش کے بہانے گھروں کا قیمتی سامان لوٹ لے جاتے اور عورتوں کے ساتھ بدتمیزی کرتے۔ موقع ملتا تو کسی جوان لڑکی کو بھی اُٹھا لے جانے کی کوشش کرتے جس سے بستی والوں کی طرف سے مزاحمت ہوتی اور اس طرح یہ بھارتی سورما نہتے لوگوں پر فائر کھول دیتے اور بستی کے گھروں کو آگ لگا دیتے۔

ٹرکوں کے بارے میں اطلاع ملتے ہی بستی والے سرگرم عمل ہو گئے۔ مجھے اور بستی کے پانچ چھ نوعمر اور جوان لڑکوں کو بستی سے تقریباً پانچ سو گز دُور چٹانوں میں ایک محفوظ جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ کسی بستی میں رہنے والے نوعمر اور جوان لڑکے بھی بھارتی فوجیوں کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے۔ اُنہیں اُگروادی (باغی) کہہ کر پکڑ لیا جاتا اور کیمپوں میں لے جا کر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔

میری اور انگوری کی رائفل بھی میرے حوالے کر دی گئی تھی۔ بستی والوں نے اپنی دقیانوسی تھری ناٹ تھری کی رائفلیں بھی اپنے لڑکوں کے حوالے کر دی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ بستی والے

اب کوئی ہنگامہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میرے ساتھ اُنہوں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ بھارتی فوجیوں نے اگر صرف تلاشی لینے پر ہی اکتفا کیا تو وہ مزاحمت نہیں کریں گے۔ اور اگر بات اس سے آگے بڑھی تو وہ فائر کر کے ہمیں سگنل دے دیں گے۔ اور اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

ہم جہاں چھپے ہوئے تھے وہاں سے بستی صاف نظر آ رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد دو فوجی ٹرک بستی کی طرف آتے ہوئے نظر آئے..... ایک ٹرک بستی کے باہر ہی رُک گیا۔ اُس ٹرک کے فوجیوں نے نیچے اُتر کر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ اُن کی سب مشین گنوں کا رُخ بستی کی طرف تھا۔ ٹرک پر دو لائٹ مشین گنیں بھی نصب تھیں اور دونوں گنرز الرٹ نظر آ رہے تھے۔ دوسرا ٹرک بستی میں جا کر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں رائفل سنبھالے چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھا بستی کی طرف دیکھتا رہا۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ تین دن پہلے یہ اطلاع ملی تھی کہ بھارتی فوجیوں کو کروڑ نامی بستی میں اپنے ایجنٹ چندر پال عرف رستم اور بستی سے پانچ میل دُور پہاڑوں میں بابا عبدالفتح کے خفیہ ٹھکانے پر چار فوجیوں کے مارے جانے کی اطلاع مل چکی تھی۔ فوج کا ایک دستہ اُس بستی میں پہنچ گیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اُنہوں نے بستی والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ لیکن اس سے اگلے روز اُنہیں کسی طرح سے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ بستی میں چندر پال اور پہاڑوں میں چار فوجیوں کے قتل کا ذمہ دار شمروز (یعنی میں) ہے۔ فوجی اگلے روز بستی کے ایک نوجوان کو پکڑ کر لے گئے تھے جہاں کیمپ میں تشدد کر کے اُس سے یہ اُگلوا لیا تھا کہ شمروز اور انگوری ہندواڑہ کی طرف گئے ہیں۔ بعد میں اُس نوجوان کو چھوڑ دیا گیا تھا جو شدید زخمی حالت میں کسی نہ کسی طرح بستی تک تو پہنچ گیا لیکن زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور اُسی شام اُس کا انتقال ہو گیا.....

میں سوچ رہا تھا کہ فوجیوں کو شاید یہ اطلاع ملی ہو گی کہ میں اور انگوری یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ انگوری بستی میں تھی اور مجھے اس کی فکر تھی۔ دو گھنٹے گزر گئے بستی کی کسی کسی گلی میں جو ہمیں نظر آ رہی تھی، فوجیوں کی سرگرمیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے علاوہ کوئی غیر معمولی بات اور افراتفری نظر نہیں آئی۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا اور پھر بستی والا ٹرک بھی واپس آتا ہوا دکھائی دیا۔ باہر کھڑے ہوئے فوجی بھی اپنے ٹرک میں سوار ہو گئے اور وہ دونوں ٹرک تیز رفتاری سے ہائی وے کی طرف چلے گئے۔ ٹرکوں کے جانے کے بعد بھی ہم اپنی کمین گاہ میں دبکے رہے۔ اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد بستی کے ایک آدمی نے وہاں آ کر خطرہ ٹل جانے کی اطلاع دی اور ہم چٹانوں سے نکل کر بستی میں آ گئے۔

اُن بھارتی فوجیوں کو اسلحے کی تلاش تھی۔ بعض گھروں کی تلاشی لیتے ہوئے اُنہوں نے توڑ پھوڑ بھی کی تھی۔ مظلوم کشمیری مسلمانوں کو وہ اپنا زرخرید غلام سمجھتے تھے۔ اُن کے ساتھ بدتمیزی

اور حقارت سے پیش آنا معمول کی بات تھی اور بیچارے کشمیری اچھے دنوں کی اُمید پر یہ سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔ آج بھی اس بستی کے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا گیا تھا اور وہ برداشت کر گئے تھے۔

میں غلام دین کے گھر میں داخل ہو کر انگوری والے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہاں دو تین عورتیں اور بھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر دو عورتیں باہر چلی گئیں جبکہ ایک عورت چارپائی کی پٹی پر بیٹھی رہی۔ میں لکڑی کے تختوں والی ایک سالخوردہ سی کرسی گھسیٹ کر چارپائی کے سامنے بیٹھ گیا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے انگوری کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

''کوئی پرابلم؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے انگوری کی طرف دیکھا۔

''نہیں.....'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''دو فوجی اس کمرے میں بھی آئے تھے۔ الماریوں کا سامان پھیلا کر چلے گئے۔'' اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے پہلی مرتبہ بائیں طرف دیکھا وہاں دیوار میں دو ہضمی الماریاں بنی ہوئی تھیں جن میں کپڑے وغیرہ تھے جو اب سنبھال لئے گئے تھے۔

''اس کے علاوہ.....'' انگوری نے بات جاری رکھی۔ ''اُنہوں نے مجھے بھی چارپائی سے اُٹھا دیا تھا اور بستر کا گدا وغیرہ اُٹھا کر دیکھا تھا کہ یہاں میں نے کوئی مشین گن وغیرہ تو نہیں چھپا رکھی؟''

ہم باتیں کر رہے تھے کہ غلام دین بھی آ گیا اور ہم بھارتی فوجیوں کی اس کارروائی پر تبصرہ کرنے لگے۔

پندرہ دن گزر گئے..... ڈاکٹر سیف اللہ کی توجہ سے انگوری کے سینے کا زخم ٹھیک ہو چکا تھا۔ اب بخار بھی بالکل نہیں تھا۔ لیکن کمزوری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ انگوری سہارے کے بغیر چند قدم سے زیادہ نہیں چل سکتی تھی۔ ہمیں ایک ہفتہ مزید پانزل ہی میں گزارنا پڑا۔ اس دوران اِدھر اُدھر کی کچھ اطلاعات ملتی رہی تھیں۔ ایک اہم اطلاع یہ تھی کہ کمانڈر محب اللہ اور کمانڈر رشید نے مشترکہ طور پر کارروائی کرتے ہوئے سرینگر کے قریب بڈگام کے ایک بڑے فوجی کیمپ پر حملہ کر کے اُسے تباہ کر دیا تھا۔ اس کارروائی میں چھ مجاہدین شہید ہوئے تھے جبکہ ایک کرنل اور ایک میجر سمیت بیس بھارتی فوجی جہنم کا ایندھن بنے تھے۔

ہمیں پانزل میں آئے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہونے والا تھا۔ میں بیکار پڑے پڑے اُکتا گیا تھا۔ انگوری بھی اب بالکل ٹھیک تھی اور اب ہم وہاں سے جانا چاہتے تھے۔

ہم نے غلام دین اور بستی کے دوسرے لوگوں کی مہمان نوازی اور محبتوں کا شکریہ ادا کیا اور اگلے روز صبح سویرے بستی سے رخصت ہو گئے۔ اُس وقت دن کا اُجالا بھی نہیں پھیلا تھا۔ سرمئی دھندلکا تھا۔ بستی سے نکل کر خوبانیوں والے باغ سے ہوتے ہوئے ہم پہاڑیوں کی طرف جا رہے تھے جہاں سے ایک راستہ سوپور کی طرف نکلتا تھا۔

یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا، ٹریک سا تھا۔ اُس راستے پر صرف خچر ہی چل سکتے تھے یا جن لوگوں کے پاس موٹر سائیکل ہوتی وہ شارٹ کٹ کے خیال سے یہ راستہ اختیار کرتے۔

لڑکپن میں کئی مرتبہ پانزل اور سوپور کے درمیان سفر کر چکا تھا۔ ان پہاڑیوں کے راستوں سے تو میں اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح واقف تھا اس لئے یہاں بھول جانے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا اور اسی لئے میں اصل راستہ چھوڑ کر پہاڑیوں میں تنگ سی پگڈنڈیوں پر چل رہا تھا۔ انگوری بھی میرے ساتھ چل رہی تھی۔ کسی وقت وہ پیچھے رہ جاتی تو مجھے تھوڑی دیر کے لئے رُک جانا پڑتا۔

دن کی روشنی پھیل رہی تھی اور پھر دُھوپ بھی نکل آئی۔ دُھوپ کی وجہ سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی کیونکہ ان پہاڑیوں پر چنار، چیڑ اور دوسرے درختوں کی بہتات تھی۔ سوپور کا فاصلہ اٹھارہ میل سے زیادہ نہیں تھا اور میرا خیال تھا کہ ہم دوپہر تک وہاں پہنچ جائیں گے۔

ہم نے دُھوپ تیز ہونے تک خاصا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ انگوری تھک کر ایک چھوٹی سی ندی کے قریب بیٹھ گئی۔ اُس نے چند گھونٹ پانی پیا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے بڑے زور کی۔''

''کیا.....؟'' میں نے اُسے گھورا۔ روانہ ہونے سے پہلے تم نے دو روٹیاں کھائی تھیں۔

''وہ ہضم ہو گئیں۔'' انگوری مسکرائی۔ ''پوٹلی کھولو..... کچھ کھائے بغیر میں آگے نہیں جا سکتی۔''

میں اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ انگوری کے لئے تھوڑی دیر آرام کر لینا بھی ضروری تھا۔ وہ طویل بیماری سے اُٹھی تھی اور پہاڑیوں میں مسلسل چلتے رہنے سے اُس کی طبیعت دوبارہ خراب ہو سکتی تھی۔

میں نے پوٹلی کھول لی۔ چار موٹی موٹی روٹیاں اور اُن کے ساتھ بھیڑ کے گوشت کے تلے ہوئے قتلے تھے۔ ہم نے ایک ایک روٹی کھائی، کچھ گوشت بھی بچا لیا۔ میں نے پوٹلی باندھ کر رائفل کی نال پر لٹکا لی اور اس طرح تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم دوبارہ چل پڑے۔

ٹھہر ٹھہر کر چلتے ہوئے دو بجے کے قریب ہمیں ایک بار پھر رُک جانا پڑا۔ یہاں پر ایک چشمے کے قریب بیٹھ کر ہم نے بچی ہوئی روٹی کھائی۔ جس جگہ ہم بیٹھے تھے وہاں سے دو فرلانگ آگے بارہ مولا کو ہندواڑہ سے ملانے والی ہائی وے تھی اور اُس ہائی وے کے دوسری طرف کچھ ہی فاصلے پر میرا قصبہ سوپور تھا۔

اُس ہائی وے پر اُن دونوں شہروں کے درمیان بسوں اور جیپوں کا ٹریفک جاری رہتا تھا اور فوجی گاڑیاں بھی گشت کرتی رہتی تھیں۔ ہم تازہ دم ہو کر چٹانوں میں چلتے ہوئے ہائی وے کے قریب آ گئے۔ اس طرح ایک فوجی ٹرک اور جیپ تیز رفتاری سے گزرتے ہوئے نظر آئے۔ میرا دل تو چاہا کہ فائر کھول دُوں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ ہم محض دو رائفلوں سے اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے البتہ یہ ضرور ہوتا کہ ہم اُن درندوں کے گھیرے میں آ جاتے اور وہ ہمیں گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔

جیپ اور ٹرک کافی دُور نکل جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر محتاط نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا اور چٹانوں سے نکل کر تیزی سے دوڑتے ہوئے سڑک پار کر کے دوسری طرف چٹانوں میں پہنچ گئے اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے چلنے لگے۔

اس طرف چھوٹی پہاڑیاں تھیں جو سبزے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ میں نے انگوری کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ پہاڑیوں پر چنار کے درختوں کے نیچے پہنچ کر ہم رُک گئے اور دوسری طرف دیکھتے ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا.....

نشیب میں تقریباً دو میل کے فاصلے پر میرا گاؤں تھا..... سوپور کے قصبے میں جگہ جگہ سے سیاہ دُھویں کے بادل اُٹھ رہے تھے.....

سوپور جل رہا تھا..... میرا گاؤں جل رہا تھا..... میرا کشمیر جل رہا تھا.....!

○

میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے لڑکھڑا گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اِردگرد پہاڑیاں اور چنار و چیڑ کے درخت بڑی تیزی سے گردش کر رہے ہوں۔ انگوری نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک پتھر پر بٹھا دیا۔ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ انگوری میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

کئی منٹ بعد میرے حواس بحال ہو سکے تھے۔ اور پھر فضا میں گرر گرر کی آواز سن کر میں چونک گیا اور سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ انگوری بھی متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''وہ..... وہ دیکھو.....'' اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا جس جگہ سے ہم نے سڑک پار کی تھی۔ وہاں سے تقریباً دو میل آگے ایک ذیلی سڑک ہمارے قصبے کی طرف مُڑتی تھی اور اُس سڑک پر چار فوجی ٹرک اور دو جیپیں نظر آ رہی تھیں۔ اُن کا رُخ قصبے سے ہائی وے کی طرف تھا جس کا مطلب تھا کہ وحشی درندے سوپور میں اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد واپس جا رہے تھے۔ چند منٹ بعد جیپیں اور ٹرک چٹانوں کے پیچھے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے مگر فضا میں گرر گرر کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔

''وحشی بھیڑیے.....'' میرے منہ سے غراہٹ سی نکلی۔ میری مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔

انگوری نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے اور پھر اُس کے ہاتھ پھسلتے ہوئے میری بانہوں میں آ گئے۔ میں نے جھکا ہوا سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں نم آلود تھیں۔

''حوصلہ رکھو شمروز!'' وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''آج پوری وادی میں ہمارے بہن بھائی، بزرگ اور بچے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ لیکن وہ دن ضرور آئے گا جب ہم ان غاصبوں کو وادی سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور مجھے یقین ہے وہ دن بہت جلد آئے گا۔''

''انشاء اللہ.....'' میں کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور قصبے کی طرف دیکھنے لگا۔ کئی جگہوں سے سیاہ دُھواں اُٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اُن شیطانوں نے جی بھر کے تباہی مچائی تھی۔ پچھلے چند مہینوں کے دوران سوپور دوسری مرتبہ اہنسا کے پجاریوں کے ہاتھوں تباہی و بربادی کا نشانہ بنا تھا..... میں نے فوجی ٹرکوں کو واپس جاتے ہوئے دیکھا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ ان وحشیوں نے صبح سویرے قصبے پر ہلہ بولا ہوگا اور اب اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد واپس جا رہے تھے۔

میں انگوری کا ہاتھ پکڑ کر نشیب میں اُترنے لگا۔ میرا خیال ہے ہم نے ڈھائی تین سو گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ اس وقت ہم چند بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں تھے۔ ان کے اوپر سے گھوم کر جیسے ہی دوسری طرف پہنچے ایک طرف سے چھوٹے چھوٹے پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی..... میں نے اس طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اُچھل پڑا۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا چٹانوں کے پیچھے غائب ہو گیا تھا..... میں نے اُس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔

میں نے انگوری کو وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور اُس طرف دوڑ لگا دی۔ چٹان کے دوسری طرف وہ آدمی نظر آ گیا جو قد آدم پودوں میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''رُک جاؤ..... ورنہ گولی مار دُوں گا۔'' میں اُس کے پیچھے دوڑتا ہوا چیخا۔ اُس شخص کے بارے میں میرا پہلا خیال یہ تھا کہ شاید وہ بھارتی فوج کا کوئی مخبر ہوگا جس نے قصبے میں مجاہدین کی موجودگی کی اطلاع دی ہوگی اور اب یہاں چھپا اپنی فراہم کردہ اطلاع کا نتیجہ دیکھ رہا تھا۔

میں ایک بار پھر چیخا تو وہ شخص رُک گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لئے۔ میں رائفل تانے اُس کے پیچھے پہنچ گیا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے غراتے ہوئے کہا۔ میری طرف گھوم جاؤ! اور اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو بھون کے رکھ دُوں گا۔''

وہ شخص آہستہ آہستہ میری طرف گھوم گیا..... اُس کا چہرہ دیکھتے ہی میں اُچھل پڑا..... وہ ہمارے قصبے کا ادھیڑ عمر موچی برکت علی تھا۔ یوں تو قصبے میں تین چار موچی تھے مگر برکت علی ہمارے محلے کا تھا اس لئے میں اُسے پہچان گیا۔

''چاچا تم.....؟'' میرے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''اوہ.....!'' برکت علی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ خونخوار بھیڑیئے اس طرف بھی آ گئے ہیں۔ آؤ..... میرے ساتھ آؤ!''

برکت علی کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ میں نے رائفل نیچے کر لی۔ دو منٹ بعد انگوری بھی اس طرف آ گئی۔ وہ بھی اُلجھی ہوئی نظروں سے چاچا برکت علی کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہے چاچا..... اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے برکت علی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ سب کیا ہو رہا ہے..... اور یہ سلسلہ تو اُس وقت تک چلتا رہے گا جب تک وادی کو ان غاصب ہندوؤں کے ناپاک وجود سے صاف نہ کر دیا جائے۔'' چاچا برکت علی کہہ رہا تھا۔ ''آج صبح فجر کی اذان کے فوراً ہی بعد تین چار ٹرک دندناتے ہوئے قصبے میں آ گئے اور لاتعداد فوجیوں نے فائرنگ کرتے ہوئے گھروں پر ہلہ بول دیا۔ قیامت صغریٰ کا سماں تھا..... گھروں کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ عورتیں اور بچے چیختے چلاتے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ میں نے کچھ عورتوں اور بچوں کو عمر دین کے گھر میں جمع کر لیا اور تھوڑی ہی دیر بعد کچھ اور لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ قصبے کا وہ حصہ ابھی کسی حد تک محفوظ تھا۔ ہم عورتوں، بچوں اور چند بوڑھوں کو لے کر قصبے سے نکل آئے اور باغ میں سے ہوتے ہوئے ان پہاڑیوں میں آ گئے اور اس طرف ایک غار میں پناہ لی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں ابھی یہی دیکھنے کے لئے غار سے نکلا تھا کہ وہ شیطان واپس چلے گئے یا نہیں؟ اس طرف تم لوگوں کی باتیں سن کر میں سمجھا تھا کہ شاید وہ درندے ہماری تلاش میں اس طرف آ گئے ہیں۔ میں اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے کے لئے بھاگا تھا۔''

''کہاں ہیں وہ لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

''اُس طرف ایک غار میں۔'' اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''میرے ساتھ آؤ.....''

ہم اُس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے اور بالآخر ایک غار میں داخل ہو گئے۔ وہاں بیس بائیس ادھیڑ عمر اور جوان عورتیں تھیں۔ دس بارہ بچے اور پانچ چھ ادھیڑ عمر آدمی تھے۔ وہ سب مجھے پہچانتے تھے۔ کئی عورتیں مجھ سے لپٹ لپٹ کر رونے لگیں۔ میں بھی آنسو ضبط نہ کر سکا۔ انگوری بھی رو رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم اُن عورتوں اور بچوں کو لے کر غار سے روانہ ہو گئے اور قصبے تک پہنچنے میں بھی ہمیں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ قصبے کی حالت دیکھ کر میں کانپ اُٹھا..... آدھے سے زیادہ مکانات تباہ کر دیئے گئے تھے۔ کئی مکانوں سے اب بھی دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ ہر طرف تباہی و بربادی کے آثار بکھرے ہوئے تھے۔ بھارتی درندہ صفت فوجیوں کی وحشیانہ فائرنگ سے بارہ افراد شہید ہوئے تھے۔ اُن میں دو بچے اور تین عورتیں بھی شامل تھیں جبکہ تیس کے قریب افراد زخمی ہوئے تھے۔

قصبے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگ اپنی اس تباہی و بربادی پر ایک دوسرے سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ میں اور انگوری دوسروں کے ساتھ امدادی کارروائیوں میں مصروف رہے۔ شہید ہونے والوں کو شام سے پہلے دفن کر دیا گیا۔ زخمیوں کو ہر ممکنہ حد تک طبی امداد دی جا رہی تھی۔ لوگ مکانوں کے ملبوں کے ڈھیر میں اپنا سامان تلاش کر رہے تھے لیکن کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ سب جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

سوپور میں اس تباہی کی خبر پوری وادی میں پھیل گئی تھی۔ وادی کے کونے کونے میں غم و غصے

کی لہر دوڑ گئی۔ ہڑتال کی کال دے دی گئی اور شدید ردِعمل کے طور پر بھارتی غاصبوں کے خلاف مجاہدین کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔

بھارتی فوجی بھی اگرچہ محتاط ہو گئے تھے۔ کیمپوں پر حفاظتی انتظامات سخت کر دیئے گئے تھے۔ لیکن اُسی رات مجاہدین کے ایک گروپ نے سرینگر کے قریب ایک فوجی کیمپ پر حملہ کر کے اُسے مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ اس حملے میں بھارتی فوج کا ایک بریگیڈیئر بھی مارا گیا تھا۔

وہ رات ہم نے برکت علی کے گھر میں گزاری تھی۔ دوسرے دن بھی میں اور انگوری قصبے والوں کے ساتھ امدادی کارروائیوں میں مصروف رہے۔ جن کے گھر کے افراد شہید ہو چکے تھے وہ عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ بھارتی فوجی پانچ لڑکوں کو بھی پکڑ کر لے گئے تھے۔ اُن کے گھر کی عورتوں کو تو قابو میں کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ کسی طرح سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھیں۔

میرا خیال تھا کہ یہاں کچھ مجاہدین نے پناہ لی ہو گی جس کی اطلاع پر فوجیوں نے یہاں ہلہ بولا تھا۔ لیکن یہ جان کر مجھے زیادہ حیرت بھی نہیں ہوئی کہ پچھلے کئی روز سے مجاہدین کی کسی پارٹی نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا۔ فوجیوں نے محض شبے کی بناء پر یہاں ہلہ بول دیا تھا اور تباہی و بربادی پھیلا کر چلے گئے تھے۔

ہم تقریباً ایک ہفتہ سوپور میں رہے۔ اس دوران ہم دونوں قصبے والوں کے ساتھ امدادی سرگرمیوں میں مصروف رہے تھے۔ آس پاس کی بستیوں سے کچھ اور لوگ بھی آ گئے تھے جو ہر ممکن حد تک قصبے والوں سے ہمدردی کا اظہار اور امدادی کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

اور بالآخر ایک روز صبح سویرے ہم ہندواڑہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہمارے ساتھ قصبے کا ایک آدمی اور بھی تھا۔ ہم تینوں خچروں پر سوار تھے اور اس مرتبہ ہم نے اُونچے پہاڑوں کا رُخ کرنے کی بجائے دریا کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ راستہ اگرچہ طویل تھا لیکن کسی حد تک محفوظ بھی تھا۔

ہم صبح سویرے روانہ ہوئے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے لانگیات نامی گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ یہ گاؤں ہندواڑہ سے چند میل پہلے ہائی وے کے قریب دریا کے کنارے پر واقع تھا۔ ہم گاؤں میں داخل ہونے کی بجائے نصف میل پہلے ایک فارم ہاؤس پر رُک گئے۔

یہاں ایک بوڑھے مرد اور ایک بوڑھی عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے وہ رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا جبکہ ساتھ آنے والا تیسرا آدمی تھوڑی دیر رُکنے کے بعد گاڑی کی طرف چلا گیا۔ اُسے دراصل جانا بھی اُسی گاڑی میں تھا۔

جمال نامی وہ بوڑھا آدمی اپنے دو جوان بیٹوں کو وطن کی آن پر قربان کر چکا تھا۔ وہ خود اگرچہ بوڑھا ہو چکا تھا مگر پس منظر میں رہ کر مجاہدین کی مدد کرتا رہتا تھا۔

وہ میرے اور انگوری کے نام سے واقف تھا۔ ان دونوں میاں بیوی نے ہمارے آنے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔

اُس رات ہم میں دیر تک آزادی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ اُس کا یہ اندازہ غلط نہیں تھا کہ تحریک آزادی کی اس لہر میں کچھ تیزی آ گئی تھی۔ مجاہدین کی کئی تنظیمیں بھارتی سامراج کے خلاف سرگرم عمل تھیں۔ بھارتی فوجی کیمپوں اور فوجی قافلوں کو جگہ جگہ نشانہ بنایا جا رہا تھا اور اُنہیں شدید نقصان پہنچایا جا رہا تھا۔

کشمیری مجاہدین آزادی کی یہ جنگ بے سروسامانی کی حالت میں لڑ رہے تھے۔ وہ کئی کئی وقت فاقے کرتے۔ اسلحہ اور ایمونیشن کے حصول میں بھی اُنہیں شدید دُشواریوں کا سامنا تھا۔ بھارتی فوجیوں سے چھینا اور کیمپوں سے لوٹا ہوا اسلحہ ہی استعمال ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس وادی میں پھیلی ہوئی سات لاکھ بھارتی فوج جدید ترین اسلحے سے لیس تھی۔ اُن کے پاس ہر قسم کے وسائل تھے اور وہ تمام وسائل کو بروئے کار لا رہے تھے۔ اس کے باوجود اُنہیں مجاہدین کے ہاتھوں شدید زک اُٹھانی پڑ رہی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کشمیری مجاہدین کے پاس اتنے وسائل اور اتنا گولہ بارود ہوتا تو وہ عملاً پہلے بھارتی غاصبوں کو نہ صرف کشمیر سے نکال چکے ہوتے بلکہ ہندوستان کے کچھ اور حصے پر بھی ان کا قبضہ ہو چکا ہوتا۔

میرا خیال تھا کہ ہم صبح سویرے ہی ہندواڑہ کی طرف روانہ ہو جائیں گے مگر جمال نے ہمیں روک لیا۔

''شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں.....'' اُس نے کہا۔ ''سوپور والے واقعہ کے بعد پوری وادی میں ہنگامے بڑھ گئے ہیں۔ سرینگر سرکار اور فوج کے خلاف جگہ جگہ مظاہرے ہو رہے ہیں۔ لوگ تو پُر امن احتجاج کرنا چاہتے ہیں مگر فوج اور پولیس خود وادی کا امن و امان خراب کر رہی ہے۔ مظاہرین کو دیکھتے ہی گولی چلا دی جاتی ہے۔ بے گناہ نوجوانوں کو پکڑ کر ان پر اس قدر تشدد کیا جاتا ہے کہ وہ زندگی بھر کے لئے مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اجنبیوں کو کسی شہر میں زیادہ مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ تم لوگ دو تین دن یہیں رہو! حالات پُرسکون ہو جائیں تو چلے جانا۔''

''ہندواڑہ میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس وادی کا کوئی بھی گوشہ میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ ویسے ہندواڑہ میں انگوری کی خالہ ہیں۔ ہم اُنہی کے ہاں جائیں گے۔''

''پھر بھی..... میرا مشورہ ہے کہ تم لوگ دو تین دن یہیں رُک جاؤ۔'' جمال دین نے اصرار کیا۔ ''تم جیسے نوجوان ہمارا سرمایہ ہیں۔ تم لوگوں سے تو کشمیری عوام نے بہت سی اُمیدیں باندھ رکھی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان ہنگاموں میں تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ اس لئے.....''

''ٹھیک ہے.....'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''آپ کہتے ہیں تو ہم رُک جاتے ہیں۔''

میں نے انگوری کی طرف دیکھا۔ اُس نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

صبح گاڑی سے دو ادھیڑ عمر آدمی اور تین عورتیں اور بھی آ گئیں۔ دو عورتیں تو ادھیڑ عمر تھیں، تیسری کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہو گی۔ یہ لوگ آتے ہی کھیتوں میں کام میں مصروف ہو گئے۔ انگوری بھی سکینہ نامی اُس جوان عورت کے ساتھ کھیتوں کی طرف چلی گئی تھی۔ میں جمال کے ساتھ ساتھ گھومتا اُس کے کام میں ہاتھ بھی بٹاتا رہا اور باتیں بھی ہوتی رہیں۔

اگلے تین دنوں میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ البتہ ہندواڑہ سے ملنے والی خبروں سے پتہ چلتا تھا کہ وہاں اب پہلے جیسے ہنگامے نہیں رہے تھے تاہم کشیدگی پائی جاتی تھی۔

ایک دن مزید فارم ہاؤس میں رُکنے کے بعد ہم صبح سویرے گاؤں کے لئے روانہ ہو گئے۔ خچر اور رائفلیں ہم نے جمال کے پاس ہی چھوڑ دی تھیں۔ خچر تو وہیں رہتے البتہ رائفلیں ہمیں ہندواڑہ پہنچا دی جاتیں۔

جمال کے ہاں رہتے ہوئے ہم نے کپڑے بھی بدل لئے تھے۔ میں نے جمال کا ایک جوڑا پہن لیا تھا اور اُس کی بیوی نے انگوری کو اپنا ایک جوڑا دے دیا تھا جو اُس کے جسم پر خاصا ڈھیلا تھا۔

لانگیات کے لاری اڈے پر ہمیں تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ ہماری طرح کچھ اور لوگ بھی بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔

بارہ مولا کی طرف سے آنے والی بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مگر کچھ مسافروں کے اُتر جانے سے ہمیں بس میں سوار ہونے کا موقع مل گیا۔ انگوری کو تو ایک آدمی نے اپنی سیٹ دے دی لیکن مجھے کھڑے ہی رہنا پڑا۔ مسافروں کے رش کی وجہ سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔

یہ مختصر سا سفر پینتالیس منٹ میں طے ہوا۔ بس جیسے ہی ہندواڑہ کے لاری اڈے پر رُکی درجن بھر فوجیوں نے اُسے گھیر لیا۔ مسافر ایک ایک کر کے اُترتے رہے۔ فوجی بڑی گہری نظروں سے بس سے اُترنے والے مسافروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ میرا خیال ہے اُنہیں کسی خاص آدمی کی تلاش تھی۔

میں نے بس میں ہی صورتحال کا جائزہ لگا لیا تھا اور انگوری کے قریب جھک کر اُس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ہمیں یہاں سے کس طرح نکلنا ہے۔

بس کے آدھے مسافر اُتر چکے تھے۔ میں نے انگوری کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے سہارا دے کر نیچے اُتارا۔ وہ اس طرح جھکی جا رہی تھی جیسے بہت بیمار ہو اور اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہوا جا رہا ہو۔ ایک فوجی جو شاید سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا گہری نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اور پھر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی.....!

''اے..... تم رُک جاؤ!'' سیکنڈ لیفٹیننٹ نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور ہمارا راستہ روک کر کھڑا

ہو گیا۔

وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اُس کی نظریں انگوری کی طرف اُٹھ گئیں۔ انگوری نے چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ اُس کا پورا جسم ڈھکا ہوا تھا اور چہرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ نے اُس کے چہرے پر سے چادر ہٹا دی میں آگے بڑھا تو اُس نے ریوالور تان لیا.....

''اپنی جگہ پر کھڑے رہو..... حرکت مت کرنا۔'' اُس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ دو اور فوجی میرے قریب آ گئے تھے۔ اُن دونوں نے مجھے اپنی سب مشین گنوں کی زد میں لے لیا۔ لیفٹیننٹ انگوری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

انگوری کا چہرہ ایک دم پیلا ہو گیا تھا اور وہ واقعی برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔

''کون ہو تم..... کہاں سے آئے ہو اور یہاں کہاں جانا ہے؟'' لیفٹیننٹ نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''لنگیات سے آئے ہیں جی.....'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ میری خالہ زاد ہے۔ بیمار ہے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔ دوائی لے کر ہم واپس چلے جائیں گے۔''

لیفٹیننٹ نے ایک فوجی کو اشارہ کیا وہ آگے بڑھ کر میری تلاشی لینے لگا اور پھر سیدھا ہو کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''اور تم نے اپنے لباس میں کیا چھپا رکھا ہے؟'' لیفٹیننٹ نے انگوری کو گھورا۔

لیفٹیننٹ شاید خود اُس کی تلاشی لینا چاہتا تھا لیکن میں کسی قسم کی پرواہ کئے بغیر تیزی سے سامنے آ گیا۔

''اس کی تلاشی لینی ہے تو کسی لیڈی سرچر کو بلاؤ!'' میں نے بے خوفی سے کہا۔ ''تم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اس سے دُور رہو!''

لیفٹیننٹ کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی اقدام کرتا آس پاس کھڑے ہوئے لوگ قریب آنے لگے۔ لوگوں کے تیور دیکھ کر لیفٹیننٹ کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اُس نے ایک فوجی کو اشارہ کیا وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

چند منٹ بعد ہی اُس فوجی کے ساتھ تین پولیس اہلکار وہاں پہنچ گئے۔ اُن میں سے ایک عورت تھی۔ لیفٹیننٹ کا اشارہ پا کر لیڈی کانسٹیبل آگے بڑھ کر انگوری کی تلاشی لینے لگی اور پھر سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

''کچھ نہیں سر!'' اُس نے لیفٹیننٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے.....'' لیفٹیننٹ نے گہرا سانس لیتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ''تم لوگ جا سکتے ہو..... لیکن میں تمہارا چہرہ یاد رکھوں گا۔''

میں انگوری کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چل پڑا۔ مجھے اُس لیفٹیننٹ کی نظریں اپنی پشت پر چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ تقریباً بیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک بازار میں مُڑ گئے۔

انگوری ایک دم سیدھی ہو گئی۔ اب نہ تو اُس کے چہرے پر پیلاہٹ نظر آ رہی تھی اور نہ ہی کسی طرح کمزور لگ رہی تھی۔ اس کے برعکس اُس کے چہرے پر نہ صرف سرخی تھی بلکہ ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

''تم تو بہت بڑی اداکارہ ہو۔'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہاں تو یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑو گی۔''

''اگر اداکاری نہ کرتی تو ہم وہاں سے آسانی سے نہ نکل سکتے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ویسے حیرت ہے جب وہ میری تلاشی لینے کے لئے آگے بڑھا تھا تو تمہارے اکڑ جانے پر وہ خاموش ہو گیا تھا۔''

''اگر وہ تمہیں ہاتھ بھی لگاتا تو میں نتائج کی پرواہ کئے بغیر اُس کا ہاتھ توڑ دیتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے وہ خاموش اس لئے ہو گیا تھا کہ شہر کے لوگ پہلے ہی بپھرے ہوئے ہیں شاید یہ بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس کی غلطی سے کوئی نیا ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہو گا۔''

شہر کی فضا میں کشیدگی نمایاں تھی۔ جگہ جگہ فوجی ٹرک کھڑے تھے جن پر مشین گنیں نصب تھیں۔ پولیس کی مسلح پارٹیاں بھی گشت کر رہی تھیں۔

ہم بازار سے نکل کر ایک گلی میں داخل ہو گئے اور پھر گلیوں ہی گلیوں میں چلتے رہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد انگوری ایک جگہ رُک گئی۔ ہمارے سامنے تین گلیاں تھیں جو ہاتھ کی اُنگلیوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ انگوری متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا..... راستہ بھول گئیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کئی سال پہلے یہاں آئی تھی۔'' انگوری نے جواب دیا۔ ''اس طرف آؤ..... میرا خیال ہے وہ گھر اسی گلی میں ہے۔''

ہم دائیں طرف والی گلی میں مُڑ گئے۔ انگوری مکانوں کے دروازوں کو دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔ اور پھر وہ ایک مکان کے سامنے رُک گئی۔ اُس نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر دروازے کی زنجیر کھٹکھٹانے لگی۔

ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا تھا جس نے لمبا سا کرتا پہن رکھا تھا۔ سر گنجا تھا۔ وہ اُلجھی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھتا رہا۔

''ارے..... تم گڈو ہو نا؟'' انگوری نے کہا تو لڑکے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''خالہ کہاں ہیں..... جاؤ! اُنہیں بتاؤ انگوری آئی ہے۔''

لڑکا اندر دوڑ گیا۔ انگوری نے مجھے اشارہ کیا، میں بھی اُس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ انگوری نے دروازہ بند کر دیا اور خالہ خالہ کہتی ہوئی صحن میں آگے چلنے لگی۔ میں دروازے کے قریب اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

چند سیکنڈ بعد ہی کمرے سے ایک ادھیڑ عمر بھاری بھرکم عورت برآمد ہوئی اور ایک جھٹکے سے

رُک گئی جیسے زمین نے اُس کے پیر پکڑ لئے ہوں..... وہ پلک جھپکے بغیر بے حس و حرکت کھڑی انگوری کی طرف دیکھتی رہی۔ لگتا تھا جیسے اُس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو..... اور پھر ''میری بیٹی'' کہتے ہوئے وہ دوڑ کر انگوری سے لپٹ گئی۔

وہ دونوں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ اس دوران گھر کے دوسرے افراد بھی کمروں سے نکل آئے تھے۔ اُن میں ایک جوان لڑکی اور ایک بہت بوڑھی عورت تھی۔ جھریوں نے اُس کے چہرے پر مکڑی کا جالا سا بن رکھا تھا۔ وہ بھی باری باری انگوری سے لپٹ کر رونے لگیں۔ وہ نوجوان گنجا لڑکا قریب کھڑا حیرت سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بڑا رقت آمیز منظر تھا۔ میرا بھی دل بھر آیا۔ آنکھیں بھیگ گئی، مگر میں نے آنسو ضبط کر لئے۔ ماں کے انتقال کے بعد انگوری کی اپنے کسی قریبی رشتے دار سے پہلی ملاقات تھی۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

خالہ نے مجھے دروازے کے قریب کھڑے دیکھا تو چونک سی گئی۔ انگوری نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے میرے بارے میں بتایا۔ خالہ میرے قریب آ گئی، سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور مجھے ایک کمرے میں لے گئی جو بیٹھک کے طور پر سجا ہوا تھا۔ فرش پر گہرے رنگ کا نمدہ سجا ہوا تھا۔ تین کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار کے قریب نمدے پر چوڑے کشن رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر طغرے بھی لگے ہوئے تھے۔

خالہ مجھے کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ گنجا لڑکا گڈو میرے پاس ایک کرسی پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ اُس کی یہ بات سن کر میں چونک گیا کہ تین دن پہلے بھارتی فوجی گلی کے ایک مکان سے ایک لڑکے کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اُس کے بارے میں ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ وہ اُسے کہاں لے گئے ہیں۔

''شمروز کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔'' خالو مشتاق نے کہا۔ ''اس کا نام ہی اس کا تفصیلی تعارف ہے۔ اور وادی میں اس کے نام کے ساتھ تمہارے نام کی بازگشت بھی گونج رہی ہے۔ ہم سب کی دُعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ قوم نے تم جیسے نوجوانوں سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔''

میں خاموش رہا۔ میرے بارے میں بہت کچھ کہا جا رہا تھا لیکن مجھے اس کا احساس نہیں تھا کہ میرا نام کیا اہمیت اختیار کر گیا ہے؟ میں تو اپنے آپ کو ایک مجاہد ہی سمجھتا تھا۔ میں تو اپنی قوم اور اپنے وطن کی آزادی کے لئے لڑ رہا تھا۔ میری طرح اور بھی ہزاروں کشمیری نوجوان آزادی کی یہ جنگ لڑ رہے تھے۔ سب نے اپنی زندگیاں داؤ پر لگا رکھی تھیں۔ سب ہی سرفروش تھے۔ میری نظروں میں کسی کا رتبہ کم نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد انگوری کی کزن عائشہ چائے بنا کر لے آئی۔ سب لوگ اُس کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ چہرے پر مکڑی کے جال والی وہ بوڑھی عورت مشتاق کی والدہ تھیں۔

مشتاق منڈی میں اناج کا بیوپاری تھا مگر کاروبار کی حالت بہت ہی دگرگوں تھی۔ آئے دن ہنگاموں اور ہڑتالوں نے ہر قسم کا کاروبار تباہ کر رکھا تھا۔

انگوری کی خالہ ان لوگوں کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور مشتاق بیٹھک میں اکیلے رہ گئے اور ہم کافی دیر تک تازہ ترین صورتحال پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔

دو دن ہم گھر میں ہی بند رہے۔ تیسرے دن میں شرافت حسین سے ملاقات کے لئے چلا گیا۔ یہ وہی دُکاندار تھا جس سے ملنے کا مشورہ مجھے گل فراز نے دیا تھا۔ اُس کی دُکان تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔ شرافت حسین نے بتایا کہ ہماری رائفلیں اُس کے پاس پہنچ چکی ہیں۔ اُس نے دو دن بعد مجھے رابطہ قائم کرنے کو کہا تھا۔

میں واپس آ رہا تھا کہ شہر میں اچانک ہی ہنگامے شروع ہو گئے..... ایک آدمی سے پتہ چلا کہ چند روز پہلے فوجی مشتاق کے پڑوسی سے جس نوجوان کو اُٹھا کر لے گئے تھے اُسے تشدد کر کے شہید کر دیا گیا تھا۔ اُس کی لاش ایک سڑک پر پڑی ہوئی ملی تھی۔

میں جانتا تھا کہ لوگ اب اس گلی میں جمع ہوں گے جہاں اُس نوجوان کا مکان تھا یعنی مشتاق والی گلی۔ میں تیز تیز چل رہا تھا تاکہ وقت سے پہلے وہاں پہنچ سکوں۔

ایک سڑک پر مُڑتے ہی سڑک کے کنارے پر بیٹھی ایک عورت کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا..... میلا کچیلا پھٹا ہوا لباس جس سے اُس کا جسم جھلک رہا تھا۔ اُلجھے ہوئے گرد آلود بال، پچکے ہوئے گال اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں..... اُس کی حرکات دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ اُس کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔

میں اُس کے قریب رُک گیا۔ اُس کے چہرے کے نقوش جانے پہچانے سے لگتے تھے اور میں اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

میں نے اُسے پہچان لیا تھا.....

وہ میری بہن زینب تھی..... جسے کئی مہینے پہلے سوپور پر حملے کے دوران بھارتی فوجی اُٹھا کر لے گئے تھے.....!

○○○

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن حقیقت کو جھٹلانا میرے اختیار میں نہیں تھا..... زینب ہی تھی۔

مجھ پر سکتہ کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو چکی تھیں..... میرے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور ٹانگوں میں بھی جیسے کھڑے رہنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

میں کئی لمحوں تک پلک جھپکے بغیر اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ جبکہ اُس نے ایک مرتبہ بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ اُسے شاید احساس ہی نہیں تھا کہ کوئی اس کے قریب آ کر کھڑا ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے شہادت والی اُنگلی سے آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنے کے بعد وہ ہتھیلی پھیر کر ساری لکیریں مٹا دیتی اور لکیریں کھینچنے کا عمل دوبارہ شروع کر دیتی۔ ساتھ ہی وہ بار بار ہنس بھی رہی تھی۔

''زینب.....!'' میرے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی اور میں ایک گھٹنا ٹیک کر اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''زینب..... اِدھر دیکھ! میری طرف..... میں ہوں..... تمہارا شمروز۔'' میں نے کہتے ہوئے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اے ہٹ.....'' اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور اس طرح ہاتھ اُٹھایا جیسے تھپڑ مارنا چاہتی ہو۔ لیکن اُس کا ہاتھ رُک گیا اور وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

میں کانپ اُٹھا..... اُس کی ویران آنکھوں میں مکمل اجنبیت تھی۔ وہ چند لمحے مجھے گھورتی رہی پھر قہقہے لگانے لگی۔ اور پھر اچانک ہی مٹھی بھر مٹی اُٹھا کر اپنے سر پر ڈال لی۔

''یہ کیا کر رہی ہو.....؟'' میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''مجھے پہچانو زینب! میں تمہارا بھائی ہوں شمروز..... ہوش میں آؤ زینب!''

وہ قہقہے لگاتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مکمل ذہنی طور پر مفلوج ہو چکی تھی۔ وہ تو شاید اب اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتی تھی۔

آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی ہمارے قریب رُک گیا۔

''کیوں پریشان کر رہے ہو بیچاری کو؟ اسے چھوڑ دو اس کے حال پر۔'' اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں سرزنش تھی۔

''مم..... میں اسے پریشان نہیں کر رہا۔ یہ..... یہ میری بہن ہے زینب۔'' میں نے سر اُٹھا

کر اُس شخص کی طرف دیکھا۔

''کیا.....؟'' وہ اُچھل پڑا۔ ''تمہاری بہن؟'' اُس کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔ ''یہ تو پچھلے تین مہینوں سے اس شہر میں ہے۔ کبھی ایک سڑک پر نظر آتی ہے اور کبھی دوسری سڑک پر۔ لوگ ترس کھا کر اسے کچھ نہ کچھ کھانے کو دے دیتے ہیں۔ تم کہہ رہے ہو کہ تمہاری بہن ہے۔ پہلے کہاں تھے تم؟'' وہ شخص مجھے اس طرح گھور رہا تھا جیسے میری بات کا یقین نہ آ رہا ہو۔

''میرا نام شمروز ہے..... میں ایک مجاہد ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''چند مہینے پہلے بھارتی فوجیوں نے ہمارے گاؤں سوپور پر حملہ کر دیا تھا..... میرے ماں باپ اور ایک بہن شہید ہو گئے تھے اور اسے وہ درندے اُٹھا کر لے گئے تھے۔ میں اسے تلاش کرتا رہا مگر اس کا سراغ نہیں ملا۔ میں دو دن پہلے یہاں آیا ہوں اور اتفاق سے یہ مجھے نظر آ گئی۔''

''سوپور.....'' وہ شخص میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''کیا نام بتایا تم نے؟''

''شمروز.....'' میں نے جواب دیا۔

''تم مولوی رسول بخش کے بیٹے تو نہیں جو بعد میں کمانڈر محبّ اللہ کی پارٹی میں شامل ہو گیا تھا؟'' اُس شخص نے کہا۔ اُس کی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''ہاں.....'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اُس شخص نے بے اختیار آگے بڑھ کر میری پیشانی چوم لی۔ اور پھر ایک جھٹکے سے الگ ہو گیا۔ شہر کے شمالی علاقے سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

''اسے اُٹھا کر میرے ساتھ آؤ..... جلدی کرو! پورا شہر ہنگاموں کی لپیٹ میں آ رہا ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے۔''

''میں لوہاری محلے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہاں تک کیسے.....''

''اُس طرف جانے کا موقع نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ..... جلدی۔'' وہ شخص بولا۔ میں نے پھرتی سے جھک کر زینب کو کندھے پر لاد لیا اور ہم ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ زینب نے پہلے تو مزاحمت کی تھی لیکن پھر پُرسکون ہو گئی۔

ہم ایک اور گلی میں مُڑ گئے اور اسی لمحے تڑتڑاہٹ کی آواز سنائی دی..... پولیس یا فوج کی کوئی گاڑی فائرنگ کرتی ہوئی تیز رفتاری سے سڑک پر سے گزر گئی۔

لوہاری محلّہ مین روڈ کے دوسری طرف شہر کے شمالی علاقے میں تھا اور فائرنگ کی آوازیں سب سے پہلے اُسی طرف سے سنائی دی تھیں۔ ایسے حالات میں انگوری کی خالہ کے گھر تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

ہم مختلف گلیوں میں گھومتے ہوئے وہاں سے کافی دُور نکل آئے۔ ہر جگہ افراتفری نظر آتی تھی۔ بعض نوجوانوں کو منہ پر ڈھاٹے باندھے مین روڈ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اُن میں کسی کے ہاتھوں میں رائفل بھی نظر نہیں آئی تھی۔

وہ شخص ایک تنگ سی گلی میں ایک مکان کے سامنے رُک گیا۔ گلی کچی تھی اور کیچڑ پھیلا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ میرا پیر پھسلا اور میں گرتے گرتے بچا تھا۔

اُس شخص نے دروازے کی زنجیر کھٹکھٹائی۔ چند سیکنڈ بعد ہی ایک جوان عورت نے دروازہ کھول دیا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے چھ سات ماہ کے ایک بچے کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ شخص اندر داخل ہو گیا اور میرے لئے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اُس شخص نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور مجھے اشارہ کرتا ہوا آنگن کے دوسری طرف ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''اسے یہاں اس چارپائی پر ڈال دو۔'' اُس شخص نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے آہستگی سے زینب کو چارپائی پر لٹا دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہنگامہ کرے گی۔ مگر وہ آرام سے لیٹی ہنستی رہی۔ کبھی وہ میری طرف دیکھتی اور کبھی اُس شخص کی طرف۔

اور پھر اُس نے ایک ایسی حرکت کی کہ میں تھرا اُٹھا..... اُس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیض اُوپر اُٹھا دی اور کمر بند کھولنے لگی۔ میں نے جلدی سے جھک کر اُس کے ہاتھ پکڑ لئے اور قمیض نیچے کھینچ دی۔

''یہ کیا کر رہی ہو..... پاگل ہو گئی ہو کیا؟'' میں چیخا۔

''ہاں..... یہ پاگل ہی ہو چکی ہے۔'' میرے قریب کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔ ''میں بعد میں کسی وقت بتاؤں گا۔ اس وقت تم اسے سنبھالو۔''

میرا خیال ہے اُسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ زینب کی اس حرکت ہی سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کن حالات سے گزری تھی۔

زینب نے دوبارہ وہ حرکت نہیں کی تھی لیکن میری طرف دیکھ کر ہنستی رہی۔ دروازے میں وہ عورت بھی بچے کو اُٹھائے کھڑی تھی۔ وہ شخص بھی میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ زینب اب بڑی حد تک پُرسکون ہو چکی تھی۔ وہ چارپائی پر لیٹی ویران سی نظروں سے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''میرا نام ظہور احمد ہے۔'' میرے قریب کھڑے ہوئے شخص نے اپنا تعارف کرایا۔ ''اور یہ میری بہن سلمٰی ہے۔ بیوہ ہے اس کا شوہر اپنے بچے کی پیدائش سے دو مہینے پہلے باندی پورہ میں ایک جھڑپ کے دوران بھارتی فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا..... بڑا دلیر آدمی تھا۔ ایک سچے مجاہد کی طرح اُس نے ساری گولیاں سینے پر کھائی تھیں۔''

میں نے سلمٰی کی طرف دیکھا۔ شوہر کے ذکر پر اُس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ اُس نے شاید غیر ارادی طور پر بچے کو سینے سے بھینچ لیا تھا۔ صرف سلمٰی ہی ایک ایسی عورت نہیں تھی جس کا جوانی میں سہاگ اُجڑا تھا۔ وادی کے ہر دوسرے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد وطن کی آزادی کی خاطر جان لٹا چکا تھا۔ کسی بہن کے سر سے دوپٹہ چھن گیا تھا، کسی کا سہاگ اُجڑ گیا تھا اور کسی ماں کی گود

اجاڑ دی گئی تھی۔

''اور سلمٰی!'' ظہور احمد کہہ رہا تھا۔ ''ہم کل ہی شمروز اور انگوری کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ عظیم مجاہد آج ہمارے گھر میں موجود ہے۔''

سلمٰی چونک سی گئی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

''تم سلطان کو مجھے دے دو اور پہلے چائے بنا دو۔ اس کے بعد کھانے کا بندوبست کرنا۔'' ظہور احمد نے آگے بڑھ کر بچے کو اُس سے لے لیا۔

''میں ابھی چائے بناتی ہوں۔ مگر تم اس پگلی کو کیوں لے آئے ہو بھائی؟'' سلمٰی نے زینب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ پگلی.....'' ظہور احمد کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ''یہ شمروز کی بہن ہے جسے چند مہینے پہلے سوپور پر حملے کے دوران بھارتی فوجی اُٹھا کر لے گئے تھے۔ اسے تین مہینے پہلے یہاں بازار میں دیکھا گیا تھا۔ پتہ نہیں کن حالات سے گزری ہے؟ بہرحال تم چائے بنا کر لاؤ!''

سلمٰی کا چہرہ ایک لمحہ کو دُھواں سا ہو گیا۔ اُسے شاید اپنے بھائی کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ وہ چند لمحے پھٹی پھٹی سی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی زینب کو دیکھتی رہی اور پھر کمرے سے نکل گئی۔ میں چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا اور زینب کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ میں یہ تو سمجھ گیا تھا کہ اُس پر کیا بیتی تھی اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی وجہ سے اُس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

ظہور احمد ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اُس کی گود میں بچہ قلقاریاں بھر رہا تھا۔

''اس بے چاری کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر کہہ رہا تھا۔ ''تین مہینے پہلے، پہلی مرتبہ اسے لاری اڈے کے قریب دیکھا گیا تھا۔ پھر یہ شہر کے مختلف علاقوں میں نظر آنے لگی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں..... لوگ اسے لاوارث اور پاگل سمجھ کر کچھ نہ کچھ کھانے کو دے دیتے۔ نجانے ہماری قوم کی کتنی بیٹیاں اس طرح اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہیں؟ لیکن لاوارث سمجھ کر اس کے ساتھ کچھ اور زیادتیاں بھی ہوتی رہیں۔ شہر کے بعض اوباش لڑکے.....''

''بس بس..... آگے کچھ مت کہو۔'' میں نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟ اور یہ تو زینب کی حالت ہی بتا رہی تھی کہ اُس پر کیا بیتی تھی۔

کچھ دیر بعد سلمٰی چائے لے آئی۔ اُس نے ٹرے ایک میز پر رکھ دی اور ایک پیالی اُٹھا کر چارپائی کے قریب آ گئی۔ میں سمجھ گیا اور اُٹھ کر ظہور احمد کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلمٰی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

زینب خود ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی اور سلمٰی کے ہاتھ سے پیالی لے لی۔ اُس نے پیالی کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا اور ندیدوں کی طرح چائے پینے لگی۔ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے

اُس کے منہ سے سڑ سڑ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

اور پھر چائے ختم ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد سلمٰی نے زینب کا ہاتھ پکڑ کر اُسے چارپائی سے اُٹھایا اور باہر لے گئی۔ زینب نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔

میں اور ظہور کمرے میں بیٹھے شہر کی تازہ ترین صورتحال پر بحث کرنے لگے۔ باہر سے کبھی کبھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔

''وہ لڑکا عبدالحمید.....'' ظہور احمد کہہ رہا تھا۔ ''چند روز پہلے کام سے واپس آ رہا تھا کہ چوک پر چند نوجوانوں کی پولیس کی ایک پارٹی سے جھڑپ ہوگئی۔ اسی دوران فوجیوں کی ایک پارٹی بھی وہاں پہنچ گئی اور فائر کھول دیا۔ فائرنگ سے کوئی ہلاک یا زخمی تو نہیں ہوا لیکن بھگدڑ مچ گئی۔ وہ لڑکے اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ عبدالحمید اگرچہ اُن سے الگ تھلگ تھا لیکن وہ فوجیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔

تین دن تک کچھ پتہ نہیں چلا کہ عبدالحمید کو کہاں رکھا گیا ہے۔ آج اُس کی زخموں سے چور لاش ملی ہے۔ لوگ بپھر گئے ہیں۔ پورا شہر ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا ہے اور مجھے لگتا ہے آج بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔''

''مزاحمت ہونی چاہئے۔ ہر سطح پر.....'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''شہروں میں، گاؤں دیہاتوں میں، وادی کے کونے کونے میں مزاحمت ہونی چاہئے تاکہ ان غاصبوں کو یہ پتہ چل جائے کہ کشمیری اب بے بس نہیں رہے۔ ان کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ وہ مزید ظلم برداشت نہیں کر سکتے اور غلامی کی زنجیریں توڑ پھینکیں گے۔''

عبدالحمید وہی لڑکا تھا جسے فوجیوں نے مشتاق والی گلی سے اُٹھایا تھا اور اب اُس کی لاش ملی تھی جس پر ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔

میں اور ظہور احمد باتیں کرتے رہے۔ ہمیں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں رہا۔ اور غالباً ایک گھنٹے بعد سلمٰی زینب کو لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو میں چونک گیا۔ اُس ایک گھنٹے میں سلمٰی نے زینب کو نہلا دھلا کر اُس کے کپڑے تبدیل کر دیئے تھے اور بالوں کی بھی چٹیا بنا دی تھی۔ زینب چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ بار بار اپنے کپڑوں کو چھو کر دیکھ رہی تھی۔ کبھی ہنسنے لگتی اور کبھی گم سم سی ہو جاتی۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا اور پھر سلمٰی نے آ کر بتایا کہ کھانا تیار ہو چکا ہے۔ ہم دوسرے کمرے میں آ گئے۔ میں نے زینب کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

کمرے میں بچھی ہوئی دری پر دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ دال چاول تھے۔ زینب ہم سے پہلے ہی دسترخوان پر بیٹھ گئی اور ندیدوں کی طرح چاول کھانے لگی جیسے عرصہ سے کچھ نہ کھایا ہو۔ میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے زینب کی طرف دیکھا۔ ہمارے گھر کیا کچھ نہیں تھا..... ہر چیز کی فراوانی تھی۔ کبھی کسی چیز کی تنگی نہیں ہوئی تھی۔ جو چیز چاہتے کھاتے

تھے۔ اور اب زینب کو دیکھ کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے۔

کھانے کے بعد سلمٰی زینب کو اپنے کمرے میں لے گئی اور میں ظہور احمد کے ساتھ اُسی کمرے میں آ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ ظہور احمد اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ اُس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔

''صورتحال بڑی سنگین ہے.....'' اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''پولیس اور فوج سے جھڑپوں میں شہر کے مختلف علاقوں میں اب تک تین نوجوان شہید ہو چکے ہیں۔ ہنگامے اب مزید بڑھیں گے۔''

میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ نہتے کشمیری نوجوان وحشی درندوں سے برسرپیکار تھے۔ سڑکوں پر اُن کا خون بہہ رہا تھا اور میں یہاں بیٹھا ہوا تھا۔

شام ہونے کو تھی۔ اور پھر یہ اطلاع ملی کہ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ کرفیو کی خلاف ورزی کرنے والوں کو دیکھتے ہی گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔

اب میری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ میں صبح نو بجے کے قریب گھر سے نکلا تھا اور انگوری سے کہہ کر آیا تھا کہ دو ڈھائی گھنٹوں میں واپس آ جاؤں گا۔ مگر اب شام ہو رہی تھی۔ انگوری اور اُس کے خالو وغیرہ یقیناً پریشان ہو رہے ہوں گے۔

میں نے ظہور احمد سے اس پریشانی کا ذکر کیا تو وہ بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں مشتاق حسین کے گھر اطلاع بھجوا دیتا ہوں کہ تم خیریت سے ہو۔''

''کرفیو لگ چکا ہے..... باہر نکلنا خطرناک ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''اس کی تم پرواہ مت کرو.....'' ظہور احمد مسکرا دیا۔ ''ہمارے نوجوان ایسے راستوں سے واقف ہیں کہ وہ کرفیو میں بھی شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ سکتے ہیں۔''

وہ اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ اُس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ ''میں نے دو لڑکوں کو بھیج دیا ہے۔'' اُس نے میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں وہ مشتاق کے گھر پر اطلاع پہنچا دیں گے۔''

باہر شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ سلمٰی نے ہمیں چائے لا کر دے دی اور رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ زینب سو گئی تھی میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے زینب ہی کے بارے میں سوچتا رہا کہ کیا اب یہ کبھی ٹھیک ہو سکے گی؟

تقریباً دو گھنٹوں بعد دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔ میں بھی ظہور احمد کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں تو برآمدے میں رُک گیا اور ظہور احمد نے آگے بڑھ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ انگوری کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر میں اُچھل پڑا۔

''ارے تم.....؟'' میں تیزی سے آگے بڑھا۔ ''تم کیوں آ گئیں..... کیا تمہیں معلوم نہیں کہ شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے اور.....''

''ان باتوں کی پرواہ کون کرتا ہے؟'' انگوری نے میری بات کاٹ دی۔ ''تم صبح سے غائب تھے۔ مجھے پریشانی ہو رہی تھی۔ اور پھر جب یہ لوگ اطلاع لے کر آئے تو میں بھی ان کے ساتھ آ گئی۔''

آوازیں سن کر سلمٰی بھی باورچی خانے سے نکل آئی تھی۔ اور میں نے جب بتایا کہ یہ انگوری ہے تو وہ دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی۔

میں نے انگوری سے سلمٰی اور ظہور احمد کا بھی تعارف کروا دیا۔ اور اُسے زینب کے بارے میں بتایا جس کی وجہ سے میں گھر واپس نہیں جا سکا تھا۔

''اوہ..... کہاں ہے وہ؟'' انگوری کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔

''اُس کمرے میں وہ سو رہی ہے۔'' میں نے بتایا۔

انگوری نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ ہم لوگ اس وقت تک باہر ہی کھڑے تھے۔ پھر سلمٰی انگوری کو لے کر کچن میں چلی گئی۔ میں اور ظہور اپنے کمرے میں آ گئے۔

کھانے کے وقت تک زینب بھی جاگ چکی تھی۔ انگوری زینب کے بازیاب ہونے کی اطلاع پر جس طرح خوش ہوئی تھی اُسے دیکھ کر اس سے کہیں زیادہ افسردہ اور ملول ہو گئی۔

وہ رات ہم نے ظہور احمد کے گھر پر ہی گزاری۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ گزشتہ روز کے ہنگاموں میں تین نوجوان شہید ہوئے تھے۔ چوتھا عبدالحمید تھا جو فوجیوں کی حراست میں تشدد سے جاں بحق ہوا تھا۔ نماز جمعہ کے لئے کرفیو میں وقفہ دینے کا اعلان نہیں کیا گیا تھا لیکن اندر ہی اندر یہ اطلاع پورے شہر میں گشت کر رہی تھی کہ اُن چاروں شہداء کی نمازِ جنازہ مرکزی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد ادا کی جائے گی۔ شہر کے معززین کی طرف سے کرفیو کی خلاف ورزی کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے میں اور ظہور بھی گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور بھی بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل رہے تھے۔ سب ساتھ ملتے گئے اس طرح جب ہم گلیوں سے نکل کر مین روڈ پر پہنچے تو ہمارے گروپ میں ساٹھ ستر آدمی شامل ہو چکے تھے۔ مین روڈ پر ہر گلی کے موڑ پر پولیس اور فوج کے مسلح سپاہی موجود تھے۔ یوں بھی لاتعداد فوجی اور پولیس والے پورے شہر میں پھیلے ہوئے تھے لیکن کسی نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ فوج کی ہائی کمان نے نمازِ جمعہ کے لئے کرفیو میں دو گھنٹے کا وقفہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن اس کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ کرفیو میں وقفے کے ساتھ یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ اگر شہریوں کی طرف سے ہنگامہ کرنے کی کوشش کی جائے تو اُن پر بلا جھجک فائر کھول دیا جائے۔

جامع مسجد شہر کے مرکزی چوراہے کے قریب ہی تھی۔ مرکزی چوراہے پر ہزاروں لوگ جمع تھے۔ پولیس اور فوج نے علاقے کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

چاروں شہداء کے جنازے بھی ایک طرف سائے میں رکھے ہوئے تھے۔ ہر چہرہ افسردہ

تھا۔ ہر روز شہر کے چار چھ نوجوان بھارتی درندوں کے ہاتھوں شہید ہو رہے تھے۔

بھارتی سامراج کے خلاف مولوی صاحب کا وعظ بڑا پُر اثر تھا۔ ایک موقع پر اُنہوں نے مُکا لہراتے ہوئے کہا تھا۔

''آج ہمیں ان غاصبوں سے نمٹنے کے لئے کمانڈر محب اللہ، کمانڈر رشید، کمانڈر عبدالحق، کمانڈر سیف الرحمٰن، شمروز جیسے جری و دلیر نوجوانوں اور انگوری جیسی نڈر اور حوصلہ مند بیٹیوں کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہ سر پھرے نوجوان ہی بھارتی غاصبوں کو اس سرزمین سے نکال سکتے ہیں۔ خدا ان سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔''

مولوی صاحب کے وعظ میں اپنا اور انگوری کا نام سن کر مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ظہور احمد نے میری طرف دیکھا۔ اُس نے اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہا مگر میں نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر بٹھائے رکھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ میری موجودگی کا اعلان کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے مناسب نہیں سمجھا۔ نماز کے بعد شہداء کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ اور پھر نوجوانوں نے جنازے کندھوں پر اُٹھا لئے اور بھارتی سامراج کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے شہر کی سڑکوں پر گشت کرنے لگے۔

جنازے میں ہزاروں لوگ شریک تھے۔ جنازے کے جلوس کو چاروں طرف سے پولیس اور فوج کی بھاری نفری نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ جوشیلے نوجوان بھارتی سامراج کے خلاف نعروں کے ساتھ مجاہدین کے کمانڈر کے نام لے لے کر زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔ اُن میں میرا اور انگوری کا نام بھی بار بار آ رہا تھا۔

ایک جگہ پولیس نے جنازے کو روک لیا۔ اس طرف چند سو گز آگے فوج کے مقامی کمانڈنٹ کی رہائش گاہ تھی۔ اور جنازے کے جلوس کے شرکاء اُس کے سامنے مظاہرہ کر کے اُسے یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ فوج کی وحشیانہ کارروائیوں سے کس طرح گھر اُجڑ رہے ہیں..... مگر فوج اور پولیس نے جلوس کو آگے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔

بات بڑھ رہی تھی۔ نوجوان جنازوں کو اُس راستے سے لے جانا چاہتے تھے۔ وہ اس بات پر بضد تھے کہ اُن کا راستہ چھوڑ دیا جائے۔

پولیس نے پہلے لاٹھی چارج کیا اور پھر فوج نے گولی چلا دی..... پہلے جلوس کو منتشر کرنے کے لئے ہوائی فائرنگ کی گئی۔ پھر لوگوں کو نشانہ بنایا جانے لگا۔ کئی لوگ زخمی ہو کر گرے..... بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ کچھ نوجوانوں نے پولیس اور فوج پر پتھراؤ شروع کر دیا لیکن جدید ترین رائفلوں کے سامنے پتھراؤ کیا حیثیت رکھتا تھا؟ کئی نوجوان زخمی ہو کر گرے۔ فوج نے مصلحتاً اُن کے جسموں کے نچلے حصوں پر گولیاں ماری تھیں۔ یہ ہنگامہ تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ پھر ایک فوجی آفیسر نے میگا فون پر اعلان کیا کہ وہ لوگ جنازے اُٹھا کر لے جائیں اور متبادل راستہ اختیار کریں۔ اگر اس حکم کی خلاف ورزی کی کوشش کی گئی تو ان پر براہِ

راست فائر کھول دیا جائے گا۔

سب سے پہلے میں اور ظہور احمد اُس طرف بڑھے تھے جہاں سڑک پر چاروں جنازے رکھے ہوئے تھے۔ ہماری دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی جمع ہونا شروع ہو گئے۔ بعض جوشیلے نوجوان اب بھی جنازے کے جلوس کو کمانڈنٹ کی رہائش گاہ کی طرف ہی لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ضد بیکار تھی۔ اس سے نہتے شہریوں کو مزید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر مختصر سی تقریر کی۔

''کیا تم لوگ اس شخص کو اپنے اُوپر ہونے والے ظلم کا احساس دلانا چاہتے ہو جس کے حکم پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟ کیا تم ایک خونخوار بھیڑیئے سے یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ چیر پھاڑ نہ کرے؟ نہیں میرے دوستو! یہ انسان نہیں بھیڑیئے ہیں..... ان کے اندر رحم کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا نہ ہی انہیں کوئی احساس دلایا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس وقت کوئی ضد کرنا بیکار ہے۔ ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ میتوں کی بے حرمتی نہ ہو۔ ویسے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان درندوں سے ہم شہداء کے خون کے ایک ایک قطرے کا بدلہ لیں گے۔ اب شہداء کو ان کی منزل تک پہنچانے میں دیر نہ کرو دوستو!''

میں کوئی مقرر یا موعظ نہیں ہوں۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ میرے ان الفاظ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور نوجوانوں نے جنازے اُٹھا کر راستہ بدل لیا۔

شاید ظہور احمد نے اپنے قریب کھڑے ہوئے کسی شخص کو بتا دیا تھا کہ میں کون ہوں..... اور پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ہزاروں لوگوں کے جلوس میں پھیل گئی کہ شمروز بھی جنازے کے اس جلوس میں شریک ہے اور تقریر اُسی نے کی تھی۔

میرے نام کے زندہ باد کے نعرے لگنا شروع ہو گئے..... قبرستان میں بھی میرے نام کے نعرے لگتے رہے۔ جن لوگوں نے مجھے تقریر کرتے ہوئے دیکھا تھا وہ میرے گرد جمع ہو گئے۔ اور پھر یہ دیکھ کر سب ہی لوگ چونک گئے کہ فوج نے قبرستان کو گھیرے میں لے لیا تھا..... جنازے کے اس جلوس میں میری موجودگی کی اطلاع فوج تک بھی پہنچ گئی تھی۔ کچھ عرصے سے میں بھی فوج کی مطلوبہ لسٹ پر تھا۔ کروڑ نامی بستی میں چندر پال عرف رستم اور بابا عبدالفتح کے ڈیرے پر چار فوجیوں کی ہلاکت کے بعد تو میں فوج کے لئے زیادہ اہم ہو گیا تھا۔ اور اس وقت اُنہیں موقع مل گیا تھا۔ اُنہوں نے قبرستان کو گھیرے میں لے لیا تھا.....

ظہور احمد کو شاید اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر ندامت کے تاثرات نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔

''گھبراؤ نہیں ظہور بھائی!'' میں نے کہا۔ ''ہم بڑے آرام سے نکل جائیں گے اور یہ فوجی یہاں ٹاپتے رہ جائیں گے۔''

قبرستان میں ہزاروں لوگ تھے۔ جن لوگوں نے مجھے تقریر کرتے ہوئے دیکھا تھا وہ اب

مجھے پہچان گئے تھے۔ اُنہوں نے مجھے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اور پھر وہ لوگ مجھے اسی طرح گھیرے میں لئے ہوئے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھ گئے۔ درختوں کے نیچے بھی قبریں تھیں۔ اور وہ لوگ اس طرح رُک رُک کر چل رہے تھے جیسے قبریں دیکھ رہے ہوں۔

درختوں کے جھنڈ کے آس پاس بھی چند فوجی موجود تھے۔ اُنہوں نے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی اور ایک فوجی نے چیختے ہوئے کہا کہ لوگ واپسی کے لئے وہی راستہ استعمال کریں جس طرف سے آئے تھے۔ لیکن تین نوجوان مجھے اپنے ساتھ لے کر درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو چکے تھے۔

درخت بہت گنجان تھے۔ اُن کی شاخیں نیچے کو جھکی ہوئی تھیں۔ ہم اُن کے اندر ہی اندر چلتے ہوئے قبرستان سے دُور آ گئے اور بالآخر درختوں سے نکل کر تیز تیز چلتے ہوئے گنجان آبادی میں پہنچ گئے۔ اس طرح آدھے گھنٹے میں ہم ظہور احمد کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہ تینوں نوجوان مجھے دروازے کے سامنے چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ظہور احمد بھی آ گیا۔ اُس کی اطلاع کے مطابق قبرستان کے داخلی راستے پر بھی فوجیوں کی ایک مسلح پارٹی کھڑی تھی۔ اُن کے ساتھ سول لباس میں دو ایسے آدمی بھی موجود تھے جن کے چہروں پر نقاب تھے۔ صرف آنکھوں کی جگہ پر سوراخ تھے۔ وہ اپنے سامنے سے گزرنے والے ہر شخص کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ظہور احمد کے خیال کے مطابق وہ دونوں نقاب پوش وہ بے ضمیر اور غدار تھے جنہوں نے مجھے جنازے کے جلوس میں دیکھ کر فوج کو خبر دی تھی اور میری شناخت کے لئے وہ فوجیوں کے ساتھ موجود تھے۔ مگر اُنہیں بڑی مایوسی ہوئی تھی کیونکہ میں تو وہاں سے نکل آیا تھا۔

اگلے دو دنوں میں شہر میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا لیکن کشیدگی برقرار تھی۔ اس دوران میں ایک مرتبہ بھی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ انگوری بھی میرے ساتھ تھی اور ہماری تمام تر توجہ زینب پر مرکوز تھی۔ اُس کی حالت دیکھ کر مجھے دُکھ ہو رہا تھا۔ وہ کبھی قہقہہ لگانے لگتی، کبھی رونا شروع کر دیتی اور کبھی خاموش بیٹھی رہتی۔ اُن دو دنوں میں اُس نے ہر مرتبہ اپنے کپڑے بھی پھاڑ ڈالے تھے۔

تیسرے دن ہم نے فیصلہ کیا کہ اسے انگوری کی خالہ کے ہاں منتقل کر دیا جائے۔ وہاں اُس کی دیکھ بھال کرنے والے موجود تھے یہاں سلمٰی اکیلی تھی۔ اُس کا شیر خوار بچہ بھی تھا اُس کے لئے زینب کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

اور پھر اگلے روز ناشتے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم ظہور احمد کے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ظہور احمد بھی ہمارے ساتھ تھا۔ زینب کو ایک طرف سے میں نے اور دوسری طرف سے انگوری نے سہارا دے رکھا تھا۔ ہمیں اُسے ساتھ لے جانے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ وہ بڑے آرام سے ہمارے ساتھ چل رہی تھی۔ ہم گلیوں سے نکل کر جیسے ہی مین روڈ پر پہنچے تو زینب نے اچانک ہی جھٹکا دے کر اپنے آپ کو ہم سے چھڑا لیا اور قہقہے لگاتی ہوئی سڑک کی طرف دوڑی۔

دائیں طرف سے فوج کی ایک تیز رفتار جیپ آ رہی تھی۔ زینب سڑک کے وسط میں پہنچ چکی تھی۔ میں اُسے پکڑنے کے لئے اُس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اور پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا..... وہ فوجی جیپ زینب سے ٹکرائی اور اُسے اپنے ساتھ گھسیٹتی ہوئی لے گئی..... میں ایک جھٹکے سے رُک گیا۔ میرا دماغ سن ہو رہا تھا اور میں پھٹی پھٹی نظروں سے جیپ کے نیچے زینب کی کچلی ہوئی لاش کو دیکھ رہا تھا.....!

○

جیپ تقریباً دس گز آگے جا کر رُکی تھی اور وہ زینب کو بھی ساتھ گھسیٹتی ہوئی لے گئی تھی۔

جیپ پر چار فوجی تھے۔ ایک ڈرائیور اور تین پیچھے۔ اُن تینوں میں سے ایک جیپ کے سامنے نصب لائٹ مشین گن کے ساتھ کھڑا تھا اور دو سب مشین گنیں سنبھالے آمنے سامنے والی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ جیپ کے زوردار جھٹکے لگنے سے وہ اپنی سیٹوں پر لڑھک گئے تھے لیکن فوراً ہی سنبھل بھی گئے تھے۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے جیپ کی طرف دوڑ لگا دی..... میں خون میں لت پت زینب کو جیپ کے نیچے سے نکالنا چاہتا تھا۔ لیکن جیپ کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے فوجی غالباً یہ سمجھے تھے کہ میں اُن پر حملہ آور ہو رہا ہوں۔ اُن میں سے ایک فوجی نے فائر کھول دیا.....

صورتحال نے ان فوجیوں کو بھی خاصا بدحواس کر دیا تھا۔ وہ فوجی تو کچھ زیادہ ہی بدحواس تھا۔ اُس نے ٹائیگر دبایا تو رائفل کا رُخ قدرے اُوپر کی طرف تھا۔ گولیاں میرے سر کے کئی فٹ اُوپر سے ہوتی ہوئی میرے پیچھے ایک دُکان کے اُوپر لگے ہوئے سائن بورڈ کو چھلنی کر گئی تھیں۔

میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کر لیا۔ پہلے تو میں زینب کو جیپ کے نیچے سے نکالنے کے لئے لپکا تھا۔ فائرنگ کی آواز سن کر میں نے اِرادہ بدل دیا اور جیپ پر چھلانگ لگا دی..... بغیر ہڈ کے جیپ تھی۔ میں ہوا میں اُڑتا ہوا جیپ میں اُس فوجی کے اُوپر گرا جس نے فائرنگ کی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر ٹرائیگر دبا دیا لیکن اس مرتبہ رائفل کا رُخ بدل گیا تھا۔ رائفل کی نال سے نکلنے والی گولیوں نے اُس فوجی کو چھلنی کر دیا جو لائٹ مشین گن کے سامنے اپنی سیٹ پر کھڑا سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چھلنی ہو کر ڈرائیور کے اُوپر گرا۔

میں نے اپنے نیچے دبے ہوئے فوجی کی رائفل پر ہاتھ ڈال دیا اور عین اسی وقت کچھ اور لوگ جیپ کی طرف دوڑ پڑے۔ ظہور احمد اور انگوری اُن میں سب سے آگے تھے۔ ظہور احمد نے آتے ہی دوسرے فوجی کی رائفل چھین لی۔ انگوری ڈرائیور کی طرف لپکی جو سیٹ سے اُترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اُسی وقت دو اور آدمی اس طرف پہنچ گئے اور اُنہوں نے ڈرائیور کو گرفت میں لے لیا اور لاتوں اور گھونسوں سے اُس کی تواضع کرنے لگے۔

ظہور احمد نے رائفل کے بٹ مار مار کر دوسرے فوجی کی کھوپڑی پاش پاش کر دی تھی۔ اُس

کا خون پوری جیپ میں بکھر رہا تھا۔ میں نے اپنے حریف فوجی سے اُس کی رائفل چھین لی تھی اور اُس فوجی کو دھکا دیتا ہوا جیپ سے نیچے اُتر آیا۔ اس دوران انگوری نے سیٹ پر کھڑے ہو کر لائٹ مشین گن سنبھال لی۔

اتفاق سے اُسی وقت ایک اور فوجی جیپ سامنے والی کشادہ گلی سے اس طرف نکل آئی۔ اُس پر بھی لائٹ مشین گن نصب تھی۔ گنر نے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے ہوائی برسٹ مار دیا۔ اُس جیپ کے فوجی صورتحال کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے تھے۔ گنر نے لوگوں کو خوفزدہ کرنے اور منتشر کرنے کے لئے ہوائی برسٹ مارا تھا لیکن انگوری نے بڑی پھرتی سے اپنی لائٹ مشین گن کا رُخ موڑ کر فائر کھول دیا۔ دوسری جیپ کا گنر چھلنی ہو کر ڈھیر ہو گیا۔

اُس جیپ میں ایک میجر، ایک کرنل اور دو فوجی اور تھے۔ ایک فوجی نے کھڑے ہو کر اپنی سب مشین گن سے فائر کرنا چاہا مگر اُس کے رائفل سیدھی کرنے سے پہلے ہی میں نے فائرنگ کر کے اُسے ڈھیر کر دیا۔ اس کے ساتھ اور دوسرے فوجی نے اپنی رائفل پھینک دی اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا دیئے تھے۔

''انگوری..... رُک جاؤ! فائر مت کرنا۔'' میں چیخ اُٹھا۔

سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ لیکن سب دُور دُور تھے۔ البتہ ہمارے والی جیپ کے گرد مجمع لگ گیا تھا۔ چند آدمی زینب کی لاش اُٹھا کر گلی میں دوڑ گئے تھے۔ ظہور احمد بھی ایک فوجی سے چھینی ہوئی سب مشین گن سنبھالے جیپ کے پیچھے آڑ لئے کھڑا تھا۔ میں اپنی سب مشین گن سنبھالے دوسری جیپ کے قریب آ گیا اور جیپ کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے ایک میجر اور کرنل کو دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی.....

وہ موت کے فرشتے تھے۔ اُنہوں نے بے دردی سے بے گناہ، مظلوم اور نہتے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ معصوم اور بے گناہ لوگوں پر گولیاں برساتے ہوئے اُنہوں نے کبھی جھجک محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن اب اپنی موت کو سامنے دیکھ کر اُن کے چہرے دُھواں ہو گئے تھے اور وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔

''نیچے آؤ!'' میں اُنہیں گن کی زد پر لیتے ہوئے دھاڑا۔ وہ فوجی اور دونوں آفیسر ہاتھ اُٹھا کر نیچے اُتر آئے۔ اتنے میں تین نوجوان دوڑتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے۔ یہ تینوں وہی تھے جو اُس روز مجھے قبرستان میں فوج کے گھیرے سے نکال کر لائے تھے۔ اُن میں سے دو نے اُن آفیسرز کے ریوالور نکال لئے، تیسرے نے ایک سب مشین گن کندھے پر لٹکا لی، دوسری سب مشین گن سے اُن سب کو زد پر لے لیا۔ اُن میں اب جیپ کا ڈرائیور بھی شامل ہو گیا تھا۔

ایک اور نوجوان دوڑتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ اُس نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور انجن سٹارٹ کر کے جیپ کو دوڑاتا ہوا دوسری جیپ کے قریب لے جا کر روک دیا اور انجن بند کر کے دوسری سیٹ پر کھڑے ہو کر لائٹ مشین گن سنبھال لی۔ دونوں جیپوں کا رُخ مخالف

سمتوں میں تھا اور اس طرح وہ سڑک دونوں طرف سے لائٹ مشین گنوں کی زد پر تھی۔ ایک مشین گن پر وہ نوجوان کھڑا تھا اور دوسری انگوری نے سنبھال رکھی تھی۔

میں اُن تینوں نوجوانوں کے ساتھ دونوں بھارتی افسروں اور اُن کے دونوں ماتحتوں کو ہانکتا ہوا پہلی جیپ کے پاس لے آیا۔ بازار بند ہو چکا تھا۔ سڑک پر سناٹا چھا گیا تھا۔ لوگ آس پاس کی گلیوں میں گھس گئے تھے۔ یہ سب کچھ اچانک اور اتفاقیہ طور پر ہی ہوا تھا۔ دو بڑے فوجی افسروں کا ہمارے قبضے میں آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن میں ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے کہ انگوری کی آواز سن کر چونک گیا.....

''شمروز ہوشیار.....فوجی ٹرک آ رہا ہے۔''

وہ دونوں آفیسر میرا نام سن کر چونک گئے۔ انگوری کی آواز نے بھی اُنہیں اُچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُنہوں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ اُن کی مقبوضہ جیپ پر ایک جوان اور حسین لڑکی مشین گن سنبھالے کھڑی ہے۔ میں اُن آفیسروں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور مُڑ کر اُس ٹرک کی طرف دیکھنے لگا جو سامنے ایک سڑک سے مُڑ کر اس طرف آ رہا تھا۔

میں نے اپنے ساتھیوں کو کچھ ہدایات دیں اور اُن دونوں افسروں اور دوسرے فوجیوں کو اپنے آگے کھڑا کر کے اُنہیں رائفلوں کی زد پر لے لیا۔ میری رائفل کی نال کرنل کے پہلو سے لگی ہوئی تھی اور دوسرے نوجوان نے میجر کو بے بس کر رکھا تھا۔ اُن سب کے ہاتھ گردنوں پر تھے۔

میں نے بہت بڑا رسک لیا تھا لیکن اس وقت اچانک جو صورتحال پیدا ہوئی تھی اس کے پیش نظر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ آنے والے ٹرک کے فوجیوں نے شاید صورتحال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ٹرک ہم سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر رُک گیا اور فوجیوں نے نیچے اُتر کر رائفلیں تان لیں۔ اس پارٹی کا انچارج ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔

''ان سے کہو آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں۔'' میں نے کرنل کے پہلو میں رائفل کی نال سے کچوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر ایک گولی بھی چلی تو تم لوگوں کو چھلنی کر دیا جائے گا۔''

کرنل نے میرے حکم کی تعمیل میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اُس نے چیخ کر حکم دیا اور تمام فوجی وہیں رُک گئے۔

''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟'' کرنل نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس جیپ نے میری بہن کو کچل دیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کی تدفین کے لئے پُرسکون فضا اور ان بے گناہ لڑکوں کی رہائی جنہیں پچھلے چند روز کے دوران پکڑا گیا ہے۔''

''اس کے لئے ہائی کمان سے بات کرنی پڑے گی۔'' کرنل نے جواب دیا۔

''اپنے لیفٹیننٹ سے کہو کہ وہ وائرلیس پر مقامی کمانڈنٹ سے بات کرے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ دے سکتا ہوں۔ تیسویں منٹ کے بعد فیصلہ ہمارے حق میں نہ ہوا تو تم لوگوں کو چھلنی کر دیا جائے گا۔''

کرنل نے سیکنڈ لیفٹیننٹ کو قریب بلا کر میرا حکم اُس تک پہنچا دیا۔ اس دوران کچھ نوجوان چہروں پر ڈھاٹے باندھے گلیوں سے نکل آئے تھے۔ اُن میں سے کسی کے پاس رائفل تھی، کسی کے پاس پستول اور کسی نے پتھر اُٹھا رکھے تھے۔ میں نے چیخ کر اُنہیں حکم دیا کہ میری اجازت کے بغیر وہ لوگ کوئی غلط حرکت نہ کریں۔

لیفٹیننٹ ٹرک پر سوار ہو گیا اور وائرلیس پر کمانڈنٹ سے بات کرنے لگا۔ میں ایک مرتبہ پھر کہوں گا کہ میں نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ لیکن مجھے توقع تھی کہ بھارتی فوج کی ہائی کمان اپنے دو افسروں کو اس طرح مروانا پسند نہیں کرے گی۔

اس دوران تین اور ٹرک وہاں آ گئے تھے اور فوجیوں نے علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ لیفٹیننٹ ٹرک سے اُتر کر بار بار ہمارے پاس آ رہا تھا اور میں کرنل کے ذریعے اپنی بات اُس تک پہنچا رہا تھا۔

اور پھر ٹھیک تیسویں منٹ پر میرا مطالبہ مان لیا گیا۔ میں نے ایک اور مطالبہ پیش کر دیا کہ فوج اس وقت تک شہر سے نکل جائے جب تک زینب کی تدفین اور ان لڑکوں کی رہائی عمل میں نہیں آ جاتی۔ اور اگر اس دوران شہر میں کہیں ایک گولی بھی چلی تو ان افسروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔ یہ مطالبہ بھی مان لیا گیا اور چند منٹ کے اندر اندر تمام ٹرک واپس چلے گئے۔

لوگ گلیوں اور کونوں کھدروں سے نکل کر سڑک پر جمع ہو گئے اور میرے اور انگوری کے نام کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔

دونوں آفیسروں اور فوجیوں کی آنکھوں پر پٹیاں اور اُن کے ہاتھ پشت پر باندھ کر وہی تینوں نوجوان اُنہیں اپنی نگرانی میں کسی نامعلوم مقام پر لے گئے۔ کچھ اور لوگ بھی اُن کے ساتھ گئے تھے۔

جیپوں پر سے اسلحہ قبضے میں لے کر دونوں جیپوں کو سڑک پر آگ لگا دی گئی تھی۔ لوگوں نے مجھے اور انگوری کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور اُن کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔

ہم دونوں کو کمانڈر کا خطاب مل گیا تھا اور انگوری کو تو دختر کشمیر، دختر وطن، کشمیر کی شیرنی اور نجانے کن کن خطابات سے نوازا جا رہا تھا۔ انگوری کی دلیری اور حوصلہ مندی وہ دیکھ چکے تھے۔ اُس نے جس طرح لائٹ مشین گن استعمال کر کے دوسری جیپ پر آنے والے فوجی افسروں کو سرنڈر ہونے پر مجبور کیا تھا وہ اُس کا قابل تعریف کارنامہ تھا۔

ہمیں تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں روکے رکھا گیا۔ اس دوران بازار کی ساری دُکانیں بھی کھل گئی تھیں۔

پھر ہم مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے ظہور احمد کے گھر آ گئے۔ زینب کی زخموں سے چور چور لاش اُٹھا کر یہیں لائی گئی تھی۔ لوگوں کو پتہ چل گیا تھا کہ شہر کی مختلف سڑکوں پر دکھائی دینے والی وہ پگلی میری بہن تھی۔ لوگ جوق در جوق ظہور احمد کے گھر کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ گلیوں

میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ ہم بڑی مشکل سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ظہور احمد کے آس پاس کے کئی مکان خالی کر دیئے گئے تھے۔ وہاں وہ لوگ بھرے ہوئے تھے جو مجھ سے ہمدردی کے لئے آئے تھے۔ ظہور احمد کے مکان میں لاتعداد عورتیں بھری ہوئی تھیں۔ مجھے سامنے والے ایک مکان میں پہنچا دیا گیا۔ لاتعداد لوگ صحن کے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے لئے بھی جگہ بنا دی گئی۔ انگوری ظہور احمد کے مکان میں چلی گئی تھی۔

چار بجے کے قریب میت تیار ہو گئی جسے جلوس کی صورت میں شہر کے مرکزی چوک کی جامع مسجد لے جایا گیا اور عصر کی نماز کے بعد جنازے کا جلوس قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہر کی سڑکوں پر پولیس کی تو بھرمار تھی مگر کسی فوجی کا نام ونشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ اس شہر میں کوئی فوجی دکھائی نہیں دے رہا تھا اور پولیس والے بھی لوگوں سے دُور دُور ہی تھے۔ اگر وہ فوجی آفیسرز ہمارے قبضے میں نہ آئے ہوتے تو صورتحال مختلف ہوتی۔

ہم تدفین کے بعد واپس آ رہے تھے کہ ایک آدمی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا وہ شرافت حسین تھا۔ اُس روز میں اُسی سے ملنے گیا تھا اور واپسی پر ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ شرافت حسین نے دو دن بعد ملاقات کے لئے کہا تھا مگر ہنگامے طول کھینچ گئے تھے اور میں زینب کی وجہ سے بھی ظہور احمد کے گھر میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔

شرافت حسین میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اُس نے مناسب الفاظ میں تعزیت کی اور پھر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

''پرسوں شام تمہاری باندی پورہ میں افضل عباس نامی ایک شخص سے ملاقات کرانی ہے۔ تم آج ہی رات یہاں سے روانہ ہو جاؤ! وہ تینوں تمہارے ساتھ جائیں گے جو اُس روز تمہیں قبرستان سے نکال کر لے گئے تھے اور آج صبح بھی تمہارے ساتھ تھے۔''

میں چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ شرافت حسین کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''جب تم پہلی بار مجھ سے ملاقات کر کے میری دُکان سے نکلے تو تمہاری حفاظت کے لئے اُن تینوں کو اُسی وقت تمہارے پیچھے لگا دیا تھا۔'' اُس نے سرگوشیانہ لہجے میں بتایا۔ ''وہ تینوں تم سے دُور رہ کر تمہاری نگرانی کرتے رہے ہیں۔ اس لئے آج صبح حادثہ رونما ہوتے ہی وہ تینوں تمہارے قریب پہنچ گئے تھے۔''

''پروگرام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''باندی پورہ پہنچ کر ہی پتہ چلے گا۔'' شرافت حسین نے جواب دیا۔ ''ویسے تمہارے اس کارنامے کی اطلاع بھی اُوپر تک پہنچ چکی ہے۔ تم نے اگرچہ بہت بڑا رِسک لیا تھا۔ فوج پورے شہر کو جلا کر راکھ کر سکتی تھی لیکن فوج کے مقامی کمانڈنٹ پر اُوپر سے بہت دباؤ پڑ گیا تھا۔ یہاں بھی اسی رینک کے آفیسرز کمانڈنٹ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ ان دونوں افسروں کو بچایا جائے۔ اگر کمانڈنٹ اُن کی بات ماننے سے انکار کر کے کسی کارروائی کا حکم دے دیتا تو بھارتی فوج میں

پھوٹ پڑ جاتی۔ کمانڈنٹ کو اس دباؤ میں آ کر تمہارا مطالبہ ماننا پڑا۔ تم نے پہلی مرتبہ فوجی کمانڈنٹ کو اپنے قدموں پر جھکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے۔ اُوپر والے تم سے بہت خوش ہیں۔''

شرافت حسین نے دو مرتبہ اُوپر والوں کا ذکر کیا تھا۔ اور میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اُوپر والے کون ہیں؟ میں نے جب جہاد کے لئے ہاتھ میں رائفل اُٹھائی تھی تو کچھ عرصہ تک کمانڈر محبّ اللہ کے ساتھ رہا تھا۔ اس کے بعد میں اور انگوری آزادانہ طور پر بھارتی فوجیوں کے خلاف کارروائیاں کرتے رہے تھے۔ یوں تو وادی میں مجاہدین کی کئی تنظیمیں بھارتی سامراج کے خلاف برسرِ پیکار تھیں۔ ہم باقاعدہ طور پر کسی ایک تنظیم سے وابستہ نہیں تھے۔ پانزل میں گل فراز نامی مجاہد نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ ہندواڑہ پہنچ کر میں شرافت حسین سے رابطہ کر لوں اور اب شرافت حسین اُوپر والوں کی بات کر رہا تھا اور یہ اُوپر والے میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے کہ کون تھے؟ میں شرافت حسین سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ دو آدمی ہمارے قریب آ گئے اور ہماری گفتگو کا رُخ بدل گیا۔

گھر پہنچے تو شام تک لوگوں کا ہجوم رہا۔ وہ تینوں نوجوان بھی میرے آس پاس منڈلاتے پھر رہے تھے۔ اُن میں سے سعید نامی نوجوان میرے قریب آ گیا۔ وہ دُبلا پتلا سا لڑکا تھا عمر تیئس چوبیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔

''ہم عشا کی نماز کے بعد یہاں سے نکلیں گے کمانڈر.....!'' اُس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''فوج کی حراست میں اپنے نوجوانوں اور فوجیوں کے تبادلے کا کیا ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس سلسلے میں ہمارے کچھ آدمی فوجی اور پولیس حکام سے گفت وشنید کر رہے ہیں۔'' سعید نے جواب دیا۔ ''تبادلے کے لئے کل دن میں کوئی وقت مقرر کیا جائے گا۔ ہندوؤں کی ذہنیت سے سب ہی لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ اپنے آفیسروں کی رہائی کے بعد وہ تمہیں اور انگوری کو گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ اُن کا بعض گھروں پر چھاپے مارنے کا پروگرام بھی ہے۔ اس لئے ہم آج ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔''

مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اپنے افسروں کی رہائی کے بعد بھارتی فوجی بے گناہ نہتے شہریوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں گے۔ میں نے سعید کے سامنے بھی اپنے اس خدشے کا اظہار کر دیا۔

''وہ فی الحال ایسا نہیں کریں گے۔'' سعید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم نے اُنہیں ایسی چوٹ لگائی ہے جسے وہ کئی روز تک سہلاتے رہیں گے اور اب وہ اپنی حکمت عملی بھی تبدیل کریں گے۔ فوجی افسروں کی گرفتاری کا ذمہ دار مقامی کمانڈنٹ کو ٹھہرایا جا رہا ہے۔ فوج میں بہت اُوپر تک ہلچل مچ گئی ہے اور ممکن ہے اس کمانڈنٹ کو ایک دو روز میں یہاں سے تبدیل کر

کے ہیڈ کوارٹر یا کسی اور جگہ بھیج دیا جائے۔''

مجھے سعید کی اس بات سے ذرا بھی اختلاف نہیں تھا۔ ہمارے ہاتھوں فوج کے دو بڑے افسروں کی گرفتاری کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ فوج میں یقیناً اُوپر تک کھلبلی سی مچ گئی ہوگی۔

''تمہارے لئے بھی خطرات بڑھ گئے ہیں۔'' سعید کہہ رہا تھا۔ ''بھارتی فوج کو مطلوب افراد کی فہرست میں تو تم پہلے ہی سے تھے لیکن اب تمہارا نام اس فہرست میں سب سے اُوپر آ گیا ہے۔ اس لئے اُوپر سے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ تمہیں اور انگوری کو آج ہی رات یہاں سے نکال دیا جائے۔''

''یہ اُوپر والے کون ہیں؟'' میں نے وہ سوال کر ڈالا جو شرافت حسین سے پوچھنا چاہتا تھا مگر اس کا موقع نہیں ملا تھا۔

''کمانڈر محبّ اللہ.....'' سعید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کمانڈر محبّ اللہ.....؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں.....'' سعید کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''وہ کسی بھی وقت تمہاری طرف سے غافل نہیں رہا۔ تمہاری سرگرمیوں کی رپورٹیں بھی مختلف ذرائع سے اُس تک پہنچتی رہی ہیں۔ پانزل میں گل فراز نے تمہیں ہندواڑہ میں شرافت حسین سے ملاقات کا مشورہ دیا تھا۔ یہ دراصل کمانڈر محبّ اللہ ہی کا حکم تھا جس کی گل فراز نے تعمیل کی تھی۔ گل فراز کی بجائے کسی اور جگہ کوئی اور مجاہد بھی تم سے ملتا تو یہ پیغام تم تک پہنچا دیتا۔''

''لیکن شرافت حسین نے کوئی خاص بات تو نہیں کی۔'' میں نے کہا۔

''یہاں کے حالات کی وجہ سے پروگرام بدل دیا گیا ہے۔ اس لئے اب باندی پورہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اگر وہاں بھی گڑبڑ ہوئی تو کسی دوسری جگہ کا انتخاب کیا جائے گا جس کی اطلاع ہمیں مل جائے گی۔''

وہاں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے لیکن ہم دونوں اس طرح باتیں کر رہے تھے کہ کسی کو ہم پر شبہ نہیں ہو سکا کہ ہم کسی اہم موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ویسے میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اُتر گیا تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ کمانڈر محبّ اللہ میری طرف سے غافل نہیں تھا۔

عشاء کی نماز ہم نے مرکزی چوک کی جامع مسجد ہی میں پڑھی تھی۔ نماز کے بعد ظہور احمد کے گھر آ کر ہم نے کھانا کھایا۔ اُس وقت بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ جب میں ظہور کے گھر میں داخل ہوا تو انگوری کی خالہ اور اُن کی بیٹی عائشہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ خالہ تو مجھے سینے سے لپٹا کر رو پڑی تھی۔ میں نے انگوری کو الگ لے جا کر بتا دیا کہ آدھے گھنٹے بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔

اور پھر ٹھیک ساڑھے نو بجے میں سعید کے ساتھ اُس مکان سے نکل آیا۔ اُس کے دونوں ساتھی پہلے ہی جا چکے تھے۔ انگوری بھی سیاہ چادر اوڑھے ظہور احمد کے گھر سے نکل آئی۔ اُس

نے اپنی خالہ تک کو نہیں بتایا تھا کہ ہم یہاں سے جا رہے ہیں بلکہ وہ تو کسی کو بتائے بغیر ہی گھر سے نکلی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے تک ہم تنگ اور پُر پیچ گلیوں میں گھومنے کے بعد گنجان آبادی سے باہر نکل آئے۔ آگے آبادی چھدری تھی۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے آبادی مزید کم ہوتی گئی۔ اب پہاڑیوں پر کہیں کہیں اِکا دُکا مکان نظر آ رہے تھے۔

ہم گہری تاریکی میں چلتے ہوئے قبرستان کی طرف نکل آئے لیکن قبرستان میں داخل ہونے کی بجائے اُس کے دائیں طرف سے ہوتے ہوئے گنجان درختوں میں داخل ہو گئے۔ یہ صنوبر کے درختوں کا وہی مختصر سا جنگل تھا جو ایک طرف قبرستان سے ملا ہوا تھا اور دوسری طرف پہاڑی کے دامن تک چلا گیا تھا۔ اُس جنگل میں چنار اور چیڑ کے درخت بھی بکثرت موجود تھے۔

جنگل سے نکل کر ہم پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ سعید چند قدم آگے تھا۔ میں نے انگوری کا ایک ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ ہم دونوں کے کندھوں پر رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ انگوری کی رائفل چادر میں چھپی ہوئی تھی جبکہ ہم سے آگے چلنے والے سعید نے اپنی رائفل ہاتھ میں اُٹھا رکھی تھی۔

ایک جگہ ہم رُک گئے۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا شہر بہت دُور رہ گیا تھا۔ امن اور سکون ہوتا تو یہ چھوٹا سا شہر روشنیوں سے جگمگا رہا ہوتا مگر ہندو غاصبوں نے پوری وادی کا امن و سکون برباد کر رکھا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد بازار بھی بند ہو جاتے تھے اور لوگ بھی اپنے گھروں میں بند ہو کر رہ جاتے تھے۔ تاہم اس وقت شہر میں کہیں کہیں روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

ہم جہاں کھڑے تھے وہ جگہ خاصی بلندی پر تھی اور وہاں سے شہر کے بائیں طرف والی پہاڑی کے دامن میں اُونچی جگہ پر واقع بھارتی فوجی کیمپ کی روشنیاں جگمگاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

سعید وہاں رُک کر کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر ہمیں اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ہم بھی اُس کے پیچھے چل پڑے۔ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سعید پھر رُک گیا۔ وہاں اطراف میں بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے اور جھاڑیوں اور قد آدم پودوں کی بہتات تھی۔ سعید ایک طرف رُخ کر کے منہ سے پہاڑی بکرے کی آواز نکالنے لگا۔ جواب میں فوراً ہی دوسرے پہاڑی بکرے کی آواز سنائی دی۔ ہم پودوں میں دبک کر بیٹھ گئے اور رائفلیں بھی ہم نے کندھوں سے اُتار کر ہاتھوں میں لے لی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد ہی تاریکی میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے اور قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ دو آدمی تھے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ دو آدمی ہی تھے جو پتھروں کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئے۔ اُن میں ایک نے سعید کا نام لے کر پکارا اور ہم پودوں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ تاریکی میں اُن دونوں کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن آوازوں سے میں نے اُنہیں پہچان

لیا۔ وہ انور اور اشرف نام کے وہی دونوجوان تھے جو سعید کے ساتھ میرے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے اور ہم سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ظہور احمد کے گھر سے رخصت ہو گئے تھے۔

ہم اُن کے ساتھ چلتے ہوئے چٹانوں کے دوسری طرف آ گئے جہاں کھلی جگہ پر بغیر ہڈ کی ایک جیپ کھڑی تھی۔ انور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اشرف نے اُس کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی اور ہم تینوں آمنے سامنے کی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ انگوری میرے ساتھ تھی اور سعید ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔

جیپ سٹارٹ ہوئی تو سناٹے میں آواز چٹانوں میں بازگشت سی پیدا کرنے لگی۔ انور نے مُڑ کر سعید سے کچھ کہا جسے میں نہیں سن سکا۔ جیپ ایک جھٹکے سے حرکت میں آ گئی۔

جیپ کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ غیر ہموار راستے پر وہ مینڈک کی طرح اُچھلتی ہوئی چل رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد چٹانوں میں گھومنے کے بعد ایک کشادہ راستے پر آ گئی۔ یہ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ غیر ہموار پتھریلا راستہ تھا۔

ہندواڑہ سے پختہ سڑک کے راستے باندی پورہ جانا ہو تو پہلے بارہ مولا ہائی وے پر سفر کرنا پڑتا ہے۔ سوپور سے کئی میل آگے ایک اور پختہ سڑک وولر جھیل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی باندی پورہ اور پھر جھیل کے اُوپر سے گھومتی ہوئی سمبال سے ہو کر سرینگر تک چلی گئی تھی۔

پختہ سڑک والا راستہ اختیار کرنا ہمارے لئے اس لئے بھی ممکن نہیں تھا کہ ایک تو وہ بہت طویل تھا اور پھر راستے میں فوج کی کسی گشتی پارٹی سے تصادم ہونے کا خطرہ تھا۔ لیکن یہ راستہ جو ہم نے اختیار کیا تھا ناہموار ضرور تھا مگر ایک تو فاصلہ کم تھا اور دوسرے یہ علاقہ سطح زمین سے تقریباً تین ہزار میٹر کی بلندی پر واقع تھا۔ ان دُشوار گزار پہاڑوں میں بھارتی فوجی دن کے وقت بھی آنے سے کتراتے تھے اور رات کے وقت تو ان سے آمنا سامنا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

کئی گھنٹوں تک ان اُونچے پہاڑوں میں ناہموار اور نہایت دُشوار راستے پر سفر کرتے ہوئے ہم بالآخر رات کے آخری پہر تین بجے کے قریب مقام نامی گاؤں میں پہنچ گئے۔ باندی پورہ وہاں سے چند میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

مقام نامی اس گاؤں میں ہم صرف چند منٹ کے لئے رُکے تھے۔ سعید نے بستی کے باہر ہی جیپ رُکوا کر ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا جس سے اندازہ ہوا کہ صاحب مکان جاگ رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر شخص سعید کے ساتھ ہی جیپ کے قریب آ گیا۔

''ابھی کل ہی فوج کے ایک دستے نے باندی پورہ پر ریڈ کیا تھا۔'' وہ شخص کہہ رہا تھا۔ ''اور تم جانتے ہو کہ جب کسی بستی سے فوج کو کچھ نہ ملے تو وہ دوسرے تیسرے دن پھر ہلہ بول دیتے ہیں۔ بہتر ہے کہ آج کا دن تم لوگ ادھر کا رُخ ہی مت کرو۔ یا تو یہیں رُک جاؤ یا.....''

''ہم یہاں نہیں رُک سکتے۔'' سعید نے اُس کی بات کاٹ دی پھر مجھ سے مشورہ کرنے لگا

کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

''یہ تو میرا بھی تجربہ ہے کہ خونی بھیڑیئے کسی بستی پر دوسری مرتبہ ضرور حملہ آور ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں ان کی بات مان لینی چاہئے۔ اور اگر آج کا دن ہم یہیں رُک جائیں تو شاید اس میں ہماری بھلائی ہو۔''

سعید اور اُس کے ساتھی مجھ سے اختلاف نہیں کر سکے۔ ہم جیپ سے اُتر کر مکان میں داخل ہو گئے۔ انور اسٹیئرنگ کے سامنے ہی بیٹھا رہا۔ وہ شخص ہمیں مکان کے اندر چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جیپ کے روانہ ہونے کی آواز سنائی دی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ دونوں بھی واپس آ گئے۔ ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے وہ خاصا کشادہ تھا۔ فرش پر دری ہی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں لکڑی کی ایک سالخوردہ چھوٹی میز پر لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ وہ شخص کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا معذرت کرنے لگا کہ اس وقت اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ لیکن جب انگوری کو دیکھ کر اُسے کچھ احساس ہوا تو وہ بولا۔

''معاف کرنا بیٹی..... آؤ! میں تمہیں دوسرے گھر میں خواتین کے پاس چھوڑ دُوں۔''

''میں یہیں ٹھیک ہوں۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' انگوری نے جواب دیا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ میں یہاں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ میرے گھر والے دوسرے مکان میں ہیں۔'' وہ بولا۔ ''کچھ کھاؤ گے تم لوگ یا قہوہ بنا لیں؟''

''اس وقت تو صرف قہوہ ہی چلے گا۔'' سعید نے جواب دیا۔

اُس شخص کا نام حنیف تھا اور وہ مجاہدین کے لئے مخبر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا تھا۔ اُسے اطلاع تھی کہ ہم آج رات کسی وقت یہاں پہنچیں گے اس لئے وہ ہمارے انتظار میں جاگ رہا تھا۔

حنیف کمرے سے باہر چلا گیا۔ ہم دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ٹانگیں سامنے کو پھیلا رکھی تھیں۔ جیپ کے اس سفر نے ہمارے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے تھے۔ اگر پیدل چلتے تو شاید اتنی تھکن نہ ہوتی۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔ تقریباً بیس منٹ بعد حنیف قہوہ لے کر آ گیا۔ انگوری بھی جاگ گئی۔

گرم گرم قہوہ پینے کے بعد ہمارے حواس کچھ بحال ہوئے لیکن ہم زیادہ دیر تک اسی طرح نہیں بیٹھے رہ سکے۔ تھکن بری طرح سوار تھی اور نیند غلبہ پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سب سے پہلے انگوری چادر اوڑھ کر آڑھی ترچھی فرش پر لیٹ گئی اور اس کے بعد دوسرے بھی لڑھکتے گئے۔

اگلا دن ہم نے مقام نامی اس بستی میں گزارا، شام سے ذرا پہلے باندی پورہ سے آنے والے ایک آدمی سے ''سب ٹھیک ہے'' کا پیغام مل گیا اور شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد ہم باندی پورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک گھنٹے میں ہم باندی پورہ پہنچ گئے۔ افضل عباسی ہمارا منتظر تھا۔ اُس نے جیپ اپنے ایک

آدمی کے حوالے کر دی اور ہمیں لے کر ایک مکان میں پہنچ گیا۔ ایک گھنٹے بعد دو اور آدمی وہاں گئے اور ہمیں بتایا گیا کہ اگلے روز شام سے پہلے ہمیں گندر بل پہنچنا ہے جہاں کمانڈر محب اللہ ہمارا منتظر ہوگا۔

میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی بڑا منصوبہ ہے جس کے لئے مجھے اتنی راز داری سے گندر بل بلایا جا رہا ہے اور کمانڈر محب اللہ خود بھی وہاں پہنچ رہا ہے۔

ہم رات دو بجے تک باتیں کرتے رہے پھر افضل عباسی اور اُس کے ساتھی چلے گئے اور ہم بھی سونے کی تیاری کرنے لگے۔ میں گہری نیند میں تھا کہ سعید نے ہمیں جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اُس وقت دن کا مدھم سا اُجالا پھیل رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے خمار آلود لہجے میں پوچھا۔

''اُٹھو..... جلدی کرو.....!'' سعید چیخا۔ ''فوج نے گاؤں کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے.....''

میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا..... میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی.....!

○○○

میرے دماغ میں سنسناہٹ بڑھتی جا رہی تھی..... سعید کے علاوہ اشرف اور انور بھی جاگ چکے تھے اور اپنی اپنی رائفلیں چیک کر رہے تھے۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ سعید نے مجھے تو جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا لیکن انگوری کو اُس نے محض آوازیں دینے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ میں نے انگوری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے جھنجھوڑ دیا۔

''انگوری..... اُٹھو جلدی کرو!'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''فوج نے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا ہے..... جلدی سے اُٹھ جاؤ!''

انگوری نے بھی اُٹھنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اُس نے فوراً ہی اپنی رائفل سنبھال لی۔ اسی وقت افضل عباسی دوڑتا ہوا مکان میں داخل ہوا۔

''تم لوگ میرے ساتھ آؤ..... جلدی کرو!'' افضل عباسی نے تیز لہجے میں کہا۔ ہم اُس کے ساتھ مقان کے عقبی دروازے سے نکل آئے۔ اس طرف ایک تنگ سی گلی تھی۔ افضل عباسی آگے تھا اور ہم اُس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ تین چار تنگ سی گلیاں گھوم کر ہم ایک کشادہ گلی میں نکل آئے۔ ٹھیک اُسی وقت گاؤں کی مشرقی مسجد سے اللہ اکبر کی آواز سنائی دی۔ یہ مسجد گاؤں کے آخری سرے پر تھی اور اُسی طرف وہ سڑک تھی جو گرور، حاجن اور سمبل ہوتی ہوئی سرینگر تک چلی گئی تھی۔ باندی پورہ سے اُوپر شمال کی طرف ترقبال جانے والی سڑک پر ایک بہت بڑا فوجی کیمپ تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ باندی پورہ کو گھیرے میں لینے والی فوج اُسی طرف سے آئی تھی۔

اذان ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھی۔ اس کے ساتھ ہی مؤذن کی آواز خاموش ہو گئی..... مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بھارتی فوجیوں نے مسجد میں گھس کر مؤذن کو شہید کر دیا تھا۔

میں رُک گیا۔ اب گاؤں کی مرکزی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ میرے ساتھی انگوری اور انور تھے۔ وہ بھی رُک گئے۔ افضل عباسی نے مُڑ کر ہماری طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اُس کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''رُکو مت کمانڈر..... آگے چلتے رہو!''

''انہوں نے مؤذن کو شہید کر دیا ہے۔'' میں نے بھی چیخ کر جواب دیا۔

''اس وقت ہم کچھ نہیں کر سکتے کمانڈر! میرے ساتھ آؤ۔'' افضل عباسی نے کہا۔ ہم سامنے والی ایک اور گلی میں داخل ہو گئے اور پھر ایک مکان میں گھس گئے۔ اُس مکان میں عورتیں بھی

تھیں اور بچے بھی۔ دو ادھیڑ عمر آدمی تھے اور ایک جوان لڑکا تھا۔ تینوں مردوں کے ہاتھوں میں آٹو میٹک رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ صرف ایک منٹ بعد ایک اور نوعمر لڑکا دوڑتا ہوا مکان میں داخل ہوا۔

''ہاں..... کتنے لوگ ہیں اور کہاں کہاں پوزیشن لی ہے اُنہوں نے؟'' افضل عباسی نے اُس لڑکے سے پوچھا۔

''دو ٹرکوں پر تقریباً تیس فوجی ہیں۔ ایک جیپ ہے جس پر دو لیفٹیننٹ اور ایک میجر ہے۔'' لڑکا بتا رہا تھا۔ ''ایک ٹرک گاؤں کے مرکزی چوراہے پر کھڑا ہے۔ فوجیوں نے چاروں طرف رائفلیں تان رکھی ہیں۔ ایک ٹرک اڈے کے پاس ہے۔ اُنہوں نے اڈے کے ساتھ والی مسجد کے پیش امام کو گولیاں مار کر شہید کر دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے..... تم جاؤ اور فقیر حسین سے کہو اپنے آدمیوں کے ساتھ اپنے ٹھکانے پر ہی میرا انتظار کرے۔'' افضل عباسی نے کہا اور لڑکا دوڑتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا۔

مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ گاؤں والے مقابلے کے موڈ میں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اُن کے پاس ایمونیشن بھی کافی مقدار میں موجود ہو گا۔ میں نے فعال کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا.....

''یہاں تمہارے پاس کتنے آدمی ہیں، اور ایمونیشن کی صورتحال کیا ہے؟'' میں نے افضل عباسی سے پوچھا۔

''کم از کم بیس آدمی ہیں جو مرتے دم تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔'' افضل عباسی نے جواب دیا۔ ''ہمارے پاس گولہ بارود بھی کافی مقدار میں موجود ہے۔ چند روز پہلے ایک جھڑپ میں بھارتی فوجی اسلحہ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے جس پر ہم نے قبضہ کر لیا تھا۔''

''ٹھیک ہے..... ہم اُن کا مقابلہ کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا ہم کسی ایسی جگہ پر جا سکتے ہیں جہاں سے مرکزی چوک کا جائزہ لیا جا سکے؟''

''ہاں..... میرے ساتھ آؤ!'' افضل نے کہا۔

ایک دو گلیوں اور پھر مکانوں کی چھتوں پر سے ہوتے ہوئے ہم ایک دو منزلہ مکان کی چھت پر پہنچ گئے۔ اُس مکان کی چھت پر خشک لکڑیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ غالباً بہت پہلے درختوں کی لکڑیاں کاٹ کر یہاں ڈال دی گئی تھیں جو اب خشک ہو چکی تھیں۔ اُن میں چند بڑے تنے بھی تھے۔

میں نے انگوری اور سعید وغیرہ کو سیڑھیوں کے قریب ہی رُکنے کا اشارہ کیا اور افضل کے ساتھ لکڑیوں کی آڑ میں سینے کے بل رینگتا ہوا منڈیر کے قریب پہنچ گیا۔

منڈیر تقریباً دو فٹ اُونچی تھی۔ اس کے ساتھ بھی لکڑیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ میں منڈیر کے اُوپر لکڑیوں کی آڑ سے سامنے دیکھنے لگا۔

چوک وہاں سے تقریباً پچاس گز دُور تھا۔ اخروٹ کے ایک بہت بڑے درخت کے نیچے ایک بڑا ٹرک اور اُس کے ساتھ ہی ایک جیپ کھڑی تھی۔ دونوں پر لائٹ مشین گنیں نصب تھیں اور گنر اُن لائٹ مشین گنوں کے سامنے مستعد کھڑے تھے۔

وہ تقریباً اٹھارہ فوجی تھے جو مختلف سمتوں میں رُخ کر کے پوزیشن لئے بیٹھے تھے۔ ایک میجر جیپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے قریب ہی ایک لیفٹیننٹ کھڑا تھا جبکہ دوسرا لیفٹیننٹ اُن سے دو تین گز دُور ایک میگا فون لئے کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد دو فوجی تین چار مقامی آدمیوں کے ساتھ چوک کے دوسری طرف والی گلی سے نمودار ہوئے۔ گاؤں کے وہ چاروں آدمی بوڑھے تھے اور فوجیوں نے اُنہیں رائفلوں کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہ لوگ جیپ کے قریب آ کر رُک گئے۔ میجر اُن سے باتیں کر رہا تھا اور وہ چاروں مسلسل انکار میں سر ہلا رہے تھے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد دوسرا لیفٹیننٹ بھی اُن کے قریب آ گیا۔ وہ بھی اُن سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا پھر میگا فون پر اعلان کرنے لگا۔

''گاؤں والو.....'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کمانڈر شمروز، کمانڈر انگوری اور اُن کے چند ساتھی گزشتہ رات ہندواڑہ سے یہاں پہنچ گئے ہیں اور اُنہوں نے گاؤں کے کسی گھر میں پناہ لے رکھی ہے۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔ میں اپنا اور انگوری کا نام سن کر اُچھل پڑا..... اُنہیں ہمارے ہندواڑہ سے نکلنے اور یہاں پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا.....

''ہم اس گاؤں کے باسیوں کو پندرہ منٹ دیتے ہیں ان اُگر وادیوں کو ہمارے حوالے کر دیں۔ پندرہ منٹ بعد ہم گھروں کی تلاشی لیں گے اور پھر ہم کسی کو معاف نہیں کریں گے۔ اور اگر کسی نے مداخلت کی تو اس گاؤں کو جلا کر بھسم کر دیا جائے گا۔''

یہ اعلان کئی مرتبہ دوہرایا گیا۔ بستی کے اُن چاروں آدمیوں کو جنہیں غالباً پوچھ تاچھ کے لئے فوجی پکڑ کر لائے تھے ایک طرف بٹھا دیا گیا تھا۔ میں لکڑیوں کی آڑ سے سامنے دیکھتا رہا۔ وہ تینوں فوجی آفیسر آپس میں کسی قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔

''تم نے کچھ دیر پہلے اُس لڑکے کو فقیر حسین کے پاس بھیجا تھا۔ اُس کے پاس کتنے آدمی ہیں اور وہ کہاں ہیں؟'' میں نے مُڑ کر افضل عباسی سے پوچھا۔

''وہ سامنے کی ایک گلی میں ہے۔ اُس کے ساتھ پانچ آدمی اور ہیں۔'' افضل عباسی نے جواب دیا۔

''اُسے پیغام بھیج دو کہ دو آدمی سامنے سرخ چھت والے مکان پر چلے جائیں اور تین آدمی گلی کو بلاک کر لیں۔'' میں نے چوک کے دوسری طرف ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور تین چار آدمی اُس طرف والی گلی کو بلاک کرنے کے لئے بھیج دو! بھارتی فوجی کھلی جگہ پر ہیں اور ہم ان سے بہتر پوزیشن میں ہیں۔ انشاء اللہ کوئی بھی بھارتی بھیڑیا بچ کر نہیں جا سکے گا۔ اور سعید!'' میں نے مُڑ کر سعید کو مخاطب کیا جو اس دوران جھکتا ہوا ہمارے قریب آ گیا تھا۔ ''تم

اپنے لڑکوں کو لے کر اُس طرف جا کر راستہ بلاک کر دو۔ اگر دوسرا ٹرک اس طرف آنے کی کوشش کرے تو اُڑا دینا۔''

''اور تم لوگ؟'' افضل عباسی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''میں اور انگوری یہیں رہیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ممکن ہو تو ہمیں تھوڑا سا ایمونیشن بھیج دو! ہم یہاں سے بہتر طور پر صورتحال پر نگاہ رکھ سکیں گے۔ جاؤ! اب دیر مت کرو۔ اُنہوں نے پندرہ منٹ کا وقت دیا ہے۔ ہمیں اس مہلت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا چاہئے۔''

افضل اور سعید وغیرہ فوراً ہی وہاں سے رُخصت ہو گئے۔ انگوری میرے قریب آ گئی تھی۔ اُسی وقت میں نے دو آدمیوں کو ایک گلی سے نکل کر بائیں طرف واقع مسجد کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ ذرا آگے بڑھے تو دو فوجیوں نے اُنہیں روک لیا۔ پہلے اُن سے کچھ پوچھتے رہے، پھر ایک فوجی اُن کی تلاشی لینے لگا۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ ہم اپنے ہی گھروں میں محفوظ نہیں تھے۔ ہر شہر، قصبے اور دیہات میں لوگوں کی تلاشی لے کر اُنہیں ذلیل کیا جاتا تھا۔ اگر کسی کی جیب سے ناخن تراش بھی نکل آتا تو ''اسلحہ'' رکھنے کے جرم میں اُس پر بے پناہ تشدد کیا جاتا اور اُسے زندگی بھر کے لئے معذور کر کے پھینک دیا جاتا۔

تلاشی لینے کے باوجود اُن دونوں بوڑھوں کو نماز پڑھنے کے لئے مسجد کی طرف نہیں جانے دیا اور اُنہیں دھکے دے کر واپس جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اسی طرح کئی اور نمازیوں کو بھی مسجد تک نہیں پہنچنے دیا گیا۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ میں نے منڈیر کے قریب لکڑیوں کی آڑ سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ گاؤں میں کوئی نقل و حرکت دکھائی نہیں دی تھی۔ جو چند آدمی نماز پڑھنے کے لئے گھروں سے نکلے تھے اُنہیں واپس بھیج دیا گیا تھا۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ مجھے اپنے آدمی بھی کہیں دکھائی نہیں دیئے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ اپنے اپنے مورچوں پر پہنچ چکے ہوں گے۔

میں ابھی اطراف کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ فضا میں ایک تھرتھراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ چوک والی مسجد کے پیش امام کی آواز تھی۔ لاؤڈ اسپیکر پر اُس کی آواز چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''آج مسجد ویران ہے..... کوئی نمازی اِدھر نہیں آیا..... یاد کرو! تمہارے اسلاف نے تو میدانِ جنگ میں بھی کبھی نماز قضا نہیں کی۔ اسلام کے شیدائیوں نے تو سنگینوں کے سائے میں بھی اپنے رب کے سامنے سجدہ کیا ہے۔ وہ کفر کی طاقت سے کبھی خائف نہیں ہوئے تھے۔ تم آج بت پرستوں کی طاقت.....'' میں اُس لیفٹیننٹ اور دو فوجیوں کی طرف دیکھنے لگا جو رائفلیں سنبھالے ایک دم مسجد کی طرف دوڑ پڑے تھے۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی..... مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اب پیش امام کا حشر کیا ہو

گا۔ چند منٹ بعد ہی مولوی صاحب کی آواز سناٹے میں ڈوب گئی..... اور اس کے ایک منٹ بعد اُس ہندو لیفٹیننٹ کی آواز مسجد کے اسپیکر پر سنائی دی۔

''گاؤں والو.....'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''پندرہ منٹ کی مہلت ختم ہو گئی ہے..... تمہیں پانچ منٹ اور دیئے جاتے ہیں۔ اگر تم لوگوں نے اُگرواد یوں کو ہمارے حوالے نہ کیا تو اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔''

اسپیکر بند ہو گیا اور اس کے دو منٹ بعد وہ منظر دیکھ کر میں کانپ اُٹھا۔ وہ دونوں فوجی مولوی صاحب کو گھسیٹتے ہوئے لا رہے تھے۔ مولوی صاحب کے سر اور چہرے سے خون بہہ رہا تھا۔ اُن کی سفید داڑھی اور کرتہ بھی خون سے تر تھا۔ اُن کے پیچھے آتا ہوا لیفٹیننٹ مولوی صاحب پر ٹھوکریں برسا رہا تھا۔ خون میں تر ہونے کے باوجود مولوی صاحب کی زبان سے اُف تک نہیں نکلا تھا۔ لیکن پھر دفعتہً اُنہوں نے اپنے آپ کو فوجیوں سے چھڑا لیا اور اُن کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے اور پھر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔

قریب کھڑے ہوئے لیفٹیننٹ نے بڑی پھرتی سے ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور اُس کی نال مولوی صاحب کے منہ میں ٹھونس کر ٹرائیگر دبا دیا..... مولوی صاحب کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے..... میں تھرا کر رہ گیا۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''اب مزید انتظار کرنا ممکن نہیں انگوری!'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''تم جیپ والے گنر کو نشانہ بناؤ! میں اُس لیفٹیننٹ سے نمٹتا ہوں۔ تمہارا نشانہ چوکنا نہیں چاہئے۔''

انگوری نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ منڈیر کے ساتھ پوزیشن لے کر بیٹھ گئی۔ اُس نے رائفل کی نال منڈیر پر ٹکا کر لیفٹیننٹ کا نشانہ لیا اور پھر ہم دونوں کی رائفلیں بیک وقت شعلے اُگلنے لگیں..... مولوی صاحب کو بیدردی سے ہلاک کرنے والے لیفٹیننٹ کو چیخنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ میری پہلی ہی گولی نے اُس کی کھوپڑی اُڑا دی تھی۔ چند گولیاں جسم کے دوسرے حصوں پر بھی لگی تھیں۔ اُس کے ساتھ ایک سپاہی بھی ڈھیر ہو گیا تھا..... دوسرے فوجی کی ٹانگ پر گولی لگی وہ چیختا اور لنگڑاتا ہوا جیپ کی طرف دوڑا لیکن میں نے اُسے دو تین گز سے زیادہ آگے جانے کا موقع نہیں دیا اور وہ بھی ڈھیر ہو گیا۔

میں دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ انگوری کی پہلی گولی جیپ پر لائٹ مشین گن کے سامنے کھڑے ہوئے گنر کی گردن میں لگی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح لہراتا ہوا نیچے گر گیا.....

جیپ پر بیٹھے ہوئے میجر نے بدحواس ہو کر ایک طرف چھلانگ لگا دی مگر وہ سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ انگوری کی رائفل کی گولیوں نے اُس کے جسم میں لاتعداد سرخ رنگ کے سوراخ بنا دیئے۔ دوسرے لیفٹیننٹ نے جیپ کی آڑ میں پناہ لے لی اور چیخ چیخ کر اپنے فوجیوں کو آرڈر جاری کرنے لگا.....

اور پھر یوں لگا جیسے جہنم کا دہانہ کھل گیا ہو..... تقریباً ڈیڑھ درجن سب مشین گنوں کا رُخ

ہماری طرف تھا۔ گولیوں کی موسلا دھار بارش تھی جس کا رُخ ہماری طرف تھا..... ہم جھک کر منڈیر کی آڑ میں بیٹھ گئے۔ لاتعداد گولیاں دیوار سے ٹکرا رہی تھیں اور لاتعداد گولیاں ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر رہی تھیں۔ اور پھر دفعتہً گاؤں کی فضا میں چاروں طرف گولیوں کی آوازیں گونجنے لگیں..... ہمارے آدمیوں نے بھارتی فوجیوں پر چاروں طرف سے فائر کھول دیئے تھے..... ہم پر بھارتی فوجیوں کی فائرنگ کا دباؤ کم ہو گیا۔ میں نے احتیاط سے سر اُٹھا کر دیکھا، فوجی فائرنگ کرتے ہوئے پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اُن میں زیادہ تر ٹرک کی آڑ میں پناہ لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

''مجھے ذرا اس طرف آنے دو!'' انگوری نے مجھے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ میں نیچے دبک کر پیچھے ہٹ گیا۔ انگوری میرے اور منڈیر کی دیوار کے درمیان رگڑ کھاتی ہوئی ذرا آگے نکل گئی اور منڈیر پر رائفل کی نال سیٹ کرنے لگی۔ اس وقت عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں نے تیزی سے پیچھے مُڑ کر دیکھا..... وہ افضل عباسی تھا جس نے ایک ہاتھ میں سب مشین گن اور دوسرے ہاتھ میں ایک تھیلا اُٹھا رکھا تھا جس میں سب مشین گنوں کے میگزین بھرے ہوئے تھے۔ انگوری ٹرک کا نشانہ لے رہی تھی۔ پھر اُس نے ٹرائیگر دبا دیا مگر اُس کی رائفل کھٹکھٹا کر رہ گئی..... اُس نے جلدی سے پیچھے مُڑ کر دیکھا، افضل عباسی اُس سے چھ سات فٹ کے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا اُس نے تھیلے میں سے ایک نیا میگزین نکال کر انگوری کی طرف اُچھال دیا۔ انگوری نے رائفل میں سے خالی میگزین نکال کر نیا میگزین فٹ کیا اور رائفل کی نال دوبارہ دیوار پر ٹکا دی۔ میں نے گردن گھما کر انگوری کی طرف دیکھا، اُس کے پرلی طرف افضل عباسی بھی پوزیشن لے رہا تھا۔

انگوری کی رائفل کا رُخ اگرچہ فوجی ٹرک کی طرف تھا لیکن مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کسی خاص چیز کا نشانہ لے رہی تھی۔ میں نے رائفل کی نال اور ٹرک کی طرف دیکھا اور پھر بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ٹرک کا فیول ٹینک اُس طرف سے صاف نظر آ رہا تھا۔

''میری دُعائیں تمہارے ساتھ ہیں انگوری..... فائر!'' میں نے مدہم لہجے میں کہا، انگوری نے ٹرائیگر دبا دیا۔ اس کے فوراً ہی بعد ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا..... دھماکہ اس قدر زوردار تھا کہ مکان کی چھت بھی لرز اُٹھی تھی۔

انگوری کی رائفل سے نکلنے والی گولیاں ٹھیک نشانے پر لگی تھیں۔ ٹرک کا فیول ٹینک پھٹتے ہی کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور ٹرک کے پرخچے اُڑ گئے..... ٹرک کے جلتے ہوئے ٹکڑے اخروٹ کے پھیلے ہوئے اور بلند و بالا درخت کی شاخوں میں پھنس گئے۔ کئی جلتے ہوئے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ سیاہ دُھویں کا ایک مہیب بادل تھا جو اخروٹ کے درخت کو لپیٹ میں لے کر فضا میں پھیل رہا تھا۔

میں بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے سرکتا ہوا انگوری کے قریب پہنچ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں

بڑی عجیب سی چمک تھی۔ افضل عباسی بھی ہمارے قریب آ گیا اور وہ بھی حیرت سے انگوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔

انگوری چمکتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ یکایک اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور وہ رائفل چھوڑ کر بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اُس کا کندھا تھپتھپاتا رہا اور پھر اُسے اپنے سے الگ کر کے چوک کی طرف دیکھنے لگا۔ دُھویں کا بادل اب درخت سے اُوپر فضا میں پھیل رہا تھا۔ ٹرک کے کچھ جلتے ہوئے ٹکڑے اب بھی درخت کی شاخوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اخروٹ کا درخت دُھویں سے بالکل سیاہ ہو گیا تھا..... درخت کی شاخوں میں ٹرک کے جلتے ہوئے ٹکڑوں کے ساتھ انسانی اعضاء بھی اٹکے ہوئے تھے..... یہ اُن بھارتی فوجیوں کے اعضاء تھے جنہوں نے ٹرک کے پیچھے یا اُس کے اندر پناہ لینے کی کوشش کی تھی۔ ٹرک کے ساتھ اُن کے بھی پرخچے اُڑ گئے تھے اور اُن کے جسموں کے اعضاء درخت کی شاخوں میں اٹک گئے تھے اور کچھ چوک میں اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔

اس دھماکے کے بعد فضا میں اچانک ہی سناٹا چھا گیا تھا..... ہم تینوں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی دوڑتے ہوئے سامنے والی گلی سے نکل کر سامنے آ گئے۔ اُن دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ افضل عباسی نے اُن میں سے ایک کا نام لے کر پکارا۔

''سب کو جمع کرو! ہم نیچے آ رہے ہیں۔''

اور پھر دوسرے ہی لمحے ہم تینوں سیڑھیوں کی طرف دوڑے۔ جب ہم گلی میں مکان کے دروازے سے نکل کر چوک کی طرف آئے تو وہاں کئی لوگ جمع ہو چکے تھے۔

''یہ کارنامہ کمانڈر انگوری کا ہے۔'' افضل عباسی نے چیخ کر کہا۔ ''اگر یہ ٹرک کو نہ اُڑاتی تو بھارتی درندے بستی کے لوگوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتے تھے۔''

فضا کمانڈر انگوری زندہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ بستی کے چند خاص لوگوں کے علاوہ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم بستی میں موجود ہیں۔ لیکن اب سب کو پتہ چل گیا تھا۔ لوگ بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مولوی صاحب کی نعش اُٹھا کر مسجد میں پہنچا دی گئی تھی۔ مجھے اور انگوری کو افضل عباسی نے جیپ پر کھڑا کر دیا تاکہ لوگ ہمیں آسانی سے دیکھ سکیں۔ اسی دوران اڈے کی طرف سے دو چار گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دو آدمی اُس طرف سے دوڑتے ہوئے آ گئے۔ اُن سے ملنے والی اطلاع بڑی دلچسپ تھی۔

جو ٹرک گاؤں کے باہر لاری اڈے پر رُکا تھا اُس پر بارہ فوجی تھے۔ افضل عباسی کے آدمیوں نے اُن میں سے تین کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا، پانچ اپنی جانیں بچا کر پہاڑیوں کی طرف بھاگ نکلے تھے جبکہ چار کو زندہ پکڑ لیا گیا تھا۔

''اُن چاروں کو ہم نے باندھ کر ٹرک میں ڈال دیا ہے۔ کیا کرنا ہے اُن کا؟'' اطلاع لانے والوں میں سے ایک نے پوچھا۔

''اُن کے ساتھیوں کی لاشیں بھی ٹرک میں ڈال دو اور ٹرک یہاں لے آؤ!'' افضل عباسی نے کہا اور دونوں نوجوان واپس دوڑ گئے۔

اُس وقت باندی پورہ کے لوگوں میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر بھارتی فوج کی پوری بٹالین بھی اس گاؤں پر حملہ کر دیتی تو گاؤں کے لوگ اُسے تہس نہس کر دیتے۔ چند منٹ بعد ہی وہ ٹرک وہاں پہنچ گیا۔ اُس پر لگی ہوئی ایک لائٹ مشین گن کے علاوہ ایمونیشن کی چار پیٹیاں، کئی رائفلیں اور دستی بموں کی ایک پیٹی بھی موجود تھی۔ بھارتی فوجی جب کسی بستی کو تاراج کرنے کے لئے نکلتے تو اپنے ساتھ اتنا گولہ بارود لے کر چلتے تھے جیسے طویل عرصہ کے لئے کسی محاذ پر جا رہے ہوں۔

افضل عباسی نے تمام اسلحہ ٹرک سے اُتروا کر کسی مکان میں بھجوا دیا۔ لاری اڈے کے قریب چار مجاہدین شہید ہوئے تھے۔ اُس مسجد کے مؤذن کو اُس وقت شہید کر دیا گیا تھا جب وہ فجر کی اذان دے رہا تھا۔ اُن کی نعشیں بھی چوک والی مسجد میں پہنچا دی گئی تھیں۔

افضل عباسی کا خیال تھا کہ ہمیں اب فوری طور پر گندربل کے لئے روانہ ہو جانا چاہئے۔

''لیکن یہ سب کچھ.....؟'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''اس کی تم فکر مت کرو کمانڈر!'' اُس نے کہا۔ ''ایک گھنٹے کے اندر اندر یہاں سب کچھ صاف ہو جائے گا۔''

''یہاں بیس بائیس بھارتی فوجی مارے گئے ہیں جن میں تین آفیسر بھی شامل ہیں۔ ہائی کمان خاموش تو نہیں بیٹھے گی۔ ہو سکتا ہے وہ آج ہی شام سے پہلے پہلے کوئی بڑا حملہ کریں۔'' میں نے کہا۔

''وہ انتقامی کارروائی ضرور کریں گے۔ لیکن ایک دو دن اس کی توقع نہیں۔'' افضل عباسی نے جواب دیا۔ ''وہ یقیناً یہی سمجھیں گے کہ یہاں مجاہدین کا کوئی بڑا گروپ موجود ہے۔ اتنا نقصان اُٹھانے کے بعد وہ فوری طور پر حملہ کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے ایک دو دن تک خاموش رہیں۔ اس دوران بارہ مولا کی طرف سے ایک پارٹی ہمارے پاس پہنچ جائے گی۔ یہاں کے معاملات ہم سنبھال لیں گے۔ تم لوگ گندربل پہنچ جاؤ۔ وہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر ایک لڑکے کو اشارہ کیا کہ ہمیں اُس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ ہم اُس لڑکے کے ساتھ چلتے ہوئے ایک کشادہ گلی میں داخل ہو گئے۔ اب عورتیں بھی گھروں سے نکل آئی تھیں۔ بچے بھی شور مچاتے ہوئے گھروں سے نکل کر چوک کی طرف جا رہے تھے۔

ہم اُس لڑکے کے ساتھ ایک مکان میں داخل ہو گئے۔ کچھ دیر بعد سعید اور اشرف وغیرہ بھی پہنچ گئے اور پھر باتوں باتوں ہی میں یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ فاضل عباسی، سعید کا حقیقی ماموں ہے اور اس لئے سعید گھر کے زنانہ حصے میں بھی آزادی سے آ جا رہا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہمارے سامنے دستر خوان بچھا کر ناشتہ لگا دیا گیا۔ اسی وقت افضل عباسی بھی پہنچ گیا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ہم تیار ہو کر مکان سے باہر آ گئے۔ سعید تو ایک تنگ سی گلی میں مڑ گیا اور ہم لوگ چوک پر آ گئے۔ گاؤں کے کئی آدمی لکڑیوں کے جلے ہوئے حصے اور انسانی اعضاء کے ٹکڑے اُٹھا کر دوسرے ٹرک میں ڈال رہے تھے۔ چاروں قیدی فوجی درخت کے نیچے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

چند منٹ بعد ہی سعید وہ جیپ لے کر آ گیا جس پر گزشتہ رات ہم نے ہندواڑہ سے یہاں تک سفر کیا تھا۔ ہم نے افضل عباسی اور دوسرے لوگوں کو الوداع کہا اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ جیپ فوراً ہی حرکت میں آ گئی۔

گاؤں سے نکلتے ہی جیپ گرور کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئی۔ ہم اُس وقت سمندر سے تین ہزار دو سو میٹر کی بلندی پر تھے۔ ہمارے ایک طرف نیلے پتھروں والے فلک بوس پہاڑ تھے اور دوسری طرف تا حد نگاہ خوبصورت وادی پھیلی ہوئی تھی اور اُس حسین وادی کے پرلی طرف وولر جھیل تھی۔

یہ پختہ سڑک بلند پہاڑوں کے دامن کے ساتھ ساتھ سرینگر تک چلی گئی تھی۔ کشمیر کو ایشیا کا سوئٹزرلینڈ کہا جاتا ہے۔ میں نے سوئٹزرلینڈ نہیں دیکھا لیکن دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وادی سوئٹزرلینڈ سے بھی زیادہ حسین ہے۔ قدرت نے جی بھر کے اس وادی کو فطری حسن سے نوازا ہے۔ ٹھنڈے اور شفاف پانی کے چشمے، قدم قدم پر گنگناتی ہوئی ندیاں اور جھرنے، برف سے ڈھکی ہوئی فلک بوس پہاڑی چوٹیاں اور اُن پہاڑوں کے دامن میں بہتی ہوئی خوبصورت آبشاریں، پُرسکون جھیلیں، لہلہاتے کھیت، تا حد نگاہ پھیلے ہوئے سبزہ زار، درختوں پر چہچہاتے ہوئے خوش رنگ پرندے اور یہاں پر بسنے والے سادہ لوح باشندے زندگی کے فطری حسن کا دلکش مرقع ہیں۔ وادی میں ہزاروں اقسام کے خوش رنگ پھولوں کے علاوہ اخروٹ، خوبانی، انگور، سیب اور ناشپاتی وغیرہ کے درخت بکثرت ہیں۔ اپنے قدرتی حسن کی بدولت اس وادی کو جنت کا ٹکڑا کہا جاتا ہے۔ لیکن گزشتہ نصف صدی سے مسلط ہندو سامراج نے وادی کی فضا میں زہر گھول رکھا ہے۔ یہاں پھولوں کی خوشبو کی بجائے فضا میں بارود کی بو پھیلی ہوئی ہے..... ہندو غاصب طاقت کے بل بوتے پر وادی کے سادہ لوح اور معصوم لوگوں کو غلام بنانا چاہتے ہیں لیکن کشمیری عوام میں اب اتنا شعور پیدا ہو چکا ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک یہ ظلم و ستم برداشت نہیں کر سکتے۔ زنجیریں اب ٹوٹنے ہی والی ہیں.....

میں اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا کی حسین ترین وادی کو دیکھتے ہوئے یہ سب کچھ سوچتا رہا اور جیپ تیز رفتاری سے پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر دوڑتی رہی۔

دھوپ اگرچہ تیز ہو گئی تھی مگر چاروں طرف پھیلے ہوئے سبزے اور خوشگوار ہوا سے گرمی کا

احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔

اسٹیئرنگ کے سامنے سعید تھا۔ اُس کے ساتھ والی سیٹ پر انور بیٹھا ہوا تھا۔ میں، انگوری اور اشرف پچھلی سیٹوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ بغیر ہڈ کی جیپ پر ہم چاروں طرف کے نظارے با آسانی دیکھ سکتے تھے۔

اُس سڑک پر سرینگر اور باندی پورہ کے درمیان فوجی گاڑیوں کا گشت جاری رہتا تھا۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ کسی فوجی پارٹی سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ بھارتی فوجی ہیڈ کوارٹر میں شاید ابھی تک باندی پورہ پر حملہ کرنے والی فوجی پارٹی کے انجام کی اطلاع تک نہیں پہنچی تھی۔ اگر اطلاع پہنچ گئی ہوتی تو اب تک کچھ نہ کچھ ہو چکا ہوتا اور سڑکوں پر فوجی گاڑیاں ضرور دندناتی ہوئی نظر آتیں۔ یوں تو پہلے بھی ایسے کئی واقعات رونما ہو چکے تھے جن میں بھارتی فوجیوں کو مجاہدین کے ہاتھوں بھاری نقصان اُٹھانا پڑا تھا لیکن شاید یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ایک جگہ پر بھارتی فوجیوں کا اتنا بھاری نقصان ہوا ہو۔

جیپ ایک چھوٹی سی بستی میں رُک گئی۔ یہاں سے سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک سڑک سبھل سے ہوتی ہوئی سرینگر کی طرف چلی گئی تھی اور دوسری گندربل کی طرف..... پھر گندربل سے ایک سڑک سرینگر کی طرف جاتی تھی اور دوسری کنگن، سونا مارگ، بتیال، پانچ ہزار دو سو میٹر کی بلندی پر واقع درّہ زوجی لا اور دراس سے ہوتی ہوئی کارگل کی طرف چلی گئی تھی۔

اُس چھوٹی سی بستی میں پہنچ کر پتہ چلا کہ آج صبح سویرے چند میل دُور سرینگر روڈ پر مجاہدین نے کارروائی کر کے ایک فوجی ٹرک تباہ کر دیا تھا جس میں تین بھارتی فوجی مارے گئے تھے۔ اور مجھے حیرت تھی کہ اس کارروائی کے بعد بھی اس شاہراہ پر کسی قسم کی فوجی سرگرمیاں دکھائی نہیں دی تھیں۔

بستی کے ایک ڈھابے پر ہم نے چائے پی اور آگے روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ اسٹیئرنگ انور نے سنبھالا تھا اور میں اُس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ ہمارا رُخ گندربل کی طرف تھا۔ اُس سڑک پر بھی کسی قسم کی فوجی سرگرمی دکھائی نہیں دی جس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ بھارتی درندے تو انتقامی کارروائی میں ذرا بھی دیر نہیں کرتے مگر یہ خاموشی ناقابلِ فہم تھی۔ یہ سکوت اور سناٹا کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہا تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ گندربل اب زیادہ دُور نہیں رہ گیا تھا۔ اس وقت ہم نہایت ہی خطرناک راستے پر سفر کر رہے تھے۔ ایک طرف عمودی چٹانیں تھیں اور دوسری طرف سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ۔ نشیب میں تا حدِ نگاہ خوبصورت وادی پھیلی ہوئی تھی۔

میں پیچھے کی طرف مُڑ کر انگوری سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور جیپ لڑکھڑا گئی..... میں ایک طرف اُچھل پڑا.....

جیپ لہراتی ہوئی تیزی سے سڑک کے کھڈ والے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انور نے

بڑی پھرتی سے اسٹیئرنگ گھما دیا۔ جیپ کا اگلا پہیہ سڑک کے کنارے سے صرف ایک فٹ کے فاصلے سے مُڑ گیا اور جیپ لہراتی ہوئی دوسری طرف چٹان سے ٹکرا کر رُک گئی۔

ہم سب فوراً ہی چھلانگ لگا کر جیپ سے اُتر گئے اور اِدھر اُدھر دوڑ کر مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھال لی۔

میں چاروں طرف پہاڑیوں میں دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید بھارتی فوجیوں کی کوئی پارٹی ان پہاڑیوں میں گھات لگائے بیٹھی تھی اور اُنہوں نے ہی ہماری جیپ پر فائر کیا تھا۔

کئی منٹ گزر گئے..... کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ کسی طرف سے فائر نہیں ہوا اور نہ ہی آس پاس کی پہاڑیوں پر کوئی نقل و حرکت دکھائی دی۔ میں اُٹھ کر کھلی جگہ پر آ گیا۔ چند سیکنڈ بعد انور اور سعید وغیرہ بھی سامنے آ گئے۔ وہ سب اپنی اپنی رائفلیں سنبھالے محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے لیکن ہر طرف خاموشی تھی۔

سعید جیپ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کا آگے بائیں طرف والا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ اور تب اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ جیپ کا یہ پہلو عمودی چٹان کی طرف تھا اور ظاہر ہے اس طرف سے کسی حملے کی توقع نہیں تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ ٹائر کسی اور وجہ سے برسٹ ہوا ہے۔ شاید کوئی نوکیلا پتھر اس کا باعث بنا ہو۔

ہمارے پاس کوئی فاضل ٹائر نہیں تھا اس لئے جیپ کو یہیں چھوڑ کر پیدل آگے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہم نے اپنی اپنی رائفلیں کندھوں پر لٹکا لیں اور چٹان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

تقریباً پانچ سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم رُک گئے گرگر کرتی ہوئی وہ آواز چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی..... آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ یا تو کوئی مسافر بس ہے یا بھارتی فوجی ٹرک جو گندربل کی طرف سے آ رہا تھا۔

ہم سعید کی رہنمائی میں سڑک چھوڑ کر ایک تنگ سے راستے پر پہاڑوں میں داخل ہو گئے اور دشوار گزار راستوں پر چلتے رہے۔ تقریباً دو سو گز آگے جا کر ہم ایک اُونچی چٹان پر پہنچ گئے۔ یہاں سے سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔ اور پھر میرے منہ سے ایک گہرا سانس نکل گیا۔

وہ دو بھارتی فوجی ٹرک تھے جو گندربل کی طرف سے آ رہے تھے..... دونوں ٹرکوں پر ہیوی مشین گنیں نصب تھیں۔ دونوں ٹرکوں کی لمبی سیٹوں پر فوجی سب مشین گنیں سنبھالے مستعد بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے سعید کی طرف دیکھا۔ سعید نے اثبات میں سر ہلا دیا..... دوسرے ساتھیوں کو بھی ہمارے پروگرام سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ہم نے فوراً ہی مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھال لی۔

وہ دونوں ٹرک جیسے ہی سامنے پہنچے میں نے چیخ کر آرڈر دیا اور ہماری رائفلیں بیک وقت شعلے اُگلنے لگیں..... انگوری میرے ساتھ تھی اور میری طرح وہ بھی ٹرک کے اگلے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی اور ہمیں ناکامی نہیں ہوئی۔

اچانک فائرنگ سے ٹرکوں کے ڈرائیور ویسے بھی بدحواس ہو گئے تھے۔ اگلے ٹرک کے ہمارے طرف والے ٹائر دھماکوں سے پھٹ گئے۔ ٹرک لہراتا ہوا سڑک کے کھڈ والے کنارے کی طرف بڑھا۔ میں نے اُس کے اگلے پہیئے سڑک سے اُترتے ہوئے دیکھے تھے اور پھر ہم اُس ٹرک اور اُس میں سوار فوجیوں کا انجام دیکھنے کے لئے وہاں نہیں رُکے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو چیخ کر حکم دیا اور سب اُٹھ کر پہاڑوں میں اندر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

سڑک کی دوسری طرف سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دوسرے ٹرک کے فوجیوں نے بدحواسی میں اندھا دُھند فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اور پھر ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ سنائی دیا..... سڑک سے کھائی میں لڑھکنے والا ٹرک اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا.....

اُونچے نیچے راستوں پر دوڑتے ہوئے ہمارے سانس پھول گئے اور پھر ہم ایک جگہ درختوں کے سائے میں رُک گئے۔ قریب ہی ایک گنگناتا ہوا جھرنا بہہ رہا تھا۔ تین چار فٹ کی بلندی سے گرنے والے پانی کی آواز مدھر موسیقی کی طرح گنگناتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''کچھ دیر کو یہاں رُک جاؤ.....'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ لوگ ہمارے پیچھے نہیں آئیں گے۔ ہم تھوڑی دیر یہاں آرام کر سکتے ہیں۔''

انگوری سعید کے قریب ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ انور اور اشرف بھی درختوں سے ٹیک لگائے کھڑے ہانپ رہے تھے۔ میرا سانس بھی بری طرح پھولا ہوا تھا۔ دو تین منٹ گزر گئے۔ اب میں اپنی کیفیت پر بڑی حد تک قابو پا چکا تھا۔ انگوری اپنی رائفل ایک طرف رکھ کر جھرنے کے قریب پہنچ گئی۔ جس جگہ جھرنے کا پانی گر رہا تھا وہاں ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ وہ تالاب کے کنارے پر بیٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگی۔ اشرف بھی اُس کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر پانی پینے لگا..... ہم تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں رُکے رہے۔ روانگی سے پہلے بھی ہم نے جی بھر کے ٹھنڈا پانی پیا تھا۔

اس مرتبہ سعید ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ راستہ خاصا خطرناک تھا۔ ہم بہت محتاط ہو کر چل رہے تھے جس سے ہماری رفتار بھی خاصی سست تھی۔

سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے ہم ایک ایسی پہاڑی پر پہنچ گئے جس کے دوسری طرف نشیب میں وسیع و عریض وادی پھیلی ہوئی تھی اور اُس وادی میں گندربل کا وہ گاؤں تھا جو ہماری منزل تھی۔

گندربل خاصا بڑا گاؤں تھا۔ رُخصت ہوتی ہوئی دُھوپ میں آبادی سے کچھ فاصلے پر بہنے والے دریا کا پانی چمک رہا تھا اور دوسری طرف ایک بل کھاتی ہوئی سرمئی لکیر سی چمک رہی تھی۔ یہ وہ پختہ سڑک تھی جو سرینگر سے گندربل ہوتی ہوئی لداخ اور کارگل کی طرف چلی گئی تھی۔

آبادی ہم سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر تھی اور سعید کا خیال تھا کہ ہمیں دوسروں کی نظروں سے بچنے کے لئے رات کے اندھیرے میں بستی میں داخل ہونا چاہئے۔ چنانچہ ہم اُس

چٹان پر بیٹھ گئے۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد سورج بلند پہاڑوں کے پیچھے چھپ گیا اور شام کا دھندلکا بتدریج اندھیرے میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

ہم اُس وقت سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے تین ہزار میٹر کی بلندی پر تھے۔ دن کے وقت تو موسم بڑا خوشگوار تھا مگر سورج غروب ہوتے ہی فضا میں خنکی سی آ گئی تھی جس میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

سورج غروب ہونے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم وہاں سے چل پڑے۔ اندھیرے میں چٹانوں سے اُترنا خاصا خطرناک کام تھا۔ میں نے انگوری کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور ہم بہت احتیاط سے نیچے اُتر رہے تھے۔ سعید، انور اور اشرف ہم سے آگے تھے۔ انگوری کی وجہ سے میں اُن سے پیچھے رہ گیا تھا۔

ایک جگہ ایک پتھر انگوری کے پیر کے نیچے سے نکل گیا۔ وہ لڑکھڑائی، اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ اگر میں فوراً ہی اُسے نہ سنبھالتا تو کم از کم بیس فٹ نیچے گر کر اُس کی ایک آدھ ہڈی ٹوٹ چکی ہوتی یا کوئی جوڑ ہل گیا ہوتا۔

وہ میرے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ میں نے اُسے اپنے بانہوں کے حصار میں لے رکھا تھا۔ اُس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا اور اُس کے سینے کا زیر و بم میرے دل میں بھی گداز سا پیدا کر رہا تھا..... مجھے اپنی گردن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

○○○

میں نے اُسے اپنے سے الگ کر دیا اور پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر احتیاط سے نیچے اُترنے لگا۔ سعید وغیرہ تقریباً پچاس گز آگے ہمارے انتظار میں رُک گئے تھے۔

آبادی اب زیادہ دُور نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن ہمیں ایک جگہ پھر رُک جانا پڑا۔ ہمارے سامنے بہت گہرائی میں دریا بہہ رہا تھا۔ تیز بہاؤ کی وجہ سے پانی کے شور کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے سامنے رسوں کا ایک پل تھا۔ تیز ہوا کی وجہ سے پورا پل جھولے کی طرح جھول رہا تھا۔ وہ پل پار کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ البتہ یہ اندیشہ ضرور تھا کہ دوسری طرف بھارتی فوجی گھات لگائے نہ بیٹھے ہوں۔

ہم پل کے ساتھ ایک چٹان کے قریب رُک گئے۔ یہاں سے دریا کا پاٹ سو فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ دونوں طرف عمودی چٹانیں تھیں اور اندھیرے میں دوسری طرف کچھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اشرف نے اپنی رائفل سعید کے حوالے کر دی اور پل پر چڑھ کر آہستہ آہستہ دوسری طرف چلنے لگا۔ اُس نے پل کے رسے کو بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ کچھ دُور تک تو ہمیں نظر آیا، پھر گہری تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ہم چٹان کے قریب کھڑے آنے والے لمحات کا انتظار کرتے رہے۔

تقریباً چالیس منٹ بعد سیٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ اشرف کی طرف سے کلیئرنس کا سگنل تھا۔ اُسے پل پار کرنے میں تو زیادہ دیر نہیں لگی تھی لیکن ہمیں سگنل دینے سے پہلے اُس نے آس پاس کی چٹانوں میں گھوم پھر کر اپنا اطمینان کر لیا ہوگا۔

سگنل ملتے ہی ہم پل پر آ گئے۔ سب سے آگے سعید تھا، اُس کے پیچھے میں، میرے پیچھے انگوری اور آخر میں انور تھا۔ ہوا بہت تیز تھی اور پل بری طرح جھول رہا تھا۔ پل کی چوڑائی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ نیچے تختے لگے ہوئے تھے اور ہم نے دونوں طرف سے رسوں کو پکڑ رکھا تھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ درمیان میں ہوا زیادہ تیز تھی۔ ہم چار آدمیوں کا وزن بھی زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوا تھا اور پل زور زور سے ہچکولے لے رہا تھا۔ ایک موقع پر تیز ہوا کے جھونکے سے پل بہت زیادہ جھول گیا تو انگوری کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے جلدی سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم چند سیکنڈ وہاں رُکے اور جب ہوا کا زور کچھ کم ہوا تو آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔

خدا خدا کر کے ہم چٹان پر پہنچ گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور انگوری کے منہ سے

بھی گہرا سانس نکل گیا۔۔

اشرف ہمارا منتظر تھا۔ سعید نے اپنی رائفل اُس کے حوالے کر دی اور ہم ایک بار پھر آگے بڑھنے لگے۔

ابھی تو رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ ہم کسی قدر بلندی پر تھے اور قصبے میں لوگوں کی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ مرکزی بازار میں تقریباً ساری ہی دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ برقی روشنیوں میں زندگی کی یہ نقل و حرکت بہت بھلی لگ رہی تھی۔

ہم قصبے کے باہر رُک گئے۔ قصبے میں اگرچہ فوج کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن پولیس تو بہرحال موجود تھی۔ اور ہم پولیس کی نظروں میں بھی نہیں آنا چاہتے تھے۔

انور سڑک کے دوسری طرف پہاڑیوں میں رک گیا۔ ہم نے اپنی رائفلیں اُس کے حوالے کر دیں اور ایک ایک کر کے وہاں سے قصبے کی طرف جانے لگے۔ سعید نے مجھے بتا دیا تھا کہ ہم قصبے کے مرکزی بازار میں واقع پیراڈائز جنرل سٹور پر پہنچ کر عبدالغفور نامی شخص سے رابطہ کر لیں۔

سعید اور اشرف کے جانے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد میں اور انگوری بھی پہاڑیوں سے نکل کر سڑک پر آ گئے اور سڑک پار کر کے تیزی سے آبادی کی طرف چلنے لگے۔

انگوری نے کالی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ یہ چادر اب اُس کے لباس کا مستقل حصہ بن گئی تھی۔ باندی پورہ میں جب وہ بھارتی فوجیوں پر مکان کی چھت سے گولیاں برسا رہی تھی تو یہ چادر اُس نے پٹکے کی طرح کمر سے باندھ لی تھی۔

ہم مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے قصبے کے مرکزی بازار میں پہنچ گئے۔ میں نے ایک آدمی سے پیراڈائز جنرل سٹور کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔

''وہ جہاں سبز بتی جل رہی ہے وہی پیراڈائز سٹور ہے۔''

میں انگوری کا ہاتھ پکڑ کر اُس طرف چلنے لگا۔ ابھی چند ہی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ بازار میں بھگدڑ سی مچ گئی..... چند آدمی ایک طرف سے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا لیکن اُس کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ البتہ دُکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگی تھیں..... جس سے مجھے کسی گڑبڑ کا اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی۔

میں انگوری کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز چلنے لگا۔ جب ہم پیراڈائز سٹور کے سامنے پہنچے تو ایک آدمی بڑی عجلت میں شٹر گرا رہا تھا۔ دُکان میں اُس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہی عبدالغفور ہے۔

میں اُس سے بات کرنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ہی کسی طرف سے سعید نمودار ہوا..... اُس وقت غفور نے بھی ہماری طرف دیکھا تھا۔

''اندر چلو..... جلدی کرو!'' سعید نے میرے ہاتھ کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ دُکان کا شٹر آدھے سے زیادہ نیچے آ چکا تھا۔ ہم دونوں بھی اُس کے ساتھ ہی جھک کر اندر داخل ہو گئے۔

سعید نے عبدالغفور کی مدد کرتے ہوئے شٹر پوری طرح گرا دیا۔ عبدالغفور نے شٹر کے دونوں طرف تالے لگا دیئے۔ دُکانوں کے شٹروں کو عام طور پر باہر سے تالے لگائے جاتے ہیں لیکن بہت سے دُکانداروں نے کسی ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لئے اندر کی طرف بھی آہنی کنڈے لگا رکھے تھے جن میں ضرورت کے وقت تالے لگائے جا سکتے تھے۔

عبدالغفور نے سیدھے ہو کر ہماری طرف دیکھا، بڑی گرمجوشی سے مجھ سے اور سعید سے ہاتھ ملایا۔ انگوری کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور دُکان کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''میرے ساتھ آ جاؤ..... باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

ہم دُکان کے پچھلے دروازے سے ایک مکان کے مختصر سے آنگن میں نکل آئے۔ عبدالغفور نے دروازہ بند کر کے یہاں بھی تالا لگا دیا اور مکان کے خارجی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں چلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ یہ آنگن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ سامنے برآمدہ تھا اور شاید دو کمرے تھے۔ مگر پورے مکان میں اندھیرا تھا جس کا مطلب ہے کہ یہاں کوئی موجود نہیں ہے۔

ہم ایک تنگ سی گلی میں نکل آئے۔ عبدالغفور نے اُس دروازے کو بھی تالا لگا دیا اور ہم اُس کے پیچھے پیچھے گلی میں تیزی سے چلنے لگی۔ اُسی وقت گاؤں میں کسی طرف سے گولیوں کی آواز سنائی دی..... لگتا تھا جیسے پورا برسٹ مارا گیا ہو۔

گلی بہت تنگ اور تاریک تھی۔ تقریباً پچاس گز چلنے کے بعد ہم ایک اور گلی میں مُڑ گئے۔ اُس طرف سے آتے ہوئے دو آدمی اندھیرے میں عبدالغفور سے ٹکرا گئے۔ اُن میں سے ایک نے معذرت کی تو عبدالغفور نے اُس کی آواز پہچان کر کہا۔

''شہر میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟''

''جلدی آ جائیں گے لالہ جی! آپ چلیں۔'' اُس شخص نے جواب دیا۔

وہ گلی زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی تھی۔ آگے جا کر بائیں طرف چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد عبدالغفور ایک مکان کے سامنے رُک گیا۔ دستک کے جواب میں فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

باہر سے بظاہر یہ مکان بہت چھوٹا لگتا تھا مگر اندر سے خاصا وسیع و عریض تھا۔ صحن بہت لمبا چوڑا تھا۔ دو کمرے اُس داخلی دروازے کے ساتھ ہی تھے اور سامنے ایل شیپ کا برآمدہ تھا۔ ایک طرف تین کمرے تھے اور دوسری طرف دو۔ برآمدے کے ایک ستون پر سو واٹ کا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔

اُس مکان میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ اگرچہ اپنی جوانی گزار چکی تھی لیکن جسمانی ساخت اور چہرے کے نقوش میں اب بھی بڑی کشش تھی۔ اُس نے پھول دار کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر کالا رُومال بندھا ہوا تھا مگر دوپٹہ یا چادر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

اُس کی قمیض کا گریبان اگرچہ گلے تک بند تھا مگر دوپٹہ یا چادر نہ ہونے کی وجہ سے اُس کا صحت مند سینہ بڑا نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ عبدالغفور کی ایک دُور کی رشتے دار اور بیوہ عورت تھی۔ اُس کا شوہر بھی بھارتی فوجیوں کی درندگی کا شکار ہوا تھا۔ سولہ سترہ سال کی عمر کی ایک بیٹی تھی جو اُس کے ساتھ رہ رہی تھی مگر عبدالغفور کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیٹا بھی سرینگر میں پولیس کے ساتھ ایک جھڑپ میں شہید ہو چکا تھا۔ وہ سیکنڈ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا اور تعلیم ہی کے سلسلے میں سرینگر میں اپنے ماما کے پاس رہائش پذیر تھا۔ دو سال پہلے پولیس نے کچھ بے گناہ لڑکوں کو گرفتار کیا تھا جس پر کالج کے سٹوڈنٹس نے احتجاجی مظاہرے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ایک ایسے ہی مظاہرے کے دوران لال چوک پر پولیس نے گولی چلا دی تھی جس سے دو طالب علم جاں بحق ہوئے تھے اور اُن میں ایک عبدالغفور کا بیٹا تھا۔

عبدالغفور بہت عرصے سے مجاہدین کے لئے کام کر رہا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اُن کی مالی امداد بھی کرتا، اُنہیں اطلاعات بھی فراہم کرتا اور ضرورت پڑنے پر مجاہدین کو پناہ بھی دیتا۔ اُس کا ایک مکان اُس شاہراہ پر تقریباً تیس میل آگے سمبل نامی بستی میں تھا جو صرف مجاہدین کی سرگرمیوں کے لئے مخصوص تھا۔ مجاہدین کی تلاش میں پولیس کئی مرتبہ اُس مکان پر چھاپہ مار چکی تھی لیکن اُسے وہاں سے کبھی کچھ نہیں ملا تھا۔

''ریشم!'' عبدالغفور نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مہمان آ گئے ہیں..... کھانا تیار ہے یا نہیں؟ انہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔''

''کھانا تیار ہے بھائی جی..... میں ابھی دسترخوان بچھاتی ہوں۔'' ریشم نے جواب دیا۔ ریشم نے اُس وقت انگوری کو سینے سے لپٹا رکھا تھا۔ وہ اُسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ اُدھر غسل خانہ ہے بیٹی! باہر بھی پانی کا ڈرم رکھا ہوا ہے۔ تم منہ ہاتھ دھو لو! میں کھانا نکالتی ہوں۔ اور بیٹا! تم لوگ بھی منہ ہاتھ دھو لو!'' اُس نے آخری الفاظ میرے اور سعید کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

اور پھر اس کے پندرہ منٹ بعد ہم ایک کمرے میں فرش پر بچھے ہوئے دسترخوان کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ریشم کی بیٹی بتول کو بھی انگوری نے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔ صحت مند ماں کے برعکس وہ دُبلی پتلی اور بڑی پیاری سی لڑکی تھی۔

جب میں اُس مکان میں داخل ہوا تو میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی کمانڈر محب اللہ سے ملاقات ہو گی مگر یہاں کمانڈر کو نہ پا کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ عبدالغفور نے پوچھنے پر بتایا کہ وہ آدھی رات کو یہاں پہنچے گا۔

ہم ابھی کھانا کھا رہے تھے کہ باہر کے دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔ عبدالغفور خود اُٹھ کر باہر گیا۔ اُس کی واپسی تقریباً تین منٹ بعد ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر تشویش کے آثرات نمایاں تھے۔

''کیا بات ہے کوئی خاص خبر؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے۔'' عبدالغفور نے جواب دیا۔ ''لیکن خیر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہنگامے اور کرفیو تو روز کا معمول ہے۔ میرے مہمانوں کو بھی پتہ ہے کہ انہیں کس راستے سے آنا ہے اس لئے زیادہ پریشانی کی بات نہیں۔ لیکن.....''

''لیکن کیا.....؟'' میں نے ایک بار پھر سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''لیکن اگر کرفیو زیادہ طول کھینچ گیا تو پریشانی ہو سکتی ہے۔ اس سے ہمارا گلا منصوبہ متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔''

''یہاں ہنگامہ کس بات پر ہوا تھا؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''باندی پورہ میں ڈیڑھ درجن بھارتی فوجیوں کا تم لوگوں کے ہاتھوں مارا جانا اور راستے میں آٹھ فوجیوں سمیت ایک ٹرک کی تباہی کی اطلاع سرینگر میں فوج کی ہائی کمان تک پہنچ چکی تھی۔'' عبدالغفور نے جواب دیا اور میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہمارے کارناموں کی خبریں ہم سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکی تھیں۔ عبدالغفور بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''باندی پورہ والی خبر تو صبح گیارہ بجے کے قریب یہاں پہنچ گئی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''پولیس کا ایک مسلمان انسپکٹر عنایت اللہ میرا دوست ہے۔ اُس نے شام سے ذرا پہلے مجھے بتایا تھا کہ باندی پورہ اور گندر بل میں چند روز پہلے بھی فوج کافی نقصان اُٹھا چکی ہے اس لئے ان دو واقعات کے حوالے سے فوج فوری طور پر کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ البتہ پولیس کو یہ اطلاع فراہم کر دی گئی تھی کہ ان دونوں واقعات میں ملوث اگر وادی گندر بل کی طرف ہی آ رہے ہیں۔ وہ یہاں پناہ لینے کی کوشش کریں گے۔ پولیس کو چوکس کر دیا گیا تھا کہ وہ مشتبہ افراد پر نگاہ رکھیں اور ایسے مشتبہ لوگوں کی نگرانی بھی شروع کر دیں جن کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ مجاہدین کو پناہ دے سکتے ہیں۔'' وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور چند لمحوں بعد بولا۔

''شام سے ذرا پہلے پولیس نے دو لڑکوں کو اُن کے گھروں سے پکڑا تھا۔ اُن پر شبہ تھا کہ وہ ہائی وے پر ٹرک کی تباہی والے حادثہ میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ پہلے تو ان لڑکوں کے والدین اور قریبی رشتے دار پولیس آفیسر سے مذاکرات کر کے اُنہیں چھڑانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ہندو اسسٹنٹ کمشنر اُنہیں چھوڑنے کو تیار نہیں تھا جس پر شہر کے کچھ لوگوں نے پولیس سٹیشن کے سامنے مظاہرہ کیا۔ پولیس نے اُنہیں لاٹھی چارج کے ذریعے منتشر کرنے کی کوشش کی مگر ہنگامہ بڑھتا گیا۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں تھانے کا گھیراؤ کر لیا جس پر پولیس نے گولی چلا دی۔ ابھی میرا یہ آدمی بتا کر گیا ہے کہ تین آدمی زخمی ہوئے ہیں۔ ہنگاموں پر قابو پانے کے لئے شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے اور اگر یہ کرفیو طول کھینچ گیا تو ہمارا منصوبہ بھی متاثر ہو سکتا ہے جس کے لئے تم دونوں کو بھی یہاں بلایا گیا ہے۔'' اُس نے بات کرتے ہوئے انگوری اور میری طرف دیکھا۔

''اور وہ منصوبہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو کمانڈر محب اللہ ہی بتائے گا..... مجھے تو صرف یہ حکم ملا تھا کہ تم لوگوں کو تلاش کر کے یہاں بلا لیا جائے۔'' عبدالغفور نے جواب دیا۔ ''شہر میں کرفیو ہو یا کچھ اور..... محب اللہ آدھی رات کے وقت ہر صورت میں یہاں پہنچے گا اور اشرف بھی زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں یہاں آ جائے گا۔''

چند لمحوں کو خاموشی رہی، پھر آج صبح باندی پورہ اور پھر یہاں سے چند میل دُور رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ سعید اُنہیں ان دونوں واقعات کی تفصیل بتا رہا تھا۔

''اس سے چند روز پہلے.....'' سعید کے خاموش ہونے پر عبدالغفور نے کہا۔ ''فوج کے ایک دستے نے مجاہدین کی تلاش کے بہانے باندی پورہ پر ہلہ بول دیا تھا۔ اُس وقت بھی بھارتی فوجیوں کو اپنے ساتھ فوجیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا اور پھر آج کا واقعہ.....'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ میرا خیال ہے پہلا واقعہ ہے جہاں بھارتیوں کو ایک ہی جگہ اتنا بھاری جانی نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس لئے ہائی کمان نے فوری طور پر باندی پورہ کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ بدل دیا ہے کیونکہ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ باندی پورہ میں گولہ بارود کے انبار لگے ہوئے ہیں اور مجاہدین بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ویسے باندی پورہ والے واقعہ میں کمانڈر شمروز اور کمانڈر انگوری کا نام واضح طور پر لیا جا رہا ہے۔''

''اور حقیقت ہے یہ کارنامہ انہی دونوں نے انجام دیا ہے۔'' سعید نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''پہلی گولی کمانڈر شمروز نے چلائی تھی اور کمانڈر انگوری کی چلائی ہوئی آخری گولی نے لاتعداد فوجیوں کے پرخچے اُڑا دیئے تھے۔''

کھانے کے بعد بتول اور انگوری نے دستر خوان سمیٹ لیا اور اُس کے تھوڑی ہی دیر بعد ریشم نے قہوہ تقسیم کر دیا۔ الائچی والا قہوہ بلاشبہ بے حد خوش ذائقہ تھا۔

باہر کی فضا میں گہرا سکوت اور سناٹا تھا۔ کبھی کبھار کسی کتے کے بھونکنے یا اِکا دُکا فائر کی آواز سے یہ سناٹا چند لمحوں کے لئے مجروح ہو جاتا اور اس کے بعد پھر وہی گہرا سکوت چھا جاتا۔

انگوری پر اب غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ وہ بتول کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی جبکہ ہماری گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ کشمیری سیاستدانوں کا کردار بھی زیر بحث آیا۔ یہ لوگ سوائے لیڈری چمکانے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ان دنوں فاروق عبداللہ پھر برسر اقتدار تھا۔ وہ وزیر اعلیٰ تھا اور اُس کے زہریلے بیانات عوام میں مزید اشتعال پیدا کر رہے تھے۔ وہ تحریک آزادی کو کچلنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ یہی وہ بے ضمیر آدمی تھا جس کے باپ نے کشمیر کاز سے غداری کی تھی اور کشمیر کی آزادی کا سودا کر

کے بنیا حکمرانوں کے چرنوں میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ کشمیر کا وزیر اعلیٰ تو بن گیا تھا لیکن اُس کی غداری سے کشمیری مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا تھا اُس کا ازالہ ممکن نہیں تھا۔ بے چارے معصوم کشمیری آج بھی اُس کے گناہوں کی سزا بھگت رہے تھے۔ اگر شیخ عبداللہ کشمیر کاز سے غداری نہ کرتا تو آج کشمیر کی صورتحال مختلف ہوتی۔ فاروق عبداللہ اُس کا بیٹا تھا اُس کی رگوں میں بھی غدار باپ ہی کا خون دوڑ رہا تھا۔ اُس سے وفا کی کیا توقع کی جاسکتی تھی؟ ان دنوں وہ پھر برسر اقتدار تھا اور تحریک آزادی کو کچل دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز اُبھری تو عبدالغفور فوراً ہی اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ ایک منٹ بعد ہی آنگن سے آوازیں سن کر میں نے دروازے سے باہر جھانکا۔ عبدالغفور کے ساتھ دو اور آدمی کمرے کی طرف آرہے تھے۔ اُن میں ایک اشرف تھا اور دوسرا چہرہ میرے لئے اجنبی تھا۔ اُس شخص نے پشت پر ایک بوری لاد رکھی تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر اُس نے بوری نیچے رکھ دی اور ہم سے ہاتھ ملانے کے بعد ایک طرف بیٹھ گیا۔ اشرف بھی ہاتھ ملا کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

''کوئی دُشواری تو پیش نہیں آئی؟'' عبدالغفور نے پہلے اشرف اور پھر دوسرے آدمی کی طرف دیکھا۔

''کرفیو کی وجہ سے ذرا لمبا چکر لگا کر آنا پڑا۔ اس کے علاوہ تو کوئی اور دُشواری پیش نہیں آئی۔'' دوسرے آدمی نے جواب دیا۔

ریشم بھی آوازیں سن کر آ گئی تھی۔ عبدالغفور نے اُن دنوں کے لئے کھانا نکالنے کو کہا تو وہ باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آؤ بیٹا! تم دونوں باورچی خانے میں ہی آجاؤ۔ وہیں میرے پاس بیٹھ کر کھالینا۔''

وہ دونوں اُٹھ کر ریشم کے ساتھ باورچی خانے میں چلے گئے۔ سعید اپنی جگہ سے اُٹھ کر آگے آ گیا اور بوری کے منہ پر بندھی ہوئی ڈوری کھولنے لگا۔ اُس بوری میں ہماری وہ سب مشین گنیں تھیں جو ہم گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے اشرف کے حوالے کر کے آئے تھے۔ بوری میں فاضل میگزین بھی تھے۔ سعید نے رائفلیں اور تمام میگزین نکال کر بوری تہہ کر کے ایک طرف رکھ دی۔ میں نے اپنی اور انگوری والی رائفلیں اُٹھالیں اور اُنہیں چیک کر کے دیوار کے ساتھ ایستادہ کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد اشرف اور اُس کا دوسرا ساتھی حمید بھی کھانا کھا کر آ گئے۔ حمید بتا رہا تھا کہ شہر میں مکمل سناٹا ہے۔ پولیس بڑی تعداد میں گشت کر رہی ہے۔ اہم مقامات پر فوجی گاڑیاں بھی کھڑی ہیں۔ اُس کے خیال میں رات کا باقی حصہ تو شاید خیریت سے گزر جائے لیکن صبح ہنگاموں کا خطرہ ہے۔ وقت دھیرے دھیرے سے گزر رہا تھا۔ اگرچہ ہم سب ہی بری طرح تھکے ہوئے تھے مگر نیند کسی کو نہیں آ رہی تھی۔

دو بجے کے قریب دروازے پر ایک بار پھر دستک کی ہلکی سی آواز اُبھری۔ دروازہ محض ایک انگلی سے مخصوص انداز میں بجایا گیا تھا۔ عبدالغفور فوراً ہی اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس مرتبہ تین آدمی اُس کے ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ اُن میں ایک کمانڈر محبّ اللہ تھا۔ اُسے دیکھ کر ہم سب ہی احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے مصافحہ کے لئے کمانڈر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اُس نے مجھے کھینچ کر سینے سے لپٹا لیا اور میری پیشانی پر بوسے دینے لگا۔

''میں نے پہلی بار جب تمہیں دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم اپنی قوم اور اپنے وطن کے لئے بڑے کارنامے انجام دو گے۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تمہاری تمام سرگرمیوں کی رپورٹس ملتی رہی ہیں۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ پوری کشمیری قوم کو تم پر فخر ہے۔ اور وہ کہاں ہے ہماری بیٹی..... کمانڈر انگوری؟''

''انگوری سو گئی ہے..... جگا دُوں؟'' میری بجائے عبدالغفور نے کہا۔

''نہیں..... سونے دو! صبح ملاقات کریں گے۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے کہا۔ ''آپ لوگوں کو بھوک لگ رہی ہو گی۔ کھانا تیار ہے..... آپ لوگ منہ ہاتھ دھولیں تو.....''

''کھانا اس وقت ہم نہیں کھائیں گے۔ قہوہ چلے گا۔ لیکن پہلے پانی پلا دو!'' کمانڈر محبّ اللہ نے کہا۔ عبدالغفور کمرے سے چلا گیا اور ہم سب لوگ فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر بیٹھ گئے۔

عبدالغفور ریشم کو قہوہ بنانے کے لئے کہہ کر واپس آ گیا اور محبّ اللہ کو شہر کی صورتحال کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

تقریباً بیس منٹ بعد انگوری کو ٹرے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میں چونک سا گیا۔ اُسے شاید ریشم نے جگا دیا تھا اور قہوہ بھی اُس کے ہاتھ بھجوایا تھا۔ اُس نے قہوے کی ٹرے ہم سب کے درمیان رکھ دی۔ کمانڈر محبّ اللہ نے صرف ایک نظر اُس کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انگوری نے اُسے سلام کیا تو کمانڈر محبّ اللہ نے اُسے سینے سے لگا لیا اور اُس کی پیشانی پر بوسے دینے لگا۔ کمانڈر کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا۔

''ہمیں تم پر فخر ہے بیٹی!'' کمانڈر محبّ اللہ کہہ رہا تھا۔ ''ہمیں اُس ماں پر بھی فخر ہے جس نے تم جیسی بیٹی کو جنم دیا۔ کشمیر کی قسمت اب بدلنے والی ہے۔ وہ وقت اب زیادہ دُور نہیں جب اس وادی میں گولیوں کی سنسناہٹ اور توپوں کی گھن گرج کی بجائے آزادی کے نغمے گونجیں گے اور فضا بارود کے دُھویں اور زہریلی بو کی جگہ پھولوں کی مسحور کن خوشبو سے مہک اُٹھے گی۔ زندہ باد کشمیر کی بیٹی۔''

ہم سب بیٹھ گئے اور پھر قہوے کی چسکیوں کے دوران کمانڈر محبّ اللہ ہمیں اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا جس کے لئے ہمیں یہاں لایا گیا تھا۔

میں کمانڈر محبّ اللہ کی باتیں سن کر کانپ اُٹھا..... بڑا ہی خوفناک منصوبہ تھا۔

○

''آج سے ٹھیک ایک ہفتے بعد۔'' کمانڈر محب اللہ اپنے منصوبے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''اسلحہ اور گولہ بارود کی ایک بہت بڑی کھیپ سرینگر سے کارگل بھیجی جانے والی ہے۔''

انگوری بھی میرے قریب ہی بیٹھی تھی اور ہم سب بڑی توجہ سے کمانڈر محب اللہ کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''یہ فوجی قافلہ تیس بڑے ٹرکوں اور چار جیپوں پر مشتمل ہوگا۔ اٹھائیس ٹرکوں میں گولہ بارود ہوگا جبکہ دو ٹرکوں میں مسلح فوجی ہوں گے..... ایک ٹرک قافلے کے آگے ہوگا اور ایک پیچھے۔ چار جیپوں پر بھی مسلح فوجی ہوں گے۔ دو جیپیں آگے اور دو جیپیں پیچھے۔ ان جیپوں اور ٹرکوں پر لائٹ اور ہیوی مشین گنیں نصب ہوں گی۔ ایک ٹرک پر چار مشین گنیں جن کے رُخ چاروں طرف ہوں گے۔ جیپوں پر لگی ہوئی لائٹ مشین گنوں کی بھی یہی صورتحال ہوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی گڑبڑ کی صورت میں وہ چاروں طرف آزادی سے فائر کھول سکیں گے۔''

کمانڈر ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''کارگل کے حالات بتدریج خراب ہوتے جا رہے ہیں..... ایک طرف سے ہمارے مجاہد بھائیوں نے بھارتی فوجیوں پر دباؤ ڈال رکھا ہے۔ وہ موقع ملتے ہی بھارتی فوجی چوکیوں پر حملے کر کے یا تو اُنہیں تباہ کر رہے ہیں یا بھاری نقصان پہنچا رہے ہیں۔ دوسری طرف سے کنٹرول لائن کے اُس پار سے پاکستانی فوج بھارتیوں پر دباؤ ڈال رہی ہے۔ کارگل میں بھارتی فوج اندھا دُھند گولہ بارود استعمال کر رہی ہے۔ اس طرح اُنہیں کچھ دُشواریاں بھی پیش آ رہی ہیں۔ سرینگر ہائی کمان نے فوری طور پر گولہ بارود کی ایک بھاری کھیپ کارگل پہنچانے کا انتظام کیا ہے۔ کچھ گولہ بارود تو ہوائی جہاز کے ذریعے پہنچایا جا رہا ہے اور کچھ ٹرکوں کے ذریعے بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پہلا قافلہ ٹھیک ایک ہفتے بعد آج ہی کے دن صبح سویرے سرینگر سے روانہ ہوگا۔ اس طرح گولہ بارود سے لدا ہوا یہ قافلہ باون میل کا فاصلہ طے کر کے صبح نو بجے کے قریب سونا مارگ پہنچے گا۔ فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں مگر راستہ نہایت خطرناک حد تک پُر پیچ ہونے کی وجہ سے قافلے کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہوگی۔ اس طرح اس قافلے کو باون میل کا فاصلہ طے کرنے میں تین گھنٹے لگیں گے۔ میری اطلاع کے مطابق سرینگر سے سونا مارگ تک جہاں راستہ بہت زیادہ خطرناک ہے اور مجاہدین کے حملے کا خطرہ ہے وہاں قافلے کی حفاظت کے خیال سے ایک دن پہلے عارضی فوجی چوکیاں قائم کر دی جائیں گی۔ سونا مارگ سے آگے کچھ علاقہ ایسا ہے جہاں حفاظتی چوکیاں نہیں ہیں۔'' وہ خاموش ہو کر باری باری ہماری طرف دیکھنے لگا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''ہمارے پاس دو آپشن ہیں..... ایک تو یہ کہ سونا مارگ سے ٹھیک تین میل آگے ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہم اپنے مورچے قائم کر سکتے ہیں۔ یہاں سے ہم دریا کے راستے اور ناتھ کے غاروں کی طرف اور وہاں سے پہلگام کی طرف نکل سکتے ہیں یا پھر.....'' وہ ایک بار پھر خاموش

ہوا۔ ہم سب کی نظریں اُس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''یا پھر درّہ زوجی لا یا اس سے چند میل پہلے بیتال کے مقام پر بھی ہم اُس قافلے کو اپنا نشانہ بنا سکتے ہیں۔ بیتال سے بھی ہمیں پہلگام کی طرف نکلنے کا راستہ مل سکتا ہے۔ اب یہ طے کرنا ہے کہ اس قافلے پر حملہ کرنے کے لئے کس جگہ کا انتخاب کیا جائے؟''

''تیس ٹرک اور چار جیپیں.....'' میں نے کمانڈر محب اللہ کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''بہت بڑا قافلہ ہوگا۔ ہمارے گروپ میں کتنے آدمی شامل ہوں گے؟''

''تقریباً چالیس۔'' کمانڈر محب اللہ نے جواب دیا۔ ''جس جگہ کا بھی انتخاب کیا جائے گا ہمارے آدمی سڑک کے دونوں طرف پہاڑیوں سے حملہ آور ہوں گے۔''

''کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ہم اپنی ساری قوت ایک جگہ پر جمع کرنے کی بجائے اُسے ٹکڑیوں میں پھیلا دیں؟'' میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ ہم قافلے پر حملے کے لئے جس جگہ کا بھی انتخاب کریں وہاں ہمارے آدمی چھوٹے چھوٹے گروپوں کی صورت میں دُور تک پھیل جائیں تاکہ اُس فوجی قافلے کے کسی ایک ٹرک کو بھی وہاں سے نکلنے کا موقع نہ مل سکے۔''

کمانڈر محب اللہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔'' وہ بولا۔ ''میں تمہاری اس تجویز سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں اور میرے خیال میں اس مقصد کے لئے اب سونا مارگ سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ وہ ایسی جگہ ہے کہ ہمارے آدمی سڑک کے دونوں طرف دُور تک بیٹھ سکتے ہیں۔ میں کل ہی تمام آدمیوں کو اطلاع بھجوا دیتا ہوں۔ وہ لوگ ایک دن پہلے سونا مارگ میں جمع ہو جائیں گے۔ کمانڈر رشید اور کمانڈر شہاب الدین اور کمانڈر یاسین بھی اپنے اپنے آدمی لے کر ایک دن پہلے وہاں جمع ہو جائیں گے۔ یہ ایک بڑی کارروائی ہوگی اور اس میں ہمیں زیادہ سے زیادہ اور تجربہ کار آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔''

''لیکن.....'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''بھارتی فوج کی انٹیلی جنس بھی تو غافل نہیں ہوگی۔ وہ پورے علاقے پر نگاہ رکھیں گے۔ وہ ہر اجنبی پر شک کریں گے۔ ہو سکتا ہے مشتبہ افراد کو روک کر اُن سے کسی قسم کی باز پرس بھی کی جائے۔ ہمارے اتنے سارے آدمی سونا مارگ میں جمع ہوں گے تو اُنہیں شبہ ہو جائے گا۔''

''اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔'' کمانڈر محب اللہ نے کہا۔ ''سونا مارگ ایک تفریحی مقام ہے۔ وادی کے حالات نہایت خراب ہونے کے باوجود ہندوستان سے لوگ تفریح کے لئے اس طرف بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ سونا مارگ سے آگے چند میل کے فاصلے پر دریا کے قریب امرناتھ نام کے وہ تاریخی غار ہیں جو ہندوؤں کے لئے بہت مقدس ہیں۔ یہ غار ہزاروں سال پرانے ہیں۔ ان کے اندر چٹانوں پر قدیم دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیاں تراشی ہوئی ہیں۔ ہندوستان سے آنے والے ہندو ان غاروں کی یاترا کے لئے اس طرف جاتے رہتے

ہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے چند آدمی ہندو یاتریوں کے بھیس میں سونا مارگ جائیں گے اور کچھ شہر سے تقریباً ایک میل دُور ایک پہاڑی غار میں چھپے رہیں گے اور وقت مقررہ پر اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔''

''ہمارے آدمی آزادی سے اسلحہ تو ساتھ نہیں لے جاسکیں گے۔'' میں نے کہا۔

''کسی کو اسلحہ لے جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ سب خالی ہاتھ ہوں گے۔'' کمانڈر نے جواب دیا۔ ''ہر قسم کا اسلحہ ایک رات پہلے اُس غار میں پہنچا دیا جائے گا۔ اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہندوستان سے آنے والی ہندو یاتریوں کی ایک پارٹی جس میں سرینگر کے کچھ کشمیری ہندو بھی ہوں گے دو دن پہلے سرینگر سے سونا مارگ پہنچے گی۔ تم اور انگوری بھیس بدل کر اُس پارٹی میں شامل ہو سکتے ہو۔''

''کیا.....؟'' میں اُچھل پڑا۔

''ہاں.....!'' کمانڈر محبّ اللہ مسکرایا۔ ''تم دونوں ہندوؤں کے بھیس میں آسانی سے سونا مارگ جاسکتے ہو۔ وہاں تمہیں زیادہ پریشانی نہیں ہوگی۔ تم پہلے کبھی سونا مارگ گئے ہو یا نہیں؟''

''نہیں.....'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہ چھوٹا سا شہر ہے..... تم اسے وادی کا خوبصورت ترین شہر بھی کہہ سکتے ہو۔'' کمانڈر محبّ اللہ کہہ رہا تھا۔ ''سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع اس شہر کے ایک طرف دریا ہے اور دوسری طرف سبزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ۔ یہیں سے لداخ اور کارگل کی طرف سڑک جاتی ہے۔ اس سے آگے پہاڑی سلسلہ ایک دم بلند ہوتا چلا گیا ہے۔ درّہ زوجی لا گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اُس درّے سے آگے لداخ کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے لیکن درّہ پار کرتے ہی تمہیں یوں لگے گا جیسے دوسری دنیا میں آ گئے ہو۔ زوجی لا تک تو تمہیں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آئے گا۔ رنگ برنگے خوشنما پھولوں کی چادریں بچھی ہوئی نظر آئیں گی۔ لیکن درّے کے اُس پار یہ سب کچھ اچانک ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ہر طرف بے آب و گیارہ اور ویران خاکستری پہاڑ نظر آئیں گے۔ سبزے کے نام پر تمہیں کہیں گھاس کی ایک پتی تک نظر نہیں آئے گی۔ بہرحال!'' وہ بات کرتے کرتے رُک گیا، پھر بولا۔ ''تمہیں اس طرف تو نہیں جانا۔ تمہاری منزل سونا مارگ ہے۔ چھوٹا سا شہر ہونے کے باوجود سونا مارگ میں سیاحوں اور ہندو یاتریوں کے لئے رہائش کی کوئی پریشانی نہیں۔ وہاں کئی گیسٹ ہاؤسز ہیں..... لیکن تم لوگوں کے لئے گیسٹ ہاؤسز میں قیام خطرناک ہوسکتا ہے۔ کیونکہ پولیس ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں قیام کرنے والوں سے پوچھ گچھ کرتی رہتی ہے۔''

''تو پھر..... ہمیں کہاں ٹھہرنا ہوگا؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''کسی مندر میں؟''

''وہاں دو تین مندر بھی ہیں..... اور ہندو یاتری پیسے بچانے کے لئے عام طور پر مندروں

ں میں ٹھہرتے ہیں۔ لیکن انگوری کے ساتھ کسی مندر میں رات گزارنا بھی تم لوگوں کے لئے طرناک ہوسکتا ہے۔'' اُس نے خاموش ہو کر انگوری کی طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مندروں کے پجاری بھارتی فوجیوں اور پولیس سے زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ صرف انٹیلی جنس والوں کے لئے مخبری کے فرائض انجام دیتے ہیں بلکہ مندر میں قیام کرنے والی جوان اور خوبصورت عورتوں پر ہاتھ صاف کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ بعض اوقات تو وہ کسی عورت کو اس طرح غائب کر دیتے ہیں کہ اُس کا سراغ بھی نہیں ملتا۔''

''تو پھر.....؟'' میں نے ایک بار پھر سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''سونا مارگ پہنچتے ہی تم پریتم سنگھ سے ملاقات کرو گے۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے کہا۔ ''بازار میں اُس کی دودھ دہی کی دُکان ہے۔ پریتم سنگھ امرتسر کا رہنے والا ہے لیکن تقریباً پندرہ سال سے یہاں پر ہے۔ اُس کی دُکان تم بہت آسانی سے تلاش کر لو گے۔ روانگی سے پہلے میں شناخت کے لئے ایک دو باتیں بتا دُوں گا۔ تم دونوں اُس کے گھر پر رہو گے اور بعد میں تمہیں اُس سے میرا پیغام بھی مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے..... ہمیں کب جانا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''دو دن پہلے تمہیں بتا دیا جائے گا.....'' کمانڈر نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''میرا خیال ہے اب تم لوگ سو جاؤ! کل سارا دن سفر میں رہے ہو اور رات بھی ختم ہونے والی ہے۔''

رات ختم ہو چکی تھی۔ اُس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ انگوری اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ عبدالغفور، انور اور دوسرے آدمیوں کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ میں اور سعید اس کمرے میں رہ گئے تھے۔ سعید تو جگہ ملتے ہی لمبا ہو گیا تھا اور پھر میں نے بھی ٹانگیں پھیلا دیں۔ کچھ ہی دیر بعد میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

○

حراست میں لئے جانے والے لڑکوں کو پولیس نے چھوڑ دیا تھا اور اُن لڑکوں کی رہائی کی وجہ سے شہر میں سکون تو ہو گیا تھا مگر پولیس کی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ ہر شخص کو شک کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا۔ کئی لوگوں کو روک کر اُن سے پوچھ تاچھ کی جا رہی تھی۔

ہمارے دوسرے آدمی تو اگلے روز صبح ہی باہر جا چکے تھے مگر مجھے اور سعید وغیرہ کو باہر جانے سے روک دیا گیا تھا۔ البتہ انگوری، ریشم کی بیٹی کے ساتھ آزادی سے شہر میں گھوم پھر رہی تھی۔

اور بالآخر وہ وقت آ گیا جس کا مجھے انتظار تھا..... اُس روز دوپہر دو بجے کی بس سے ہمیں روانہ ہونا تھا۔ یہ بس سرینگر سے آنے والی تھی اور اطلاع کے مطابق اُس میں بھی کم از کم بیس ہندو یاتری سفر کر رہے تھے۔ اُن میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔

دن کے گیارہ بجے ہی ہمارے حلیئے تبدیل کر دیئے گئے۔ مجھے ہندو کا بھیس بدلنے کے لئے

اپنے بالوں کی قربانی دینی پڑی تھی۔ میرے سر پر اُسترا پھیر دیا گیا۔ البتہ کھوپڑی پر چٹیا کی صورت میں کچھ بال چھوڑ دیئے گئے۔ میری یہ چٹیا بھی تقریباً پانچ انچ لمبی تھی جو سر کی حرکت کے ساتھ پھندنے کی طرح جھول رہی تھی۔ گیروے رنگ کے کپڑے، پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں، گلے میں موٹے موٹے موتیوں والی کئی مالائیں اور ماتھے پر دائیں سے بائیں کشکا۔ تین لمبی سفید لکیریں تھیں جو اُوپر نیچے کھینچی گئی تھیں۔ میرے ایک ہاتھ میں سٹیل کا ایک کڑا تھا اور لکڑی کا ایک ترشول۔ دونوں گالوں پر بھی سرخ رنگ سے لکیریں کھینچ دی گئی تھیں اور مزید ستم یہ ہوا کہ میری بھنویں بھی صاف کر دی گئیں۔

اس حلیئے میں مجھے ایک مکمل سادھو یا سوامی بنا دیا گیا تھا۔ میرے کندھے پر ایک میلا سا تھیلا بھی لٹکا دیا گیا جس میں کھانے کی کچھ چیزیں ڈال دی گئی تھیں۔

انگوری کا حلیہ بھی بدل گیا تھا۔ ماتھے پر بندیا، کانوں میں بالیاں اور ناک میں بھی چوڑی کے سائز کی تار جتنی موٹی ایک نتھ پہنا دی گئی تھی۔ ہندو عورتیں اکثر اس قسم کی بالیاں پہنتی تھیں۔ اُس نے بتول کے کپڑے پہن لئے تھے۔ فیض انگوری کے بدن پر کچھ ٹائٹ تھی جس سے اُس کا شباب اُمڈ آیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

گندربل میں ہندو گھروں کی بھی کمی نہیں تھی اس لئے ہم پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم ایک بجے عبدالغفور کے گھر سے نکلے۔ کمانڈر محب اللہ کا ایک آدمی ہم سے پہلے نکل گیا تھا اور ایک آدمی ہمارے بعد گھر سے برآمد ہوا تھا۔ پہلا آدمی ہم سے تقریباً بیس گز آگے تھا۔ ہم اُس کے پیچھے پیچھے گلیوں میں چلتے رہے۔ بعض لوگوں نے مُڑ کر بڑی نفرت بھری نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا تھا۔ ایک آدمی نے تو بہت سخت قسم کی گالی بکتے ہوئے جملہ بھی کسا تھا۔ وہ گالی سن کر میرا خون کھول اُٹھا تھا۔ لیکن میں سر جھکائے خاموشی سے چلتا رہا، ظاہر ہے وہ گالی مجھے نہیں دی گئی تھی۔

گلیوں سے نکل کر ہم مین بازار میں آ گئے اور پھر دوسری سڑک پر ہوتے ہوئے لاری اڈے پر پہنچ گئے۔ اڈے پر اس وقت دو جیپیں اور ایک بس کھڑی تھی۔ ایک جیپ تو سونا مارگ کی طرف جانے والی تھی جبکہ دوسری جیپ اور بس کے سامنے سرینگر کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ مسافر برداری کے لئے کشمیر کے تقریباً تمام ہی علاقوں میں جیپیں بھی بکثرت چلتی ہیں۔

سونا مارگ کی طرف جانے والی بس ابھی نہیں آئی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہمارے آگے پیچھے آنے والے دونوں آدمی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ میں انگوری کے ساتھ ایک درخت کے نیچے رُک گیا جہاں کچھ اور لوگ بھی کھڑے تھے اور اُن میں تین چار عورتیں بھی تھیں۔ انگوری عورتوں کے قریب کھڑی ہو گئی اور میں لوگوں سے الگ تھلگ زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

ہمیں تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ دو بسیں ایک ساتھ ہی وہاں پہنچی تھیں۔ ایک بس

میں تو تمام ہندو یاتری بھرے ہوئے تھے اُس میں کسی اور مسافر کی گنجائش نہیں تھی۔ البتہ دوسری بس میں کچھ ہندو یاتری اور کچھ کشمیری مسلمان تھے۔ کئی سیٹیں خالی بھی پڑی تھیں۔

اسٹاپ پر بارہ مسافر تھے جنہیں اُس بس میں سوار ہونا تھا۔ تین چار عورتیں بس پر سوار ہو چکیں تو میں نے انگوری کو آگے دھکیل دیا اور اُس کے پیچھے ہی میں بھی ہری اوم ہری اوم کہتے ہوئے اُوپر چڑھ گیا۔ انگوری کو ایک عورت نے اپنے ساتھ جگہ دے دی۔ اُس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ بھی تھا۔ مجھے بھی ایک ہندو کے ساتھ ہی جگہ ملی تھی۔ پہلی سیٹ پر ایک سکھ جوڑا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں یہاں ایک بات بتاتا چلوں کہ سرینگر، سونا مارگ اور پہلگام اور قرب و جوار کے شہروں میں سکھ بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ اور ہندو پولیس اور فوج کے سورما مسلمانوں کی طرح وقتاً فوقتاً اُنہیں بھی تنگ کرتے رہتے ہیں۔

ہم جتنی دیر لاری اڈے پر کھڑے رہے تھے پولیس والے بار بار وہاں کھڑے ہوئے یا آنے جانے والے لوگوں کو پریشان کرتے رہے تھے۔

بس سوا دو بجے روانہ ہو کر تین بجے کے قریب اٹھارہ بیس میل کے فاصلے پر کنگن کے اڈے پر رُک گئی۔ دریا کے کنارے پر آباد یہ گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہاں تین مسافر اُترے تھے اور دو نئے مسافر سوار ہوئے تھے جنہیں سمبل جانا تھا۔ یہاں میں ایک اور وضاحت کرتا چلوں کہ سمبل نام کے دو گاؤں ہیں۔ ایک سرینگر کے مغرب میں باندی پورہ جانے والی شاہراہ پر سونا مارگ سے تقریباً بیس میل پہلے ہے۔

ہماری بس کنگن سے جیسے ہی آگے نکلی پیچھے سے آنے والی ایک فوجی جیپ نے تیزی سے آگے نکل کر راستہ روک لیا..... بس کو رُکنا پڑا۔ اُس جیپ پر نصف درجن فوجی تھے۔ اُنہوں نے بس کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک حوالدار بس میں سوار ہو کر بڑی کڑی نظروں سے مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور کندھے پر سب مشین گن بھی لٹکی ہوئی تھی۔

وہ چند منٹ وہیں کھڑا لوگوں کو گھورتا رہا پھر آگے بڑھ کر بعض مسافروں سے سوالات کرنے لگا۔ اور پھر وہ میرے قریب رُک گیا۔

''کہاں سے آئے ہو سوامی جی؟'' اُس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔

جب اُس نے بس کے دوسرے مسافروں سے پوچھ گچھ شروع کی تھی تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی لیکن اپنے قریب آنے تک میں اپنی کیفیت پر مکمل طور پر قابو پا چکا تھا۔

''سرینگر سے جی!'' میں نے بھی اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم پانچ سال سے ہری پربت پر شیوا مندر میں آنے والے یاتریوں کی سیوا کر رہے ہیں۔''

''کہاں جا رہے ہو؟'' اُس نے دوسرا سوال کیا۔

''لو دیکھو.....'' میں نے کہا۔ ''اس مورکھ کو یہ پتہ نہیں کہ ہندو یاتری امرناتھ کی طرف کیوں جاتے ہیں۔ ہم بھی امرناتھ کے غاروں کی یاترا کو جا رہے ہیں مہاراج!''

وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا، پھر میرے ہاتھ سے ترشول لے کر اُسے اس طرح اُٹھایا جیسے اُس کے وزن کا اندازہ لگانا چاہتا ہو۔ اُس نے ترشول واپس کر دیا اور آگے بڑھ گیا۔ میں ہری اوم ہری اوم کا ورد کرنے لگا۔

اس چیکنگ کی وجہ سے بس تقریباً پندرہ منٹ تک وہاں رُکی رہی۔ اُس حوالدار نے ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے بھی کچھ سوالات کئے تھے۔ اُسے یہ بھی بتا دیا گیا کہ سرینگر سے آنے والے تین مسافر کنگن کے اڈے پر اُترے تھے۔

سمبل اور گندر کے آس پاس بھی بس کو روک کر چیک کیا گیا تھا۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ اس شاہراہ پر فوج کی سرگرمیاں کچھ زیادہ ہی تھیں۔ اس کی وجہ یقیناً یہ تھی کہ دو دن بعد یہاں سے ٹرکوں کا ایک بہت بڑا قافلہ گولہ بارود کی بڑی کھیپ لے کر گزرنے والا تھا۔

سونا مارگ کا راستہ واقعی بہت خطرناک تھا۔ کہیں نہایت تنگ موڑ، کہیں خوفناک گھاٹیاں اور کہیں عمودی ڈھلان۔ ڈرائیور کی معمولی سی غفلت کسی خوفناک حادثے کا باعث بن سکتی تھی۔ اس خطرناک راستے کی وجہ سے بس کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ اور پھر راستے میں جگہ جگہ چیکنگ بھی ہو رہی تھی جس میں خاصا وقت ضائع ہوا تھا۔ اس طرح بس چھ بجے کے قریب سونا مارگ پہنچی تھی۔ ہندو یاتریوں کی دوسری بس ہم سے چند منٹ پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔

سونا مارگ بہت چھوٹا سا شہر ہے۔ اڈے پر گیسٹ ہاؤسز اور ہوٹلوں کے ایجنٹوں نے بس سے اُترنے والے مسافروں کو گھیر لیا۔ آس پاس کئی پولیس والے بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف فوجی ٹرک بھی کھڑا تھا۔ ایک گیسٹ ہاؤس کے ایجنٹ نے ہمیں بھی گھیرنے کی کوشش کی تو ہم اُسے جھڑک کر بس سے اُترنے والے سکھ جوڑے کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

میں نے کچھ چبھتی ہوئی نظریں بھی انگوری اور اپنی طرف اُٹھتی ہوئی محسوس کی تھیں۔ وہ یقیناً سادہ پوش تھے جو بس سے اُترنے والے مسافروں کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔

میں ہری اوم ہری اوم کا اشلوک پڑھتا ہوا چلتا رہا۔ انگوری بھی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اُس نے سر پر چنری اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ گھونگھٹ سا بن گیا تھا اور اُس کا چہرہ تقریباً چھپ کر رہ گیا تھا۔ وہ سکھ جوڑا ہم سے تقریباً بیس گز آگے تھا۔ میں نے اپنی رفتار اور بڑھا دی۔ میرا خیال تھا کہ اس سکھ کو روک کر سردار پریتم سنگھ کے بارے میں دریافت کروں گا لیکن پھر بازار میں اور سکھوں کو دیکھ کر اُسے روکنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

یہ ایک لمبا سا بازار تھا۔ تقریباً ساری ہی دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ بازار میں چہل پہل تھی۔ پولیس تو تھی ہی، اِدھر اُدھر دو دو کی ٹولیوں میں فوجی بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے سامنے سے آنے والے ایک سکھ کو روک لیا۔

''سردار پریتم سنگھ کی ہٹی کہاں ہے بالک؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی مندر کا پتہ پوچھو سوامی جی! پریتم سنگھ کے پاس جا کر کیا کرنا ہے؟'' اُس نے کہتے ہوئے کن انکھیوں سے انگوری کی طرف دیکھا۔

''جانا تو ہم کو مندر ہی ہے بالک!'' میں نے جواب دیا۔ ''سردار پریتم سنگھ کو ایک سندیسہ دینا ہے۔''

''تو پھر ایسا کرو سوامی جی.....'' اُس نے کہا۔ ''وہ سامنے جو کھمبا نظر آ رہا ہے نا اُس کے ساتھ بائیں طرف مُڑ جاؤ! اُس طرف تھوڑا ہی آگے دودھ دہی کی ایک دُکان ہے۔ پریتم سنگھ دُکان پر ہی بیٹھا ہوگا۔''

ہم آگے چل پڑے۔ اور پھر اُس سکھ کے بتائے ہوئے راستے پر مُڑ گئے۔ اُس طرف بھی دُکانیں ہی تھیں مگر یہ بازار زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس طرف گھومتے ہی مجھے دودھ دہی کی وہ دُکان نظر آ گئی۔

وہ دُکان ایسی ہی تھی جیسے دودھ دہی کی دُکان ہونی چاہئے۔ آگے سڑک کے کنارے پر لکڑی کے دو بنچ بچھے ہوئے تھے جن پر تین چار گاہک بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ دُکان کا تھڑا آگے کو نکلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پتھروں کا بڑا سا چولہا تھا جس پر دودھ سے بھری ہوئی کڑاہی رکھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف دو بڑی بڑی گول سینیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک میں برفی اور دوسری میں جلیبیاں تھیں جن پر چاندی کے ورق لگے ہوئے تھے۔ کڑاہی اور سینیوں کے درمیان چوکی پر ایک ادھیڑ عمر کا سکھ بیٹھا ہوا تھا۔ موسم میں اگرچہ خاصی خنکی تھی مگر اُس کے جسم پر پھولدار کپڑے کی نیکر بنیان کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سر کے بال بھی جوڑا بن کر ایک جالی میں کسے ہوئے تھے۔ اُس کے سامنے ایک اور چوکی سی تھی جس پر گلاس اور پیالے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔

دُکان اندر سے خاصی بڑی تھی۔ دو تین بنچ اندر بھی پڑے ہوئے تھے لیکن اندر کوئی گاہک نہیں تھا۔ دُکان کے پچھلے حصے پر ٹاٹ کا ایک پردہ بھی ٹنگا ہوا تھا۔ پردہ آدھا ہٹا ہوا تھا اور اُس کے دوسری طرف بھی دو بنچ نظر آ رہے تھے۔ ایک گتے پر فیملی رُوم لکھا ہوا تھا۔

میں نے انگوری کو ایک طرف رُکنے کا اشارہ کیا اور خود آگے بڑھ گیا۔

''جی آیا نوں سوامی جی!'' سردار پریتم سنگھ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''کیا سیوا کروں آپ کی سوامی جی؟''

''کھٹی کسی ملے گی سردار جی؟'' میں نے قدرے آگے جھکتے ہوئے اتنے مدھم لہجے میں کہا کہ باہر بنچوں پر بیٹھے ہوئے لوگ نہ سن سکیں۔

''آہو جی..... آہو جی..... اندر آ جاؤ سوامی جی!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اُدھر فیملی رُوم میں بیٹھ جاؤ! اوئے چھوٹے کہاں مر گیا ہے؟ سوامی جی کو اندر بٹھا۔''

دس گیارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا پتہ نہیں کہاں سے نکل کر وہاں پہنچ گیا۔ میں اور انگوری اُس

کے ساتھ دُکان میں داخل ہو کر پچھلے حصے میں بینچوں پر بیٹھ گئے۔ لڑکے نے پردہ کھینچ دیا۔

پندرہ منٹ گزر گئے میں دُکان کے اس حصے میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف کوکا کولا اور پیپسی کی بوتلوں کے کئی خالی کریٹ اُوپر نیچے رکھے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر بابا گرونانک کی رنگین تصویر والا پرانا کیلنڈر بھی لٹکا ہوا تھا۔ بائیں طرف ایک دروازہ بھی تھا جس کے سامنے ٹاٹ کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ یہ دروازہ غالباً پہلو کی گلی میں کھلتا تھا۔

پانچ منٹ اور گزر گئے اور پھر پریتم سنگھ لسّی کے دو بڑے گلاس لے کر اندر داخل ہوا۔ اُس نے ایک گلاس انگوری کے ہاتھ میں تھما دیا اور ایک میری طرف بڑھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے آگے جھک کر سرگوشی کی۔

''لسّی پی کر اس دروازے سے باہر نکل جانا..... چھوٹا باہر کھڑا ہوگا۔ وہ تمہیں میرے گھر پہنچا دے گا۔ ایک گھنٹے بعد میں بھی آ جاؤں گا۔'' اُس نے دوسرے دروازے کا پردہ ایک طرف ہٹا کر دروازہ بھی کھول دیا تھا۔

ہم اطمینان سے بیٹھے لسّی پیتے رہے۔ انگوری میری طرف دیکھ کر بار بار مسکرا رہی تھی۔ لسّی پینے کے بعد خالی گلاس بنچ پر ہی رکھ دیئے اور میں انگوری کو اشارہ کر کے اُٹھ کر بغلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

یہ ایک تنگ سی گلی تھی۔ اُس وقت شام ہو چکی تھی اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ گلی میں وہ لڑکا ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں دُکان سے نکلتے دیکھ کر کچھ کہے بغیر گلی کے اندر کی طرف چل پڑا۔

تقریباً پندرہ منٹ تک مختلف تنگ سی گلیوں میں گھومنے کے بعد وہ ایک مکان کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ ہم باہر ہی رُک گئے۔ دو تین منٹ بعد ایک عورت دروازے میں نمودار ہوئی۔

''آپ باہر کیوں رُک گئے سوامی جی؟ اندر آ جایئے نا۔'' اُس نے کہا ہم دونوں اندر آ گئے تو عورت نے دروازہ بند کر دیا۔

وہ امریتا کور تھی پریتم سنگھ کی بیوی۔ اُس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دراز قامت، صحت مند اور خاصی حسین عورت تھی۔ اُس نے ہمیں ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا اور تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے سامنے میز پر کھانا لگا دیا۔

''تسی روٹی کھا لو جی! سردار جی تو ذرا دیر سے آئیں گے۔'' اُس نے کہا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ ان لوگوں کو پہلے سے ہمارے آنے کی اطلاع تھی اس لئے خاص طور پر یہ کھانا تیار کیا گیا تھا۔ بھنی ہوئی مرغی اور آلو کی بھجیا بھی تھی۔ ایک پلیٹ میں سوجی کا حلوہ بھی تھا۔ کئی روز بعد اتنا لذیذ کھانا ہمارے سامنے آیا تھا۔

سردار پریتم سنگھ تقریباً دو گھنٹوں بعد آیا تھا۔ اس وقت اُس نے دھوتی اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ سر پر وہی جالی تھی جس میں بال جوڑے کی شکل میں جکڑے ہوئے تھے۔ سردار پریتم سنگھ ہمیں لے کر فوراً ہی پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اُس طرف بھی ایک تنگ سی گلی تھی۔ دو تین گلیاں

گھومنے کے بعد ہم ایک کھلی جگہ پر نکل آئے۔ آگے پہاڑی سلسلہ تھا۔ پہاڑیوں کے دامن میں بھی مکان تھے لیکن ایک دوسرے سے فاصلے پر۔

پریتم سنگھ ایک مکان کے سامنے رُک گیا۔ دستک کے جواب میں دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک نوعمر سکھ تھا۔ یہ دو کمروں کا مکان تھا جس کے دوسری طرف بہت لمبی چوڑی جگہ خاردار تاروں سے گھری ہوئی تھی اور اس طرف سے ایک بھینس کے ڈکرانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ دراصل باڑہ تھا۔ اُس طرف ایک بہت بڑا شیڈ بنا ہوا تھا جس کے نیچے دس بارہ بھینسیں اور گائیں بندھی ہوئی تھیں۔ شیڈ کے بائیں طرف دو اور کمرے تھے۔ ایک کمرے میں بھوسہ وغیرہ بھرا ہوا تھا جبکہ دوسرا کمرہ خالی تھا اور ہمیں اُس کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اس کمرے میں دری بچھی ہوئی تھی۔ دو چار تکیے بھی اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔

''آپ آرام سے یہاں پر رات گزارو جی!'' سردار پریتم سنگھ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو سریندر سنگھ کو بتا دینا..... یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ کوئی غم فکر مت کرنا۔''

''اس وقت چائے مل جائے تو.....''

''ضرور ضرور.....'' اُس نے میری بات کاٹ دی اور نوجوان سریندر سنگھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''انہیں چائے بنا کر دو! اور خیال رکھنا پروہنوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔'' وہ میری طرف مُڑ گیا۔ ''اب میں چلتا ہوں جی..... رات کو دُکان بند کر کے آؤں گا۔''

پریتم سنگھ چلا گیا۔ سریندر سنگھ نے دیوار کی ایک ہضمی الماری کھول کر دو کمبل نکال کر دری پر رکھ دیئے اور باہر چلا گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ چائے لے آیا۔ دودھ والی چائے بھی کئی روز بعد پینے کو ملی تھی۔ سریندر سنگھ بھی ہمارے پاس ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ بار بار انگوری کو دیکھ رہا تھا۔

سریندر سنگھ کی عمر بیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ پہلے وہ سرینگر میں تھا اُس نے سرینگر ہی سے گریجویشن کیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ پڑھ لکھ کر بڑا آفیسر بنے لگا لیکن کشمیر تو کیا پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی طرح سکھ بھی ہندوؤں کے تعصب کا شکار تھے۔ سرکاری محکموں میں ان پر بھی ملازمتوں کے دروازے بند تھے۔ اگر سفارش اور رشوت سے کسی سکھ کو کلرک کی نوکری مل بھی جاتی تو وہ زندگی بھر کلرک کی کرسی پر بیٹھا قلم گھستا رہتا۔ اُس کے لئے ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

گریجویشن کرنے کے بعد سریندر بھی سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے ایک سال تک دھکے کھاتا رہا اور بالآخر پریتم سنگھ نے اُسے اپنے پاس بلا لیا۔ اب وہ مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور دُکان میں بھائی کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ چائے پینے کے بعد بھی سریندر سنگھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس علاقے میں مسلمان مجاہدین کی سرگرمیوں کے حوالے سے بھی باتیں ہوئی

تھیں جن سے پتہ چلا کہ پچھلے دو مہینوں سے اس طرف کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ اِکا دُکا معمولی واقعات تو ہوتے رہتے تھے لیکن انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ البتہ ایک بات پر وہ حیران ضرور تھا اس علاقے میں چند روز سے پولیس اور فوج کی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ اور اُس کے خیال میں یہاں کوئی بڑا آپریشن ہونے والا تھا۔

سریندر سنگھ چلا گیا۔ اُس نے بتا دیا تھا کہ وہ سامنے والے کمرے میں موجود ہوگا کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف اُسے آواز دے لیں۔

سریندر کے جانے کے بعد انگوری نے چیزی اُتار کر ایک طرف دری پر رکھ دی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ بتول دُبلی پتلی سی لڑکی تھی اور انگوری اُس کے مقابلے میں صحت مند۔ بتول کی قمیض اُس کے جسم پر خاصی ٹائٹ تھی۔ اُس کا بدن اس قمیض میں کسا ہوا تھا۔ اُس کے سینے کے اُبھار تو خاصے نمایاں ہو گئے تھے۔

وہ ذرا سا آگے جھکی تو مجھے اپنا دل کن پٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا..... گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میری نظریں قمیض کے گریبان کے اندر تک رینگ گئی تھیں۔ میں اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

چند منٹ بعد ہی اپنے دونوں کندھوں پر ہلکا سا دباؤ محسوس کر کے میں چونک گیا۔ وہ انگوری تھی جو دبے قدموں کمرے سے نکل کر میرے پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر تھے اور اُس کے سینے کے گداز اُبھار میری پشت کو چھو رہے تھے..... میرے دل کی دھڑکنیں ایک بار پھر بے ترتیب ہونے لگیں۔ میں نے انگوری کا ایک ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے سامنے کر لیا.....

○○○

جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں کوئی بلب نہیں تھا البتہ بھینسوں والے شیڈ میں بتی جل رہی تھی جس کی روشنی ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔

''انگوری!'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتی ہو ہم اس وقت کس قسم کے حالات سے دوچار ہیں..... ہم زندگی کے اہم ترین مشن کے ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ ہمیں محتاط رہنا چاہئے۔ کوئی معمولی سی غفلت ہمیں اپنی منزل سے بہت دُور لے جا سکتی ہے۔''

''مجھے احساس ہے.....'' انگوری نے جواب دیا۔ ''مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہم کس کاز کے لئے کام کر رہے ہیں۔ وطن کی آزادی ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم ہے۔ اسی کے لئے تو ہم اپنے سروں پر کفن باندھے پھر رہے ہیں..... میں یہ سب کچھ کیسے بھول سکتی ہوں؟ اپنے ماں باپ کے قتل کو کیسے فراموش کر سکتی ہوں.....؟ ان ہزاروں شہدا کا خیال ذہن سے کیسے نکال سکتی ہوں جنہوں نے اس آزادی کی جدوجہد میں اس مقدس سرزمین کو اپنا خون پلایا..... کشمیر کی ان ماؤں اور بیٹیوں کو کیسے بھول سکتی ہوں جنہیں ان بھیڑیوں نے ہوس کا نشانہ بنا کر زندگی بھر کے لئے انہیں زندہ درگور کر دیا..... میں زینب کو کیسے بھول سکتی ہوں جس نے میرے سامنے جان دی اور.....''

''اگر تم میں یہ احساسات اور جذبات نہ ہوتے تو آج تمہارے ہاتھوں میں رائفل نہ ہوتی۔'' میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کوئی معمولی سی غفلت یا کوتاہی ہمیں اپنی منزل سے بھٹکا سکتی ہے۔''

''ایسا نہیں ہوگا شمروز!'' انگوری نے جواب دیا۔ ''میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کاز کے لئے وقف ہے۔ لیکن میں تمہارا خیال بھی ذہن سے نہیں نکال سکتی۔ کبھی میں محسوس کرتی ہوں کہ تم بیٹھے تو میرے قریب ہو لیکن مجھ سے بہت دُور چلے گئے ہو۔''

''یہ محض تمہارا وہم ہے.....'' میں نے جواب دیا۔ ''میں تو چوبیس گھنٹے تمہارے پاس ہی رہتا ہوں لیکن.....''

''لیکن کیا.....؟'' اُس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''لیکن وعدہ کرو کہ ہم اپنی کسی ذاتی خوشی یا غرض کو زندگی کے اس عظیم ترین مقصد پر حاوی نہیں ہونے دیں گے جس کے لئے ہم نے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وعدہ.....'' انگوری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس کی آنکھیں روشن ستاروں کی طرح چمک اُٹھی تھیں۔ وہ چند لمحے میری آنکھوں میں جھانکتی رہی اور پھر بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اُس وقت نہ تو میرے جسم میں سنسنی پھیلی تھی اور نہ ہی انگوری نے بے چینی کا اظہار کیا تھا۔

''باہر سردی ہو رہی ہے..... آؤ! اندر چل کر بیٹھیں۔'' میں نے اُسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کوئی ہمیں اس طرح لپٹے ہوئے دیکھ نہ لے۔ اس طرح بات کچھ سے کچھ ہو جاتی۔

باہر واقعی سردی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ فضا میں گوبر کی ناگوار سی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔

ہم اندر آ گئے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ انگوری نے اپنی ٹانگیں سامنے کو پھیلا لی تھیں۔ میں نے ایک کمبل کھول کر اُس پر ڈال دیا اور دوسرا خود لے لیا۔ ہم اسی طرح بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اور پھر انگوری اونگھنے لگی۔ میرے ذہن پر بھی غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے انگوری کو پوری طرح کمبل اوڑھا دیا اور اس سے کچھ فاصلے پر اپنے اُوپر کمبل لپیٹ کر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی.....

باتوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا۔ دروازے کے قریب ہی کمرے میں تین آدمی تھے۔ ایک پریتم سنگھ تھا اور اُس کے ساتھ دو آدمیوں کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ دونوں ہندو تھے اور دوپہر کو گندربل کے لاری اڈے پر ہمارے ساتھ ہی اُس بس پر سوار ہوئے تھے۔ وہ پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ سونا مارگ کے اڈے پر بھی میں نے اُنہیں بس سے اُترتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ دوسرے ہندو مسافروں کے ساتھ چلے گئے تھے اور میں انگوری کے ساتھ اُس سکھ جوڑے کے پیچھے چل پڑا تھا۔

''مترجی.....'' پریتم سنگھ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے دو متر اور آ گئے ہیں۔ اب تمہاری خوب گپ شپ رہے گی۔ یہ عبدالستار ہے اور یہ حبیب الرحمٰن۔'' اُس نے باری باری دونوں کی طرف اشارہ کیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''اب تم لوگ آرام کرو! سویرے ملاقات ہو گی۔ اُس وقت تک رب راکھا۔''

سردار پریتم سنگھ چلا گیا۔ میں نے الماری سے دو کمبل نکال کر اُن کے حوالے کر دیئے اور خود اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ اُن میں سے ایک نے مجھے میرے نام سے مخاطب کیا تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اور پھر دلچسپ انکشاف ہوا کہ وہ کمانڈر محب اللہ کے آدمی تھے اور اُنہیں اس خیال سے ہمارے پیچھے بھیجا گیا تھا کہ اگر ہم راستے میں کسی اُلجھن میں پھنس جائیں تو وہ ہماری مدد کر سکیں۔ سونا مارگ پہنچ کر جب ہم سردار پریتم سنگھ کی دُکان میں داخل ہو گئے تھے تو وہ دونوں مطمئن ہو کر واپس چلے گئے تھے اور پھر اُنہوں نے کچھ اور لوگوں سے بھی رابطے کئے تھے اور بالآخر یہیں آ گئے تھے۔

آوازوں سے انگوری کی آنکھ نہیں کھلی تھی وہ اطمینان سے سوئی تھی۔ میں بھی کمبل میں منہ لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میں رات کو اگرچہ دیر سے سویا تھا۔ مگر صبح سویرے بھینسوں کی آوازیں سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ اُس وقت اچھی خاصی سردی تھی۔ میں ایک کمبل لپیٹ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ پریتم سنگھ کا چھوٹا بھائی سریندر سنگھ بھینسوں کو گتاوا (چارہ) ڈال رہا تھا اور دو آدمی بھینسوں کا دودھ نکال رہے تھے۔ وہ دونوں بھی سکھ ہی تھے۔

ابھی ملگجا سا اُجالا تھا۔ دن کی روشنی پوری طرح پھیلنے سے پہلے پہلے وہ دونوں آدمی اپنے کام سے فارغ ہو گئے۔ دودھ کے چار بڑے کین تھے اور میرے خیال میں ہر کین پینتیس چالیس سیر کا تو ہو گا۔ اُنہوں نے کین اُٹھا کر باہر ریہڑے پر رکھے اور رخصت ہو گئے۔

سریندر سنگھ اپنے کام میں مصروف رہا۔ بھینسوں اور گائیوں کو چارہ ڈالنے کے بعد وہ گوبر صاف کرنے لگا۔ شیڈ کے ایک کونے میں گوبر کا ڈھیر لگا کر وہ شیڈ کے دوسرے حصے میں چلا گیا جہاں چار خچر بندھے ہوئے تھے۔ اُس نے خچروں کی بھی ٹہل سیوا کی، اُنہیں چارہ وغیرہ ڈالا اور ایک طرف لگے ہوئے ہینڈ پمپ پر جا کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔

اُس وقت دھوپ نکل رہی تھی۔ سریندر سنگھ اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ کرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھتا ہوا میری طرف آ گیا۔

''چائے چلے گی یا دودھ کا گلاس لے آؤں؟'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''چائے ہی ٹھیک رہے گی۔'' میں نے جواب دیا اور آہٹ پا کر پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ انگوری بھی کمرے سے نکل کر باہر آ گئی تھی۔ اُس نے بھی کمبل لپیٹ رکھا تھا۔

''ٹھیک ہے..... میں دس منٹ میں چائے لے کر آتا ہوں۔'' سریندر سنگھ تیز تیز چلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

اُس روز ناشتہ بھی بڑا زوردار تھا۔ سریندر سنگھ گھر سے پراٹھے بنوا کر لایا تھا۔ میرے خیال میں اگر چند روز یہاں رہنے کا موقع ملتا تو ایسی خوراک کھا کر ہٹے کٹے ہو جاتے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم سردار پریتم سنگھ سے رخصت ہو گئے۔ اس مرتبہ عبدالستار اور حبیب الرحمٰن ہمارے ساتھ ہی تھے۔ ہم لوگ بازار کی طرف جانے کی بجائے باہر ہی باہر چلتے ہوئے پہاڑی کے دامن میں واقع ایک گیسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے۔ یہاں گیسٹ ہاؤس کے باہر کچھ اور لوگ بھی جمع تھے۔ وہ سب ہندو تھے۔ اُن میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ کچھ کشمیری مسلمان بھی خچر اور گدھے لئے اُن کے آس پاس موجود تھے۔ بعض لوگوں سے خچروں کے معاملے میں سودے بازی ہو رہی تھی۔ انگوری عورتوں کے بیچ میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک کشمیری ہمارے قریب آ گیا۔ اُس نے حبیب الرحمٰن کی طرف جھک کر کچھ کہا اور ہم اُس کے ساتھ چل پڑے۔

چند گز دُور ایک درخت کے نیچے ایک دُبلا پتلا سا آدمی چار خچر لئے کھڑا تھا۔ یہ خچر ہمارے لئے تھے۔ اُن کا انتظام کس نے کیا تھا؟ مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔

انگوری بھی ہماری طرف آ رہی تھی لیکن میں نے اُسے وہیں رُکے رہنے کا اشارہ کیا اور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پھر میں نے اُونچی آواز میں ایک بھجن گانا شروع کر دیا۔

ہمارے گاؤں میں ہندوؤں کے چند گھر بھی ہوا کرتے تھے۔ ہمارے پڑوس میں ایک پنڈت رہا کرتا تھا وہ اکثر یہ بھجن گایا کرتا تھا اور اس وقت اتفاق سے مجھے یہ بھجن یاد آ گیا تھا۔

میری آواز بھی اچھی پاٹ دار تھی۔ ڈاک بنگلے کے سامنے کھڑے ہوئے لوگ میری طرف دیکھنے لگے۔ میں آنکھیں بند کئے اُونچی آواز میں بھجن گاتا رہا۔

بھجن ختم کرنے کے بعد بھی میں آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔

''چلئے مہاراج! قافلہ روانگی کے لئے تیار ہے۔''

یہ آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک ادھیڑ عمر ہندو ہاتھ جوڑے میرے سامنے کھڑا تھا۔ دوسرے لوگ بھی میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں ہری اوم کا نعرہ لگاتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

سب لوگ خچروں پر سوار ہو چکے تھے۔ میں بھی اپنے خچر پر سوار ہو گیا۔ کشمیری مسلمان خچروں کی باگیں پکڑے آگے آگے چل رہے تھے۔ بعض سواروں نے اپنے خچروں کی باگیں خود ہی سنبھال رکھی تھیں۔

مجھے ابھی تک پتہ نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ بہرحال یہ اطمینان تھا کہ یہ سب کچھ پلاننگ کے تحت ہو رہا ہے۔ ہمیں کسی ایسی جگہ پہنچایا جائے گا جہاں سے ہم اصل منزل کی طرف جا سکیں گے۔ حبیب الرحمٰن کا خچر میرے ساتھ تھا اور وہ مجھے بتا رہا تھا.....

''یہاں سے چار کوس کے فاصلے پر دریا کے کنارے پہاڑیوں میں مہادیو مندر ہے جس میں بھگوان کرشن کی صدیوں پرانی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ پہاڑ کی کھوہ میں واقع اس مندر کے اندر رکھی ہوئی مورتیوں کو بڑے بڑے چٹانی پتھروں سے تراش کر بنایا گیا ہے..... اس مندر کو بھی بہت مقدس سمجھا جاتا ہے اور اماوس کی رات اس مندر میں خاص پوجا ہوتی ہے۔ یہ سب لوگ رات اس مندر میں رہیں گے۔''

''کیا ہم لوگ بھی ان کے ساتھ رہیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کمانڈر.....'' حبیب الرحمان نے جواب دیا۔ ''رات کے اندھیرے میں ہم اُس مندر سے نکل جائیں گے اور.....''

ایک اور خچر سوار ہندو کو اپنی طرف آتے دیکھ کر حبیب الرحمٰن خاموش ہو گیا۔ وہ ہندو اپنا خچر میرے سامنے لے آیا۔ پہلے میرے بھجن کی تعریفیں کرتا رہا پھر بولا۔

''مہاراج! سب لوگوں کی اچھا ہے کہ آپ وہ بھجن ایک بار پھر سنائیں۔ اُمید ہے کہ آپ

مایوس نہیں کریں گے۔''

میں نے حبیب الرحمٰن کی طرف دیکھا اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور پھر میں نے اُونچی آواز میں وہ بھجن گانا شروع کر دیا۔

شہر سے باہر نکلتے ہی فوجی چوکی پر ہمیں روک لیا گیا۔ ایک لیفٹیننٹ گہری نظروں سے ایک ایک شخص کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ بعض لوگوں سے کچھ سوالات بھی کئے۔ پھر ہمارے قافلے کو آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

سڑک پر تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمارا قافلہ دریا کی طرف مُڑ گیا۔ وہ شخص سب سے آگے تھا جس نے مجھ سے بھجن کی فرمائش کی تھی۔ وہی اس قافلے کا رہنما بھی تھا۔

ایک طرف پہاڑیاں تھیں جو پہلے بتدریج بلند ہوتی چلی گئی تھیں اور دوسری طرف ذرا گہرائی میں دریا بہہ رہا تھا۔ دریا اور چٹانوں کے درمیان ایک تنگ سا پتھریلا راستہ تھا اُس پتھریلے راستے پر صرف خچروں اور گدھوں پر ہی سفر کیا جا سکتا تھا۔ کسی مشینی سواری کے اس طرف آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہمارا قافلہ اُس تنگ سے راستہ پر چلتا رہا۔ کہیں ہم دریا کے بالکل کنارے پر پہنچ جاتے اور کہیں چٹانوں کے بیچ میں جہاں راستہ زیادہ دُشوار تھا۔

پانچ کوس کا فاصلہ تقریباً دو گھنٹوں میں طے ہوا۔ وہ مندر دریا کے عین سامنے تھا۔ چٹانوں میں ایک بہت بڑا غار تھا۔ دہانے کے دونوں طرف اور اُوپر کی دیواروں کو تراش کر کرشن بھگوان کی مورتیاں بنائی گئی تھیں۔ غار کے اندر بالکل سامنے چٹانی پتھر سے تراشی ہوئی کرشن بھگوان کی ایک بہت بڑی مورتی ایستادہ تھی۔ غار میں اندھیرا دُور کرنے کے لئے کئی مشعلیں جل رہی تھیں۔ دیواروں کو بھی تراش کر مورتیاں اُبھاری گئی تھیں۔

اُس مندر میں پہلے سے کئی پجاری موجود تھے۔ قافلے میں آئے ہوئے لوگ اپنے ساتھ لائی ہوئی چیزیں کرشن بھگوان کی مورتی کے سامنے بھینٹ کرنے لگے۔ اُن میں ناریل اور کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ کئی قیمتی چیزیں بھی شامل تھیں۔ بہت سی عورتوں نے اپنے گہنے چاندی کے زیورات بھگوان کے قدموں میں ڈال دیئے تھے۔ سکوں اور نوٹوں کا بھی ڈھیر لگ گیا تھا۔

میں اندر کا ایک مختصر سا چکر لگا کر باہر آ گیا۔ یہاں مندر کے سامنے دریا کے کنارے پر ایک بہت بڑا پختہ چبوترا بنا ہوا تھا۔ کئی لوگ اُس چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اور انگوری بھی ایک طرف بیٹھ گئے۔ حبیب الرحمٰن اور عبدالستار ابھی مندر کے اندر ہی تھے۔

شام ہونے سے پہلے یاتریوں میں بھنڈارہ (کھانا) تقسیم ہونے لگا۔ مٹی کی کٹوریوں میں کالی دال اور روٹیاں تھیں۔ اس کھانے کا انتظام پہلے ہی سے کیا گیا تھا۔

انگوری نے میری طرف دیکھا، میں نے اشارہ کیا اور کھانا کھانے لگا۔ انگوری نے بھی کھانا

شروع کر دیا۔ حبیب اور عبدالستار بھی اپنا کھانا لے کر وہیں آ گئے تھے۔

سورج غروب ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد شام کا اندھیرا گہرا ہونا شروع ہو گیا۔ مندر کے اندر مشعلیں جل رہی تھیں۔ دو مشعلیں دروازے کے دائیں بائیں بھی لگی ہوئی تھیں جن کی روشنی آس پاس تک ہی محدود تھی۔

فضا میں گہری تاریکی تھی۔ یہ اماوس کی رات تھی۔ آسمان بہت دُور تھا۔ ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی روشنی زمین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ چاند کا تو نام و نشان تک نہیں تھا۔

مندر کے اندر اب ناقوس اور گھنٹیاں بجنے لگیں تھیں۔ اور پھر کسی کے بھجن گانے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی گھنگھروؤں کی جھنکار بھی سنائی دے رہی تھی۔ باہر بیٹھے ہوئے لوگ بھی اُٹھ اُٹھ کر اندر جانے لگے۔

مجھے شبہ تھا کہ بھجن گانے کے لئے مجھے بھی بلایا جائے گا۔ مجھے صرف وہی ایک بھجن یاد تھا جو میں دو مرتبہ اُن لوگوں کو سنا چکا تھا۔ اگر کسی اور بھجن کی فرمائش کی گئی تو میں پھنس جاؤں گا۔

''میرا خیال ہے اب کھسک لینا چاہئے۔'' حبیب الرحمٰن نے کھسک کر میرے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ان کے بھجن شروع ہوئے ہیں، پھر پوجا پاٹ ہو گی اور یہ سلسلہ رات بھر چلتا رہے گا۔ اس وقت موقع ہے ہم اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ سب لوگ مندر کے اندر ہیں بعد میں شاید ایسا موقع نہ ملے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''آپ دونوں دریا کے ساتھ ساتھ اُوپر کی طرف چلتے رہیں۔ راستہ بالکل صاف ہے۔''

میں انگوری کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کو مندر کی طرف دیکھا، اندر کوئی عورت رقص کر رہی تھی۔ میں چبوترے سے اُتر گیا اور انگوری کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں ایک طرف چلنے لگا۔ تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کر کے ہم رُک گئے۔ اور اس کے چند سیکنڈ بعد ہی پیچھے سے چھوٹے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہم ایک بڑے پتھر کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو گئے۔

''کمانڈر.....'' یہ حبیب الرحمٰن کی آواز تھی۔ میں نے جواب دے کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ وہ دونوں ہمارے قریب آ گئے۔

''ہمارے پیچھے چلتے رہو کمانڈر!'' حبیب الرحمٰن نے کہا اور وہ دونوں ہمارے آگے آگے چلنے لگے۔ ہم اُن کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ میں نے انگوری کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ تاریکی اس قدر گہری تھی کہ دو قدم آگے کی چیز بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کئی مرتبہ مجھے اور انگوری کو پتھروں سے ٹھوکریں لگی تھیں۔ ہم تقریباً ایک گھنٹہ دریا کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ تاریکی اور سناٹے میں دریا کے بہتے ہوئے پانی کی آواز بڑا پراسرار تاثر دے رہی تھی۔

ہم بالآخر ایک جگہ رُک گئے۔ آگے دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے پتھر تھے اور بائیں طرف تقریباً سو گز ہٹ کر چٹانوں کا سلسلہ تھا۔ حبیب الرحمٰن کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا

رہا، پھر چٹانوں کی طرف چلنے لگا۔

اندھیرے میں چٹانوں میں چلنا خاصا دُشوار تھا۔ بار بار ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ ہم میں سے کوئی کسی سنگین حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔ تھوڑا اور فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر رُک گئے۔

''میرا خیال ہے ہم چٹانوں میں کافی اندر آ چکے ہیں۔ اور اب ٹارچ روشن کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' حبیب الرحمٰن نے کہتے ہوئے اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے سے ٹارچ نکال لی۔

ٹارچ خاصی طاقتور تھی۔ ہم اس کی تیز روشنی میں آگے چلنے لگے۔ اس مرتبہ ہماری رفتار میں بھی تیزی آ گئی تھی۔ ہمارا رُخ مسلسل بلندی کی طرف تھا۔ ایک تو بلندی، آڑھا ترچھا اُونچا نیچا راستہ اور پھر درختوں اور جھاڑیوں کی بھرمار تھی جن کی وجہ سے چلنے میں اور بھی دُشواری پیش آ رہی تھی۔

انگوری ہانپنے لگی۔ میرا بھی سانس پھولنے لگا تھا اور حبیب الرحمٰن اور عبدالستار بھی ہانپنے لگے۔ حبیب الرحمٰن نے ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھا، کسی طرف سے پانی کے گرنے کی ہلکی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ غالباً کوئی جھرنا تھا۔ ہم اُس آواز کے تعاقب میں چل پڑے۔

ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ اس چٹان کے دوسری طرف گھومتے ہی وہ جھرنا نظر آ گیا۔ پانی پتھروں میں دو تین فٹ کی بلندی سے گر رہا تھا۔ ہم اُس جگہ بیٹھ گئے۔ موسم میں اگرچہ خاصی خنکی تھی مگر پیاس سے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ میں نے جی بھر کے پانی پیا اور وہیں پتھروں پر لیٹ گیا۔ انگوری بھی میرے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

مسلسل چلتے رہنے سے ہمیں خنکی کا احساس نہیں ہوا تھا مگر رُکنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سردی کا احساس ہونے لگا۔ چند روز سے موسم میں بھی کچھ تبدیلی آ رہی تھی۔ اور اس وقت ویسے بھی ہم سمندر سے تقریباً نو ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ دبیز سبزے اور تیز ہواؤں سے سردی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم پھر چل پڑے۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ہم آسمان کو چھونے جا رہے ہوں۔ ہم رات بھر چلتے رہے۔ اس دوران کئی مرتبہ رُک کر تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے آرام بھی کیا گیا تھا۔

چار بج گئے۔ اب دن کا بہت مدھم سا اُجالا پھیلنے لگا تھا۔ اس وقت ہم ایک چشمے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ رات بھر چلتے رہنے سے کھایا پیا ہضم ہو گیا تھا اور پیٹ میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی۔ انگوری تو کچھ زیادہ ہی بے چین ہو رہی تھی۔ اُس وقت سردی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور دوسروں کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر میرے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔

دن کا اُجالا واضح ہو گیا تھا۔ حبیب الرحمٰن نے ٹارچ بند کر کے تھیلے میں ڈال لی اور اُٹھ کر

اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''اب ہماری منزل زیادہ دُور نہیں رہ گئی۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہم زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔''

ہم ایک بار پھر چل پڑے..... اس مرتبہ ہم نشیب کی طرف جا رہے تھے۔ دن کا اُجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ روشنی میں ہمیں چلنے میں بھی دُشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ حبیب الرحمٰن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم ایک گھنٹے بعد منزل پر پہنچ گئے۔ ہمارا استقبال ایک گرجتی ہوئی آواز نے کیا تھا۔

''کون ہے..... رُک جاؤ! خبردار اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔''

وہ کڑکتی ہوئی آواز دائیں طرف سے آئی تھی۔ ہم رُک گئے۔ حبیب الرحمٰن کی طرح ہم نے بھی ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا دیئے تھے۔ میرے دل کی دھڑکن اگرچہ تیز ہو گئی تھی لیکن وہ لہجہ خالص کشمیری تھا اس لئے میں مطمئن تھا کہ وہ کوئی بھارتی فوجی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے گردن گھما کر آواز کی سمت دیکھا لیکن گنجان جھاڑیوں میں کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

''ٹائیگر شکار کی تلاش میں نکلا ہوا ہے..... ہمارا راستہ مت روکو!'' حبیب الرحمٰن نے جھاڑیوں کی طرف رُخ کر کے اُونچی آواز میں کہا۔

''شکار آگے ملے گا..... راستہ یہی ہے۔'' دوسری طرف سے جواب ملا۔

''ٹائیگر بھوکا ہے..... راستہ چھوڑ دو۔'' حبیب الرحمٰن نے کہا۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی اور پھر جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی اور دو نوجوان لڑکے ہمارے سامنے آ گئے۔ اُن میں سے کسی کی عمر بھی سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ دونوں کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں۔ اُنہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہم سے ہاتھ ملایا۔ اس دوران مختلف سمتوں سے دو اور لڑکے سامنے آ گئے۔ اُنہوں نے بھی ہم سے ہاتھ ملایا۔

''کمانڈر شمروز اور کمانڈر انگوری.....'' حبیب الرحمٰن نے ان سے ہمارا تعارف کرایا۔

ان میں سے ایک لڑکا ہمارے ساتھ چلنے لگا جبکہ باقی تین وہیں رُک گئے تھے۔ ہم چیڑ اور چنار کے درختوں سے لدی ہوئی پہاڑیوں میں تنگ سے راستوں پر چکراتے ہوئے آدھے گھنٹے میں ایک غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ ایک چٹان غار پر سائبان کی طرح آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ آس پاس گنجان درختوں اور گھنی جھاڑیوں سے بھی غار کا دہانہ چھپ گیا تھا۔ یہ غار بے حد محفوظ تھا۔ اسے فضا سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ غار کے آس پاس بھی حفاظتی انتظامات موجود تھے۔ نگرانی کرنے والے ایسی جگہوں پر چھپے ہوئے تھے کہ اُنہیں دیکھ لیا جانا ممکن نہیں تھا۔

غار کے دہانے پر کمانڈر محب اللہ اور کمانڈر رشید نے ہمارا استقبال کیا۔ کمانڈر رشید نے تو مجھے سینے سے لگا کر اس قدر زور سے بھینچا کہ مجھے سینے میں اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

اس غار میں بیس بائیس آدمی تھے۔ میرا حلیہ دیکھ کر بہت سے لڑکے مسکرا دیئے تھے لیکن جب اُن سے میرا تعارف کرایا گیا تو اُن سب کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور سب

آگے بڑھ بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کرنے لگے۔ بہت سے لڑکے ایسے تھے جن کی عمریں سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھیں۔ میری عمر بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔

یہ وہ عمر تھی جب ہمارے ہاتھوں میں قلم اور کتابیں ہونی چاہئے تھیں لیکن وقت نے ہمارے ہاتھوں میں رائفلیں تھما دی تھیں۔ اپنے وطن کی آزادی کے لئے ہم جیسے نوعمر لڑکوں نے سروں پر کفن باندھ لئے تھے اور ایک ایسے دشمن سے برسرِ پیکار تھے جو بہت خونخوار، چالاک اور عیار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہم ان غاصبوں کو ایک نہ ایک دن مار بھگائیں گے اور ہماری آنے والی نسلیں آزاد فضاؤں میں سانس لیں گی۔ کسی نوعمر لڑکے کے ہاتھ میں رائفل نہیں ہو گی۔ اُن کے ہاتھوں میں کتابیں نظر آئیں گی، وادی کی فضا میں بارود کا دُھواں نہیں پھیلا ہو گا، پھولوں کی خوشبو سے مہکتی ہوئی فضا میں آزادی کے ترانے گونجا کریں گے۔

یہ غار بہت بڑا تھا۔ یہاں کم سے کم سو افراد کے رہنے کی گنجائش تھی۔ اس کے پچھلی طرف کا حصہ اُوپر سے کھلا ہوا تھا جہاں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ غار کے پچھلے حصے میں کھانا پکانے کا انتظام تھا۔ کھانا دن کا اُجالا پھیلنے سے پہلے ہی تیار کر لیا گیا تھا۔ دن میں یہ اندیشہ تھا کہ آسمان کی طرف اُٹھنے والا دُھواں اس جگہ ہماری موجودگی کی نشاندہی کر سکتا تھا۔

غار کے باہر دُھوپ چمکنے لگی تھی جس سے غار کے اندر بھی کچھ روشنی ہو رہی تھی۔ ہمارے لئے فوراً ہی کھانے کا بندوبست کیا گیا۔ کھانے کے بعد ہمیں آرام کا موقع بھی دیا گیا۔ رات بھر کے اس سفر نے ہمیں بری طرح تھکا دیا تھا۔ انگوری تو لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد میں بھی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میں دوپہر دو بجے کے قریب بیدار ہوا تھا۔ اُس وقت تک کمانڈر یاسین اور کمانڈر شہاب الدین بھی پہنچ چکے تھے اور کچھ اور مجاہدین کی آمد ابھی جاری تھی۔ یہ ایک بہت بڑا اور بہت خطرناک آپریشن تھا اور اس کے لئے نہایت تجربہ کار کمانڈوز جمع کئے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد سعید، اشرف اور انور بھی پہنچ گئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم پانچ چھ غار سے نکل کر پہاڑوں میں نشیب کی طرف اُترنے لگے۔ کمانڈر محب اللہ سب سے آگے تھے۔ اُس کے پیچھے میں، پھر کمانڈر یاسین، کمانڈر شہاب الدین، سعید اور انور تھے۔

میرا حلیہ بدل گیا تھا۔ سر کی چٹیا صاف کر دی گئی تھی۔ اور میں نے سیاہ رنگ کا رُومال سر پر باندھ لیا تھا۔ گیروے رنگ کے یوگیوں والے کپڑے اُتار کر دوسرے کپڑے پہن لئے تھے۔ غار کے ایک حصے میں گولہ بارود کے انبار کے علاوہ کچھ ایسی چیزیں بھی تھیں جو مجاہدین کے کام آ سکتی تھیں اور یہ کپڑے میں نے وہیں سے لئے تھے۔

پہاڑوں میں تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کر کے ایک جگہ رُک گئے۔ سامنے نشیب میں سونا مرگ سے درّہ زوجی لا کی طرف جانے والی شاہراہ نظر آ رہی تھی جہاں سے کل اس فوجی قافلے کو تباہ کرنے کے لئے ہم سب یہاں جمع ہوئے تھے۔

ہم چٹانوں میں ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں کہیں سے بھی ہمیں نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ہم گنجان درختوں اور اُونچی جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے مزید آگے بڑھتے گئے اور بالآخر ایک جگہ رُک گئے۔ سڑک اب ہم سے صرف پچاس گز کے فاصلے پر تھی۔ سڑک کے دونوں طرف عمودی چٹانیں تھیں اور اُن کے پیچھے بلند عمودی پہاڑ تھے۔ اس طرح تقریباً نصف میل تک ایک درّہ سا بن گیا تھا۔

کمانڈر محبّ اللہ ہمیں پچویشن سمجھا رہا تھا۔ اور بالآخر ہم چاروں کمانڈروں نے یہ طے کر لیا کہ کس کو اپنے آدمی لے کر کہاں مورچہ لگانا ہوگا۔ کمانڈر یاسین اور کمانڈر شہاب الدین کو اپنے آدمی لے کر سڑک کے دوسری طرف جانا تھا اور درمیان میں سو گز کا فاصلہ رکھ کر مورچے لگانے تھے۔ جبکہ اس طرف مجھے، کمانڈر محبّ اللہ اور کمانڈر رشید کو ہر سو گز کے فاصلے پر مورچے قائم کرنے تھے۔ اس طرح وہ پورا درّہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہماری زد میں ہوتا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک اس کا جائزہ لینے کے بعد ہم غار میں واپس آ گئے۔ اس وقت تک کچھ اور مجاہدین بھی پہنچ چکے تھے۔ شام تک مجاہدین کی تعداد ساٹھ ہو گئی اور پھر ان مجاہدین کو پانچ پارٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ میری پارٹی میں دس آدمی تھے۔ انگوری، سعید، انور، اشرف، حبیب الرحمٰن اور عبدالستار کے علاوہ دو لڑکے اور تھے۔

وہ رات قافلے پر حملے کی حکمت عملی تیار کرتے ہوئے گزری تھی۔ اور پھر رات دو بجے کے قریب ہم اپنی اپنی پارٹیاں لے کر تھوڑے تھوڑے وقفے سے غار سے روانہ ہو گئے۔

ہماری پارٹی کا ہر شخص اسلحہ اور گولہ بارود سے لدا ہوا تھا۔ دو لڑکوں کے پاس راکٹ لانچر تھے۔ ہر لانچر کے لئے چار چار راکٹ تھے۔ دستی بم، سب مشین گنیں اور اُن کے کئی کئی فاضل میگزین۔ اچھا خاصا بوجھ تھا جو ہر لڑکا اُٹھا کر چل رہا تھا۔ انگوری کے پاس بھی اسلحے کا اتنا ہی بوجھ تھا۔

دو گھنٹوں بعد ہم اپنی اپنی جگہوں پر مورچے سنبھال چکے تھے۔ کمانڈر یاسین اور کمانڈر شہاب الدین نے بھی سڑک کے دوسری طرف اپنی اپنی جگہوں پر مورچے سنبھال لئے تھے۔ مختلف جانوروں کی آوازیں نکال کر ایک دوسرے کو آگاہ کر دیا گیا تھا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پھیلا دیا تھا۔ انگوری میرے قریب ہی تھی۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ہو رہا ہو۔ فوجی قافلے کو صبح پانچ بجے سرینگر سے روانہ ہو کر آٹھ بجے کے قریب یہاں سے گزرنا تھا۔

رات بیت گئی، دن نکل آیا، دھوپ چمکنے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور پھر دفعتہً فضا میں ہیلی کاپٹر کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سن کر میں اُچھل پڑا.....

''کوئی ہیلی کاپٹر پر فائر نہ کرے اور جھاڑیوں میں چھپ جائے۔'' میں نے چیخ کر کہا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد ایک گن شپ ہیلی کاپٹر ایک پہاڑی کی چوٹی کے اُوپر سے ہوتا ہوا سامنے گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور میں گہری نظروں سے ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

ہیلی کاپٹر سڑک کے اُوپر گندربل کی طرف سے آ رہا تھا۔ کسی وقت وہ بائیں طرف اور کبھی دائیں طرف پہاڑیوں پر پرواز کرنے لگتا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ وہ نگران ہیلی کاپٹر تھا اور غالباً نہیں بلکہ یقیناً اُس ہیلی کاپٹر کے ذریعے یہ چیک کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ راستے میں کسی جگہ فوجی قافلے کو خطرہ تو نہیں؟ اس ہیلی کاپٹر کی آمد کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ فوجی قافلہ اب پہنچنے ہی والا ہے.....

میں اور میرے ساتھی قد آدم جھاڑیوں میں چھپ گئے تھے۔ ان پہاڑیوں پر جھاڑیاں اور پودے اس قدر گنجان تھے کہ ان میں چھپے ہوئے کسی شخص کو فضا سے بھی دیکھ لیا جانا ممکن نہیں تھا۔

ہیلی کاپٹر فضا میں پرواز کرتا ہوا ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر گیا۔ میں فکر مند تھا کہ ہمارے مجاہدین میں سے کوئی اُس پر فائرنگ نہ شروع کر دے۔ ہیلی کاپٹر پہاڑیوں کے اُوپر سو ڈیڑھ سو میٹر کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ اُسے نشانہ بنانا بالکل آسان تھا۔ اُسے تو آسانی سے گرایا جا سکتا تھا لیکن اس طرح اصل مشن ناکام ہو جاتا۔ ہیلی کاپٹر کی تباہی کے بعد فوجی قافلہ دُور ہی کہیں رُک جاتا اور ہمارا مقصد پورا نہ ہوتا۔

گن شپ ہیلی کاپٹر پہاڑیوں پر پرواز کرتا ہوا بہت آگے جا کر اُونچی پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری طرح دوسرے کمانڈروں کے ذہن میں بھی یہی بات آئی ہوگی کہ اگر ہیلی کاپٹر کو گرا لیا گیا تو ہمارا اصل مشن خطرے میں پڑ جائے گا۔

ہیلی کاپٹر کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز بھی اب معدوم ہو چکی تھی۔ یہ ہیلی کاپٹر روسی ساخت کا تھا۔ افغانستان میں بھی مجاہدین کے ٹھکانوں پر حملوں کے لئے یہی گن شپ ہیلی کاپٹر استعمال ہو رہے تھے۔ بھارت میں اگرچہ اسلحہ اور دیگر جنگی ساز و سامان بنانے کی کئی فیکٹریاں تھیں لیکن جنگی جنون میں مبتلا بھارتی حکمرانوں نے ہر اُس ملک سے اسلحہ اور گولہ بارود حاصل کیا تھا جہاں سے ملنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ روس ان ممالک میں پیش پیش تھا۔ بھارتی فوج میں استعمال ہونے والا ستر فیصد سے زائد جنگی سامان روس سے درآمد شدہ تھا۔ اور یہ ہیلی کاپٹر بھی روسی تھا۔

دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت سوویت یونین کئی سال سے افغانستان پر قبضہ کرنے کے لئے ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ اُس نے اپنی ساری طاقت افغانستان کی جنگ میں جھونک دی تھی لیکن افغانستان روسیوں کا قبرستان بنتا جا رہا تھا۔ افغان مجاہدین بے سر و سامانی کی حالت میں بھی روسیوں کو ناکوں چنے چبوا رہے تھے اور روسی اب افغانستان سے بوریا بستر سمیٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔

دفعتہً گڑگڑ کی آواز سن کر میں چونک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر میرے ہونٹوں پر

مسلراہٹ آ گئی۔ وہ بھاری ٹرکوں کی آواز تھی جو ہوا کے دوش پر کبھی قریب سے اور کبھی دُور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا، دُور دُور تک ہیلی کاپٹر کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اور پھر میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر دیا..... میرے تمام ساتھی قد آدم جھاڑیوں اور پودوں میں رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اور پھر میرا اشارہ پا کر مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھالنے لگے۔

میں نے بڑی تیزی سے گھوم کر ہر مجاہد کی پوزیشن کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر انگوری کے ساتھ ایک پتھر کی آڑ میں پودوں میں پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔

سڑک ہم سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ ہمارے آگے تقریباً عمودی چٹان تھی جس کے اختتام پر سڑک کے کنارے تقریباً آٹھ فٹ اُونچی دیوار سی بن گئی تھی جبکہ سڑک کے دوسری طرف کی پہاڑیاں زیادہ بلند نہیں تھیں اس طرف قد آدم جھاڑیاں اور پودے بہت گنجان تھے۔

میری نظریں سڑک پر مرکوز تھیں، اور کان گرر گرر کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ اور پھر پچھلے موڑ سے پہلی جیپ کو سامنے آتے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی.....

جیپ پر بھارتی ترنگا لہرا رہا تھا۔ یہ بغیر ہڈ کی جیپ تھی۔ سامنے ونڈ اسکرین کے فریم کے اُوپر ایک آہنی پائپ بھی لگا ہوا تھا جس پر لائٹ مشین گن فٹ تھی۔ ایک فوجی گن کے سامنے سیٹ پر بالکل چاق و چوبند کھڑا تھا۔ جیپ کی پچھلی دو سیٹیں آگے پیچھے کی بجائے آمنے سامنے تھیں۔ ہر سیٹ پر تین تین فوجی سب مشین گنیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ اُن کے رُخ باہر کی طرف تھے۔ جیپ کے پیچھے ایک ٹرک تھا اُس پر آگے ایک ہیوی مشین گن اور دائیں بائیں ایک ایک لائٹ مشین گن نصب تھی۔ تقریباً دو درجن فوجی سب مشین گنیں سنبھالے ٹرک کے اندر کھڑے تھے۔ اُن ٹرکوں میں لکڑی کے تختوں کی سیٹیں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ فوجی ان پر آسانی سے کھڑے ہو سکیں۔ اُس ٹرک کے پیچھے اسلحہ اور گولہ بارود سے لدے ہوئے ٹرک تھے جن پر ترپال پڑے ہوئے تھے۔ ان ٹرکوں کی کیبن کی چھتوں پر بھی دو دو فوجی سب مشین گنیں سنبھالے بیٹھے تھے۔

میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

وہ ٹرک ہلکی رفتار سے ہمارے سامنے سے گزرتے رہے۔ اس دوران پیچھے سے آتی ہوئی ایک جیپ تیزی سے آگے نکل گئی۔

میں اُن ٹرکوں کو گنتا رہا۔ اُن کی تعداد تیس تھی۔ آخر میں بھی دو جیپیں تھیں۔ اُن جیپوں پر بھی آگے پیچھے لائٹ مشین گنیں فٹ تھیں اور ہر جیپ پر چھ چھ فوجی سب مشین گنیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ ٹرکوں اور جیپوں پر بیٹھے ہوئے تمام فوجی دائیں بائیں پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پروگرام کے مطابق سب سے پہلے میری پارٹی کو قافلے کے آخری ٹرکوں اور جیپوں پر حملہ

رہا تھا۔ ہماری طرف سے پہلا فائر ہوتے ہی سڑک کے دونوں طرف دُور تک گھات لگائے ہوئے مجاہدین سمجھ جاتے کہ قافلہ اب مکمل طور پر گھیرے میں آ چکا ہے اور وہ بھی فائر کھول دیتے۔

ہمارے سامنے اب تین ٹرک تھے اور دو جیپیں۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا اور پھر نعرۂ تکبیر بلند کر دیا..... یہ میری طرف سے اپنے ساتھیوں کو سگنل تھا۔ جواب میں ''اللہ اکبر'' کی صدائیں گونجیں اور پھر فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھی.....

ہمارے پہلے حملے میں ٹرکوں پر بیٹھے ہوئے تین فوجی جہنم رسید ہوئے تھے اور پھر اس کے ساتھ ہی جیپوں اور دوسرے ٹرکوں پر ہم نے فائر کھول دیا تھا..... سب مشین گنوں اور لائٹ مشین گنوں کی گولیاں ہمارے آس پاس پتھروں پر لگ رہی تھیں یا ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر رہی تھیں۔

بھارتی فوجی غالباً یہ سمجھے تھے کہ ان پر حملہ ایک ہی جگہ سے ہوا ہے لیکن بہت جلد اُن کی یہ غلط فہمی دُور ہو گئی۔ ٹرکوں کا وہ قافلہ تقریباً دو سو گز تک پھیلا ہوا تھا اور دو سو گز کے اس حصے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سڑک کے دونوں طرف سے اُن پر گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔

ہماری پارٹی میں دو لڑکوں کے پاس راکٹ لانچر تھے اور دونوں کے پاس چار چار راکٹ تھے۔ اُن میں سے ایک نے راکٹ فائر کر دیا جو ایک ٹرک پر لگا اور گویا وہاں قیامت مچ گئی..... ایک زوردار دھماکہ ہوا اور پھر مسلسل دھماکوں کے ساتھ ٹرک میں لدا ہوا گولہ بارود پھٹنے لگا۔

قافلے کی آخری جیپ تیزی سے مُڑی اور واپس جانے کے لئے دوڑنے لگی۔ انگوری نے فاسب مشین گن کا رُخ اُس طرف موڑ دیا مگر جیپ زد میں نہیں آئی اور تیزی سے دوڑتی ہوئی پہلا موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

پہاڑیوں میں دو سو گز تک سڑک کا پورا ٹکڑا محاذِ جنگ بنا ہوا تھا۔ ہمارے مجاہدین نے اُس پورے قافلے پر بھرپور حملہ کیا تھا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ جنگ یکطرفہ تھی۔ مجاہدین تو قافلے پر انگارے برسا رہے تھے جبکہ بھارتی فوجیوں کو کچھ کرنے کا بہت کم موقع مل رہا تھا۔

جگہ جگہ دھماکے ہو رہے تھے..... مجاہدین رائفلوں کے علاوہ دستی بم اور راکٹ بھی استعمال کر رہے تھے۔ زوردار دھماکوں سے فضا گونج رہی تھی اور پہاڑیاں تھرا رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے بیک وقت کئی آتش فشاں پھٹ پڑے ہوں..... ٹرکوں میں پھٹتے ہوئے راکٹ اور گولے اب چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ راکٹ چٹانوں پر لگ لگ کر پھٹ رہے تھے۔

پروگرام کے مطابق ہمیں یہ کارروائی آدھے گھنٹے میں مکمل کرنی تھی لیکن میرے خیال میں ہمارا تو سب کچھ چند منٹ میں ہی ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔

دفعتہً اُن پے در پے دھماکوں میں پھڑپھڑاہٹ کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ ہیلی کاپٹر ہیلی آگے کا چکر لگا کر واپس آ رہا تھا۔ اور اُس سے نہ صرف ہیوی مشین گن سے فائرنگ ہو رہی تھی بلکہ راکٹ بھی برسائے جا رہے تھے۔

وہ گن شپ ہیلی کاپٹر پہاڑیوں پر ہمارے سروں کے اُوپر سے ہوتا ہوا تیزی سے آگے نکل گیا۔ مشین گن کی لاتعداد گولیاں ہمارے پاس گری تھیں..... ایک راکٹ ہم سے تقریباً پچاس گز آگے ایک چٹان پر لگا اور ایک زوردار دھماکے سے پتھروں کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔

ہیلی کاپٹر کافی آگے جا کر واپس پلٹا۔ اس مرتبہ وہ نسبتاً زیادہ بلندی پر تھا۔ ہم نے اپنی سب مشین گنوں سے فائرنگ شروع کر دی لیکن ہماری گولیاں اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں البتہ ہمارا ایک ساتھی ناصر مشین گن کی ایک گولی کی زد میں آ گیا تھا۔

ناصر کی چیخ سن کر میں تیزی سے اُس کی طرف لپکا۔ بھاری مشین گن کی گولی نے اُس کے سینے میں بہت بڑا سوراخ کر دیا تھا..... ہر طرف خون بکھرا ہوا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر کانپ کر رہ گیا۔ اُس کے لئے اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اپنی رائفل کندھے پر اُٹھا لی اور ناصر کا راکٹ لانچر سنبھال لیا۔ اُس کے پاس صرف ایک راکٹ بچا تھا۔ میں نے وہ راکٹ لانچر لوڈ کیا اور اُوپر دیکھا۔ ہیلی کاپٹر پہاڑیوں پر گولیوں اور راکٹوں کی بارش کرتا ہوا بہت آگے نکل گیا تھا..... اس طرف سے بھی ہیلی کاپٹر پر فائرنگ ہو رہی تھی مگر وہ محفوظ ہی رہا۔

میں نے اپنے مجاہدین کو اُوپر جانے کا حکم دیا اور انگوری کا ہاتھ پکڑ کر خود بھی بلندی کی طرف دوڑنے لگا۔

ہیلی کاپٹر ایک طویل چکر کاٹ کر ایک مختلف سمت سے ہماری طرف آنے لگا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو چیخ کر پتھروں کے پیچھے پناہ لینے کا حکم دیا اور خود بھی ایک بڑے پتھر کی آڑ لے کر لانچر سے اُس کا نشانہ باندھنے لگا۔ ہیلی کاپٹر بڑی تیزی سے گولیاں برساتا ہوا آ رہا تھا۔ میرا ایک اور ساتھی گولیوں کی زد میں آ کر شہید ہو گیا..... میں ایک لمحہ اُس کی طرف متوجہ ہوا اور اُسی لمحہ ہیلی کاپٹر بائیں طرف مُڑ گیا جس طرف پہاڑیوں میں دُور تک ہمارے مجاہدین پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے کاپٹر کا نشانہ لے کر راکٹ فائر کر دیا۔ اسی لمحہ دوسری طرف سے بھی پہاڑیوں میں کسی جگہ سے ایک راکٹ فائر ہوا اور پھر دوسرے ہی لمحہ فضا ایک کان پھاڑ دینے والے دھماکے سے گونج اُٹھی..... گن شپ ہیلی کاپٹر پہلے آگ کے گولے میں تبدیل ہوا اور پھر اُس کے جلتے ہوئے ٹکڑے چاروں طرف پہاڑیوں میں بکھر گئے.....

سڑک کی طرف اب بھی پے در پے خوفناک دھماکے ہو رہے تھے۔ اب ہمیں اُوپر سے کوئی خطرہ نہیں تھا ہم نے وہ فوجی قافلہ تباہ کر دیا تھا۔ ہمارا مشن پورا ہو گیا تھا۔ اگر اُس قافلے میں کچھ بچا بھی ہو گا تو گولہ بارود میں ہونے والے دھماکے اُسے بھی ختم کر دیں گے۔ مجھے ایک جیپ کے بچ کر نکل جانے کا افسوس تھا۔ اُس جیپ میں یقیناً وائرلیس بھی ہو گا اور اب تک اُنہوں نے سرینگر ہائی کمان کو اطلاع کر دی ہو گی اور مجھے یقین تھا کہ اس علاقے کو دُور دُور تک گھیرے میں لینے کی کوشش کی جائے گی۔

ٹرکوں یا جیپوں پر امدادی پارٹیوں کو پہنچنے میں خاصا وقت لگ سکتا تھا لیکن اگر ہیلی کاپٹر بھی ہماری تلاش میں روانہ ہو گئے تو ہمارے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

تقریباً ایک ہزار فٹ کی بلندی پر آ کر ہم سب لوگ ایک جگہ پر جمع ہو گئے اور پھر میں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ بکھر کر اپنے اپنے طور پر محفوظ مقامات کی طرف جانے کی کوشش کریں۔ ہم سب نے بڑی گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ میں نے انگوری کا ہاتھ پکڑا اور ہم ایک مختلف سمت میں چل پڑے۔

میرا خیال درست نکلا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہیلی کاپٹروں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی..... میں انگوری کو پکڑ کر گنجان جھاڑیوں میں لے گیا۔ اُس وقت ہم سطح سمندر سے چار ہزار آٹھ سو میٹر کی بلندی پر تھے۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے بھی تیر رہے تھے۔ سورج کبھی بادل کے کسی ٹکڑے کے پیچھے چھپ جاتا اور کبھی دھوپ چمکنے لگتی۔ تیز ہوا سے پودوں اور جھاڑیوں کے سرسرانے کی آوازیں چاروں طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔

ایک محفوظ جگہ پر پہنچ کر میں نے اُوپر دیکھا۔ وہ دو گن شپ ہیلی کاپٹر تھے جو ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر پرواز کرتے ہوئے ہائی وے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر جیسے ہی ایک پہاڑی چوٹی کی آڑ میں نگاہوں سے اوجھل ہوئے میں انگوری کا ہاتھ پکڑ کر ایک بار پھر دوڑنے لگا۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ انگوری بری طرح ہانپ رہی تھی۔ میرا سانس بھی پھولنے لگا تھا۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے رُکتے اور پھر دوڑنے لگتے۔

ہم ایک بار پھر رُک گئے۔ انگوری ہانپ گئی تھی۔ اُس کے منہ سے کف بہنے لگا تھا۔ میرا سانس بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم دونوں دیر تک بیٹھے ہانپتے رہے اور بتدریج نارمل ہوتے چلے گئے۔

''میرا حلق خشک ہو رہا ہے..... بہت شدت کی پیاس لگ رہی ہے۔'' انگوری گلا سہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے ہونٹوں پر بھی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، قرب و جوار میں کسی ندی یا چشمے کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

''اس طرف چلتے ہیں۔ شاید کوئی ندی یا چشمہ مل جائے۔'' میں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہم ایک بار پھر چلنے لگے۔ سامنے بہت دُور تقریباً چھ ہزار میٹر بلند پہاڑی چوٹی پر برف جمی نظر آ رہی تھی۔ ہمارا رُخ اُسی طرف تھا۔ بعض چوٹیوں پر سال بھر برف جمی رہتی تھی۔ برف پگھلنے سے پانی ندیوں اور جھرنوں کی صورت میں پہاڑوں پر بہتا رہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ پانی کی تلاش میں ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑے گا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم ایک چشمے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اُس چشمے کے آس پاس اُونچے پودے یا جھاڑیاں وغیرہ نہیں تھیں۔ دُور دُور تک البتہ دبیز گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے جی بھر کے پانی پیا۔ انگوری گھاس پر لیٹ گئی میں بھی کہنی کے بل دراز ہو گیا اور انگوری کی طرف دیکھنے لگا۔

سورج نصف النہار سے آگے جا چکا تھا۔ میرے خیال میں دو بج رہے ہوں گے۔ گزشتہ رات دو بجے کے قریب ہی ہم غار سے روانہ ہوئے تھے اور اس وقت قہوے کے ساتھ کچھ روٹی کھائی تھی۔ صبح نو بجے کے قریب ہم نے قافلے پر حملہ کیا تھا اور اس کے بعد سے اب تک مسلسل بلندیوں کی طرف دوڑ رہے تھے اور مجھے بھوک کا احساس ہونے لگا تھا۔ بھوک انگوری کو بھی لگ رہی ہو گی لیکن ابھی تک اُس نے اس سلسلے میں زبان نہیں کھولی تھی۔ راستے میں ہمیں کوئی پھلدار درخت بھی نظر نہیں آیا تھا کہ کسی پھل ہی سے پیٹ بھر لیا جاتا۔

''اب آگے چلنا چاہئے.....'' میں نے اُٹھ کر اپنی رائفل سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''شاید اس طرف ہمیں کوئی پھلدار درخت مل جائے۔ ورنہ پتہ نہیں ہمیں کب تک بھوکا رہنا پڑے۔''

انگوری بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی چادر سنبھالنے لگی۔ یہ سیاہ چادر اُس کی شناخت بن گئی تھی۔ اب تک اُس نے چادر ایک بل دے کر گردن پر لپیٹ رکھی تھی اس طرح اُسے کچھ اُلجھن بھی ہو رہی تھی۔

''ایک منٹ.....'' وہ بولی۔ ''میں یہ چادر پٹکے کی طرح کمر پر باندھ لوں۔ چلنے میں بھی آسانی رہے گی۔''

اُس نے چادر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر جھٹک دی اور پھر لمبائی کے رُخ پر اُسے تہہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ تیز ہوا کے جھونکے سے چادر اُس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اُس نے لپک کر چادر پکڑنے کی کوشش کی مگر ہوا کے جھونکے نے چادر کو اُوپر اُٹھا دیا۔

میں نے اپنی جگہ سے اُچھل کر چادر کو پکڑنا چاہا مگر ہوا کا ایک اور زوردار جھونکا اُسے اُڑا کر مزید اُوپر لے گیا.....

چادر کٹی پتنگ کی طرح ہوا میں اُڑ رہی تھی۔ میں اُس کے پیچھے دوڑنا چاہتا تھا مگر اسی لمحہ ہیلی کاپٹر کی آواز سن کر میں رُک گیا۔ انگوری بھی چیخ اُٹھی.....!

○○○

''شمروز.....رُک جاؤ! ہیلی کاپٹر اس طرف آ رہا ہے۔''

میں نے مُڑ کر دیکھا۔ ہیلی کاپٹر ایک پہاڑی چوٹی کے پیچھے سے نمودار ہو کر اس طرف آ رہا تھا۔ انگوری نے جلدی سے رائفل اُٹھا لی اور میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر چٹانوں کی طرف دوڑنے لگا۔ ہم اس وقت کھلی جگہ پر تھے۔ ہیلی کاپٹر والوں کی نظروں میں آ سکتے تھے۔ اور پھر ہوا میں اُڑتی ہوئی چادر ہماری موجودگی کی نشاندہی کر سکتی تھی۔

میرا خدشہ درست نکلا، ہمیں دیکھ لیا گیا تھا..... کاپٹر اُس وقت کافی بلندی پر تھا لیکن دوسرے ہی لمحہ بڑی تیزی سے نیچے آنے لگا.....

میں انگوری کا ہاتھ پکڑے دوڑتا رہا۔ اور پھر دفعتہً فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھی۔ ہم پر مشین گن سے گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ انگوری ٹھوکر کھا کر گری۔ میں نے اُسے دوبارہ ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھایا اور قریبی چٹان نما پتھر کی طرف چھلانگ لگا دی۔

کئی گولیاں اُس چٹان نما پتھر پر لگی تھیں۔ ہیلی کاپٹر آگے نکل گیا تھا۔ میں انگوری کا ہاتھ پکڑے چٹانوں میں دوڑتا رہا۔ انگوری ایک بار پھر لڑکھڑا کر گری، میں نے اُسے دوبارہ اُٹھا دیا۔

''یہاں رُکے تو وہ ہمیں ٹھکانے کر دیں گے۔'' میں نے کہا۔

''مجھ سے نہیں چلا جاتا..... میری ٹانگیں شل ہو رہی ہیں۔'' انگوری نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''ہمت سے کام لو.....'' میں نے کہا۔ ''وہ ہمیں ایسی اذیت ناک موت ماریں گے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔''

میں انگوری کو پکڑے چٹانوں میں آڑھے ترچھے راستوں پر دوڑتا رہا۔ فضا میں ہیلی کاپٹر کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ کبھی کبھی چٹانیں مشین گن کی فائرنگ کی آواز سے بھی گونج اُٹھتیں۔ کچھ دیر بعد اپنے سروں پر ہیلی کاپٹر کی آواز سن کر میں انگوری کو گھسیٹتا ہوا ایک چٹان کے ساتھ چپک گیا۔ چٹان کے اُوپر ایک بہت بڑا پتھر سائبان کی طرح آگے جھکا ہوا تھا اور اُس کی وجہ سے ہمیں فضا سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

ہیلی کاپٹر فضا میں معلق ہو گیا تھا۔ اُس کا سایہ کچھ دُور بائیں طرف کی ایک چٹان پر دکھائی دے رہا تھا۔ تقریباً ایک منٹ بعد وہ سایہ حرکت میں آیا اور کاپٹر کی آواز بتدریج دُور ہوتی چلی گئی۔

ہم دو تین منٹ اسی چٹان سے چپک کر کھڑے رہے اور پھر آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگے۔ انگوری کی حالت ناگفتہ ہو رہی تھی۔ وہ بار بار لڑکھڑا جاتی۔ اگر میں اُسے نہ سنبھالے ہوتا تو

وہ یقیناً گر پڑتی اور پھر رُکنے کا نام نہ لیتی۔

میں ایک دراڑ کے قریب رُک گیا۔ وہ دراڑ اتنی کشادہ تھی کہ دو آدمی پہلو بہ پہلو آسانی سے چل سکتے تھے۔ فضا میں تھرتھراہٹ کی بڑھتی ہوئی آواز سن کر میں سمجھ گیا کہ ہیلی کاپٹر دوبارہ اس طرف آ رہا تھا۔ میں انگوری کو کھینچتا ہوا اُس دراڑ میں گھستا چلا گیا۔

یہ دراڑ تقریباً دس گز آگے جا کر دائیں طرف مُڑ گئی تھی۔ اُس طرف گھومتے ہوئے میں نے اُوپر دیکھا، بہت اُوپر چٹانیں ایک دوسرے کے بہت قریب تھیں اور اُن کے درمیان روشنی کی ایک باریک سی لکیر نظر آ رہی تھی۔ مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اگر کسی چٹان کا کوئی حصہ گر جائے تو یہ دراڑ ہمارا مقبرہ بن جاتی۔ لیکن میں نے سر جھٹکتے ہوئے اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ یہ چٹانیں ہزاروں سال سے بلکہ نجانے کب سے اس جگہ اسی طرح کھڑی تھیں۔ اور اب ان کے گرنے کا سوچنا حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔

انگوری میری گرفت سے ہاتھ چھڑا کر چٹان کے ساتھ سرکتی ہوئی دوزانوں ہو کر بیٹھ گئی تھی اور آگے کو جھکی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اُس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا اور وہ آستین سے بار بار منہ پونچھ رہی تھی۔ میں نے اُسے اُٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ خود بھی اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ یہاں ہم کسی حد تک محفوظ تھے اور کچھ دیر آرام کر سکتے تھے۔

بیس پچیس منٹ گزر گئے..... ہیلی کاپٹر کی آواز اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے صرف ایک اندیشہ تھا کہ بھارتی فوجی کاپٹر سے اُتر کر ان چٹانوں میں ہماری تلاش نہ شروع کر دیں۔ ایک اطمینان یہ بھی تھا کہ ان سنگلاخ اور نوکیلی چٹانوں میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں ہیلی کاپٹر اُتر سکتا۔

ہم ایک بار پھر آگے چلنے لگے۔ دراڑ چٹانوں میں کبھی دائیں مُڑ جاتی اور کبھی بائیں۔ کسی جگہ تو یہ اس قدر کشادہ ہو جاتی کہ آٹھ دس آدمی آرام سے ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ اور کہیں اس قدر تنگ کہ ہمیں آگے پیچھے ہو کر چٹان کے ساتھ گھسٹ کر چلنا پڑتا۔

تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر رُک گئے۔ یہ جگہ کافی کشادہ تھی اور اُوپر بھی آسمان نظر آ رہا تھا۔ چند منٹ بعد میں پھر آگے بڑھنے لگا۔ بیس گز آگے دراڑ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ میں دائیں طرف مُڑ گیا۔ اُس طرف راستہ کافی کشادہ تھا۔ انگوری اب پھر بار بار رُک رہی تھی۔

''میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے..... اب مجھ سے نہیں چلا جا رہا۔'' وہ ایک ہاتھ پیٹ پر رکھ کر دوہری ہو گئی۔

''تھوڑا سا اور.....'' میں نے کہا۔ ''ہم جلد ہی کسی کھلی جگہ پر نکل آئیں گے اور کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر آرام کر لیں گے۔ ان چٹانوں سے نکل کر کسی نہ کسی جگہ ہمیں پانی بھی مل جائے گا۔''

''مم..... مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولی۔

''ان چٹانوں سے باہر نکلیں تو شاید کوئی چیز کھانے کو بھی مل جائے۔'' میں نے جواب دیا۔

بھوک مجھے بھی لگ رہی تھی لیکن ظاہر ہے میں انگوری کی طرح کراہ نہیں سکتا تھا۔ اس کے برعکس میں اُس کا حوصلہ بڑھاتا رہا اور اُسے ہاتھ سے پکڑے کھینچتے ہوئے چلتا رہا۔

دراڑ بائیں طرف مُڑ گئی اور اس کے ساتھ ہی میں رُک گیا۔ اس سے آگے ایک غار تھا اور یہ غار کسی سرنگ کی طرح خاصا طویل تھا۔ اُس کے دوسرے سرے پر روشنی کا دائرہ سا نظر آ رہا تھا۔ وہ غار کا دہانہ تھا۔

''اس غار کے دوسری طرف ہمیں یقیناً پانی بھی مل جائے گا اور کچھ.....''

''کھانے کو بھی.....'' انگوری نے ہنستے ہوئے میری بات کاٹ دی۔ ''تم دوسروں کو بہلانا خوب جانتے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے ہم ان چٹانوں سے کبھی باہر نہیں نکل سکیں گے۔''

''میں مایوس نہیں ہوں انگوری.....'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا تمہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ ہم ان سنگلاخ چٹانوں ہی کی وجہ سے محفوظ ہیں۔ اگر کھلی جگہ پر ہوتے تو اب تک مارے جا چکے ہوتے۔ ہمت نہ ہارو! اُمید رکھو کہ اس غار سے نکل کر ہمیں مایوسی نہیں ہو گی۔''

غار میں اندھیرا سا تھا۔ میں انگوری کا ہاتھ پکڑے چلتا رہا۔ تقریباً دس منٹ بعد ہم غار کے دوسرے دہانے پر پہنچ گئے اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ غار کے دوسری طرف عمودی ڈھلان تھی اور نیچے اُترنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے ہزاروں فٹ نیچے سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی..... میرے قریب کھڑی ہوئی انگوری نے بھی یہ منظر دیکھا۔ اُس کے منہ سے بھی اس طرح گہرا سانس نکلا جیسے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ وہ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا اور پھر خود بھی شکست خوردہ انداز میں اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ ہم تقریباً پانچ منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔ انگوری بھوک پیاس اور تھکن سے نڈھال ہو رہی تھی۔ میں اور کچھ بولنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میری بات پکڑ لیتی۔

''تم کہتے تھے ان پہاڑوں نے ہمیں پناہ دی ہے۔ اب یہی چٹانیں ہمارے لئے موت کے جال بن گئی ہیں۔'' انگوری نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر وہی مایوسی کی باتیں.....'' میں نے کہا۔ ''یہ وادیاں اور یہ سنگلاخ چٹانیں ہی زندگی کی علامت ہیں۔ مایوس نہ ہو! کوئی نہ کوئی راستہ مل جائے گا۔''

میں دہانے کے قریب آ گیا اور صورتحال کا جائزہ لینے لگا۔ دُھوپ اب نرم ہو گئی تھی۔ سورج اگرچہ غار کے اُوپر والی چٹانوں کے عقب میں تھا مگر سامنے وادی میں پھیلی ہوئی دُھوپ کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں سورج غروب ہونے والا ہے۔

میں دہانے کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ڈھلان اس قدر عمودی تھی کہ اس پر اُترنے کی کوشش کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ البتہ دائیں طرف چٹان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پتھر اُبھرے ہوئے تھے اور تیس چالیس فٹ نیچے کشادہ اور محفوظ جگہ تھی جس سے آگے

گنجان درخت تھے۔ میں نے انگوری کو اشارے سے قریب بلا لیا..... اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ راستہ مشکل ضرور ہے۔ لیکن اگر کوشش کی جائے تو ہم نیچے اُتر سکتے ہیں۔''

''اور اگر بیچ میں ہاتھ یا پیر پھسل گیا تو ہماری ہڈیوں کا بھی سراغ نہیں ملے گا۔'' انگوری نے کہا۔

''باہر کو اُبھرے ہوئے پتھر کافی بڑے بڑے ہیں۔ کوشش کی جا سکتی ہے۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے میں اُترتا ہوں، تم میرے پیچھے پیچھے چلی آنا۔''

میں نے رائفل کندھے پر لٹکا لی اور ان پتھروں پر اُترنے لگا۔ چند گز کا فاصلہ طے کرتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اس طرح نیچے اُترنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا میں نے سمجھا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکے مجھے مسلسل دھکیل رہے تھے۔

''انگوری.....!'' میں نے اُوپر دیکھتے ہوئے آواز لگائی۔ ''ہوا تیز ہے لیکن پتھر خاصے بڑے ہیں۔ ان پر ہاتھ پیر جمانا زیادہ مشکل نہیں۔ ہمت کرو اور احتیاط سے نیچے اُتر آؤ۔''

انگوری نے اپنے اندر حوصلہ پیدا کر ہی لیا اور وہ بھی میری طرح پتھروں پر ہاتھ پیر جما کر نیچے اُترنے لگی۔ ڈر اور خوف سے اُس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

واقعی بہت کٹھن اور جان لیوا کام تھا۔ تیس چالیس فٹ کا فاصلہ پندرہ بیس منٹ میں طے ہوا تھا۔ نیچے کشادہ جگہ پر آتے ہی انگوری گھاس پر دراز ہو گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میں بھی اُس کے قریب بیٹھ گیا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ پشت کے بل لیٹی ہوئی تھی..... اُس کے سینے کا زیر و بم میرے اندر عجیب سی کیفیت پیدا کرنے لگا لیکن میں فوراً ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ہم اُس جگہ سے نجانے کتنی دُور نکل آئے تھے۔ فضا میں ہیلی کاپٹروں کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے خیال میں اب ہم محفوظ تھے۔ کچھ ہی آگے گنجان درختوں کا سلسلہ تھا۔ اگر کاپٹر آ بھی گئے تو ہم ان درختوں میں پناہ لے سکتے تھے۔

میں انگوری کو وہیں چھوڑ کر درختوں کی طرف آ گیا۔ اور پھر میں خوشی سے ناچ اُٹھا..... وہ خوبانی کے درخت تھے۔ اُن پر پھل نہیں لگا ہوا تھا البتہ نیچے گھاس پر اِدھر اُدھر خوبانی کی لاتعداد گٹھلیاں بکھری ہوئی تھیں۔ تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ان درختوں کا پھل توڑنے والا کوئی نہیں تھا۔ پھل نیچے گر کر گل سڑ گیا تھا اور اُن کی گٹھلیاں رہ گئی تھیں۔ جگہ جگہ سوکھی ہوئی خوبانیاں بھی نظر آ رہی تھیں اور مزے کی بات یہ تھی کہ چند گز آگے ان درختوں میں شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی ندی بھی بہہ رہی تھی۔

میں نے انگوری کو آواز دے کر بلایا۔ پہلے ہم نے ندی سے پانی پیا اور پھر میں سوکھی ہوئی خوبانیاں اور بکھری ہوئی گٹھلیاں جمع کرنے لگا۔

ہماری پیاس بھی بجھ گئی اور پیٹ کی آگ بھی۔ لیکن اب پریشانی کی جو سب سے بڑی بات تھی وہ یہ تھی کہ سورج غروب ہونے والا تھا اور ہمارے پاس پناہ کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ موسم میں بھی سے خاصی خنکی آ گئی تھی اور میں جانتا تھا کہ کھلی جگہ پر رات گزارنا قیامت سے کم نہیں ہو گا۔

میں نے ایک میلی سی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی جبکہ انگوری نے شلوار اور کرتہ پہنا ہوا تھا۔ کرتے کے دونوں طرف جیبیں تھیں۔ ہم نے اپنی جیبوں میں سوکھی ہوئی خوبانیاں بھر لیں اور درختوں کے نیچے چلتے ہوئے نشیب میں اُترنے لگے۔

ہمارے سامنے ہزاروں فٹ نیچے تا حدِ نگاہ سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی۔ بظاہر ایسی کوئی جگہ دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن مجھے اُمید تھی کہ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے کہیں کوئی ایسی جگہ مل جائے گی جہاں ہم رات گزار سکیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہی سورج برف پوش چوٹیوں کے پیچھے روپوش ہو گیا۔ فضا میں سرمئی اندھیرا پھیلنے لگا اور خوش قسمتی سے ہمیں ایک چھوٹا سا غار بھی مل گیا..... اُس غار کا دہانہ مغرب کے رُخ پر تھا اور اندر ابھی تک مدھم سا اُجالا تھا۔ میں اندر گھس گیا۔ غار کافی لمبا تھا جبکہ چوڑائی بارہ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ بہرحال یہاں رات گزاری جا سکتی تھی۔

ہم غار کے دہانے کے قریب ہی بیٹھ گئے اور اب تک کی صورتحال پر تبصرہ کرنے لگے۔

اندھیرا پھیل گیا۔ اب غار کے باہر بھی چند فٹ سے زیادہ دُور کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کی وجہ سے اندھیرا کچھ زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ وقت کی رفتار جیسے تھم گئی تھی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور درختوں اور پودوں کی سرسراہٹ وحشت سی طاری کر رہی تھی۔

دفعتاً ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اس کے فوراً بعد فضا میں اس طرح چمک پیدا ہوئی کہ ایک لمحے کو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں..... وہ بادلوں کے گرجنے کی آواز تھی اور اس کے ساتھ ہی بجلی کی کڑاکے سے چمکی تھی۔ انگوری چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اُسے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ اور دوسرے ہی لمحہ مجھے دماغ میں آندھیاں سی چلتی محسوس ہونے لگیں۔ پورے بدن میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ انگوری میرے ساتھ اس طرح لپٹی ہوئی تھی کہ اُس کے دل کی دھڑکن میں اپنے سینے میں محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے اُسے غیر ارادی طور پر اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ پانی کے چھینٹے اندر بھی آ رہے تھے۔ انگوری مجھ سے الگ ہو گئی۔

''سردی لگ رہی ہے..... بارش کی بوچھاڑ بھی اندر آ رہی ہے۔ ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ جائیں کسی کونے میں۔'' انگوری نے کہا۔

میں اُسے بازو سے پکڑ کر غار کے آخری حصے میں لے آیا۔ یہاں بارش اور تیز ہوا سے تو بچ گئے تھے تاہم خنکی تو بہرحال موجود تھی۔

بارش کی پُرشور آواز دلوں پر وحشت سی طاری کر رہی تھی۔ بادل ایک بار پھر گرجے اور

انگوری پھر مجھ سے لپٹ گئی.....

''تم تو بہت بہادر لڑکی ہو۔ بادلوں سے ڈر رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''مجھے بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک سے ڈر لگتا ہے۔'' انگوری نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

بجلی ایک بار پھر کڑکی اور انگوری نے چیخ کر مجھے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ مجھ سے اس طرح چپک گئی جیسے کبھی الگ نہ ہو گی۔ میں نے بھی اُسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا اور ایک ہاتھ سے اُس کی پشت سہلانے لگا۔ مجھ پر ایک بار پھر وہی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ میرا ایک ہاتھ انگوری کی پشت کو سہلاتا رہا۔ مجھے اپنے سینے پر انگوری کی سانس کی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ اور پھر سانس کی یہ حرارت میرے گلے پر محسوس ہونے لگی۔

اُسی وقت کڑاکے کے ساتھ بجلی چمکی، غار آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے والی تیز روشنی سے بھر گیا۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

مجھے یوں لگا تھا جیسے بجلی باہر کسی چیز پر نہیں میرے اُوپر گری ہو۔ میں نے تڑپ کر انگوری کو اپنے آپ سے الگ کر دیا لیکن انگوری پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

''انگوری.....'' میں نے اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''جانتی ہو ہم نے ایک دوسرے سے کیا وعدہ کیا تھا..... کیا تم بھول تو نہیں گئیں؟''

''نن..... نہیں.....'' انگوری ہکلائی۔ ''مجھے وہ وعدہ یاد ہے۔''

انگوری مجھ سے الگ ہٹ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اُس کے تیز اور بے ربط سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں خاموش بیٹھا غار کی تاریکی میں گھورتا رہا اور کبھی باہر دیکھنے لگتا جہاں بارش کے شور کے سوا کچھ نہیں تھا۔

وقت دھیرے دھیرے سے گزر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ رات کسی طرح جلد بیت جائے مگر وقت کو اپنی رفتار سے چلنا ہوتا ہے۔ وہ کسی کی خواہش کے تابع نہیں ہوتا۔

انگوری شاید سو گئی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے نیند کے جھونکے میں میرے اُوپر جھک گئی۔ میں نے اُس کا سر اپنے گھٹنے پر رکھ لیا اور اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میری آنکھیں بھی بند ہونے لگیں۔

میری آنکھ کھلی تو غار میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ انگوری سمٹی ہوئی میرے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے باہر دیکھا بارش رات ہی کو کسی وقت بند ہو گئی تھی اور باہر دُھوپ چمک رہی تھی۔ میں نے انگوری کو جگا دیا اور ہم دونوں غار سے باہر آ کر دُھوپ میں بیٹھ گئے۔ آسمان پر کہیں بادلوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہر طرف دُھوپ پھیلی تھی۔ پہاڑوں پر بارش کا پانی طوفانی ندی نالوں کی صورت میں بہہ رہا تھا اور ایسی حالت میں ہمارے لئے سفر جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔

ہم نے ایک ندی کے کنارے پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا، پانی پیا اور اپنی جیبوں سے خوبانیاں

ں کر کھانے لگے۔ یہی ہمارا ناشتہ تھا۔ خوبانیوں کی گٹھلیاں توڑ کر اُن کی گریاں کھانے کا ایک ں مزہ آ رہا تھا۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا وہ اس وقت میری طرف ہی دیکھ رہی تھی لیکن ھ اپنی طرف متوجہ پا کر اُس نے نظریں جھکا لیں۔

دوپہر ہو گئی۔ ندی نالوں میں پانی کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ میں غار میں جا کر رائفلیں اُٹھا لایا انگوری نے اپنی رائفل لے کر کندھے پر لٹکا لی اور ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

اگلی رات بھی ہمیں ایک غار ہی میں گزارنی پڑی۔ دوسرے دن صبح سویرے ہم پھر چل ے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت ہم کہاں ہیں اور کسی منزل پر پہنچ بھی سکیں گے یا زندگی بھر ں پہاڑوں میں بھٹکتے رہیں گے؟

انگوری کی حالت خاصی ابتر ہو رہی تھی۔ بھوک اور تھکن نے اُسے بری طرح نڈھال کر رکھا ۔ میں اُسے حوصلہ دلاتا رہا اور وہ لشتم پشتم میرے ساتھ گھسٹتی رہی۔

دوسرے دن شام کو نشیب میں بہت دُور ایک جگہ سے دُھویں کی ایک لکیر اُٹھتے دیکھ کر ہم ں گئے۔ وہاں یقیناً کوئی بستی تھی۔ لیکن ہم اندھا دُھند اس بستی میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ نے بھارتی فوج کو بہت بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ نہ صرف کروڑوں روپے کا گولہ بارود تباہ کیا تھا اس کے ساتھ درجنوں فوجیوں کو بھی جہنم رسید کر دیا تھا۔ وہ ہیلی کاپٹر جس طرح ہماری تلاش ئی گھنٹوں تک پہاڑوں پر پرواز کرتا رہا تھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بھارتی فوج کارروائی میں حصہ لینے والے مجاہدین کو ہر صورت میں تلاش کرنا چاہتی ہے۔

یہ دوسرا دن تھا اور مجھے توقع تھی کہ بھارتی فوج چپے چپے پر پھیل چکی ہو گی۔ کوئی گاڑی، کوئی ان سے محفوظ نہیں ہو گی۔ میں دوسرے ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ اُن سے کوئی پکڑا گیا تھا یا سب لوگ پناہ کی تلاش میں ہماری طرح بھٹک رہے تھے؟

ہم درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ گئے۔ جیبوں میں بھری ہوئی خوبانیاں آج صبح ختم ہو چکی ں اور ہمیں کوئی پھلدار درخت بھی نہیں ملا تھا۔ ہم صبح سے بھوکے تھے۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد میں نے انگوری کا ہاتھ پکڑا اور محتاط انداز میں اُس بستی کی ف بڑھنے لگا جس کا ہم نے دُور سے صرف ایک ہی مکان دیکھا تھا اور دُھواں بھی اُسی مکان ین سے اُمڈ رہا تھا۔

ہم بہت محتاط انداز میں چلتے ہوئے اُس مکان کے قریب پہنچ گئے۔ ایک کھڑکی میں لالٹین روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر یہ انکشاف ہوا کہ صرف وہی مکان تھا۔ اور غالباً یہ کوئی فارم ہاؤس تھا۔

میں اور انگوری دبے قدموں چلتے ہوئے مکان کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے محتاط انداز میں کی میں جھانک کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی چونکے بغیر نہ رہ سکا.....

چارپائی پر ایک نوجوان لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے بازو اور سینے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں جو خون

سے تر ہو رہی تھیں۔ چارپائی کے قریب ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی اُس نوجوان کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ میں اُس نوجوان کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر دفعتہً اپنے عقب میں بھیڑیئے جیسی غراہٹ سن کر اُچھل پڑا.....

''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا.....تم دونوں میری رائفل کی زد پر ہو۔''

انگوری کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''رائفلیں پھینک کر ہاتھ اُٹھالو ورنہ بھون کر رکھ دُوں گا۔'' وہی غراہٹ دوبارہ سنائی دی۔

میں نے رائفل پھینک کر ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے۔ انگوری نے بھی میری تقلید کی تھی۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا آنے والے لمحات کا انتظار کر رہا تھا۔

○

کمرے میں بیٹھی ہوئی عورت بھی مُڑ کر اس طرف دیکھنے لگی تھی۔ اور پھر وہ اُٹھ کر تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ چارپائی پر پڑے ہوئے زخمی نوجوان کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

اُس شخص نے ہمیں پیچھے مُڑنے کا حکم دیا۔ میں جیسے ہی مُڑا میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ بھارتی فوجی نہیں تھا، کشمیری کا شتکار تھا جس نے ہمیں رائفل کی زد میں لے رکھا تھا۔ وہ ہمیں مکان کے سامنے کی طرف لے آیا۔ یہاں برآمدے میں ایک لالٹین جل رہی تھی اور وہ عورت ایک لاٹھی اُٹھائے برآمدے میں کھڑی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس نے لاٹھی پھینک دی اور حیرت سے انگوری کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم کون ہو.....؟'' اُس نے انگوری کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''میں انگوری ہوں..... کشمیر کی بیٹی..... ایک مجاہدہ.....'' انگوری نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم اُونچے پہاڑوں سے آئے ہیں اور ہمیں پناہ کی تلاش ہے۔''

وہ شخص بھی ہمارے سامنے آ گیا جس نے ہمیں رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔ اُس نے رائفل جھکا لی۔ پہلے انگوری کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اگر یہ انگوری ہے تو تم یقیناً شمروز ہو۔''

''ہاں.....!'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چلو.....اندر چلو!'' اُس شخص نے اشارہ کیا۔

ہم اُس کمرے میں آ گئے۔ بستر پر پڑے ہوئے زخمی نوجوان نے ہماری طرف دیکھا اور پھر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اب میں نے بھی اُسے پہچان لیا تھا۔ وہ ان چالیس مجاہدین میں سے ایک تھا جو اس رات بھارتی فوجی قافلے پر حملہ کرنے کے لئے غار سے روانہ ہوئے تھے۔

سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک دوسری چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ انگوری تو اُس چارپائی پر

اس طرح ڈھیر ہو گئی جیسے اُس کی ہمت اب بالکل جواب دے گئی ہو۔ میں چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ وہ عورت کمرے سے باہر چلی گئی۔ اُس کا شوہر غلام رسول میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اور پھر باتوں باتوں میں یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا شہباز نام کے اس مجاہد کا تعلق کمانڈر عبدالغنی کے گروپ سے تھا۔ فوجی قافلے پر کارروائی کے بعد وہ پہاڑوں میں بھاگ رہے تھے کہ کمانڈر عبدالغنی ہیلی کاپٹر سے چلائی جانے والی گولیوں کی زد میں آ کر شہید ہو گیا۔ اس گروپ کے تین آدمی اور شہید ہوئے تھے۔ وہ خود یعنی شہباز بھی زخمی ہوا تھا، اور پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا دو دن بعد یہاں پہنچا تھا۔ غلام رسول اور اُس کی بیوی اُس کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

غلام رسول نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اس فوجی قافلے کی تباہی کے بعد پوری وادی میں بھارتی فوج کی سرگرمیوں میں تیزی آ گئی تھی۔ مجاہدین کے ٹھکانوں پر حملے کئے جا رہے تھے۔ ہر گاؤں اور بستی میں بے گناہ نوجوانوں کو گرفتار کر کے اُنہیں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

یہ فارم ہاؤس پہلگام سے تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ غلام رسول کے کہنے کے مطابق دو دنوں میں کم از کم تین مرتبہ فوجی اس طرف آ چکے تھے۔ ہر مرتبہ اُنہوں نے مکان کی تلاشی لی تھی اور غلام رسول اور اُس کی بیوی کو ڈرا دھمکا کر گئے تھے۔ شہباز آج شام سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے یہاں آیا تھا۔

ایک دلچسپ اور سنسنی خیز انکشاف یہ ہوا کہ فوجی قافلے کی تباہی کی تمام تر ذمہ داری انگوری اور شمروز پر (یعنی ہم پر) ڈال دی گئی تھی۔ پہاڑوں میں ہوا سے اُڑ جانے والی انگوری کی کالی چادر بھارتی فوجیوں کے ہاتھ آ گئی تھی۔ وہ کالی چادر انگوری کی شناخت تھی جس سے یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اُس فوجی قافلے پر حملہ ہم نے ہی آرگنائز کیا تھا۔

غلام رسول کی بیوی رابعہ چائے بنا کر لے آئی۔ انگوری بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی حالت تو بہت ہی خستہ ہو رہی تھی۔

''ہم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔'' وہ رابعہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے بولی۔ ''بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ اگر کچھ کھانے کو ہو تو.....''

''میں نے چاول چڑھا دیئے ہیں۔'' رابعہ نے جواب دیا۔ ''چائے پی لو! آدھے گھنٹے میں چاول بھی تیار ہو جائیں گے۔''

چائے کے دوران میں شہباز سے باتیں کرتا رہا۔ اُس نے بتایا کہ ہیلی کاپٹر کی فائرنگ سے اُس کے گروپ کے کمانڈر عبدالغنی سمیت پانچ مجاہدین شہید ہوئے تھے۔ دوسروں کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ لوگ محفوظ ٹھکانوں پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے یا نہیں؟

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم نے کھانا کھایا۔ اُبلے ہوئے چاول اور پتلی سی مسور کی دال ہمارے لئے یہ بھی بہت بڑی نعمت تھی۔ کھانے کے بعد رابعہ انگوری کو ساتھ والے کمرے میں لے گئی۔ میں بھی تھکن سے چور ہو رہا تھا اور چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد میری آنکھیں

بند ہونے لگیں۔

میں پتہ نہیں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا۔ ''اُٹھو..... جلدی کرو!'' غلام رسول کہہ رہا تھا۔ ''فوجیوں نے مکان کو گھیرے میں لے لیا ہے۔''

میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا، میری نیند کافور ہو گئی تھی۔ شہباز نے بھی زخمی ہونے کے باوجود رائفل سنبھال لی تھی۔ میں بھی اُٹھ کر دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی اپنی رائفل کی طرف لپکا۔ انگوری بھی دوسرے کمرے سے نکل کر دوڑتی ہوئی اس طرف آ گئی۔ اُس نے بھی اپنی رائفل اُٹھا لی۔

میں نے سامنے والی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ تقریباً پچاس گز دُور ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی ٹرک یا جیپ نظر نہیں آئی۔ جس کا مطلب تھا کہ اس جیپ پر آنے والے فوجیوں کی تعداد چھ سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

غلام رسول کے ہاتھ میں بھی آٹومیٹک رائفل نظر آ رہی تھی۔ گویا اُس نے بھی مقابلے کی ٹھان لی تھی۔ غلام رسول پچھلی کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ شہباز نے سامنے والی کھڑکی کے قریب پوزیشن سنبھال لی۔ میں انگوری کو لے کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ رابعہ بھی رائفل اُٹھائے کھڑی تھی۔ میں نے انگوری کو ایک کھڑکی کے سامنے پوزیشن لینے کو کہا اور خود دوسری طرف کے دروازے کے قریب آ گیا۔ میں نے بڑی آہستگی سے چند انچ کے قریب دروازہ کھولا اور باہر جھانکنے لگا۔ باہر گہری تاریکی تھی اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

دفعتہً فضا فائر کی آواز سے گونج اُٹھی۔ فائر دوسرے کمرے سے ہوا تھا۔ غالباً غلام رسول یا شہباز نے گولی چلائی تھی۔ جواب میں چاروں طرف سے مکان پر گولیوں کی بارش ہونے لگی۔

ہم بھی پوزیشن لے کر فائرنگ کرنے لگے۔ میں دروازے کے قریب زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ کئی گولیاں دروازے پر لگی تھیں۔ سامنے درختوں میں ایک ہیولے کو متحرک دیکھ کر میں نے فائر کر دیا۔ ایک چیخ کی آواز گونجی اور دوڑتا ہوا وہ ہیولا ڈھیر ہو گیا۔

مکان چاروں طرف سے گھیرے میں تھا۔ اس طرف سے میں نے ایک فوجی کو ڈھیر کر دیا تھا، دوسرا رابعہ کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال اُبھرا۔ اگر ہم مکان کے اندر رہے تو آسانی سے مارے جائیں گے۔ جبکہ اس طرف سے کچھ راستہ بن گیا تھا اور ہم باہر نکل سکتے تھے۔

میں دوڑ کر دوسرے کمرے میں آ گیا اور غلام رسول کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

''تم ان لوگوں کو لے کر نکلنے کی کوشش کرو۔ میں اس طرف سے اُنہیں اپنی طرف متوجہ رکھتا ہوں۔'' غلام رسول نے جواب دیا۔ ''شہباز! تم بھی ان لوگوں کے ساتھ جاؤ۔''

''نہیں.....'' شہباز نے جواب دیا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کمانڈر! تم خواتین کو لے کر نکل جاؤ۔ ہم انہیں اس طرف اُلجھائے رکھتے ہیں۔''

میں دوڑ کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ اس طرف اب فائرنگ نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے

رابعہ اور انگوری کو اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ اس طرف کوئی نقل و حرکت بھی دکھائی نہیں دی۔ میں اُن دونوں کو لے کر باہر نکل آیا اور ہم تینوں تیزی سے درختوں کی طرف دوڑنے لگے۔

دفعتہً دائیں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی رابعہ کی چیخ سنائی دی..... وہ لڑکھڑاتی ہوئی گر گئی۔ میں نے مُڑ کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کی۔

''مجھے چھوڑ دو!'' رابعہ کراہی۔ ''مجھے کم از کم چار گولیاں لگی ہیں۔ میں نہیں بچ سکتی۔ تم انگوری کو لے کر نکل جاؤ..... جلدی کرو!''

اس وقت گولیوں کی ایک اور بوچھاڑ آئی۔ گولیاں ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر گئیں۔ میں نے رابعہ کو چھوڑ دیا اور انگوری کے ساتھ درختوں کی طرف دوڑنے لگا۔

فائرنگ مسلسل ہو رہی تھی۔ دفعتہً انگوری کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑا گئی..... میں نے مُڑ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے کھینچتا ہوا دوڑنے لگا.....

گولیوں کی ایک اور بوچھاڑ آئی۔ اور اس مرتبہ انگوری کے ساتھ میرے بھی منہ سے چیخ نکل گئی..... میری بائیں ران میں گولی لگی تھی اور انگوری کا تو جسم چھلنی ہو گیا تھا..... وہ تیورا کر گری۔

''جج..... جاؤ..... بھاگ جاؤ.....'' وہ کراہتے ہوئے رُک کر بولی۔ ''مم مجھے چھوڑ دو..... اپنے آپ کو..... بچاؤ..... کشمیر کو تمہاری..... ضرورت ہے اور کشمیر..... ضرور..... آزاد ہو گا..... خدا..... حافظ.....''

انگوری خاموش ہو گئی..... ہمیشہ کے لئے..... کشمیر کی بیٹی نے کشمیر کی آزادی کے لئے اپنی جان دے دی تھی.....

مجھ پر جنون سا طاری ہو گیا۔ میں نے اندھا دُھند فائرنگ شروع کر دی۔ ایک چیخ سنائی دی۔ میں وہاں رُکا نہیں، لنگڑاتا ہوا درختوں کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

اور پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا اور میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... غلام رسول کا مکان شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ ایک اور دھماکہ ہوا اور آگ کا وہ گولہ غبارے کی طرح پھٹا اور جلتے ہوئے ٹکڑے چاروں طرف بکھرنے لگے۔

○

میں پہلگام کے اُوپر سے ہوتا ہوا رات بھر پہاڑوں میں سفر کرنے کے بعد بٹا کھو کی طرف نکل آیا۔

ران پر لگنے والی گولی گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ غلام رسول کے مکان کی تباہی کے بعد دشمن فوجیوں نے فائرنگ کرتے ہوئے میرا پیچھا کیا تھا مگر میں تاریکی سے فائدہ اُٹھاتا ہوا نکل گیا اور پہاڑوں میں ان سے بہت دُور نکل گیا تھا اور پھر ایک جگہ رُک کر میں نے اپنی شرٹ اتار لی اور اُسے پھاڑ کر پٹیاں سی بنا لیں۔ پتلون نیچے کر کے میں نے زخم پر پٹیاں کس لیں اور

پتلون چڑھالی۔ اس طرح خون بہنا رُک گیا تھا مگر چلنے میں کافی تکلیف ہو رہی تھی۔

میں صبح کی روشنی پھیلنے سے کچھ ہی دیر پہلے بٹا کھو کی نواحی پہاڑیوں میں پہنچا۔ رات بھر چلتے رہنے سے میری حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ مجھے فوری طور پر علاج کی ضرورت تھی۔ لیکن میں کسی بستی میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ بھارتی فوجی وادی کے چپے چپے میں پھیل گئے تھے۔

تقریباً دو گھنٹے بٹا کھو کی نواحی پہاڑیوں میں رُکنے کے بعد میں نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ اس مرتبہ میں دریائے لدھر کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ٹانگ کے زخم کی وجہ سے مجھے چلنے میں خاصی دُشواری پیش آ رہی تھی۔ لیکن میں چلتا رہا اور شام کے وقت اننت ناگ سے چند میل دُور بھوبن نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کے نواح میں پہنچ گیا۔

بھوک اور تھکن سے میری بری حالت ہو رہی تھی۔ زخم سے بھی رہ رہ کر خون رِسنے لگا تھا۔ لیکن میں نے اپنا سفر جاری رکھا تھا۔

اُس وقت شام کا دھندلکا پھیل گیا تھا۔ میرے سامنے مرغزار پھیلا ہوا تھا اور تقریباً نصف میل کے فاصلے پر بھوبن نامی بستی تھی۔ میں ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے بستی میں داخل ہونا چاہئے یا نہیں؟ کہ دفعتہً میں گھنٹیوں کی آواز سن کر چونک گیا۔ میں نے پتھروں کی آڑ سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا اور میرا اندازہ درست نکلا۔

وہ بھیڑوں کا ایک ریوڑ تھا۔ بھیڑوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیاں فضا میں عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ خچر پر سوار ایک ادھیڑ عمر آدمی بھیڑوں کو اِدھر اُدھر سے گھیر کر سیدھے راستے پر لیجانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے چیخ کر اُس شخص کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اُس نے خچر کا رُخ فوراً ہی میری طرف موڑ دیا اور قریب آ کر خچر سے اُتر گیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ چونک گیا۔ میں نے اُسے اپنا نام نہیں بتایا لیکن میری حالت دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ میں کوئی مجاہد ہی ہو سکتا ہوں۔

''بستی میں جانا تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔'' اُس بوڑھے نے کہا۔ ''تم یہیں رُکو! میں تمہارے لئے کوئی بندوبست کرتا ہوں۔''

وہ بوڑھا خچر پر سوار ہو کر بھیڑوں کو ہانکتا ہوا **چلا گیا۔**

اُس کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے **بعد ہوئی تھی۔ وہ میرے لئے نہ صرف** کھانا لے کر آیا تھا بلکہ مرہم بھی لے آیا تھا۔ میں نے پہلے **زخم پر مرہم لگا کر پٹی باندھی اور پھر روٹی** کھانے لگا۔ وہ تین موٹی موٹی روٹیاں لے کر آیا تھا۔ **ساتھ میں مرچوں کا اچار تھا۔ میں** نے دو روٹیاں کھالیں اور تیسری بچا کر رکھ لی۔

اُس بوڑھے سے بڑے سنسنی خیز انکشافات ہوئے تھے۔ کل صبح دو مجاہدین پہلگام میں ایک سکھ گھرانے سے پکڑے گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں ہندو فوجیوں نے مسلمان مجاہدین کو پناہ دینے کے الزام میں شہر کے چالیس سکھوں کو ایک جگہ جمع کر کے گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔

اُس بوڑھے کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ اننت ناگ میں بھی بڑے زوردار ہنگامے ہو رہے تھے۔ یہاں مجاہدین نے ایک فوجی چوکی بھی تباہ کر دی تھی۔ مجاہدین کی تلاش میں بھارتی فوجی دستے قرب و جوار کی چھوٹی چھوٹی بستیوں پر بھی چڑھائی کرتے رہتے تھے۔

اُس بوڑھے چرواہے نے مہربانی یہ کی کہ اپنا خچر مجھے دے دیا اور میں اُس کا شکریہ ادا کر کے رات ہی رات سفر کرتا ہوا درّہ بنیال سے ہوتا ہوا ہنگ پورہ کی طرف نکل آیا۔

سطح سمندر سے تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع یہ بستی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ میں دن کے گیارہ بجے کے قریب یہاں پہنچا تھا۔ رات بھر سردی میں ٹھٹھرتا رہا اور اب چمکتی ہوئی تیز دُھوپ میرے برہنہ جسم کو جھلسائے دے رہی تھی۔

ہنگ پورہ سے کچھ پہلے چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ میں کچھ دیر پہاڑیوں میں کھڑا بستی کا جائزہ لیتا رہا اور پھر خچر کا رُخ بستی کی طرف موڑ دیا۔

پوری وادی میں کوئی جگہ بھارتی بھیڑیا صفت فوجیوں کی سرگرمیوں سے محفوظ نہیں تھی۔ فوجی دستے اُس بستی پر بھی چڑھائی کرتے رہتے تھے لیکن پچھلے دو دن سے فوج کی کسی پارٹی نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا۔

بستی کے لوگوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مجھے بشیر احمد نامی ایک شخص کے گھر پر پہنچا دیا گیا۔ سب سے پہلے میرے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا اور پھر ایک بوڑھا میرے زخم کا معائنہ کرنے لگا۔

عبدالحفیظ حکیم تھا۔ میرا زخم دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ میں تین دن سے بھاگ دوڑ کر رہا تھا اور اس بھاگ دوڑ اور کوئی علاج نہ ہونے کی وجہ سے بھی زخم بگڑنے لگا تھا۔

''تمہیں علاج کے ساتھ آرام کی بھی ضرورت ہے بیٹا!'' حفیظ نے کہا۔ ''اگر زخم زیادہ بگڑ گیا تو تمہاری یہ ٹانگ مفلوج ہو جائے گی۔''

''آرام.....'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''آرام تو اس وقت ہی ملے گا جب ہم ہندو غاصبوں کو اس وادی سے نکال دیں گے۔''

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں..... ہر کشمیری مسلمان کا عہد یہی ہے لیکن.....'' حکیم حفیظ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ''لیکن ان غاصبوں کو وادی سے نکالنے کے لئے اپنے ہاتھوں پیروں کا تندرست ہونا ضروری ہے۔ تم چند روز یہاں رہو! میں تمہارا علاج کروں گا۔ تم انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

حکیم حفیظ نے جڑی بوٹیوں سے تیار کیا ہوا ایک مرہم میرے زخم پر باندھ دیا۔

مجھے اُس بستی میں دو دن گزر گئے۔ اس زخم اور مسلسل بھاگ دوڑ کی وجہ سے اب میں اپنے آپ میں کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ حکیم حفیظ روزانہ میری پٹی تبدیل کر رہا تھا لیکن ظاہر ہے

دو دن میں زخم ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے مجھے چند روز آرام کرنے کو بھی کہا تھا۔ لیکن تیسرے روز شام کے وقت اچانک ہی بھارتی فوجیوں کے ایک دستے نے گاؤں پر ہلہ بول دیا۔ اُنہیں اطلاع ملی تھی کہ بستی والوں نے کسی زخمی مجاہد کو پناہ دے رکھی ہے۔

میں کسی نہ کسی طرح موقع پا کر اُس بستی سے نکل گیا اور پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ اُس وقت میرے جسم پر ایک پاجامہ اور کرتہ تھا۔ میری ٹانگ میں رہ رہ کر ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ ایک قدم اُٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن میں پہاڑوں میں رات بھر سفر کرتا رہا۔ کبھی چند منٹ آرام کرنے کے لئے بیٹھ جاتا اور پھر چل پڑتا۔

اس بستی میں رہتے ہوئے میں نے اپنا اصل نام نہیں بتایا تھا لیکن بستی والوں سے جو باتیں معلوم ہوئی تھیں اُن سے پتہ چلا تھا کہ انگوری ماری گئی تھی اور شمروز زخمی ہو کر فرار ہو گیا تھا۔ وہ بھارتی فوج کو سب سے زیادہ مطلوب تھا اُس کے ساتھ ہی فوج کو کمانڈر محبّ اللہ، کمانڈر الیاس اور دوسرے نامور مجاہد لیڈروں کی بھی تلاش تھی۔

میں نے راہِ فرار اختیار نہیں کی تھی۔ مجھے کسی ایسی منزل کی تلاش تھی جہاں چند روز آرام کر سکوں اور مجاہدین کی ایک نئی طاقت جمع کر کے بھارتی غاصبوں کے خلاف از سرِ نو کارروائیاں شروع کر سکوں۔

رات بیت گئی..... سردی کی وجہ سے میرے زخم کی تکلیف بھی بڑھ گئی تھی مگر میں سورج نکلنے کے بعد بھی چلتا رہا۔ میں اُس وقت دریا کے ساتھ ساتھ ہی سفر کرتا رہا۔ بھوک، تھکن اور زخم کی تکلیف سے میری حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اور بالآخر میری ہمت جواب دے گئی..... میں لڑکھڑا کر گرا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا چلا گیا..... اور اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔

مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک غار کے پتھریلے فرش پر پڑے ہوئے پایا۔ میرے اُوپر کوئی جھکا ہوا تھا..... میری آنکھوں کے سامنے دُھند پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اُسی لمحہ ایک کھنکتی ہوئی مترنم سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''شکر ہے تم ہوش میں تو آئے..... میں تو پریشان ہو گئی تھی۔''

میں سر جھٹکنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے سے دُھند چھٹنے لگی اور وہ چہرہ واضح ہوتا چلا گیا.....

وہ وجیہہ و ملیح چہرہ بہت ہی حسین تھا۔ میرے ذہن میں انگوری کا خیال اُبھرا۔ لیکن وہ انگوری نہیں تھی۔ انگوری نے ماتھے پر کبھی بندیا نہیں لگائی تھی۔ اور پھر مجھے یاد آ گیا کہ انگوری تو اب اس دنیا میں ہی نہیں رہی تھی.....

وہ بہت حسین تھی۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جن میں ستاروں جیسی چمک تھی اور ماتھے پر سرخ بندیا بہت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

میں غور سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے حواس بحال ہو رہے تھے۔ اُس کے ماتھے پر چمکتی ہوئی بندیا دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ہندو تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی..... میں پلک جھپکے بغیر اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

○○○

اُس چہرے اور اُس آواز نے مجھے مسحور سا کر دیا اور ایک لمحہ کو میں یہ بھول گیا کہ میں کون ہوں؟ کس حال میں ہوں اور کہاں ہوں.....؟

''کیسے ہو جی.....؟'' وہ جلترنگ سی آواز پھر میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''تم جتنی دیر بے ہوش رہے ہم نے بھگوان سے پرارتھنا کی کہ تم ہوش میں آ جاؤ۔ سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ دل سے مانگی ہوئی دُعا ضرور پوری ہوتی ہے۔ تم ہوش میں آ گئے۔ میری دُعا پوری ہو گئی۔ اب تم چنتا مت کرو! بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔''

میں چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اُٹھنے کی کوشش کی تو درد کی ایک شدید لہر برقی رو کی طرح میرے بدن میں پھیلتی چلی گئی۔ میں بے اختیار کراہ اُٹھا اور دوبارہ پتھریلے فرش پر لیٹ گیا۔ میری زخمی ٹانگ میں شدید درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ میں نے دانت بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں اور ذہن پر زور دے کر سوچنا لگا کہ میں کہاں ہوں؟ میری ٹانگ کیسے زخمی ہوئی تھی؟

میں اور انگوری فوجی قافلے کی تباہی کے بعد دو تین دن اُونچے پہاڑوں میں سفر کرنے کے بعد پہلگام سے چند میل دُور غلام رسول نامی ایک کاشتکار کے فارم ہاؤس میں پہنچے تھے جہاں ایک زخمی مجاہد پہلے ہی موجود تھا۔ اور پھر اُسی رات بھارتی فوجیوں نے اُس فارم پر حملہ کر دیا..... ہم مقابلے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے۔ غلام رسول اور اُس کی بیوی نے ہمیں وہاں سے بھگا دینا چاہا تھا کیونکہ اُن کے خیال میں میری اور انگوری کی زندگیاں سب سے اہم تھیں اور کشمیری قوم کو ہماری ضرورت تھی۔

فارم ہاؤس سے فرار کی کوشش میں انگوری بھارتی فوجیوں کی گولیوں سے چھلنی ہو گئی اور میری ٹانگ میں بھی گولی لگی۔ لیکن میں وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں دو دن تک پہاڑوں میں بھٹکتا رہا۔ مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں میں چند روز آرام کر سکوں اور اپنے بکھرے ہوئے ساتھیوں سے رابطہ کر کے اُنہیں ایک جگہ جمع کر سکوں۔ لیکن مجھے ایسی کوئی جگہ نہیں ملی۔ ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر بستی میں بھارتی فوجی موجود تھے۔ مجھے جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی تلاش کیا جا رہا تھا۔

میری ٹانگ کا زخم پھیلتا جا رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر طبی امداد نہ ملی تو زہر پھیل جائے گا اور ٹانگ مفلوج ہو جائے گی۔ میں کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں پہاڑوں میں بھٹکتا رہا اور بالآخر میری ہمت جواب دے گئی اور میں گر کر بے ہوش ہو گیا..... اور اب جو ہوش آیا تو نہ صرف اپنے آپ

کو ایک غار میں پڑے ہوئے پایا بلکہ ایک حسینہ بھی میرے اُوپر جھکی ہوئی تھی۔

میں اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کراہ اُٹھا تو اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ میں نے اپنے آپ کو گھسیٹ کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔ میری دونوں ٹانگیں آگے کو پھیلی ہوئی تھیں۔ جس ٹانگ میں گولی لگی تھی وہ لکڑی کے تختے کی طرح اکڑی ہوئی تھی..... پتلون کا وہ حصہ خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ خون سوکھ گیا تھا اور پتلون کا کپڑا بھی اکڑا ہوا تھا۔

''تم بہت گھائل ہو جی.....'' وہ حسینہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیسے لگی گولی تمہاری ٹانگ میں؟''

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ مجھے گولی لگی ہے؟'' اپنی تکلیف کے باوجود اُس کی بات سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''ہم نے دیکھا تھا جی.....'' اُس نے نظریں جھکاتے ہوئے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم تو وید جی کو بلانے جا رہے تھے مگر اس کارن ہم نے ارادہ بدل دیا۔

''کس کارن؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تم مسلمان ہو جی.....'' اُس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔ ''اگر ہم وید جی کو بلا لاتے تو وہ تمہیں سینکوں کے حوالے کر دیتے۔ اس لئے ہم نے وید جی کو نہیں بلایا اور تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے رہے۔ اب بتاؤ جی..... ہم تمہارا کریں کیا؟ تمہارا کشٹ ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔''

میں گہری نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ ہندو تھی اور اُس نے یہ بھی جان لیا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ لیکن اس کے باوجود اُسے مجھ سے ہمدردی ہو رہی تھی اور میری تکلیف اُس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اُس نے کسی وید کو اس لئے نہیں بلایا تھا کہ وہ مجھے فوجیوں کے حوالے کر دے گا۔

''تم کون ہو..... یہ جگہ کون سی ہے اور مجھے اس غار میں کون لایا تھا؟'' میں نے ایک وقت میں کئی سوال کر ڈالے۔

''ہمارا نام سیتا ہے جی..... سیتا دیوی۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''یہ جگہ ڈوڈا سے پانچ کوس دُور ہے۔ وہ اُدھر ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ چند گھر ہیں۔ میرا ماما وہاں رہتا ہے۔ اُس کی زمین ہے۔ سیب کے باغ ہیں اور وہ بستی کا مکھیا بھی ہے۔ ہم جے پور سے آئے ہوئے ہیں جی.....'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ہم سیر کو اس طرف آئے تھے لیکن تمہیں وہاں بے ہوش پڑے دیکھا۔ آس پاس اور کوئی نہیں تھا۔ ہم تمہیں اُٹھا کر اس غار میں لے آئے اور ندیا سے پانی لا لا کر تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔''

''مجھے تو یہاں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی..... تم پانی کس میں لائی تھیں؟ اور ندیا یہاں سے کتنی دُور ہے؟'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ندیا ادھر نیچے کی طرف ہے جی.....'' اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''ہم ندیا پر جا کر اپن ساڑھی کا پلو بھگو لیتے تھے اور یہاں آ کر تمہارے منہ پر نچوڑ دیتے تھے۔ پر تم بہت بے ہوش تھے اور جانتے ہو دو گھنٹوں بعد ہوش میں آئے ہو۔''

''تم ہندو ہو اور تم نے یہ بھی جان لیا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود تم نے بستی والوں کو میرے بارے میں اطلاع نہیں دی۔'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''تم تو پہلے ہی گھائل ہو.....'' وہ بولی۔ ''بستی والے تمہیں سینکوں کے حوالے کر دیتے اور وہ تمہیں مار دیتے۔''

''اور تم نہیں چاہتیں کہ میں مار دیا جاؤں۔'' میں نے ایک بار پھر اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''ہم نے جے پور میں سنا تھا کہ کشمیر میں مسلمان ہندوؤں پر بہت ظلم کرتے ہیں۔ ہمارے پتا جی تو ہمیں یہاں آنے نہیں دیتے تھے لیکن ہم زبردستی آ گئے۔ یہاں ایک مہینہ سے ہیں اور جو کچھ دیکھا وہ بہت افسوسناک ہے جی۔''

''یعنی مسلمان ہندوؤں پر ظلم ڈھا رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''نہیں جی.....'' اُس نے جواب دیا۔ ''بات تو اس کے اُلٹ ہے جی..... ہمارے ماما کی بستی میں زیادہ گھر ہندوؤں کے ہیں جی۔ پانچ چھ گھر مسلمانوں کے بھی تھے۔ ہندوؤں نے اُنہیں ڈرایا دھمکایا تو وہ اپنے گھر اور اپنی زمینیں بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ اب مسلمانوں کا صرف ایک گھر ہے۔ چاچا قربان علی..... بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ بوڑھا آدمی ہے۔ ایک جوان بیٹی ہے۔ میرے ماما سے اُس کی بچپن کی دوستی ہے اس لئے بستی کے ہندو چاچا قربان علی کو تنگ نہیں کرتے۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''ادھر مسلمانوں پر بہت ظلم ہوتا ہے۔ جموں میں، کشمیر میں، ہر جگہ اُنہیں تنگ کیا جاتا ہے۔ سینک اُن کے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔ ان پر گولیاں چلاتے ہیں۔ مسلمان عورتوں کو بالوں سے پکڑ کر سڑکوں پر گھسیٹتے ہیں۔ ان کا بلادکار کرتے ہیں۔ ڈوڈا میں ہم نے خود دیکھا ہے جی۔''

''بلادکار کرتے ہوئے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی.....'' وہ جلدی سے بولی۔ ''عورتوں کو بالوں سے پکڑ کر سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اور اُنہیں ٹھوکریں مارتے ہوئے۔''

''گویا تمہیں کشمیر کے مسلمانوں سے ہمدردی ہے..... کیا تم نے کبھی اپنے ماما سے یہ بات کہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک بار کہی تھی جی جب ہم شروع میں یہاں آئے تھے۔'' سیتا دیوی نے جواب دیا۔ ''ماما نے ہمیں ڈانٹ دیا تھا کہ آئندہ ہم محتاط رہیں اور کسی کے سامنے ایسی باتیں نہ کریں۔ پر میں وہ

دن کیسے بھول سکتی ہوں جی جب چار لڑکے ڈوڈا کی طرف سے پہاڑیوں میں بھاگتے ہوئے اس طرف آ گئے تھے اور سینکوں نے رام مندر والے چشمے کے قریب اُنہیں گھیر کر گولیوں سے بھون دیا تھا۔ ہم نے سب کچھ دیکھا تھا۔ مگر ماما سے کچھ نہیں کہا۔ ہمیں بہت دُکھ ہوا تھا۔ ہم ماما سے اپنے دُکھ کا اظہار کرتے تو وہ ہمیں بڑے زور سے ڈانٹتے۔ اور اب.....'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اور اب تم آ گئے ہو۔ بہت گھائل ہو۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم تمہارا کیا کریں؟''

میں نے پہلی مرتبہ غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ بھرا بھرا گداز جسم، لانبا قد، چہرے کے نقوش بڑے غضب کے۔ اُس نے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بلاؤز کا وی شیپ کا گریبان خاصا فراخ تھا۔ وہ گھٹنوں پر کسی قدر آگے کو جھکی بیٹھی تھی۔ میری نظریں اُس کے گریبان کے اندر بھٹکنے لگیں اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی..... اُس نے میری نظروں کو تاڑ لیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''تم میری مدد کرنا چاہتی ہو سیتا؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم چاہتی ہو کہ میں بھارتی سینکوں کے ہتھے نہ چڑھوں؟''

''ہاں..... میں یہی چاہتی ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری مدد کس طرح کروں..... تمہارا علاج نہ ہوا تو.....''

''تم ایک طرح سے میری مدد کر سکتی ہو۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''تم نے بتایا تھا کہ تمہاری بستی میں ایک مسلمان گھرانہ بھی ہے اور تمہارا ماما اس بوڑھے مسلمان قربان علی کا بچپن کا دوست ہے۔''

''ہاں.....'' سیتا دیوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا تم قربان علی کو میرے بارے میں بتا سکتی ہو اس طرح کہ کسی اور کو پتہ نہ چلے؟'' میں نے کہا۔

''ارے ہاں.....'' سیتا دیوی بولی۔ ''چاچا قربان علی کو تو ہم بھول ہی گئے تھے۔ وہ بھی حکمت جانتا ہے۔ ہم ابھی جا کر اُس کو بتاتے ہیں۔'' وہ ایک دم جانے کو تیار ہو گئی۔

''ابھی رُک جاؤ.....'' میں نے کہا۔ ''مجھے بڑی شدت سے پیاس لگ رہی ہے۔ کسی طرح مجھے ایک گھونٹ پانی پلا دو۔''

''پانی..... ہم ابھی لاتے ہیں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھ کر غار سے باہر چلی گئی۔

میں ایک ہاتھ سے اپنی زخمی ٹانگ کو دبانے لگا جس میں شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ میں بڑی مشکل سے تکلیف ضبط کئے ہوئے تھا۔ سیتا دیوی کے جانے کے بعد میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ غار زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پندرہ بیس آدمی اُس میں آسانی سے سما سکتے تھے۔ ایک طرف سے اُس کی چھت اس قدر نیچی تھی کہ جھک کر چلنا پڑتا تھا اور دوسری طرف بیس بائیس فٹ تک اُوپر

چلی گئی تھی۔ ایک طرف جہاں چھت نیچے تھی دیوار کے ساتھ تین پتھر چولہے کی طرح رکھے ہوئے تھے جس میں جلے ہوئے کوئلے اور ایک دو ادھ جلی لکڑیاں بھی پڑی تھیں۔ وہ دیوار دھویں سے کالی ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ غار باقاعدہ رہائش کے لئے بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کبھی مجاہدین نے یہاں ٹھکانہ بنا رکھا ہو.....

میں ابھی اس غار کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سیتا دیوی غار میں داخل ہوئی۔ اُس نے ساڑھی کا پلو سمیٹ کر دونوں ہاتھوں میں اُٹھا رکھا تھا اور ہاتھ سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی میرے قریب آ کر گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گئی اور ساڑھی کا بھیگا ہوا پلو میرے منہ کے قریب لے آئی۔

ساڑھی کا پلو پانی سے تر تھا۔ بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ میں نے منہ کھول دیا۔ وہ بھیگا ہوا کپڑا نچوڑنے لگی۔ پانی کے قطرے حلق سے ٹپکنے لگے۔ پھر میں نے اُس کی ساڑھی کا پلو ہاتھ میں لے لیا اور اُسے منہ میں ڈال کر چوسنے لگا۔

میری پیاس پوری طرح تو نہیں بجھی لیکن حلق تر ہو گیا تھا اور وہ بے چینی ختم ہو گئی تھی جو میں کچھ دیر پہلے محسوس کر رہا تھا۔

''اب ہم جائیں؟'' اُس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''ہم چاچا قربان علی کو تمہارے بارے میں بتا کر اُن سے کوئی دوا لے لیں گے۔''

''ہاں..... جاؤ لیکن..... میں تمہیں اپنے زخم کے بارے میں اچھی طرح سے بتا دُوں۔'' میں نے کہا۔ ''گولی گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اگر گولی اندر رہ جاتی تو شاید میں زندہ نہ بچ سکتا۔ علاج نہ ہونے اور دو تین دن تک مسلسل چلتے رہنے سے زخم بگڑ گیا ہے اور.....''

''ہم نے تمہارا زخم دیکھا تھا۔'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''ہم چاچا قربان علی کو اچھی طرح سمجھا دیں گے۔ اور تم ادھر ہی رہنا جی..... باہر مت نکلنا۔ بستی کا کوئی مورکھ گھومتا ہوا ادھر نکل آیا اور اُس نے تمہیں دیکھ لیا تو ہماری ساری محنت رائیگاں جائے گی۔''

''ٹھیک ہے..... میں اس غار سے باہر نہیں نکلوں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اُٹھ کر باہر کی طرف جانے لگی۔ دھانے کے قریب رُک کر اُس نے میری طرف دیکھا اور پھر باہر نکل گئی۔

سیتا دیوی کے جانے کے بعد میں دیر تک اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ہندو تھی لیکن اُسے کشمیری مسلمانوں سے ہمدردی تھی۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ جموں اور کشمیر میں ہندوؤں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ لیکن یہاں آ کر اُسے معاملہ اس کے برعکس نظر آیا۔ مسلمان ہندوؤں پر نہیں، ہندو مسلمانوں پر مظالم ڈھا رہے تھے۔ اُنہیں اُن کے گھروں سے بے دخل کر رہے تھے۔ یہ بڑی اچھی بات تھی کہ سیتا نے حقیقت کا اعتراف کر لیا تھا۔ سارے ہی ہندو کٹر اور ظالم نہیں تھے۔ ایسے بھی تھے جو حقیقت کا ادراک رکھتے تھے لیکن اُن کی تعداد آٹے میں نمک کے

برابر تھی اور اُن کی آواز کوئی اثر نہیں رکھتی تھی۔

میں نے سیدھا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی تو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میری پتلون کی بیلٹ اور اُوپر کا ہُک کھلا ہوا تھا۔ سیتا دیوی نے میری پینٹ نیچے کھینچ کر ٹانگ کے زخم کا جائزہ لیا تھا، پھر پینٹ تو اُوپر کھینچ دی تھی مگر ہُک اور بیلٹ نہیں لگا سکی تھی۔

میں نے پینٹ کو مزید اوپر کھینچ کر ہُک اور بیلٹ لگایا اور ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ غار کے باہر دُھوپ چمک رہی تھی اور ہوا بھی تیز چل رہی تھی۔ غار سے بہت دُور نظر آنے والے درخت جھوم رہے تھے۔ دفعتہً پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سن کر میں چونک گیا..... سیتا دیوی کو گئے ہوئے بمشکل دس منٹ ہوئے تھے۔ وہ اتنی جلدی واپس نہیں آ سکتی تھی۔ ہوسکتا ہے یہ کوئی اور ہو..... وہ کوئی بھی ہو اگر غار میں آ گیا تو میرے لئے بڑی مشکل پیدا ہو سکتی تھی۔ میں تو اپنا دفاع کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

میں نے ایک بار پھر غار میں اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا اُس طرف بڑھنے لگا جہاں پتھروں سے چولہا بنا ہوا تھا۔ چولہے سے تقریباً پانچ فٹ بائیں طرف دیوار کا ایک کونا قدرے آگے کو نکلا ہوا دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید اس طرف چھپنے کی کوئی جگہ ہو۔

اُس طرف بڑھتے ہوئے مجھے اچانک ہی اپنی رائفل کا خیال آ گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ رائفل غار میں کہیں بھی نظر نہیں آئی..... مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ گر کر بے ہوش ہونے سے پہلے رائفل میرے کندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔

پتھر لڑھکنے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ یہ آواز غار کے دہانے کے قریب سے سنائی دی تھی۔ میں اپنے آپ کو تیزی سے گھسیٹنے لگا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ آگے کو نکلی ہوئی دیوار کے پچھلی طرف ایک لمبی سی دراڑ تھی اور وہ دراڑ اس قدر کشادہ تھی کہ تین چار آدمی پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ اندر کسی طرف سے مدھم سی روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔

اُس دراڑ میں ایک طرف لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس کے اُوپر ہی میری رائفل بھی پڑی ہوئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے رائفل اُٹھا لی اور اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے مزید پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ تقریباً پانچ گز آگے دراڑ بائیں طرف مُڑ گئی تھی۔ میں بھی اُس طرف گھوم گیا۔ موڑ کے دوسری طرف دراڑ تنگ تھی اور تقریباً دو سو گز آگے جا کر بند ہو گئی تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور رائفل سنبھال لی۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے خیال اُبھر رہے تھے۔ سیتا نے بتایا تھا کہ بھارتی سینک اس طرف گھومتے رہتے تھے۔ ہوسکتا ہے انہیں کوئی شبہ ہو گیا ہو یا بستی والوں کو بھنک پڑ گئی ہو۔ اگر وہ لوگ غار کے اندر آ گئے تو میرے لئے فرار کے تمام راستے بند ہو جاتے۔ یہ غار میرے لئے چوہے دان بن گیا تھا.....

غار میں اب دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن قدموں کی وہ

آوازیں بھاری نہیں تھیں اور چند سیکنڈ بعد ہی میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔

وہ نوعمر لڑکے تھے اور اُن کی تعداد چار یا پانچ رہی ہوگی۔ وہ غار میں اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ اُن کی آواز غار میں گونجتی تو وہ مزے لینے کے لئے اور بھی زور سے چیخنے لگتے۔

اب میں صورتحال سمجھ گیا تھا۔ بستی کے نوعمر لڑکے شاید کھیلتے ہوئے اس طرف آ نکلے تھے۔ مجھے اپنا لڑکپن یاد آ گیا..... میں بھی تو ہم عمر لڑکوں کے ساتھ اپنے قصبے کے نواح میں پہاڑیوں پر گھومتا رہتا تھا۔ یہ لڑکے بھی یقیناً کھیلنے ہی کے لئے نکلے ہوئے تھے لیکن اگر اُنہیں غار میں میری موجودگی کا احساس ہوگیا تو میری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

دفعتہً ایک آواز سن کر میں چونک گیا..... وہ آواز لڑکوں کی آوازوں سے مختلف تھی۔ وہ آواز دوبارہ سنائی دی تو مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ اُس لڑکی کی عمر بھی بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ گاؤں دیہات کا معاشرتی ماحول اب بھی وہی تھا جو برسوں پہلے تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے رات کو گلیوں میں دیر تک ٹیلو اور لکن میٹی کھیلتے تھے۔ ماں باپ کو کوئی فکر یا پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ یہ لڑکی بھی اگر اپنی عمر کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی بستی سے باہر آ گئی تھی تو اُس کے ماں باپ کو یقیناً کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

لیکن چند سیکنڈ بعد ہی ایک اور آواز سن کر میں اُچھل پڑا۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے منہ چوما گیا ہو..... پھر لڑکی کی منمناتی ہوئی آواز بھی سنائی دی۔

''رمیش! چھوڑ دو مجھے..... میں پتا جی سے تمہاری شکایت کرُدوں گی۔''

''کر دینا شکایت.....'' یہ آواز غالباً رمیش کی تھی۔ ''آج تو تم قابو آ گئی ہو لکشمی۔ ہم تمہارے چمے ہی نہیں کچھ اور بھی لیں گے۔''

''چھوڑ دو مجھے..... میں ابھی جا کر پتا جی سے شکایت کرتی ہوں۔'' اس مرتبہ لڑکی کی آواز میں کسی قدر غصہ بھی شامل تھا۔

''تم یہاں سے جاؤ گی تو شکایت کرو گی نا۔'' رمیش کی آواز سنائی دی۔ اُس کی آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اُس کی عمر پندرہ سال ضرور رہی ہوگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اس کی چڈی اُتارو سندر..... میں دیکھتا ہوں یہ کیسے شکایت کرے گی اپنے پتا جی سے۔''

میرا خون کھول کر رہ گیا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ چار پانچ لڑکے لکشمی نامی اُس لڑکی کو دھوکے سے یہاں لے آئے تھے اور اب اُس کے ساتھ شیطانی کھیل کھیلنا چاہتے تھے اور وہ لڑکی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہی تھی۔

''چھوڑ دو مجھے..... میں کھیا کاکا سے تمہاری شکایت کروں گی۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''کھیا کاکا تمہاری کھال ادھیڑ دیں گے۔''

''ہم برہمن ہیں۔ اور تم نچلی ذات کے موچی کی بیٹی۔'' یہ رمیش ہی کی آواز تھی۔ ''تمہاری

ت کا یقین کون کرے گا؟ ہم جب کھیا کاکا کو بتائیں گے کہ تم نے مجھ سے دو روپے لینے کے ئے ہمارے سامنے اپنے کپڑے اُتار دیئے تھے تو وہ ہماری بات کو کبھی نہیں جھٹلائیں گے۔ اگر تم ر مچاؤ گی تو یہاں تمہاری آواز بھی کوئی نہیں سنے گا۔''

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ یہ تھی ہندوؤں کی گندی ذہنیت۔ بڑے تو بڑے عمر لڑکے بھی اُونچی ذات کا حق استعمال کرنا سمجھتے تھے۔ اُونچی ذات کے ہندو نیچی ذات کے ندوؤں کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ اُنہیں ملیچھ اور ناپاک سمجھتے تھے۔ وہ اُنہیں اپنے مندروں میں نہیں گھسنے دیتے تھے کہ گھر ناپاک ہو جائے گا۔ مگر جنسی بھوک مٹانے کے لئے نچلی ت کی عورتوں کو روندتے تھے تو اُنہیں کوئی شرم نہیں آتی تھی۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھا کھولتا رہا..... اُس لڑکی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں سامنے آتا تو ں تمام لڑکوں کو موت کے گھاٹ اُتارنا پڑتا۔ اُن میں سے ایک بھی بچ کر نکل جاتا تو میری دگی خطرے میں پڑ جاتی۔ میں اُس لڑکی کو تو برباد ہونے سے بچا لیتا مگر وہ بستی میں واپس جا کر رے بارے میں بتاتی تو بستی والے اس طرف دوڑ پڑتے اور میرا زندہ بچنا مشکل ہو جاتا۔ ں دوڑ تو کیا چل بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر میری ٹانگ ٹھیک ہوتی تو میں ان لڑکوں کو ڈرا دھمکا کر بھگا تا اور خود یہاں سے کسی اور طرف نکل جاتا۔

''اوہ..... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ایک اور آواز سن کر میں اُچھل پڑا۔ وہ سیتا دیوی کی آواز تھی۔

''دیدی..... دیدی..... مجھے بچا لو ان سے۔'' اُس لڑکی کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''یہ ل مجھے دھوکے سے یہاں لے آئے تھے اور.....''

''یہ جھوٹ بولتی ہے سیتا دیوی!'' ایک لڑکے نے چیختے ہوئے اُس کی بات کاٹ دی۔ یہ بش کی آواز تھی اور میرا خیال تھا کہ وہی لڑکوں کی اس ٹولی کا سرغنہ تھا۔ ''یہ جھوٹ بولتی ہے یدی! یہ خود ہمیں یہاں لے کر آئی تھی۔''

''میں سب سمجھتی ہوں۔ تمہاری بدمعاشیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ آج میں ماما سے کہہ کر تمہارا روبست کرتی ہوں۔ شرم آنی چاہئے تمہیں۔'' یہ سیتا دیوی کی آواز تھی۔ ''چلو بھاگو تم لوگ ہاں سے۔ اور لکشمی! تم کپڑے پہنو۔''

''تم مہمان آئی ہوئی ہو سیتا دیوی!'' رمیش نے کہا۔ ''اپنے لئے مشکلات پیدا مت کرو۔''

''آج میں تمہاری مشکلات تو حل کرُدوں گی۔ مجھے اپنی مشکلات کی پرواہ نہیں ہے۔ بھاگتے یہاں سے یا نہیں؟'' سیتا نے چیخ کر کہا۔ اس کے بعد لڑکوں کی آواز سنائی نہیں دی۔

''لکشمی کی بچی! تمہیں اتنے بڑے بڑے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ چل ں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ تیری ماں سے کہوں گی تمہیں پٹہ ڈال کر رکھے اور اس غار کے بھوت! یہیں رہنا۔'' یہ سیتا کی آواز تھی۔ آخری الفاظ اُس نے یقیناً مجھے مخاطب کر کے کہے تھے۔ نے غار میں نہ پا کر وہ سمجھ گئی ہوگی کہ میں کہاں ہوں۔ کیونکہ اس دراز میں میری رائفل تو اُسی

نے چھپائی تھی۔

غار میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ میں اپنی جگہ پر دبکا رہا۔ دراڑ میں جس جگہ میں بیٹھا ہوا تھا وہاں ہوا کی آمد و رفت بالکل نہیں تھی۔ پسینے سے میرا جسم تر ہونے لگا تھا۔ میں کچھ دیر اور وہیں بیٹھا رہا، پھر اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا دوسری طرف لکڑیوں کے ڈھیر کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ یہاں کچھ ہوا آ رہی تھی۔

تقریباً دس منٹ بعد پھر غار میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں محتاط ہو گیا۔ ''اے جی..... کہاں ہو تم؟'' یہ سیتا کی آواز تھی۔ ''اب باہر آ جاؤ! کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

میں اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا اُس دراڑ سے باہر آ گیا۔ سیتا غار کے دہانے سے چند فٹ آگے کھڑی اس طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی بھی تھی۔

''تم اتنی جلدی واپس آ گئیں..... میرا مطلب ہے تم تو اس لڑکی کو بستی میں چھوڑنے گئی تھیں۔'' میں نے کہا۔

''اُسے میں نے نیلم کے ساتھ بھیج دیا ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''نیلم کون؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''چاچا قربان علی کی بیٹی۔ وہ میرے ساتھ آئی تھی۔'' سیتا نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے سیتا! میں اُس لڑکی کی کوئی مدد نہیں کر سکا تھا۔ اگر تم بروقت نہ آ جاتیں تو اُس لڑکی کے ساتھ نجانے کیا ہوتا؟'' میں نے کہا۔

''ہوتا کیا.....'' سیتا بولی۔ ''وہ اُس کا بلادکار کرتے اور جب بستی والوں کو پتہ چلتا تو وہ چند روز کے لئے کہیں غائب ہو جاتے۔ ہمارے دھرم میں یہی تو سب سے زیادہ قابلِ نفرت بات ہے۔ ایک ہی دھرم کو ذاتوں میں تقسیم کر کے کوئی اعلیٰ ذات کا بن بیٹھا ہے اور کسی کو نیچ بنا دیا گیا ہے۔ نیچ کو پلید اور ناپاک سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ہوا بھی اُونچی ذات والوں کو چھو جائے تو قیامت آ جاتی ہے۔ لیکن بڑے بڑے دھرماتما جب کسی نیچ ذات کی عورت کو اپنے بستر کی زینت بناتے ہیں تو اُنہیں ذات پات کا کوئی خیال نہیں آتا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''یہ رمیش جموں کے ایک مندر کے پنڈت کا بیٹا ہے۔ یہاں اس کی زمین ہے۔ پنڈت خود تو جموں میں رہتا ہے اور اس کی بیوی اور بیٹا یہیں رہتے ہیں۔ بیس دن پہلے بھی اس نے بستی کی ایک لڑکی کے ساتھ بلادکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کا باپ پنڈت منوہر لال آج کل یہاں آیا ہوا ہے۔ میں اُس کی شکایت ضرور کروں گی اور ماما سے بھی کہوں گی۔ یہ دن بدن پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کا بندوبست کیا جانا ضروری ہے۔''

میں گہری نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر غصے کی سرخی نمایاں تھی۔ میں نے اُس میں ایک تبدیلی بھی محسوس کی تھی۔ پہلے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو ہم کہتی رہی تھی اور اب اپنے لئے بھی واحد کا صیغہ استعمال کر رہی تھی۔

''معاف کرنا جی.....'' وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے لئے کپڑے اور کھانا وغیرہ لے کر آئی ہوں۔ ان کم بختوں کی وجہ سے اتنی دیر ہو گئی۔'' اُس نے پوٹلی کھول لی۔ ''میں نے چاچا قربان علی کو تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔ اُس نے ایک مرہم دیا ہے اور فوری طور پر لگانے کے لئے کہا ہے۔ وہ کل صبح سویرے آ کر تمہیں دیکھ لے گا۔ لو..... پہلے روٹی کھا لو! نیلم آ جائے تو ہم تمہارے زخم پر مرہم بھی لگا دیں گے اور کپڑے بھی بدل دیں گے۔''

''تت تم میرے کپڑے بدلو گی، یعنی تم اور نیلم؟'' میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

''مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ اچھی نرس اور ڈاکٹر ثابت ہوتی ہیں۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ویسے چنتا مت کرو! ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گی۔ جب تمہاری مرہم پٹی کرنے لگیں تو تم آنکھیں بند کر لینا۔''

اُس نے پوٹلی میں سے کندوری (چھوٹا دسترخوان) نکال کر الگ رکھ دیا۔ یہ بھی پوٹلی کی طرح بندھا ہوا تھا۔ اُس میں چار روٹیاں اور ایک کٹورے میں بھنی ہوئی ماش کی دال تھی۔

''تم روٹی کھاؤ..... میں تمہارے لئے پانی لے کر آتی ہوں۔'' اُس نے بڑی پوٹلی میں کپڑوں میں رکھا ہوا ایلومینیم کا ایک چھوٹا ڈول نکال لیا۔ اُس میں پانچ چھ گلاس پانی آ سکتا تھا۔ وہ ڈول لے کر غار سے باہر چلی گئی اور میں روٹی کھانے لگا۔ میں پتہ نہیں کب سے بھوکا تھا۔ نوالے تقریباً ثابت ہی نگلتا جا رہا تھا۔ چند منٹ بعد سیتا پانی لے کر آ گئی تو میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد نیلم بھی آ گئی۔ اُسے دیکھ کر میں پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ مانا سیتا بھی بہت حسین تھی لیکن نیلم کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اُس کی عمر بیس اکیس کے لگ بھگ ہی ہو گی۔ بھرپور جوانی تھی جو دیکھنے والے کو مسحور کر دیتی تھی۔

''دیکھو! بات یہ ہے کہ.....'' میں نے باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے سامنے کپڑے اُتارتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے۔ وہ مرہم مجھے دے دو میں خود ہی لگا لوں گا اور کپڑے بھی بدل لوں گا۔ تم دونوں غار سے باہر چلی جاؤ۔''

سیتا نے پوٹلی میں سے ایک گول ڈبیہ اور ایک بوتل نکال کر میرے سامنے رکھ دی اور غالباً پرانی ساڑھی پھاڑ کر ایک پٹی بھی تیار کی گئی تھی۔

''یہ سپرٹ ہے.....'' اُس نے بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ ''پہلے زخم کو اچھی طرح صاف کر لینا۔ اگر ہمت نہ ہو تو ہمیں آواز دے لینا۔''

وہ دونوں غار سے باہر چلی گئیں اور پھر جس طرح میں نے سپرٹ سے زخم صاف کر کے مرہم لگا کر پٹی باندھی وہ میں ہی جانتا تھا۔ اور پھر میں نے کپڑے بھی بڑی مشکل سے تبدیل کئے تھے۔ اور پھر میری آواز سن کر وہ دونوں اندر آ گئیں۔

''میرا خیال ہے اسے یہاں رکھنا مناسب نہیں ہے..... کوئی نہ کوئی اس طرف آ سکتا ہے۔''

نیلم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا اسے بستی میں لے چلیں؟'' سیتا بولی۔

''نہیں.....'' نیلم نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''حضوری بابا کے مزار اور چشمے کے قریب ہی ایک غار ہے۔ پہلے جب گاؤں میں مسلمان رہتے تھے تو اُس مزار پر لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ مسلمانوں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد یہ مشہور کر دیا گیا کہ وہاں بدروحوں کا ڈیرہ ہے۔ ہندو تو ویسے ہی توہم پرست ہوتے ہیں۔ کوئی اس طرف جانے کی ہمت نہیں کرتا۔ اور میرا خیال ہے وہ جگہ اس کے لئے سب سے زیادہ محفوظ رہے گی۔''

''کیا نام بتایا تم نے حضوری بابا؟'' سیتا بولی۔ ''ہاں..... مجھے یاد آ رہا ہے۔ جب میں یہاں آئی تھی تو ماما نے کہا تھا کہ جہاں بھی چاہوں گھومتی پھرتی رہوں مگر حضوری بابا کے مزار کی طرف نہ جاؤں۔ ویسے وہ جگہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟''

''اُس طرف..... آدھا کوس۔'' نیلم نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''اتنی دیر تک چل سکو گے؟'' سیتا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''کوشش کر لوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

نیلم نے ساری چیزیں سمیٹ لیں۔ سیتا نے مجھے سہارا دے کر اُٹھا دیا۔ میں رائفل کو لاٹھی کی طرح ٹیکتا ہوا اُن کے ساتھ چل پڑا۔ لیکن میں زیادہ دُور نہیں چل سکا۔ اُن دونوں نے مجھے دونوں طرف سے سہارا دیا اور ہم چٹانوں میں گھومتے ہوئے نصف کوس کا فاصلہ تقریباً ایک گھنٹے میں طے کر سکے۔

وہ غار میرے حساب سے بھی واقعی بہت محفوظ تھا۔ ایک چھوٹا سا چشمہ تھا جس کا پانی ایک چھوٹی سی ندی کی صورت میں گنگناتا ہوا نشیب کی طرف بہہ رہا تھا۔ چشمے کے بائیں طرف تقریباً بیس گز کے فاصلے پر چٹان کے دامن میں ایک پختہ قبر تھی جس پر سبز رنگ کیا ہوا تھا۔ قبر پر اور اُس کے ارد گرد چبوترے پر سوکھے ہوئے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ چشمے کے دوسری طرف ایک اُونچی پہاڑی تھی جو سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اور وہ غار اُس پہاڑی پر زمین کی سطح سے تقریباً سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ غار کے دہانے کے سامنے درختوں اور قد آدم جھاڑیوں کی بھرمار تھی۔ میں غار کے دہانے پر ان جھاڑیوں میں بیٹھ کر نہ صرف اس چشمے بلکہ تقریباً ایک کوس دُور نشیب میں بستی کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس غار کے پچھلی طرف ایک تنگ سا راستہ بھی تھا جو ضرورت کے وقت فرار کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

غار صاف ستھرا تھا۔ ایک طرف لمبی چوڑی جگہ پر پرالی (گیہوں کے خشک پودے) کی لمبی چوڑی دبیز تہہ بچھی ہوئی تھی جسے بستر کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ جب حضوری بابا کے مزار پر لوگ آتے ہوں گے تو یہ غار استعمال ہوتا ہوگا۔

سورج غروب ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا۔ غار کے باہر دُھوپ ماند پڑ چکی تھی۔

''ہم چلتے ہیں۔'' نیلم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بابا کبھی مزار پر پھول وغیرہ ڈالنے کے لئے ادھر آ جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی یہاں نہیں آتا۔ میں بابا کو بتا دُوں گی۔ وہ صبح سویرے تمہارے لئے کھانا بھی لے آئے گا۔ ویسے تم بھی ذرا محتاط رہنا۔ غار سے باہر مت نکلنا۔''

''اس ڈول میں میرے لئے پانی لا دو۔'' میں نے کہا۔ نیلم ڈول لے کر غار سے باہر چلی گئی اور میں سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم کب آؤ گی؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''دن چڑھے آؤں گی۔'' سیتا دیوی نے لجا کر جواب دیا۔ ''تم اپنا خیال رکھنا جی..... کسی کو آس پاس دیکھو تو پچھلی طرف سے چٹانوں میں نکل جانا۔''

''تمہیں میری اتنی فکر کیوں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم مجھے اچھے لگتے ہو۔'' اُس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔ ''اگر اچھے نہ لگتے تو میں تمہیں اٹھا کر اُس غار میں نہ لے جاتی۔''

''شکریہ سیتا دیوی جی! میں کل تمہارا انتظار کروں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

نیلم پانی لے آئی۔ میں نے ڈول پرالی کے قریب رکھ دیا۔ وہ دونوں میری طرف دیکھتے ہوئے رخصت ہو گئیں۔ میں غار کے دہانے پر بیٹھا جھاڑیوں کی آڑ سے اُنہیں اُس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہیں۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد بھی میں دیر تک وہیں بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر پرالی پر آ گیا۔ اندھیرا ہوتے ہی مچھروں نے یلغار کر دی تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ سیتا میرے اوڑھنے کے لئے ایک چادر بھی لے آئی تھی۔ میں نے مچھروں سے بچنے کے لئے چادر اوڑھ لی اور منہ بھی چھپا لیا۔ اور پھر پتہ نہیں کب میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○

چاچا قربان علی صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ اُسی نے مجھے جگایا تھا۔ ایک لمحہ کو تو میں بدحواس ہو گیا تھا۔ لیکن اُس کی صورت دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا۔

قربان علی کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ خشخشی سفید داڑھی، سر کے بال بھی برف کی طرح سفید تھے۔ وہ مجھ سے بڑی ہمدردی سے پیش آیا۔ وہ مجھے ایک عام کشمیری مجاہد سمجھ رہا تھا لیکن جب میں نے اُسے اپنا نام بتایا تو اُس کی آنکھوں میں تشویش کی لہریں اُبھر آئیں۔

''تمہیں تلاش کرنے کے لئے تو پوری فوج حرکت میں آ چکی ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی تمہیں تلاش کیا جا رہا ہے۔ یوں تو ماضی میں بھی مجاہدین کے بعض لیڈروں کی تلاش کے سلسلے میں پولیس اور فوج سرگرم رہی ہے لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ کسی کی تلاش میں ہیلی کاپٹر استعمال کئے جا رہے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ بچ کر یہاں تک آن پہنچے ہو۔ لیکن اپنے آپ کو

محفوظ مت سمجھنا۔ تمہیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔''

''سیتا دیوی کیسی ہے..... کیا اُس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اعتماد.....'' قربان علی مسکرا دیا۔ ''اگر وہ قابل اعتماد نہ ہوتی تو اب تک تمہاری زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ ویسے تو زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اس وقت تمہیں سیتا ہی کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ اگر وہ اس طرف نہ آنکلتی تو تم ان پہاڑیوں میں بے ہوشی کی حالت میں ہی ختم ہو چکے ہوتے۔ ویسے یہ لڑکی میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ اس کا ماما جسونت سنگھ کٹر ہندو ہے۔ کالی کی پوجا کرنے والا۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ سیتا کے خیالات اپنے خاندان والوں سے اتنے مختلف کیوں ہیں؟ تمہیں اُس کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ''اُس نے تمہیں زخمی اور بے ہوش پڑے ہوئے دیکھا تھا تو ہو سکتا ہے محض انسانی ہمدردی کی بناء پر تمہیں اُٹھا کر غار میں لے گئی ہو۔ لیکن تمہاری ٹانگ کا زخم دیکھتے ہوئے جب اُس پر انکشاف ہوا کہ تم مسلمان ہو تو تم سے اُس کی ہمدردی اور بڑھ گئی۔ اُس نے مجھے کل ہی تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور مجھ سے تمہاری مدد کی درخواست کی تھی۔ تمہیں غار میں چھپا کر اور تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کر کے اُس نے اپنی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی ہے۔ وہ اب اپنی جان تو دے دے گی مگر تمہارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔''

ہم کافی دیر تک سیتا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس دوران قربان علی نے میرے زخم کا معائنہ کر کے نئی پٹی باندھ دی تھی۔

''تمہارا زخم کافی بگڑ چکا ہے۔ مگر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ البتہ تمہیں چند روز مکمل آرام کی ضرورت ہے۔'' قربان علی نے کہا۔ ''تمہارے لئے یہ جگہ محفوظ ہے۔ اس طرف کوئی نہیں آتا۔ صرف میں ہفتے میں ایک مرتبہ یعنی جمعرات کے دن حضوری بابا کے مزار پر آیا کرتا ہوں۔ اب ہر دو دن بعد آیا کروں گا تمہیں دیکھنے کے لئے۔ اس طرف میری زیادہ آمد و رفت کسی کے دل میں شبہ پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن یہ لڑکیاں تمہاری دیکھ بھال کے لئے آتی رہیں گی۔ نیلم نے حکمت کے حوالے سے مجھ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ تمہارا خیال رکھے گی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر جیب سے گول ڈبیاں نکالتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس گولیاں اور انجکشن وغیرہ تو نہیں ہیں لیکن یہ دوائیں ایسی ہیں جو گولیوں اور انجکشنوں سے زیادہ مؤثر ہیں۔ یہ دونوں دوائیں دن میں تین مرتبہ کھانی ہیں۔ ایک ایک خوراک تو ابھی کھا لو، پھر دوپہر اور شام کو کھانی ہوگی۔

دونوں ڈبیوں میں معجون جیسی کوئی چیز بھری ہوئی تھی۔ اُن کے رنگ مختلف تھے مگر دونوں بے حد خوش ذائقہ تھیں۔ میں نے اُنگلی سے لگا کر ہی چاٹ لیں۔

''یہ کالے رنگ کی دوا تمہارا زخم خشک کرے گی۔'' قربان علی کہہ رہا تھا۔ ''اور یہ سفید دوا نہ

صرف تمہارے درد کو کم کرے گی بلکہ تمہیں توانائی بھی فراہم کرے گی۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں پائی جانے والی جڑی بوٹیوں میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے۔''

وہ دیر تک جڑی بوٹیوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ باہر دُھوپ پھیلنے لگی تھی۔

''اب تم ناشتہ کر لو اور آرام کرو..... زیادہ چلنے پھرنے کی کوشش مت کرنا۔ دوپہر کو نیلم تمہارے لئے کھانا لے کر آ جائے گی۔ اور اگر کسی وقت زیادہ تکلیف ہو تو نیلم کو بتا دینا۔'' قربان علی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پانی کا ڈول اُٹھا کر باہر چلا گیا۔

قربان علی میرے لئے ناشتے کے علاوہ کھانے کی ایک دو اور چیزیں بھی لے کر آیا تھا۔ دس منٹ بعد وہ ڈول میں چشمے سے تازہ پانی لے آیا اور مجھے محتاط رہنے اور آرام کرنے کا مشورہ دے کر رُخصت ہو گیا۔

میں نے ڈول کے کچھ پانی سے منہ دھویا، کلی کی اور ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتے کے بعد میں غار کے دہانے پر جھاڑیوں کی آڑ میں بیٹھ گیا اور نشیب میں پھیلی ہوئی وادی کو دیکھنے لگا۔ بستی کے کئی گھروں سے دُھویں کی لکیریں اُٹھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو غار کے اندر آ کر پرالی پر لیٹ گیا۔ میری ٹانگ میں اگرچہ ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا لیکن شدید تناؤ اور کھنچاؤ کی جو کیفیت پہلے تھی اُس میں بڑی حد تک کمی آ گئی تھی۔

نیلم اور سیتا تین بجے کے قریب آئی تھیں۔ میں اُس وقت غنودگی میں تھا لیکن اُن کے آ جانے سے میری نیند کافور ہو گئی۔ وہ میرے لئے کھانا اور کپڑوں کا ایک جوڑا اور ایک کمبل بھی لے کر آئی تھیں۔ گزشتہ رات اگرچہ میں نے چادر اوڑھ رکھی تھی لیکن رات بھر سردی سے ٹھٹھرتا رہا تھا۔ کمبل کے لئے صبح میں نے ہی قربان علی سے کہا۔

سیتا نے چشمے سے پانی لا کر میرا منہ ہاتھ دُھلایا۔ پانی لانے کے لئے وہ گھی کا ایک خالی ڈبہ ساتھ لے کر آئی تھی۔ میں کھانا کھا رہا تھا اور وہ دونوں میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ سیتا بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' میں نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہاری عمر کتنی ہوگی؟'' میں نے سوال کیا۔

''سترہ سال.....'' میں نے جواب دیا۔ ''بلکہ سترہ سال ایک مہینہ اور چھ دن۔''

''چاچا قربان علی نے بتایا تھا کہ تمہارا نام شمروز ہے۔'' سیتا بولی۔ ''کیا واقعی تم وہی شمروز ہو جس کی تلاش میں پوری ریاست کی پولیس اور فوج پہاڑوں اور جنگلوں کی خاک چھانتی پھر رہی ہے؟ اور جس نے چند روز پہلے اپنے ساتھیوں کی مدد سے گندربل کے قریب ایک بہت بڑا فوجی کانوائے تباہ کیا تھا؟''

''ہاں..... میں وہی شمروز ہوں۔ لیکن کیا تم مجھے اپنے سینکوں کے حوالے کرنے کا ارادہ کر

رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''نہیں.....'' وہ مسکرا دی۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا۔ اور تمہارے ساتھ ایک لڑکی بھی تو تھی جو پہلگام کے قریب کسی جگہ ہمارے سینکوں کے ہاتھوں شہید ہو گئی تھی۔''

''میں بھی اُسی جھڑپ میں زخمی ہوا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''مجھے اُس لڑکی کے بارے میں بتاؤ!'' سیتا بولی۔ ''کاش وہ زندہ ہوتی۔ میں اُس کے پیر دھو دھو کر پیتی۔ ایسی بہادر لڑکیاں تو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔''

''تم بھی بہت عظیم ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کون ہوں، میرے ہاتھوں تمہاری سینا کو کتنا نقصان ہو چکا ہے، میری تلاش میں ہیلی کاپٹر تک استعمال کئے جا رہے ہیں، تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے اور.....''

''اس کی وجہ میں بتا چکی ہوں۔'' سیتا نے میری بات کاٹ دی۔ ''مجھے انگوری کے بارے میں بتاؤ۔ تم دونوں کا نام ہمیشہ ایک ساتھ سنا گیا ہے۔ ماما سے جو باتیں سنی ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری سینا پر تمہارے نام کی بڑی دہشت ہے۔ اس لئے تمہاری تلاش میں ہیلی کاپٹر تک استعمال کئے جا رہے ہیں۔ انگوری..... کاش! وہ زندہ ہوتی۔ اور کاش.....! میں انگوری بن سکتی۔''

''تم بھی انگوری بن سکتی ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ میری نظریں اُس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ''مجھے یہاں پناہ دے کر اور میری مدد کر کے تم نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ انگوری نے رائفل اُٹھا کر اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی تھی اور تم نے رائفل کو ہاتھ لگائے بغیر مجھے پناہ دے کر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ اگر کسی کو اس کا پتہ چل جائے تو تمہارا جو حشر کیا جائے گا تم اس کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم نے انجانے میں مجھے پناہ دے کر جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کے لئے پوری کشمیری قوم تمہاری احسان مند ہو گی۔''

''انجانے میں نہیں.....'' سیتا بولی۔ ''کسی اگر وادی کو پناہ دینا بھی سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ میں نے جب تمہیں زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں اُٹھایا تھا تو اُس وقت میرے دل میں صرف انسانی ہمدردی تھی۔ لیکن تمہارے زخم کا جائزہ لیتے ہوئے جب میں نے دیکھا کہ تم مسلمان ہو تو مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ تم مجاہد ہو..... زخمی ہونے کے بعد چھپتے چھپاتے اس طرف نکل آئے ہو۔ اور آج جب چاچا قربان علی نے تمہارا نام بتایا تو مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔''

مجھے سیتا کی باتیں سن کر واقعی حیرت ہو رہی تھی۔ کیا واقعی اُسے کشمیری مسلمانوں سے اتنی ہمدردی تھی؟ اور کیوں، اس کی وجہ کیا تھی؟ کیا وہ کشمیری مسلمانوں کو واقعی مظلوم سمجھ کر اُن سے ہمدردی کا اظہار کر رہی تھی یا اس کی وجہ کچھ اور تھی..... اور وہ کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

نیلم اس دوران خاموش بیٹھی میری طرف دیکھتی رہی تھی۔

تقریباً دو گھنٹوں بعد وہ واپس چلی گئیں۔ میرے پاس کھانے پینے کی اتنی چیزیں موجود تھیں کہ میں رات کو بھی پیٹ بھر کر کھا سکتا تھا اور صبح کا ناشتہ بھی ہو سکتا تھا۔

تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران قربان علی دو مرتبہ یہاں آیا تھا۔ میرے زخم میں ابھی کوئی خاص بہتری نہیں ہوئی تھی لیکن پہلے جیسی صورتحال بھی نہیں رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اسی توجہ سے علاج ہوتا رہا اور مجھے آرام کرنے کا موقع ملا تو چند روز بعد میرا زخم مندمل ہونا شروع ہو جائے گا۔

قربان علی سے مجھے صورتحال کا بھی پتہ چلتا رہتا تھا۔ انگوری کی شہادت کو بھارتی فوج اپنا ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہی تھی۔ جن بھارتی فوجیوں نے اُس کارروائی میں حصہ لیا تھا اُنہیں نہ صرف ترقیاں دی گئی تھیں بلکہ اُنہیں گرانقدر نقد انعامات سے بھی نوازا گیا تھا۔

میری تلاش کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ گو کہ اس میں پہلے جیسی گرم جوشی نہیں رہی تھی تاہم میری تلاش میں پہلگام اور اس کے گرد و نواح کی بستیوں میں مسلسل چھاپے مارے جا رہے تھے۔ اس جھڑپ میں چونکہ میں بھی زخمی ہوا تھا اس لئے بھارتی فوجیوں کو یقین تھا کہ میں اُس علاقے سے زیادہ دُور نہیں گیا ہوں گا اور کسی بستی یا فارم ہاؤس میں پناہ لئے ہوئے ہوں یا پہاڑوں میں کسی غار میں چھپا ہوا ہوں۔ اس علاقے میں دُور دُور تک پہاڑوں اور جنگلوں میں بھی مجھے تلاش کیا جا رہا تھا۔ یہ بات تو شاید وہ لوگ سوچ بھی نہیں سکے ہوں گے کہ میں زخمی حالت میں دو دن تک مسلسل سفر کرتے ہوئے وہاں سے اتنی دُور پہنچ چکا ہوں گا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ ڈوڈا کی طرف میری تلاش پر زیادہ زور نہیں دیا جا رہا تھا۔

دوسری طرف بھارتی فوجیوں کے خلاف مجاہدین کی سرگرمیاں بھی جاری تھیں۔ پوری وادی میں فوجی چھاؤنیوں، کیمپوں اور فوجی قافلوں پر مجاہدین کے حملے جاری تھے۔ ڈوڈا میں بھی مجاہدین کی سرگرمیوں کی خبریں مجھے قربان علی سے ملتی رہتی تھیں۔ ابھی دو دن پہلے ڈوڈا سے چند میل دوسری طرف ایک کارروائی میں مجاہدین نے پندرہ فوجیوں کو ہلاک کر دیا تھا جن میں ایک کرنل بھی شامل تھا۔ بھارتی فوجی ڈوڈا کے گرد و نواح میں چھوٹی چھوٹی بستیوں پر بھی کشمیری مجاہدین کی تلاش میں چھاپے مارتے رہتے تھے۔ لیکن یہ بستی اُن کی چیرہ دستیوں سے محفوظ تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک گھر کے سوا اس بستی کی تمام آبادی کٹر ہندوؤں پر مشتمل تھی اور یہاں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

چند روز اور گزر گئے..... اب میرا زخم مندمل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سیتا اور نیلم روزانہ ہی کسی نہ کسی طرح چھپ چھپا کر یہاں آ جاتی تھیں۔ اُن کی وجہ سے بھی مجھے بڑا حوصلہ ملا تھا۔ سیتا دیوی کی باتوں سے میری بڑی ڈھارس بندھتی تھی۔ اُن سے بھی مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔

نیلم کچھ لئے دیئے رہتی تھی لیکن سیتا مجھ سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی تھی۔ مجھے بھی وہ

اچھی لگنے لگی تھی اور میں بھی زیادہ تر اُس سے باتیں کرتا تھا۔ جبکہ نیلم خاموش بیٹھی ہماری باتیں سنتی رہتی تھی۔ کبھی وہ ہم دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر غار سے باہر چلی جاتی۔ ایسے ہی ایک موقع پر سیتا باتیں کرتے ہوئے میری طرف جھک گئی اور پھر اچانک ہی اُس نے مجھے اپنی گرفت میں لے کر اپنے ہونٹ میرے گال پر رکھ دیئے.....

میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ پورے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ غار کے باہر قدموں کی آہٹ سن کر سیتا نے تو مجھے چھوڑ دیا لیکن میں دیر تک اپنے گال پر اُس کے ہونٹوں کی تپش محسوس کرتا رہا۔ نیلم نے اندر داخل ہو کر ہماری طرف دیکھا اور پھر اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ میرے چہرے کو دیکھ کر شاید اُس نے صورتحال کا اندازہ لگا لیا تھا۔

اُس روز وہ معمول سے زیادہ دیر تک میرے پاس رہی تھیں۔ اُن کی وجہ سے مجھے بڑا سہارا تھا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ کسی کو اُن پر شبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ بستی سے نکل کر کہاں غائب رہتی ہیں۔ ایک روز میں نے اُن سے یہ بات پوچھی بھی تھی اور سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''میں سیر و تفریح کے لئے یہاں آئی ہوئی ہوں گھر میں قید ہو کر بیٹھنے کے لئے نہیں۔ میرا ماما بستی کا مکھیا ہے۔ کوئی میری طرف اُنگلی اُٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اور ویسے بھی ہم بستی سے نکل کر نجانے کہاں کہاں گھومتی ہوئی اس طرف آتی ہیں۔ کسی کو ہم پر شبہ نہیں ہو سکتا۔''

بیس بائیس دن گزر گئے۔ میرا زخم اب کافی بہتر ہو گیا تھا اور میں غار کے اندر تھوڑا بہت چلنے بھی لگا تھا۔ چاچا قربان علی اب بھی دوسرے تیسرے دن چکر لگا لیتا تھا۔ اُس کی توجہ سے ہی میں اُٹھ کر چلنے کے قابل ہو سکا تھا۔

سیتا اب کبھی کبھی اکیلی بھی آ جاتی تھی۔ اور جب وہ اکیلی آتی تھی تو کچھ زیادہ ہی کھلنے کی کوشش کرتی۔ میری مزاحمت اُس کے ارادوں میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔

اُس روز دوپہر کو میں اونگھ گیا اور پھر ہلکی سی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میری نظریں فوراً ہی غار کے دہانے کی طرف اُٹھ گئیں۔ مجھے ایک رنگین آنچل سا لہراتا ہوا نظر آیا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

میرے بستر کے قریب ہی ایک پوٹلی رکھی ہوئی تھی۔ اُس میں کھانا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سیتا آج بھی اکیلی ہی آئی تھی۔ مجھے سوتے دیکھ کر وہ پوٹلی رکھ کر باہر چلی گئی تھی۔ میں اُسے آواز دینا چاہتا تھا مگر پھر ارادہ بدل دیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر غار کے دہانے کی طرف آ گیا۔

سیتا جھاڑیوں میں غائب ہو گئی تھی۔ میں اس طرف دیکھتا رہا۔ جھاڑیاں ہلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اور پھر سیتا چشمے کے قریب جھاڑیوں سے برآمد ہوئی اور چشمے کے پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ منظر دیکھ کر میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور مجھے اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا..... سیتا نے بلاؤز اُتار دیا تھا..... اور پھر وہ کمر پر ساڑھی کے بل

کھولنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی تیز سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور جب میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا.....

سیتا چشمے کے پانی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ شفاف پانی میں اُس کا بدن صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے پورے جسم میں بجلی کی لہریں سی دوڑنے لگیں.....

چشمے کے چاروں طرف اُونچی جھاڑیاں تھیں۔ اس طرف کسی کے آنے کا خدشہ بھی نہیں تھا اور اسی لئے سیتا کپڑے اُتار کر پانی میں اُتر گئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اُس نے ایک دو مرتبہ غار کی طرف بھی دیکھا تھا۔ لیکن میں بھی جھاڑیوں کی آڑ میں تھا اس لئے وہ مجھے نہیں دیکھ سکی تھی۔

مجھے ایسا لگا جیسے وقت تھم گیا ہو..... مجھے اپنے پورے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اور پھر سیتا کو چشمے سے نکلتے دیکھ کر میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ وہ اپنے کپڑے اُٹھا کر جھاڑیوں کی آڑ میں چلی گئی۔ اور جب وہ دوبارہ سامنے آئی تو کپڑے پہن چکی تھی۔

اُسے اُوپر کی طرف آتے دیکھ کر میں رینگتا ہوا غار میں اپنے بستر پر پہنچ گیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر غار کے باہر آہٹ سن کر میں نے آنکھیں بند کر لیں..... میں اُس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اُس کے آنے کے بعد میں بیدار ہوا تھا یا اپنی جگہ سے اُٹھا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ میرے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

''شمروز..... اُٹھو.....! میں آئی ہوں۔'' سیتا کی آواز مجھے میلوں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ مجھے آواز دینے کے ساتھ ہی اُس نے اپنے سر کو بھی ہولے سے جھٹکا دیا تھا۔ اُس کے بالوں سے نچڑتے ہوئے پانی کی چند بوندیں میرے چہرے پر پڑیں اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ میرے اُوپر جھکی ہوئی تھی۔ اُس کے بلاؤز کا اُوپر والا ایک بٹن کھلا ہوا تھا اور بلاؤز کے اندر کا منظر میرے حواس اُڑا دینے کے لئے کافی تھا..... اور پھر میں واقعی اپنے حواس کھو بیٹھا..... میں نے سیتا کو بانہوں سے پکڑ لیا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک دم سرخی تیر گئی۔ اُس نے ایک لمحے کو میری آنکھوں میں جھانکا اور میرے اُوپر جھکتی چلی گئی..... ہمارے بیچ تمام فاصلے مٹ گئے.....!

○

اُس غار میں ڈیڑھ مہینہ بیت گیا۔ اس دوران صرف ایک مرتبہ بھارتی فوجیوں کی ایک پارٹی بستی میں آئی تھی۔ وہ صبح دس بجے سے دوپہر تین بجے تک مکھیا کے مہمان رہے تھے۔ مکھیا نے اُن کی خوب خاطر مدارت کی تھی اور اُنہیں اطمینان دلایا تھا کہ بہت عرصے سے اس طرف کوئی بھگوڑا مجاہد نہیں آیا۔ یہاں سب شانتی ہی شانتی ہے۔ اُس بیچارے کو کیا پتہ تھا کہ اُس کی

بھانجی مجاہدین کے سب سے خطرناک لیڈر کو نہ صرف پناہ دیئے ہوئے ہے بلکہ اُس کے ساتھ جوانی کے مزے بھی لوٹ رہی ہے۔

مجھے افسوس بھی ہوتا تھا کہ میں یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہوں؟ میں نے اب تک ایک مجاہد کی سی زندگی گزاری تھی۔ انگوری عرصہ تک میرے ساتھ رہی تھی۔ کئی ایسے موقعے بھی آئے تھے کہ ہم پٹری سے اُتر گئے تھے لیکن ہم نے ہر مرتبہ اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور اپنے کاز کو اوّلیت دی تھی۔ غاصب ہندوؤں سے کشمیر کی آزادی ہماری زندگی کا پہلا اور آخری مقصد تھا اور ہم اس مقصد کو پس پشت نہیں ڈال سکتے تھے۔

لیکن سیتا..... اُس نے مجھے راستے سے بھٹکا دیا تھا۔ لیکن میں فوراً ہی سنبھل گیا۔ ایک مرتبہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اُسے میں اپنی بھول کہہ سکتا تھا۔ دوسری مرتبہ سیتا میرے قریب آئی تو میں نے اُسے سمجھا دیا کہ وہ ایک مخلص اور بے لوث دوست کی طرح میرے ساتھ رہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اور اس کے بعد سیتا نے واقعی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔

اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ ہندو ہونے کے باوجود سیتا کو ہندوؤں سے اتنی نفرت اور کشمیری مسلمانوں سے اتنی ہمدردی کیوں تھی؟ یہ بات مجھے سیتا ہی نے بتائی تھی۔

سیتا کے چچا کا بیٹا گوپال سنگھ انڈیا آرمی میں کیپٹن تھا اور چھ مہینے کشمیر میں ڈیوٹی دے کر گیا تھا۔ یہ پچھلے سال کی بات تھی۔ سیتا جے پور میں تھی اور گریجویشن کی تیاری کر رہی تھی۔ بشیر احمد نام کا ایک مسلمان لڑکا بھی سیتا کا دوست تھا۔ وہ اُس کا کلاس فیلو تھا اور وہ دونوں اکثر مل کر اسٹڈی کیا کرتے تھے۔ کئی بار ایسے مواقع بھی آئے تھے کہ بشیر احمد چاہتا تو سیتا کے ساتھ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ مگر اس نے کبھی سیتا کو چھوا تک نہیں تھا۔ بشیر کی شرافت کے قائل تو سیتا کے گھر والے بھی تھے اسی لئے اُنہوں نے اُن دونوں کے ملنے پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

گوپال سنگھ کشمیر سے واپس آنے کے بعد جیسلمیر چھاؤنی میں تعینات ہوا تھا۔ وہ مہینے میں دو مرتبہ جے پور ضرور آتا تھا۔

ایک روز سیتا گھر میں اکیلی تھی کہ گوپال سنگھ آ گیا۔ اُس نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سیتا کو دبوچ لیا۔ مزاحمت کے باوجود سیتا اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکی اور بے بس چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

اتفاق سے اسی وقت بشیر بھی پہنچ گیا۔ اُسے صورتحال کا اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی۔ اُس نے گوپال سنگھ کو برا بھلا کہا تو گوپال سنگھ اسی پر پلٹ پڑا اور اُسے پیٹنے لگا۔ بشیر دُبلا پتلا کمزور سا لڑکا تھا۔ پٹتا رہا۔

یہ ہنگامہ جاری تھا کہ سیتا کے ماتا پتا بھی گھر پہنچ گئے۔ گوپال سنگھ نے سارا الزام بشیر پر دھر دیا اور اُنہیں بتایا کہ اُس نے اُسے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ سیتا ماں باپ کو بتا رہی تھی کہ اُس کے ساتھ بلاد کار بشیر نے نہیں گوپال نے کیا ہے۔ مگر گوپال اُلٹا اُسی پر چڑھ دوڑا کہ وہ اپنے

عاشق کو بچانے کے لئے اُسے الزام دے رہی ہے۔ سیتا کا بھائی بشیر کو پیٹنے لگا۔ وہ گوپال کے ساتھ مل کر اُسے دیر تک پیٹتا رہا پھر گوپال اُسے تھانے لے گیا۔

بشیر غریب گھرانے کا لڑکا تھا اور مسلمان تھا۔ گوپال ایک معزز ٹھاکر گھرانے کا فرد تھا اور فوج میں کیپٹن تھا۔ اُس کی بات کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ بشیر کو تھانے میں اُلٹا لٹکا کر اتنا پیٹا گیا کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ پولیس نے اُس کے مُردہ جسم میں دو گولیاں اُتار دیں اور لاش سڑک پر پھینک دی اور یہ مشہور کر دیا کہ اس نے تھانے سے بھاگنے کی کوشش کی تھی مقابلے میں مارا گیا۔

سیتا رو رو کر اپنے ماں باپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ بشیر بے قصور تھا۔ اُس کے ساتھ زیادتی گوپال نے کی تھی لیکن اُس کی بات پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ بشیر کا غریب اور مسلمان ہونا ہی اُس کا سب سے بڑا جرم تھا۔ اُس کے قتل کی تحقیقات بھی نہیں کی گئی اور یہ کیس ٹھپ ہو گیا۔

سیتا کو اپنے دھرم، اپنے ماں باپ اور اپنے بہادر سینکوں سے شدید نفرت ہو گئی۔ وہ تو اب تک یہ سنتی رہی تھی کہ کشمیر میں مسلمان ہندوؤں پر شدید مظالم ڈھا رہے ہیں۔ فوج ہندوؤں کو بچانے کے لئے کشمیر بھیجی گئی ہے لیکن اب وہ حقیقت جان گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ بھارتی فوج کشمیر میں کیا کر رہی تھی۔

اتفاق سے دو مہینے بعد اُس کا ماما جے پور آیا۔ وہ چند روز بعد واپس لوٹا تو سیتا بھی ماں باپ سے ضد کر کے اُس کے ساتھ گئی اور یہاں آ کر اُس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا۔

وہ اپنے دھرم اور اپنے ماں باپ سے اتنی شدید نفرت کرنے لگی کہ اُس نے کشمیری مجاہدین کی کسی پارٹی میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس غرض سے وہ دو تین مرتبہ ڈوڈا شہر بھی گئی تھی جہاں وہ ایسے لوگوں سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی جو اُسے مجاہدین تک پہنچا سکتے تھے۔ لیکن اُس کا ہندو ہونا آڑے آ گیا۔ اور اب اتفاق سے سیتا سے میری ملاقات ہو گئی۔ اسی لئے اُس نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر میری مدد کی تھی۔

سیتا بہت خوش تھی کہ بالآخر ایک کشمیری مجاہد سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور میں سیتا سے ملاقات پر اپنی جگہ خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ سیتا سے ہندوؤں کے خلاف کس طرح کام لیا جائے.....؟

○○○

وہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں غار میں اپنے بستر پر لیٹا اونگھ رہا تھا کہ ایک نسوانی چیخ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ غار میں کوئی نہیں تھا اور کوئی معمولی سی آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نسوانی چیخ کی آواز کو اپنا واہمہ سمجھا اور میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ دراصل میری زندگی کا پچھلا کچھ عرصہ ایسا ہی ہنگامہ خیز گزرا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے درندہ صفت بھارتی فوجیوں کو مسلمانوں کی بستیوں کو تاراج کرتے دیکھا تھا۔ آگ، خون اور لاشیں..... عورتوں اور جوان لڑکیوں کی چیخیں ہر طرف سنائی دیتی تھیں۔ ان بستیوں پر حملوں کے کئی روز بعد بھی معصوم اور بے گناہ عورتوں اور لڑکیوں کی چیخیں میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھیں اور پھر اسی طرح کا کوئی نیا واقعہ رونما ہو جاتا۔ اس طرح کشمیر میں تباہی اور بربادی کا ایک تسلسل تھا جو عرصے سے چل رہا تھا۔ میں پچھلے دو مہینوں سے اگرچہ آبادی سے دُور اس غار میں تھا۔ سیتا دیوی اور نیلم میرا ہر طرح سے خیال رکھے ہوئے تھیں۔ اگرچہ یہ غار لڑائی ہنگاموں سے بہت دُور تھا لیکن اس لڑائی کو میں نے کبھی ایک لمحہ کو بھی فراموش نہیں کیا تھا جو کشمیری مسلمان طویل عرصے سے اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے۔

اس غار میں میرے لئے مکمل طور پر سکون ہونے کے باوجود میرے دماغ میں کبھی کبھی دھماکے ہونے لگتے اور بھیڑیا صفت بھارتی فوجیوں کی بربریت کا شکار ہونے والی معصوم لڑکیوں اور بے گناہ عورتوں کی چیخیں میرے کانوں میں گونجنے لگتیں۔ اور اس وقت میں نسوانی چیخ کی اس آواز کو اپنا واہمہ ہی سمجھا تھا۔

میں نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ نجانے کیا بات تھی کہ نیند اس وقت بڑی شدت سے مجھ پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی چیخ کی آواز دوبارہ سنائی دی تو میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ میرا واہمہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چیخ کی وہ آواز بہت واضح طور پر سنائی دی تھی۔

میں اپنی رائفل اُٹھا کر تیزی سے غار کے دہانے کے قریب پہنچ گیا۔ اس دوران چیخ کی آواز دوبارہ سنائی دی..... میں دہانے سے کچھ اور آگے بڑھ کر سرسراتی ہوئی جھاڑیوں کی آڑ سے جھانکنے لگا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھے سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا.....

چشمے کے قریب دو بھارتی فوجیوں نے سیتا کو دبوچ رکھا تھا اور سیتا اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ ایک فوجی نے اُس کا منہ دبا رکھا تھا اور جب کسی وقت ہاتھ منہ سے ہٹ جاتا تو سیتا کی گھٹی گھٹی سی چیخ فضا میں پھیل جاتی۔

سیتا کی ساڑھی اُس کے جسم سے الگ ہو چکی تھی۔ صرف پیٹی کوٹ اور بلاؤز بدن پر رہ گیا ۔ ایک فوجی نے ایک ہاتھ سے اُس کا منہ دبا رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ اُس کے سینے پر لپیٹے اُسے بو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ دوسرا فوجی اُس کا پیٹی کوٹ نیچے کھینچنے کے چکر میں تھا اور تا اپنے آپ کو بچانے کے لئے بری طرح لاتیں چلا رہی تھی۔

دونوں فوجیوں کی سب مشین گنیں چشمے کے کنارے پتھروں پر پڑی ہوئی تھیں۔ میں رائفل ہائے قد آدم جھاڑیوں کی آڑ میں بڑی احتیاط سے نیچے اُترنے لگا۔ ایک تو جھاڑیاں بہت نچی تھیں۔ اگر میں کھڑے ہو کر بھی چلتا تو چشمے کی طرف سے مجھے دیکھا نہیں جا سکتا تھا اور پھر ستہ ان جھاڑیوں میں بل کھاتا ہوا تھا۔ اس طرح دیکھے جانے کا امکان نہیں تھا مگر اس کے جود میں جھک کر بڑی احتیاط سے چل رہا تھا۔

سیتا کی گھٹی گھٹی سی چیخ ایک بار پھر سنائی دی۔ میں نے رُک کر جھاڑیوں میں سے جھانکا، سیتا پنے آپ کو کسی طرح چھڑا کر ایک طرف کو بھاگ کھڑی ہوئی تھی لیکن اُن دونوں فوجیوں نے ے پھر دبوچ لیا تھا اور اُسے اُٹھا کر چشمے کے دوسری طرف لے جا رہے تھے۔

بستی کا فاصلہ وہاں سے اتنی دُور تھا کہ اگر سیتا پھیپھڑوں کی پوری قوت سے بھی چیختی تو اُس ا آواز بستی تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ قرب و جوار میں موجود کوئی شخص اُس کی وازسن لے۔ لیکن لگتا تھا اس وقت اس نواح میں کوئی نہیں تھا جو اُس کے چیخنے کی آواز سن لیتا۔

میں نے اُس کی آواز سن لی تھی اور اُسے بچانے کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔ سیتا کو بھی شاید ین ہو گا کہ میں اُس کی آواز سن لوں گا اور اس کی مدد کو ضرور آؤں گا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی ہ اُس نے ایک مرتبہ بھی میرا نام لے کر مدد کے لئے نہیں پکارا تھا جس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ن کا منہ دبا رکھا گیا تھا اور اُسے میرا نام پکارنے کا موقع نہیں مل رہا تھا یا وہ اُن فوجیوں کے امنے جان بوجھ کر میرا نام نہیں پکارنا چاہتی تھی۔

وہ فوجی اُسے چشمے کے دوسری طرف ایک چٹان کے پیچھے لے گئے۔ اس طرف سیتا کے ٹنے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ میں تیزی سے جھاڑیوں سے نکل کر چشمے کے قریب آ گیا۔ جیوں کی دونوں سب مشین گنیں اس جگہ پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے محتاط نظروں سے نشیب ا بہت دُور بستی کی طرف اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ دُور دُور تک کوئی ذی رُوح دکھائی نہیں دیا تھا ں کا مطلب تھا کہ ان فوجیوں کا کوئی تیسرا ساتھی آس پاس موجود نہیں تھا۔ اگر ان کے کوئی اتھی ہوں گے بھی تو بہت دُور کسی اور بستی کی طرف ہوں گے اور یہ دونوں شاید گشت کرتے ئے یا راستہ بھٹک کر اس طرف آ نکلے تھے اور ایک جوان اور حسین لڑکی کو اکیلے پا کر اُن کی ندی فطرت کے عین مطابق اُن کی ہوس جاگ اُٹھی تھی۔

میں دبے قدموں چشمے کے اُوپر سے گھوم کر اُس چٹان کے قریب پہنچ گیا۔ دوسری طرف ے سیتا کی گھٹی گھٹی سی چیخوں اور دھینگا مشتی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً سیتا اپنے

آپ کو بچانے کے لئے اب بھی بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔ میں چند قدم محتاط انداز میں آگے بڑھا اور پھر چھلانگ لگا کر چٹان کے دوسری طرف آ گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے..... رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی جس سے میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں.....

سیتا زمین پر چت پڑی تھی۔ ایک فوجی نے اُس کی بانہوں میں ہاتھ ڈال کر اُسے پوری طرح گرفت میں لے رکھا تھا۔ سیتا کے منہ میں ایک رُومال ٹھنسا ہوا تھا جس سے اُس کی چیخیں اُس کے سینے ہی میں دم توڑ رہی تھیں۔ سیتا کا بلاؤز بھی پھٹ چکا تھا وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے پوری قوت سے لاتیں چلا رہی تھی۔ اور دوسرا فوجی اُسے مکمل طور پر بے بس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر سامنے آیا تو آواز سن کر دونوں فوجی چونک گئے۔ ایک لمحے کو اُن پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی لیکن انہوں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اُن دونوں فوجیوں کی رائفلیں تو چشمے کے قریب ہی پڑی ہوئی تھیں البتہ دونوں کی سنگینیں اُن کے بیلٹوں سے لگے ہوئے ہولسٹروں میں تھیں۔

جو فوجی سیتا کو ٹانگوں سے پکڑ کر قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا وہ سنگین کے دستے پر ہاتھ ڈالتا ہوا میری طرف لپکا لیکن میں نے اُسے سنگین ہولسٹر سے نکالنے کا موقع نہیں دیا اور بڑی پھرتی سے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ کر لٹو کی طرح گھما دیا۔ رائفل کا بٹ پوری قوت سے اُس کے سر پر لگا۔ پٹاخ کی آواز اُبھری اور اُس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ اُس کا بھیجہ بھی بکھر گیا اور اُس کے منہ سے صرف ایک آواز نکلی تھی۔ وہ تیورا کر گرا اور پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

دوسرے فوجی نے بھی سیتا کو چھوڑ دیا۔ اُس کے چہرے پر شدید خوف اور آنکھوں میں بے پناہ وحشت اُبھر آئی تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے رائفل کو گھما کر بٹ کی طرف سے پکڑا اور اُسے زد میں لے لیا۔ اُس بزدل فوجی نے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا دیئے تھے۔

سیتا چند لمحوں تک متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر اپنی جگہ سے اُٹھی اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے رائفل کو سنبھالے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

''اپنے حواس قابو میں رکھو سیتا!'' میں نے کہا۔

''مار دو شمروز..... مار دو اسے..... چھلنی کر دو اسے.....'' وہ ایک دم پھٹ پڑی۔ ''اس نے ہندو ہو کر ایک ہندو ناری کی عزت لوٹنے کی کوشش کی ہے۔ تم مسلمان ہو..... تم نے مجھے ان درندوں سے بچایا۔ ختم کر دو اسے بھی۔'' اُس نے جذبات میں آ کر مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش بھی کی تھی۔

''ہوش میں آؤ سیتا!'' میں نے کہا۔ ''تم اس طرف بیٹھ جاؤ اور دیکھو میں اس کا کیا حشر کرتا

ہوں۔''

اور پھر میں نے بڑی مشکل سے سیتا کو اپنے آپ سے الگ کیا۔ وہ دونوں گھٹنے سمیٹ کر چٹان کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ دونوں بانہیں اُس نے اپنے گھٹنوں پر لپیٹ لی تھیں۔

میں نے ایک مرتبہ دوسرے فوجی کی طرف دیکھا وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اُس کی کھوپڑی سے بہنے والا خون اور بھیجے کے لوتھڑے اِدھر اُدھر پتھروں پر بکھرے ہوئے تھے۔

میں لاش سے نظریں ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس جگہ دو چٹانیں آپس میں اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ ان کے بیچ میں تقریباً دو سو مربع گز پر مشتمل ایک تکون میدان سا بن گیا تھا۔ دوسری چٹان کے ساتھ ایک بیس بائیس فٹ چوڑا راستہ جو پچھلی طرف نشیب میں چلا گیا تھا اور میدان کے اختتام پر ایک گہرا کھڈ تھا۔

میں نے میدان کے کنارے پر پہنچ کر نیچے جھانک کر دیکھا۔ بالکل عمودی ڈھلان تھی جو سینکڑوں فٹ گہرائی تک چلی گئی تھی۔ اُس ڈھلان پر پیر جمانا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ ڈھلان کے اختتام پر گہرائی میں پتھر بکھرے ہوئے تھے اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں بھی تھیں۔

میں نے ایک بڑا سا پتھر اُس ڈھلان پر لڑھکا دیا۔ وہ پتھر ایک بڑے سائز کے مٹکے کے برابر تھا۔ وہ ایک مرتبہ ڈھلان کی سطح سے ٹکرایا پھر گیند کی طرح ہوا میں اُچھلا اور بیسیوں فٹ نیچے اب بار پھر چٹانی ڈھلان سے ٹکرا کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ نیچے پہنچنے پر وہ پتھر چھوٹے چھوٹے تعداد ٹکڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔

میں نے مُڑ کر اُس فوجی کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھائے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا اور وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اُس کی عمر تیس اور بتیس کے درمیان رہی ہو گی۔ ٹوتھ برش ٹائپ مونچھیں خاصی خوفناک لگ رہی تھیں۔

''تم لوگوں کو یہ وردی پہنائی جاتی ہے دیش اور جنتا کی رکھشا کے لئے..... لیکن تم لوگوں نے اس خطے کو شکار گاہ سمجھ رکھا ہے۔ طاقت کے گھمنڈ میں تم لوگ انسانیت کو بھی بھول گئے ہو۔ یہ انسانیت تو تم لوگوں میں کبھی تھی ہی نہیں۔ تم لوگ بہادر تو بہت ہو۔ نہتے اور مظلوم بے گناہ لوگوں پر گولیاں برسانا اور کمزور عورتوں کو پامال کرنے کو ہی تم لوگوں نے بہادری سمجھ لیا ہے۔ جو مال مقابلہ کرنے والے چار آدمی سامنے آتے ہیں تم لوگ بیجڑوں کی طرح ہتھیار پھینک کر بھاگ کھڑے ہوتے ہو۔ اس لڑکی کو اکیلے دیکھا تو اپنی بہادری اور جوانمردی کے جوہر دکھانے کو تیار ہو گئے۔ مگر یہ سورما تو ایک ہاتھ بھی برداشت نہیں کر سکا۔ اور تمہاری موت تو اس سے بھی زیادہ بھیانک ہو گی۔

''مم..... مجھے شما کر دو مہاراج!'' اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اُس کے منہ سے آواز بھی بمشکل نکل رہی تھی۔

''ہاتھ اُوپر.....!'' میں غرایا۔ اُس نے ہاتھ فوراً ہی سر سے اُوپر اُٹھا دیئے۔

''اس کو مار دو شمروز..... ختم کر دو اسے۔'' سیتا چیختی ہوئی اپنی جگہ سے اُٹھ گئی اور دوڑ کر ایک بار پھر مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کرنے لگی۔

''ہوش میں آؤ سیتا!'' میں نے کہا۔ ''اس نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ یہ تمہارے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے گا۔'' میں نے سیتا کو اپنے سے الگ ہٹا کر ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور اُس فوجی کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔

''یہ لاش اُٹھا کر اس کھڈ میں پھینک دو!'' میں نے اُسے رائفل کی زد پر لیتے ہوئے حکم دیا۔

اُس کا چہرہ ایک دم دُھواں ہو گیا۔ وہ کبھی لاش کی طرف دیکھتا اور کبھی ہم دونوں کی طرف۔

''یہاں اس کی چتا کا بندوبست نہیں کیا جا سکتا۔ لاش اُٹھا کر پھینک دو کھڈ میں۔'' میں نے غراتے ہوئے کہا۔

وہ جھک کر لاش اُٹھانے لگا۔ اُس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ وہ لاش اُٹھا کر کھڈ کی طرف بڑھا تو اُس کی ٹانگیں بھی کانپ رہی تھیں۔ لگتا تھا کسی بھی وقت گر جائے گا۔

کھڈ کے کنارے پر پہنچ کر وہ رُک گیا۔ اُس کی ٹانگیں اب بھی کانپ رہی تھی۔ اور پھر میری دھاڑ سن کر اُس نے لاش کھڈ میں پھینک دی۔ میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ فوجی نے لاش پھینک کر جیسے ہی مُڑنا چاہا سیتا نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اُس کے کولہے پر زوردار لات رسید کر دی۔ فوجی لڑکھڑا گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور کھڈ میں گر گیا..... اُس کی آخری چیخ بہت بھیانک تھی جو دیر تک پہاڑیوں میں گونجتی رہی۔

میں نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ دونوں لاشیں نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ شاید ان کے اتنے ٹکڑے ہو چکے ہوں گے کہ انہیں جمع کرنا بھی ممکن نہیں رہا ہوگا۔

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر سنسنی کے تاثرات تھے۔ اور پھر وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

جب تک اُن دونوں درندوں کا انت نہیں ہو گیا تھا میں بھی سنسنی کی لپیٹ میں رہا تھا۔ لیکن اب میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ میں سیتا کی برہنہ پشت سہلاتے ہوئے اُسے تسلی دینے لگا۔

''ہم سارا دن یہاں کھڑے نہیں رہ سکتے سیتا!'' میں نے کہا۔ ''اپنے کپڑے اُٹھاؤ اور یہاں سے ہٹ چلو۔ اگر کوئی اس طرف آ گیا تو.....''

''یہاں کوئی نہیں آتا۔'' اُس نے میری بات کاٹ دی اور چہرہ اُوپر اُٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''اگر تم نہ ہوتے تو یہ درندے پتہ نہیں میرا کیا حشر کرتے۔ تم نے مجھے نیا جیون دیا ہے..... میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔''

''ٹھیک ہے..... مگر اس وقت یہاں سے چلو!'' میں نے کہا۔

سیتا مجھ سے الگ ہو گئی۔ اُس نے اپنا پٹی کوٹ اور پھٹا ہوا بلاؤز اُٹھایا اور ہم دونوں چٹان

کی آڑ سے نکل کر چشمے کی طرف آ گئے۔ میں نے ان فوجیوں کی دونوں رائفلیں بھی اُٹھا لیں۔ سیتا کی ساڑھی بھی قریب ہی پڑی تھی جو میں نے اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

''لو..... یہ لپیٹ لو اور اُوپر چلو!''

''تم تھوڑی دیر یہیں رُک جاؤ!'' سیتا بولی۔ اب وہ اپنی حالت پر بڑی حد تک قابو پا چکی تھی۔ ''اُنہوں نے اپنے گندے ہاتھوں سے میرے شریر کو چھوا تھا۔ میں اشنان کر لوں تو اُوپر چلتے ہیں۔''

میں چشمے سے چند گز دُور رُخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ چند منٹ تک پانی میں چھپاکوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں، پھر سیتا کی آواز سنائی دی۔

''میں نے کپڑے پہن لئے ہیں..... اب تم اس طرف دیکھ سکتے ہو۔''

میں پیچھے مُڑ گیا۔ سیتا اپنے جسم پر ساڑھی لپیٹ چکی تھی اور بلاؤز بھی کسی نہ کسی طرح اُس نے اٹکا لیا تھا۔ پھر چشمے کے قریب ہی جھاڑیوں کے قریب جھک کر اُس نے ایک پوٹلی اُٹھا لی۔ اُس کے قریب ہی پیتل کی ایک گڑوی بھی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہارے لئے کھانا لے کر ہی آئی تھی۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''اور پھر یہ سوچا تھا کہ اس گڑوی میں پانی بھی لیتی چلوں کہ اچانک ہی وہ دونوں میرے سامنے آ گئے۔ کچھ دیر مجھ سے اُلٹے سیدھے سوال کرتے رہے پھر ان دونوں نے مجھے دبوچ لیا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''چلو! اُوپر غار میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

اُس نے چشمے پر اُوپر سے، جہاں سے پانی نیچے گر رہا تھا، گڑوی میں پانی بھر لیا۔ میں نے رائفلیں اپنے کندھوں پر لٹکا لیں اور ہم دونوں جھاڑیوں میں بل کھاتے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے غار میں آ گئے۔

''لو! تم روٹی کھاؤ میں تمہیں بتاتی ہوں اُن دونوں نے کس طرح مجھے گھیرنے اور بے بس کرنے کی کوشش کی تھی۔'' سیتا کہتے ہوئے میرے سامنے بیٹھ گئی۔

چند منٹ پہلے جو کچھ بھی ہوا تھا اُس کے پیشِ نظر میری بھوک اُڑ جانی چاہئے تھی مگر حیرت ہے میری بھوک چمک اُٹھی تھی۔ اور میں بڑے بڑے نوالے توڑ کر منہ میں رکھ رہا تھا۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی سیتا بتا رہی تھی کہ کس طرح ان دونوں فوجیوں نے اُسے اکیلا دیکھ کر موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔

میں ہوں ہاں کرتے ہوئے کھانا کھا رہا تھا۔ ایک مرتبہ میری نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں اور نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا۔ سیتا گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے پھٹے ہوئے بلاؤز کو اپنے بدن پر پھنسانے کی کوشش کی تھی مگر بلاؤز ایک طرف سے ہٹ کر نیچے ہو گیا تھا اور اُس کا سینہ ایک طرف سے اس طرح برہنہ ہو رہا تھا کہ مجھے سینے میں اپنا سانس رُکتا

ہوا محسوس ہونے لگا۔

میں نے گڑوی اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لی۔ پانی کے چند بڑے بڑے گھونٹ بھر کر حلق میں اٹکا ہوا نوالہ نیچے اُتارا اور اُس کے چہرے کو تکنے لگا۔

''کیا ہوا؟'' سیتا نے پوچھا۔

''پھندہ لگ گیا تھا..... نوالہ حلق میں اٹک گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''آرام سے کھانا کھاؤ نا..... کوئی تم سے چھین تو نہیں رہا۔'' سیتا مسکرا دی۔

''کیا تمہارے خیال میں یہ جگہ اب رہنے کے لئے مناسب ہے؟'' میں نے اس مرتبہ نسبتاً چھوٹا نوالہ منہ میں رکھا۔ ''یہ فوجی گشت کرتے ہوئے اس طرف آ گئے تھے۔ انہیں کسی نہ کسی وقت اپنی چوکی پر واپس تو پہنچنا ہوگا۔ اور جب یہ لوگ وہاں نہیں پہنچیں گے تو ان کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ تلاش کرنے والی کوئی پارٹی تمہاری بستی میں بھی آئے گی اور اس طرف بھی چیک کیا جائے گا۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''یہاں انہیں لاشیں تو نہیں ملیں گی۔ ان لاشوں کو تلاش کر لینا آسان نہیں ہوگا لیکن اس چٹان کے دوسری طرف پتھروں پر بکھرا ہوا خون تلاش کرنے والوں کو ساری کہانی سنا دے گی۔ جب وہ لوگ اس طرف آئیں گے تو یہ غار بھی ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکے گا۔''

''یہی میں بھی سوچ رہی ہوں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''یہ جگہ اب واقعی خطرناک ہو گئی ہے۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم یہ غار ہی نہیں یہ علاقہ بھی چھوڑ دیں گے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''یہاں سے قریب ترین ہماری بستی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''اپنے دو فوجیوں کی گمشدگی پر وہ سب سے پہلے ہماری ہی بستی میں آ کر پوچھ گچھ کریں گے اور جب یہاں پتھروں پر جگہ جگہ خون کے دھبے ملیں گے تو انہیں صورتحال کا اندازہ لگانے میں دُشواری نہیں ہوگی۔ بستی کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ میں آس پاس گھومتی رہتی ہوں۔ مجھ سے پوچھ گچھ کی جائے گی اور شاید میں.....''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''کہاں جانا چاہتی ہو..... میرا مطلب ہے کوئی متبادل انتظام؟''

''ایک جگہ ہے میری نظروں میں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''ہماری بستی کے دوسری طرف پہاڑیوں میں کچھ گھپائیں ہیں جہاں کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں ہوگا۔ تم ایک دو دن وہاں رہ جاؤ اس کے بعد ہم جموں کی طرف نکل جائیں گے۔''

''ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے اُسے گھورا۔ ''کیا تم بھی اپنا گھر چھوڑ کر میرے ساتھ جانا چاہتی ہو؟''

''ہاں.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اب تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ مسلمان تو مسلمان یہاں تو ان وحشیوں سے ہندو عورتوں کی عزتیں بھی محفوظ نہیں۔ سب سے پہلے میرے

کزن نے مجھے بے آبرو کیا اور اب یہ ہندو فوجی..... کیا اب بھی ایسی کوئی گنجائش باقی ہے کہ میں ان پر بھروسہ کروں؟ اگر انہیں شبہ بھی ہو گیا کہ میں دو ہندو فوجیوں کے قتل میں ملوث ہوں تو وہ میرا حشر مسلمان عورتوں سے بھی بدتر کریں گے۔ میرے گھر والوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا۔ ہو سکتا ہے اس بستی ہی کو جلا کر راکھ کر ڈالا جائے اور وہ لوگ کبھی نہیں مانیں گے کہ ان دو ہندو فوجیوں نے میرا بلادکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے ہمیں یہ غار ہی نہیں بستی بھی چھوڑ دینی ہوگی۔''

''وہ گھپائیں یہاں سے کتنی دُور ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بستی کے اس طرف۔'' اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''لیکن وہاں تک جانے کے لئے بستی کی طرف نہیں جانا پڑے گا۔ حضوری بابا کے مزار والی چٹان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''تو پھر انتظار کیوں کیا جائے؟'' میں نے کہا۔ ''کیوں نہ ابھی یہاں سے نکل چلیں؟''

''یہی مناسب رہے گا۔'' سیتا بولی۔ ''تم تیار ہو جاؤ! ہم ابھی نکل چلتے ہیں۔''

کھانا ختم کرنے کے بعد میں نے بستر کی چادر اور کمبل تہہ کر لیا۔ سیتا نے باقی چیزیں اُٹھا کر غار کے پچھلی طرف تنگ سی دراڑ میں چھپا دیں۔ اُس نے کمبل اور چادر میرے ہاتھ سے لے لی۔ میں نے ہندو فوجیوں کی رائفلیں تو اپنے کندھوں پر لٹکا لیں اور اپنی رائفل ہاتھ میں سنبھال لی اور ہم غار سے نکل آئے۔

حضوری بابا کے مزار کے قریب سے گزرتے ہوئے سیتا ایک لمحے کو رُک گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر وہ زیرلب کچھ بڑبڑائی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم پہاڑیوں کے دامن میں درختوں کی آڑ لے کر چلتے ہوئے بستی کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ اُس طرف پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹی سی جھیل تھی جس کے چاروں طرف دبیز گھاس اور جھاڑیاں تھیں اور پوری جھیل کی سطح کنول کے چوڑے پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں ان پودوں میں پھول بھی کھلے ہوئے تھے جو ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔

ان چٹانوں میں لاتعداد گھپائیں تھیں۔ ان گھپاؤں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اندر سے یہ چٹانیں پانی سے کٹی تھیں۔ پانی سے چٹانوں کے کٹاؤ کا یہ عمل صدیوں میں یہاں تک پہنچا ہوگا۔ ان گھپاؤں کے اندر چھت پر کہیں کہیں سے پانی ٹپک رہا تھا اور یہی پانی بہتا ہوا باہر والی جھیل میں جا گرتا تھا۔

کہیں کہیں اُوپر سے چٹانیں کھلی ہوئی تھیں اور روشنی ان گھپاؤں کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ میں سیتا کے ساتھ چلتا رہا۔ پانی کے کٹاؤ سے لاتعداد قدرتی ستون بن گئے تھے اور یہ گھپائیں بہت دُور تک چلی گئی تھیں۔ سیتا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ایسی جگہ پر کسی کو تلاش کر لینا ممکن نہیں تھا۔ ایک جگہ سیتا رُک گئی۔ یہ جگہ قدرے صاف ستھری تھی اور اُوپر چٹانوں میں کچھ کھلی جگہ تھی جہاں

سے آسمان بھی دکھائی دے رہا تھا۔ جس جگہ ہم رُکے تھے اُس کے قریب ہی تقریباً ایک فٹ چوڑی ندی کی صورت میں پانی بھی نشیب کی طرف بہہ رہا تھا۔ پانی کی گہرائی چھ سات انچ سے زیادہ نہیں تھی۔

''سوری شریمان جی!'' سیتا نے کمبل اور چادر چٹانی دیوار کے قریب زمین پر رکھ دی اور اُن کے اُوپر وہ چھوٹی سی پوٹلی جس میں بچی ہوئی روٹی تھی۔ ''اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ.....''

''یہ تو بہت اچھی جگہ ہے۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''میں نے تو ایسی ایسی جگہوں پر شب و روز گزارے ہیں جہاں.....''

''میں جانتی ہوں۔'' اُس نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی۔ ''یہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ لیکن اگر اتفاق سے کوئی اس طرف آ بھی گیا تو تم اُس راستے سے اوپر چلے جانا۔ وہ اوپر تمہیں چیڑ کا ایک جھومتا ہوا درخت نظر آ رہا ہے نا؟'' اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اُوپر اشارہ کیا۔ ''وہاں سے تم پہاڑیوں کے اندر جا کر کسی محفوظ جگہ پر پناہ لے سکتے ہو۔ اگر ایسی کوئی صورتحال ہوئی تو میں اس طرف آ جاؤں گی۔''

''لگتا ہے یہ سارا علاقہ تم نے بہت اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ سیتا نے جب ہاتھ اُٹھا کر اوپر اشارہ کیا تھا تو اُس کی ساڑھی کا پلو نیچے گر گیا تھا اور پھٹا ہوا بلاؤز بھی ایک طرف سے ہٹ گیا تھا اور وہ قیامت خیز منظر میرے دل پر قیامت ڈھا رہا تھا۔

''میں صبح سے شام تک گھومتی رہتی ہوں اور اس علاقے کے بارے میں اتنا کچھ جان چکی ہوں کہ یہاں کے رہنے والے بھی نہیں جانتے اور.....'' وہ بات کرتے کرتے رُک گئی۔ اُس نے میری نگاہوں کا مرکز تاڑ لیا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''سوری ڈیئر!'' اُس نے دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ ''میں تمہاری.....'' میں سیتا کو جملہ مکمل کرنے کا موقع دیئے بغیر ایک قدم آگے بڑھ گیا اور میں نے بھی بانہیں پھیلا دیں۔ سیتا والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ میری کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اُس کے گداز سینے کے لمس نے میرے اندر لاوا سا بھر دیا تھا۔ سیتا نے مجھے اپنی بانہوں کے شکنجے میں جکڑ لیا..... ہم زیادہ دیر تک اپنے پیروں پر کھڑے نہیں رہ سکے اور زمین پر جھکتے چلے گئے.....

میں اس وقت یہ بھول گیا تھا کہ میں نے اپنے دل سے عہد کیا تھا کہ سیتا کے اتنے قریب نہیں آؤں گا کہ جذبات بھڑک اُٹھیں مگر اب کمبخت وہی دل بے قابو ہو گیا تھا۔ اس میں سیتا کا کیا قصور؟

میں اپنے آپ کو ہلکے پھلکے بادلوں کی طرح ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اور یہ

کیفیت بہت دیر تک برقرار رہی۔ حواس بحال ہونے پر میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ سیتا میرے بازو پر سر رکھے میرے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

''سیتا!'' میں نے اُسے ہولے سے پکارا۔ لیکن اُس کے بدن میں حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ تیسری مرتبہ پکارنے پر وہ کسمسا کر رہ گئی۔

''ہوں.....'' اُس کی آواز بہت مدھم تھی جیسے بہت گہری نیند میں ہو۔

''اُٹھو..... بہت دیر ہو گئی۔ تمہیں بستی واپس جانا ہے۔'' میں نے کہا۔ سیتا نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ چند لمحے مخموری نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر میرے سینے پر سر رکھ دیا۔

چند منٹ بعد میں نے اُسے اپنے سے الگ کیا۔ وہ اُس کے بعد بھی کافی دیر تک زمین پر لیٹی گہرے گہرے سانس لیتی رہی پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اس طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے یہ جاننا چاہتی ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ اور پھر وہ اُٹھ کر اپنا لباس درست کرنے لگی۔

سیتا چلی گئی اور میں اپنی جگہ پر بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں اپنے راستے سے کیوں بھٹک رہا ہوں؟ دفعتہً میرے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا..... سیتا ہندو تھی..... اور کشمیر کے مسلمان آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ کشمیر میں موجود سات لاکھ بھارتی فوجی اس تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے کشمیریوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔ کشمیری مجاہدین بھی بھارتی فوج کو جانی و مالی نقصان پہنچا رہے تھے۔ روزانہ درجنوں بھارتی فوجی کشمیری مجاہدین کے ہاتھوں مارے جا رہے تھے اور ظاہر ہے ہندوؤں کی تمام تر ہمدردیاں اپنے سینکوں کے ساتھ تھیں۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا سیتا جان بوجھ کر مجھے راستے سے بھٹکا رہی ہے؟ اُس نے جب مجھے زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں اُٹھا کر غار میں پہنچایا تھا تو میرے زخم کو دیکھتے ہوئے اُسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ میں کوئی کشمیری مجاہد ہوں۔ اور بعد میں اُسے میرا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ وادی کا بچہ بچہ میرے نام سے واقف ہو چکا تھا۔ بھارتی فوجیوں کے لئے تو میرا نام دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ انگوری ماری جا چکی تھی اور میں کشمیر میں بھارتی فوج کو سب سے زیادہ مطلوب تھا۔ میرے مُردہ یا زندہ گرفتاری پر لاکھوں روپے انعامات مقرر تھے۔

میرے بارے میں جاننے کے بعد سیتا نے شاید سوچا ہو کہ اگر اُس نے مجھے بستی والوں کے ذریعے پولیس یا فوج کے حوالے کرنے کی کوشش کی تو شاید میں بھاگ جاؤں۔ اور مجھے راستے سے ہٹانے کے لئے اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ اپنے بارے میں ایک جھوٹی کہانی سنا کر میری بھی ہمدردیاں حاصل کیں اور خود بھی میری ہمدرد بن گئی اور اپنے حسن و شباب کے سنہرے جال میں پھنسا کر وہ مجھے میرے راستے سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور میں ہی وہ بیوقوف تھا جو اُس کی چال میں آ گیا تھا اور اُس کے سنہرے جال میں پھنس کر غیر شعوری طور پر اپنے اصل

مقصد سے ہٹتا جا رہا تھا۔

لیکن نہیں..... شاید ایسا نہیں تھا۔ میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ آج جو کچھ ہوا تھا اس سے ہندو فوجیوں سے سیتا کی نفرت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اُس نے میرے خلاف کوئی سازش نہیں کی تھی..... وہ واقعی میری مدد کر رہی تھی..... اور یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس میں شاید اُس کے ارادے کو بھی دخل نہیں ہوگا۔ جوانی تو ہوتی ہی خطرناک ہے اس کا اندازہ مجھے بھی ہو چکا تھا۔ سیتا کی جوانی بھی اُسے بہکا رہی تھی۔ بار بار.....

غاروں میں بتدریج اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ ابھی شام تو نہیں ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے باہر ابھی دُھوپ چمک رہی ہو لیکن روشنی براہِ راست ان گھپاؤں کے اندر تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے یہاں اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

میں نے سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا، چٹان کے اُوپر والے دہانے کے قریب چیڑ کا فلک بوس درخت ہوا میں جھوم رہا تھا اور اُس کی شاخوں پر دُھوپ چمک رہی تھی۔ دفعتہً میرے ذہن میں ایک خیال آیا یہاں تاریکی میں دبکے رہنے سے تو بہتر تھا کہ میں اُوپر چلا جاؤں اور جب تک دن کی روشنی ہے وہیں بیٹھا رہوں۔ اور ممکن ہو تو رات میں اوپر ہی کھلی فضا میں گزاروں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کمبل اور ایک رائفل اُٹھا لی اور سیتا کے بتائے ہوئے راستے پر اُوپر چڑھنے لگا۔ وہ راستہ زیادہ دُشوار نہیں تھا۔ سیڑھیوں کی طرح تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پتھر اُبھرے ہوئے تھے۔ میں بڑی آسانی سے اُوپر پہنچ گیا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کم از کم ایک گھنٹہ باقی تھا۔ فلک بوس درختوں اور اُونچی پہاڑیوں کی چوٹیوں میں دُھوپ چمک رہی تھی۔ وہ درخت جو غار کے اندر سے بھی نظر آ رہا تھا وہ دہانے سے دس بارہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں اُسی درخت کے قریب ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ درخت کے نیچے جھاڑیوں میں چلغوزے اور اُن کے لٹو نما پھل بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے قریب سے کچھ چلغوزے جمع کر لئے۔ یہ حسین وادی ایسی ہی تھی۔ قدرت نے اسے بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا۔ پھل دار درخت تو پہاڑوں میں اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ کوئی اُن تک پہنچنے والا نہیں تھا اور اُن درختوں کا پھل اسی طرح ضائع ہو جاتا تھا۔

میں چلغوزے چھیلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ڈوڈا سرینگر سے بہت دُور تھا۔ یہاں کی جغرافیائی صورتحال بھی سرینگر اور کشمیر کے باقی حصوں سے مختلف تھی۔ پہاڑ زیادہ تر خاکستری اور بنجر تھے۔ سبزہ بھی کم تھا اور درخت بھی نہیں نہیں تھے۔ اس طرف سے جیسے جیسے جموں کی طرف چلتے جائیں یہ تبدیلی نمایاں ہوتی جائے گی۔ جموں کے پہاڑ زیادہ تر بنجر اور خشک تھے۔

ریاست جموں و کشمیر دنیا کا واحد خطہ ہے جو طبیعات، موسم، جغرافیائی اور فطری حسن کے اعتبار سے تین حصوں میں منقسم ہے۔ جموں کشمیر اور لداخ کے نہ صرف موسمی مزاج مختلف ہیں

بلکہ ان کی تہذیب و معاشرہ اور زبانیں بھی ایک دوسرے سے قطعی جداگانہ اور مختلف ہیں۔ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی یہ تینوں حصے ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ جموں اور کشمیر میں سکھ بھی آباد ہیں اور ہندو بھی۔ ہندو لاتعداد مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں۔ مسلمان ایک خدا کے آگے سر جھکاتے ہیں اور لداخ کے رہنے والے مہاتما بدھ کے پیروکار ہیں۔ یہ خطہ اس لحاظ سے بھی دنیا بھر میں منفرد مقام رکھتا ہے کہ یہاں جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی قدرت نے ایسی ایسی نعمتیں پیدا کی ہیں جو دنیا کے کسی اور خطے میں میسر نہیں ہیں۔

میں چلغوزے چھیل کر کھاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ سیتا کی بستی یہاں سے نظر نہیں آ رہی تھی لیکن بہت دُور نشیب میں ایک سرمئی سی بل کھاتی ہوئی لکیر چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ سڑک تھی یا کوئی دریا۔

بتدریج مغرب کی طرف جھکتا ہوا سورج ایک بلند پہاڑی چوٹی کے پیچھے غائب ہو گیا۔ دن کی روشنی دھندلکے میں بدلنے لگی۔ میں نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں ایک ایسی جگہ منتخب کر لی جہاں تیز ہواؤں سے بچا جا سکتا تھا اور آرام سے رات گزاری جا سکتی تھی۔

شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ رات کی تاریکی میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی خنکی بھی بڑھ رہی تھی۔ میں نے کمبل آدھا نیچے بچھا لیا اور آدھا اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور نیم دراز ہو کر آسمان کو گھورنے لگا۔ اندھیری رات میں ایسا روشن آسمان میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں جھلملاتے ہوئے ستارے عجیب منظر پیش کر رہے تھے مگر ان کی روشنی زمین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

تیز ہوا سے درختوں اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ سے فضا بڑی پُر ہول سی ہو گئی تھی۔ یہاں رات کی تاریکی میں کسی انسان کے آنے کا اندیشہ تو نہیں تھا لیکن کسی جنگلی جانور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے رائفل اپنے پہلو میں رکھ لی تھی تاکہ کسی ایسی صورتحال میں اُس پر فوراً ہاتھ ڈالا جا سکے۔

آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو گھورتے ہوئے میں ایک بار پھر سیتا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اور پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے پاس ہو..... میرے ساتھ ہو..... میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس حسین تصور میں کھو کر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○

تڑتڑاہٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا.....

وہ فائرنگ کی آواز تھی جیسے آٹومیٹک رائفل کا پورا برسٹ مارا گیا ہو۔ میں نے بڑی پھرتی سے کمبل ہٹا کر رائفل سنبھال لی اور پتھروں کی آڑ سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ فائرنگ کی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔

سورج بہت دیر پہلے طلوع ہو چکا تھا۔ دُھوپ کی تپش بڑھ رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہونے لگی کہ میں اس قدر گہری نیند سویا رہا کہ دن چڑھے تک آنکھ نہیں کھل سکی۔

میں نے کمبل لپیٹ لیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر پتھروں کی آڑ سے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دُور دُور تک کسی ذی رُوح کا نام ونشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور میرے لئے یہ اندازہ لگانا بھی دُشوار تھا کہ فائرنگ کی وہ آواز کس طرف سے آئی تھی؟ آیا بستی میں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی یا کسی اور طرف۔

میں نے کمبل اُٹھایا اور اُس کھوہ میں اُترتا چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ سیتا ضرور آئے گی اور مجھے اس گپھا میں نہ پا کر پریشان ہوگی۔ غار میں ابھی تک اندھیرا تھا۔ میں ٹٹولتا ہوا اُس جگہ پہنچ گیا جہاں چادر اور بھارتی فوجیوں والی دونوں رائفلیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے قریب ہی وہ پوٹلی بھی پڑی تھی جس میں کل دوپہر کی بچی ہوئی روٹی تھی۔ میں نے پوٹلی کی طرف ہاتھ بڑھایا، پھر رُک گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد غار میں بھی اُوپر سے آنے والی روشنی سے مدھم سا اُجالا ہو گیا۔ میں کپڑے اُتار کر اُس چھوٹی سی ندی میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور گڑوی سے پانی اپنے اُوپر ڈالنے لگا۔

میں نے نہا کر کپڑے پہنے ہی تھے کہ ان گپھاؤں میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ آواز بھارتی بوٹوں کی نہیں ہلکے قدموں کی تھی۔ وہ سیتا ہی ہو سکتی تھی۔ مگر میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں رائفل سنبھال کر ایک چٹانی ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔

''شمروز..... شمروز..... کہاں ہو تم؟'' وہ سیتا کی آواز تھی۔ میں ستون کی آڑ سے نکل آیا۔

''میں یہاں ہوں سیتا..... اس طرف۔'' میں نے جواب دیا۔

ٹھیک ایک منٹ بعد سیتا چٹانی ستونوں کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ قریب آتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اُسے سہارا دے کر دیوار کے قریب کمبل پر بٹھا دیا۔

''کیا ہوا..... تم اتنی بدحواس کیوں ہو؟ کیا فوجیوں نے بستی پر حملہ کر دیا ہے؟ میں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔'' میں نے کہا۔

''اُنہوں نے چاچا قربان علی کو مار دیا.....'' سیتا نے اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''چاچا قربان علی ہر جمعرات کی صبح اور شام کو حضوری بابا کے مزار پر جاتا تھا۔ آج صبح سویرے جب وہ وہاں گیا تو وہاں پہلے سے چھ ہندو فوجی موجود تھے۔ اُنہوں نے غار میں وہ چیزیں بھی تلاش کر لی ہیں جو ہم نے وہاں چھپائی تھیں۔ اُنہوں نے چٹان کی دوسری طرف پتھروں پر خون اور بھیجے کے دھبے بھی دیکھ لئے تھے۔ وہ چاچا قربان علی سے دو

گمشدہ فوجیوں کے بارے میں پوچھتے رہے، پھر اُسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ فائرنگ کی آواز ہم نے بستی میں بھی سنی تھی.....'' سیتا رُکے بغیر بولے جا رہی تھی۔

''ہندو سینک چاچا قربان علی کی لاش گھسیٹتے ہوئے بستی میں لے آئے۔ لاش بستی کے چوک پر ڈال کر دو فوجی چاچا قربان علی کے گھر میں گھس گئے اور نیلم کو بالوں سے پکڑ کر مارتے گھسیٹتے ہوئے چوک پر لے آئے۔ بستی کے ہندوؤں سے اُنہوں نے کچھ نہیں پوچھا۔ اُنہیں اپنے دو گمشدہ سینکوں کی موت کا یقین ہو چکا تھا اور اُن کا خیال ہے کہ اُنہیں کسی مسلمان نے ہی قتل کر کے لاشیں کسی کھڈ میں پھینک دی ہیں۔ چاچا قربان علی کا گھر اُس بستی کا واحد مسلمان گھر ہے۔ اُنہوں نے چاچا قربان علی کو تو مار دیا اور نیلم پر تشدد کرنے لگے۔ اُنہوں نے نیلم کو بستی والوں کے سامنے ننگا کر دیا اور اُسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے رہے۔ اُنہیں یہ بھی شبہ تھا کہ اس غار میں کوئی مجاہد پناہ لئے ہوئے تھا اور چاچا قربان علی اور اُس کی بیٹی اُس کی مدد کر رہے تھے۔ وہ نیلم سے اُس مجاہد کے بارے میں پوچھ رہے تھے مگر نیلم نے زبان نہیں کھولی۔''

''تم نے بستی سے بھاگ کر غلطی کی۔'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''بستی والے جانتے ہیں کہ تم اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہو۔ تم بستی سے بھاگ آئی ہو تو اُنہیں تم پر شبہ ہو سکتا ہے۔''

''شبہ ہی نہیں اُن سینکوں کو یقین آ چکا ہے کہ ان دو ہندو فوجیوں کے قتل میں میرا بھی ہاتھ ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' میں اُچھل پڑا۔

''کل جب اُن دو فوجیوں نے مجھے دبوچ رکھا تھا تو دھینگا مشتی میں میرے گلے کا لاکٹ زنجیر ٹوٹ کر وہاں گر گیا تھا۔ وہ لاکٹ اُنہیں وہیں سے ملا ہے جہاں آس پاس پتھروں پر خون بکھرا ہوا ہے۔ اُس لاکٹ کے اندر میرا نام کندہ ہے۔ وہ لوگ بستی میں مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ اگر میں اُن کے ہاتھ آ جاتی تو وہ میرا نیلم سے بھی برا حشر کرتے۔ میں بڑی مشکل سے بستی سے نکل کر اس طرف آئی ہوں۔ اب ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ ہمیں تلاش کرتے ہوئے اس طرف آ جائیں۔''

''بستی میں میرے بارے میں کوئی اور بھی جانتا ہے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''کوئی نہیں.....'' سیتا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''چاچا قربان علی ختم ہو گیا۔ نیلم اُن کے قبضے میں ہے اور ہو سکتا ہے وہ زیادہ دیر تک تشدد برداشت نہ کر سکے اور تمہارا نام بھی اُس کے منہ سے نکل جائے۔''

''کیا اُسے معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اب دیر مت کرو۔ یہ کمبل وبل یہیں چھوڑ دو اور اپنی رائفل اُٹھاؤ۔ ایک رائفل میں لے لیتی ہوں اور دوسری رائفل یہیں پڑی رہنے دو۔''

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہو گیا تھا کہ مجھے کچھ سوچنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف ایک ہی بات تھی۔ نیلم اُن کے قبضے میں تھی۔ وہ معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کب تک تشدد برداشت کر سکے گی؟

میں نے ایک رائفل اُٹھا کر سیتا کے حوالے کر دی۔ دوسری رائفل اُٹھا کر اُس کا میگزین نکالا اور رائفل پانی میں پھینک دی۔ کمبل، چادر اور پیتل کی گڑوی وہاں سے اُٹھا کر آگے پھینک دی جہاں کسی قدر اندھیرا تھا۔ سیتا اُوپر جانے والے راستے کی طرف لپکی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی تھا۔

پوری طرح باہر آنے سے پہلے سیتا نے دہانے سے سر اُبھار کر باہر دیکھا اور پھر مجھے اشارہ کر دیا۔ میں بھی اُس کے ساتھ ہی اُس چٹان کے کھوکھلے سینے سے باہر نکل آیا۔ سیتا اشارہ کرتی ہوئی ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی لپکا اور اسی وقت پہاڑیوں میں فائرنگ کی آواز گونج اُٹھی..... شاید آٹومیٹک رائفل کا پورا برسٹ مارا گیا تھا۔

میں رُک گیا اور پیچھے مُڑ کر دیکھنے لگا۔ آواز پہاڑیوں میں چاروں طرف گونجتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ فائرنگ بستی میں ہوئی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلم کا چہرہ گھوم گیا..... میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

سیتا مجھ سے چند گز آگے تھی۔ اُس نے مُڑ کر میرا ہاتھ پکڑا اور پتھروں میں ایک طرف دوڑنے لگی۔ ہم کچھ دُور بلندی پر جانے کے بعد دوسری طرف نشیب میں اُترنے لگے۔ دوڑتے دوڑتے سیتا کا سانس پھول گیا۔ مگر اُس پر اس قدر خوف طاری تھا کہ وہ سانس لینے کو بھی کہیں نہیں رُک رہی تھی۔ اور پھر دفعتہً وہ لڑکھڑا گئی۔ اُس جگہ چھوٹے چھوٹے پتھر تھے۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اُن پتھروں پر اُس کے پیر نہیں جم سکے۔ وہ نیچے گری اور ڈھلان پر لڑھکتی چلی گئی.....

میں نے اُس کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور چند گز لڑھکنے کے بعد اُسے پکڑ لیا۔ اُسے گرفت میں لینے کے بعد بھی ہم کتنی دُور تک لڑھکتے چلے گئے اور پھر میں نے ایک بڑے پتھر پر پیر جما دیئے۔ میں تو رُک گیا تھا مگر سیتا نیچے کی طرف پھسلتی گئی اور اُس کے ساتھ ہی میرے ہوش اُڑ گئے۔ اُس پتھر سے آگے ڈھلان اچانک ہی ختم ہو گئی تھی..... اُس چٹان نے ایک عمودی دیوار کی شکل اختیار کر لی تھی اور تقریباً دس فٹ نیچے ایک اور مسطح ڈھلان تھی جو دُور تک چلی گئی تھی.....

سیتا کو میں نے کلائی سے پکڑ رکھا تھا اور وہ نیچے لٹکی چیخ رہی تھی۔ میں نے جس پتھر پر پیر جما رکھے تھے وہ اگرچہ کافی بڑا تھا مگر عین کنارے پر تھا اور میرے دباؤ کی وجہ سے آہستہ آہستہ اپنی جگہ چھوڑ رہا تھا۔

''سیتا.....!'' میں نے اُس کے خوفزدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بلندی زیادہ نہیں ہے۔ میں تمہارا ہاتھ چھوڑ رہا ہوں۔ اپنے آپ کو سنبھال کر بائیں طرف ہٹ جانا۔ یہ پتھر بھی جگہ چھوڑ

رہا ہے۔''

''نہیں نہیں..... مجھے مت.....''

''ہوشیار.....!'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی اور اس کے ساتھ ہی اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

سیتا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ بھد سے نیچے گری۔ اُس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اُٹھ کر بائیں طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔

پتھر اپنی جگہ چھوڑ رہا تھا..... میں نے سینے کے بل اوندھے ہو کر اُوپر چند جھاڑیوں کو پکڑ لیا اور اپنے پیر کو آہستہ آہستہ پتھر سے ہٹانے لگا بلکہ پتھر خود ہی میرے پیروں سے ہٹنے لگا۔ پتھر اپنی جگہ سے اُکھڑ کر دس بارہ فٹ نیچے گرا اور گڑگڑاہٹ کی مہیب آواز پیدا کرتا ہوا نیچے والی ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ میرے پیروں کے قریب سے اور بھی لاتعداد پتھر اُکھڑ کر نیچے گرے تھے مگر میں جھاڑیوں کو پکڑے سینے کے بل زمین سے چپکا رہا۔ دو تین منٹ بعد میں نے اپنے آپ آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھایا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سیتا نیچے پتھروں پر بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی اور چیخ چیخ کر مجھے محتاط رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔ اُوپر والی ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے ہم دونوں کی رائفلیں چند گز اُوپر گر گئی تھیں۔ میں محتاط انداز میں چلتا ہوا اُوپر پہنچ گیا اور دونوں رائفلیں اُٹھا کر آہستہ آہستہ پھسلتا ہوا نیچے آ گیا۔ کنارے پر پہنچ کر میں نے دونوں رائفلیں نیچے لٹکا کر سیتا کو پکڑا دیں اور پھر خود چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا۔

اب ہمارے سامنے وسیع و عریض پتھریلا میدان تھا جو بتدریج نشیب کی طرف چلا گیا تھا۔ اس میدان کے اختتام پر اُونچے پہاڑ تھے۔ اس بنجر میدان میں پتھر اور چھوٹی چھوٹی خشک جھاڑیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ البتہ بہت دُور درختوں کا ایک جھنڈ سا دکھائی دے رہا تھا۔

سیتا زمین پر بیٹھی اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی اُس کے قریب بیٹھ گیا اور اس وقت میں نے پہلی مرتبہ اُس پر توجہ دی تو پتہ چلا کہ وہ ننگے پیر تھی۔ اُس نے اگرچہ شلوار قمیض پہن رکھی تھی لیکن چپلی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ پتھروں پر ننگے پیر دوڑتے ہوئے اُس کے پیروں کے تلوے سرخ ہو گئے تھے۔

''تمہارے سینڈل شاید راستے میں کہیں گر گئے ہیں۔'' میں نے اُس کے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں.....'' سیتا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں تو گھر سے ہی ننگے پیر بھاگی تھی اور دوپٹہ بھی نہیں لے سکی تھی۔ اگر چپل وغیرہ کی تلاش میں رہتی تو پکڑی جاتی کیونکہ جس وقت میں مکان کے پچھلے دروازے سے نکل رہی تھی اُس وقت ایک فوجی سامنے والے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں گلیوں میں چھپتی چھپاتی بستی سے باہر آ گئی اور اس طرف درختوں میں گھس کر دوڑتی ہوئی جھیل کی طرف آ گئی۔''

''اُنہیں یہ پتہ چل گیا ہو گا کہ تم گاؤں کے مکھیا کی بھانجی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کیا وہ

تمہارے ماما کو نہیں پکڑیں گے؟''

''ماما کل شام سے ذرا پہلے کسی کام سے ڈوڈا چلا گیا تھا۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اُسے اناج کے آڑھتی سے سال بھر کا حساب کرنا ہے۔ وہ اس وقت تو ڈوڈا ہی میں ہوگا مگر یہ سینک اُسے چھوڑیں گے نہیں۔ ہوسکتا ہے ڈوڈا ہی سے اُسے گرفتار کرلیا جائے۔ اُس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو گا مجھے افسوس ہوگا۔ مگر سب سے زیادہ افسوس تو مجھے چاچا قربان علی اور نیلم کا ہے..... چاچا قربان علی بے گناہ مارا گیا اور بیچاری نیلم..... اُسے میں نے جس حال میں دیکھا ہے وہ سوچ کر اب بھی میری آتما کانپ اُٹھتی ہے۔''

''جب ہم ان گپھاؤں سے نکل کر بھاگے تھے تو اُس وقت بھی فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی.....'' میں نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے اُسے بھی اُس کے باپ کی طرح گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا ہو۔''

''میرا خیال ہے نہیں.....'' سیتا بولی۔ ''تم ان ہندو سینکوں کو نہیں جانتے۔ نیلم جوان اور حسین لڑکی ہے۔ وہ لوگ پہلے خونخوار بھیڑیوں کی طرح اُسے بھنبھوڑیں گے، اُس کی بوٹیاں نوچیں گے اور اُس وقت تک اُسے روندتے رہیں گے جب تک اُس کی آتما اُس کے شریر کا ساتھ نہیں چھوڑ دیتی۔''

میری بہن کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا..... درندہ صفت ہندو فوجی سوپور پر حملے کے وقت اُسے اُٹھا کر لے گئے تھے اور پھر وہ تین چار مہینوں بعد مجھے ہندواڑہ میں ایک سڑک پر اس طرح پڑی ہوئی ملی تھی کہ اُس کی زندگی کا سارا رس نچوڑ لیا گیا تھا..... اُس کی رُوح کو بری طرح کچل دیا گیا تھا..... صرف اپنی بہن کیا میں نے وادی کی اور بھی کئی مسلمان لڑکیوں کو اس حال میں دیکھا تھا۔ اُنہیں پامال کر کے اُن کی رُوح کو کچل کر اس طرح پھینک دیا جاتا تھا کہ وہ کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہتی تھیں۔ اُنہیں یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ کون ہیں، کہاں ہیں؟ دوسروں کو تو کیا وہ اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتی تھیں۔

نیلم بھی جوان تھی اور بے حد حسین تھی۔ شومئی قسمت سے وہ ان بھیڑیوں کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ سیتا ٹھیک ہی تو کہتی تھی کہ وہ اُسے گولیوں سے چھلنی کر کے ضائع نہیں کریں گے۔ پہلے اُس کے خوبصورت جسم سے اُس کی زندگی ایک ایک قطرہ کر کے نچوڑ لی جائے گی اور پھر اُسے بھی زینب کی طرح کہیں پھینک دیا جائے گا.....

''لیکن فائرنگ کی وہ آواز.....؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے سیتا کی طرف دیکھا۔

''چاچا قربان علی بہت اچھا آدمی تھا.....'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''بستی کے کسی شخص کو اُس سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی۔ سب ہی لوگ اُس کی بہت عزت کرتے تھے۔ نیلم کو بھی سب لوگ بہت چاہتے تھے۔ ہر گھر میں اُس کا اس طرح آنا جانا تھا جیسے وہ اُس کا اپنا ہی گھر ہو۔ ہوسکتا ہے.....'' وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''ہوسکتا ہے اُس کی

بے بسی اور فوجیوں کے ہاتھوں اُس کی ذلت اور رسوائی دیکھ کر بستی ہی کے کسی آدمی کی غیرت جاگ اُٹھی ہو اور وہ اُسے بچانے کے لئے آگے بڑھا ہو تو اُن وحشیوں نے اُسے گولیوں سے بھون ڈالا ہو.....''

''ہوسکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو۔'' میں نے سر ہلا دیا۔

چند لمحے خاموشی میں گزر گئے اور پھر سیتا اپنا گلا سہلاتے ہوئے بولی۔

''مجھے پیاس لگ رہی ہے۔''

میں ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دُھوپ تیز ہوگئی تھی۔ پتھر تپ گئے تھے۔ آس پاس سائے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ میری نظریں درختوں کے اُس جھنڈ پر جم گئیں جو وہاں سے کم از کم نصف میل دُور تھا۔ جہاں درخت یا کچھ سبزہ ہو وہاں پانی لازمی ہونا چاہئے۔

''درختوں کا وہ جھنڈ دیکھ رہی ہو؟'' میں نے اُس طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں شاید پانی مل جائے۔ ہوسکتا ہے کوئی چشمہ ہو یا اُس طرف کوئی ندی ہو۔ وہاں تک چل سکو گی؟ دُھوپ بھی تیز ہو رہی ہے۔ کچھ دیر درختوں کے سائے میں آرام بھی کرلیں گے۔''

''چلو.....'' سیتا اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اُس نے اپنی رائفل کندھے پر لٹکا لی تھی۔

میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن چند گز چلنے کے بعد ہی سیتا بار بار کراہنے لگی۔ اُس نے جوش اور موت کے خوف سے ننگے پیر پتھروں پر دوڑتے ہوئے ایک طویل فاصلہ طے کرلیا تھا۔ لیکن اب جبکہ ہم خطرے کی حدود سے نکل چکے تھے وہ ہمت ہار بیٹھی تھی۔ پیروں میں پتھر چبھتے تو وہ بے اختیار کراہ اُٹھتی اور پھر گرمی کا احساس بھی اب ہونے لگا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی اور پتھر بھی تپ کر آگ اُگل رہے تھے۔ میری قمیض بھی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ پسینے کی دھاریں کیچوؤں کی طرح گردن پر قمیض کے نیچے کمر پر رینگ رہی تھیں۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ دُھوپ کی تپش سے اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور گردن پر پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ نصف میل کا یہ فاصلہ طے نہیں کر سکے گی۔

''ایک منٹ..... رُک جاؤ!'' میں نے کہا اور زمین پر بیٹھ کر اپنے جوگرز اُتارنے لگا۔ یہ جوگرز میں بہت عرصہ سے استعمال کر رہا تھا۔

''لو..... تم میرے جوتے پہن لو! چلنے میں آسانی رہے گی۔'' میں نے کہا۔ سیتا نے پہلے تو انکار کیا پھر جوتے پہن لئے۔ جوتے پہنتے ہوئے بھی وہ بے اختیار کراہ اُٹھی تھی۔ میرے یہ جوتے اُس کے پیروں میں اگرچہ خاصے بڑے تھے مگر وہ پیر گھسٹ گھسٹ کر چلتی رہی۔

اگر میں سیتا کو اپنے جوتے نہ پہناتا تو وہ نصف میل کا یہ فاصلہ کبھی بھی طے نہیں کر سکتی تھی۔ اب میں ننگے پیر تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں پتھروں پر نہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر چل رہا ہوں..... نوکیلے پتھر چبھتے تو میں بے اختیار کراہ اُٹھتا۔

○○○

خدا خدا کر کے کسی نہ کسی طرح درختوں کے جھنڈ تک پہنچ گئے اور اس کے ساتھ ہی ہم دونوں کے چہروں پر رونق سی آ گئی.....

اُس جگہ سے آگے نشیب تھا۔ دُور سے تو چند ہی درخت نظر آ رہے تھے لیکن آگے نشیب میں ایک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ درخت اگرچہ چھدرے تھے لیکن دُور دُور تک نظر آ رہے تھے اور اُن میں زیادہ تر انجیر کے درخت تھے اور بعض درخت تو پھل سے لدے ہوئے تھے۔

جنوب کی طرف سے آنے والا ایک برساتی نالا اُس جنگل میں بل کھاتا ہوا کہیں غائب ہو گیا تھا۔ برسات کے موسم میں تو اس نالے میں یقیناً سیلابی کیفیت رہتی ہو گی مگر ان دنوں وہ صورتحال نہیں تھی۔ بہت کم پانی تھا جو نالے کے عین وسط میں بہہ رہا تھا۔

سیتا نالے میں اُتر کر گرسی گئی اور کسی جانور کی طرح منہ ڈال کر پانی پینے لگی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

میرا حلق بھی پیاس کی شدت سے خشک ہو رہا تھا۔ میں نے بھی سیر ہو کر پانی پیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے پانی سر پر ڈالنے لگا۔ گرمی سے میرا دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ ابھی دن کا ابتدائی حصہ تھا۔ میرے خیال میں گیارہ بجے ہوں گے مگر گرمی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اپنے پیروں کو دیکھا، گرم تپتے ہوئے پتھروں پر چلنے سے تلوے بالکل سرخ ہو رہے تھے۔ میں نے پیر پانی میں ڈال دیئے۔ سیتا نے بھی جوتے اُتار کر پھینک دیئے تھے اور وہ بھی پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

ہم جس جگہ بیٹھے ہوئے تھے وہاں دُھوپ تھی۔ میں نالے کے بہاؤ کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید کوئی ایسی جگہ ہو جہاں یہ نالہ درختوں کے سائے سے گزرتا ہو۔ تقریباً بیس گز آگے ایسی جگہ نظر آ گئی۔ میں نے گردن گھما کر سیتا کی طرف دیکھا تو میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

سیتا نے قمیض اُتار دی تھی اور اُس کا پنڈا دُھوپ میں کندن کی طرح چمک رہا تھا..... میں نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور قریب پڑی ہوئی دونوں رائفلیں اُٹھاتے ہوئے بولا۔ ''دُھوپ بہت تیز ہے..... اُس طرف چلو! وہاں سایہ ہے۔''

سیتا نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا اور اُٹھ کر لڑکھڑاتی ہوئی سائے والی جگہ کی طرف چل پڑی۔ اُس نے اپنی قمیض اور جوتے بھی وہیں چھوڑ دیئے جو مجھے اُٹھانے پڑے۔

سائے میں جا کر سیتا پھر پانی میں پیر ڈال کر بیٹھ گئی۔ میں نے رائفلیں اور جوتے ایک

طرف رکھ دیئے اور خود بھی شرٹ اُتار دی۔ پسینہ دھاروں کی صورت میں جسم پر بہہ رہا تھا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا اُس کے کندن جیسے بدن پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

میں اپنا دھیان بٹانے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ریش، کیکٹس اور انجیر کے درخت ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے اور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کیکٹس میں تو ظاہر ہے کوئی پھل نہیں لگتا۔ ریش بھی ایسا ہی درخت تھا اُس میں کوئی پھل نہیں آتا لیکن یہ اُونچا اور سایہ دار درخت ہوتا ہے اور اس کی لکڑی عام طور پر جلانے کے کام ہی آتی ہے۔ انجیر کا درخت زیادہ اُونچا تو نہیں ہوتا لیکن یہ پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس کا پھل زمین پر کھڑے کھڑے آسانی سے توڑا جا سکتا ہے۔

ہم ریش کے درخت کے گھنے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پسینے میں بھیگے ہوئے جسم کو چھوتی ہوئی ہوا بہت بھلی لگ رہی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ہوا بھی گرم ہوتی چلی جائے گی۔

میں اُٹھ کر انجیر کے ایک درخت کی طرف آ گیا۔ شاخیں پھل سے لدی ہوئی تھیں۔ پھل میں بہت ہلکا سا گلابی پن آ گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ پھل پک رہا تھا۔ میں نے ایک انجیر توڑ کر منہ میں ڈالی۔ انجیر میٹھی اور رس سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے نیچے والی شاخوں سے خوب پکی ہوئی کئی انجیریں توڑ لیں اور سیتا کے قریب آ گیا۔ انجیریں پانی میں دھو کر پتھروں پر رکھ دیں۔

''کھاؤ..... بہت مزیدار ہیں۔'' میں نے ایک انجیر اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

سیتا نے میری طرف دیکھا اور انجیر لے کر کھانے لگی۔ میں بھی ایک انجیر کھاتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے جسم کے بالائی حصے پر مختصر سا انرگارمنٹ تھا جس سے سینے کے گلابی اُبھار قیامت خیز منظر پیش کر رہے تھے۔ میں اُس کی طرف سے نظریں چرانے کی کوشش کرتا رہا۔

پیٹ بھرنے کے بعد سیتا ندی کے کنارے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر لیٹ گئی۔ اُس وقت میری نظریں اُس کے پیروں کی طرف اُٹھ گئیں اور میں کانپ اُٹھا۔ پیروں کے تلوے بالکل سرخ ہو رہے تھے جیسے ابھی خون بہہ نکلے گا۔

وہ شہر کی رہنے والی دولت مند گھرانے کی فرد تھی۔ بڑے ناز و نعم میں پلی تھی۔ یہاں تو وہ اپنے ماما کے پاس سیر و تفریح کے لئے آئی تھی لیکن اس مصیبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اُس نے زندگی میں کبھی کوئی مشقت کا کام نہیں کیا ہو گا لیکن یہاں اپنی جان بچانے کے لئے اُسے ننگے پیر میلوں دُور تک تپتے ہوئے پتھروں پر دوڑنا پڑا تھا۔ اُس کے پیروں کو دیکھ کر میں کہہ سکتا تھا کہ اگر کچھ دُور اور ننگے پیر پتھروں پر چلنا پڑتا تو اُس کے تلوؤں سے خون بہنا شروع ہو جاتا۔

میں نے اپنی اور سیتا کی پسینے میں بھیگی ہوئی قمیض دھو کر دُھوپ میں ڈال دی اور سیتا سے کچھ فاصلے پر لیٹ گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی اور ہوا میں بھی حدت پیدا ہو رہی تھی۔ یہاں اگرچہ

درختوں کا سایہ میسر تھا مگر چاروں طرف بنجر، خشک اور تپتے ہوئے پہاڑ تھے جن کی وجہ سے ہوا بھی گرم ہو رہی تھی۔ ایسی صورتحال میں سفر آگے جاری رکھنا ناممکن نہیں تو انتہائی دُشوار ضرور تھا۔ اور پھر ننگے پیر ہونے کی وجہ سے معاملہ کچھ اور بھی سنگین ہو گیا تھا۔ سیتا کے لئے تو اب ننگے پیر چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے میں نے اپنے جوتے اُسے دے دیئے تھے۔

ہم پوری دوپہر ندی کے کنارے درختوں کے سائے میں پڑے رہے۔ سہ پہر کے قریب دُھوپ میں تپش کم ہوئی تو میں نے وہاں سے روانگی کا فیصلہ کر لیا۔ سیتا کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟ اور میں بھی نہیں جانتا تھا کہ ہمیں کس طرف جانا ہے۔ کوئی باقاعدہ راستہ تو تھا نہیں۔ ہم شتر بے مہار کی طرح منہ اُٹھائے درختوں میں ایک طرف چلتے رہے۔

میں نے کچھ انجیریں توڑ کر رکھ لی تھیں لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ زیادہ انجیریں کھانے سے پیٹ میں گڑبڑ ہو سکتی ہے۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ سایہ دار درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور اب کہیں کہیں کیکٹس کے پودے نظر آ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیل گیا۔ ہم رُک رُک کر چلتے رہے۔ سیتا نڈھال ہو رہی تھی۔ اُس کے پیروں میں تکلف بڑھ گئی تھی جس سے چلنے میں اور بھی دُشواری پیش آ رہی تھی۔

آدھی رات کے قریب ہم ایک جنگل میں پہنچ گئے جو زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس جنگل سے باہر نکلتے ہی ہم ٹھٹھک کر رُک گئے..... سامنے ایک جگہ کسی قدر بلندی پر مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر میں اُس ٹمٹماتی ہوئی روشنی کی طرف دیکھنے لگا۔

○

وہ غالباً ایک ہی مکان تھا جس کا ہیولہ تاریکی میں نظر آ رہا تھا..... اور وہ مدھم سی زرد روشنی اُس مکان کی کھڑکی سے جھلک رہی تھی۔ اُس کمرے کے اندر لالٹین یا لیمپ روشن تھا۔ میں نے گردن گھما کر سیتا کی طرف دیکھا۔

''وہ شاید کوئی فارم ہاؤس ہے۔'' میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اس طرف بھی ایک مکان کا ہیولہ دکھائی دے رہا ہے۔ وہ اُس طرف.....'' اُس نے اشارہ کیا۔ پہلے مکان سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک اور مکان کا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا لیکن وہاں روشنی نہیں تھی۔ وہ مکان گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''کیا خیال ہے.....'' میں نے کہا۔ ''آگے بڑھا جائے؟''

''رسک تو ہے۔'' سیتا بولی۔ ''اگر یہ فارم ہاؤس کسی مسلمان کا ہوا تو ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔ پورے جموں کشمیر میں مسلمان مجاہدین کو اپنے گھروں میں پناہ دے دیتے ہیں اور ان کی بھرپور

مدد کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ ہندو گھرانہ ہوا تو پھنس جائیں گے۔''

''لیکن..... تم تو ہندو ہو۔ تمہیں تو کسی بھی ہندو گھرانے میں پناہ مل سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

ہندو عورتیں اس طرح رائفلیں اُٹھائے رات کی تاریکی میں پہاڑوں میں نہیں بھٹکتیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''ہم کیا بہانہ کریں گے؟''

''ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اپنے بھگوان کو یاد کرو اور میں اپنے اللہ کو یاد کرتا ہوں اور ہم آگے چلتے ہیں۔ اگر ہندو گھرانہ ہوا تو تم بات کو سنبھالنے کی کوشش کرنا اور بتانا کہ مسلمان مجاہدین نے ہماری بستی پر حملہ کر دیا تھا اور ہم بڑی مشکل سے اپنی جانیں بچا کر بھاگے ہیں اور رات بھر پہاڑوں میں بھٹکنے کے بعد اس طرف آ نکلے ہیں۔ اور اگر یہ کسی مسلمان کا گھر ہوا تو میں معاملے کو سنبھال لوں گا۔''

''گویا ففٹی ففٹی۔'' سیتا بولی۔ ''ٹھیک ہے..... ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن ذرا رُک جاؤ..... تھکن سے بری حالت ہو رہی ہے۔ چند منٹ یہاں رُک کر دم لے لو۔ پھر آگے بڑھتے ہیں۔''

وہ زمین پر بیٹھ گئی اور میں بھی اُس کے قریب بیٹھ کر سامنے والے مکان کی طرف دیکھنے لگا جس کی ایک کھڑکی سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اُس کے آس پاس صرف ایک مکان کا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا جس کی نشاندہی سیتا نے کی تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی مکان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ قرب و جوار میں درختوں کے ہیولے ہوا سے جھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ہم تقریباً دس منٹ تک وہاں بیٹھے رہے اور پھر اُٹھ کر اُس مکان کی طرف چلنے لگے جس کی ایک کھڑکی سے روشنی جھلک رہی تھی۔ وہ مکان تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔ ہم محتاط انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ ابھی ہم مکان سے دُور ہی تھے کہ ایک کتا بھونکتا ہوا ہماری طرف لپکا..... سیتا چیخ کر میرے ساتھ لپٹ گئی۔ اس اچانک افتاد پر میں بھی بدحواس ہو گیا تھا۔ میں نے سیتا کو بڑی مشکل سے اپنے آپ سے الگ کیا اور کتے کو ہشکارنے لگا جو ہم سے چند گز کے فاصلے پر اُچھل اُچھل کر بھونک رہا تھا۔ میں نے زمین پر ٹٹول کر ایک پتھر اُٹھایا اور کتے کی طرف اُچھال دیا۔ کتا پیچھے ہٹا اور چند سیکنڈ بعد دوبارہ ہماری طرف لپکا۔

''گولی مار دو اسے۔'' سیتا خوفزدہ لہجے میں بولی۔ وہ ڈر کر میرے پیچھے ہو گئی تھی۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا.....'' میں نے کہا۔ ''اگر اس کتے کو گولی مار دی گئی تو معاملہ بگڑ جائے گا۔''

''اے..... کون ہے اِدھر.....'' مکان کی طرف سے ایک گونجتی ہوئی بھاری آواز سنائی دی۔

''مسافر ہیں بھائی..... اس کتے کو پیچھے ہٹاؤ!'' میں نے جواب دیا۔

''اپنی جگہ پر رُک جاؤ..... ورنہ گولی مار دُوں گا۔'' وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ اس مرتبہ اُس نے چیختے ہوئے کہا۔

''ہم چور یا ڈاکو نہیں ہیں۔ مصیبت کے مارے ہوئے ہیں۔ راستہ بھٹک کر اس طرف آ گئے

ہیں۔اس کتے کو یہاں سے ہٹاؤ!''

میری توقع کے عین مطابق نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ ایک عورت کی آواز سن کر اُس شخص کو شاید کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ وہ کتے کو ہشکارنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی قدموں کی ہلکی سی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ اور پھر وہ آدمی تاریکی سے نکل کر سامنے آ گیا۔ میں صرف اُس کا ہیولہ ہی دیکھ سکتا تھا۔ وہ قریب پہنچا تو اُس کے ہاتھوں میں ایک بندوق بھی نظر آ گئی۔

''کون ہو تم لوگ اور اس وقت.....''

''ہم مصیبت کے مارے ہوئے ہیں۔'' سیتا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''کیا تم ہمیں آگے آنے کو نہیں کہو گے؟ ہم طویل فاصلہ طے کر کے آئے ہیں اور تھکن اور بھوک سے ہماری بہت بری حالت ہو رہی ہے۔''

وہ شخص چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے.....آ جاؤ!''

ہمیں آگے بڑھتے دیکھ کر کتا غرانے لگا۔ اُس شخص نے کتے کو ڈانٹ دیا۔ اُسے ٹھوکر مارنے کے لئے پیر اُٹھاتے دیکھ کر کتا ایک طرف بھاگ گیا۔ اسی دوران ایک اور آدمی لالٹین لئے برآمدے میں آ گیا۔ لالٹین کی روشنی میں اُس شخص کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ وہ مسلمان تھا۔ سفید نوکدار چھوٹی داڑھی اور سر پر دھاگے کی بنی ہوئی گول ٹوپی..... اُس کے چہرے اور سفید بالوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پچاس سال سے اوپر ہی کا ہے۔ جو شخص لالٹین لے کر آیا تھا وہ کلین شیو تھا اور اُس کی عمر کا اندازہ تیس بتیس سال تک کا لگایا جا سکتا تھا۔

ہمارے ہاتھوں میں رائفلیں دیکھ کر سفید داڑھی والے کی آنکھوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی حالانکہ اُس کے ہاتھ میں ڈبل بیرل بندوق تھی۔ لیکن وہ اس بات کو بھی سمجھتا تھا کہ دو سب مشین گنوں کے سامنے اس بندوق کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

''آپ گھبرائیے مت.....'' میں نے اُس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ہم تو خود پناہ کی تلاش میں ہیں۔ آج کی رات گزار کر ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''مجاہدین سے مجھے کوئی خوف نہیں آتا۔ ان کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ آؤ..... اندر آ جاؤ!'' بوڑھے نے کہا۔

وہ ہمیں ایک کمرے میں لے آئے۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد گھر کے دوسرے افراد بھی وہاں جمع ہو گئے۔ ایک بوڑھی عورت تھی۔ دوسری کی عمر ستائیس اٹھائیس سال رہی ہو گی۔ اور ایک لڑکی تھی سولہ سترہ سال کی جبکہ گیارہ بارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا بھی دروازے میں کھڑا جھانک رہا تھا۔

خدا بخش نامی سفید داڑھی والا شخص اُس کنبے کا سربراہ تھا۔ کلین شیو والا اُس کا بیٹا اور دوسری عورت اُس کی بہو تھی۔ نوجوان لڑکی اُس کی بیٹی اور نوعمر لڑکا بیٹا تھا۔

''آرام سے بیٹھ جاؤ..... یہاں تم لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' بوڑھے خدا بخش نے کہا اور پھر اپنی بہو کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''یہ بہت تھکے ہوئے ہیں اور انہیں بھوک بھی لگ رہی ہو گی۔ ان کے کھانے کا کچھ بندوبست کرو۔''

بہو اور خدا بخش کی بیٹی فوراً ہی کمرے سے چلی گئیں۔ خدا بخش کی بیوی سیتا کے پاس بیٹھ گئی اور خدا بخش میرے ساتھ سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کا بڑا بیٹا امیر دین دوسرے لڑکے کے ساتھ دروازے میں کھڑا تھا۔

''تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تم لوگ بہت دُور سے سفر کر کے آ رہے ہو۔'' خدا بخش باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کون ہو تم لوگ.....اور کہاں سے آئے ہو؟''

''میرا نام شمروز ہے.....اور یہ سیتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''سیتا.....؟'' خدا بخش چونک گیا۔ ''اوہ.....تو تم شمروز ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ اتم نگر سے آئے ہو۔''

اس مرتبہ چونکنے کی باری میری تھی۔ اتم نگر سیتا کی بستی کا نام تھا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے تھے۔

''وادی کے ایک سرے پر کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کی خبر آناً فاناً دوسرے سرے تک پہنچ جاتی ہے۔'' خدا بخش نے کہا۔ ''ہمارا یہ فارم ہاؤس اگرچہ کسی آبادی سے کم از کم پانچ کوس دُور ہے لیکن کل صبح سویرے اتم نگر میں جو کچھ ہوا اس کی خبر ہم تک پہنچ چکی ہے۔ شمروز نام کا ایک مجاہد اور بستی کے کھیا کی بھانجی بستی میں قتل و غارت مچا کر بھاگے ہیں۔ پہاڑوں میں اور ڈوڈا کی طرف انہیں تلاش کیا جا رہا ہے۔ تم لوگ ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے ہو۔ یہاں فی الحال تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مجھے تو شمروز جیسے مجاہد کو اپنے غریب خانے میں پا کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' اُس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور دوبارہ اُس جگہ بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر میں اُس کے دِلی جذبات کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

''اور یہ لڑکی.....'' وہ سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کا کردار قابل تعریف ہے۔ اس نے حق کو پہچان لیا ہے۔ اس نے تمہاری مدد کی.....اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر تمہیں وہاں سے نکال کر لے آئی۔ خدا اسے اس نیکی کا اجر ضرور دے گا۔''

خدا بخش کی بیوی کنیز فاطمہ بھی سیتا کے ساتھ بہت محبت اور ہمدردی سے پیش آئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اس گھر میں بڑی پذیرائی ملی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہمارے لئے چاول تیار ہو گئے۔ سالن پہلے ہی سے موجود تھا۔ ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سیتا تو خواتین کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور مجھے خدا بخش اپنے کمرے میں لے آیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس کی کھڑکی سے روشنی ہم نے دُور سے دیکھی تھی۔

رات کو اگرچہ ہم دیر تک جاگتے رہے تھے لیکن صبح میری آنکھ بھی جلدی ہی کھل گئی۔ دوسرے مکان میں خدا بخش کا چھوٹا بھائی اللہ بخش اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ اُسے رات کو ہمارے آنے کی خبر نہیں ہو سکی تھی لیکن اس وقت وہ بیوی بچوں کے ساتھ یہاں موجود تھا۔

یہ ان کی پشتی زمین تھی جہاں زیادہ تر دھان کی کاشت ہوتی تھی۔ یہ دونوں بھائی اس اراضی کو سنبھالے ہوئے تھے۔ رات کو جسے ہم جنگل سمجھے تھے وہ دراصل انجیر کا بہت بڑا باغ تھا۔ درختوں کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی تھیں اور پھل کچھ عرصہ میں پکنے ہی والا تھا۔ دھان کی فصل بھی تیار ہونے والی تھی۔ فضا میں ہر طرف دھان کی مہک رچی ہوئی تھی۔ خدا بخش نے مجھے اپنے بیٹے امیر دین کے کپڑے دے دیئے اور میں نہانے کے لئے چشمے پر چلا گیا۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلے اور اپنے کپڑے دھو کر دُھوپ میں ڈال دیئے۔

جب میں واپس آیا تو سیتا بھی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے امیر دین کی بیوی کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

ناشتے کے بعد میں اور خدا بخش گھر کے سامنے درختوں کے نیچے بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ خدا بخش کشمیری حقہ گڑگڑاتے ہوئے باتیں بھی کر رہا تھا۔

یہ انکشاف میرے لئے خاصا سنسنی خیز ثابت ہوا کہ خدا بخش کا یہ فارم ہاؤس رام نگر نامی ایک بڑے قصبے سے پانچ چھ کوس کے فاصلے پر ہے۔ رام نگر ضلع جموں میں واقع تھا اور جموں شہر وہاں سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر تھا۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میں سونا مارگ کے قریب فوجی قافلے کو تباہ کرنے کے بعد انگوری کے ساتھ کسی نہ کسی طرح پہلگام کے قریب ایک فارم ہاؤس میں پہنچ گیا تھا جہاں بھارتی فوج کے ایک دستے نے چھاپہ مارا۔ اس چھاپہ مار کارروائی میں انگوری شہید ہو گئی اور میں زخمی ہو کر رات کی تاریکی میں وہاں سے بھاگ نکلا اور تین دن تک پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا ایک جگہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔

سیتا میرے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوئی۔ اُس نے مجھے اُٹھا کر ایک غار میں پہنچا دیا۔ ہوش میں آنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ غار ڈوڈا شہر سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ ہندو ہونے کے باوجود سیتا نے میری مدد کی اور بستی میں رہنے والے واحد مسلمان چاچا قربان علی سے بڑی رازداری سے میرا علاج کروایا۔ میں دو مہینوں تک اس غار میں رہا۔ میری موجودگی سے صرف تین افراد واقف تھے۔ سیتا، چاچا قربان علی اور اُس کی بیٹی نیلم۔ لیکن سیتا مجھ میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ اپنوں ہی سے چوٹ کھائے ہوئے تھی۔ وہ میری دیکھ بھال کرتی رہی۔ اور پھر دو ہندو فوجیوں نے سیتا کو بے آبرو کرنے کی کوشش کی۔ میں نے نہ صرف سیتا کو ان سے بچایا بلکہ ایک فوجی بھی میرے ہاتھوں مارا گیا دوسرے کو سیتا نے سینکڑوں

فٹ گہرے کھڈ میں دھکیل دیا۔

بھارتی فوجیوں کی ایک پارٹی اپنے گمشدہ دو فوجیوں کی تلاش میں اس طرف نکل آئی۔ انہوں نے پتھروں پر خون کے دھبے دیکھ لئے اور پھر اتفاق سے چاچا قربان علی ان کے ہاتھ لگ گیا جسے انہوں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا اور بستی میں پہنچ کر نیلم کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ اُن فوجیوں کو خون آلود پتھروں کے قریب سے ایک لاکٹ بھی ملا تھا جس پر سیتا کا نام لکھا ہوا تھا۔ اُنہیں سیتا کی تلاش تھی اور سیتا بستی سے بھاگ کر پہاڑی گپھاؤں میں میرے پاس آ گئی اور ہم دونوں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

سیتا نے میری خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈال رکھی تھی اور میرے ساتھ چلچلاتی دُھوپ میں انگاروں کی طرح تپتے ہوئے پتھروں پر دوڑتے ہوئے اُس کے پیر چھلنی ہو گئے تھے۔ مجھے سیتا کی نیت پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ اُس نے مجھے موت کے منہ سے بچایا تھا۔ اگر وہ مجھے بے ہوشی کی حالت میں اُٹھا کر چاچا قربان علی سے میرا علاج نہ کرواتی تو شاید میں وہیں پڑے پڑے ختم ہو چکا ہوتا۔ یا یہ بھی ہوتا کہ وہ بستی والوں کو میرے بارے میں اطلاع دے دیتی اور مجھے پولیس یا فوج کے حوالے کر دیا جاتا اور اس طرح میری کہانی ختم ہو چکی ہوتی۔ لیکن سیتا نے مجھ سے ہمدردی کی اور مجھے موت کے منہ سے بچا کر یہاں لے آئی۔ سیتا کی نیت پر شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن اب میں محسوس کرنے لگا تھا کہ سیتا غیر محسوس انداز میں مجھے میرے محاذ سے دُور لے جا رہی تھی۔ اس میں اُس کی نیت یا ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ تو میری ہمدردی کر رہی تھی۔ مجھے میرے دشمنوں سے بچانا چاہتی تھی۔

جموں اور کشمیر اگرچہ ایک ہی خطہ تھا۔ پچھلی نصف صدی سے بھارتی سامراج کے ظلم و ستم کا شکار ہو رہا تھا۔ آزادی کی تحریک اس خطے میں بھی شروع ہی سے چل رہی تھی۔ اس میں اُتار چڑھاؤ آتے رہتے تھے۔ کبھی لگتا تھا کہ طاغوتی قوتیں غالب آ رہی ہیں اور کبھی لگتا مٹھی بھر مجاہدین طاقتور بھارتی فوج کو نیست و نابود کر دیں گے۔ لیکن میرے خیال میں فیصلہ کن مرحلہ ابھی نہیں آیا تھا۔

ایک ہی خطہ ہونے کے باوجود جموں اور کشمیر موسمی، معاشرتی، جغرافیائی اور تہذیبی لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ کشمیر سرسبز تھا۔ وہاں کے پہاڑ جنگلوں سے لدے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ جھیلیں تھیں۔ دھرتی سبز مخملی گھاس اور رنگ برنگے پھولوں کی چادر سے ڈھکی رہتی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیاں بارہ مہینے سفید برف سے ڈھکی رہتی تھیں اور یہی برف پگھل کر گنگناتی ہوئی ندیوں، جھرنوں اور آبشاروں کو جنم دیتی تھی۔ کشمیر اگر جنت نظیر تھا تو جموں اس کے برعکس جہنم کا نمونہ پیش کرتا تھا۔

سلسلہ کوہ ہمالیہ کے انتہائی جنوب میں واقع جموں خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا ان بے آب و گیاہ پہاڑوں کے درمیان کہیں کہیں وسیع و عریض بنجر وادیاں پھیلی ہوئی

تھیں جہاں کیکٹس کے پودے تو بکثرت نظر آتے ہیں مگر کوئی اور پھل دار یا سایہ دار درخت دکھائی نہیں دیتا۔ تاہم جہاں پانی میسر ہے وہاں انجیر اور دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ جموں کی آبادی کا زیادہ حصہ ڈوگروں، سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ مسلمان بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ مگر ہندو سامراج نے ان کا جینا حرام کر رکھا ہے اور وہ اپنے حق کے لئے بندوق اُٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اُنیسویں صدی میں کشمیر اور جموں پر راجہ گلاب سنگھ کی حکمرانی تھی۔ اور پھر اُس نے یہ خطہ کوڑیوں کے مول انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا اور اس طرح اس وادی کی تاریخ نے ایک نیا موڑ لیا۔ 1947ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو جموں اور کشمیر کا خطہ ایک تنازعہ بن گیا۔ اُس وقت اس خطے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور وہ پاکستان سے الحاق چاہتے تھے۔ مگر ہندو اس خطے سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہندوؤں کو لا کر یہاں بسایا جانے لگا تاکہ یہاں ہندوؤں کی اکثریت ثابت کی جا سکے۔

یہ خطہ اب ہندو کے گلے میں پھنسی ہوئی وہ ہڈی بن چکا ہے جسے نہ تو وہ نگل سکتا ہے اور نہ ہی اُگل سکتا ہے۔ ہر طرح کے جدید ترین اسلحہ اور گولہ بارود سے لیس سات لاکھ سے زائد ہندو فوج کشمیریوں کی جنگ آزادی کو نہیں دبا سکی۔

کشمیر کی طرح جموں کی آبادی بھی پہاڑوں میں بکھری ہوئی ہے۔ یہاں موسم گرما میں شدید گرمی پڑتی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ڈوگروں اور سکھوں کو کھیتی باڑی کے لئے شدید محنت کرنا پڑتی ہے۔ جبکہ ہندو اپنی فطری اور روایتی چالاکی سے یہاں کے کاروبار اور معیشت پر قابض ہیں۔

ہمیں خدا بخش کے اس فارم ہاؤس میں چار دن گزر گئے۔ یہ جگہ ہمارے لئے واقعی محفوظ تھی۔ رام نگر قصبہ وہاں سے سات آٹھ کوس دُور تھا اور قصبے کی طرف جانے والی سڑک بھی وہاں سے کم از کم تین میل کے فاصلے پر تھی۔ رام نگر میں ہندو آبادی کی اکثریت تھی۔ مسلمان کم تعداد میں تھے اس لئے وہاں زیادہ ہنگامے نہیں ہوتے تھے اور اس لئے یہ فارم ہاؤس بھی محفوظ تھا۔ تاہم اودھم پور، ریاسی، اکھنور اور جموں میں پولیس اور فوج کے بیچ مسلمان مجاہدین کی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔

چار روز کے آرام اور ایک مخصوص مرہم لگانے سے سیتا کے پیر بھی بالکل ٹھیک ہو گئے تھے اور وہ ایک نئے سفر کے لئے تیار تھی۔ اور پھر اُس روز اُس کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ وہ مجھے جموں لے جانا چاہتی تھی۔ جہاں بقول اُس کے ایک دُور کے رشتے دار موجود تھے۔ اُس کے کہنے کے مطابق چند روز جموں میں رہنے کے بعد ہم پنجاب اور پھر راجستھان کی طرف چلے جائیں گے۔

سیتا کے پروگرام نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مجھے میرے محاذ سے دُور لے جانا چاہتی تھی اور یہ مجھے کسی طرح قبول نہیں تھا۔ میں اپنی سرزمین سے دُور نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں اس مٹی سے پیدا

ہوا تھا، یہیں پر میرے والدین، بزرگوں اور ان لوگوں کی ہڈیاں دفن تھیں جنہوں نے وطن کی آزادی کے لئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے۔ میں نے بھی اس وادی میں رہتے ہوئے مجاہدانہ زندگی کا آغاز کیا تھا اور عرصہ سے آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ لیکن اب سیتا مجھے یہاں سے دُور لے جانا چاہتی تھی اور یہ مجھے قبول نہیں تھا۔ میں نے بہرحال یہ طے کر لیا تھا کہ جموں میں کسی مجاہد سے رابطہ کر کے ایک بار پھر تحریک میں شامل ہو جاؤں گا۔ اس سلسلے میں، میں نے خدا بخش سے بات بھی کر لی تھی۔ اُس نے مجھے جموں کے ایک دُکاندار کا پتہ بتا دیا تھا جس کے ذریعے میں مجاہدین کی ایک تحریک سے رابطہ کر سکتا تھا۔

ہم دو دن اور فارم ہاؤس میں رہے اور پھر اُن کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر کے اُن سے رخصت ہو گئے۔ سیتا نے امیر بخش کی بیوی کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ دوپٹہ بھی تھا۔ مجھے صورت سے تو کوئی نہیں پہچانتا تھا کہ میں کون ہوں البتہ سیتا کا خطرہ تھا۔ میرے ساتھ اُسے بھی تلاش کیا جا رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ اسے کہیں شناخت نہ کر لیا جائے۔ اسی لئے اُس نے دوپٹہ بھی لے لیا تھا تاکہ وہ اپنا چہرہ چھپائے رکھے۔

ہمیں بس پر سفر کرنا تھا اور ظاہر ہے ہم اپنی رائفلیں ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ وہ دونوں رائفلیں خدا بخش کے پاس چھوڑ دی گئیں اور اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ رائفلیں ایک دو دن میں جموں کے دُکاندار سہیل کو پہنچا دے گا۔

مین روڈ وہاں سے تقریباً تین میل دُور تھی۔ ہم صبح سات بجے فارم ہاؤس سے روانہ ہوئے تو امیر بخش بھی ہمارے ساتھ تھا۔ خدا بخش نے ہمیں کچھ رقم دے دی تھی تاکہ جموں میں ہمیں کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہم آدھے گھنٹے میں سڑک پر پہنچ گئے۔ سیتا ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک بس آئی تو امیر بخش نے ہاتھ کے اشارے سے بس رُکوائی لیکن کنڈیکٹر نے بتایا کہ یہ بس جموں نہیں کٹھوروجا رہی ہے۔ اودھم پور سے جموں کی طرف جانے والی بس کے لئے ہمیں مزید آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ امیر بخش مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا اور ہم بس پر سوار ہو گئے۔ اتفاق سے ہم دونوں کو ایک ہی سیٹ پر جگہ ملی تھی۔ وہ دراصل تین مسافروں کی سیٹ تھی۔ ایک بوڑھا ہندو پہلے ہی سے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کنارے پر آ گیا۔ سیتا کھڑکی کی طرف بیٹھ گئی اور میں اُس کے ساتھ۔

سیتا نے دوپٹے سے اس طرح گھونگھٹ نکال رکھا تھا کہ اُس کا چہرہ نظر نہ آئے۔ روانہ ہونے سے پہلے ہی ہم نے طے کر لیا تھا کہ راستے میں اگر کہیں چیکنگ ہوئی تو ہم اپنے آپ کو میاں بیوی ظاہر کریں گے۔ اُس کا نام عذرا اور میرا نام سلطان ہو گا۔

سڑک کہیں کچی تھی اور کہیں پختہ۔ اس طرح بس کی رفتار بھی کبھی تیز اور کبھی ہلکی ہو رہی تھی۔ چاروں طرف دُور دُور بنجر اور خشک پہاڑ تھے۔ کہیں کہیں سبزہ اور چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی تھیں۔ دُھوپ جیسے جیسے تیز ہو رہی تھی ہوا میں بھی تپش بڑھ رہی تھی۔ رام نگر سے جموں کا فاصلہ

اگرچہ چالیس میل کے لگ بھگ تھا مگر بس نے یہ فاصلہ تین گھنٹوں میں طے کیا۔ راستے میں اگرچہ تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے کئی جگہوں پر رُکی تھی لیکن تھلورہ نامی قصبے میں یہ بس تقریباً آدھا گھنٹہ رُکی رہی تھی۔ تھلورہ کو ایک جنکشن کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں سے ایک سڑک رام نگر، دوسری جموں، تیسری اودھم پور، چوتھی سمبا اور پانچویں سڑک رام کوٹ سے ہوتی ہوئی کٹھوا کی طرف چلی گئی تھی۔

جموں ایک بہت بڑا اور پھیلا ہوا شہر تھا۔ کوہ ہمالیہ کا جنوبی سلسلہ یہاں پر ختم ہو جاتا تھا۔ اس سے آگے بتدریج ڈھلان تھی جو میدانی علاقے سے مل کر پنجاب سے جا ملتا تھا۔ اس کے ایک طرف مغربی پنجاب (پاکستان) کے شہر سیالکوٹ، گجرات اور شکر گڑھ تھے تو دوسری طرف مشرقی پنجاب کا پہلا شہر پٹھانکوٹ تھا۔

جموں میں ایک بہت بڑا ریلوے سٹیشن بھی تھا۔ یہاں سے شروع ہونے والی ریلوے لائن پٹھان کوٹ سے ہوتی ہوئی امرتسر، دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کو ملاتی تھی۔

جب ہم جموں کے لاری اڈے پر بس سے اُترے تو ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ گرم ہوا کے تھپیڑے چل رہے تھے۔ سیتا نے دوپٹہ اس طرح اوڑھ رکھا تھا کہ کوئی اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ شدید گرمی سے پیاس بھی بھڑک اُٹھی تھی اور حلق خشک ہو رہا تھا۔ ہم لاری اڈے سے نکل کر ایک مسلمان کی دُکان پر آ گئے جہاں لسّی اور دیگر مشروبات فروخت ہو رہے تھے۔ دو دو گلاس لسّی پینے کے بعد ہم پتہ پوچھ کر نہرو مارکیٹ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں مجھے سہیل نامی دُکاندار سے رابطہ کرنا تھا۔ لیکن سیتا کا خیال تھا کہ پہلے لاہوری محلے میں سوامی نارائن نامی اُس کے رشتہ دار کا گھر تلاش کیا جائے اس کے بعد ہی کہیں اور جائیں گے۔

لاہوری محلّہ وہاں سے بہت دُور تھا۔ دُھوپ بہت کڑی تھی۔ میری قمیض پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ سیتا کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی لیکن وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلتی رہی۔ لاہوری محلّہ گنجان آبادی والا علاقہ تھا۔ تنگ اور پُر پیچ گلیاں، کھیلتے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے۔ سیتا گلیوں کے ایک چوراہے پر رُک گئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''تم آخری مرتبہ یہاں کب آئی تھیں اور راستہ یاد بھی ہے یا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''دو سال پہلے آئی تھی۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے اس طرف آگے ایک موڑ گھوم کر دوسری گلی میں ہے۔''

شدید گرمی میں گلی میں کھیلتے ہوئے بچے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ دس گیارہ سال کی عمر کے ایک لڑکے نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے کچھ کہا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

ہم دائیں طرف والی گلی میں مُڑ گئے۔ چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سیتا ایک بار پھر رُک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''وہ مکان اسی گلی میں ہونا چاہئے، مگر پہچان میں نہیں آ رہا۔'' وہ بڑبڑائی اور قریب سے

گزرتے ہوئے ایک بوڑھے آدمی کو روک لیا۔ حلیے سے وہ مسلمان ہی لگتا تھا۔

''لالہ جی!'' سیتا اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لالہ سوامی نارائن کا مکان کون سا ہے؟''

سوامی نارائن کا نام سن کر وہ شخص چونک گیا۔ پہلے اُس نے گھونگھٹ کے اندر سیتا کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی پھر میری طرف دیکھنے لگا۔

''تم لوگ ڈوڈا سے آئے ہو؟'' وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ لڑکی مسلمان نہیں، سیتا ہے۔ اور .....''

''لالہ جی آپ.....'' سیتا نے اُس کی بات کاٹ کر کچھ کہنا چاہا مگر وہ شخص اُسے اپنی بات پوری کرنے کا موقع دیئے بغیر بولا۔

''میں مسلمان ہوں اور میرا نام عبدالرؤف ہے۔'' وہ سرگوشیانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''لالہ سوامی نارائن کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ سادہ لباس میں پولیس اُس کے گھر کی نگرانی کر رہی ہے۔ انہیں سیتا اور اُس کے ایک مسلمان ساتھی کا انتظار ہے جو ڈوڈا کے قریب ایک بستی میں قتل و غارت کر کے بھاگے ہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''لالہ سوامی نارائن کا مکان یہاں نہیں، ساتھ والی گلی میں ہے۔ میں اُس کا پڑوسی ہوں اور مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ دو سادہ لباس پولیس والے اُس کے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تم لوگ جیسے ہی وہاں پہنچو گے دھر لئے جاؤ گے۔ میرے ساتھ آؤ!''

میں نے اور سیتا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے اُس کے ساتھ چل پڑے۔ اُس گلی میں واپس چلتے ہوئے ہم ایک اور گلی میں داخل ہو گئے۔ یہ گلی نسبتاً کشادہ تھی اور یہاں لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ بوڑھا عبدالرؤف ہمارے ساتھ چلتے ہوئے اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے ہم اُس کے قریبی عزیز ہوں۔ آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ سرسری سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

ایک اور گلی میں داخل ہو کر عبدالرؤف ایک مکان کے سامنے رُک گیا۔ دستک کے جواب میں دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ عبدالرؤف نے پہلے ہمیں اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا اور ہمارے بعد اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک ادھیڑ عمر بھاری بھرکم عورت تھی جو اُلجھی ہوئی نظروں سے کبھی عبدالرؤف اور کبھی ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

''یہ کون ہیں بھائی صاحب؟'' بالآخر وہ عورت خاموش نہیں رہ سکی۔

''ابھی بتاتا ہوں شریفاں..... پہلے ان کے لئے لسّی پانی کا بندوبست کر! گرمی میں دُور سے چل کر آئے ہیں پیاس لگ رہی ہو گی۔'' عبدالرؤف نے جواب دیا اور ہمیں اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

مختصر سا صحن عبور کر کے ہم ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ کمرہ گھر کے دوسرے کمروں سے الگ تھلگ تھا اور بیٹھک کے طور پر آراستہ تھا۔ فرش پر موٹی دری بچھی ہوئی تھی۔ ریگزین کا ایک

صوفہ سیٹ تھا اور چند کرسیاں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے بیچ میں ایک تپائی بھی پڑی ہوئی تھی۔ عبدالرؤف نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پنکھا کھول دیا تھا اور ہمیں آرام سے بیٹھنے کو کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں اور سیتا ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس نے دوپٹہ سر سے اُتار لیا تھا اور اُس کے پلو سے پسینے سے تر چہرہ پونچھ رہی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد عبدالرؤف ایک ٹرے اُٹھائے اندر داخل ہوا۔ اُس میں شربت کے تین بڑے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ٹرے میز پر رکھ کر اُس نے ایک ایک گلاس ہماری طرف بڑھا دیا۔

''آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ہم ڈوڈا سے آئے ہیں؟ اور آپ نے یہ اندازہ کس طرح لگا لیا کہ یہ سیتا ہے اور میں ایک مسلمان مجاہد؟'' میں نے شربت کا گھونٹ بھر کر سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یہ میری بہن کا گھر ہے۔ جبکہ میں لالہ سوامی نارائن کے پڑوس میں رہتا ہوں۔'' عبدالرؤف نے جواب دیا۔ ''کئی روز پہلے پولیس نے لالہ سوامی نارائن کے گھر پر چھاپہ مارا تھا۔ اُنہیں سیتا نامی ایک لڑکی اور ایک مسلمان مجاہد کی تلاش تھی جو ڈوڈا کے قریب ایک بستی میں قتل و غارت کر کے بھاگے تھے۔ سیتا لالہ سوامی نارائن کی رشتہ دار ہے اور اس بستی کا مکھیا اُس کا ماما ہے۔ پولیس کو یقین تھا کہ سیتا پناہ لینے کے لئے یہاں ضرور آئے گی۔ یہاں جموں میں اس کے ایک دو اور رشتہ داروں کے گھر بھی ہیں۔ پولیس نے ان گھروں کے تمام مردوں کو بھی پکڑ لیا ہے اور عورتوں کی بھی بستی کے ایک آدمی سے شناخت کرائی گئی تھی۔ پولیس کو اب بھی یقین ہے کہ وہ مسلمان مجاہد ہیں تو سیتا ان میں سے کسی ایک کے گھر ضرور آئے گی۔ ہر گھر میں دو دو سادہ لباس میں مسلح پولیس والے موجود ہیں تاکہ سیتا اپنے مسلمان مجاہد ساتھی کے ساتھ جیسے ہی کسی گھر میں داخل ہو اُنہیں پکڑ لیا جائے۔''

''اس میں شبہ نہیں کہ ہم ہی اُس بستی سے بھاگے ہیں۔ لیکن ہم نے وہاں کوئی قتل و غارت نہیں کی۔ ہم نے تو ایک گولی بھی نہیں چلائی بلکہ پکڑے جانے کے خوف سے پہاڑوں کی طرف بھاگ نکلے تھے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن سننے میں تو یہ آیا ہے کہ سیتا اور اس کے ساتھی نے بستی سے کچھ دُور دو ہندو فوجیوں کو مار دیا تھا۔ اُن کی لاشیں بھی ایک کھڈ سے مل گئی ہیں اور پھر سیتا اور اس کے ساتھی نے بستی میں فوجیوں کی پارٹی پر حملہ کر دیا تھا جس سے ایک اور فوجی مارا گیا۔ وہ دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں بستی کی ایک مسلمان لڑکی نے بتایا کہ سیتا کے ساتھ مجاہد لیڈر شمروز تھا جو کئی روز سے بستی سے کچھ دُور ایک غار میں پناہ لئے ہوئے تھا۔''

''یہ درست ہے کہ میں کئی روز سے اُس غار میں چھپا ہوا تھا اور سیتا میری مدد کر رہی تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ وہاں دو ہندو فوجی مارے گئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے سیتا کو اکیلے پا کر اسے بے آبرو کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن.....'' میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے

ہوئے بولا۔ ''لیکن ہم نے فوجی پارٹی پر حملہ نہیں کیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بستی میں آنے والے فوجیوں نے اس بستی میں رہنے والے واحد مسلمان قربان علی کو دو ہندو فوجیوں کے قتل کے شبے میں گولیوں سے بھون ڈالا اور اُس کی جوان بیٹی کو بستی کے چوک میں برہنہ کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ہو سکتا ہے بستی کے کسی غیرت مند ہندو ہی نے لڑکی کو بچانے کے لئے فوجیوں پر حملہ کر دیا ہو اور کوئی فوجی اُس کے ہاتھوں مارا گیا ہو۔

''مجھے تمہاری بات پر کوئی شبہ نہیں۔ لیکن سچ وہی سمجھا جائے گا جو سرکار کہتی ہے.....'' عبدالرؤف نے کہا۔ ''وادی میں تو مسلمانوں کے سچ کو بھی سچ نہیں سمجھا جاتا۔ اسلحہ یا مجاہدین کی تلاش میں ہندو فوجی مسلمانوں کی بستیوں پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ عورتوں کو بے آبرو کیا جاتا ہے بے گناہ نوجوانوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے اور بستیوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا جاتا ہے اور سرکار اسے معمولی سا واقعہ قرار دیتی ہے۔ لیکن کوئی ایک بھارتی فوجی مجاہدین کے ہاتھوں مارا جائے تو اسے قیامت کہا جاتا ہے اور انتقام لینے کے لئے فوجی دستے ایک بار پھر مسلمان بستیوں پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ مسلمان مجبور اور بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔''

''وادی کے مسلمان مجبور اور بے بس نہیں ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم نے تو غلامی کی زنجیریں توڑنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ ہمارے نوجوان نہ مجبور و بے بس ہیں اور نہ بزدل۔ ہم نے عہد کر رکھا ہے کہ وادی میں کہیں بھی ہندو فوج کو ٹکنے نہیں دیں گے۔ جب تک ان غاصبوں کو نکال باہر نہیں کریں گے ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔''

''تم نوجوانوں ہی سے تو اُمیدیں وابستہ ہیں۔'' عبدالرؤف نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بہر حال اچھا ہوا کہ میں راستے میں تم لوگوں کو مل گیا ورنہ غلط فہمی میں مارے جاتے۔ اگر تم لوگوں کے پاس کوئی اور ٹھکانہ نہ ہو تو تم لوگ چند روز یہاں رہ سکتے ہو۔ میری بہن شریفاں یہاں اپنی بیٹی کے ساتھ اکیلی رہتی ہے۔ پڑوسیوں کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تم لوگ ہمارے رشتے دار ہو اور پٹھان کوٹ سے آئے ہو۔ اور تم.....'' اُس نے میری طرف دیکھا۔ ''تمہیں تو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ جس روز تم لوگ ڈوڈا کی بستی سے بھاگے تھے اس سے اگلے روز یہاں بھی تمہاری تلاش میں چیکنگ شروع ہو گئی تھی۔ اس طرف سے آنے والی ہر بس کے مسافروں کو روک کر بڑی سختی سے اُن سے پوچھ گچھ کی جاتی رہی تھی۔ اب اگرچہ سرگرمیاں کچھ ماند پڑ گئی ہیں لیکن تم لوگوں کو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ میرا تو مشورہ یہی ہے کہ کہیں اور جانے کی بجائے تم لوگ یہیں رہ جاؤ۔ یہ گھر تم لوگوں کے لئے سب سے زیادہ محفوظ ہے۔''

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا جیسے وہ یہاں رہنے کو تیار ہو۔

''ٹھیک ہے.....'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم چند روز یہاں رہ لیتے ہیں۔ لیکن اس دوران آپ کو میرا ایک کام کرنا ہو گا۔ بلکہ آج ہی۔''

''ہاں کہو.....!'' عبدالرؤف نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں چند لمحے خاموش رہا پھر اُسے نہرو مارکیٹ میں سہیل نامی دُکاندار کے بارے میں بتانے لگا۔

''اطمینان رکھو..... میں آج ہی سہیل سے ملوں گا۔ اور ہاں میری واپسی شام کے بعد ہی ہو گی۔ تم لوگ پریشان مت ہونا۔'' عبدالرؤف نے کہا اور آواز دے کر اپنی بہن شریفاں کو بلا لیا۔ ''دیکھو شریفاں! یہ ہمارے دُور کے رشتہ دار ہیں اور پٹھان کوٹ سے آئے ہیں۔ یہ میاں بیوی ہیں ان کے نام.....''

''سلمان اور عذرا۔'' میں بیچ میں بول پڑا۔

''ہاں..... یہ سلمان ہے اور یہ عذرا۔'' عبدالرؤف نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہم لوگوں سے ملنے آئے ہیں اور چند روز یہاں رہیں گے۔ تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟''

''نہیں بھائی صاحب..... مجھے کیا مسئلہ ہوگا؟ مجھے تو مہمانوں کی خدمت کر کے خوشی ہوگی۔ ایسے مہمان روز روز تو نہیں آتے۔'' شریفاں نے جواب دیا۔ وہ بھی شاید سمجھ گئی تھی کہ ہم کون ہو سکتے ہیں۔

''ٹھیک ہے..... میں شام کو چکر لگاؤں گا۔'' عبدالرؤف نے کہا اور ہماری طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

شریفاں کچن میں چلی گئی۔ میں اور سیتا کچھ دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اور پھر آج کے اس واقعہ پر تبصرہ کرنے لگے۔ یہ واقعی ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم نے گلی میں عبدالرؤف کو روک کر لالہ سوامی نارائن کے مکان کا پتہ پوچھ لیا تھا اور ہمیں نہ صرف صحیح صورتحال کا پتہ چل گیا تھا بلکہ ہم بال بال بچ گئے تھے۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے سیتا کی طرف دیکھا۔

''دو چار روز تو یہیں رہنا پڑے گا..... اس کے بعد ہی کچھ فیصلہ کریں گے۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''ایک تجویز ہے میرے ذہن میں۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا؟'' اُس نے پوچھا۔

''دو چار روز یہاں رہ کر تم جے پور چلی جاؤ اور میں اپنے محاذ پر لوٹ جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''شاید تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' اُس نے مجھے گھورا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ انہوں نے میری گرفتاری کے لئے جے پور میں میرے گھر پر چھاپہ نہیں مارا ہوگا؟ وہ مجھے ہر اُس جگہ تلاش کریں گے جہاں میرا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ نہیں ڈیئر..... میں تو اب تمہارے ہی کھونٹے سے بندھ گئی ہوں۔ کہیں اور نہیں جا سکتی۔ جہاں بھی جاؤں گی ماردی جاؤں گی۔''

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ شریفاں کی بیٹی خالدہ نے آ کر بتایا کہ کھانا تیار ہو چکا

ہے۔ خالدہ تیرہ چودہ سال کی ایک بھولی بھالی اور حسین لڑکی تھی۔ وہ ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی اور ابھی سکول سے واپس آئی تھی۔

ہم دوسرے کمرے میں آ گئے جہاں دری پر دستر خوان بچھا ہوا تھا۔ خالدہ اور شریفاں بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئیں۔ شریفاں بیٹی کو بتا رہی تھی کہ میں رشتے میں اس کا ماموں لگتا ہوں۔

کھانے کے بعد شریفاں نے ہمیں ایک اور کمرہ دے دیا جہاں دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سیتا کچھ دیر بعد خالدہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور میں چار پائی پر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد میں نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

اور پھر اُس شام عبدالرؤف سے ملنے والی خبریں بڑی خوفناک تھیں.....

پولیس اور فوج کی انٹیلی جنس نے کسی طرح پتہ لگا لیا تھا کہ مجاہدین کا سب سے خطرناک لیڈر شمروز (یعنی میں) ڈوڈا کے قریب ہندوؤں کی ایک اور چھوٹی سی بستی میں تباہی مچا کر فرار ہونے کے بعد رام نگر کے قریب ایک فارم ہاؤس میں پناہ لئے ہوئے تھا۔ اس کے ساتھ سیتا نام کی وہ ہندو لڑکی بھی تھی جو دو فوجیوں کے قتل میں ملوث تھی۔ یہ دونوں تقریباً ایک ہفتہ اُس فارم ہاؤس میں رہنے کے بعد جموں کی طرف فرار ہو گئے تھے۔

فوج کی ایک پارٹی نے اُس فارم ہاؤس پر چھاپہ مارا تھا اور اُس خاندان کے سربراہ خدا بخش نے بتایا تھا کہ شمروز جموں کی نہرو مارکیٹ میں سہیل نامی ایک دُکاندار سے رابطہ کرے گا۔ سہیل مجاہدین کی ایک تنظیم کا سرگرم ایجنٹ ہے اور مجاہدین کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے۔

فوج کی ایک پارٹی نے آج شام سے ذرا پہلے سہیل کو گرفتار کر لیا اور اُس سے شمروز کے بارے میں پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ سہیل کی گرفتاری کے ساتھ ہی شہر کی پولیس کو بھی الرٹ کر دیا گیا تھا اور شمروز کی گرفتاری کے لئے مشتبہ مقامات پر چھاپے مارے جا رہے تھے اور ایسے لوگوں کو حراست میں لیا جا رہا ہے جو مجاہدین سے تعاون اور اُن کی امدادی سرگرمیوں میں ملوث سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سیتا کی تلاش میں بھی سرگرمیاں بڑھا دی گئی ہیں۔ جموں میں آباد اُس کے دو چار دُور کے رشتہ داروں کے گھروں کے علاوہ اُسے مندروں میں بھی تلاش کیا جا رہا ہے کیونکہ شبہ ہے کہ وہ کسی مندر میں بھی پناہ لے سکتی ہے۔

دوسری طرف اس سے زیادہ خوفناک خبر یہ تھی کہ کشمیر میں فوج نے ایک بار پھر سوپور پر ہلہ بول دیا تھا اور کئی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد شہر کے کئی گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا.....

○○○

سرینگر کے بعد سوپور ہی کشمیر کا دوسرا بڑا شہر سمجھا جاتا تھا۔ یہ کشمیر میں اسلام پسندوں کا مضبوط گڑھ تھا..... آزادی کی تقریباً تمام تحریکوں کی وابستگی بھی اسی شہر سے تھی۔ دوسرے لفظوں میں اُسے کشمیر میں اسلام کا قلعہ کہا جاتا تھا اور درندہ صفت بھارتی فوجوں نے گویا اُس شہر کو نیست و نابود کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آئے دن مختلف حیلوں بہانوں سے اس شہر پر حملے اور قتل و غارت یہی ثابت کرتے تھے۔ لیکن یہاں کے لوگ بھی بڑے عجیب تھے۔ ان پر گولیاں برسائی جاتی تھیں، اُن کے خون سے ہولی کھیلی جاتی تھی، اُن کے گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا تھا مگر یہ لوگ ہر مرتبہ ایک نئے حوصلے اور جذبے کے تحت ان باطل قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے تھے جو اُنہیں مٹانے کے درپے تھیں۔

سوپور پر تازہ ترین حملہ آج صبح سویرے ہوا تھا۔ اس حملے کا بہانہ یہی تھا کہ چند خطرناک چھاپہ مار مجاہدین یہاں پناہ لئے ہوئے ہیں اور لوگوں نے گھروں میں اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگا رکھے ہیں۔

سوپور پر یہ حملہ صبح سویرے اُس وقت ہوا تھا جب مساجد میں فجر کی نماز پڑھائی جا رہی تھی۔ فوجی دندناتے ہوئے شہر کی بڑی جامع مسجد میں گھس گئے تھے اور نمازیوں پر فائر کھول دیا تھا..... صرف اس ایک مسجد میں بارہ نمازی شہید ہوئے تھے۔ دوسری مسجدوں اور شہر کے کئی علاقوں میں خون خرابہ ہوا تھا۔ اس مرتبہ سوپور کے شہریوں نے بھی مقابلہ کیا تھا اور دو درجن سے زائد ہندو فوجیوں کو جہنم رسید کر دیا تھا جن میں ایک کرنل بھی شامل تھا۔ عبدالرؤف سے ملنے والی اطلاع کے مطابق فوج کی بھاری نفری نے سوپور کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور سوپور کا پوری وادی سے رابطہ کٹا ہوا تھا۔

سوپور پر اس وحشیانہ کارروائی کی خبر پورے کشمیر اور جموں میں پھیل گئی تھی۔ ہر جگہ ہنگامے شروع ہو گئے تھے اور اگلے دن کے لئے ہڑتال کی کال دے دی گئی تھی۔

شام ہوتے ہی جموں میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ یہ علاقہ گنجان آبادی اور تنگ گلیوں پر مشتمل تھا اس لئے یہاں زیادہ گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ لوگ گھروں میں بند ہو کر بیٹھ گئے تھے البتہ شہر کی بڑی سڑکوں اور شاہراہوں پر شہر کے نوجوانوں اور پولیس میں پتھراؤ، لاٹھی چارج اور آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔

میری حالت اُس شیر کی سی تھی جسے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ سوپور پر فوج کے حملے اور

وہاں ہونے والی تباہی کی خبر نے مجھ پر لرزہ سا طاری کر دیا تھا۔ میں وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہاں جس سے رابطے کی توقع تھی اُسے بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ میں نے عبدالرؤف سے کسی اور مجاہد تنظیم یا کسی ٹھکانے کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس سلسلے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ مجاہدین کی مختلف تنظیموں کی سرگرمیوں کے بارے میں سنتا تو رہتا تھا مگر وہ کسی کے ٹھکانے سے واقف نہیں تھا۔

''ایک آدمی ہے جس کے ذریعے مجاہدین کی ایک تنظیم سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔'' عبدالرؤف نے کہا۔

''کون ہے وہ..... کہاں ہے؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''وہ امرمحل کے علاقے میں رہائش پذیر ہے۔'' عبدالرؤف نے جواب دیا۔ ''امرمحل شہر کے دوسری طرف دریائے قوس کے قریب ہے۔ اور اس وقت وہاں پہنچنا ممکن نہیں۔ کل صبح کوشش کی جا سکتی ہے۔''

''کل صبح تک تو پتہ نہیں کیا ہو جائے..... میں ابھی اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے امرمحل کا راستہ سمجھا دو! میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''تم اکیلے وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔'' عبدالرؤف نے جواب دیا۔ ''شہر میں ہنگامے ہو رہے ہیں۔ کل دن میں تمہیں وہاں پہنچانے کی کوشش کروں گا۔''

''ٹھیک ہے.....'' میں گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

عبدالرؤف نو بجے کے قریب آیا تھا۔ اُس نے کھانا ہمارے ساتھ کھایا تھا اور گیارہ بجے کے قریب وہ اپنے گھر چلا گیا۔ میں اور سیتا دیر تک بیٹھے اس صورتحال پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔

شہر میں ہنگامے جاری تھے۔ فائرنگ کی آوازوں کے ساتھ کبھی کبھی زوردار دھماکے بھی سنائی دے جاتے۔ ایک دو مرتبہ گلی میں کچھ لوگوں کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ آدھی رات کے بعد فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں بتدریج کم ہوتی چلی گئیں اور پھر پورا شہر، شہر خموشاں کی تصویر بن گیا۔ ہر طرف مکمل خاموشی اور گہرا ناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس شہر سے زندگی کا نام و نشان تک مٹ گیا ہو۔

سیتا کے چہرے سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس صورتحال سے وہ خاصی پریشان اور خوفزدہ تھی۔ شاید وہ اپنوں کے خلاف میرا ساتھ دے کر پچھتا رہی ہو۔ میں نے یہی سوال پوچھا تو وہ ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔

''میں بالکل نہیں پچھتا رہی..... تم مجھے مل گئے مجھے کسی اور بات کی پرواہ نہیں۔ مجھے کوئی پچھتاوہ نہیں ہے۔''

میں اُسے گھور کر رہ گیا۔ اس وقت رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ سیتا دوسری چارپائی پر کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اُٹھ کر میری چارپائی پر آ

گئی اور مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لیتے ہوئے بولی۔

''مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ کوئی تمہیں مجھ سے چھین نہ لے۔''

''ایک بات بتاؤ.....'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم اس لئے مجھے وہاں سے نکال کر لائی ہو کہ کوئی مجھے تم سے چھین نہ لے۔ اور کیا یہ غلط ہے کہ تم مجھے یہاں سے بھی نکال کر کہیں دُور لے جانا چاہتی ہو..... کسی ایسی جگہ جہاں کوئی.....''

''یہ درست ہے۔'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میں نے جب تمہیں بے ہوش اور زخمی حالت میں پہاڑوں میں پڑے ہوئے دیکھا تھا تو نجانے میرے دل میں یہ احساس کیوں جاگ اُٹھا تھا کہ تم وہی ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔ میری جوانی کے سپنوں کی تعبیر..... میں تمہیں اُٹھا کر غار میں لے گئی۔ تمہاری ٹانگ پر زخم دیکھتے ہوئے مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ تم مسلمان مجاہد ہو۔ لیکن پریم دین دھرم اور ذات پات کو کب دیکھتا ہے؟ میں جانتی تھی کہ پولیس یا فوج تمہاری تلاش میں ہوگی لیکن میں نے تمہاری حفاظت اور مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اسی وقت یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ تم اچھے ہو جاؤ گے تو تمہیں کہیں بہت دُور لے جاؤں گی۔ اور پھر اتفاق سے اُن دو ہندو فوجیوں نے مجھے گھیر لیا۔ تم نے جس طرح اُن سے میری عزت اور جان بچائی اس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

میں یہ جان چکی تھی کہ تم وہ خطرناک مجاہد لیڈر ہو جو بھارتی فوج کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ کسی مسلمان مجاہد کو پناہ دینا سنگین جرم ہے اور تم کوئی عام مجاہد نہیں..... تم تو وہ تھے جس نے بھارتی فوج کو سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان پہنچایا ہے۔ تمہیں پناہ دینے والے کو تو ایسی سزا دی جاتی جس سے دوسرے بھی عبرت حاصل کرتے۔ لیکن میں اپنے من کے ہاتھوں مجبور تھی اور تمہیں ہر قیمت پر بچانے اور وہاں سے نکالنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اور پھر حالات اس تیزی سے تبدیل ہوئے کہ ہمیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ ہاں..... میری نیت یہی تھی کہ میں تمہیں یہاں سے نکال کر ان ہنگاموں سے بہت دُور لے جاؤں گی۔ لیکن.....''

''لیکن کیا.....؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میرے ماما کی بستی میں جو کچھ ہوا اُس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔'' سیتا بولی۔ ''اُن درندوں نے چاچا قربان علی کو گولیوں سے چھلنی کر دیا..... نیلم جیسی بے گناہ اور معصوم لڑکی کو برہنہ کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور کسی غیرت مند نے اُسے بچانے کی کوشش کی تو اُسے بھی مار دیا گیا۔ اب عبدالرؤف سے ملنے والی خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے نیلم کو بھی مار ڈالا اور پھر سوپور میں آج صبح جو کچھ ہوا اور اب یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیش نظر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''میں تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بنوں گی اور نہ ہی تمہارے پیروں کی بیڑیاں بن کر رہوں گی..... بلکہ میں بھی قدم بہ قدم تمہارے ساتھ رہوں گی۔ انگوری کی طرح.....''

سیتا کی سچائی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

''ٹھیک ہے.....'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہاری سچائی اور تمہارے فیصلہ سے مجھے خوشی ہوئی۔ بہرحال اگلا قدم ہم صورتحال کے تحت ہی اُٹھائیں گے۔''

سیتا کے چہرے پر طمانیت سی آ گئی..... وہ میرے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی تو میں نے بڑی آہستگی سے اپنے آپ کو اُس سے الگ کیا اور دوسری چارپائی پر لیٹ گیا۔

ہم صبح چھ بجے عبدالرؤف کے ساتھ نکلے تھے۔ میں نے سیتا کو منع کیا تھا کہ وہ یہیں رہ کر میرا انتظار کرے مگر وہ کسی طرح نہیں مانی اور میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔

اُس وقت سڑکوں پر سناٹا تھا۔ اِکا دُکا لوگوں کی پیدل آمد و رفت تھی۔ موٹر سائیکل یا سائیکل پر کوئی دُودھ والا سڑک پر سے گزر جاتا یا کبھی کوئی گاڑی بھی نظر آ جاتی۔ البتہ سڑک کے ہر موڑ پر پولیس والے بڑی تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ ہر پولیس پارٹی کے ساتھ ہندو فوجی بھی تھے۔ جگہ جگہ پولیس اور فوج کی گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

کل آدھی رات تک شہر میں ہنگامے جاری رہے تھے اور توقع تھی کہ کچھ دیر بعد پھر ہنگامے شروع ہو جائیں گے جن سے نمٹنے کے لئے پولیس اور فوج نے پورا بندوبست کر رکھا تھا۔

ہمیں راستے میں دو تین جگہ روکا گیا۔ عبدالرؤف کی درویشانہ شخصیت ہر جگہ ہمارے کام آئی۔ اُس نے مجھے اپنا بیٹا اور سیتا کو اپنی بہو ظاہر کیا اور اس طرح ہم پولیس والوں کی کڑی پوچھ تاچھ سے بچتے رہے۔

دریائے قوس کے قریب امر محل بہت خوبصورت عمارت تھی۔ اُس کا ڈیزائن ایک راجہ کی فرمائش پر ایک فرانسیسی آرکیٹیکٹ نے تیار کیا تھا۔ نہ وہ راجہ رہا تھا نہ آرکیٹیکٹ۔ لیکن یہ محل اپنی جگہ پر موجود تھا اور بلاشبہ اسے جموں کی خوبصورت ترین عمارت ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ آج کل یہاں میوزیم قائم ہے جس میں لائبریری کے علاوہ آرٹ کے بہترین شاہکار جمع ہیں۔

اس طرف رہائشی بنگلے ہی تھے۔ عبدالرؤف ہمیں ایک بنگلے میں لے گیا جہاں ہماری ملاقات پرویز نامی ایک ایسے شخص سے ہوئی جو اناج کا بیوپاری تھا۔ میرا اور سیتا کا تعارف ہونے پر وہ چونک گیا۔

ہم نے ناشتہ وہیں کیا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد عبدالرؤف واپس چلا گیا۔ اُس روز شہر میں ہنگامے تو ہوئے تھے مگر زیادہ زور نہیں پکڑ سکے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے ایک گھنٹے بعد پرویز ہمیں لے کر بنگلے سے روانہ ہو گیا۔ ہم مختلف راستوں پر ہوتے ہوئے دریا کی طرف نکل گئے۔ چٹانوں میں ایک جگہ دریا کے کنارے دو آدمی ڈونگے (کشتی) پر ہمارے منتظر تھے۔ اس معمولی سی کشتی پر تیز رفتار دریا پار کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا مگر وہ دونوں آدمی ماہر ملاح تھے۔ وہ بڑی مہارت سے رات کی تاریکی میں ڈونگے کو تیز و تند لہروں پر کھینچتے ہوئے دوسرے کنارے

تک لے گئے۔

توی کے دوسرے کنارے باہو قلع کا ہیولہ ہمارے سامنے تھا۔ سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر بنایا گیا یہ قلعہ جموں کی قدیم ترین یادگار سمجھا جاتا تھا۔ پرویز ہمیں قلعہ کے دوسری طرف ایک اور کھنڈر نما عمارت میں لے گیا۔ یہاں ہماری ملاقات ایک مقامی مزاحمتی تحریک کے لیڈر عبدالرحمٰن سے ہوئی۔ پرویز ہمیں وہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

عبدالرحمٰن میرا نام سن کر ہی متاثر ہو گیا تھا۔ البتہ سیتا کے نام پر وہ کچھ چیں بہ جبیں ہوا تھا۔

''اس کی تم فکر مت کرو۔ یہ بھارتی فوجیوں کے لئے دوسری انگوری ثابت ہو گی۔'' میں نے رحمٰن کو سیتا کے بارے میں سب کچھ بتا کر مطمئن کر دیا۔

عبدالرحمٰن کے ساتھ اس کھنڈر میں چار لڑکے اور تھے اور وہ کسی خاص چھاپہ مار کارروائی کا منصوبہ بنا رہے تھے اور کل صبح اپنے کچھ اور ساتھیوں کا بھی انتظار تھا۔

مجھے اپنے درمیان پا کر عبدالرحمٰن اور اُس کے ساتھی بہت خوش ہو رہے تھے۔ عبدالرحمٰن نے وہ منصوبہ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ منصوبہ اگرچہ بے حد خوفناک تھا مگر اس پر عمل کر کے بھارتی فوج پر ایک کاری ضرب لگائی جا سکتی تھی۔

''اب اس پارٹی کی قیادت تم کرو گے کمانڈر شمروز!'' عبدالرحمٰن نے کہا اور پھر تفصیل سے اُس جگہ کے بارے میں بتانے لگا جہاں یہ کارروائی کی جانے والی تھی۔

صبح دس بجے تک عبدالرحمٰن کے دوسرے ساتھی بھی پہنچ گئے۔ اس طرح ہماری کل تعداد چودہ ہو گئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد ہم لوگ کھنڈروں سے نکل کر دریائے توس کے متوازی پہاڑوں کی طرف چل پڑے۔ سیتا میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور ہم دبے لفظوں میں اس منصوبے کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے جا رہے تھے۔

عبدالرحمٰن کا منصوبہ واقعی بڑا خوفناک تھا..... جموں شہر سے کئی میل دُور پہاڑیوں میں گھری ہوئی جھیل مانسر اس خطے کے لوگوں کے لئے قدرت کا حسین تحفہ تھی۔ اس جھیل کے اطراف کی پہاڑیوں میں تین چار قدیم مندر تھے جن کی یاترا کے لئے ہندو دُور دُور سے آتے تھے۔ جھیل کے جنوبی ساحل پر ایک خوبصورت ٹورسٹ بنگلہ تھا۔

عبدالرحمٰن کے کہنے کے مطابق بھارتی فوج کے کچھ اعلیٰ افسران آج رات اس ٹورسٹ بنگلے میں جشن منانے والے تھے۔ یہ جشن ہر مہینے کی پہلی اتوار کی شب منایا جاتا تھا جس میں راگ رنگ اور عیاشی کا ہر سامان موجود ہوتا تھا۔

عبدالرحمٰن نے بہت سوچ سمجھ کر اس منصوبے کی پلاننگ کی تھی اور اس کی قیادت میرے سپرد کر دی تھی۔ اور رحمٰن کی اطلاع کے مطابق آج رات تو جموں کا کور کمانڈر بھی اس محفل میں شریک ہونے والا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا تو کم از کم اس خطے میں بھارتی فوج کی کمر ٹوٹ جائے گی اور کچھ عرصہ تک ان کی سرگرمیاں محدود ہو جائیں گی۔

ہم دن بھر تپتے ہوئے بنجر پہاڑوں میں سفر کرتے رہے۔ دوپہر کو ایک چھوٹی سی ندی کے پاس رُک گئے۔ یہ واحد ندی تھی جو ہمارے راستے میں آئی تھی۔ کانٹے دار سوکھی ہوئی جھاڑیوں اور کیکٹس کے پودے بکثرت تھے اور کسی قسم کا سبزہ ان پہاڑیوں پر نہیں تھا۔

صبح کھنڈروں میں آنے والے عبدالرحمٰن کے ساتھی کچھ کھانے پینے کی اشیاء ساتھ لے آئے تھے جن میں بھنے ہوئے کابلی چنے بھی تھے۔ ندی کے کنارے پر بیٹھے تو عبدالرحمٰن نے وہ سب چیزیں تمام ساتھیوں میں بانٹ دیں تاکہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے رہیں۔

تقریباً ایک گھنٹہ وہاں آرام کرنے کے بعد ہم آگے روانہ ہو گئے اور سورج غروب ہونے سے پہلے جھیل مانسر کے جنوب میں واقع پہاڑی پر پہنچ گئے۔ آگے جانا خطرناک تھا۔ عبدالرحمٰن مجھے ایک طرف لے گیا اور ایک چٹان کے پاس جھاڑیوں میں لیٹ کر مجھے ایک بار پھر بریف کرنے لگا۔

بہت خوبصورت منظر تھا۔ کشمیر سے نکلنے کے بعد میں نے پہلی مرتبہ ایسی حسین جگہ دیکھی تھی۔ وسیع و عریض جھیل کا نیلگوں پانی رخصت ہوتی ہوئی دُھوپ میں پگھلے ہوئے سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ جھیل کے اطراف میں گہرا سبزہ تھا سایہ دار اور پھلدار درختوں کی بھرمار تھی۔ سیاحوں کے لئے لاتعداد پرائیویٹ ہٹ بنے ہوئے تھے۔ غالباً ایک طرف تین چار اوپن ایئر ریسٹورنٹ اور اشیائے خورد و نوش کے سٹال بھی تھے۔ اس طرف کچھ کاریں اور دوسری گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔

اسے مقدس جھیل سمجھا جاتا تھا۔ اس کے کناروں پر لوگوں کے لئے لاتعداد چھپر بھی بنے ہوئے تھے جو لوگوں کے اشنان کے لئے مخصوص تھے۔ جھیل میں کچھ شکارے اور ڈونگے بھی تیر رہے تھے۔ جھیل کے کناروں پر بہت سے لوگ بھی دکھائی دے رہے تھے اور میں جانتا تھا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے بہت سے لوگ واپس چلے جائیں گے اور صرف وہی لوگ رہ جائیں گے جنہوں نے یہاں بنگلے کرائے پر لے رکھے تھے۔

جھیل کے جنوبی کنارے پر وہ ریسٹ ہاؤس تھا جو آج کی شب کے لئے فوجی افسروں کے لئے مخصوص تھا۔ ریسٹ ہاؤس کی عمارت خاصی بڑی تھی اور اُس کے سامنے اور اطراف میں بہت لمبے چوڑے خوبصورت لان تھے جنہیں دُور دُور تک قناتوں نے گھیر رکھا تھا۔ ریس ہاؤس کے دوسری طرف دو بڑے فوجی ٹرک اور دو جیپیں کھڑی تھیں اور کئی فوجی وہاں کام کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ تمام لانز میں میزیں اور کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں۔

میں گہری نظروں سے ریسٹ ہاؤس کے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہم سے کچھ آگے پہاڑی کا ایک حصہ پھیلی ہوئی ٹانگ کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا۔

''کیا خیال ہے کمانڈر؟'' عبدالرحمٰن نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''وہ آگے کو نکلی ہوئی پہاڑی اور یہ جگہ۔'' میں نے اپنے آگے زمین پر ہاتھ مارا۔ ''یہ دونوں

جگہیں ایسی ہیں جہاں سے ریسٹ ہاؤس اور اس کے لانز کو ٹارگٹ بنایا جا سکتا ہے۔ اور اگر حملہ بھرپور ہو تو وہاں پر موجود بہت کم لوگوں کے زندہ بچنے کی اُمید کی جا سکتی ہے۔'' میں نے ریسٹ ہاؤس کی طرف اشارہ کیا۔

''ہمارے پاس مشین گنوں کے علاوہ دو راکٹ لانچر اور دو مارٹر گنیں بھی ہیں۔'' عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ''اگر واقعی حملہ بھرپور ہو تو اُن میں سے کوئی نہیں بچے گا۔''

ہم دیر تک پلاننگ کرتے رہے اور بالآخر یہ طے پایا کہ ریسٹ ہاؤس پر حملہ رات بارہ بجے کے قریب کیا جائے جب محفل عروج پر ہو۔ میں نے کہا اور عبدالرحمٰن نے تائید میں گردن ہلا دی۔

سورج غروب ہونے کے دو گھنٹوں بعد تمام مجاہدین کو پہاڑیوں پر پھیلا دیا گیا۔ میں، سیتا اور عبدالرحمٰن اکٹھے ہی تھے اور ہم پتھروں سے ٹیک لگائے بیٹھے وقت گزرنے کا انتظار کرتے رہے۔

جنگل میں منگل کا سا سماں تھا.....

جھیل کے پرلی طرف پرائیویٹ ہٹس میں کیروسین آئل لیمپوں اور لالٹینوں کی مدھم روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جھیل کی پرسکون سطح پر دو تین شکارے تیر رہے تھے۔ اُن پر بھی لالٹینوں یا کیروسین لیمپوں کی مدھم روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ مگر سب سے دلفریب منظر تو ریسٹ ہاؤس کا تھا جہاں رنگ برنگی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ریسٹ ہاؤس میں روشنی کے لئے غالباً جنریٹر کا انتظام کیا گیا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کے لان کسی نائٹ کلب کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ہیجان خیز موسیقی کی آواز فضا میں پھیل رہی تھی۔ تقریباً بیس میزیں تھیں اور ہر میز پر دو دو چار چار مہمان موجود تھے۔ اُن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ تمام مرد بھارتی سینا کے اعلیٰ فوجی افسر تھے جو سادہ لباس میں تھے۔ یہ سب ہندو سورما تھے جو کشمیر فتح کرنے نکلے ہوئے تھے۔ ان درندہ صفت بھارتی فوجیوں نے جموں اور کشمیر کو شکارگاہ بنا رکھا تھا۔ یہ دن میں مظلوم اور بے گناہ کشمیری مسلمانوں کا شکار کرتے تھے اور راتوں کو اس طرح رنگ رلیاں مناتے تھے۔

اُن کے ساتھ جو عورتیں تھیں وہ جوان تھیں اور حسین بھی۔ یہ فاحشہ عورتیں تھیں جنہیں ان سورماؤں کا دل بہلانے کے لئے یہاں لایا گیا تھا۔ اُن کے لباس ایسے تھے کہ ان کے بدن ان لباسوں کی قید سے پوری طرح آزاد ہونے کے لئے مچلے جا رہے تھے۔

ہر میز پر چکن اور ہرن کے بھنے ہوئے گوشت کے ساتھ انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ اس علاقے میں ہرن بکثرت پائے جاتے تھے اور ان فوجی افسروں کے لئے ہرن خاص طور پر شکار کر کے لائے گئے تھے۔ شراب کی بوتلیں بھی ہر میز پر موجود تھیں اور شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ باوردی فوجی، ویٹر اور اردلی وغیرہ بھاگ بھاگ کر اپنے افسروں کے احکامات بجا لا رہے تھے۔

کھانے کی خالی پلیٹیں اُٹھا لی گئیں۔ میزوں پر صرف شراب کی بوتلیں رہ گئی تھیں۔ بلکہ ہر میز

پر کچھ اور بوتلیں سرو کر دی گئیں۔ موسیقی کی دھن بدل گئی۔ ایک فوجی آفیسر ایک لڑکی کو بازو سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ فوجی آفیسر لڑکی کے ساتھ ناچتے ہوئے اس طرح لڑکھڑا رہا تھا جیسے شراب چڑھ گئی ہو۔ لڑکی نے میز پر سے شراب کا گلاس اُٹھا کر اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اُس آفیسر نے شراب کا ایک گھونٹ بھرا اور گلاس لڑکی کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اُس نے شراب لڑکی کے گریبان کے بلاؤز میں انڈیل دی۔

دوسروں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ وہ لڑکی بھی قہقہے میں شامل ہو گئی۔ آفیسر نے اپنے ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھے اور بلاؤز ایک جھٹکے سے نیچے کھینچ دیا۔ لڑکی کا بالائی حصہ برہنہ ہو گیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے قہقہے لگانے لگی۔

عبدالرحمٰن مجھ سے تقریباً دس گز کے فاصلے پر بائیں طرف تھا اور سیتا میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ بے حیائی کا یہ منظر اُس نے بھی دیکھا۔

''انتہا ہو گئی بے غیرتی کی.....'' وہ بڑبڑائی۔

''یہ تمہارے ہی سورما ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''انہوں نے کشمیر کو شکارگاہ بنا رکھا ہے۔ یہ اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ اور جب کوئی فوجی اخلاق اور انسانیت سے اس طرح گر جائے تو وہ بہادری کا کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ کشمیر میں جگہ جگہ ان کی پٹائی ہو رہی ہے اور یہ سب کچھ دیکھ کر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اب یہ لوگ زیادہ عرصہ تک کشمیر میں نہیں ٹک سکیں گے۔ انہیں بہت جلد اپنا بوریا بستر سمیٹنا ہو گا۔''

''یہ میرے لوگ نہیں.....'' سیتا بولی۔ ''بلکہ اب میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ان وحشیوں پر پہلی گولی میں چلاؤں۔''

''پہلی گولی تم ہی چلاؤ گی..... اطمینان رکھو!'' میں نے کہا اور ایک بار پھر سامنے دیکھنے لگا۔

منظر کچھ اور کھل گیا تھا۔ ہیجان خیز موسیقی میں مختلف جگہوں پر پانچ چھ عورتیں نیم عریاں لباس میں رقص کے نام پر مختلف زاویوں سے جسموں کی نمائش کر رہی تھیں۔ آفیسر بھی اُٹھ اُٹھ کر اُن کے ساتھ بھونڈی حرکتیں کر رہے تھے۔ پھر دوسرے مرد اور عورتیں بھی اپنی جگہوں سے اُٹھتی گئیں۔ رقص کرنے والی عورتوں نے اپنے جسموں کے اُوپر کے لباس اُتار دیئے تھے۔ اُن کے تھلتھلاتے ہوئے بدن مردوں میں مزید ہیجان پیدا کر رہے تھے۔

اپنے قریب ہلکی سی آہٹ سن کر میں نے تیزی سے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ وہ عبدالرحمٰن تھا۔

''کمانڈر!'' اُس نے سرگوشی کی۔ ''بے حیائی کی یہ محفل عروج پر ہے۔''

''ہاں! تم اپنی جگہ پر چلو.....'' میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ ''میری طرف سے پہلے فائر کی آواز کے ساتھ ہی بھرپور حملہ شروع کر دینا۔''

عبدالرحمٰن سینے کے بل رینگتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ پر چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر ریسٹ

ہاؤس کی طرف دیکھا۔ قناتوں کے باہر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کچھ باوردی فوجی ٹہل رہے تھے۔ وہ یقیناً گارڈ ڈیوٹی پر تھے۔ ریسٹ ہاؤس کے پرلی طرف کئی کاریں اور جیپیں کھڑی تھیں۔ تین ہیوی ٹرک بھی تھے۔

ریسٹ ہاؤس کے برآمدے اور لان میں بے حیائی اور بے غیرتی کا مظاہرہ عروج پر پہنچ چکا تھا اور میرے خیال میں رنگ رلیاں منانے والے ان اعلیٰ ہندو فوجی افسروں اور عورتوں کی تعداد ساٹھ اور ستر کے درمیان رہی ہوگی۔ اُن میں تین سکھ آفیسر بھی تھے۔ اُن کے سروں پر بندھی ہوئی پگڑیاں اُن کی قومیت کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

''پہلے کبھی رائفل چلائی ہے نا؟'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

''ہاں..... میرے ماما کے پاس بھی ایسی ہی سب مشین گن تھی۔'' سیتا نے اپنی رائفل پر ہاتھ مارتے ہوئے سرگوشی میں جواب دیا۔ ''اُس نے مجھے یہ رائفل چلانا سکھائی تھی۔ پہلی مرتبہ فائر کیا تھا تو کندھے پر بڑے زور کا جھٹکا لگا تھا۔''

''تو پھر رائفل کو مضبوطی سے تھاموا ور چلا دو پہلی گولی۔'' میں نے کہا۔

ہم دونوں سینے کے بل لیٹے پوزیشن لئے ہوئے تھے۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا رائفل پر اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''رائفل کو مضبوطی سے پکڑو اور ٹرائیگر دبا دو!'' میں نے اُس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

سیتا کے جسم میں معمولی سی حرکت پیدا ہوئی اور پھر فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھی..... سیتا نے ٹرائیگر تو دبا دیا تھا مگر رائفل کا رُخ بھی ذرا سا اُوپر کو اُٹھ گیا تھا اور گولیاں ریسٹ ہاؤس کا رُخ کرنے کی بجائے آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کو نشانہ بنانے کے لئے بلندیوں کی طرف چلی گئی تھیں۔

فائرنگ کی آواز گونجتے ہی ریسٹ ہاؤس کے لان میں بھگدڑ سی مچ گئی اور ٹھیک اُسی وقت دونوں پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے مجاہدین نے بھی فائر کھول دیا۔ اُن کے ہتھیار انگارے اُگلنے لگے۔ عبدالرحمٰن بھی سب مشین گن سے ریسٹ ہاؤس کی طرف گولیاں برسا رہا تھا۔

سیتا کی رائفل جھٹکا لگنے سے اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میں نے لپک کر رائفل اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔

''شاباش.....'' میں نے اُس کے کندھا تھپتھپایا۔ ''اب تمہیں کوئی خوف نہیں آنا چاہئے۔ دبا دو ٹرائیگر۔''

سیتا کا خوف واقعی دُور ہو گیا تھا اور اب وہ بڑی پتی تلی فائرنگ کر رہی تھی۔ میں نے بھی اپنی سب مشین گن سنبھال کر فائر کھول دیا۔ ریسٹ ہاؤس کے لان میں عجیب تماشا نظر آ رہا تھا۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو بچانے کے لئے ریسٹ ہاؤس کی عمارت کی طرف بھاگ رہے تھے کچھ بدحواسی میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ اُن کے ٹکرانے سے دونوں طرف کی قناتیں گر گئیں تھیں

اور کئی لوگ قناتوں کی رسیوں سے اُلجھ کر گرے تھے۔

وسیع لان میں کئی لاشیں گری تھیں۔ اُن میں مرد بھی تھے اور برہنہ عورتیں بھی۔ میزیں اور کرسیاں اُلٹ گئی تھیں۔ بوتلوں کی شراب گھاس کی آبیاری کر رہی تھی۔

ایک زخمی عورت نے اُٹھ کر بھاگنا چاہا مگر کسی طرف سے آنے والی گولی نے اُس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑا دیئے اور وہ ڈھیر ہو گئی۔

ریسٹ ہاؤس کی طرف سے محافظ فوجیوں نے بھی پہاڑیوں کی طرف فائرنگ شروع کر دی تھی لیکن ہماری طرف سے فائرنگ زیادہ شدید تھی۔ سب مشین گنوں کے علاوہ ہمارے آدمی اب مارٹر گنیں بھی استعمال کر رہے تھے۔ گولے اِدھر اُدھر گر کر پھٹ رہے تھے۔ ایک گولہ ریسٹ ہاؤس کی چھت پر گرا جس سے چھت کا وہ حصہ اُڑ گیا۔

عبدالرحمٰن سے پرلی طرف بیٹھے ہوئے مجاہد نے راکٹ داغ دیا۔ راکٹ ریسٹ ہاؤس کی عمارت سے ٹکرا کر پھٹا اور دیوار میں سوراخ کرتا ہوا اندر چلا گیا۔ ایک اور راکٹ پھٹا اور اس کے ساتھ ہی تاریکی چھا گئی..... غالباً بجلی کا جنریٹر بھی زد میں آ گیا تھا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے میں نے عورتوں اور مردوں کی کئی لاشیں گرتی دیکھی تھیں۔ ہماری طرف سے فائرنگ اندھیرا ہونے کے بعد بھی کئی منٹ تک جاری رہی۔ فائرنگ کے شور میں چیخوں کی آوازیں بھی واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ اور پھر اندھیرے میں چلایا گیا مارٹر کا ایک گولہ کسی ٹرک پر گرا۔ ٹرک کے پرخچے اُڑ گئے اور شعلوں نے قریب کھڑی ہوئی دو جیپوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔

عبدالرحمٰن سینے کے بل تیزی سے رینگتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

''فائرنگ جاری رکھیں کمانڈر؟'' اُس نے پوچھا۔

''اب کوئی فائدہ نہیں..... اپنے آدمیوں کو واپسی کا حکم دے دو!'' میں نے کہا۔

عبدالرحمٰن نے پتلون کی جیب سے ایک پستول نکالا اور اُس کا رُخ اوپر کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ روشنی کی لکیر آسمان کی طرف اُٹھتی چلی گئی اور پھر تاریکی میں سرخ رنگ روشنی کا ایک چھوٹا سا گولہ نمودار ہوا جو پھلجھڑی کی طرح بکھر گیا۔

یہ اپنے ساتھیوں کو واپسی کا اشارہ تھا۔ ہمارے آس پاس موجود مجاہد اپنا اپنا اسلحہ سنبھالے پہاڑیوں کے اندر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

''تم دونوں میرے ساتھ آؤ کمانڈر!'' عبدالرحمٰن چیخا۔

میں نے سیتا کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دونوں عبدالرحمٰن کے پیچھے دوڑنے لگے۔

ہمیں تعاقب کا خطرہ نہیں تھا۔ رنگ رلیاں منانے والے فوجی افسروں کے اس ٹولے کی حفاظت کے لئے چند فوجی تھے جن کے پاس صرف سب مشین گنیں تھیں۔ اُنہوں نے اگرچہ جوابی فائرنگ کی تھی لیکن وہ لوگ بھی ہماری فائرنگ کی زد پر تھے۔ اُن میں سے اگر کوئی بچ بھی گئے ہوں گے تو رات کی تاریکی میں ان پہاڑیوں میں ہمارے پیچھے آنے کی جرأت نہیں کریں

گے۔ لیکن ہم جلد سے جلد اس علاقے سے دُور نکل جانا چاہئے تھے۔

ہم دو گھنٹوں تک مسلسل دوڑتے اور تیز رفتاری سے چلتے رہے۔ غیر ہموار راستوں پر کئی مرتبہ ہمیں ٹھوکریں لگی تھیں۔ سیتا تو دو مرتبہ گر بھی چکی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بری طرح تھک گئی تھی اور بار بار لڑکھڑا رہی تھی۔

بالآخر ہم ایک جگہ رُک گئے۔ سیتا آگے کو جھک کر بیٹھ گئی۔ اُس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ میری اور عبدالرحمٰن کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہم اپنی کیفیت پر قابو پا سکے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہم اس وقت نشیبی علاقے میں تھے۔ ہمارے اردگرد کیکٹس کے پودے پھیلے ہوئے تھے اور دُور دُور تک پہاڑیاں تھیں۔

ہم تینوں ہی تھے۔ گروپ کا کوئی اور لڑکا ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ وہ لوگ مختلف سمتوں میں نکل گئے تھے۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا اُس نے دونوں ٹانگیں آگے کو پسار لی تھیں اور قدرے پیچھے جھک کر دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹکا رکھی تھیں۔

''مجھے پیاس لگ رہی ہے۔'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن لگتا ہے یہاں کہیں پانی نہیں ملے گا۔''

عبدالرحمٰن بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کندھے پر لٹکی ہوئی پانی کی بوتل اُتار کر سیتا کی طرف بڑھا دی۔ ہم جب باہو قلعہ کے قریبی کھنڈروں سے مانسر جھیل کی طرف روانہ ہوئے تھے تو چار پانچ مجاہدین کے پاس پانی کی بوتلیں دیکھی گئی تھیں۔ اور پھر مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ عبدالرحمٰن کے پاس بھی ایسی کوئی بوتل موجود تھی۔

سیتا نے ایک دو گھونٹ بھرنے کے بعد بوتل میری طرف بڑھا دی۔ بوتل کا وزن بتا رہا تھا کہ اس میں پانی کی مقدار زیادہ نہیں تھی۔ میں نے بھی صرف دو گھونٹ بھرنے کے بعد بوتل عبدالرحمٰن کی طرف بڑھا دی۔ اُس نے بھی ایک دو گھونٹ بھرے اور ڈھکنا بند کر کے بوتل دوبارہ کندھے پر لٹکا لی۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تم وہاں سے بھاگ نکلو گی یا کہیں دبک کر خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگو گی۔ لیکن تم تو بہت بہادر ثابت ہوئیں۔'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پہلا جھٹکا تو میرے لئے واقعی ناقابل برداشت تھا۔'' سیتا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''جب ہر طرف سے فائرنگ شروع ہوئی تو ایک لمحہ کو میرا دل چاہا تھا کہ وہاں سے بھاگ نکلوں۔ لیکن تم نے میری ہمت بڑھائی اور میں نے رائفل پر ہاتھ جما دیئے۔

''ایسے موقع پر بھاگنے کی کوشش کا نتیجہ خوفناک موت کی صورت ہی میں نکلتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پشت پر گولی کھانے سے بہتر ہے کہ آدمی سینہ سپر ہو کر جان دے دے۔''

''یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''آئندہ ایسا کوئی موقع آیا تو سینہ تان کر کھڑی

ہو جاؤں گی۔''

''معاف کرنا سیتا جی.....'' عبدالرحمٰن نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے بارے میں، میں کچھ شبہات میں مبتلا تھا۔ لیکن اب مجھے اپنے آپ پر شرمندگی ہو رہی ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔''

''میں نے اپنے بھائی کو معاف کر دیا۔'' سیتا اس مرتبہ کھل کر مسکرا دی۔

''دراصل میرا نام سن کر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا کہ مجھے حریت پسندوں سے ہمدردی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اب میں اپنے آپ کو انہی میں سے ایک سمجھتی ہوں۔ اور آپ لوگوں کی تحریک میں رہتے ہوئے اپنی جان تک دے دُوں گی۔ اور اُمید کرتی ہوں کہ اس کے بدلے میں مجھے اس آزاد دھرتی پر دفن ہونے کے لئے دو گز جگہ تو مل ہی جائے گی۔''

''آپ نے حریت پسندوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیوں کیا؟'' عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

''یہ کہانی زیادہ پیچیدہ نہیں۔'' سیتا نے جواب دیا اور اپنے ماما کی بستی میں پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ''شمروز کے کردار اور اس کی باتوں نے بھی مجھے متاثر کیا اور تب مجھے ادراک ہوا کہ میں نے غلط دھرتی پر، غلط گھر میں اور غلط وقت پر جنم لیا تھا۔ مجھے تو سرزمین کشمیر کے کسی مسلمان گھرانے میں جنم لینا چاہئے تھا جہاں ہوش سنبھالتے ہی میرے ہاتھوں میں بندوق ہوتی اور میں اپنے ہزاروں مجاہد بھائیوں کے ساتھ دشمن سے برسرپیکار ہوتی اور لوگ مجھے انگوری کے نام سے جانتے۔''

''انگوری.....'' عبدالرحمٰن بولا۔ ''آپ تو اُس عظیم مجاہدہ سے ملی ہوں گی سیتا جی؟''

''نہیں..... میں انگوری سے نہیں ملی۔ لیکن وہ واقعی بہت عظیم مجاہدہ تھی۔'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

سیتا نے انگوری کو نہیں دیکھا تھا لیکن اُس کے بارے میں سن سن کر وہ اُس سے بے حد متاثر ہوئی تھی اور دو تین روز سے تو وہ اکثر اُسی کا تذکرہ کرتی رہتی تھی۔

ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا اور پھر ہم اُٹھ کر آگے چل پڑے۔ عبدالرحمٰن کا خیال تھا کہ جموں میں بھارتی فوجی ہائی کمان کو اس واقعہ کی اطلاع مل گئی ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ فوجی دستے ہماری تلاش میں پہاڑوں کی طرف روانہ ہو چکے ہوں۔ حالانکہ اس کی توقع کم تھی۔ کیونکہ بھارتی فوجی رات کی تاریکی میں پہاڑوں کی طرف جانے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ البتہ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے ہماری تلاش شروع کر دی جائے۔ جموں کشمیر میں بھارتی فوج کے پاس ایسے روسی گن شپ ہیلی کاپٹر بھی موجود تھے جن میں لگے ہوئے آلات سے رات کی تاریکی میں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر بلندی پر پرواز کرتے ہوئے ہمیں تلاش کر سکتے تھے اس لئے ہم جلد سے جلد کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جانا چاہتے تھے۔

ہم بنجر اور ویران پہاڑیوں میں تیز تیز چلتے رہے۔ سیتا نے اپنی رائفل کندھے پر لٹکا رکھی تھی اور میں نے اُس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

اور پھر میرے وہ بدترین خدشات درست ثابت ہوئے..... فضا میں ہیلی کاپٹر کے پروں کی ہلکی سی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دینے لگی..... عبدالرحمٰن چیخا۔

''کمانڈر..... بھاگو..... اس طرف۔''

وہ ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے سیتا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر ایک طرف دوڑ لگا دی جہاں کچھ اُونچے ہیولے سے نظر آ رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر کی آواز واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اور پھر وہ ہیلی کاپٹر نظر آ گیا..... وہ گن شپ ہیلی کاپٹر نہیں تھا۔ اُس کے نیچے سرچ لائٹ نصب تھی۔ کاپٹر کے پیندے سے پھوٹنے والی دھار نیچے آتے ہوئے پھیلتی چلی گئی تھی اور ایک وسیع علاقہ تیز روشنی کی زد میں تھا۔

عبدالرحمٰن ایک چٹان کی کھوہ میں دبک گیا تھا۔ ہم اس سے کچھ فاصلے پر تھے اور ہمارا رُخ بھی کسی قدر دوسری طرف تھا۔ ہم سے چند گز آگے کیکٹس کے درختوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ جھنڈ سے چند گز دُور سیتا لڑکھڑا کر گری۔ ہیلی کاپٹر قریب آ رہا تھا..... میں نے جھک کر سیتا کا ہاتھ پکڑا اور اُسے گھسیٹتا ہوا کیکٹس کے جھنڈ میں لے گیا۔

کیکٹس کے پودے ڈنٹھل کی صورت میں بالکل سیدھے ہوتے ہیں اور اُن پر چھوٹی چھوٹی پتیاں بھی برائے نام ہی ہوتی ہیں۔ اس لئے ان پودوں کا سایہ بھی گھنا نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے کپڑے گہرے رنگ کے تھے اس لئے یہ اُمید ہی کی جا سکتی تھی کہ ہمیں اُوپر سے نہیں دیکھا جا سکے گا۔

میں نے سیتا کو ساتھ لیتے ہوئے کیکٹس کے پودوں کے جھنڈ میں چھلانگ لگا دی۔ سیتا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں بھی بے اختیار کراہ اُٹھا تھا..... کانٹوں سے میرے ہاتھ اور بازو چھل گئے تھے۔ چہرے پر بھی ایک خراش آئی تھی۔ اور غالباً سیتا کو بھی کانٹے ہی چبھے تھے اس لئے وہ چیخی تھی۔

سیتا میرے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ ہم دونوں بے حس و حرکت پڑے رہے۔ ہیلی کاپٹر بلندی پر پرواز کرتا ہوا ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔ اور پھر تیز روشنی کا وہ وسیع و عریض دائرہ ہم سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے سے گزر گیا..... ہیلی کاپٹر کے کافی دُور نکل جانے کے بعد بھی ہم بے حس و حرکت پڑے رہے۔ اور پھر پہلے میں نے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سیتا کو ہٹا کر آہستہ آہستہ اُٹھتے ہوئے پیچھے کی طرف رینگنے لگا۔ سیتا بھی اسی طرح رینگتے ہوئے پودوں کے جھنڈ سے باہر آ گئی۔ وہ کراہ رہی تھی۔ میرے جسم پر بھی خراشیں آئی تھیں جن میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ عبدالرحمٰن بھی اپنی کمین گاہ سے نکل آیا تھا۔ ہم چند لمحے وہاں کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے اور پھر تیزی سے ایک طرف چلنے لگے۔

ہم نے ریسٹ ہاؤس پر جس شدت سے فائرنگ، راکٹ اور گولے برسائے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں اچھا خاصا جانی نقصان ہوا تھا۔ کئی لاشیں تو میں نے اپنی آنکھوں سے گرتے ہوئے دیکھی تھیں۔ وہ سب فوج کے اعلیٰ افسران تھے۔ اُن میں سے کئی یقینی طور پر مارے گئے ہوں گے۔ کمانڈ ہیڈ کوارٹر میں اطلاع ملتے ہی کہرام مچ گیا ہوگا۔ جس طرح رات ہی میں ہیلی کاپٹروں کے ذریعے ہماری تلاش شروع ہو گئی تھی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ہر قیمت پر ہمیں پکڑنا چاہتے تھے اور مجھے یقین تھا کہ فوج کے کئی دستے بھی ہماری تلاش میں پہاڑیوں میں پہنچ گئے ہوں گے تاکہ ہمیں زیادہ دُور جانے کا موقع نہ مل سکے۔

ہم کہیں رُکے بغیر تیز تیز چلتے رہے۔ اس دوران ایک مرتبہ اور ہمیں ہیلی کاپٹر سے بچنا پڑا تھا۔ لیکن اس کے بعد ایسی کوئی صورتحال پیش نہیں آئی تھی۔

سیتا کی بری حالت ہو رہی تھی لیکن میں اُسے ہاتھ سے پکڑے کھینچتا رہا۔ شہر کی رہنے والی ناز و نعم میں پلی ہوئی لڑکی ایک ایسی افتاد میں مبتلا ہو گئی تھی جس سے نبرد آزما ہونے کی وہ کوشش کر رہی تھی۔ پو پھوٹنے لگی تھی۔ اُس وقت تک ہم جموں شہر سے میلوں دُور دریا کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ اس علاقے میں کچھ دُور تک درخت بھی تھے۔ ہم تھوڑی دیر دریا کے کنارے پر رُکے اور پھر تازہ دم ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ اب ہمیں درختوں اور اُونچی چٹانوں کی آڑ بھی حاصل تھی۔ اگر کوئی ہیلی کاپٹر اس طرف آ بھی جاتا تو ہم آسانی سے کہیں چھپ سکتے تھے۔

دن کی روشنی پھیل گئی اور پھر دُھوپ نکل آئی۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ چٹانوں میں چلتے رہے۔ دُھوپ جیسے جیسے تیز ہو رہی تھی چٹانیں تپ رہی تھیں اور گرمی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میری قمیض پسینے میں تر ہو گئی۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا اُس کی بھیگی ہوئی قمیض بھی جسم سے چپکی ہوئی تھی۔ عبدالرحمٰن کی حالت بھی ہم سے مختلف نہیں تھی۔

''اور کتنی دُور جانا ہے..... کوئی ٹھکانہ ہے یا ہم اسی طرح ویران پہاڑوں میں بھٹکتے رہیں گے؟'' سیتا نے ایک جگہ رُک کر کہا۔ اُس کا سانس پھول گیا تھا اور وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔

''اب ہم اپنی منزل کے قریب پہنچنے والے ہیں۔'' عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ''زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔'' اور پھر واقعی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم ایک غار میں پہنچ گئے۔ وہ غار بھی عجیب طرح کا تھا۔ ایک ندی سے دوسری طرف سنگلاخ چٹانوں میں گہرائی کی طرف ایک تنگ سی سرنگ تھی۔ تقریباً دس فٹ ڈھلان اُترنے کے بعد ہموار جگہ تھی اور وہیں سے غار دائیں طرف مُڑ گیا تھا جو کافی کشادہ اور سرنگ کی طرح بہت طویل تھا۔ دوسری طرف تقریباً بیس گز آگے روشنی نظر آ رہی تھی۔ اُس سرنگ میں بھی اُوپر کسی طرف سے پانی بہہ رہا تھا جس سے تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑی ندی سی بن گئی تھی۔

''یہی جگہ مناسب رہے گی۔'' عبدالرحمٰن ایک صاف سی جگہ دیکھ کر رُک گیا۔ ''یہاں پانی بھی ہے اور ہوا بھی آ رہی ہے۔''

سیتا ایک دم ڈھیر ہوگئی اُس نے جانوروں کی طرح ندی میں منہ لگا کر پانی پیا اور پھر پشت کے بل لیٹ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہی ہمارے حواس ٹھکانے آسکے تھے۔ ہمارے کپڑے پسینے میں بھیگے ہوئے تھے اور غار کے کھلے حصے سے آنے والی ہوا سے جسم میں ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔

عبدالرحمٰن نے پتلون کی جیب سے ایک چھوٹی سی پوٹلی نکال کر سامنے رکھ دی۔ اُس میں بھنے ہوئے سفید کابلی چنے تھے۔ میری پتلون کی جیب میں بھی چنے موجود تھے جو میں نے نکال کر اُس کھلی ہوئی پوٹلی میں ڈال دیئے۔ ہم تینوں نے چنے کھائے اور پیٹ بھر کر پانی پی لیا۔

''یہ غار کہاں پر ہے..... میرا مطلب ہے قرب و جوار میں کوئی آبادی ہے یا.....'' سیتا نے رحمٰن کی طرف دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''یہاں سے پانچ میل دُور مستواری نام کا ایک قصبہ ہے۔'' عبدالرحمٰن بتا رہا تھا۔ ''جموں سے ٹرین پر سوار ہوں تو دس بارہ میل کے فاصلے پر مستواری پہلا ریلوے سٹیشن ہے۔ قصبہ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ ہندوؤں، سکھوں، ڈوگروں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی ہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہم اس قصبے میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں دو تین گھر ہمارے محفوظ ٹھکانے ہیں۔ دو چار روز وہاں رہ کر صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی اگلا قدم اُٹھائیں گے۔''

''ٹھیک ہے..... فی الحال تو آرام کرنے کو جی چاہتا ہے۔'' میں نے کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پسار لیں۔ سیتا مجھ سے پہلے ہی آنکھیں بند کر چکی تھی۔

''ٹھیک ہے..... تم لوگ کچھ آرام کر لو۔ میں جاگ رہا ہوں۔'' رحمٰن نے کہا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد میں بھی دیوار سے ٹیک لگائے اونگھنے لگا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ رحمٰن نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ تھی اور آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی جیسے کسی نے مٹھی بھر مرچیں جھونک دی ہوں۔

''اُٹھ جاؤ کمانڈر..... باہر کوئی آ رہا ہے۔'' رحمٰن نے سرگوشی کی۔

میں اُچھل پڑا۔ میری نیند کافور ہوگئی۔ میں نے لپک کر رائفل اُٹھا لی اور سیتا کو بھی جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

''اُس طرف.....'' عبدالرحمٰن نے سرگوشی کی۔ ''اُس تاریک گوشہ میں۔'' ہم تینوں بڑی پھرتی سے غار کے ایک تاریک گوشے میں دبک گئے۔ سیتا کو پیچھے کر دیا گیا تھا اور میں اور عبدالرحمٰن رائفلیں سنبھالے آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگے۔

غار کے ندی والے دہانے کی طرف سے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی جو لمحہ بہ لمحہ قریب پہنچ رہی تھی.....!

○○○

قدموں کی آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کم از کم دو آدمی تھے جو بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہم نے اپنی رائفلیں بالکل تیار کر رکھی تھیں۔

ہم تاریکی میں تھے اور ہماری نظریں غار کے موڑ کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں سے گزر کر ہم بھی اس طرف آئے تھے۔ قدموں کی آہٹ بالکل قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر ایک انسانی ہیولہ موڑ گھوم کر سامنے آ گیا۔ وہاں بھی روشنی زیادہ نہیں تھی لیکن اُس انسانی ہیولے کا لباس دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان سا ہوا تھا کہ وہ پولیس یا فوج کی وردی نہیں تھی۔

''لگتا ہے اس طرف کوئی نہیں آیا۔'' ایک آواز سنائی دی۔

''ہو سکتا ہے اس طرف کا کسی کو خیال نہ آیا ہو اور وہ دوسری طرف گئے ہوں۔ بہرحال ہمیں یہاں تھوڑی دیر آرام کا موقع مل جائے گا۔'' یہ دوسری قدرے بھاری سی آواز تھی۔

''یہ اپنے ہی لڑکے ہیں۔'' عبدالرحمٰن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ان میں ایک تو وقاص ہے۔ تم یہیں رُکو! میں معلوم کرتا ہوں۔'' عبدالرحمٰن کسی قدر آگے بڑھ گیا اور پھر اُس نے سرگوشیانہ انداز میں وقاص کا نام لے کر پکارا۔

''کون ہے..... ادھر کون ہے؟ سامنے آ جاؤ.....!'' وہی بھاری آواز غار میں گونجتی ہوئی سنائی دی۔

''میں ہوں..... عبدالرحمٰن۔'' رحمٰن کہتے ہوئے مزید آگے بڑھ گیا۔ اور پھر وہ دونوں بھی آگے آ گئے۔ اُن میں ایک وقاص تھا اور دوسرا حمید۔ یہ دونوں بھی رات کی چھاپہ مار کارروائی میں ہمارے ساتھ شامل تھے۔ میں اور سیتا بھی تاریکی سے نکل کر سامنے آ گئے۔ ہمیں دیکھ کر اُن دونوں کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

وہ دونوں ندی کے کنارے پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگے اور پھر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اُن دونوں کے چہروں سے تھکن نمایاں تھی۔

''کس طرف سے آ رہے ہو تم لوگ.....؟'' کچھ دیر بعد رحمٰن نے وقاص کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہم لوگ دھتریال کی طرف نکل گئے تھے۔'' وقاص نے جواب دیا۔ ''لیکن اُس طرف خطرہ محسوس کر کے ہم طویل چکر کاٹتے ہوئے اس طرف آ گئے۔ کیونکہ ہمارے خیال میں یہی جگہ سب سے محفوظ تھی۔ اچھا ہوا تم لوگ بھی یہاں پہنچ گئے ہو۔ ہر طرف تو راستے بند ہو چکے

ہیں۔ جموں شہر اور اس کے نواحی علاقوں کو فوج نے پوری طرح گھیرے میں لے لیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں ریسٹ ہاؤس پر حملہ کرنے والے اُگر وادی شہر اور اُس کے نواح ہی میں کسی طرف چھپے ہوئے ہیں۔ لیکن تمہارے لئے ایک بری خبر بھی ہے۔''

''وہ کیا.....؟'' عبدالرحمن نے بے تابی سے پوچھا۔

''فیروز اور بشیر ہمارے ساتھ نہیں رہے۔'' وقاص نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' رحمن نے اُسے گھورا۔

''ہم پانچ آدمی پہاڑیوں سے بھاگ کر مانسر جھیل کے دوسری طرف چلے گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم نندانی کی طرف نکل جائیں گے۔ لیکن پہاڑیوں میں بھٹک کر ایک طویل چکر لگانے کے بعد دوبارہ جھیل کی طرف پہنچ گئے۔ اُس وقت تک شہر سے فوج اور پولیس کی ایک بڑی نفری مانسر جھیل پر پہنچ چکی تھی اور فوجی دستے پہاڑیوں میں گھس آئے تھے۔ ایک جگہ ہمارا تصادم ہو گیا۔ بشیر اور فیروز گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ عباس پکڑا گیا۔ میں اور حمید کسی طرح ان پہاڑیوں سے نکل کر نندانی کی طرف نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن نندانی کی طرف بھی خطرہ محسوس کر کے اس طرف آ گئے۔''

''عباس پکڑا گیا ہے تو بہت برا ہوا۔'' عبدالرحمن بولا۔ ''ویسے کچھ پتہ چلا اُن کے کتنے آدمی مارے گئے تھے؟''

''کچھ پتہ نہیں.....'' وقاص نے جواب دیا۔ ''اچھے خاصے مارے گئے ہوں گے۔ وہ سب اعلیٰ افسر تھے اس لئے تو پوری ہائی کمان پاگل ہو رہی ہے۔ کئی پلاٹون پہاڑوں میں ہمیں تلاش کر رہی ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ تلاش کا دائرہ وسیع کیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ یہاں تک پہنچ جائیں آپ لوگوں کو یہاں سے نکل جانا چاہئے۔''

''ہم شام کا اندھیرا پھیلتے ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔ تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟'' عبدالرحمن نے پوچھا۔

''ہم لوگ بھی ندی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے نواحی شہر کی طرف نکل جائیں گے اور اگر موقع ملا تو وہاں سے سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔'' وقاص نے جواب دیا۔

وہ لوگ دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ اُن کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ایسی صورتحال میں ستواری بھی ہمارے لئے محفوظ نہیں تھا۔ وہ ریلوے سٹیشن جموں سے دس بارہ میل ہی کے فاصلے پر تھا۔ اگر جموں شہر کو سیل کر دیا گیا تو ستواری کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے اس خدشے کا اظہار کیا تو عبدالرحمن بولا۔

''رسک تو لینا پڑے گا کمانڈر! اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ ان بنجر پہاڑوں میں دور دور تک کوئی بستی نہیں۔ اگر تلاش کا سلسلہ یہاں تک پہنچ گیا تو ہم زندگی بھر ان پہاڑوں سے نہیں

نکل سکیں گے۔''

وہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہم لوگ پروگرام بناتے اور رد کرتے رہے اور بالآخر یہی طے پایا کہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی یہاں سے نکل کر ستواری کا رُخ کیا جائے۔ آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی ہم روانہ ہو گئے۔ تقریباً ایک میل تک ہم سب دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ اکٹھے ہی چلتے رہے۔ اور پھر ہم تینوں نے راستہ بدل لیا اور وقاص اور حمید دریا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے گئے۔

پہاڑوں میں پانچ میل کا وہ فاصلہ طے کرنے میں ہمیں تقریباً ایک گھنٹہ لگا تھا اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ عبدالرحمن نے ہمیں کھیتوں میں روک دیا اور اپنی رائفل بھی ہمارے حوالے کر کے خود قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس کی واپسی تقریباً دو گھنٹوں بعد ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک اور ادھیڑ عمر آدمی بھی تھا جو ہمارے لئے کھانا بھی لے آیا تھا۔

وہ سکندر تھا۔ اُس سے ملنے والی اطلاعات بڑی خوفناک تھیں..... سکندر کے کہنے کے مطابق آج صبح سویرے ایک فوجی پارٹی اس طرف آئی تھی۔ بعض مسلمانوں اور مشتبہ کردار کے حامل ہندوؤں کے گھروں کی تلاشی بھی لی گئی تھی۔ فوج تو دو تین گھنٹوں بعد واپس چلی گئی تھی لیکن سادہ لباس میں چند آدمی اب بھی قصبے میں موجود تھے جن کے بارے میں سب ہی کو یہ شبہ تھا کہ ان کا تعلق انٹیلی جنس سے ہے۔

دوسری خوفناک اطلاع یہ تھی کہ رات کو ہمارے دو آدمی پکڑے گئے تھے۔ عباس تو رات ہی کو پکڑا گیا تھا جبکہ دلاور نامی نوجوان صبح سویرے ان پہاڑیوں میں فوجیوں کے ہاتھ لگا تھا اور دلاور نے تشدد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور یہ بتا دیا تھا کہ یہ منصوبہ عبدالرحمن نے تیار کیا تھا اور چھاپہ مار کارروائی کی قیادت شمروز نے کی تھی۔ اس کے ساتھ سیتا نام کی ایک ہندو لڑکی بھی تھی۔ دلاور نے یہ بھی شبہ ظاہر کیا تھا کہ وہ لوگ باہو قلعہ کے نواحی کھنڈرات میں ہیں یا جموں کے مغرب میں واقع وشنو دیو کے غاروں والے مندر میں پناہ لے سکتے ہیں۔ اور یہ اتفاق تھا کہ وشنو دیو کے مندر والے غار شہر کے مخالف سمت میں سینتیس میل کے فاصلے پر تھے اور باہو قلعہ بھی شہر کے دوسری طرف تھا۔ جبکہ ہم پہاڑیوں میں طویل چکر کاٹتے ہوئے مخالف سمت میں آ گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہماری تلاش کے لئے تمام تر توجہ اُس طرف ہو گی۔

سکندر کے کہنے کے مطابق آج صبح جموں سے پٹھانکوٹ جانے والی ٹرین کو بھی جموں سٹیشن سے روانگی کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ شہر اور اُس کے نواحی علاقوں کو مکمل طور پر سیل کر دیا گیا تھا اور ہماری تلاش میں پورے شہر میں گھر گھر تلاشی لی جا رہی تھی اور ہمارا اُس طرف رُخ کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔

سکندر سے ملنے والی اہم ترین خبر یہ تھی کہ رات کو ہماری چھاپہ مار کارروائی میں سترہ فوجی آفیسر مارے گئے تھے جن میں تین بریگیڈیئر، پانچ کرنل اور میجر اور کیپٹن وغیرہ تھے۔ کئی آفیسر

شدید زخمی ہوئے تھے۔ ان فوجی آفیسروں کے ساتھ مرنے والی عورتوں کی تعداد سولہ تھی۔ جبکہ کئی عورتیں شدید زخمی ہوئی تھیں۔ عبدالرحمٰن کے کہنے کے مطابق جموں کے کور کمانڈر کو بھی اس محفل میں شریک ہونا تھا مگر وہ کسی وجہ سے نہیں آ سکا تھا اور اُس کی قسمت ہی اچھی تھی کہ وہ وہاں سے دُور ہی رہا تھا۔

سکندر کے کہنے کے مطابق آج صبح ہی سے دہلی سے ہیلی کاپٹروں کی آمد و رفت لگی ہوئی تھی۔ کئی منتری اور اعلیٰ ترین سرکاری حکام صبح سویرے ہی دِلّی سے جموں پہنچ گئے تھے۔

ستواری ریلوے سٹیشن پر فوجیوں کی ایک پارٹی صبح ہی سے موجود تھی۔ وہ ہر شخص پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے اور بعض بے گناہوں کو پکڑ کر مارا پیٹا بھی گیا تھا۔

سکندر کے کہنے کے مطابق ان حالات میں ہمارا قصبے میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اُس نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم وہاں رُکنے کی بجائے آگے روانہ ہو جائیں۔ دس میل آگے ایک اور گاؤں اور ریلوے سٹیشن تھا۔ شاید وہاں صورتحال بہتر ہو۔

سکندر نے ہمارے لئے خچروں کا بندوبست کر دیا اور ہم آبادی سے دُور رہتے ہوئے آگے روانہ ہو گئے۔ لیکن اگلا گاؤں بھی ہمارے لئے محفوظ نہیں تھا۔ اس طرح ہم وہاں بھی رُکے بغیر آگے نکل گئے۔ اس طرح ہم خچروں پر رات بھر سفر کرتے ہوئے سامبا پہنچ گئے۔

سامبا ایک بڑا قصبہ تھا اور نواح میں پہاڑی سلسلہ بھی بتدریج ختم ہوتا جا رہا تھا۔ آگے میدانی علاقہ تھا اور سرسبز فصلیں لہراتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سامبا کے نواح میں ایک جگہ ہمیں پناہ مل گئی۔ وہ دن اور رات ہم نے وہیں گزاری اور اُس سے اگلے روز ہم عبدالرحمٰن سے رخصت ہو کر پٹھان کوٹ کی طرف جانے والی بس پر سوار ہو گئے۔ ہمارے ساتھ دو بوڑھی عورتیں اور دو آدمی بھی تھے۔ سیتا اُن عورتوں کے ساتھ تھی اور میں اُن دو بوڑھے آدمیوں کے بیچ میں بیٹھ گیا تھا۔

جسمیر گڑھ میں بس رُکی تو پولیس کی بھاری نفری نے بس کو گھیرے میں لے لیا اور بس سے اُترنے والے ہر مسافر سے پوچھ گچھ کی جانے لگی۔ دو پولیس والے بھی بس میں گھس آئے تھے۔ مجھ سے بھی کچھ ایسی باتیں پوچھی گئیں جن کے بارے میں مجھے پہلے سے سمجھا دیا گیا تھا۔ میں کہاں سے آیا ہوں؟ مجھے کہاں جانا ہے؟ میرے رشتے داروں کے نام کیا ہیں اور وہ کیا کام کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا بوڑھا نواب دین بھی اس آڑے وقت میں بڑا کام آیا تھا۔ اُس نے سامبا کے ایک پولیس آفیسر کا نام بھی لے دیا کہ ہم اُس کے رشتہ دار ہیں۔ ہمارے بارے میں اُس سے معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

خدا خدا کر کے سہ پہر کے قریب بس پٹھان کوٹ پہنچ گئی۔ بس سے اُترتے ہوئے بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ آس پاس کھڑے ہوئے چند پولیس والے اور کچھ سادہ لباس، مسافروں کو کڑی نظروں سے گھور رہے تھے۔ جموں کی طرف سے آنے والے ہر شخص کو مشتبہ نگاہوں سے

دیکھا جا رہا تھا۔

جموں کی طرف سے آتے ہوئے پنجاب کا پہلا بڑا شہر پٹھان کوٹ ان چند شہروں میں سے ایک تھا جس کی تعمیر میں مغلوں نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ کشمیر کی گزرگاہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اس شہر کو دِلّی سے کشمیر جانے والے مغل شہنشاہوں اور شہزادوں کے ایک پڑاؤ کی حیثیت حاصل تھی۔ ہر مغل شہزادے نے حسب توفیق یہاں اپنی نشانیاں اور یادگاریں قائم کی تھیں۔ شہر کا سب سے خوبصورت پارک (شاہی باغ) اب بھی شہنشاہ جہانگیر کے عہد کی یاد دلاتا ہے۔ دُور تک پھیلا ہوا یہ شہر قدیم و جدید فن تعمیر کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہاں قدیم تہذیب بھی دیکھنے کو ملتی ہے اور جدید ثقافت بھی۔

اس شہر کی زیادہ آبادی سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ دوسری قومیں بھی آباد ہیں۔ مگر عبادت گاہوں میں زیادہ تعداد سکھوں کے گردواروں اور ہندوؤں کے مندروں کی ہے۔ جبکہ شہر کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی چند مساجد بھی ہیں۔

وہ دوپہر کا وقت تھا اور شدید گرمی تھی۔ لو کے تھپیڑے چل رہے تھے۔ ہم ان دونوں بوڑھی عورتوں اور بوڑھے مردوں کے ساتھ چلتے رہے۔ سیتا نے مسلمان عورتوں کی طرح دوپٹے سے گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ یہاں اگرچہ اُسے پہچان لئے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا لیکن وہ اپنے آپ کو ایک مسلمان عورت پوز کر رہی تھی اور اس خیال سے اُس نے غیر مردوں سے پردہ ضروری سمجھا تھا۔

تانگہ اسٹینڈ پر کوچوان شہر کے مختلف علاقوں کی آوازیں لگا رہے تھے اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنے تانگوں کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک تانگے والا محلہ فیروز پورہ کی آوازیں لگا رہا تھا۔ ہم اُس کے تانگے پر بیٹھ گئے۔ میں اُن دو بوڑھوں کے ساتھ آگے بیٹھ گیا جبکہ سیتا عورتوں کے ساتھ پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ اُن کا سامان، ایک ٹوکری جس میں سامبا کی کچھ سوغاتیں تھیں، میں نے اپنی سیٹ کے آگے پیروں کے قریب رکھی تھی۔

شدید گرمی کے باوجود شہر کی سڑکوں پر ٹریفک کا اژدحام تھا۔ بازاروں میں خوب رونق تھی۔ تانگہ مختلف سڑکوں پر ہوتا ہوا تقریباً پون گھنٹے میں محلہ فیروز پورہ میں ایک مسجد کے قریب رُک گیا۔ عمر دین نامی ایک بوڑھے نے کرایہ ادا کیا اور ہم نیچے اُتر آئے۔ میں نے وہ ٹوکری سر پر اُٹھائی اور اُن کے پیچھے چلنے لگا۔ سیتا بھی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

فیروز پورہ میں ایک مین بازار اور دائیں بائیں لاتعداد گلیاں تھیں۔ بعض گلیاں تو کافی کشادہ تھیں اور بعض گلیاں اس قدر تنگ تھیں کہ تین آدمی پہلو بہ پہلو بمشکل چل سکتے تھے۔ زیادہ آبادی سکھوں اور مسلمانوں کی تھی۔ ہندو بھی نظر آ رہے تھے۔

تقریباً ایک فرلانگ تک مین بازار میں چلنے کے بعد ہم ایک کشادہ گلی میں داخل ہو گئے۔ سرخ اینٹوں کے مکان قدیم فن تعمیر کی عکاسی کر رہے تھے لیکن بیشتر مکانوں میں اپنی ضرورت

اور عہد حاضر کے مطابق تبدیلیاں کر لی گئی تھیں۔ زیادہ تر مکان دو منزلہ تھے۔ اس کشادہ گلی میں تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک اور گلی میں داخل ہو گئے اور دائیں طرف والے چوتھے مکان کے سامنے رُک گئے۔

دستک کے جواب میں دروازہ جلد ہی کھل گیا۔ اس مرکزی دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی ایک طرف بیٹھک کا دروازہ تھا اور دوسری طرف اوپر جانے کے لئے سرخ اینٹوں والی سیڑھیاں۔

بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر پنکھا چل رہا تھا مگر کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ عمر دین نے مجھ سے گٹھڑی لے لی۔ مجھے اور سیتا کو بیٹھک میں بٹھا کر وہ سب لوگ اندر چلے گئے۔ سیتا نے چہرے پر سے گھونگھٹ ہٹا دیا بلکہ دوپٹہ اُتار کر ایک کرسی پر ڈال دیا اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ پسینے سے اُس کا چہرہ بھی تر ہو رہا تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

ایک دیوار پر قریب قریب خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ کی رنگین تصاویر فریم میں آویزاں تھیں۔ دوسری دیوار پر کسی کمپنی کا کیلنڈر آویزاں تھا۔ کمپنی کا نام ہندی میں چھپا ہوا تھا۔ فرش پر ایک پرانا سا قالین بچھا ہوا تھا اور فرنیچر بھی درمیانے درجے کا تھا جس سے گھر والوں کی مالی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک ادھیڑ عمر عورت ایک ٹرے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے میں دو گلاس اور ایک شیشے کا جگ تھا جو لیموں کے شربت سے لبریز تھا۔ اس عورت کے اندر داخل ہوتے ہی سیتا نے جلدی سے دوپٹہ اُٹھا کر سر پر ڈال لیا اور میں بھی کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اُس عورت کو سلام کیا۔

عورت نے ٹرے تپائی پر رکھ کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، سیتا کو گلے سے لگا کر پیشانی پر بوسہ دیا۔ ''بیٹھو تم لوگ۔ کھڑے کیوں ہو؟'' وہ باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''پانی پیو! دُھوپ سے آئے ہو۔ پیاس لگ رہی ہو گی۔''

ہم دونوں بیٹھ گئے اور ایک ایک گلاس اُٹھا لیا۔ گلاس خالی ہوئے تو اُس عورت نے جگ اُٹھا کر اُنہیں دوبارہ بھر دیا۔

''میں عبدالرحمٰن کی ماسی زبیدہ ہوں۔'' وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے عمر دین نے تم لوگوں کے بارے میں تھوڑا سا بتا دیا ہے۔ یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ تم دونوں نے ہمارے گھر کو رونق بخشی۔'' وہ اگرچہ اُردو میں بات کر رہی تھی مگر لہجہ کشمیری تھا اور پنجابی زبان کے الفاظ بھی بکثرت استعمال کر رہی تھی۔ ''اس کو اپنا ہی گھر سمجھنا بیٹا! اور کوئی تکلف نہ کرنا۔ جس چیز کی بھی ضرورت ہو بلا تکلف کہہ دینا۔''

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ بوڑھا عمر دین دروازے میں نمودار ہوا۔ اُس کے پیچھے دونوں عورتیں اور دوسرا بوڑھا بھی تھا۔

''اچھا زبیدہ بیٹی..... اب ہم چلتے ہیں۔'' عمر دین نے کہا۔ ''عبدالرحمٰن نے ایک امانت ہمارے سپرد کی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں وہ امانت تم تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔'' اُس نے بات کرتے ہوئے میری اور سیتا کی طرف دیکھا تھا۔

''ایسی کیا جلدی ہے ماما جی..... روٹی کھا کے جانا۔ ابھی تو بہت تیز دُھوپ ہو رہی ہے۔'' زبیدہ نے کہا۔

''ساری زندگی دُھوپ میں جلتے ہوئے گزری ہے۔ اب یہ ہمارا کیا بگاڑ لے گی؟ روٹی ہم محمد شفیع کے ہاں کھا لیں گے۔'' عمر دین نے جواب دیا۔ زبیدہ کے اصرار کے باوجود وہ نہیں رُکے۔ اُن سب نے ہم دونوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور رخصت ہو گئے۔

''عمر دین میرا ماما ہے۔'' زبیدہ نے بتایا۔ ''اس کا بیٹا محمد شفیع یہاں سرکاری نوکری کرتا ہے۔ سامبا میں ان کی تھوڑی سی زمین ہے۔ یہ ہفتہ دس دن میں یہاں آتے رہتے ہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم لوگ نہا دھو لو۔ میں اتنے میں آٹا گوندھ کر روٹیاں پکا لیتی ہوں۔ آؤ..... میرے ساتھ آؤ۔''

ہم زبیدہ کے ساتھ بیٹھک سے باہر آ گئے۔ بڑا لمبا چوڑا پختہ صحن تھا جس کے عین وسط میں اُونچا اور گھنیرا نیم کا درخت لگا ہوا تھا۔ اُس کا گہرا سایہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ دو کمرے سامنے تھے اور دو دائیں طرف۔ دونوں طرف برآمدے تھے۔ ایک طرف باورچی خانہ تھا اور اوپر جانے والی سیڑھی کے ساتھ ایک غسل خانہ تھا۔

''ایک غسل خانہ تو یہ ہے۔'' وہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اور کمرے میں بھی غسل خانہ ہے۔ آؤ بیٹی..... تم میرے ساتھ آ جاؤ! ٹھہرو میں تولئے لا دیتی ہوں۔''

زبیدہ ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہے جا رہی تھی۔ وہ بات کرتی ہوئی ایک کمرے میں گھس گئی اور تھوڑی دیر بعد وہ دُھلے ہوئے تولئے لے آئی۔

''لو بیٹا!'' اُس نے ایک تولیہ میری طرف بڑھا دیا۔ ''تم یہاں نہا لو! اور بیٹی تم اس کمرے میں چلی جاؤ۔ میں جلدی سے روٹیاں پکا لوں۔ تم لوگوں کو بھوک لگ رہی ہو گی۔''

میں تولیہ لے کر سیڑھیوں کے ساتھ والے غسل خانے میں گھس گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک پانی کے ڈونگے بھر کر اپنے اُوپر ڈالتا رہا اور جب نہا کر باہر نکلا تو زبیدہ کھانا تیار کر چکی تھی۔ اُس نے نیم کے سائے میں تپائی اور چار کرسیاں بچھا دی تھیں اور پھر کھانا بھی وہیں لگا دیا تھا۔ وہ خود بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شامل تھی۔ اور اس وقت پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ وہ گھر میں اکیلی تھی۔

''بچے کہاں ہیں ماں جی؟'' میں نے پوچھا۔ اور پھر مجھے لگا جیسے میں نے اُس کے زخم پر اُنگلی رکھ دی ہو۔

زبیدہ کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ چہرے پر ناقابل بیان کرب کے تاثرات بکھر گئے۔

''بچے.....؟'' وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''اللہ نے سب کچھ دیا مگر اس نعمت سے محروم رکھا۔ عبدالرحمٰن میری بہن کا بیٹا ہے۔ مگر اُسے میں نے ہی اولاد کی طرح پالا ہے۔''

اُس کے دکھ کو محسوس کر کے میں نے موضوع بدل دیا اور پھر باتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ زبیدہ جموں کی رہنے والی تھی۔ اُس کا پورا خاندان وہاں تھا۔ کچھ رشتے دار سامبا، اکھنور، کٹھوا اور پٹھان کوٹ کے علاوہ پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی آباد تھے۔ اُس کا شوہر الطاف اُس کا فرسٹ کزن تھا۔ زبیدہ شادی کے بعد پٹھان کوٹ آ گئی اور کچھ عرصے بعد وہ عبدالرحمٰن کو بھی اپنے پاس لے آئی۔ وہ خود بے اولاد تھی۔ اُس نے عبدالرحمٰن کو اولاد ہی کی طرح پایا اور گریجویشن تک تعلیم دلائی۔

عبدالرحمٰن اپنے والدین سے ملنے کے لئے جموں جاتا رہتا تھا۔ وہ جموں اور کشمیر میں بھارتی غاصبوں کے خلاف مجاہدین کی سرگرمیوں سے بڑا متاثر تھا۔ جموں اور کشمیر کے ہر باشندے کی طرح وہ بھی اپنے وطن کی آزادی کے خواب دیکھنے لگا اور بالآخر مجاہدین کی ایک تحریک میں شامل ہو گیا اور کئی کئی روز تک گھر سے غائب رہنے لگا۔ پولیس اُس کی گرفتاری کے لئے جموں میں اُس کے والدین اور دوسرے رشتے داروں کے گھروں پر چھاپے مارتی رہتی تھی۔ ایک موقع پر پولیس اُس کے والد کو پکڑ کر لے گئی اور اُسے تشدد کر کے ہلاک کر ڈالا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن نے گھر آنا چھوڑ دیا مگر بھارتی سامراج کے خلاف اُس کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔

''دو دن پہلے جموں میں جو کچھ ہوا اُس نے ہندو سرکار کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔'' زبیدہ کہہ رہی تھی۔ ''کل یہاں شہر میں ہندو سرکار اور فوج کی اعلیٰ قیادت کے خلاف بہت زبردست مظاہرہ ہوا تھا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے کہ فوج کو باغیوں کی سرکوبی کے لئے جموں اور کشمیر بھیجا گیا تھا مگر یہ لوگ وہاں جا کر رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ لوگ مطالبہ کر رہے ہیں کہ فوج سے کالی بھیڑوں کو نکالا جائے اور جموں کی فوجی بائی کمان اور دیگر اعلیٰ افسران کو گرفتار کر کے اعلیٰ سطح پر اس واقعہ کی تحقیقات کرائی جائے۔ آج کے تمام اخبارات بھی جموں ہی کے حوالے سے خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''مانسر جھیل ریسٹ ہاؤس پر کارروائی میں جن مجاہدین نے حصہ لیا تھا اُن میں عبدالرحمٰن کا نام بھی شامل ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ اس چھاپہ مار کارروائی کی قیادت نوجوان مجاہد لیڈر شمرز نے کی تھی جو کشمیر میں بھی بھارتی فوج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکا ہے۔ اور آج مجھے دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ کشمیر کا وہ سپوت میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔''

زبیدہ کی بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ عبدالرحمٰن کو اُس نے پالا تھا، اُس نے اس شہر سے گریجویشن کیا تھا۔ یہاں کے بہت سے لوگ اُسے جانتے تھے۔ اور اب جموں میں فوجی افسروں کے قتل عام میں بھی اُس کا نام لیا جا رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ یہ جگہ ہمارے لئے محفوظ نہیں تھی۔ پولیس اُس کی تلاش میں کسی وقت بھی ادھر کا رُخ کر سکتی تھی۔ میں نے زبیدہ سے یہی

سوال کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ عبدالرحمٰن نے جب مزاحمتی تحریک میں شمولیت اختیار کی تھی تو اُس کے بعد اُس نے یہاں آنا چھوڑ دیا تھا اور ہم نے بھی یہ مشہور کر رکھا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ گیا ہوا ہے۔ یہ بات تو چار سال پرانی ہو چکی ہے۔ اُس نے جب بھی کوئی کارروائی کی جموں ہی میں اُس کے والدین اور رشتے داروں کے گھروں پر چھاپے مارے گئے۔ یہاں کبھی کسی نے اُس کے بارے میں آ کر نہیں پوچھا۔ ویسے.....'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''خدانخواستہ ایسا کوئی وقت آیا تو ہم تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچنے دیں گے۔ آس پاس کے تمام گھر مسلمانوں کے ہیں۔ تم لوگوں کو اس طرح غائب کر دیا جائے گا کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔'' بظاہر اُس کی بات سے میں مطمئن ہو گیا تھا مگر اندر سے مطمئن نہیں تھا اور ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

ہمارے ساتھ سمبا آنے والے بوڑھے عمر دین نے زبیدہ کو ہمارے بارے میں بہت مختصر سا بتا دیا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ میرے ساتھ یہ لڑکی سیتا ہے اور اپنوں سے بغاوت کر کے میرے ساتھ مل گئی ہے۔ اور میں شمروز ہوں۔ اور اب میں نے اُسے اپنے اور سیتا کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا اور یہ بھی درخواست کی کہ ہمیں عذرا اور سلطان کے نام سے پکارا جائے تاکہ ہمارے اصل ناموں سے کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔

شام چھ بجے کے قریب زبیدہ کا شوہر عبدالعزیز بھی آ گیا۔ اُس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ سر کے بال اگرچہ سفید ہو چکے تھے مگر صحت قابل رشک تھی۔ ہمارے بارے میں جان کر اُس نے بڑی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ عبدالعزیز ایک ملٹی نیشنل فارماسیوٹیکل کمپنی میں ملازم تھا جس کا ایک دفتر پٹھان کوٹ میں بھی تھا۔ اس کمپنی کے جموں اور کشمیر کے معاملات کو اس دفتر سے ہینڈل کیا جاتا تھا۔

اس شام پڑوس کی کچھ عورتوں اور رشتہ داروں کی آمد و رفت بھی شروع ہو گئی۔ میں تو عبدالعزیز کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھا رہا جبکہ سیتا زبیدہ کے پاس تھی جہاں خواتین کی آمد و رفت تھی۔ گھر میں آنے والے مہمانوں کو یہی بتایا جا رہا تھا کہ ہم جالندھر سے آئے ہیں اور چند روز یہاں رہ کر چلے جائیں گے۔

مکان کے نچلے حصہ میں اگرچہ چار پانچ کمرے تھے مگر ہمارے لئے اُوپر والے حصے میں انتظام کر دیا گیا تھا۔ اوپر بھی وسیع و عریض صحن تھا اور صرف تین کمرے تھے۔ ایک کمرہ تو سیڑھیوں کے بالکل ساتھ تھا جس کی ایک بڑی کھڑکی گلی کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی میں کھڑا ہو کر سامنے والے مکان کی اُوپر کی منزل کے مکینوں سے بڑی آسانی سے بات کی جا سکتی تھی۔ دو کمرے صحن کے دوسری طرف تھے۔ ہمارے لئے انہی میں سے ایک کمرے میں انتظام کیا گیا تھا۔ اوپر والے صحن کا آدھا حصہ کھلا ہوا تھا جس کے کنارے پر ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ نچلے صحن میں

نیم کے درخت کی شاخیں اُوپر والے صحن سے بہت اُوپر تک چلی گئی تھیں۔

ہم رات گیارہ بجے کے قریب اوپر آئے تھے۔ اس کمرے میں ڈبل بیڈ کے علاوہ دو تین کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اٹیچ باتھ رُوم تھا۔ زبیدہ اور عبدالعزیز جانتے تھے کہ ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہم بہت عرصے سے اکیلے رہ رہے ہیں۔ انہیں ہمارے کردار پر کوئی شبہ نہیں تھا اور اس لئے ہمارے لئے ایک ہی کمرے میں انتظام کیا گیا تھا۔

مانسر جھیل والے ریسٹ ہاؤس پر چھاپہ مار کارروائی کے بعد آج تیسرا دن تھا اور یہ سارا وقت بھاگ دوڑ کرتے ہوئے ہی گزرا تھا۔ کہیں آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تھکن نے ہم دونوں کو نڈھال کر رکھا تھا۔ سیتا تو موقع ملتے ہی آرام دہ بستر پر لیٹتے ہی سو گئی تھی لیکن مجھے تھکن کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔

میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز اس صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا جس سے ہم گزر کر آئے تھے۔ ہمارے ہاتھوں سترہ اعلیٰ فوجی آفیسر ہلاک ہو گئے تھے اور کئی زخمی ہوئے تھے۔ حریت پسندوں کی تلاش کے لئے جموں شہر اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں کو سیل کر دیا گیا تھا اور ہماری تلاش کا دائرہ وسیع تر کیا جا رہا تھا۔ زیادہ توجہ کشمیر کی طرف جانے والے راستوں پر دی جا رہی تھی۔ چھاپہ مار کارروائی میں میرا نام سامنے آنے کے بعد بھارتیوں کو یقین ہو گا کہ میں کشمیر کی طرف ہی جانے کی کوشش کروں گا اس لئے زیادہ توجہ اس طرف دی جا رہی تھی۔ یہ تو انہوں نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ میں وہاں سے بہت دُور ایک محفوظ جگہ پر آ چکا ہوں۔ ایک اور بات جو مجھے سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ اب میں واقعی اپنے محاذ سے بہت دُور آ چکا تھا۔ اس رات تو سیتا نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی میرے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی اور مجھے کشمیر کی قتل گاہ سے بہت دُور لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن پھر اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ میرے راستے کی رُکاوٹ نہیں بنے گی اور ہندو سامراج کے خلاف جنگ میں میرے پہلو بہ پہلو رہے گی۔ اور اُس نے اپنی اس بات کو سچ بھی ثابت کر دکھایا تھا۔ مانسر جھیل کے ریسٹ ہاؤس پر چھاپہ مار کارروائی خودکشی کے مترادف تھی۔ لیکن سیتا نے ہمارا ساتھ دیا تھا اور تین دن تک بھوکی پیاسی ہمارے ساتھ پہاڑوں میں بھٹکتی رہی تھی۔

سیتا کے کردار پر اگرچہ مجھے کوئی شبہ نہیں تھا لیکن میں اپنے محاذ سے اس قدر دُور نکل آیا تھا کہ فی الحال فوری طور پر واپسی کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری تلاش میں چپہ چپہ چھانا جا رہا تھا اور ان حالات میں جموں یا کشمیر کی طرف واپسی کا رُخ اختیار کرنا ممکن نہیں تھا۔

شہر کی کسی عمارت پر لگے ہوئے گھڑیال نے تین بجے کا اعلان کیا۔ میں نے گردن گھما کر سیتا کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ اُس کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ نیند میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ میں چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا اور بالآخر نیند کو مجھ پر ترس آ

ہی گیا.....

صبح نو بجے میری آنکھ کھلی تو سیتا بستر پر نہیں تھی۔ باتھ رُوم کا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا اور ظاہر ہے وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر اُٹھ کر باتھ رُوم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی سے نہانے کے باوجود دماغ کی تپش کم نہیں ہوئی تھی۔ میں باتھ روم سے نکلا ہی تھا کہ سیتا کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں چائے کے کپ اُٹھا رکھے تھے۔

''اوہ..... تم اُٹھ گئے؟'' وہ چائے کے کپ چھوٹی میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ تمہیں جگانے کے لئے جھنجھوڑنا پڑے گا۔''

ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے اور چائے پینے لگے۔ عبدالعزیز آٹھ بجے اپنی ڈیوٹی پر جا چکا تھا۔ اور زبیدہ اپنے کمرے میں کسی پڑوسن سے باتیں کر رہی تھی۔

اور پھر دس بجے کے قریب ہم بھی نیچے آ گئے۔ اُس وقت زبیدہ اکیلی تھی۔ اُس نے ہمارے لئے ناشتہ تیار کر دیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں اور سیتا شہر کی صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے گھر سے رخصت ہو گئے۔ زبیدہ نے زبردستی سیتا کو دو ہزار روپے دے دیئے تھے تاکہ ہم ضرورت کی چیزیں خرید لیں۔

گرمی کے باوجود بازاروں میں رونق تھی۔ شہر کی زندگی معمول کے مطابق تھی۔ البتہ وہ علاقہ جہاں اعلیٰ حکام کے سرکاری دفاتر تھے اُس طرف ہندسرکار کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے۔ ایک مخصوص طبقہ تھا جو جموں میں مانسر جھیل پر اعلیٰ فوجی افسروں کے قتل عام پر حکومت کے خلاف مظاہرے کر رہا تھا جبکہ عام شہریوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، تاہم ہر جگہ موضوع یہی تھا۔ لوگوں کے پاس صرف اخباری معلومات تھیں اور وہ انہی پر تبصرے کر رہے تھے۔

ہم دو بجے تک بازاروں میں گھومتے رہے۔ سیتا نے ضرورت کی کچھ چیزیں خریدیں۔ میں نے جموں سے شائع ہونے والا ایک انگریزی اخبار بھی خرید لیا۔ ہمیں بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی لیکن ہم نے ایک جگہ چاٹ کے علاوہ کچھ نہیں کھایا کیونکہ زبیدہ نے کہا تھا کہ دوپہر کا کھانا ہم گھر پر کھائیں گے۔ اور پھر تین بجے کے قریب ہم گھر پہنچ گئے۔

کھانے کے بعد میں اخبار لے کر نیم کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چوتھے دن کے باوجود اخبار انہی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ کئی زخمی فوجی افسران اور ان عورتوں کی تصویریں تھیں جن کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے وہ گھائل ہوئے تھے۔ اس واقعہ کی تحقیقات کے لئے اُس روز اعلیٰ سطح کی ایک کمیٹی قائم کر دی گئی تھی اور ترجمان کے بیان کے مطابق تحقیقات میں کچھ پیش رفت ہوئی تھی۔

ایک اور خبر نے مجھے چونکا دیا۔ اُس رات کی چھاپہ مار کارروائی میں حصہ لینے والا بلال نام کا ایک لڑکا جموں سے کئی میل دُور اودھم پور شہر سے پکڑا گیا تھا اور اُس نے انتہائی تشدد اٹھانے کے بعد تفتیشی افسروں کو بتایا تھا کہ شمروز سرینگر کی طرف جا چکا ہے جہاں وہ کسی فوجی کیمپ پر ایک

اور کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ پکڑے جانے والے مجاہدین نے میرے اور دوسرے ساتھیوں کے بارے میں بھارتی افسروں کو گمراہ ہی کیا تھا۔

ہم تقریباً ایک ہفتہ زبیدہ اور عبدالعزیز کے مہمان رہے۔ کشمیر کی طرف واپسی کا چانس نہیں تھا۔ سیتا نے بالآخر مجھے اپنے ساتھ راجستھان چلنے پر مجبور کر دیا۔ اور پھر اس سے اگلے روز ہم اپنے مہربانوں سے رخصت ہو گئے۔ زبیدہ اور عبدالعزیز نے ہماری ضروریات کے لئے ایک معقول رقم بھی ہمیں دے دی تھی۔

پٹھان کوٹ سے رخصت ہو کر ٹرینوں اور بسوں میں سفر کرتے ہوئے ہم تیسرے روز شام کو پنجاب کی سرحد سے نکل کر راجستھان کے شہر ہنومان گڑھ پہنچ گئے۔

یہ میری زندگی کا ایک نیا موڑ تھا اور مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میرے لئے کیا تھا.....؟

○○○

سرفروش مجاہدوں کی داستان

''انگارے'' ابھی جاری ہے،

بقیہ واقعات کے لئے جلد دوئم کا مطالعہ کریں

انگارے

اقبال کاظمی

2

ہنومان گڑھ درمیانے درجے کا شہر تھا۔ یہاں چند اچھے اور درمیانے درجے کے ہوٹل تھے لیکن سیتا نے شہر کے نواحی علاقے میں واقع ایک گیسٹ ہاؤس کو ترجیح دی۔

گیسٹ ہاؤس کے چاروں طرف وسیع باغ تھا جس پر بڑی محنت کی گئی تھی۔ وسیع و عریض لان تھا۔ دبیز گھاس کے قطعات کے کناروں پر خوبصورت پھولوں کے پودوں کی کیاریاں تھیں۔ لان میں ایک دوسرے سے فاصلے پر میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر رنگ برنگی خوبصورت چھتریاں بھی تنی ہوئی تھیں۔

جس ٹرین پر ہم بٹھنڈہ سے آئے تھے اُس نے ہمیں سہ پہر چار بجے کے قریب ہنومان گڑھ پہنچایا تھا۔ سٹیشن سے نکلنے اور آٹو رکشہ پر یہاں تک آنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ ریلوے سٹیشن سے نکل کر سیتا نے رکشے والے کو جس طرح گیسٹ ہاؤس کا پتہ بتایا تھا اُس سے مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ یہ شہر اُس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔

اس وقت اگرچہ پانچ بج چکے تھے مگر فضا میں ہلکی سی تپش اب بھی موجود تھی۔ اس شہر کے چاروں طرف دُور دُور تک ریگستان تھا اور ریگستان کی گرمی شہر کو بھی اثر انداز کرتی تھی۔

آٹو رکشہ جیسے ہی گیسٹ ہاؤس کے گیٹ کے سامنے رُکا ایک ادھیڑ عمر ملازم دوڑتا ہوا باہر آ گیا۔ اُس نے پہلے ہاتھ جوڑ کر ہمیں پرنام کیا پھر وہ بیگ اُٹھا لیا جو ہم دونوں کا کل اثاثہ تھا۔ میں سیتا کے ساتھ بجری والی روش پر چلتے ہوئے لان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تمام میزیں خالی تھیں۔ لان کے دوسری طرف درختوں کے نیچے باربی کیو اسٹینڈ تھا۔ مگر وہاں بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

گیسٹ ہاؤس کی عمارت ایک بہت بڑے ڈبل سٹوری بنگلے پر مشتمل تھی۔ برآمدہ بہت وسیع و عریض تھا۔ فرش سفید ماربل کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے بنا ہوا تھا۔ ایک کافی ٹیبل اور چند کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ برآمدے کے کناروں کے ساتھ ساتھ پودوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ ہم ملازم کے پیچھے چلتے ہوئے برآمدے والے دروازے میں داخل ہو گئے۔ آگے ایک کشادہ راہداری تھی جس کے ایک طرف استقبالیہ کاؤنٹر بنا ہوا تھا اور سامنے اُوپر جانے کے لئے زینہ تھا جس پر گرے رنگ کا ایکرالک قالین بچھا ہوا تھا۔ کاؤنٹر اور زینے کے بیچ میں بھی اتنی کشادہ جگہ تھی کہ تین چار آدمی پہلو بہ پہلو آسانی سے گزر سکتے تھے۔ اس سے آگے ایک وسیع ہال نظر آ رہا تھا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے اور کئی صوفہ نما سیٹیں ایک دوسرے کے سامنے مناسب فاصلوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ ہر دو سیٹوں کے بیچ شیشے کے ٹاپ والی کافی ٹیبل بھی نظر آ

رہی تھی۔ اس ہال کے دوسری طرف ایک مختصر سی راہداری اور اس سے آگے غالباً کچن تھا۔

ملازم کاؤنٹر کے سامنے رُک گیا۔ اُس نے ہمارا بیگ نیچے رکھ دیا تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر خوبصورت عورت کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ جوانی میں قیامت رہی ہوگی۔ اُس کے چہرے پر ہلکا سا میک اپ تھا اور وہ تازہ دم لگ رہی تھی۔ اُس نے گولڈن بارڈر والی گہرے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی جس کا پلو نیچے لٹکا ہوا تھا۔ اسی رنگت کا بلاؤز اس قدر مختصر تھا کہ میں اُس کی طرف نظریں اُٹھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

اُس نے ہونٹوں پر پیشہ وارانہ مسکراہٹ لاتے ہوئے ہمارا استقبال کیا اور سامنے رکھا ہوا ایک رجسٹر کھول کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس سے پہلے کہ میں ہاتھ بڑھاتا سیتا نے وہ رجسٹر سرکا کر اپنے سامنے کر لیا اور بال پین اُٹھا کر خانہ پُری کرنے لگی۔ میں خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اور پھر یہ جان کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اُس نے رجسٹر میں میرا نام پریم کمار اور اپنا کنیا کماری لکھا تھا۔ اور اس سے آگے والے خانے میں پتی پتنی لکھا تھا۔

ہم پٹھان کوٹ میں اور اس کے بعد سفر میں بھی اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے آئے تھے لیکن یہاں آ کر یکایک ہندوانہ ناموں کی تبدیلی میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔

''کتنے دن قیام کا ارادہ ہے مسز پریم کمار؟'' کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی عورت نے رسٹر اپنی طرف سرکا کر نام پڑھتے ہوئے پوچھا۔

''صرف آج کی رات..... کل صبح کی ٹرین سے ہم بیکانیر روانہ ہو جائیں گے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اُس عورت نے کچھ کہا، سیتا نے پرس میں سے چند نوٹ نکال کر اُس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔

''مہمانوں کو رُوم نمبر اٹھارہ میں پہنچا دو۔'' اُس عورت نے نوٹ سمیٹ کر قریب کھڑے ہوئے ملازم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آیئے دیوی جی!'' ملازم نے بیگ اُٹھا لیا۔ اُس نے بھی سیتا ہی کو مخاطب کیا تھا۔ غالباً وہ سمجھ گیا تھا کہ جو کچھ ہے یہ دیوی جی ہی ہے۔ میں تو بس ایویں ہی ہوں۔

رُوم نمبر اٹھرہ (اٹھارہ) اُوپر تھا۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے میں نے ہال کی طرف دیکھا کہ لوگ مختلف سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور کافی یا چائے پیتے ہوئے مدھم لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ رُوم نمبر اٹھرہ (اٹھارہ) اوپر کی منزل پر کارنر میں اور سامنے کے رُخ پر تھا۔ ڈبل بیڈ کا یہ کمرہ بہت شاندار طریقے سے آراستہ تھا۔ بیڈ کے ایک طرف سفید فارمیکا کی الماری اور اس کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ صوفہ بچھا ہوا تھا جس کے سامنے شیشے کے ٹاپ والی کافی ٹیبل بھی تھی۔ داخلی دروازے کے ساتھ ہی باتھ رُوم کا دروازہ تھا۔ ایک اور دروازہ صوفے سے ذرا آگے تھا۔ ملازم نے ہمارا بیگ بیڈ پر رکھ کر وہ پردہ بھی ہٹا دیا۔ اس

دروازے کے دوسری طرف کشادہ سی گیلری تھی جس کے اطراف میں پائپ کی گرل لگی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ گملے رکھے ہوئے تھے۔ بانس کی کھپچیوں والی دو کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ اس گیلری سے سامنے والے لان کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ گیٹ کے سامنے سڑک پر ٹریفک کی آمد و رفت جاری تھی۔

''کوئی جل پان دیوی جی؟'' ملازم نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی نہیں..... تم جاؤ!'' سیتا نے کہا۔ ''ضرورت ہوگی تو بلا لیں گے۔'' ملازم شاید ٹپ ملنے کی اُمید پر اب تک کھڑا تھا۔ سیتا کا رُوکھا سا جواب سن کر منہ لٹکائے چلا گیا۔ سیتا نے دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا اور بیڈ پر گر گئی۔

''تھک گئی.....!'' وہ میری طرف کروٹ لیتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا کیا حال ہے پریم کمار جی؟'' اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

''یہ یکایک نام بدلنے کی کیا تک تھی؟''

''پٹھان کوٹ سے بھٹنڈہ تک مسلمانوں کی اکثریت ہے.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''مسلم دھرم کے حوالے سے کوئی بات ہوتی تو تم سنبھال لیتے۔ اب یہاں سے آگے زیادہ آبادی ہندوؤں کی ہے۔ یہاں ہندو دھرم کے حوالے سے کوئی بات ہوگی تو میں سنبھال لوں گی۔''

''تم نے اپنا نام کیوں بدلا؟ تم رجسٹر پر سیتا بھی لکھ سکتی تھیں۔ اور پھر یہ پتی پتنی؟''

''یہ رشتہ تمہیں پسند نہیں آیا کیا؟'' سیتا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''سیدھی سی بات ہے رجسٹر میں کچھ تو لکھنا تھا۔ اگر میں درست لکھتی تو بلاوجہ ہمیں شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا۔ اور پھر تم سے بھی الگ خانہ پُری کرائی جاتی۔ میں نے پتی پتنی لکھ کر سارے جھگڑے ہی مُکا دیئے۔''

''اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ابھی تو ہم آئے ہیں..... دم تو لینے دو! پروگرام بھی بنا لیں گے۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ گئی اور بیگ کھول کر کپڑے نکالنے لگی۔ ''میں نہانے جا رہی ہوں۔ بعد میں تم بھی نہا لینا۔ پھر ہم چائے پئیں گے۔'' وہ اپنے کپڑے اور تولیہ لے کر باتھ رُوم میں گھس گئی۔ اُس نے دروازہ آدھا کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں صوفے سے اُٹھ کر گیلری میں آ گیا اور سامنے سڑک پر ٹریفک کو دیکھنے لگا۔ اس وقت ایک ٹیکسی گیٹ کے سامنے رُکی۔ گیسٹ ہاؤس کا وہی ملازم بھی برآمدے سے نکل کر دوڑتا ہوا گیٹ پر پہنچ گیا۔ ٹیکسی کی چھت پر دو سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔ ٹیکسی سے اُترنے والے مسافروں میں تقریباً چالیس سال کی عمر کا ایک آدمی، ایک عورت جس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی اور دو بچے شامل تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا، لڑکی کی عمر بارہ تیرہ سال اور لڑکا سات آٹھ سال کا ہوگا۔ وہ لوگ ٹیکسی سے اُتر کر اندر آ گئے تو میں بھی گیلری سے ہٹ کر کمرے میں آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس وقت میری نظر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کی طرف اُٹھ گئیں اور اس کے ساتھ ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

ڈریسنگ ٹیبل اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ آئینے میں باتھ رُوم کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دروازہ نیم وا تھا اور اندر تک کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اور وہ منظر بڑا ہوشربا تھا..... مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ سیتا شاور کے نیچے کھڑی تھی۔ ہلکی پھوار کے ساتھ برستا ہوا پانی اُس کے بدن پر دھاروں کی صورت میں پھسل رہا تھا..... اور کہیں کہیں کندنی بدن پر پانی کے قطرے آبدار موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

میری کنپٹیاں سلگنے لگیں..... میں ڈریسنگ ٹیبل کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا لیکن میری نظریں بار بار آئینے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔

میں اُٹھ کر دوبارہ بالکونی میں آ گیا اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اسی دوران ایک اور ٹیکسی گیٹ کے سامنے آ کر رُکی۔ ایک نوجوان لڑکی اور ایک مرد ٹیکسی سے اُترے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی بات پر ہنستے ہوئے بجری والی روش پر چلتے ہوئے برآمدے میں غائب ہو گئے۔ اور اسی وقت سیتا کی آواز سن کر میں نے مُڑ کر اندر کی طرف دیکھا۔ سیتا باتھ رُوم کے دروازے سے سر باہر کو نکالے کھڑی تھی۔

''یہ دروازہ بند کر دو! اور کھڑکی کا پردہ بھی برابر کر دو۔'' اُس نے کہا۔

میں نے اندر آ کر دروازہ بھیڑ دیا اور کھڑکی کا پردہ بھی کھینچ کر برابر کر دیا۔ سیتا جسم پر تولیہ لپیٹے باتھ رُوم سے باہر آ گئی۔ تولیہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ اُس کے جسم کو پوری طرح ڈھک سکتا۔ اُس کے بدن پر پانی کے قطرے اب بھی موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

میں نے جھک کر بیگ میں سے کپڑے نکالے اور اُس کی طرف دیکھے بغیر باتھ رُوم میں گھس گیا۔ میں تقریباً آدھا گھنٹہ شاور کے نیچے کھڑا رہا۔ ٹھنڈے پانی سے دماغ کی تپش کسی حد تک کم ہو گئی۔ باتھ رُوم کے دروازے پر دھب دھب کی آواز سن کر میں چونک گیا اور آڑ میں ہو کر تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو سیتا سامنے کھڑی تھی۔

''میرے کپڑے اندر کھونٹی پر ٹنگے ہوئے ہیں..... وہ دے دو مجھے۔'' اُس نے کہا۔ میں نے کپڑے اُتار کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیئے اور دروازہ بند کر دیا۔ باتھ رُوم میں بھی ایک صاف ستھرا تولیہ ٹنگا ہوا تھا۔ میں نے اپنا جسم خشک کیا اور کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔ سیتا لباس پہن چکی تھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال سنوار رہی تھی۔ میں اُس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ سے کنگھا لیا اور اپنے بال سنوارنے کے بعد کنگھا اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ آئینے میں مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ میرے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے اُسے نہیں بتایا کہ اس آئینے میں کیسا ہوشربا منظر دیکھ چکا ہوں۔

''ویٹر کو بلا کر چائے کے لئے کہہ دو! اب طلب ہو رہی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ میں نے ویٹر کو بلانے کے لئے کال بیل کا بٹن دبا دیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ چند منٹ بعد ویٹر دروازے میں نمودار ہوا۔ میں نے اُسے چائے لانے کے لئے کہہ دیا اور ہم دونوں اُٹھ کر

بالکونی میں بیٹھ گئے۔

باہر لان میں اب کچھ رونق نظر آ رہی تھی۔ کئی میزوں پر لوگ بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ سب جوڑے ہی تھے۔ کوئی مرد اکیلا یا کوئی عورت اکیلی نہیں تھی۔ لان کے دوسری طرف بار بی کیو سٹینڈ کے چولہوں میں بھی کوئلے دہکنے لگے تھے اور تین آدمی کام میں مصروف تھے۔ تینوں نے میرون رنگ کے ایپرن باندھ رکھے تھے۔ دو کے سروں پر بٹلرز والی اُونچی سفید ٹوپیاں تھیں۔

کچھ دیر بعد ویٹر چائے لے آیا۔ اُس کیجانے کے بعد میں نے دوسرا دروازہ بند کر دیا۔ اس دوران سیتا نے کمرے سے چھوٹی ٹیبل اُٹھا کر گیلری میں رکھ لی اور چائے پیالیوں میں اُنڈیلنے لگی۔

شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ موسم بھی خوشگوار ہوتا جا رہا تھا۔ صحرائی علاقوں کی یہی ایک انفرادیت تو ہوتی ہے۔ دن کے وقت جھلسا دینے والی گرمی اور شام ڈھلتے ہی ٹھنڈ کا احساس ہونے لگتا ہے۔

ہم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سامنے دیکھتے رہے۔ رونق بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ باہر سے آنے والے کچھ لوگ لان کا رُخ کرنے کی بجائے اندر ہال کی طرف جا رہے تھے۔

سورج غروب ہوتے ہی لان میں برقی قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ فضا چکن تکوں اور کوئلوں پر تیار ہونے والے دیگر فاسٹ فوڈز کی اشتہا آمیز خوشبو سے مہک اُٹھی۔

لان میں اتنے گاہکوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ یہاں قیام پذیر لوگ تو کم تھے زیادہ تعداد باہر سے آنے والوں کی تھی۔ شاید یہ گیسٹ ہاؤس کسی خاص وجہ سے شہر میں شہرت رکھتا تھا۔

نو بجے کے قریب تو کسی میز پر کوئی خالی سیٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم دونوں بالکونی میں جا بیٹھے اور اس رونق کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتے رہے۔ اور پھر دس بجے کے قریب ہم بھی کمرے سے نکل کر نیچے آ گئے۔ نیچے والا ہال بھی گاہکوں سے بھرا ہوا تھا اور ایک دلچسپ انکشاف یہ ہوا کہ گیسٹ ہاؤس کے عقبی لان میں گھاس پھوس کے گول جھونپڑوں کی طرح کیبن بنے ہوئے تھے جو صرف کپلز کے لئے مخصوص تھے۔ میں نے بہت سے لوگوں کو اس طرف بھی آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ انکشاف تو بعد میں ہوا کہ وہ جھونپڑا نما کیبن گاہکوں کی عیاشی کے لئے بنائے گئے تھے۔ یوں تو بھارت میں شراب عام تھی۔ ہر جگہ پی جا سکتی تھی مگر بعض ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز نے کچھ اصول بنا رکھے تھے۔ مثلاً اس گیسٹ ہاؤس کے ہال اور لان میں شراب نوشی ممنوع تھی۔ مگر پیچھے کی طرف جھونپڑا نما کیبنوں میں شراب سرو کی جا رہی تھی۔

ہال میں ایک دو سیٹیں اگرچہ خالی تھیں مگر سیتا کا رُخ باہر کی طرف تھا۔ میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور برآمدے سے نکل کر ہم لان کے کنارے پر رُک گئے اور تجسّس بھری نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ لان میں تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ لیکن تقریباً اُس وقت

کونے کی میز سے ایک عورت اور دو آدمی اُٹھتے ہوئے نظر آئے۔ سیتا مجھے اشارہ کرتی ہوئی اُس طرف بڑھ گئی اور اس سے پہلے کہ کوئی اور اس طرف آتا ہم نے اُس میز پر قبضہ کرلیا۔

تھوڑی دیر بعد ویٹر مینو کارڈ لے کر آ گیا اور تب مجھے پتہ چلا کہ ہرن کے کباب اس گیسٹ ہاؤس کی اسپیشل ڈش تھی۔ ہرن راجستھان میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ لیکن بیشتر علاقوں میں اس کے شکار پر پابندی ہے اس کے باوجود غیر قانونی طور پر اس کا شکار ہوتا ہے۔ ہنومان گڑھ میں دو تین ریسٹورنٹ ایسے تھے جہاں ہرن کا گوشت پکتا تھا۔ لیکن ان ریستورانوں پر بھی آئے دن چھاپے پڑتے رہتے تھے اور بھاری جرمانے کئے جاتے تھے۔

اس گیسٹ ہاؤس کی مالکہ الکا ہوتری بیوہ عورت تھی۔ اُس کا شوہر نٹور سنگھ جب زندہ تھا تو اُس نے خوب ہاتھ پیر پھیلائے تھے۔ الکا ہوتری بھی اُن دنوں جوان تھی۔ وہ اپنی جوانی میں یقیناً قیامت رہی ہوگی۔ نٹور سنگھ نے بیوی کے حسن و شباب سے خوب فائدہ اُٹھایا تھا۔ یہ شاندار گیسٹ ہاؤس اور اس کے اطراف میں لمبی چوڑی زمین جوانی میں بڑے لوگوں سے تعلقات ہی کی مرہون منت تھی۔

نٹور سنگھ کو مرے ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے۔ الکا ہوتری نے کبھی ہندو عورتوں کی طرح سفید ساڑھی نہیں پہنی تھی۔ وہ بیوگی کا لباس پہن کر زندگی کی خوشیوں اور نعمتوں سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اُس نے اپنے اور مرحوم شوہر کے دوستوں سے تعلقات جاری رکھے۔ آج اگرچہ اُس کی عمر ڈھل رہی تھی لیکن اب بھی اُس میں بڑا دم خم تھا۔ اور یہ اُس کے تعلقات ہی کا نتیجہ تھا کہ اُس کے گیسٹ ہاؤس میں دھڑلے سے ہرن کے گوشت سے لذیذ کباب تیار ہوتے تھے اور اُسے کبھی کسی پوچھ تاچھ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ہرن کے گوشت ہی کی وجہ سے یہاں گاہکوں کا رش رہتا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ یہاں ہرن ہی نہیں پچھلے جھونپڑا نما کیبنوں میں نسوانی گوشت کی بھی تجارت ہوتی تھی۔ یہ گیسٹ ہاؤس عیاشی کا اڈہ تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ بہت سے مرد سیتا کو گھور رہے تھے۔ بعض آدمیوں کا انداز تو ایسا تھا جیسے وہ اُسے نظروں ہی نظروں میں کھا جائیں گے۔

اسی دوران ویٹر نے قریب آ کر سیتا کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ چونک سی گئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ویٹر چلا گیا۔ سیتا کی آنکھوں میں اور چہرے پر تشویش کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ کھانا ختم کر کے وہ اُٹھ گئی۔

''تم بیٹھو! میں ابھی آتی ہوں۔''

''کوئی خاص بات؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا لیکن وہ جواب دیئے بغیر اُٹھ کر ایک طرف چلی گئی۔

میں اکیلا بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ویٹر برتن اُٹھا کر لے گیا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ایک عورت کسی میز سے اُٹھ کر میری طرف آ گئی اور بے تکلفی سے سیتا والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ہیلو!'' اُس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''وہ تمہیں چھوڑ کر چلی گئی..... یہ کال گرلز ہوتی ہی ایسی ہیں۔ بیچ منجدھار میں چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ میرے ساتھ چلو! خوش کر دُوں گی۔ اور تمہاری جیب پر زیادہ بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔''

''تم یہاں سے اپنی مرضی سے اُٹھ جاؤ گی یا مجھے کچھ کرنا پڑے گا؟'' میں نے کھا جانے والی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

وہ گڑبڑا سی گئی۔ اُسے شاید مجھ سے ایسے رویئے کی توقع نہیں تھی۔ لیکن بہرحال اُس نے وہاں سے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

سیتا کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر اب بھی تشویش نمایاں تھی۔

''کہاں غائب ہوگئی تھیں؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ایک پرانا جاننے والا مل گیا تھا..... اُس طرف کھڑی اُس سے باتیں کر رہی تھی۔'' اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا۔

''یہاں تمہارا جاننے والا؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں جے پور کی رہنے والی ہوں جو یہاں سے صرف چار سو کلومیٹر ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ راجستھان ہے اور اس خطے کا ہر شہر ایک تاریخی مقام رکھتا ہے۔ کالج کے زمانے میں، میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھومتی رہتی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کئی سال پہلے جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں آئی تھی تو مان سنگھ کے گھر پر ہی قیام کیا تھا۔ اب اُس نے مجھے دیکھ لیا اور ویٹر کو پیغام بھیج کر مجھے بلا لیا۔''

''وہ یہاں کیوں نہیں آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہاری وجہ سے۔'' اُس نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ سمجھا تھا کہ تم میرے پتی ہو۔ ہوسکتا ہے ناراض ہو جاؤ۔ اس لئے وہ یہاں نہیں آیا۔''

میں نے مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہوسکتا ہے وہی بات ہو جو وہ کہہ رہی تھی۔ اس کے بعد ہم زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھے۔ سیتا نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں آتے ہی سیتا بستر پر ڈھیر ہوگئی۔ میں بالکونی میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور لان کی رونق کو دیکھتا رہا۔

بارہ بجے کے قریب میں اندر آ گیا۔ سیتا لیٹی ہوئی سامنے دیوار کو گھور رہی تھی۔ میں خاموش بیٹھا اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ باہر جانے سے پہلے تو وہ بہت چہک رہی تھی لیکن اُس اجنبی سے ملاقات کے بعد وہ ایک دم خاموش سی ہوگئی تھی۔ میں نے سیتا سے پوچھنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ ٹال گئی اور موضوع بدل کر بات کرنے لگی۔

ایک بج رہا تھا۔ باہر سے آنے والی آوازیں بھی ختم ہوگئی تھیں۔ مجھے نیند آنے لگی۔ میں نے

بالکونی والا دروازہ بند کر دیا اور تیز روشنی والا بلب بجھا کر نائٹ بلب جلا دیا اور صوفے پر لیٹ گیا۔ سیتا بھی باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگی اور پھر میری بھی آنکھ لگ گئی۔

کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی..... میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سیتا بیڈ پر نہیں تھی۔ میں نے باتھ رُوم کی طرف دیکھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا مگر اندر کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ گیلری والا دروازہ بھی بند تھا۔ میں نے ہولے سے سیتا کا نام لے کر پکارا اور اُٹھ کر باتھ رُوم میں بھی جھانک لیا۔ میں نے باہر والے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اُسے کھولنا چاہا تو دروازہ نہیں کھلا۔ باہر سے کنڈا لگا ہوا تھا۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی..... ذہن میں طرح طرح کے وسوسے سر اُبھارنے لگے۔ میں صوفے پر آ کر بیٹھ گیا اور سیتا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کہاں چلی گئی تھی؟ میرے ذہن میں بار بار اُس پراسرار اجنبی کا خیال اُبھر رہا تھا۔ اُس سے ملاقات کے بعد ہی وہ کچھ پریشان سی دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ پراسرار ملاقاتی کون تھا؟ میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ کیا سیتا مجھے دھوکے میں رکھ کر اُسی سے ملنے گئی تھی؟

شہر کی کسی عمارت پر لگے ہوئے گھڑیال نے تین بجے کا اعلان کیا۔ میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ ذہن میں ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ سیتا مجھے کسی چکر میں پھنسانے کی کوشش تو نہیں کر رہی؟ لیکن میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر مجھے پھنسانا ہوتا تو وہ بہت پہلے ایسا کوئی قدم اُٹھا چکی ہوتی۔

ہلکا سا کھٹکا سن کر میں ایک بار پھر چونک گیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ باہر سے کوئی بہت احتیاط سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جلدی سے صوفے پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

دروازہ کھلنے اور پھر آہستگی سے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک آنکھ میں بہت معمولی سی جھری پیدا کر کے دیکھا وہ سیتا تھی جو دروازہ بند کر کے دبے قدموں آگے بڑھ رہی تھی۔ اُس کی نظریں میری طرف لگی ہوئی تھیں۔ قریب پہنچی تو میں نے وہ آنکھ بھی پوری طرح بند کر لی۔ سیتا ایک لمحے کو میرے قریب رُکی اور پھر بیڈ پر لیٹ گئی۔ میں نے ایک بار پھر آنکھ میں جھری پیدا کر کے دیکھا۔ وہ دوسری طرف کروٹ لئے لیٹی تھی۔

سیتا تو شاید تھوڑی دیر بعد سو گئی تھی لیکن مجھے دیر تک نیند نہیں آ سکی۔ میرا ذہن بری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ میں یہی سوچتا رہا کہ سیتا رات کے آخری پہر چوری چھپے کہاں گئی تھی؟ اور پھر یہی سوچتے ہوئے میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ سیتا اُس وقت بھی کمرے میں نہیں تھی۔ وہ باتھ رُوم میں بھی نہیں تھی۔ میں نے اُٹھ کر باہر والے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو اس مرتبہ وہ آسانی سے کھل گیا۔ میں نے باہر جھانکا تو راہداری کے اختتام پر زینے کے قریب کچھ لوگ کھڑے

تھے۔ اُن میں سیتا بھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے اس طرف آ گئی اور اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

''اس وقت آٹھ بج رہے ہیں اور رات کو تم نے کہا تھا کہ ہمیں دس بجے والی ٹرین سے جانا ہے۔'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب شاید ہم دس بجے والی ٹرین سے نہ جا سکیں۔ دو بجے والی ٹرین پکڑنی ہو گی۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''کیوں.....؟ پروگرام میں یہ تبدیلی کیوں؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''گیسٹ ہاؤس میں ایک قتل ہو گیا ہے۔'' سیتا نے بتایا۔ ''نیچے پولیس آئی ہوئی ہے۔ اُنہوں نے گیسٹ ہاؤس میں قیام پذیر تمام مہمانوں کو روک لیا ہے۔ کوئی اجازت کے بغیر باہر نہیں جا سکتا۔''

''اوہ.....!'' میں اُچھل پڑا۔ ''کون قتل ہوا ہے..... کیسے؟ میرا مطلب ہے کچھ معلوم ہوا؟''

''گیسٹ ہاؤس کے پچھلی طرف ایک جھونپڑا نما کیبن میں ایک آدمی کی لاش ملی ہے۔ اُسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔'' سیتا نے بتایا۔ ''لاش کا انکشاف صبح ساڑھے چھ بجے اُس وقت ہوا جب گیسٹ ہاؤس کا صفائی کرنے والا ملازم کیبنوں کی صفائی کر رہا تھا۔ اُس کیبن میں اُس شخص کو پڑے دیکھ کر پہلے تو وہ یہی سمجھا کہ شاید کوئی گاہک نشے میں دھت پڑا ہوا ہے۔ لیکن جب اُسے ہلایا جلایا گیا تو پتہ چلا کہ وہ ختم ہو چکا ہے۔ فوری طور پر پولیس کو اطلاع دی گئی اور پولیس نے یہ انکشاف کیا کہ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ اُس کے گلے پر ایسے نشان صاف نظر آ رہے تھے جیسے رسّی لپیٹی گئی ہو۔ پولیس نے پوچھ گچھ کے لئے تمام مہمانوں کو روک لیا ہے۔ اس لئے ہم دس بجے والی ٹرین سے نہیں جا سکتے۔''

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور میں گہری نظروں سے سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ سیتا رات کے پچھلے پہر چوری چھپے کمرے سے باہر گئی تھی۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے سوال اُبھر رہے تھے۔ کیا سیتا اس پراسرار اجنبی سے ملنے گئی تھی؟ کیا وہ لاش اُس اجنبی کی تھی اور کیا سیتا نے اُسے قتل کیا تھا؟

''میری طرف اس طرح گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟'' سیتا مجھے اس طرح گھورتے پا کر گڑبڑا سی گئی۔

''اوہ..... کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لگتا ہے یہاں ہمارے لئے کچھ اُلجھن پیدا ہو گئی ہے۔''

''کچھ نہیں ہو گا۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''پولیس بھی جانتی ہے کہ قاتل گیسٹ ہاؤس کے مہمانوں میں سے نہیں ہو سکتا۔ وہ محض خانہ پری کے لئے معمول کے مطابق کچھ سوالات کریں

گے اور بس.....''

اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ ناشتہ ہم نے کمرے ہی میں منگوالیا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم بالکونی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ساڑھے نو بجے کے قریب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ سیتا نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔

ایک سب انسپکٹر تھا اور اُس کے ساتھ گیسٹ ہاؤس کی مالکہ الکا ہوتری جو خاصی پریشان لگ رہی تھی۔

سب انسپکٹر پندرہ بیس منٹ تک ہم سے مختلف سوالات پوچھتا رہا جن کے جواب زیادہ تر سیتا ہی نے دیئے تھے۔ اُس نے مجھے بہت کم بولنے کا موقع دیا تھا۔

''ٹھیک ہے مسز پریم کمار!'' سب انسپکٹر نے سیتا ہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگوں کو جو زحمت ہوئی اس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں۔ آپ لوگ چاہیں تو گیسٹ ہاؤس سے جا سکتے ہیں۔''

''ہمیں تو دس بجے کی ٹرین سے بیکانیر جانا تھا۔ مگر اس ٹرین کا وقت تو نکل گیا۔ اب دو بجے والی گاڑی ہی پکڑیں گے۔'' سیتا نے کہا۔

سب انسپکٹر نے ایک بار پھر معذرت کی اور الکا ہوتری کو اشارہ کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

دن کا باقی حصہ ہم نے کمرے ہی میں گزارا۔ گیارہ بجے کے قریب پولیس چلی گئی تھی۔ ایک بجے ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا اور سیتا نے کاؤنٹر پر جا کر حساب چکایا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم گیسٹ ہاؤس سے رخصت ہو گئے۔

بہت سست رفتار ٹرین تھی۔ شام سے ذرا پہلے ہم بیکانیر پہنچ گئے۔ یہ ہنومان گڑھ سے بڑا اور زیادہ قدیم شہر تھا۔ یہاں بھی ہم نے درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر رجسٹر کی خانہ پری سیتا ہی نے کی۔ یہاں بھی اُس نے میرا نام پریم کمار اور اپنے آپ کو مسز پریم کمار لکھا تھا۔

ریگستان میں ٹرین پر چند گھنٹوں کے اس سفر نے مجھے زیادہ تھکا دیا تھا۔ سیتا کے چہرے پر بھی تھکن کے آثار نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ ہنومان گڑھ میں تو ہم رات کو کمرے سے نکل کر لان میں آ گئے تھے لیکن یہاں ہم کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ رات کا کھانا بھی کمرے ہی میں منگوا کر کھایا تھا۔

صبح سات بجے ناشتہ کر کے ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ ایک بار پھر ٹرین کا سفر درپیش ہو گا۔ لیکن سیتا نے بتایا کہ بیکانیر سے جیسلمیر کی طرف ریلوے لائن نہیں تھی۔ البتہ پوکھران سے ٹرین مل سکتی تھی۔ بیکانیر سے پوکھران تک کا سفر بس میں کرنا پڑے گا۔

بس کا یہ سفر بے حد اذیت ناک ثابت ہوا تھا۔ ایک تو بس کھٹارہ ٹائپ کی تھی اس پر مسافر بھیڑ بکریوں کی طرح بھر لئے گئے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ چاروں طرف تپتا ہوا ریگستان۔

گرمی کی شدت سے دم گھٹا جا رہا تھا۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنے آپ کو سبزے ہی میں گھرے ہوئے پایا تھا۔ کشمیر کی وادی تو واقعی جنت کا ٹکڑا تھی۔ اور مجھے لگتا تھا جیسے میں اُس جنت سے نکل کر جہنم میں آ گیا ہوں۔ اوپر آگ برساتا ہوا آسمان اور نیچے چاروں طرف تپتا ہوا صحرا۔ راستے میں کہیں کہیں پانی دستیاب تھا۔ وہاں آبادی بھی تھی اور تھوڑا بہت سبزہ بھی۔ ایسی جگہوں پر ناریل کے درخت دُور ہی سے نظر آ جاتے تھے۔

بس گنج نیر، کولیات، پالوری اور رام ڈیوڑھا سے ہوتی ہوئی بالآخر دوپہر کے قریب پوکھران پہنچ گئی۔ بڑی شدت کی گرمی تھی۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی اور دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ آگے تقریباً ایک سو پندرہ کلومیٹر کا سفر باقی تھا۔ یہاں سے شام کے وقت ٹرین بھی مل سکتی تھی لیکن شاید سیتا میں بھی سفر جاری رکھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اس لئے ہم ایک آٹو رکشہ میں بیٹھ کر ایک ہوٹل میں پہنچ گئے۔ یہاں ہمیں ایئر کنڈیشنڈ کمرہ مل گیا۔

ہم دن بھر کمرے میں بند رہے۔ باہر گرمی اس شدت کی تھی کہ کمرے سے نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ رات کا کھانا بھی سیتا نے کمرے ہی میں منگوالیا تھا۔ وہ باہر نکلنے سے گریز کر رہی تھی۔ اُس کے بارے میں میرے ذہن میں جنم لینے والے شبہات بڑھتے جا رہے تھے۔ ہنومان گڑھ میں اُس پراسرار اجنبی سے ملاقات اور اُسی رات اُس کے قتل کے بعد سیتا کو چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ مسلسل کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ پوچھنا چاہا تھا کہ وہ گیسٹ ہاؤس میں رات کے آخری پہر چوری چھپے کمرے سے نکل کر کہاں گئی تھی لیکن کوشش کے باوجود میں دل کی بات زبان پر نہیں لا سکا تھا۔

صبح ہم دیر تک سوتے رہے۔ ناشتے کے بعد سیتا مجھے کمرے ہی میں چھوڑ کر چلی گئی۔ اُس کی واپسی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔

''بس اسٹینڈ تک گئی تھی۔'' اُس نے خود ہی بتایا۔ ''آگے تقریباً سوا سو کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ریل میں ایئر کنڈیشنڈ پارلر میں یہاں سے سیٹ ملنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ چار بجے والی ایئر کنڈیشنڈ میں سیٹیں مل گئی ہیں۔ ہم سات بجے تک جیسلمیر پہنچ جائیں گے۔ اس وقت وہاں کا موسم بھی کسی قدر خوشگوار ہو گا۔''

''ہم موسم کی شدت سے بچنے کے لئے زندگی بھر تو ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں نہیں دبکے رہیں گے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''جیسلمیر۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر تم نے تو بتایا تھا کہ تم جے پور کی رہنے والی ہو۔'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم جیسلمیر کہاں ہے اور جے پور کہاں ہے۔ لیکن.....''

''جے پور، جیسلمیر سے تقریباً ساڑھے چھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔'' اُس نے میری

بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پہلے جیسلمیر۔ وہاں پہنچ کر میں بتا دُوں گی کہ تمہیں یہاں کیوں لائی ہوں۔''

''تم اب تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی ہو۔ میں کل رات سے پریشان ہوں۔ ذہن بری طرح اُلجھا ہوا ہے۔'' میں نے اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔

''کیوں..... کیا بات ہے؟'' اُس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''رات کے پچھلے پہر تم چوری چھپے کمرے سے نکل کر کہاں گئی تھیں؟'' یہ سوال غیر ارادی طور پر میری زبان سے نکل گیا۔

وہ اس طرح اُچھل پڑی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اُس کا چہرہ بھی ایک دم دُھواں ہو گیا لیکن اُس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

''تمہیں مجھ پر کوئی شبہ ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''رات کے کھانے کے بعد تم سے ملاقات کرنے والا وہ اجنبی کون تھا اور اُس آدمی کی موت سے تمہارا کیا تعلق ہے جس کی لاش گیسٹ ہاؤس کے پیچھے ہٹ میں پائی گئی تھی؟'' میں نے کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''اوہ.....'' سیتا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ''تو تم اس وقت جاگ رہے تھے جب میں کمرے سے باہر گئی تھی اور تمہیں شبہ ہے کہ اُس آدمی کو میں نے قتل کیا ہے؟''

''تم اس کی وضاحت کر دو تو شاید میری اُلجھن رفع ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے..... میں اس کی وضاحت کر دُوں گی لیکن ابھی نہیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''لیکن بہتر ہو گا کہ میرے بارے میں اپنے ذہن سے شبہات نکال دو۔ اور میں تمہیں یہاں کیوں لائی ہوں اس کے بارے میں بھی بتا دُوں گی۔ لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تم سوچ رہے ہو کہ میں تمہیں تمہارے محاذ سے بہت دُور لے آئی ہوں۔ مگر ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''تم یہاں رہ کر اپنی قوم کی وہ خدمت کر سکو گے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس وقت تم اس کے بارے میں کچھ مت پوچھنا۔ وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتا دُوں گی۔''

اس کے بعد میں نے واقعی کوئی سوال نہیں کی۔ سیتا نے اُس وقت وہی ساڑھی پہن رکھی تھی جو گزشتہ شام کو ہنومان گڑھ آنے کے بعد پہنی تھی۔ اُس نے پہلے ساڑھی کا پلو گرایا پھر خالی کھول کر ساڑھی اپنے جسم سے الگ کر کے ایک کرسی پر ڈال دی اور بیڈ پر پشت کے بل لیٹ گئی۔ اُس کے جسم پر مختصر سا بلاؤز اور پیٹی کوٹ تھا۔ اُس کا سینہ کھڑی کمان کا منظر پیش کر رہا تھا۔

''آؤ..... تم بھی تھوڑی دیر آرام کر لو!'' سیتا نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور سرک کر ایک طرف ہو گئی۔ لیکن میں صوفے پر بیٹھا رہا۔ سیتا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو

گئی۔ وہ کچھ دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی اور پھر سو گئی۔ اور میں کرسی پر بیٹھا اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔ نجانے کیا بات تھی کہ میرا شبہ قوی تر ہوتا جا رہا تھا کہ ہنومان گڑھ والے گیسٹ ہاؤس کے پیچھے ہٹ میں ہونے والے قتل میں سیتا ہی کا ہاتھ تھا اور مقتول اجنبی تھا جس نے ویٹر کے ذریعہ پیغام بھیج کر سیتا کو الگ بلوایا تھا۔ میں جیسے جیسے سوچتا گیا میرا ذہن اُلجھتا گیا۔ اور پھر میں بھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔

○

وہ شاندار ایئر کنڈیشنڈ بس محکمہ سیاحت کی تھی جو ٹھیک چار بجے روانہ ہو گئی۔ سیٹیں دو دو مسافروں کے لئے اور کافی کشادہ تھیں۔ مجھے اور سیتا کو جو سیٹ ملی وہ آگے سے دوسرے نمبر پر تھی۔ اس طرح ہم نہ صرف شفاف ونڈ سکرین سے سامنے بلکہ دائیں بائیں کھڑکیوں کے براؤن شیشوں سے بھی باہر دیکھ سکتے تھے۔

بس میں سفر کرنے والے سب ہی لوگ سیاح تھے۔ اُن میں ہندوستانی بھی تھے اور دس بارہ یورپین بھی۔ جن میں آدھی عورتیں اور آدھے مرد تھے۔ بس میں محکمہ سیاحت کی ایک گائیڈ بھی تھی۔ اُس جوان اور خوبصورت لڑکی نے گلابی ساڑھی پہن رکھی تھی جس پر محکمہ سیاحت کا بیج لگا ہوا تھا۔ بس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ گائیڈ مسافروں کو راستے میں آنے والے مختلف مقامات کے بارے میں بتاتی جا رہی تھی۔

ساڑھے پانچ بجے کے قریب بس چندن نامی ایک قصبے میں رُک گئی۔ بس جس جگہ رُکی تھی وہاں سامنے ہی ایک بہت بڑا جین مندر نظر آ رہا تھا اور گائیڈ بس میں بیٹھے بیٹھے ہی مسافروں کو اُس مندر کے بارے میں بتا رہی تھی۔ شاید مندر کی سیر کا پروگرام اس ٹور میں شامل نہیں تھا۔ اس دوران مسافروں کی ٹھنڈے مشروبات سے تواضع بھی کی جا رہی تھی۔

پندرہ منٹ رُکنے کے بعد بس آگے روانہ ہو گئی۔ اب جیسلمیر صرف پینتالیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ لیکن بس کی رفتار مقررہ حد سے زیادہ نہیں بڑھائی گئی۔ راستے میں دو اور چھوٹی بستیوں میں بھی بس کو چند منٹ کے لئے روکا گیا تھا۔ اس طرح تقریباً سوا گھنٹے بعد بس جیسلمیر کے نواح میں پہنچ گئی۔

اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ میں سامنے پہاڑی پر ایک بہت بڑے حصے کو سونے کی طرح چمکتے دیکھ کر چونک گیا۔ لگتا تھا جیسے پہاڑی کا وہ حصہ پتھروں کا نہیں سونے کا ہو۔ میں سیتا سے اُس کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا کہ خوبصورت گائیڈ کی سریلی آواز سنائی دی۔ وہ مسافروں کو رخصت ہوتی روپہلی دُھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے اس پہاڑ کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''ہم تاریخی شہر جیسلمیر کے نواح میں پہنچ رہے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے دُھوپ میں سونے کی طرح دمکتی ہوئی کوئی چٹان نہیں بلکہ جیسلمیر کا پیلے پتھروں سے بنا ہوا قلعہ ہے۔ دو سو پچاس

فٹ اُونچی تکونی پہاڑی پر اس قلعے کی بنیاد راجہ راول جیسل نے رکھی تھی۔ اس کی تعمیر میں پیلا پتھر استعمال کیا گیا اور یہ سات سال کی مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔''

وہ خوبصورت گائیڈز کے بغیر رٹے رٹائے الفاظ بڑی روانی سے بولے جا رہی تھی۔

''اس قلعے کے ننانوے برج ہیں اور جنگی اعتبار سے اسے اُس زمانے میں بہت مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی دوہری فصیلیں تقریباً تیس فٹ بلند ہیں۔ قلعہ کے چار دروازے ہیں۔ راجہ جیسل اس قلعہ کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد اگرچہ صرف چار سال ہی زندہ رہا لیکن بعد میں آنے والے راجے اس قلعہ کی شان و شوکت میں اضافہ کرتے رہے۔ قلعے کے اندر آٹھ جین مندر ہیں جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ان مندروں کی تعمیر تقریباً سو سال میں مکمل ہوئی اور ان کی تعمیر میں بھی پیلا پتھر استعمال کیا گیا۔ ان کے اندر پتھروں سے تراشی ہوئی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اس قلعے کے اندر ہندوؤں کے بھی کئی مندر ہیں جن میں لکشمی ناتھ مندر سب سے بڑا ہے۔ مہاراجہ راول جیسل کے بعد آنے والے راجے اس قلعے میں اپنے خوبصورت محلات بھی تعمیر کرواتے رہے۔ یوں تو ہر عمارت قابل دید ہے مگر موتی محل، رنگ محل اور گنج ویلا ز سب سے زیادہ خوبصورت ہیں.....''

گائیڈ اس قلعے کے بارے میں بتاتی رہی۔ بس اب شہری حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ میں سڑک کے دونوں طرف خوبصورت اور تاریخی عمارتوں کو دیکھنے لگا۔ اور اب سیتا میری طرف جھکی اس شہر کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''اس شہر کی بنیاد تقریباً ساڑھے آٹھ سو سال پہلے راجہ راول جیسل نے رکھی تھی اور یہ شہر اُس کے نام سے منسوب ہو گیا۔ راجہ جیسل کے خاندان نے آٹھ سو سال تک یہاں حکومت کی۔ 1947ء میں ہندوستان کے بٹوارے کے بعد ہندوستان کی تمام ریاستوں کے ساتھ ریاست جیسلمیر کی سرکاری حیثیت بھی ختم کر دی گئی..... گنجان آبادی والے اس شہر کو گولڈن سٹی بھی کہتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شہر کے چاروں طرف سنہری ریت کے ٹیلے ہیں جو تیز ہوا کی وجہ سے اپنی جگہ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔

جیسلمیر کی اپنی تاریخی اہمیت تھی۔ یہ ایسی گزرگاہ پر واقع تھی جہاں سے قدیم وسط ہند، گجرات، مہاراشٹر اور سندھ کی طرف جانے والے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ ان تجارتی قافلوں سے دیگر محصولات اور چنگی کی مد میں یہاں کے حکمرانوں کو بڑی آمدنی ہوتی تھی جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ بھی خوشحال تھے۔ نہ صرف ہر راجہ نے قلعہ بند شہر کے اندر خوبصورت محلات تعمیر کروائے بلکہ بڑے بڑے تاجروں نے بھی سنہری پتھروں سے خوبصورت حویلیاں تعمیر کروائیں۔ مگر بمبئی کی بندرگاہ تعمیر ہونے کے بعد تجارتی قافلوں نے اپنا رُخ بدل لیا جس سے نہ صرف ریاست کی آمدنی بلکہ اس کی اہمیت بھی کم ہو گئی۔ یہاں تمہیں ہر قدیم عمارت میں سنگ تراشی کا بڑا نفیس اور خوبصورت کام نظر آئے گا۔ لیکن بمبئی کی بندرگاہ تعمیر ہونے کے بعد وہاں

روزگار کا سلسلہ پیدا ہوا تو سنگتراشی کے ماہر کاریگر سلاوٹ یہاں سے ہجرت کر کے سندھ کا رُخ کرنے لگے۔ لیکن آج بھی یہاں سنگتراشی کے کام کو شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔''

''ایک کام کرو!'' میں اُس کے خاموش ہونے پر جلدی سے بول پڑا۔ ''اس گائیڈ کو میرے پاس بھیج دو اور تم اُس کی جگہ کھڑی ہو کر بس کے مسافروں کو اس تاریخی شہر کے بارے میں بتاتی رہو۔ تمہیں تو محکمہ سیاحت میں گائیڈ ہونا چاہئے تھا۔''

''میں ان گائیڈز سے زیادہ جانتی ہوں۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''راجستھان قدیم تاریخی قلعوں، محلات اور حویلیوں کی سرزمین ہے۔ میں تمہیں اس خطے کی تاریخ کے علاوہ ایک ایک عمارت کے بارے میں بتا سکتی ہوں کہ وہ کب اور کس نے بنوائی تھیں۔ مثلاً جیسلمیر میں بڑا باغ، قلعہ، گدیسر ٹینک، جین مندر، پتوؤں کی حویلی، رام ڈیوڑھا، ویاس چھتریاں، سالم سنگلا کی حویلی، مندر محل، جواہر نواس جن پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کی روپہلی کرنیں پڑتی ہیں تو یہ سونے کی طرح چمک اُٹھتے ہیں اور.....''

''بس بس.....'' میں نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''کچھ بعد میں بتانے کے لئے بھی رہنے دو۔''

سیتا مسکرا کر رہ گئی۔

بس شہر کے مختلف بارونق علاقوں سے گزرتی ہوئی پیلس ہوٹل کے سامنے رُک گئی۔ اُس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور شام کا اندھیرا پر پھیلانے لگا تھا۔ مگر شہر کی بتیاں بھی جگمگا اُٹھی تھیں جن کی روشنیاں پھیلتے ہوئے اندھیرے سے دست و گریباں ہو رہی تھیں۔

بس سے اُترتے ہی سیتا نے ایک آٹو رکشہ روک لیا اور اندر بیٹھنے کے بعد ڈرائیور کو علاقے کا جو نام بتایا وہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔

رکشہ شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑتا ہوا مشرق میں نواحی علاقے کی طرف نکل آیا۔ یہاں آبادی چھدری تھی۔ حویلی نما عمارتیں ایک دوسرے سے فاصلے پر تھیں۔ سیتا نے ایک عمارت کے سامنے رکشہ رُکوا لیا اور نیچے اُتر کر ڈرائیور کو کرایہ ادا کرنے لگی۔ میں بھی بیگ سنبھال کر اُتر گیا۔ میرا خیال تھا کہ سیتا یہاں بھی کسی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس ہی میں قیام کرے گی۔ لیکن اس حویلی کو دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ گیٹ پر کال بیل کا بٹن دبانے کے دو تین منٹ بعد گیٹ کا ذیلی دروازہ کھل گیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

وہ ادھیڑ عمر آدمی راجستھانی لباس میں تھا۔ سر پر مخصوص انداز میں بندھی ہوئی میرون رنگ کی پگڑی بھی اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ اُس کا تعلق کسی راجپوت خاندان سے ہے۔

اندر اندھیرا تھا جس کی وجہ سے نہ تو ہم اُس کی شکل اچھی طرح دیکھ سکے تھے اور نہ ہی وہ ہمیں ٹھیک سے دیکھ پایا تھا۔ البتہ ہمیں دیوانہ وار اندر گھستے دیکھ کر وہ کچھ گڑبڑا سا گیا تھا۔''

''کون ہو بھایا..... ایسے اندر کیوں گھسے آوت ہو؟''

''میں ہوں چتون سنگھ! سیتا۔'' سیتا نے کہا۔ ''یہاں اور کون ہے؟'' سیتا نے پوچھا۔

''اوہ سیتا دیوی.....؟'' چتون سنگھ نامی وہ آدمی چونک سا گیا۔ ''یہاں کوئی نا ہیں ہے۔ آؤ.....ادھر کو آ جاؤ.....آؤ آؤ!'' اُس نے میرے ہاتھ سے بیگ لے لیا۔

برآمدہ بھی تاریک تھا۔ ہم چتون سنگھ کے پیچھے اندر داخل ہوئے تو صرف ایک کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ چتون سنگھ نے وسطی کمرے میں رُک کر بتی جلا دی اور بیگ ایک طرف رکھ کر کندھے پر پڑا ہوا اجرک نما کپڑا اُتار کر فرنیچر جھاڑنے لگا۔ حالانکہ فرنیچر صاف ہی تھا۔

''بیٹھو.....بیٹھو سیتا دیوی!.....آپ بھی بیٹھو!'' اُس نے ہم دونوں کو اشارہ کیا۔

چتون سنگھ کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لمبا قد، گھٹا ہوا جسم اور بڑی بڑی گچھے دار مونچھیں۔ راجستھانی لباس میں وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔

''کوئی جل پان سیتا دیوی؟'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے سیتا کی طرف دیکھا۔

''ہاں چتون سنگھ! ہم چائے پئیں گے۔ اور اس کے بعد بھوجن بھی کریں گے۔'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم چائے بنا دو.....کھانا بازار سے لے آنا۔''

''جی سیتا دیوی۔'' چتون سنگھ کہتے ہوئے ایک طرف غائب ہوگیا۔

''یہ کس کی حویلی ہے؟'' چتون سنگھ کے جانے کے بعد میں نے سیتا سے پوچھا۔

''ہماری ہے.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''راجپوتانہ کے مہاراجوں کو آبادی اور بربادی کا بہت شوق تھا۔ وہ آپس میں بڑی بڑی جنگیں لڑتے اور جو وقت بچتا وہ قلعوں، محلات اور حویلیوں کی تعمیر پر صرف کر دیتے۔ جتنی دولت ان راجوں نے عمارتوں کی تعمیر پر خرچ کی ہے وہ اگر فلاح و بہبود پر خرچ کی جاتی تو آج راجستھان میں کوئی ریگستان دکھائی نہ دیتا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہوتا۔ لیکن اس طرف کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ پہلے یہ لوگ انسانوں کی جنگیں لڑا کرتے تھے۔ آج کل کتے لڑایا کرتے ہیں۔ یہی ان کا شوق رہ گیا ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میرے پتا جی کا تعلق بھی ایک ایسے ہی خاندان سے ہے جس نے راجستھان کی ایک ریاست پر صدیوں حکمرانی کی ہے۔ اس خاندان کو بھی عمارتیں سنوانے کا شوق تھا۔ جے پور، اودھے پور، جیسلمیر اور راجستھان کے بڑے بڑے شہروں میں کئی حویلیاں ہیں جن میں سے بیشتر ویران ہوتی جا رہی ہیں۔ یہاں ہمارے کنبے کے کچھ لوگ کبھی کبھار آتے رہتے ہیں اس لئے حویلی کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہتی ہے۔ ایک بہت بڑی حویلی شہر کے اندرونی حصے میں بھی ہے لیکن اُسے تاریخی ورثہ قرار دے کر سرکار نے قبضے میں لے رکھا ہے۔''

اسی دوران چتون سنگھ چائے بنا کر لے آیا۔

''آپ کشمیر سے کب لوٹیں سیتا دیوی؟'' اُس نے ہمارے سامنے کافی ٹیبل پر چائے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کئی روز ہوگئے.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''یہاں کی کیا صورتحال ہے؟''

''حالت بہت کھراب ہے سیتا دیوی!'' چتون سنگھ نے کہتے ہوئے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ ''آپ کو ادھر آوت ناہیں چاہئے تھا۔ لوگار کو پتہ چل گیا تو.....'' وہ ایک بار پھر میری طرف دیکھتے ہوئے خاموش ہوگیا۔

''ہاں ہاں کہو..... یہ اپنا ہی بندہ ہے۔'' سیتا بولی۔

''خبراں بہت گرم ہیں سیتا دیوی!'' چتون سنگھ بولا۔ ''ہمارتو یہ سنن ہے کہ سیتا دیوی نے پہلے کشمیر میں دو سینکوں کی ہتھیا کر ڈالی اور ایک اُگر وادی کے ساتھ بھاگ گئی۔ بعد ماں اُس مسلمان اُگر وادی نے جموں میں سینک افسران پر گولے چلائے تو سیتا بھی اُس کے ساتھ ہووے تھی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''جے پور میں سینا کے افسران نے بڑے ٹھاکر جی کو پکڑ لیا پر اُسی روز چھوڑ دیا۔ آپ نے یہاں آ کر بہت گلتی کرت ہو سیتا دیوی! کیپٹن صاب بھی اِدھر آوت رہت ہے۔''

''اوہ..... آخری مرتبہ وہ کب آیا تھا؟'' سیتا نے پوچھا۔

''دو روج پہلے.....'' چتون سنگھ نے جواب دیا۔ ''اُس کے ساتھ رانا بھی تھا اور.....'' وہ خاموش ہوگیا۔

''عورتیں بھی۔'' سیتا نے اُس کی بات پوری کر دی۔

''ہاں سیتا دیوی.....'' چتون سنگھ نے گردن ہلا دی۔

''اچھا ٹھیک ہے.....'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ میں یہاں آئی ہوں..... کسی کو نہیں۔ سمجھ گئے؟''

''سمجھ گیا سیتا دیوی.....!'' چتون سنگھ نے گردن ہلا دی۔ ''اب میں جاؤں؟ کچھ بھوجن کا بندوبست.....''

''ہاں..... تم جاؤ!'' سیتا نے پرس میں سے کچھ نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیئے۔ ''یہ رکھ لو! اور جو سمجھ میں آئے لے آنا۔''

چتون سنگھ نے نوٹ لے کر جیب میں رکھ لئے اور خالی کپ اُٹھا کر لے گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ حویلی سے چلا گیا۔ حویلی کا گیٹ اُس نے باہر سے بند کر دیا تھا۔

چتون سنگھ کی باتوں سے میں بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ سیتا کے بارے میں خبریں بہت پہلے یہاں تک پہنچ چکی تھیں۔ اس صورتحال سے بھارتی فوجیوں کی گندی ذہنیت کا اندازہ بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔ اپنے آدمیوں کو بچانے اور اپنے جرائم چھپانے کے لئے اُنہوں نے اپنوں کو بھی معاف نہیں کیا تھا۔ پہلے چاچا قربان علی کو گولیوں سے چھلنی کیا پھر اُس کی بیٹی کو تشدد کا نشانہ بنا کر ہلاک کر ڈالا۔ اور احتجاج کرنے والوں کو بھی بھون ڈالا۔ یہ اطلاع تو ہمیں جموں ہی میں مل گئی تھی کہ فوجیوں نے سیتا کے بارے میں پوچھنے کے لئے اُس کے ماما کو بھی اذیتیں دے کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ اور میرا اندازہ بالکل درست نکلا تھا کہ راجستھان میں بھی سیتا کے بارے

میں پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ اور میرے خیال میں سیتا نے یہاں آ کر واقعی غلطی کی تھی۔

چتون سنگھ نے جس کیپٹن کا تذکرہ کیا تھا وہ سیتا کا وہی کزن تھا جو عرصہ پہلے سیتا کو اپنی ہوس کا شکار بنا چکا تھا اور اُس کے ایک مسلمان دوست پر جھوٹا الزام عائد کر کے اُسے پولیس کے ہاتھوں مروا دیا تھا۔

سیتا نے مجھے راستے ہی میں بتایا تھا کہ جیسلمیر شہر پاکستان کی سرحد سے ساٹھ ستر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور یہاں ایک بہت بڑی چھاؤنی ہے۔ اور اُس کا کزن کیپٹن گوپال بھی یہیں پر ہے۔ پہلے وہ لیفٹیننٹ تھا اور بعد میں کیپٹن ہو گیا تھا۔ چتون سنگھ کے کہنے کے مطابق کیپٹن گوپال اس حویلی میں آتا رہتا تھا۔ دو دن پہلے بھی وہ رانا نامی کسی دوست کے ساتھ آوارہ عورتوں کو لے کر آیا تھا اور وہ کسی بھی وقت یہاں آ سکتا تھا۔

چتون سنگھ بازار سے کھانا لے کر آ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد سیتا نے کپڑے بدل لئے۔ اُس کے جسم پر یہ لباس دیکھ کر میں چونک سا گیا۔ اس لباس میں اُس کے جسم کا زیادہ حصہ برہنہ ہو رہا تھا۔

''یہ..... کپڑے تم نے کہاں سے لئے؟'' میں نے پوچھا۔

''بیڈ رُوم کی الماری میں بہت سے کپڑے موجود ہیں۔ تمہارا کام بھی چل سکتا ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر چتون سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

''چتون سنگھ! تم بلبیر سنگھ کے پاس چلے جاؤ۔ دو چار دن وہیں رہ لو۔ جب میں یہاں سے جانے لگوں گی تو تمہیں فون کر کے بلوا لوں گی۔''

''جی سیتا دیوی!'' چتون سنگھ نے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں اُلجھن سی اُبھر آئی تھی۔ ''پر آپ کی سیوا.....''

''اپنی سیوا ہم خود ہی کر لیں گے۔'' سیتا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''اور تم اپنی زبان بند رکھو گے۔ کسی کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔ اب تم جاؤ!''

''جی سیتا دیوی۔'' چتون سنگھ نے کہا اور ایک کمرے میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک چھوٹی سی پوٹلی، جس میں اُس کے دو جوڑے کپڑے تھے، لے کر رُخصت ہو گیا۔

میں سیتا کے ساتھ ایک کمرے میں آ گیا۔ یہ بہت وسیع و عریض بیڈ رُوم تھا اور شاندار طریقے سے آراستہ تھا۔ بیڈ کے عین سامنے والی دیوار پر دو عورتوں کی ایسی تصویریں آراستہ تھیں جنہیں دیکھ کر ہی شرم آتی تھی۔ سیتا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر میک اَپ کرنے لگی۔ یہاں ہر چیز موجود تھی۔ یوں تو سیتا ویسے ہی بے حد حسین تھی مگر ہلکے سے میک اَپ سے اُس کا حسن کچھ اور نکھر آتا تھا۔ اور اس وقت تو وہ بہت اہتمام سے میک اَپ کر رہی تھی۔

''کیسی لگ رہی ہوں.....؟'' اُس نے اُٹھ کر میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''تمہیں دیکھ کر تو سو سالہ بوڑھا بھی اپنے اندر ہلچل سی محسوس کرنے لگے گا۔ مگر تم کر کیا رہی ہو..... کہیں جانے کا پروگرام ہے کیا؟'' میں نے اُسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اُسے دیکھ کر میرے دل میں بھی کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔

''میں ایک شکار کی تلاش میں جا رہی ہوں۔ واپسی میں دو تین گھنٹے لگ سکتے ہیں..... تم پریشان مت ہونا۔'' اُس نے جواب دیا۔

''اگر تمہارے بعد کوئی آ گیا تو؟'' میں نے کہا۔

''کوئی نہیں آئے گا.....'' سیتا نے جواب دیا اور اچانک ہی مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

میں گڑبڑا سا گیا۔ اس سے پہلے کہ سنبھل سکتا اُس نے اپنے ہونٹ میرے بائیں گال پر ثبت کر دیئے اور پھر پیچھے ہٹ کر میری طرف دیکھتے ہوئے زوردار قہقہہ لگایا اور مجھے پکڑ کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف گھما دیا۔ میرے گال پر اُس کے ہونٹوں کا سرخ نشان بن گیا تھا جسے میں اپنے ہاتھ کی پشت سے صاف کرنے لگا۔

سیتا نے اپنے ہونٹوں کی لپ اسٹک درست کی اور مجھے اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ چند منٹ بعد وہ حویلی سے رخصت ہو گئی۔ حویلی کے گیٹ کا چھوٹا دروازہ اُس نے باہر سے بند کیا تھا۔ برآمدے والا دروازہ میں نے ویسے ہی بھیڑ دیا۔ سیتا کی ہدایت کے مطابق میں نے اُس دروازے کی چٹخنی بھی نہیں لگائی تھی۔

میں کچھ دیر تک کمرے کے ہال کے وسط میں کھڑا رہا اور گھوم پھر کر حویلی دیکھنے لگا۔ بہت بڑی حویلی تھی۔ کئی راہداریاں اور لاتعداد کمرے تھے۔ میں نے راجے مہاراجوں کے شاہی محلات، قلعوں اور اس قسم کی حویلیوں کے بارے میں سنا تھا کہ ان میں سرنگیں، تہہ خانے اور خفیہ راستے ہوتے ہیں۔ کئی کمرے اُوپر بھی تھے۔ اُوپر جانے کے لئے ہال کمرے کے اندر سے بھی زینہ تھا اور باہر سے سیڑھیاں بھی تھیں۔

میں تقریباً ایک گھنٹے تک حویلی میں گھومتا رہا اور پھر دوبارہ ہال نما کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر وہاں رُکا اور پھر اُسی بیڈ رُوم میں آ گیا۔ میں نے کمرے کی بتی بجھا دی اور بستر پر لیٹ گیا۔ راہداری میں جلنے والے بلب کی مدھم سی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔

بستر اس قدر آرام دہ تھا کہ لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں..... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر سویا؟ اور پھر کسی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ اس کے ساتھ ہی ''چٹ'' کی ہلکی سی آواز سے کمرہ روشنی سے بھر گیا..... میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور جب آنکھیں تیز روشنی سے مانوس ہوئیں تو سامنے سیتا اور اُس کے ساتھ ایک آدمی کو دیکھ کر میں [illegible] ہو گیا ہے جس کی مجھے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ چند لمحے میری طرف دونوں میں ڈال دیا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

سے روشناس کرا دیا کہ یہ میرا خیال

''کیپٹن گوپال! یہ ہے کشمیر کا وہ سب سے بڑا اُگر وادی..... مجاہدین کا بہت بڑا سرغنہ شمروز..... جس نے بھارتی سینا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ جموں کے قریب مانسر جھیل کے کنارے سینا کے اعلیٰ افسروں کی ہلاکت کا منصوبہ بھی اسی نے بنایا تھا۔ تمہاری سینا، انٹیلی جنس یا کوئی اور ایجنسی اس کا سراغ نہیں لگا سکی لیکن دیکھو میں کس طرح آسانی سے اسے یہاں لے آئی ہوں.....''

میں اُچھل پڑا..... میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ میں نے خونخوار نظروں سے سیتا کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ اپنی جگہ سے کوئی حرکت کرتا کیپٹن گوپال نے بڑی پھرتی سے جیب سے پستول نکال لیا۔

میں بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا..... مجھے اپنی رگوں میں خون منجمد ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شدید سردی کی ایک لہر مجھے اپنی لپیٹ میں لیتی چلی گئی.....!!

○○○

میری رگوں میں خون جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا..... شدید سردی کی لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا کبھی کیپٹن گوپال اور کبھی سیتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیتا کے ہونٹوں پر اب بھی بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ لیکن اس وقت مجھے اُس کی مسکراہٹ بڑی مکروہ لگ رہی تھی۔ کیپٹن گوپال کے پستول کا رُخ اب بھی میری طرف تھا۔

''ویل ڈن سیتا!'' کیپٹن گوپال کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ ''تم نے واقعی وہ کام کر دکھایا ہے جو ہمارے بڑے بڑے سورما بھی نہیں کر سکے۔ اس نے واقعی ہماری سرکار اور ہماری سینا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی زندہ یا مُردہ گرفتاری پر سرکار کی طرف سے کروڑوں روپے کے انعامات مقرر ہیں۔ یہ انعامات تمہیں ملیں گے۔ اور تم بلاشبہ ہندوستان کی سب سے دولت مند عورت بن جاؤ گی۔'' وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے نفرت اور انتقام کی چنگاریاں برس رہی تھیں۔ اُس کے پستول کا رُخ اب بھی میری طرف تھا۔ وہ ایک بار پھر سیتا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم اس تک کیسے پہنچ گئیں؟ اور اسے آسانی سے کس طرح قابو کر لیا؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں یہاں سے یہ عہد کر کے نکلی تھی کہ یا تو اسے اور انگوری کو پکڑ کر لاؤں گی یا اپنی جان دے دُوں گی۔ انگوری میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ماری جا چکی تھی۔ میں ڈوڈا کے قریب اپنے ماما کی بستی میں تھی۔ اس دوران میں نے جموں اور ڈوڈا میں مجاہدین سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ میں مجاہدین کے توسط سے اس تک پہنچنا چاہتی تھی لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''اور پھر یہ اتفاق سے مجھے بستی کے قریب پہاڑیوں میں بے ہوش پڑا ہوا مل گیا۔ یہ زخمی تھا۔ میں اسے اُٹھا کر غار میں لے گئی۔ میرا خیال تھا کہ میں اس کے ذریعے شمروز تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ میں نے اسے غار میں چھپائے رکھا۔ بستی کے ایک بوڑھے مسلمان کے ذریعے اس کا علاج کروایا اور اس کے کھانے پینے کا خیال رکھا۔

میں یہ سمجھتی رہی تھی کہ یہ کوئی عام کشمیری مجاہد ہے جو زخمی ہو کر اس طرف آن نکلا تھا۔ لیکن یہ انکشاف میرے لئے خاصا سنسنی خیز ثابت ہوا کہ یہی وہ خطرناک اُگر وادی ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ بھگوان نے اسے پکے ہوئے پھل کی طرح میری جھولی میں ڈال دیا تھا۔ میں اس کی سیوا کرتی رہی۔ میں نے اسے زندگی کی ایک ایسی لذت سے روشناس کرا دیا کہ یہ میرا خیال

اپنے ذہن سے نہ نکال سکے۔ میں اسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئی کہ ہندو ہوتے ہوئے بھی مجھے ہندوؤں سے شدید نفرت ہے۔ کشمیر کے حوالے سے اپنی سرکار کی پالیسیوں سے بھی اختلاف ہے۔ میں آزادی کو کشمیری مسلمانوں کا حق سمجھتی تھی۔ میں نے اسے باور کرا دیا کہ میں کشمیری مسلمانوں کو حق بجانب سمجھتی ہوں اور ہندو سامراج کے خلاف ان کے شانہ بشانہ لڑنا چاہتی ہوں۔ اس نے میری باتوں کا یقین کر لیا۔ یہ اب تندرست ہو چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی اگلا قدم اُٹھاتی غار کے قریب چشمے پر مجھے دو ہندو سینکوں نے گھیر لیا۔ وہ مجھے اکیلے پا کر میرے ساتھ بلادکار کرنا چاہتے تھے لیکن اس نے مجھے بچایا اور وہ دونوں فوجی ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ اور پھر یہیں سے حالات میرے ہاتھ سے نکلنے لگے۔ یہ شمروز اپنے محاذ پر واپس جانا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے قابو میں رکھا اور وہاں سے نکال لائی۔ میرے ماما کی بستی میں جو کچھ ہوا اس میں نہ اس کا ہاتھ تھا اور نہ میرا۔ بستی میں ہندو فوجیوں نے جو کچھ بھی کیا اس نے میرے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ تو بھر دیا لیکن میرے لئے مشکلات پیدا ہوگئیں۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح جموں تک لے آنے میں کامیاب ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے کسی نہ کسی طرح وہاں سے بھی نکال لاؤں گی۔ لیکن وہاں مجاہدین کی ایک اور پارٹی سرگرم تھی۔ اُنہوں نے بھرتی فوجی افسروں کے قتل کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ میں اسے دُور رکھنا چاہتی تھی مگر یہ ان مجاہدین سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور پھر میں بھی اس گروہ میں شامل ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ میں وقت سے پہلے بھارتی فوجیوں کو اس سازش سے آگاہ کر دُوں گی لیکن مجھے موقع نہیں مل سکا۔ اور پھر مانسر جھیل پر جس طرح قتل عام ہوا وہ خوفناک منظر میں زندگی بھر نہیں بھلا سکوں گی..... یہ ایک بار پھر کشمیر کی طرف واپس جانا چاہتا تھا مگر ایک میری کوشش اور پھر حالات نے اسے اس طرف جانے سے باز رکھا اور ہم کسی نہ کسی طرح جموں سے نکل کر پٹھان کوٹ پہنچ گئے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی اور پھر پٹھان کوٹ سے یہاں تک کے حالات بتانے لگی۔

تم واقعی بہادر لڑکی ہو بھارتیہ ناری.....'' کیپٹن گوپال نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''اس کی گرفتاری پر نقد انعامات کے علاوہ تم مہاویر چکر کی بھی حق دار ہو۔''

''شاید تم یہ بھول گئے ہو کہ مہاویر چکر کسی زندہ انسان کو نہیں دیا جاتا۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ درست ہے..... لیکن اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہیں اس سے بھی بڑا ایوارڈ دیتا۔'' کیپٹن گوپال نے کہا۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر بھی طیش آ رہا تھا کہ کس قدر آسانی سے بیوقوف بن گیا تھا۔ سیتا نے اپنے آپ کو کشمیری مسلمانوں کا ہمدرد ظاہر کر کے مجھے اپنے حسن و شباب کے جال میں جکڑ لیا تھا اور بڑی خوبصورتی سے مجھے وہاں

سے نکال لائی تھی۔ عورت..... خوبصورت عورت واقعی اپنے اندر بڑی طاقت رکھتی ہے۔ جو کام بڑے سے بڑے سور ما نہیں کر سکتے وہ ایک خوبصورت عورت بڑی آسانی سے کر ڈالتی ہے۔ اور مرد..... خواہ کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو عورت کے حسن کے جال میں پھنس کر بیوقوف بن جاتا ہے۔ یہی سب کچھ میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں کتنی آسانی سے بیوقوف بن گیا تھا۔ لیکن مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ میں اس کی باتوں میں کیوں آ گیا تھا۔

وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور میں موقع کی تلاش میں تھا۔ اور بالآخر مجھے موقع مل گیا..... کیپٹن گوپال کی توجہ ایک لمحہ کو میری طرف سے ہٹی تھی اور میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کیپٹن پر چھلانگ لگا دی۔

میرے پیر کی ٹھوکر پوری قوت سے اُس کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہوا میں اُڑتا ہوا صوفوں کے پیچھے کہیں جا گرا۔ اس سے پہلے کہ کیپٹن گوپال اس جھٹکے سے سنبھل سکتا میں نے اُس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا اور اُسے ساتھ لیتا ہوا درمیان میں رکھی ہوئی شیشے کے ٹاپ والی کافی ٹیبل پر گرا۔

ایک زوردار چھناکے کی آواز اُبھری..... شیشے کے ساتھ میز بھی ہم دونوں کے بوجھ سے ٹوٹ گئی۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کا ایک ٹکڑا میرے بائیں بازو پر کہنی سے ذرا اُوپر لگا کھال کٹ گئی اور خون رِسنے لگا۔

میز ٹوٹنے سے ہم اس طرح گرے تھے کہ کیپٹن گوپال میرے اُوپر آ گیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے سے اُس کے بازو پر بھی کٹ لگا تھا جس سے خون بہنے لگا تھا۔ لیکن میری طرح اُس نے بھی تکلیف کی پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ میرے گلے پر گرفت جمانے کی کوشش کرتے ہوئے مجھے رگید رہا تھا۔

میں نے پوری قوت سے اُسے ایک طرف اُلٹ دیا اور بڑی پھرتی سے اُٹھ کر اُس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا۔ اُس نے میرا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر گرا اور اس سے پہلے کہ سنبھل سکتا گوپال نے میرے اُوپر چھلانگ لگا دی اور مجھے رگیدتا ہوا دُور تک لے گیا۔

کیپٹن گوپال ایک بار پھر میرے اُوپر تھا۔ اور میرے گلے پر گرفت جمانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس مرتبہ بھی میں نے اُس کی کوشش کامیاب نہیں ہونے دی اور اُسے دونوں پیروں پر اُٹھا کر اُچھال دیا۔ وہ اُلٹی قلابازی کھاتا ہوا پچھلی طرف صوفے پر گرا۔ میں نے بھی اُٹھ کر چھلانگ لگا دی..... صوفہ ہم دونوں کے بوجھ سے اُلٹ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے دیوار کے قریب پہنچ گئے۔

سیتا خاموش تماشائی کی طرح ایک طرف کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اپنے ساتھی کیپٹن گوپال کی مدد کیوں نہیں کر رہی تھی؟

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ کیپٹن گوپال میں سانڈ جیسی طاقت بھری ہوئی تھی۔ طاقت کے حوالے سے میرا اور اُس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ لیکن یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا میری کمزوری میری شکست کا باعث بن سکتی تھی اور اس شکست کا انجام بھی میں اچھی طرح جانتا تھا۔ میں اپنے آپ کو گوپال کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور پھر میں نے اُس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

کیپٹن گوپال کو موقع مل گیا اور وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب ہم ایک دوسرے پر لاتیں اور گھونسے برسا رہے تھے۔ ایک مرتبہ موقع پا کر گوپال مجھ سے لپٹ گیا اور مجھے دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ گوپال میرا سر دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔ ہر ٹکر پر میرے منہ سے کراہ نکل جاتی تھی۔ اُس نے میرے بال مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ میں نے اُس کی بغل میں ایک دو گھونسے لگائے تھے مگر ان گھونسوں میں شاید اتنی طاقت نہیں تھی کہ گوپال پر اس کا کوئی اثر ہو۔

میں نے گوپال کی ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنے سے ضرب لگائی..... وہ کراہ اُٹھا اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ کیپٹن گوپال نے ایک بار پھر مجھے دبوچ لیا۔ گوپال پر گویا جنون طاری ہو چکا تھا..... وہ مجھ پر لاتیں اور گھونسے برساتا رہا۔ میں صرف اپنا دفاع کر رہا تھا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے میں ایک کرسی سے ٹکرا کر پشت کے بل گرا اور گوپال نے میرے اُوپر چھلانگ لگا دی۔

اس مرتبہ میرا گلا اُس کی گرفت میں آ گیا..... اُس کے دونوں انگوٹھے میرے نرخرے پر تھے اور دباؤ بڑھتا جا رہا تھا..... میں گرفت چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اُس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی..... مجھے سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا..... آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگیں۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی میری آخری کوشش بھی ناکام ہو چکی تھی۔ کیپٹن گوپال پر واقعی جنون طاری تھا۔ وہ مجھے گلا گھونٹ کر مار ڈالنا چاہتا تھا۔ اسی وقت سیتا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ یہ آواز مجھے میلوں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''گوپال..... چھوڑ دو اسے..... میں کہتی ہوں چھوڑ دو.....!''

مگر کیپٹن گوپال پاگل ہو گیا۔ میرے گلے پر اُس کی گرفت کچھ اور بڑھ گئی۔ سیتا کی چیختی ہوئی آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ اور پھر کیپٹن گوپال کے منہ سے ایک کراہ خارج ہوئی۔ میرے گلے پر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی..... میں نے دُھندلائی ہوئی نظروں سے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں کافی ٹیبل کا ٹوٹا ہوا پایا تھا جس سے اُس نے گوپال کے سر پر ضرب لگائی تھی۔

سیتا کا ہاتھ اُوپر کو اُٹھا ہوا تھا۔ اُس نے دوسری ضرب لگائی لیکن اس مرتبہ وار سر کی بجائے اُس کے کندھے پر پڑا۔ گوپال کے ہاتھ میرے گلے سے ہٹ گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے چھائی ہوئی دُھند چھٹنے لگی۔ میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''شمروز! اُٹھو.....'' سیتا کی چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''مارو اسے..... مار ڈالو اسے.....''

میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ کیپٹن گوپال اب بھی میرے سینے پر سوار تھا۔ میں نے اُسے ایک طرف گرا دیا اور اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ گوپال نے میرے منہ پر گھونسہ رسید کر دیا۔ گھونسہ اس قدر زوردار تھا کہ میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا.....

سیتا نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کافی ٹیبل کے پائے سے کیپٹن گوپال کے کندھوں پر دو تین ضربیں لگائیں۔ کیپٹن گوپال کے منہ سے گندی گالیاں نکلنے لگیں۔ اور پھر یہ گالیاں خرخراہٹوں میں تبدیل ہو گئیں..... وہ مجھے چھوڑ کر سیتا کی طرف لپکا اور اُس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ سیتا کی چیخیں کمرے میں گونجنے لگیں۔

میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیئے..... میرے حواس بحال ہونے لگے۔ اور پھر میں نے کیپٹن گوپال پر چھلانگ لگا دی اور اُسے رگیدتا ہوا دُور تک لے گیا۔ لیکن کیپٹن گوپال کو ایک بار پھر موقع مل گیا اور وہ مجھے نیچے گرا کر میرے جسم پر ٹھوکریں برسانے لگا۔

''بس گوپال.....'' سیتا کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اسے چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں گولی مار دُوں گی۔''

''ہٹ جاؤ سیتا! میں اس اُگر وادی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' کیپٹن گوپال مجھے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا۔

کمرہ فائر کی آواز سے گونج اُٹھا..... اس کے ساتھ ہی سیتا کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''اب اگر تم پیچھے نہ ہٹے تو دوسری گولی تمہاری کھوپڑی میں لگے گی۔''

کیپٹن گوپال مجھے گھونسہ مارنے جا رہا تھا لیکن اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ رُک گیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو تم؟'' وہ سیتا کی طرف دیکھ کر غرایا۔ ''تم ایک آتنک وادی کو بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔''

''یہ نہ تو آتنک وادی ہے اور نہ اُگر وادی۔'' سیتا نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔ ''آتنک وادی اور اُگر وادی، دہشت گرد اور باغی کو کہتے ہیں۔ یہ نہ تو دہشت گرد ہے اور نہ ہی باغی..... یہ تو اپنی مادر گیتی کو غاصبوں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ یہ اپنے وطن کی تحریک آزادی کا ایک دلیر اور بے باک مجاہد ہے۔ ایک ایسا مجاہد جس پر اس کی قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ تمہارے سینکوں پر تو اس کے نام کی دہشت ہے۔ اس کا مظاہرہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ اس کا نام سن کر تمہاری سینا کے بڑے بڑے جرنیلوں کے پیشاب خطا ہو جاتے ہیں۔ میں نے تمہیں اس پر ہاتھ اُٹھانے کا موقع دیا جس کا مجھے افسوس ہے۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو سیتا؟'' کیپٹن گوپال چیخا۔ اُس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا

تھا۔ ''تم ایک آتنک وادی کی حمایت کر رہی ہو..... ایک اُگر وادی کی حمایت میں تم ہندوستانی فوج کے ایک آفیسر پر پستول اُٹھایا ہے جس کا انجام تم جانتی ہو۔''

''بہت اچھی طرح.....'' سیتا مسکرا دی۔ ''میں یہاں سے کشمیر کی طرف گئی تو اسی مقصد تھی کہ شمروز کو گرفتار کر کے لاؤں۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگئی ہوں۔ لیکن وہاں نے جو کچھ بھی دیکھا ہے اس سے میرے دل میں بھارتی فوج کے لئے شدید نفرت پیدا ہو ہے۔ اتنے مظالم تو ہٹلر نے بھی یہودیوں پر نہیں توڑے ہوں گے جتنے بھارتی فوج کشمیر نہتے اور مظلوم مسلمانوں پر ڈھا رہی ہے۔ ہتھیاروں کی تلاش کے بہانے ان کے گھروں کو لو رہا ہے۔ مجاہدین کو پناہ دینے کے الزام میں ان کی بستیوں کو جلا کر راکھ کیا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ لوگوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا ہے۔ عورتوں اور کم عمر لڑکیوں اجتماعی آبروریزی کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ بھارتی فوجیوں نے کشمیر کو ایک شکارگاہ بنا رکھا ہے۔ انسان نہیں بھیڑیئے اور درندے ہیں جن کے منہ کو انسانی خون لگ گیا ہے۔''

''سیتا.....!'' کیپٹن گوپال ایک بار پھر چیخا۔ ''تم بہک رہی ہو۔''

''ہاں..... میں بہک رہی ہوں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''مجھے بھارتی فوج سے نفرت تو اُ روز ہوگئی تھی جب تم نے مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا اور جب میں نے کشمیر میں یہ سب ہوتے دیکھا تو مجھے ان بھارتی فوجیوں سے اور بھی شدید نفرت ہوگئی۔''

''تم غلطی کر رہی ہو سیتا!'' کیپٹن گوپال نے کہا۔ ''تم جموں اور کشمیر کی صورتحال سے واقف نہیں ہو۔ جو اِن لوگوں نے ہمارے ہندوؤں کے ساتھ کیا ہے وہ تم نہیں جانتیں۔ انہوں ہماری سیناؤں کو جو نقصان پہنچایا ہے تم اس سے بھی واقف نہیں ہو۔ یہ مظلوم نہیں ہیں..... انہیں کسی ہمدردی کا مستحق مت سمجھو..... یہ لوگ کشمیر کو بھارت سے الگ کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں پاکستان کی آشیرباد حاصل ہے۔ لیکن کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ اسے کسی صورت الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ باغی ہیں اور ان لوگوں کو سزا ملنی چاہئے۔ تم نے ایک باغی کے حق ایک ہندوستانی فوجی آفیسر پر پستول اُٹھا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھے یہ پستول میرے حوالے کر دو! تم نے جو کچھ بھی کیا ہے اور کہا ہے میں اسے بھول جاؤں گا۔ اس کی گرفتاری پر تم اب بھی انعام کی حق دار ہو۔ تمہیں بے حساب.....''

''حساب پر یاد آیا۔'' سیتا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے تو ابھی تم سے بھی حساب کتاب کرنا ہے۔ تم جانتے ہو تم نے مجھے کس طرح ہوس کا نشانہ بنایا تھا..... اپنا دوش ایک بے گناہ مسلمان کے کندھوں پر ڈال کر اُسے پولیس کے ذریعے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ میں سب کچھ نہیں بھولی ہوں۔ اب حساب کتاب کا وقت آ گیا ہے۔ اپنے کپڑے اُتار دو!''

''کیا.....؟'' کیپٹن گوپال اُچھل پڑا۔ ''کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''میرا مطلب وہی ہے جو کچھ میں نے کہا۔'' سیتا بولی۔ ''اپنے کپڑے اُتارو.....!''

کیپٹن گوپال کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ میں بھی اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا سیتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت نہیں تھی کہ سیتا نے گوپال کو کپڑے اُتارنے کو کیوں کہا تھا اور وہ اُس کے ساتھ کیا کرنا چاہتی تھی۔ حیرت تو اُس کے طرزِ عمل پر تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اُس نے مجھے پلیٹ میں سجا کر کیپٹن گوپال کے سامنے پیش کر دیا تھا کہ یہ ہے وہ خطرناک ترین کشمیری اُگر وادی جس نے کشمیر میں بھارتی فوج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ اور اس وقت یہ بات بھی واضح ہوگئی تھی کہ وہ محض مجھے پھانسنے کے لئے یہاں سے کشمیر گئی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگئی تھی۔ وہ مجھے یہاں تک لے آئی تھی اور اُس نے مجھے کیپٹن گوپال کے سامنے پیش بھی کر دیا تھا۔ اور جب کیپٹن گوپال گلا گھونٹ کر مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا تو اُس نے نہ صرف مجھے بچا لیا بلکہ کیپٹن گوپال پر گولی بھی چلا دی تھی اور ایک بار پھر میری اور کشمیری مسلمانوں کی ہمدرد بن گئی تھی۔ کیا یہ بھی اُس کی کوئی چال تھی؟ کیپٹن گوپال نے بتایا تھا کہ میری گرفتاری پر اُسے کروڑوں روپے انعام ملیں گے۔ اور ہو سکتا ہے سیتا کے ذہن میں یہ خیال آیا ہو کہ کیپٹن گوپال مجھے کہیں خود تو حکام کے سامنے پیش نہیں کرنا چاہتا تھا تاکہ انعام کی رقم خود حاصل کر سکے۔ ہو سکتا ہے یہی سب کچھ سوچ کر اُس نے پینترا بدلا ہو اور ایک بار پھر میری ہمدرد بن گئی۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ وہ کیپٹن گوپال کے کپڑے کیوں اُتروانا چاہتی تھی۔

''سنا نہیں تم نے کیپٹن گوپال.....؟'' سیتا ایک بار پھر چیخی۔ ''میں نے تمہیں کہا تھا کہ کپڑے اُتارو اور تم نے ابھی تک میرے حکم کی تعمیل نہیں کی۔''

''تم پاگل ہوگئی ہو.....'' کیپٹن گوپال بولا۔ وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سیتا نے فائر کھول دیا۔ گولی کیپٹن گوپال کے پیروں پر لگی۔ وہ اُچھل پڑا۔

○

کیپٹن گوپال چیختا ہوا قالین پر لوٹنے لگا۔ اُس کی ٹانگوں سے خون کا فوارہ اُبل پڑا تھا اور خون قالین کو گندا کر رہا تھا۔ سیتا کے ہاتھ بھی خون آلود تھے۔ اُس نے ایک بار پھر نفرت بھری نظروں سے کیپٹن گوپال کی طرف دیکھا اور ہاتھ دھونے کے لئے باتھ رُوم کی طرف چلی گئی۔

کیپٹن گوپال تقریباً پندرہ منٹ تک مچلتا رہا۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح نیکر پہن لی اور دو منٹ کے اندر اندر نیکر بھی خون سے تر ہوگئی۔ سیتا ابھی تک کمرے ہی میں تھی۔ میں نے ایک نظر کیپٹن گوپال کی طرف دیکھا اور صوفے پر پڑا ہوا پستول اُٹھا کر اُسی کمرے میں آ گیا جہاں سیتا تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ باتھ رُوم میں ہوگی مگر وہ بیڈ پر پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

''تم نے اُس کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''زیادتی.....!'' سیتا کے لہجے میں بے پناہ سرد مہری تھی۔ ''میرا تو دل چاہتا ہے اُس کے ٹکڑے کر کے گوشت کتوں کو کھلا دوں۔ لیکن یہ سزا ایسی ہے کہ وہ زندگی کے آخری لمحوں تک

اسے بھول نہیں سکے گا۔''

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر سے آہٹ سن کر چونک گئے..... آواز ایسی تھی جیسے برآمدے کا جالی والا دروازہ دھڑ سے بند ہوا ہو۔ سیتا اُچھل کر بیڈ سے اُتر گئی۔ میں بھی اُس کے ساتھ باہر کی طرف لپکا۔ کیپٹن گوپال سنگھ ہال والے کمرے میں نہیں تھا جہاں ہم اُسے چھوڑ کر گئے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ سیتا نے میرے ہاتھ سے پستول جھپٹ لیا اور باہر کی طرف دوڑی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی لپکا۔

کیپٹن گوپال جھک کر لڑکھڑاتا ہوا باہر والے گیٹ کی طرف دوڑ رہا تھا۔ سیتا نے پورچ میں چھلانگ لگا دی اور پستول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پے در پے مُرائیگر دباتی چلی گئی.....

تین گولیاں چلی تھیں اور تینوں کی تینوں کیپٹن گوپال کی پشت میں پیوست ہو گئیں..... وہ لٹو کی طرح گھوم کر گرا اور تڑپنے لگا۔ اُس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ گولیوں اور گوپال کی چیخوں کی آواز رات کے سناٹے میں دُور تک پھیل گئی تھی۔

میں نے بھی سیتا کے پیچھے گیٹ کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اُس جگہ برآمدے کے بلب کی مدھم سی روشنی پہنچ رہی تھی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ دو گولیاں اُس کی پشت پر لگی تھیں اور ایک گردن میں۔ وہ بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ سیتا نے اُس پر تھوک دیا اور اُس کو ایک ٹھوکر مار کر پیچھے ہٹ گئی۔

''مجھے یقین ہے کہ کشمیر میں بھی بھارتی سینکوں کو پیٹھ پر ہی گولیاں لگتی ہوں گی۔'' وہ بڑبڑائی۔

''زیادہ تر.....!'' میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''رات کے سناٹے میں گولیوں کی آواز دُور تک گونجی ہو گی۔ اگر کوئی پتہ کرنے اس طرف آ گیا تو.....؟''

''یہ مہاراج پرتاب سنگھ کی حویلی ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''یہاں کچھ بھی ہو جائے کوئی اس طرف آ کر دروازے پر دستک نہیں دے گا۔''

''اب اس لاش کا کیا، کیا جائے؟'' میں نے پوچھا۔

''حویلی کے پیچھے بہت جگہ ہے، کہیں بھی گڑھا کھود کر ڈال دیں گے۔'' اُس نے جواب دیا۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم لاش کو گھسیٹ کر حویلی کے پچھلی طرف لے گئے۔ یہاں وسیع و عریض کمپاؤنڈ تھا۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ قطار در قطار ناریل کے اونچے درخت تھے جو تیز ہوا سے ایک طرف جھکے جا رہے تھے۔ سیتا مجھے وہیں رُکنے کو کہہ کر پچھلے دروازے سے حویلی میں چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک گینتی اور بیلچہ لے آئی۔ ہم نے دیوار کے قریب جگہ کا انتخاب کیا اور میں نے گینتی سے کھدائی شروع کر دی۔

زمین نرم تھی۔ چھ فٹ لمبا اور تین فٹ گہرا گڑھا کھودنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ کیپٹن گوپال کی لاش اُس گڑھے میں ڈال کر زمین برابر کر دی گئی۔

''تازہ کھدی ہوئی زمین دیکھ کر کسی کو شبہ تو نہیں ہو گا؟'' میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''راجوں مہاراجوں کی حویلیاں اور محلات اپنے اندر پتہ نہیں کیسے کیسے راز چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ تو ایک لاش ہے جسے زمین نے نگل لیا۔ اب اس کے بارے میں کون جان سکے گا۔'' سیتا نے جواب دیا۔ اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''میں اسے جان سے نہیں مارنا چاہتی تھی۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کر کے خود ہی اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ اگر یہ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو ہمارے لئے مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے۔''

''ابھی تم نے کہا ہے کہ میں اسے جان سے نہیں مارنا چاہتی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم اسے زندہ چھوڑ دیتیں؟ کیا اس صورت میں یہ ہمارے لئے مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے نہیں کر سکتا تھا؟''

''میں اسے اس طرح یہاں سے جانے کی اجازت دیتی کہ یہ زندگی بھر اپنی زبان بند رکھتا۔ آؤ! اندر چلتے ہیں۔'' سیتا نے کہا۔

ہم حویلی کے پچھلے دروازے سے اندر آ گئے۔ سیتا نے مجھ سے بیلچہ اور گینتی لے کر سٹور روم میں ڈال دیئے۔ ہال کمرے کا سارا سامان اُلٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ سینٹر ٹیبل ٹوٹ جانے سے شیشے کی کرچیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں اور قالین پر چاروں طرف خون پھیلا ہوا تھا۔

''ہمیں تھوڑی سی محنت کرنی پڑے گی۔'' سیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد ہم آرام سے بیٹھ کر چائے پئیں گے اور گپ شپ کریں گے۔''

ہم نے فرنیچر وغیرہ الگ ہٹا کر قالین کو رول کر دیا۔ اس سے پہلے ٹوٹی ہوئی کافی ٹیبل اور شیشے کے بڑے بڑے ٹکڑے اُٹھا کر ایک طرف ڈال دیئے تھے۔ قالین خاصا وزنی تھا۔ اُسے گھسیٹ کر چھت تک لے جانے میں ہم دونوں پسینے میں نہا گئے۔ واپس آ کر ہم نے فرنیچر سیٹ کیا۔ سیتا ایک صوفے پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ کیپٹن گوپال سے ہاتھا پائی میں اُس کا بلاؤز سامنے سے پھٹ گیا تھا اور اُس کے سینے کا زیر و بم بہت خطرناک صورت اختیار کئے ہوئے تھا۔ میں اُس سے نظریں چرانے کی کوشش کرتا رہا۔

''میں نہا کر کپڑے بدل لوں، پھر چائے بناتی ہوں۔'' سیتا کہتے ہوئے اُٹھ گئی۔

میں بھی فوراً ہی اُٹھ گیا اور اس سے پہلے ہی کمرے میں گھس کر بیگ میں سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس دوران میں بھی دوسرے کمرے کے باتھ روم میں جا کر نہا لوں گا۔''

میں ابھی بیگ میں سے کپڑے نکال ہی رہا تھا کہ کھٹ کی ہلکی سی آواز سنائی دی..... میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ سیتا اندر آ کر دروازہ بند کر چکی تھی اور اوپر والی چٹخنی لگا رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی قاتلانہ مسکراہٹ تھی۔

ہم دونوں اُس بیڈ رُوم میں بیٹھے ہوئے تھے جسے ہم نے رات گزارنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں حویلی میں داخل ہونے کے بعد ہم سب سے پہلے آئے تھے۔ اس

کمرے میں دیوار پر عورتوں کی رنگین شرمناک تصویریں آویزاں تھیں۔ میں نے بیٹھنے سے پہلے ان تصویروں والے فریم اُلٹ دیئے۔

''میں تمہیں اب تک نہیں سمجھ سکا سیتا!'' میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ سیتا نے چائے بڑی خوش ذائقہ بنائی تھی۔ ''ڈوڈا سے جموں تک تم ایک بزدل لڑکی ثابت ہوئی تھیں۔ جموں میں مانسر جھیل پر تم نے رائفل چلانے کی حد تک کچھ بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد تم پھر پہلے جیسی لڑکی نظر آنے لگیں۔ ڈری ڈری اور سہمی سہمی سی۔ لیکن یہاں میں نے تمہارا ایک مختلف رُوپ دیکھا ہے۔ تم نے جس بیدردی سے پہلے کیپٹن گوپال کو اُس کی مردانگی سے محروم کیا اور بعد میں جس طرح اُس کے شریر میں گولیاں پیوست کیں وہ سب میرے لئے بہت ہی حیران کن ہے۔ اور سب سے اہم بات.....'' میں نے کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ''تم نے کیپٹن گوپال سے کہا تھا کہ مجھے پکڑنے کے لئے ہی کشمیر گئی تھیں اور بڑی خوبصورتی سے مجھے گھیر کر یہاں لے آئیں۔ مجھے اب تم پر شبہ ہونے لگا ہے۔ تم کون ہو سیتا.....؟ وہ تو ہرگز نہیں ہو جو اب تک اپنے آپ کو ظاہر کرتی رہی ہو۔ میں تمہاری اصلیت جاننا چاہتا ہوں۔''

''میری اصلیت.....'' سیتا نے کہتے ہوئے دونوں پیر سامنے کو پھیلا لئے۔ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اُس کے جسم پر شب خوابی کا باریک لباس تھا جس سے کہیں کہیں سے اُس کا جسم جھلک رہا تھا۔ ''میری اصلیت جاننا چاہتے ہو تو سنو!'' اُس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ''میں بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کی ایجنٹ ہوں۔''

''کیا.....؟'' میں اُچھل پڑا۔

''یہ سچ ہے.....'' سیتا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''یہ کالج کے زمانے کی بات ہے۔ ایک روز کالج ہی میں شیتاب نامی عورت سے میرا سامنا ہو گیا۔ وہ آنند نامی کسی لڑکے کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ آنند میری ہی کلاس میں پڑھتا تھا لیکن اُس روز وہ کالج نہیں آیا تھا۔ نجانے کیوں مجھے اُس عورت پر شبہ سا ہوا اور میں نے اُس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ میں دو دن تک اُس کی نگرانی کرتی رہی۔ اس دوران آنند نے بھی کم از کم تین مرتبہ اُس سے ملاقات کی تھی اور یہ ملاقاتیں نہایت پراسرار انداز میں جے پور سے باہر امبر کے پرانے محلات میں ہوئی تھیں۔ نجانے کیوں اُس عورت پر میرا شبہ بڑھتا گیا۔ میں نے سرسری سے انداز میں آنند سے اُس عورت کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی عورت کو نہیں جانتا۔ بقول اُس کے پچھلے کئی روز سے کسی عورت سے اُس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

میرا شبہ بڑھتا گیا۔ وہ عورت تین دن بعد غائب ہو گئی۔

ایک مہینے بعد وہ عورت مجھے دوبارہ نظر آ گئی۔ میں نے پھر اُس کی نگرانی شروع کر دی۔ اس مرتبہ وہ آنند سے ملنے کالج نہیں آئی۔ لیکن اگلے ہی روز میں نے آنند کو اُس کے ساتھ دیکھ لیا۔

وہ ایک غیر معروف سے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آنند کی عمر بائیس کے لگ بھگ تھی جبکہ وہ عورت چالیس کے قریب تھی۔ مجھے اُن دونوں کے اس طرح چھپ چھپ کر ملنے پر حیرت تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ چالیس کی ہونے کے باوجود وہ عورت بے حد حسین تھی لیکن حیرت تو مجھے آنند پر تھی۔ وہ تو جوان اور خوبصورت لڑکیوں کا دلدادہ تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کے چکر میں کس طرح پھنس گیا تھا؟

مجھے کچھ گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے اُن کی نگرانی جاری رکھی اور تیسرے روز اُن دونوں کا پیچھا کرتی ہوئی نردانی مارگ کے علاقے میں واقع ایک بنگلے تک پہنچ گئی۔ اُن کے آنے سے پہلے وہ بنگلہ مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن پھر روشنی نظر آنے لگی۔

میں کسی نہ کسی طرح دیوار پھاند کر اندر پہنچ گئی۔ میں دبے قدموں بنگلے کی عمارت کے ساتھ گھومتی ہوئی اُس کھڑکی کے سامنے پہنچ گئی جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ بیڈ رُوم تھا۔ اُس کمرے میں آتی ہی شیتاب نامی اُس عورت نے ساڑھی اُتار دی تھی۔ اُس کے جسم پر صرف مختصر سا بلاؤز اور پیٹی کوٹ تھا۔ آنند اُس کے سامنے کھڑا بھوکی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس عورت نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ آنند والہانہ انداز میں اُس سے لپٹ گیا اور وہ دونوں بیڈ پر گر گئے..... اور پھر وہاں جو کچھ ہوا میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ وہ شیطانی کھیل تھا جو بڑی گرمجوشی سے کھیلا جا رہا تھا۔ میں اگرچہ اُس وقت کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی تھی لیکن اپنے آپ میں عجیب سی سنسنی محسوس کر رہی تھی۔ میرے سینے میں انگارے بھر گئے تھے اور دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

پتہ نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی اور پھر باتوں کی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آ گئی۔ میں نے اُٹھ کر دوبارہ کھڑکی سے جھانکا تو اس مرتبہ ایک اور سنسنی خیز منظر دیکھنے کو ملا۔ وہ دونوں بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے بیچ سگریٹ کے پیکٹ کے برابر ایک ڈبیہ رکھی ہوئی تھی جس میں کئی بٹن لگے ہوئے تھے اور انٹینا کی طرح ایک تار باہر نکلی ہوئی تھی۔ شیتاب نامی وہ عورت آنند کو اُس ڈبیہ کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی اور آنند بار بار اس طرح سر ہلا رہا تھا جیسے وہ اُس کی بات سمجھ رہا ہو۔ پھر شیتاب اُٹھ کر الماری کے قریب چلی گئی۔ الماری کھول کر اُس نے ویلویٹ کے کور والی ڈبیہ نکال لی جو حجم میں پہلی ڈبیہ کے برابر تھی۔

''اور یہ ایک خوبصورت ٹائی پن ہے تمہارے پتا جی کے لئے۔'' شیتاب کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''تین دن بعد تمہارے پتا جی کی سالگرہ ہے اور تم جانتے ہو وہ اپنی سالگرہ ہمیشہ گھر والوں کے ساتھ مناتے ہیں۔ اس بار بھی وہ ایک دو دن کی چھٹی لے کر جیسلمیر سے یہاں ضرور آئیں گے۔ تم یہ ٹائی پن اُنہیں سالگرہ کے تحفے کے طور پر دو گے۔'' شیتاب نے ڈبیہ کھول کر وہ ٹائی پن آنند کو دکھائی اور اُسے ڈبیہ میں رکھ کر ڈبیہ آنند کے حوالے کر دی۔

اس کے بعد وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شیتاب نے آنند کو ایک بار پھر دوسری ڈبیہ کے

بارے میں سمجھایا جس میں انٹینا اور بٹن لگے ہوئے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کسی قسم کا ٹرانسمیٹر تھا۔

اور اس کے بعد پھر وہی شیطانی کھیل شروع ہو گیا جسے دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں تھی..... میں وہاں سے ہٹ گئی اور دبے قدموں چلتے ہوئے دیوار پھاند کر بنگلے سے باہر آ گئی۔ میرے دماغ میں اس وقت سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ شیتاب نے آنند کو وہ ٹرانسمیٹر کیوں دیا تھا؟ اور اُس کے پتا جی کے لئے ٹائی پن کیوں دی تھی؟

دفعتہً میرے دماغ میں دھماکہ سا ہوا۔ آنند کے پتا جی فوج میں کرنل تھے اور جیسلمیر چھاؤنی میں ڈیوٹی دے رہے تھے۔ میں نے کچھ جاسوسی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں اور بعض فلموں میں بھی ایسی چیزیں دیکھی تھیں اور اب مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر یقین ہو گیا کہ یہ بھی کوئی جاسوسی ہی کا چکر ہے۔ وہ شیتاب نامی عورت دشمن کی ایجنٹ تھی اور اُس نے آنند کو بھی اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ آنند کے پتا جی فوج میں کرنل تھے اور جیسلمیر چھاؤنی میں تعینات تھے جہاں سے پاکستان کی سرحد پچاس ساٹھ میل سے زیادہ نہیں۔

میں وہ رات سو نہیں سکی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ اگر میں یہ بات پولیس کو بتاتی تو کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ پولیس کا کام کرنے کا طریقہ کار کچھ ایسا ہے کہ وہ کام کم اور شور شرابا زیادہ کرتے ہیں۔ وہ شیتاب کو پکڑ تو لیتے لیکن گھوس لے کر چھوڑ دیتے۔ دوسرے دن شیتاب پھر غائب ہو گئی۔ اُس بنگلے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اگلے روز آنند کالج نہیں آیا۔

سالگرہ والے دن اُس کے پتا جی بھی جے پور پہنچ گئے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے ذہن میں گوپال کا خیال اُبھرا۔ وہ نیا نیا فوج میں گیا تھا اور ان دنوں اکیڈمی میں تھا۔ اُس سے رابطہ کرنا مشکل تھا۔ مجھے اپنے ایک اور رشتے دار کا خیال آ گیا وہ بھی فوج میں آفیسر تھا۔ میں نے فون پر اُس سے بات کی تو وہ اُسی روز جیسلمیر سے جے پور پہنچ گیا۔

اُسی روز بڑی رازداری سے آنند کو حراست میں لے لیا گیا اور اُس کے پتا جی کو تحفے میں دی جانے والی ٹائی پن بھی قبضے میں کر لی گئی۔ اس ٹائی پن کے اندر ایک بہت ننھا سا اور بہت طاقتور ٹرانسمیٹر پوشیدہ تھا۔ اُس ٹرانسمیٹر کے ذریعے دشمن ہمارے فوجی آفیسروں کی باتیں سنتے رہتے اور سرحد پر انڈین فوج کی سرگرمیوں سے آگاہ رہتے۔

آنند کو اس رازداری سے حراست میں لیا گیا تھا کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چل سکا۔ اُس کے قبضے سے وہ ٹرانسمیٹر بھی برآمد کر لیا گیا جو شیتاب نے اُسے دیا تھا۔ پوچھ گچھ کے دوران آنند نے بتایا کہ شیتاب سے اُس کی ملاقات چند مہینے پہلے ہی ہوئی تھی۔ اُس نے اُسے اپنے حسن کے جال میں پھنسا لیا اور پیسوں کا لالچ بھی دیا تھا۔ یہ ٹرانسمیٹر اُسے اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ اپنے پتا جی سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے میں اُسے آگاہ کرتا رہے۔ آنند نے شیتاب کے بارے میں بتایا کہ وہ دہلی کی رہنے والی ہے۔ اُس کے بتائے ہوئے پتے پر دہلی میں چھاپہ

مارا گیا لیکن شیتاب کو شاید آنند کی گرفتاری کی خبر مل چکی تھی۔ وہ روپوش ہو گئی اور اُس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔'' سیتا خاموش ہو گئی۔ چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر بولی۔

''اس واقعہ کے چند روز بعد دو آدمیوں نے مجھ سے رابطہ کیا۔ وہ انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کے آفیسر تھے۔ وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گئے جہاں دو اور بڑے آفیسروں سے میری ملاقات کرائی گئی۔ اُن میں ایک عورت بھی تھی۔ ''را'' کو پتہ چل گیا تھا کہ میری وجہ سے انڈین فوج کے خلاف ایک بڑی سازش ناکام ہو گئی تھی۔ اُن کے خیال میں میرے اندر وہ تمام تر صلاحیتیں موجود تھیں جو ''را'' کے ایک ایجنٹ میں ہونی چاہئے تھیں۔ انہوں نے مجھے ایجنسی کے لئے کام کی پیشکش کی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ میری تعلیم کا حرج نہیں ہو گا۔ جب تک میں تعلیم سے فارغ نہیں ہو جاتی میری تربیت کا سیشن جاری رہے گا۔ اور تعلیم سے فارغ ہونے تک میں مکمل طور پر تربیت حاصل کر چکی ہوں گی۔

''را'' کے بارے میں، میں بہت کچھ سن چکی تھی۔ ان کے ایجنٹ نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے یہ پیشکش قبول کر لی اور پھر رفتہ رفتہ مجھ پر بہت سے انکشافات ہوتے چلے گئے۔ اسرائیلی ''موساد'' کو دنیا کی بہترین انٹیلی جنس سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ''را'' اُس کے بھی کان کاٹنے لگی ہے۔ پاکستان اور کشمیر کے حوالے سے ''را'' کی پالیسی بہت مختلف ہے۔ اسرائیلی ''موساد'' اس سلسلے میں ''را'' سے بھرپور تعاون کر رہی ہے۔ نہ صرف ''را'' کے ایجنٹوں کو اسرائیل میں تربیت دی جاتی ہے بلکہ ''موساد'' کے ایجنٹ یہاں بھی ''را'' کے ایجنٹوں کو تربیت دیتے ہیں۔ پاکستان میں تخریب کاری اور دہشت گردی کے لئے راجستھان میں کئی ایسے کیمپ قائم ہیں جہاں دہشت گردوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ پاکستان سے ان نوجوانوں کو یہاں لایا جاتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنے لوگوں اور اپنی حکومت سے ناراض ہیں۔ ایسے لوگ بڑی آسانی سے لالچ میں آ کر ''را'' کے ایجنٹوں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ یہاں ان کی برین واشنگ کر کے ان کے دل و دماغ میں پاکستان کے خلاف شدید نفرت بھر دی جاتی ہے اور ''موساد'' اور ''را'' کے ایجنٹ انہیں تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت دیتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں پاکستان بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ بیدردی سے اپنے ہی لوگوں پر موت برساتے ہیں۔ بموں کے دھماکے کرتے ہیں اور تباہی و بربادی پھیلاتے ہیں۔ بہرحال...''

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اُس نے اپنی ایک ٹانگ سمیٹ کر گھٹنا اُوپر اُٹھا لیا تھا۔ اس طرح اُس کی ٹانگ پر سے کپڑا ہٹ گیا اور میں نے جلدی سے اپنا رُخ بدل لیا۔

''تعلیم ختم ہونے کے بعد مجھے ''را'' کی طرف سے باقاعدہ اسائنمنٹ دیئے جانے لگے۔ میں سرحد پار کر کے دو مرتبہ کراچی بھی جا چکی ہوں۔ ادھر میرے گھر والوں کو بالکل پتہ نہیں تھا کہ میں کن سرگرمیوں میں مصروف ہوں۔ میں نے تو انہیں یہ بھی خبر نہیں ہونے دی تھی کہ میں ''را'' کے لئے کام کر رہی ہوں۔ اسی دوران گوپال سنگھ میرا کزن سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے

فوج میں اپنی ڈیوٹی سنبھال چکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اُسے کشمیر بھیج دیا گیا جہاں وہ لیفٹیننٹ بن گیا۔ میں نے اُن دنوں ایجوکیشن کا ایک اسپیشل کورس شروع کر دیا تھا۔ میرا ایک مسلمان دوست سلیم اس سلسلے میں میری مدد کر رہا تھا۔ گوپال کشمیر سے واپس آ چکا تھا۔ ایک روز وہ ہمارے گھر آیا تو میں اکیلی تھی۔ اُس کے دل میں ہوس جاگ اُٹھی اور اُس نے مجھے دبوچ لیا۔ اُس نے مجھے روند ڈالا اور پھر سلیم بھی آ گیا۔ گوپال کو اُس نے برا بھلا کہا تو گوپال نے اُلٹا اُسی کو پھنسا دیا۔ پہلے خود اُسے مارا پیٹا پھر پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس نے سلیم پر اتنا تشدد کیا کہ وہ ختم ہو گیا۔

میں اگر چاہتی تو اپنے ''را'' کے تعلقات بروئے کار لا کر گوپال کو نہ صرف فوج سے نکلوا دیتی بلکہ اُسے سڑنے کے لئے زندگی بھر کے لئے جیل میں بھی ڈلوا دیتی لیکن میں خود اُس سے انتقام لینا چاہتی تھی اور موقع کی تلاش میں رہنے لگی۔ انہی دنوں کشمیر کے حوالے سے تمہارا اور انگوری کا بڑا شہرہ تھا۔ تم دونوں کشمیر میں بھارتی فوج کو پے در پے ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے تھے اور تم لوگوں کی زندہ یا مُردہ گرفتاری کے لئے فوج اور ہند سرکار کی طرف سے کروڑوں روپے کے انعامات مقرر کئے گئے۔

بالآخر تم دونوں کی گرفتاری کے لئے ایک نئی پالیسی اختیار کی گئی۔ مجھے کشمیر اور تمہارے بارے میں بریفنگ دے کر کشمیر بھیج دیا گیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ میں مجاہدہ کے روپ میں کسی نہ کسی طرح تم تک رسائی حاصل کروں اور تمہیں کسی چکر میں پھنسا کر وہاں سے نکال لاؤں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ کشمیری مسلمان کشمیر میں آباد ہندوؤں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہے ہیں۔ وہ ہندوؤں کو وادی سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ اُن کی بستیوں کو آگ لگائی جا رہی ہے، اُن کی املاک پر قبضہ کیا جا رہا ہے اور اُن کا قتل عام ہو رہا ہے۔ ہندو اپنا سب کچھ چھوڑ کر وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

پولیس ہندوؤں کی جان و مال کی حفاظت کرنے میں ناکام ہو گئی تو اُن کی رکھشا کے لئے فوج بھیجی گئی۔ کشمیری مسلمان کھلی بغاوت پر اُتر آئے۔ اُنہوں نے فوجی کیمپوں اور قافلوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اس سلسلے میں اُنہیں پاکستان کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ پاکستان اُنہیں دھڑا دھڑ اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔

○○○

گوپال سنگھ نے جے پور میں میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس سے مجھے اُس سے نفرت ہو گئی تھی اور پھر وہ مزے لے لے کر بتاتا رہا تھا کہ وہ کشمیر میں کس طرح مسلمان عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا رہا ہے۔ اور جب میں نے کشمیر میں اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا تو بھارتی فوجیوں سے میری نفرت دو چند ہو گئی۔ لیکن..... میں ایک مشن پر نکلی ہوئی تھی۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ تم تک ضرور پہنچوں گی۔

میں ڈوڈا میں اپنے ماما کے گاؤں میں تھی تو انگوری کی ہلاکت کی خبر ملی اور یہ بھی پتہ چلا کہ تم زخمی ہو کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ اس سے صرف ایک روز پہلے میں نے چاچا قربان علی کے ساتھ ڈوڈا میں ایک مسلمان مجاہد سے ملاقات کر کے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں اس کی تحریک میں شامل ہونا چاہتی ہوں لیکن اُسے پتہ چل گیا تھا کہ میں ہندو ہوں۔ میں نے بھی اپنا دھرم نہیں چھپایا تھا۔ اُس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ کوئی ہندو کشمیری مسلمانوں اور اُن کی تحریک کا کتنا ہی ہمدرد کیوں نہ ہو اُسے تحریک میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

اور پھر اگلے روز تم مجھے بے ہوشی کی حالت میں مل گئے۔ تم شدید زخمی تھے۔ میں تمہیں غار میں لے گئی۔ میرے دل میں ایک اُمید پیدا ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں تمہارا علاج کراؤں گی، تمہاری سیوا کروں گی اور اس طرح شاید میں تمہارے توسط سے تمہاری پارٹی اور پھر شمروز تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ تم ہی شمروز ہو تو مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنے ماما کی مدد سے تمہیں وہاں سے نکال لاؤں گی لیکن..... نجانے کیا بات تھی کہ تمہارے خلاف کوئی قدم اُٹھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ چند روز بعد ہی میرے اندر یہ احساس جاگ اُٹھا کہ میں تو تم سے پریم کرنے لگی ہوں۔ پریم کی طاقت کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت تسلیم کیا گیا ہے۔ اسے کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ یہ پریم ایسا جذبہ ہے جو نہ تو دین دھرم کو دیکھتا ہے نہ ہی دوست اور دشمن میں تفریق کرتا ہے۔

اور پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں وہاں سے نکالوں گی تو ضرور لیکن اس طرح نہیں جس طرح منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اور پھر اُس روز جب چشمے کے قریب مجھے دو ہندو فوجیوں نے گھیر لیا، ہندو فوجیوں سے مجھے اور بھی نفرت ہو گئی۔ اور جس طرح تم نے اپنی جان پر کھیل کر اُن دو بھیڑیوں سے میری عزت اور جان بچائی اس سے میرے من میں تمہاری عزت بڑھ گئی۔ قدرت بھی میرا ساتھ دیتی رہی۔ ایسے حالات پیدا ہوتے رہے کہ ہم دونوں وہاں سے دُور ہٹتے

چلے گئے اور بالآخر میں تمہیں یہاں تک لانے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن میرا ارادہ ہرگز یہ نہیں تھا اور نہ ہے کہ تمہیں سرکار کے حوالے کروں گی۔''

''لیکن.....'' میں نے سیتا کے خاموش ہونے پر اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم تو کیپٹن گوپال کو یہاں لے کر آئی تھیں اور بڑے فخر سے اُسے بتایا تھا کہ کشمیر کے سب سے خطرناک اُگروادی کو پکڑ کر لے آئی ہو۔''

''ایسا کرنا میری مجبوری تھی۔'' سیتا مسکرائی۔ ''کیپٹن گوپال کو کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ میں ''را'' کے لئے کام کر رہی ہوں اور کسی اہم مشن پر کشمیر گئی ہوئی ہوں۔ اور پھر میں نے اُس سے اپنا انتقام بھی لینا تھا۔ میں اپنی اس توہین کو بھولی نہیں تھی۔ میرا سینہ اب بھی انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اُسے کوئی چارا ڈالنا ضروری تھا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیپٹن گوپال اُس وقت آفیسرز میس میں تھا۔ میں نے اُسے پیغام بھیج کر الگ بلوالیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونک گیا۔ کئی مہینوں بعد ہمارا سامنا ہوا تھا۔ اُس کے سینے میں ایک بار پھر ہوس جاگ اُٹھی تھی۔ ہم آفیسرز میس کے ایک الگ کمرے میں بیٹھے رہے۔ وہ میرے ساتھ اپنی شام رنگین بنانا چاہتا تھا۔ وہ جلد سے جلد میرے کپڑے اُتارنا چاہتا تھا اور جب میں نے اُسے تمہارے بارے میں بتایا تو وہ اُچھل پڑا۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ میں اس مشن پر کشمیر گئی ہوئی تھی۔ اگر میں شمروز کو خاموشی سے ''را'' کے حوالے کر دُوں تو کچھ مزہ نہیں آئے گا۔ میں نے اُسے لالچ دیا کہ اگر شمروز کو اُس کے توسط سے سرکار کے حوالے کیا جائے تو اُسے پرموشن بھی مل سکتی ہے۔ اس طرح وہ آسانی سے میری چال میں آ گیا اور یہاں آ کر جو کچھ بھی ہوا وہ سب تم نے دیکھ لیا۔''

''یہ ناٹک رچانے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے اُس کی طرف دیکھا۔

''ناٹک تو یہ خود بخود بن گیا۔ میں تو اسے صرف پھانس کر یہاں لانا چاہتی تھی۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ایک بات اور.....'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''ہنومان گڑھ میں وہ آدمی کون تھا جس کی لاش.....''

''اوہ.....'' سیتا نے میری بات کاٹ دی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''تم ابھی تک اُس واقعہ کو بھولے نہیں ہو؟''

''میرے ذہن میں ایک خلش ہے.....'' میں نے کہا۔ ''وہ آدمی کون تھا اور تم اُس رات کمرے سے نکل کر کہاں گئی تھیں؟''

''اوہ.....'' اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تو تمہیں معلوم تھا کہ میں رات کو کمرے سے باہر گئی تھی۔''

''میری آنکھ کھل گئی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم کمرے میں نہیں تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تم کتنی دیر پہلے باہر گئی تھیں؟ لیکن میرے جاگ جانے کے دس بارہ منٹ بعد نہایت خاموشی سے واپس آئی تھیں۔ اور پھر صبح یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ گیسٹ ہاؤس میں ایک قتل ہوگیا ہے اور مقتول کا گیسٹ ہاؤس سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''وہ کون تھا اور تم نے اُسے قتل کیوں کیا تھا؟''

''تو گویا تمہیں اب بھی شبہ ہے کہ اس آدمی کو میں نے قتل کیا تھا؟'' سیتا بولی۔ اُس کے ہونٹوں پر بدستور مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''شبہ نہیں یقین ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''صبح میں نے کمرے کے قالین پر سرخ مٹی دیکھی تھی جو تمہاری چپلوں کے ساتھ اندر آئی تھی۔ ہم کھانے کے لئے جب سامنے والے لان میں گئے تھے تو تم نے جوگرز پہنے ہوئے تھے۔ اور پھر اس طرف کہیں مٹی نہیں تھی۔ گیسٹ ہاؤس کے پچھلی طرف کچی زمین ہے اور مٹی سرخ ہے۔ اور کمرے میں وہ سرخ مٹی تمہاری چپلوں کے ساتھ آئی تھی۔''

''اوہ..... بہت گہرا مشاہدہ ہے تمہارا۔'' سیتا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''ہاں..... یہی کہہ لو!'' میں نے کہا۔ ''وہ کون تھا اور تم نے اُسے قتل کیوں کیا تھا؟''

''وہ ''را'' کا ایجنٹ گوتم تھا۔'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتا تھا اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں کس مشن پر کشمیر گئی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اُسے شبہ تھا کہ میرے ساتھ شمروز کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ اُس نے ویٹر کے ذریعے پیغام بھیج کر مجھے الگ بلا لیا۔ اُس وقت میں بھی اُلجھن کا شکار تھی کہ وہ کون ہے جس نے مجھے اس قدر رازداری سے الگ بلایا ہے۔ لیکن جب میں پودوں کے دوسری طرف پہنچی تو گوتم کو دیکھ کر پریشان سی ہوگئی۔ وہ بڑا حرامی آدمی تھا۔ اُس کے ذریعے ہماری آمد کی اطلاع ہم سے پہلے جیسلمیر اور جے پور پہنچ سکتی تھی اور ممکن تھا کہ ہمیں راستے ہی میں گھیر لیا جاتا یا ہماری نگرانی شروع ہو جاتی۔ اُسے شبہ تھا کہ میرے ساتھ شمروز ہے۔ لیکن میں نے اُسے بتایا کہ شمروز کو ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا ہے۔ گوتم مجھ سے کچھ طلب کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اُس کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ رات ہی رات میں شمروز کو تلاش کر کے موت کے گھاٹ اُتار دے گا اور میری ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ میں نے اُسے رات تین بجے گیسٹ ہاؤس کے پیچھے ایک ہٹ میں بلا لیا اور گلا گھونٹ کر اُسے ہلاک کر دیا۔ اگر وہ بچ کر نکل جاتا تو ہمارے لئے بہت سی پریشانیاں ہوسکتی تھیں۔ اور میں نہیں چاہتی کہ فی الحال تمہارے لئے مزید پریشانیاں پیدا ہوں۔''

''تم یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہو؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے لئے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ پریم میں

بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اور میں اس پریم شکتی پر وشواش رکھتی ہوں۔''

وہ چند لمحے مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بیڈ سے اُتر کر وہ میرے سامنے زمین پر بیٹھ گئی۔ اُس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور چہرہ اُٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''تم بھی..... ایک بار..... صرف ایک بار کہہ دو کہ مجھ سے پریم کرتے ہو۔ بس ایک بار کہہ دو.....''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا حویلی کا پھاٹک زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا.....

پھاٹک بدستور دھڑ دھڑایا جا رہا تھا اور رات کے سناٹے میں یہ آواز دُور تک پھیل رہی تھی۔

''کون ہوسکتا ہے؟'' سیتا نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے وحشت سی جھلکنے لگی تھی۔

''تم جانو.....'' میں نے کندھے اُچکا دیئے۔ ''میرا تو یہاں کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ تمہارا کوئی چاہنے والا ہو تو.....''

''یہ مذاق کا وقت نہیں ہے.....'' سیتا نے میری بات کاٹ دی۔ ''رات کو اس سمے کون ہو سکتا ہے؟''

''پولیس بھی ہوسکتی ہے۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ میں اس قدر پُرسکون کیوں تھا؟ حالانکہ اس قسم کی صورتحال میں تو مجھے بدحواس ہو جانا چاہئے تھا۔ ''دو گولیاں تم نے اس حویلی کے ہال کمرے میں چلائی تھیں۔ کیپٹن گوپال یہاں ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلاتا بھی رہا تھا۔ ممکن ہے ان گولیوں اور کیپٹن گوپال کی چیخوں کی آواز اس حویلی سے باہر نہ گئی ہو۔ لیکن بھاگتے ہوئے کیپٹن گوپال پر گیٹ کے قریب تم نے تین گولیاں چلائی تھیں۔ اُن کی آواز سناٹے میں دُور تک گونجی تھی۔ ہوسکتا ہے پولیس اسٹیشن قریب ہی ہو اور آواز تھانے تک پہنچی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گولیوں اور کیپٹن گوپال کی چیخوں کی آواز قریب کی کسی حویلی میں سن لی گئی ہو اور اُنہوں نے پولیس اسٹیشن فون کر دیا ہو۔''

''یہ ممکن نہیں۔'' سیتا بولی۔ ''گولیوں کی آواز بازگشت پیدا کرتی ہوئی فضا میں پھیلی تھی۔ اس طرح یہ اندازہ لگانا دُشوار ہوتا ہے کہ گولی کس جگہ سے چلائی گئی تھی۔''

''اگر پولیس نہیں تو کیپٹن گوپال کے دوست ہوں گے۔'' میں نے کہا۔ ''تم آفیسرز میس سے گوپال کو بلا کر لائی تھیں۔ وہاں تمہیں کسی اور نے بھی دیکھا ہوگا۔ کیپٹن گوپال کے واپس نہ پہنچنے پر اُنہیں تشویش ہوئی ہوگی۔ ہوسکتا ہے وہ اُس کے بارے میں پوچھنے کے لئے آئے ہوں۔''

''میں وہاں صرف ایک اردلی کے سامنے آئی تھی جسے پیغام دے کر میں نے کیپٹن گوپال کو الگ بلا لیا تھا۔ کسی اور کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ بہرحال.....'' وہ اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''صورتحال مخدوش بھی ہوسکتی ہے۔ پر تمہیں چنتا کرنے کی

ضرورت نہیں۔ پرنتو احتیاط پھر بھی ضروری ہے۔ میں باہر جا رہی ہوں۔ تم ایسی جگہ کھڑے رہنا جہاں سے کسی ہنگامی صورتحال پر قابو پایا جا سکے۔''

ہم دونوں بیڈ رُوم سے باہر آ گئے۔ میں نے کیپٹن گوپال والا وہ پستول اُٹھا لیا جو سیتا نے صاف کر کے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ اس میں سے پانچ گولیاں وہ چلا چکی تھی۔ دو تین گولیاں ہی بچی ہوں گی۔ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ خالی پستول بھی کسی پر دہشت طاری کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

بیڈ رُوم میں جانے سے پہلے سیتا نے بڑے ہال کی بتی بجھا دی تھی۔ ہال میں اندھیرا تھا۔ سیتا میرا ہاتھ پکڑے محتاط انداز میں چلتی رہی۔ مجھے بھی اندازہ تھا کہ ہال میں کون سی چیز کہاں رکھی ہے لیکن اس کے باوجود میں ایک کرسی سے ٹکرا گیا۔ گھٹنے پر چوٹ لگی اور میں بے اختیار کراہ اُٹھا۔

''خیال سے.....'' سیتا نے میرا ہاتھ دبایا۔ ''بتی جلا دُوں؟''

''نہیں..... رہنے دو!'' میں نے گھٹنا سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اسی دوران گیٹ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا گیا۔ انداز اب بھی وہی جارحانہ تھا۔ لگتا تھا جیسے کوئی عجلت میں ہو۔ ہم دونوں ایک بار پھر آگے چل پڑے۔ برآمدے والے دروازے کے قریب میں نے سیتا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور چند گز دُور کھڑکی کے قریب پہنچ گیا جس کے سامنے گہرے نیلے رنگ کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔

میں نے پردے کا ایک کونا سرکا کر باہر جھانکا۔ برآمدے میں غالباً ساٹھ واٹ کا بلب جل رہا تھا۔ برآمدے کے اندر اور اس کے آس پاس تو اس بلب کی روشنی معقولیت کی حد تک ٹھیک تھی لیکن اس سے آگے یہ روشنی بتدریج کمزور پڑتی چلی جا رہی تھی۔ تاہم گیٹ نظر آ رہا تھا۔

سیتا نے بولٹ گرا کر دروازہ کھول دیا اور باہر نکل گئی۔ وہ صرف ایک سیکنڈ کو برآمدے میں رُکی تھی۔ پھر سیڑھیاں اُتر کر تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی گیٹ کی طرف چلنے لگی کیونکہ اس دوران گیٹ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا گیا تھا۔

گیٹ کے قریب پہنچ کر سیتا رُک گئی۔ اُس نے پہلے جھری میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ چند لمحے شاید تذبذب کا شکار رہی، پھر اُس نے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول دیا۔

میں پستول ہاتھ میں لئے کھڑکی سے لگا کھڑا تھا اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو کوئی عملی قدم اُٹھانے میں ایک لمحہ کی تاخیر نہیں کروں گا۔ لیکن اگلے ہی لمحہ ایک لڑکی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر میری آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی۔ سیتا نے ایک لمحہ اُس سے کوئی بات کی، پھر دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھایا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی برآمدے کی طرف آنے لگی۔ برآمدے میں بلب کی روشنی میں اُس لڑکی کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ لیکن میں زیادہ دیر تک اُس کا جائزہ نہیں لے سکا تھا کیونکہ سیتا اُسے لے کر دروازے میں داخل ہو چکی تھی۔ اُس نے دروازہ بھی بڑی آہستگی سے بند کر کے بولٹ چڑھا دیا تھا۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اندھیرے میں اُس لڑکی کی تیز تیز سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اُس کی سانسوں کی آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا جیسے بہت دُور سے بھاگتی ہوئی آئی ہو اور شاید کسی بات پر خوفزدہ بھی ہو۔

''مہابیر!'' اندھیرے میں سیتا کی آواز اُبھری۔ ''میرے ساتھ ایک مہمان ہے۔ میں اُسے لے کر بیڈ رُوم میں جا رہی ہوں۔ تم بھی وہیں آ جاؤ۔''

ظاہر ہے سیتا نے یہ بات مجھ سے ہی مخاطب ہو کر کہی تھی۔ وہ اُس لڑکی کے سامنے میرا اصل نام نہیں لینا چاہتی تھی اس لئے اُس نے مجھے مہابیر کے فرضی نام سے مخاطب کیا تھا۔

وہ دونوں غالباً دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی راہداری میں مُڑ گئی تھیں۔

اور جب میں نے بیڈ رُوم کے دروازے میں قدم رکھا تو وہ لڑکی عین میرے سامنے تھی۔ مجھے اور میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اُس لڑکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی..... خوف سے اُس کا چہرہ دُھواں ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئی تھیں۔

''اوہ!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''ڈرو نہیں..... مجھے اس طرح پستول ہاتھ میں لئے کمرے میں داخل نہیں ہونا چاہئے تھا۔'' میں نے آگے بڑھ کر پستول ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا اور مُڑ کر اُس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اور اب میری آنکھوں میں وحشت نمودار ہونے لگی تھی۔

وہ لڑکی اُس ہرنی کی طرح خوفزدہ تھی جو شکاریوں کے نرغے سے اپنی جان بچا کر بھاگی ہو۔ اُس کی عمر بمشکل سترہ سال رہی ہو گی۔ سرو قد، دُبلا پتلا بدن، چہرے کے نقوش نہایت جاذب، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تو واقعی کسی ہرنی سے مشابہ تھیں۔ اُس کی رنگت اگرچہ کسی قدر سانولی تھی لیکن اس میں بے پناہ کشش تھی۔ اُس کے بدن پر گھٹنوں سے اُوپر تک کا پیٹی کوٹ اور بلاؤز تھا۔ بلاؤز سامنے سے اور ایک کندھے سے پھٹا ہوا تھا۔ اُس کے نیم عریاں سینے پر اور دائیں بازو پر کھرونچوں کے نشان تھے۔ سر کے بال بھی اُلجھے ہوئے تھے۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ شاید وہ غنڈوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی اور کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگ نکلی تھی۔

مجھے دیکھ کر اُس نے دونوں ہاتھ سینے سے لپیٹ لئے۔ شاید وہ اپنی برہنگی چھپانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہو رہی تھی۔ اُس کا یہ پھٹا ہوا اور مختصر لباس دیکھ کر یہ بھی اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ساڑھی پہنے ہوئے تھی جو دھینگا مشتی کے دوران اُتر گئی تھی۔ بلاؤز بھی بہت مختصر تھا۔ پیٹ تو ناف تک برہنہ تھا ہی، بالائی جسم کی برہنگی چھپانے کی کوشش میں سینے کے اُبھار اُوپر کی طرف کچھ اور نمایاں ہو گئے تھے۔

وہ لڑکی وحشت زدہ سی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی سیتا کو دیکھ رہی تھی۔ سیتا نے پلنگ پر پڑی ہوئی چادر اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی جسے اُس نے جلدی سے اپنے جسم پر لپیٹ لیا۔

''بیٹھ جاؤ!'' سیتا نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھے بچا لو دیدی.....!'' لڑکی کی آواز خوف سے کپکپا رہی تھی۔ ''وہ لوگن میرے کو مار دیویں گے۔ میرے شریر کے ٹکڑے کر دیویں گے۔''

''ڈرو نہیں.....!'' سیتا نے کہا۔ ''یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ کوئی ہماری اجازت کے بغیر اس حویلی میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آرام سے بیٹھ جاؤ!''

وہ لڑکی جھجکتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چادر کے اندر اُس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ خوف سے اُس کے ہونٹ بھی سفید پڑ گئے تھے۔ وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ سیتا اُٹھ کر بیڈ کے دوسری طرف چلی گئی جہاں سائیڈ ٹیبل پر پانی سے لبریز جگ اور اس کے قریب ہی ایک گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ اُس نے گلاس میں پانی انڈیلا اور لڑکی کے قریب آ گئی۔

''لو..... جل پی لو! تمہیں پیاس لگ رہی ہو گی۔''

لڑکی نے ایک ہاتھ چادر میں سے نکال کر گلاس کی طرف بڑھایا۔ لیکن اُس کا ہاتھ راستے ہی میں رُک گیا اور وہ بے بسی کی سی نظروں سے سیتا کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا.....؟'' سیتا نے پوچھا۔

''مم..... میں..... میں بچ جاتی کی..... ہوں دیدی.....'' وہ ہکلائی۔

''اوہ.....!'' سیتا بولی۔ ''تو اس لئے تم گلاس نہیں پکڑ رہیں۔ لیکن تم تو ہماری کرسی پر بیٹھی ہو۔ ہماری چادر بھی تم نے اوڑھ رکھی ہے۔''

لڑکی ایک جھٹکے سے کرسی سے اُتر گئی۔ اُس نے چادر جسم سے ہٹانا چاہی مگر رُک گئی۔ اُس کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے اُبھر آئے تھے۔

''ڈرو نہیں.....!'' سیتا نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں جاتوں کی چھوٹائی بڑھائی کو نہیں مانتی۔ آرام سے بیٹھ جاؤ اور جل پیو۔ پیاس سے تمہارا حلق خشک ہو رہا ہے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ لیکن تم اس لئے یہ جل نہیں پی رہی ہو کہ تمہارے چھونے سے یہ گلاس نشٹ ہو جائے گا۔ لو! جل پیو اور بچ جاتی کا خیال دل سے نکال دو۔''

لڑکی نے عجیب سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی اور چادر میں سے ہاتھ نکال کر گلاس لے لیا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی حلق میں اُنڈیل لیا۔

سیتا نے اُس کے ہاتھ سے گلاس لے کر اُس میں کچھ اور پانی اُنڈیلا اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ واقعی ذات پات پر یقین نہیں رکھتی، اُس نے پانی پی لیا اور گلاس میز پر رکھ کر دوبارہ لڑکی کے قریب آ گئی۔ لڑکی اب بھی عجیب سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' سیتا نے اُس کے سامنے بیڈ پر پیر لٹکا کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کلپنا..... مارو نام کلپنا ہے دیدی!'' لڑکی نے جواب دیا۔

سیتا کچھ اور کہنا ہی چاہتی تھی کہ باہر کا گیٹ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا جانے لگا..... لڑکی اُچھل

کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کا چہرہ ایک بار پھر خوف سے دُھواں ہوگیا۔ اس خوف سے چادر کا ایک کونا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ تیز سانس لینے سے اُس کا گداز سینہ غبارے کی طرح پھول پچک رہا تھا۔

''ڈرو نہیں... تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' سیتا اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''وہ جو کوئی بھی ہیں اگر بری نیت سے اس حویلی کے دروازے پر آئے ہیں تو اپنے پیروں پر واپس نہیں جائیں گے۔ تم آرام سے یہاں بیٹھی رہو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ پرنتو باہر آنے کی کوشش مت کرنا۔''

سیتا نے مجھے اشارہ کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے پستول نکالا اور سیتا کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گیا۔ اس مرتبہ سیتا نے ہال کی ایک بتی جلالی تھی اور برآمدے والا دروازہ کھول رہی تھی۔ حویلی کا گیٹ اب بھی دھڑ دھڑایا جا رہا تھا اور اس مرتبہ اس کے ساتھ ہی کال بیل کی آواز بھی پوری شدت سے گونج اُٹھی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کم از کم دو آدمی تھے جن میں سے ایک گیٹ کو پیٹ رہا تھا اور دوسرے نے کال بیل کے بٹن پر اُنگلی رکھ دی تھی۔

''کون ہے.....؟'' سیتا گیٹ کے قریب پہنچ کر چیخی۔ میں سائیڈ میں ہوگیا اور سیتا نے بے دھڑک ذیلی دروازہ کھول دیا۔ ''کون ہو تم لوگ..... کیا پاگل ہوگئے ہو جو اس طرح آدھی رات کو گیٹ پیٹ رہے ہو؟''

''معاف کرنا دیوی جی!'' باہر سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''ہماری چھوکری گھر سے بھاگ گئی ہے۔ ہم اُسے تلاش کر رہے ہیں۔ یہاں کوئی ناری تو نہیں آئی تھوڑی دیر پہلے؟''

''چھوکری گھر سے بھاگ گئی ہے تو جا کر پولیس میں رپورٹ کرو۔ اس طرح لوگوں کو پریشان کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے تمہیں۔'' سیتا نے غصے سے کہا۔

''اے..... اے.....'' ایک اور غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''جوبان کو قابو میں رکھ..... تم جانت ناہیں ہو کس سے بات کرت ہو۔ ہمار پرشن کا جواب دیو! یہاں کوئی چھوکری تو ناہیں آوت رہی ہے؟''

''میرا جوبان قابو میں ہے..... یہاں کوئی چھوکری نہیں آئی۔ جاؤ یہاں سے۔'' سیتا نے جواب دیا اور دروازہ بند کرنا چاہا تو باہر سے کسی نے دروازے میں پیر پھنسا دیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا جوگر پہنے ہوئے تھا۔

''ہمیں تمہار جوبان پر وشواس ناہی ہوت ہے۔ ہم تلاسی لیواں گے۔'' اُس شخص نے ایک مرتبہ پھر غراتے ہوئے کہا اور دروازے کو دھکا دینے لگا۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ آدمی اندر گھس آیا۔ برآمدے سے آنے والی مدھم سی روشنی میں اُس کا جائزہ بخوبی لیا جا سکتا تھا۔ اُس کی صورت دیکھ کر اُسے بلا تکلف ایک چھٹا ہوا بدمعاش کہا جا سکتا تھا۔ اور وہ تھا بھی چھٹا ہوا بدمعاش۔ وہ

درمیانے قد اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ اُس نے جینز اور بنیان پہن رکھی تھی۔ بازوؤں کے اُبھرے ہوئے مسلز صاف نظر آ رہے تھے۔ دو تین دن کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ سر کے بال لمبے تھے جنہیں چٹیا کی طرح باندھا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اُس نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے پشت سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ تیزی سے میری طرف مُڑا۔

''کیا بات ہے مہاشے؟ بڑے تپے ہوئے لگتے ہو۔ چھوکری بھاگ گئی ہے اس لئے؟'' میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ اُچھل پڑا۔ ''اے.....!'' وہ غرایا۔ ''جانت نہ ہو کس سے بات کرت ہو؟ گنگو کہت ہیں میرے کو..... گنگو دادا۔''

''گنگو دادا.....'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''یہاں سے جانے کا کیا لو گے؟'' میں نے پستول والا ہاتھ سامنے کر دیا۔

''او بھایا.....'' وہ بدحواس سا ہوگیا۔ ''اس بندوکڑی کو اپنے بوجھے میں رکھ! ہم لڑت واسطے ناہیں آیا ہوں۔ چھوکری کو ڈھونڈھت ہوں بھایا۔''

''کوئی چھوکری یہاں نہیں آئی..... چل بھاگ!'' میں نے پستول سے اشارہ کیا۔

''نراج مت ہو بھایا!'' گنگو دادا دونوں ہاتھ سامنے جوڑتے ہوئے بولا۔ ''وہ چھوکری ہمارا سب کچھ لے گیوت رے..... ہم تو اُس کو ڈھونڈھت ہوں۔ تو نراج نہ ہو بھایا! ہم جاتا ہوں۔ ترت جاتا ہوں۔''

اور وہ واقعی ترت یعنی فوراً ہی باہر نکل گیا۔ مجھے اُس بدمعاش سے اس شرافت کی توقع نہیں تھی۔ سیتا نے گیٹ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا اور ہم دونوں واپس آ گئے۔ سیتا نے برآمدے والا دروازہ بند کر کے لاک کیا اور اُوپر کا بولٹ بھی چڑھا دیا۔ میں نے خود باقی دروازے بھی چیک کئے اور ہم بیڈ رُوم میں آ گئے۔ وہ لڑکی کلپنا کمرے میں موجود نہیں تھی..... میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ سیتا بھی پریشان ہوگئی۔

''اوئے! کہاں گئی وہ..... تلاش کرو اُسے کہیں باہر نکل گئی تو ان بدمعاشوں کے ہاتھوں ماری جائے گی۔''

میرا خیال تھا کہ شاید موقع پا کر کلپنا برآمدے والے دروازے سے باہر نکل گئی تھی۔ شاید درختوں میں کہیں چھپی ہوئی ہو۔ میں کمرے سے نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آواز سن کر ہم دونوں اُچھل پڑے۔

''میں یہاں ہوں دیدی..... کھاٹ کے نیچے۔''

یہ آواز بیڈ کے نیچے سے آئی تھی۔ میں نے جھک کر دیکھا تو بے اختیار مسکرا دیا۔ کلپنا پلنگ کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔

''وہ لوگ چلے گئے..... باہر آ جاؤ! اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ کہنیوں کے بل رینگتی ہوئی پلنگ کے نیچے سے نکل آئی۔ ایسا کرتے ہوئے چادر اُس کے جسم سے الگ ہوگئی تھی۔ پلنگ کے نیچے سے نکل کر اُس نے اپنے آپ کو ذرا سا اُوپر اُٹھایا تو میری نظریں اُس کے پھٹے ہوئے بلاؤز کے اندر رینگ گئیں۔ میرا سانس بے ربط ہونے لگا۔ خاکستری گھاٹیاں بڑا خوفناک منظر پیش کر رہی تھیں۔

وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اُس نے اپنی برہنگی چھپانے کے لئے دونوں بازو ایک بار پھر سینے پر لپیٹ لئے۔ میں نے پلنگ کے نیچے پڑی ہوئی چادر اُٹھا کر اُس کی طرف اُچھال دی۔ اُس نے جلدی سے چادر اوڑھ لی۔

''وہ لوگ چلے گئے..... اب تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' سیتا نے کہا۔ ''تمہیں اس وقت کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جس سے تمہارے حواس قابو میں آسکیں۔ چائے پیو گی؟''

لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم یہاں بیٹھو..... میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' سیتا نے کہا۔ ''اور ہاں..... میں تمہیں دوسرے کپڑے دے دیتی ہوں، پہن لینا۔'' اُس نے وارڈ روب سے ہینگر پر ٹنگی ہوئی ایک ساڑھی نکال کر پلنگ پر ڈال دی۔ ساڑھی کے ساتھ بلاؤز اور پیٹی کوٹ بھی تھا۔

سیتا کمرے سے نکلی تو میں بھی اُس کے ساتھ ہی آ گیا۔ ظاہر ہے میرے وہاں کھڑے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔

کچن میں آ کر سیتا چائے بنانے لگی اور میں اُس کے قریب کھڑا اُسے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سیتا نے چائے صرف کلپنا کے لئے نہیں سب کے لئے بنائی تھی۔ میں تو اس وقت واقعی چائے کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ اُس لڑکی کے آنے سے پہلے جب ہم باتیں کر رہے تھے تو اُس وقت مجھے نیند کے جھونکے آنے لگے تھے۔ اُس خستہ حال لڑکی کو دیکھ کر میری نیند غائب ہو گئی تھی اور گیٹ پر اُس بدمعاش سے نہایت مختصر سی ملاقات کے بعد تو نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اس وقت میں واقعی چائے جیسی چیز کی طلب محسوس کر رہا تھا۔

سیتا نے تینوں کپ ٹرے میں رکھے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں ٹرے اُٹھائی اور ہم کمرے کی طرف آ گئے۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اُسے گھمایا تو دروازہ نہیں کھلا۔ میں نے ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے کلپنا نے کچھ کہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور پھر ایک منٹ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ کلپنا کپڑے بدل چکی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی اُس کے سانولے بدن پر خوب جچ رہی تھی۔ وہ دُبلی پتلی سی لڑکی تھی۔ بلاؤز اُسے ڈھیلا تھا جس سے اُس کے سینے کا گداز جھلک رہا تھا۔

کلپنا نے اپنے اُتارے ہوئے کپڑے پلنگ کے نیچے ڈال دیئے تھے۔ سیتا نے ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور کلپنا کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ ''کتنی پیاری لگ رہی ہو۔'' وہ بولی۔

کلپنا شرما گئی۔ اب اُس کے چہرے پر خوف نہیں تھا۔ اُسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے اور یہاں اُسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی تو سیتا نے چائے کا ایک کپ اُس کی طرف بڑھا دیا اور خود بھی پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں بھی سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے سے پہلے میں نے اپنا چائے کا کپ اُٹھا لیا تھا۔

میں اور سیتا چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کلپنا کی طرف دیکھتے رہے جو کپ کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہی تھی۔

''ہاں..... اب بتاؤ! یہ سب کیا ہے؟'' بالآخر سیتا نے اصل موضوع چھیڑ دیا۔ ''تم کون ہو؟ یہ دشٹ (بدمعاش) کون تھے اور تمہیں کیوں پکڑنا چاہتے تھے؟''

''میں پوکھران کی رہنے والی ہوں دیدی!'' کلپنا نے جواب دیا۔ ''میرے پتا جی دھوبی تھے۔ میں اور ماتا جی بھی دن رات اُن کے ساتھ کام کرتیں۔ لوگوں کے کپڑوں کی میل اُتار کر اُنہیں اُجلا کرنا ہمارا کام تھا۔ ہم کپڑے تو اُجلے کر دیتے لیکن لوگوں کے دلوں کا میل صاف کرنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ کبھی گھاٹ پر کپڑے دھوتی اور کبھی دُھلے ہوئے کپڑے لوگوں کے گھروں پر بھی پہنچاتی۔ میں چھوٹی عمر سے ہی یہ کام کر رہی تھی۔ پہلے پتا جی کے ساتھ جایا کرتی تھی، پھر اکیلی بھی جانے لگی۔

اُس روز میں ٹھاکر ہوش سنگھ کی حویلی پر کپڑے لے کر گئی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس سے میری بدبختی کا زمانہ بھی شروع ہونے والا ہے۔ میں حویلی کے ڈیوڑھے میں بیٹھی ٹھاکرانی کے ساتھ کپڑوں کا حساب کر رہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ٹھاکرانی کا بھائی ٹھاکر بلبیر سنگھ ایک طرف کھڑا مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے ایک دو مرتبہ اُس کی طرف دیکھا بھی تھا مگر خیال نہیں کیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ستر سالہ ٹھاکر کی نیت میں کھوٹ ہے۔

اس کے بعد میں نے ٹھاکر بلبیر سنگھ کو دھوبی گھاٹ کے چکر لگاتے ہوئے دیکھا۔ وہ دیر تک میرے پتا جی کے پاس کھڑا باتیں کرتا رہتا۔ باتیں تو وہ پتا جی سے کرتا لیکن اُس کی نظریں میری طرف لگی ہوتیں۔ تم جانو دھوبی گھاٹ پر کپڑے پٹختے ہوئے ہمارا حلیہ کیا ہوتا ہوگا۔ ساڑھی کا پلو تو بدن پر ٹکتا ہی نہیں۔ کبھی میں بوڑھے ٹھاکر کی نظریں اپنے بدن پر چبھتی ہوئی محسوس کرتی۔ وہ کمبخت کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتا رہتا تھا۔

پھر یکایک ٹھاکر بلبیر سنگھ حویلی سے غائب ہو گیا۔ پتہ پڑا کہ وہ جیسلمیر سے آیا ہوا تھا۔ یہاں چند روز رہ کر واپس چلا گیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اُس بڈھے کی میلی نظروں سے نجات مل گئی تھی۔ مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ چند روز بعد وہ واپس آ گیا۔ اور پھر اُس کا آنا جانا لگا رہا۔ وہ اگر شام کو جیسلمیر واپس جاتا تو صبح پھر پوکھران آ جاتا۔ اُس کے پاس موٹر تھی اور ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ کیا معنی رکھتا تھا۔ اور پھر میرے پتا جی کا دیہانت ہو گیا۔ اُنہیں گردن توڑ تاپ (بخار) چڑھا تھا۔ اُن کا بہت علاج کروایا مگر ایک ہفتے کے اندر اندر اُن کے جیون کا انت ہو گیا۔

اُس روز میں کپڑے لے کر حویلی گئی تو اُس بڈھے ٹھاکر نے پہلی مرتبہ مجھ سے بات کی۔ میرے پتا جی کے گزر جانے کا افسوس کیا اور مجھے سو روپے بھی دیئے۔ اُس وقت ٹھاکرانی موجود نہیں تھی۔ میں نے روپے لے لئے۔ میرے من میں کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ دھن وان ہم جیسے کمی کاروں کو بخشش دیتے ہی رہتے تھے۔

اس کے چند روز بعد میرا چاچا رام چند دھوبی ہمارے گھر آیا۔ رام چند دھوبی میرا سگا چاچا نہیں ہے۔ وہ دیر تک ماتا جی سے کھسر پھسر کرتا رہا اور بار بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہا۔ اُس کی باتوں کے جواب میں میری ماتا جی بار بار انکار میں سر ہلاتی رہیں۔

رام چند دھوبی کا کئی روز ہمارے گھر آنا جانا لگا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری ماتا جی اور اُس میں کیا کھسر پھسر ہوتی تھی؟ پرنتو مجھے لگتا تھا جیسے وہ میری ماتا جی کو کسی بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور شاید ماتا جی نے ہار مان لی۔ رام چند دھوبی کھل اُٹھا۔ اُس نے میری ماتا جی کو کچھ نوٹ بھی دیئے۔ ماتا جی نے نوٹ چولی کے گریبان میں چھپاتے ہوئے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا بھی تھا مگر میں کچھ نہیں سمجھ سکی تھی..... یہ ایک ہفتے پہلے کی بات ہے۔'' کلپنا نے گہرا سانس لیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''اس سے اگلے روز ماتا جی مجھے لے کر جیسلمیر آ گئیں۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم ایک پرانے مندر کی یاترا کے لئے جا رہے ہیں۔ جب ہم جیسلمیر کے لاری اڈے پر بس سے اُترے تو یہاں رام چند دھوبی ہمارے استقبال کو موجود تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ وہ ہمیں ایک موٹر میں بٹھا کر ایک حویلی میں لے گیا۔ پہاڑی کے قریب یہ حویلی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ وہ ٹھاکروں کا علاقہ تھا۔ آس پاس اور بھی بہت سی اور بڑی بڑی حویلیاں تھیں۔

اور پھر اُسی شام حویلی میں بڈھے ٹھاکر بلبیر سنگھ کو دیکھ کر پہلی مرتبہ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے ماتا جی سے کچھ پوچھنا چاہا تو اُس نے ہنس کر ٹال دیا۔ میرے دل میں کھد بدسی ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ کسی پرانے مندر کی یاترا کے بہانے مجھے دھوکے سے یہاں لایا گیا ہے۔ دوسرے دن میں ماتا جی کے پیچھے پڑ گئی۔ میں اصل بات جاننا چاہتی تھی۔ اور پھر ماتا جی نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ ماتا جی اُس بڈھے ٹھاکر سے میری شادی کرنے والی ہیں جو عمر میں شاید میرے دادا سے بھی بڑا تھا۔ میں چیخ اُٹھی۔ ماتا جی نے مجھے ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔ وہ رام چند دھوبی کے ذریعے ٹھاکر سے دو ہزار روپے لے چکی تھی اور اُسے تین ہزار روپے اور ملنے والے تھے۔ گویا پانچ ہزار میں مجھے بیچ دیا گیا تھا..... میں بہت روئی پیٹی، چیخی چلائی مگر ماتا جی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ رام چند دھوبی بھی پہلے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ میں زندگی بھر عیش کروں گی۔ ٹھاکرانی بن کر راج کروں گی لیکن میں نے ضد نہیں چھوڑی تو وہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگا۔ ایک مرتبہ میرے منہ پر طمانچہ بھی مار دیا۔ اور پھر ایک روز ماتا جی پر بھی یہ سنسنی خیز انکشاف ہو گیا کہ ہمارے ساتھ واقعی دھوکہ ہو رہا ہے۔ اُس روز ماتا جی نے رام چند دھوبی کو ایک اور آدمی کے

ساتھ باتیں کرتے ہوئے سن لیا تھا۔

یہ ٹھاکر برہمن اور اُونچی جاتی کے لوگ ہم جیسے نیچ جاتی والوں کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔ ہمیں ملیچھ کہا جاتا ہے۔ ہمارے کپڑوں کو چھو کر گزرنے والی ہوا اُن کے کپڑوں کو بھی چھو کر گزر جائے تو وہ ناپاک ہو جاتے ہیں۔ پرنتو کسی حسین ناری کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے، اُس کے بدن کو اپنے بدن سے مسلتے ہوئے، اپنا پوتر خون اُس ناری کے خون میں شامل کرتے ہوئے انہیں احساس نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس وقت نہ وہ ناری ملیچھ ہوتی ہے اور نہ وہ دیوتا۔

''وہ بڈھا ٹھاکر بھی مجھے دیکھ کر میری خوبصورتی اور میری جوانی پر ریجھ گیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ اُونچی جاتی کا ٹھاکر ہے اور میں نیچی جاتی کی ہوں۔ اُس کے من میں کھوٹ تھا، ہوس تھی۔ وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔

رام چند دھوبی نے میری ماتا جی سے کہا تھا کہ ٹھاکر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اپنی پتنی بنا کر عالیشان حویلی میں رکھے گا۔ مجھے ٹھاکرانی بنائے گا۔ میں راج کروں گی۔ مگر اُس رات ماتا جی نے رام چند دھوبی کی دوسرے آدمی سے باتیں سنیں تو وہ کانپ اُٹھی۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ بڈھا ٹھاکر میرے خوبصورت شریر سے اپنی ہوس کی آگ بجھانا چاہتا تھا جس کے لئے اُس نے میری ماتا جی کو پانچ ہزار روپے دے دیئے تھے۔ ایسے دھن وانوں کے لئے پانچ ہزار روپے کیا معنی رکھتے تھے۔

ماتا جی کو رام چند دھوبی اور اُس آدمی کی باتوں سے پتہ چل گیا کہ ہمیں دھوکے سے یہاں لایا گیا ہے۔ وہ بڈھا ٹھاکر چند روز مجھے برتتا، میرے خوبصورت شریر سے اپنی ہوس کی آگ بجھاتا پھر مجھے اپنے کارندوں کے حوالے کر دیتا جو جیون بھر میری بوٹیاں نوچتے رہتے۔

پرسوں رات ماتا جی نے مجھے ساتھ لے کر حویلی سے بھاگنے کی کوشش کی مگر ہمیں پکڑ لیا گیا۔ حویلی میں رام چند دھوبی اور ماتا جی میں خوب لڑائی ہوئی۔ ماتا جی نے غصے میں رام چند دھوبی کے کپڑے پھاڑ دیئے اور رام چند دھوبی نے طیش میں آ کر ماتا جی کے سر پر لوہے کی سلاخ سے زوردار ضرب لگائی..... ماتا جی کا سر پھٹ گیا۔ بھیجہ بہہ نکلا اور ماتا جی نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی.....

مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا اور حویلی پر دو خطرناک دشٹوں کا پہرہ بٹھا دیا گیا۔ میں بند کمرے میں بیٹھی روتی اور تڑپتی رہی مگر کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ آج شام دو عورتیں حویلی میں آ گئیں۔ مجھے اُس کمرے سے نکالا گیا۔ اُن دونوں عورتوں نے مجھے نہلایا دھلایا، اچھے کپڑے پہنائے اور مجھے خوب بنایا سنوارا گیا۔ وہ دونوں عورتیں صورتوں ہی سے بڑی حرافہ لگتی تھیں۔ ایک موقع پر میں نے مزاحمت کی تو ایک عورت نے میری پٹائی کر دی۔

آدھی رات کے سمے مجھے ایک اور کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ہمیں حویلی میں رہتے ہوئے کئی

روز ہو گئے تھے مگر یہ کمرہ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ بہت شاندار کمرہ تھا۔ اُسے اُس بڈھے ٹھاکر کی عشرت گاہ کہنا ٹھیک ہوگا۔ دیواروں پر عورتوں کی ایسی بڑی بڑی رنگین تصویریں لگی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر شرم آتی تھی۔ ایک عورت تو بالکل ننگی بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ دونوں عورتیں اُس وقت تک کمرے میں بیٹھی رہیں جب تک وہ بڈھا ٹھاکر نہیں آ گیا۔ عورتیں کمرے سے چلی گئیں تو بڈھے ٹھاکر نے دروجہ بند کر کے کنڈا لگا دیا۔ اُس نے دارو پی رکھی تھی۔ کمرے میں آ کر بھی اُس نے دارو پینا شروع کر دی۔ کئی گلاس پی کر وہ میری طرف آیا۔ میں اُس کی بنتی کرنے لگی..... اُس کے آگے ہاتھ جوڑے، اُس کے چرنوں پر گر گئی کہ میرا جیون نشٹ نہ کرے۔ پر اُس نے میری ایک نہیں سنی۔ اُس کے سینے میں تو ہوس کی آگ جل رہی تھی۔ اُس نے میرے شریر کو پانے کے لئے میری ماتا کو پانچ ہزار روپے دیئے تھے وہ مجھے کیسے چھوڑ دیتا۔

اُس نے میری ساڑھی کھینچ کر اُتار دی۔ اور پھر میرا بلاؤز اُتارنے لگا..... میں نے بنتی چھوڑ دی اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں چیخ رہی تھی مگر میری فریاد سننے والا کون تھا؟ میری مدد کو کون آتا؟ حویلی میں موجود دوسرے لوگ تو میری چیخیں سن کر خوش ہو رہے ہوں گے کہ ان کی محنت سپھل ہوئی اور بڈھا ٹھاکر میرے شریر کو روند رہا ہے۔

میرا بلاؤز پھٹ گیا..... اُس کمبخت ٹھاکر کی بانہوں میں بڑی شکتی تھی۔ اُس نے مجھے شکنجے کی طرح دبوچ رکھا تھا۔ پرنتو مجھے اپنے آپ کو چھڑانے کا ایک موقع مل گیا۔ میں اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آ گئی جہاں پیتل کا ایک گلدان بھی رکھا ہوا تھا جس میں پھول سجے ہوئے تھے۔ بڈھا ٹھاکر میری طرف لپکا تو میں نے پیتل کا گلدان اُٹھا کر اُس کے سر پر دے مارا۔ اُس کا سر پھٹ گیا۔ خون بہنے لگا..... وہ چیختا ہوا قالین پر گر گیا۔ میں دوڑ کر دروجے کے قریب آ گئی۔ پھر یہ سوچ کر رُک گئی کہ یہاں سے باہر نکلوں گی تو رام چند دھوبی اور اُس کے ساتھی مجھے پکڑ لیں گے۔ میں دوڑ کر کھڑکی کے قریب آ گئی اور کھڑکی کھول کر باہر کود گئی۔ یہ حویلی کا پچھلا حصہ تھا۔ اس طرف اندھیرا تھا۔ پچھلی دیوار کے ساتھ اُوپر جانے کے لئے تنگ سی سیڑھیاں تھیں جہاں ایک چھوٹا سا کمرہ بھی بنا ہوا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر دیوار پر آ گئی اور باہر چھلانگ لگا دی۔

حویلی کے اندر شور مچ گیا تھا..... بڈھے ٹھاکر نے چیخ چیخ کر رام چند دھوبی اور اُن دشٹوں کو بتا دیا تھا کہ میں اُسے زخمی کر کے پچھلی طرف سے بھاگ گئی ہوں۔ وہ لوگ بھی دیوار پھاند کر حویلی سے باہر آ گئے اور مجھے پکڑنے کے لئے دوڑ پڑے۔ میں اپنی جان بچانے کے لئے بھاگتی رہی۔ ایک موقع پر رام چند دھوبی نے مجھے پکڑ لیا۔ میں نے اُس کے بازو پر دانت گاڑھ دیئے، وہ درد سے چیخ اُٹھا۔ میں اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑا کر بھاگ نکلی۔ میں بری طرح بد حواس تھی۔ موت کا خوف دماغ پر سوار تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر ان دشٹوں کے ہاتھ لگ گئی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میری بدھی نے کام چھوڑ دیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں

جاؤں..... اور پھر میں اس حویلی کے پھاٹک کے سامنے رُک گئی۔ اندر برآمدے میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے وشواش تھا کہ یہاں مجھے پناہ مل جائے گی۔ اور دیدی.....'' کلپنا خاموش ہو گئی۔ اُس نے اُٹھ کر سیتا کے چرن چھو لئے، پھر میری طرف رُخ کر کے دونوں ہاتھ جوڑے۔

''اگر آپ دونوں مجھے پناہ نہ دیتے تو وہ لوگ مجھے خونخوار بھیڑیوں کی طرح چیر پھاڑ دیتے۔''

''اب تمہیں تسلی ہو گئی نا کہ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔'' سیتا نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''اُن کا خوف ذہن سے نکال دو! یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔'' سیتا اُس سے کچھ اور باتیں پوچھتی رہی، پھر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''اس پریشانی سے چھٹکارا پانے کے لئے تمہیں آرام اور گہری نیند کی ضرورت ہے۔ آؤ میں تمہیں دوسرے کمرے میں بھیج دُوں۔ بے فکر ہو کر آرام سے سو جاؤ..... باقی باتیں صبح ہوں گی۔'' سیتا اُسے لے کر کمرے سے نکل گئی۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ سیتا پانچ منٹ بعد واپس آ گئی۔

''دیکھا تم نے....'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ ہے ہمارا دھرم جو کئی ذاتوں میں بٹا ہوا ہے۔ اُونچی ذات کے لوگ اپنے آپ کو بہت پوتر اور دیوتا سمجھتے ہیں۔ نیچی ذات والے اُن کی نظروں میں ملیچھ ہیں۔ وہ اُن کو چھو کر آنے والی ہوا سے بھی بچتے ہیں۔ لیکن ہوس کی آگ جب سینے میں بھڑکتی ہے تو وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اُنہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ وہ پوتر اور دیوتا ہیں اور جس ناری کو وہ اپنے وجود تلے روندر ہے ہوتے ہیں وہ کم ذات اور ملیچھ ہے۔''

میں گہرا سانس لے کر رہ گیا اور جواب دینے کی بجائے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ ساڑھے تین سے اُوپر کا وقت ہو رہا تھا۔ اُس وقت میرا دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ سیتا نے دروازہ بھیڑ دیا اور پھر وہ بھی میرے ساتھ بیڈ پر لیٹ گئی۔ چند لمحوں بعد ہی اُس کی سنجیدگی رُخصت ہو گئی اور وہ ایک بار پھر شرارتوں پر اُتر آئی.....!!

○

وہ نسوانی چیخ کی آواز تھی.....

اُس وقت میرے دماغ پر غنودگی سی طاری تھی مگر چیخ کی آواز سن کر میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا اور اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ عقبی سمت والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے سامنے پڑا ہوا پردہ ہولے ہولے بل کھا رہا تھا۔

چیخ کی وہ آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ میں اُسے اپنا واہمہ سمجھ کر لیٹ گیا۔ لیکن اُسی لمحے چیخنے کی آواز دوبارہ سنائی دی..... اس مرتبہ یوں لگا تھا جیسے کسی جوان لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے چیخنے سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی ہو..... جوان لڑکی کا خیال آتے ہی میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ سیتا بھی اس مرتبہ چیخنے کی آواز سن کر جاگ گئی تھی۔

''کیا ہوا..... کون چیخا تھا؟'' وہ بدحواس سی ہو رہی تھی۔ اُس کے ذہن پر بھی نیند کا غلبہ تھا۔

میں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بڑی آہستگی سے بیڈ سے اُتر کر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے پستول نکالا اور ننگے پیر دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اُسے آہستگی سے گھمانے کی کوشش کی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ وہ لاک بھی نہیں تھا اور اُوپر کی چٹخنی بھی نہیں لگی ہوئی تھی۔ میں نے گھوم کر سیتا کی طرف دیکھا وہ بھی اپنا شب خوابی کا لباس درست کرتی ہوئی پلنگ سے اُتر آئی۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کوئی کلپنا کے کمرے میں موجود ہے اور اس دروازے کو باہر سے کنڈا لگا دیا گیا ہے۔'' میں نے سرگوشی کی۔

میرے ذہن میں بدترین خدشے جنم لے رہے تھے اور نجانے مجھے یہ یقین کیوں تھا کہ کوئی حویلی میں گھس آیا ہے اور کلپنا کو زبردستی یہاں سے لے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں عقبی دروازے کی طرف لپکا مگر سیتا نے میرا بازو پکڑ لیا اور ایک اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ یہ دروازہ ملحق کمرے میں کھلتا تھا۔ سامنے پردہ لٹکا ہوا تھا۔ سیتا نے پردہ ہٹا کر بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا اور ہم دوسرے کمرے میں آ گئے۔ اُس کمرے کا راہداری میں کھلنے والا دروازہ محض بھڑا ہوا تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ پہلے احتیاط سے باہر جھانکا اور پھر سیتا کو وہیں رُکنے کا اشارہ کر کے باہر آ گیا۔

راہداری میں قالین بچھا ہوا تھا۔ میں ننگے پیر تھا اور قدموں کی آواز بالکل نہیں اُبھر رہی تھی۔ میں تاریک ہال میں آ گیا۔ ہال کے دوسری طرف والی راہداری کے ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے میں جلنے والے نائٹ بلب کی مدھم سی نیلگوں روشنی باہر بھی آ رہی تھی اور اُس کمرے سے دھینگا مشتی اور خرخراہٹ کی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ہال میں پڑے ہوئے فرنیچر سے بچتا ہوا ہر ممکن تیزی سے آگے بڑھا۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور اندر دو آدمی کلپنا کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور کلپنا پوری شدت سے مزاحمت کر رہی تھی۔ ان دو بدمعاشوں میں سے ایک تو وہی گنگو تھا جو تین گھنٹے پہلے میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر دُم دبا کر بھاگ گیا تھا۔

میں غنڈوں اور بدمعاشوں کی فطرت سے واقف نہیں تھا۔ مجھے اُن کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ اس وقت میں نے گنگو اور اُس کے ساتھی کو جانے دیا تھا اور مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ تاک میں رہیں گے اور موقع پاتے ہی واپس آ جائیں گے۔

گنگو نے ایک ہاتھ کلپنا کے منہ پر جما رکھا تھا اور دوسرا بازو اُس کے سینے پر لپیٹ کر اُسے گرفت میں لے رکھا تھا۔ جبکہ اُس کا دوسرا ساتھی کلپنا کی دونوں ٹانگوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور کلپنا اپنے آپ کو بچانے کے لئے بری طرح ٹانگیں چلا رہی تھی۔

میں نے مُڑ کر دیکھا، سیتا بھی مجھ سے دو قدم پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے اُسے ایک بار پھر

خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دروازے کے عین سامنے آ گیا۔

''حیرت ہے....'' میں نے اُونچی آواز میں کہا۔ ''دو آدمی ایک چھوکری کو قابو نہیں کر سکتے۔''

وہ دونوں بری طرح اُچھل پڑے۔ اور اس بدحواسی میں کلپنا اُن کی گرفت سے نکل گئی۔ کلپنا آزاد ہوتے ہی میری طرف دوڑی لیکن اُس کا پیر اپنی ساڑھی میں اُلجھا اور وہ چیختی ہوئی منہ کے بل میرے سامنے گری۔

میں نے کلپنا کی طرف دیکھا اور اس ایک لمحہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے گنگو کے ساتھی نے میری طرف چھلانگ لگا دی..... وہ گنگو کے مقابلے میں قدرے دراز قامت تھا اور اُس کا جسم بھی خاصا مضبوط تھا۔ اُن دونوں میں ایک فرق بہت نمایاں تھا۔ گنگو کے بال لمبے تھے جنہیں اُس نے چوٹی کی صورت میں باندھ رکھا تھا اور یہ دوسرا بدمعاش گنجا تھا۔

اُس کے پیر کی ٹھوکر میرے پستول والے ہاتھ پر پڑی..... پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر چمگادڑ کی طرح ہوا میں اُڑتا ہوا دیوار کے ساتھ ایستادہ الماری کے اُوپر جا گرا۔

میں اس صورتحال سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ گنجے کی دوسری ٹھوکر میرے گھٹنے پر لگی..... میں کراہتا ہوا ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔ اُس کا ہتھوڑے کی طرح وزنی گھونسہ میرے پیٹ پر پڑا۔ میں دوہرا ہو گیا۔ اگلا گھونسہ میری ٹھوڑی پر لگا۔ میرے منہ سے ایک اور کراہ نکلی..... میں سیدھا ہو کر لڑکھڑا گیا۔

میری زندگی لڑتے ہوئے گزری تھی لیکن بدترین دشمن کے خلاف وہ لڑائی کسی اور نوعیت کی تھی۔ رائفلوں کی لڑائی، مشین گنوں کی اور گولہ بارود کی لڑائی..... ہندو فوجیوں سے دو بدو لڑائی کا موقع بہت کم ملا تھا۔ میں اگرچہ ہر لڑائی میں سرخرو رہا تھا لیکن غنڈوں کے ساتھ اس لڑائی نے مجھے وقتی طور پر بدحواس کر دیا تھا۔

گنجا بدمعاش مجھ پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا اور گنگو نے ایک بار پھر کلپنا کو دبوچ لیا تھا۔ وہ بری طرح ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ لیکن اس بار ایک فرق تھا کہ اُس کی چیخیں آزاد تھیں۔ مگر اُس کے چیخنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایک تو رات کا آخری پہر تھا۔ اس علاقے میں بڑی بڑی حویلیاں اور محل نما عمارتیں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھیں اور ویسے بھی ٹھاکروں اور مہاراجوں کی حویلیوں سے راتوں میں ناریوں کی چیخیں گونجتی ہی رہتی تھیں۔ کسی کو ان چیخوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

گنجے بدمعاش نے ایک اور مُکا مارا۔ اس مرتبہ اُس نے میرے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ مگر میں تیزی سے ایک طرف جھکا تو گھونسہ وزنی ہتھوڑے کی طرح میرے کندھے پر پڑا اور میں کراہتا ہوا نیچے گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بھی پہلی مرتبہ داؤ آزمانے کا موقع مل گیا۔

میں نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے گنجے کے دونوں پیروں کو ٹخنوں سے ذرا اُوپر سے زور سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گر گیا۔ میں بڑی تیزی سے اُٹھ کر

کھڑا ہو گیا اور گنجے کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اُسے اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

گنجا دیر تک پٹتا رہا۔ پھر اُس نے میرا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا..... میں بری طرح لڑکھڑا گیا لیکن اپنے آپ کو گرنے سے بچا لیا۔ اس دوران گنجا بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ گنجے نے ایک دم چھلانگ لگا کر مجھ سے لپٹنے کی کوشش کی مگر میں تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا اور وہ اپنی ہی جھونک میں آگے جا کر الماری سے ٹکرا گیا۔ ابھی وہ سنبھلنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے پیچھے سے ایک لات رسید کر دی..... وہ کراہتا ہوا دوبارہ الماری سے ٹکرایا۔ اس مرتبہ اُس کے منہ سے بڑی خوفناک چیخ نکلی تھی۔ الماری کے تالے میں چابی لگی ہوئی تھی اور اُس گنجے کا سر اُس چابی سے ٹکرایا تھا۔ چابی اُس کی گنجی کھوپڑی میں پیوست ہو گئی اور جب ایک جھٹکے سے وہ پیچھے ہٹا تو زخم سے بہنے والا خون اُس کی پیشانی اور چہرے کو تر کر رہا تھا۔ اُس کا چہرہ بڑا بھیانک ہو گیا تھا۔

سیتا بھی کمرے میں گھس آئی۔ اُس نے آتے ہی گنگو پر حملہ کر دیا اور کلپنا کو اُس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ گنگو نے کلپنا کو چھوڑ دیا اور سیتا کو پکڑ کر پوری قوت سے پیچھے دھکیل دیا۔ سیتا لڑکھڑاتی ہوئی پلنگ پر گری..... اس کے ساتھ ہی اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ یہ چیخ کسی خوف کی وجہ سے نہیں نکلی تھی۔ اُس کا باریک شب خوابی کا لباس سامنے سے پھٹ گیا تھا۔ اُس نے کوئی زیر جامہ بھی نہیں پہنا ہوا تھا..... وہ بالکل برہنہ ہو گئی.....

گنگو کی آنکھوں میں وحشیانہ سی چمک اُتر آئی۔ وہ سیتا کی طرف لپکا لیکن قالین پر پڑی ہوئی کلپنا اُچھل کر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

''دیدی..... بھاگ جاؤ!'' کلپنا چیخی۔

گنگو جھٹکے دے کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران سیتا کو موقع مل گیا۔ وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ گنگو نے کلپنا پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ کلپنا چیختی رہی لیکن گنگو کی ٹانگیں نہیں چھوڑیں۔ گنگو نے اُس کی کھوپڑی پر زوردار گھونسہ مارا۔ اس مرتبہ کلپنا کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی اور گنگو کی ٹانگیں اُس کی گرفت سے آزاد ہو گئیں.....

میں نے گنجے بدمعاش کو پشت کی طرف سے اس طرح گرفت میں لے رکھا تھا کہ اُس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر دونوں بازو پیچھے کی طرف موڑ رکھے تھے اور وہ پیر ایڑھی سے میری پنڈلی پر ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اُس کے سر سے بہنے والا خون اب اُس کے لباس کو بھی تر کر رہا تھا۔

کلپنا سے نجات مل جانے کے بعد گنگو کو اب اس طرف توجہ دینے کا موقع مل گیا تھا۔ اُس نے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا اور میری پشت پر وار کرنے کے لئے بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا میری طرف لپکا.....

میں گنجے بدمعاش کو اس طرح گرفت میں لئے ہوئے تیزی سے گھوم گیا کہ گنجا میری ڈھال بن گیا۔ اُس کا سینہ سامنے تھا اور دوسرے ہی لمحہ کمرہ اُس کی بھیانک چیخ سے گونج اُٹھا..... گنگو کا خنجر دستے تک اُس کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا۔ گنگو کا ہاتھ ابھی تک خنجر کے دستے پر تھا۔ پھر

وہ اس طرح پیچھے ہٹا جیسے بجلی کا زبردست کرنٹ لگا ہو..... عجیب سے خوف کی شدت سے اُس کا چہرہ دُھواں ہو گیا۔ آنکھیں دہشت کے مارے حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔

گنجا شیطان میری گرفت میں پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا..... اسی لمحے سیتا دوبارہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ وہ بڑی عجلت میں لباس تبدیل کر کے آئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں لوہے کی تین فٹ لمبی سلاخ تھی۔ لیکن کمرے کا منظر دیکھ کر وہ اس طرح رُک گئی جیسے زمین نے اُس کے پیر پکڑ لئے ہوں۔ سیتا شاید ابھی تک اس صورتحال کو سمجھ نہیں پائی تھی کہ گنگو چیختا ہوا اپنی جگہ سے اُچھلا..... اُس کا رُخ سیتا کی طرف تھا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ سیتا پر حملہ آور ہوا ہے۔ سیتا نے بھی سنبھلنے کی کوشش کی مگر میرا اور سیتا کا اندازہ بھی غلط نکلا۔ گنگو نے سیتا پر حملہ نہیں کیا تھا۔ وہ سیتا سے ٹکرایا اور اُسے پوری قوت سے ایک طرف دھکیل کر دروازے کے باہر راہداری میں گرا۔ سیتا بھی دروازے سے ٹکرا کر چیختی ہوئی نیچے گری تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا گنگو نے اُٹھ کر راہداری میں ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ گنجا بدمعاش ابھی تک میری گرفت میں تڑپ رہا تھا۔ اُس کے زخم سے بہنے والا خون لباس کو تر کرتا ہوا پیروں کے قریب قالین پر گر رہا تھا۔ اُس کے تڑپنے سے خون کے چھینٹے اِدھر اُدھر بھی اُڑ رہے تھے۔ میں نے تڑپتے ہوئے گنجے بدمعاش کو قالین پر ڈال دیا اور دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ راہداری میں پہنچتے ہی میں مُڑ کر ہال کی طرف دوڑا۔

گنگو حویلی کے عقبی طرف گیا تھا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز اُس طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے بھی اُس طرف چھلانگ لگا دی۔ ایک صوفے سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا، پھر سنبھل کر دوڑ لگا دی۔ اس طرف بھی ایک کشادہ اور مختصر سی راہداری تھی۔ دائیں بائیں ایک ایک کمرہ تھا اور سامنے وہ اُونچا دروازہ تھا جو عقبی سمت میں کھلتا تھا۔ گنگو اُسی دروازے سے نکلا تھا۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میں بھی دوڑتا ہوا باہر آ گیا اور اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کسی طرف سے قدموں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ گنگو درختوں میں کہیں چھپ گیا ہے۔ میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر ایک عجیب سی آواز سن کر چونک گیا..... وہ آواز ایسی تھی جیسے بلی درخت کے تنے کو پنجوں سے نوچ رہی ہو۔

میں نے آواز کی سمت دیکھا اور پھر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ایک انسانی ہیولہ ناریل کے درخت پر چڑھتا ہوا دکھائی دیا..... وہ گنگو کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ بندر کی سی پھرتی سے درخت پر چڑھا تھا۔ ناریل کا وہ درخت حویلی کی بیرونی دیوار سے صرف تین فٹ کے فاصلے پر تھا۔ بلندی پر پہنچ کر گنگو دیوار پر چلا گیا۔ اُس نے غالباً پیچھے مُڑ کر دیکھا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اُس نے باہر چھلانگ لگا دی۔

میرے منہ سے ایک بار پھر گہرا سانس نکل گیا۔ اُس کے پیچھے جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں واپس مُڑا، راہداری میں داخل ہوا، دیوار ٹٹول کر بتی جلائی اور دروازہ بند کرتے ہوئے اُس

کا جائزہ لینے لگا۔ گنگو اور اُس کا گنجا ساتھی اسی دروازے سے اندر آئے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ اُنہوں نے دروازہ کس طرح کھولا ہوگا حالانکہ کلپنا کے آنے کے بعد سیتا نے خود تمام دروازے چیک کئے تھے۔ اور پھر بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس دروازے میں اوپر یا نیچے کوئی بولٹ نہیں تھا۔ صرف ہضمی قفل تھا۔ سیتا نے یقیناً ناب دبا کر دروازہ لاک کیا ہوگا۔ لیکن کسی تار وغیرہ کی مدد سے باہر سے بھی تالا کھولنا ناممکن نہیں تھا۔ گنگو وغیرہ اسی طرح یہ دروازہ کھول کر اندر آئے تھے۔

کلپنا کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا۔ آنکھیں دہشت سے جیسے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اُس کے بدن پر ہلکی سی کپکپاہٹ بھی طاری تھی۔ گنجا ختم ہو چکا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف اس طرح خون بکھرا ہوا تھا جیسے کسی بکرے کے گلے پر چھری پھیر کر چھوڑ دیا گیا ہو۔

''ڈرو نہیں کلپنا!'' میں گھٹنوں کے بل اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''اسے ہم نے نہیں مارا۔ گنگو نے خنجر کا وار مجھ پر کیا تھا مگر یہ زد میں آ گیا۔''

''میں بھی اسے یہی سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ دشٹ اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔'' سیتا نے کہا پھر کلپنا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لاش کے سینے میں پیوست اس خنجر کو دیکھو..... پہچانو اسے۔ اب تم اُس بڈھے ٹھاکر کی حویلی میں تھیں تو یہی دونوں بدمعاش تمہاری نگرانی کر رہے تھے۔ تم نے گنگو کے پاس یہ خنجر ضرور دیکھا ہوگا۔ یہ اُس کا خنجر ہے اور یہ گنجا اُس کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ تمہاری چیخوں کی آواز سن کر جب مہابیر اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو خالی ہاتھ تھا۔''

''مجھے وشواوش ہے دیدی! کہ اس غنڈے کو تم میں سے کسی نے نہیں مارا۔'' کلپنا لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے تو خوشی ہے کہ یہ مارا گیا اور اذیت کی موت مارا گیا۔ میں نے اسے آخری لمحوں تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔ کتنی بے رحم موت مرا ہے یہ راکھشس..... اسے تو اس سے بھی زیادہ اذیت ناک موت مرنا چاہئے تھا۔ پرنتو مجھے اس کی بھیانک شکل دیکھ کر ڈر لگ رہا ہے۔''

میں نے بے اختیار لاش کی طرف دیکھا۔ پھٹی پھٹی سی آنکھیں اور خون سے آلودہ چہرہ واقعی بہت بھیانک ہو گیا تھا..... اُسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔

''تم تو ایک بہادر لڑکی ہو۔'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بڑے کشٹ اُٹھائے ہیں۔ جو لڑکی بوڑھے ٹھاکر اور رام چند دھوبی اور گنگو جیسے بدمعاشوں کے چنگل سے نکل آئے اُسے بھلا اور کس بات کا خوف ہو سکتا ہے..... یہ بے جان لاش کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟''

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ ''اسے اپنے کمرے میں لے چلو! اس کا زیادہ دیر یہاں رُکنا ٹھیک نہیں۔''

''تم بھی چلو..... تم یہاں رُک کر کیا کرو گے.....؟'' سیتا نے کلپنا کو سہارا دے کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

اُس نے ٹھیک کہا تھا۔ میرے وہاں رُکنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے الماری پر پڑا ہوا پستول اُٹھا لیا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ کلپنا کی طرف دیکھتے ہوئے یکایک مجھے احساس ہوا کہ اُس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور سیتا اُسے بمشکل سہارا دیئے ہوئے تھی۔ مجھے کلپنا کی حالت پر ترس آنے لگا۔ ایک ہی رات میں وہ زندگی کے سنگین ترین تجربات سے دوچار ہوئی تھی۔ اُس کی ماں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا، اُس کی عزت نیلامی کی سولی پر چڑھ گئی تھی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی عزت بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ گنگو اور گنجے جیسے شہر کے خطرناک ترین غنڈے مرتیوں (موت) کے فرشتوں کی طرح اُس کے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔ ہم نے اُسے اپنی حویلی میں پناہ دی تھی۔ وہ ہم سے مطمئن ہو گئی تھی۔ اُس کا خوف دُور ہو گیا تھا۔ لیکن موت کے فرشتے بھی کسی طرح حویلی میں گھس آئے تھے اور یہاں جو کچھ بھی ہوا تھا اُسے دیکھ کر وہ دہل گئی تھی۔ اُس پر اتنا خوف طاری ہوا تھا کہ اُس سے اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔

دوسری طرف سے میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے چلانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن کلپنا سے اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول سیتا کو تھما دیا اور جھک کر کلپنا کو گود میں اُٹھا لیا۔ وہ مچلنے لگی۔

''نہیں نہیں..... مجھے اُتار دو جیجا جی! میں چل لوں گی۔'' وہ بولی۔

میں سیتا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اُس کے لبوں پر بھی مسکان آ گئی۔ کلپنا ہمیں پتی پتنی ہی سمجھی تھی۔

''شانت ہو شریر لڑکی!'' میں نے کلپنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے اس وقت تم اپنے قدموں پر نہیں چل سکتیں۔''

کلپنا نے میری طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ اُس نے شرم کے مارے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ سیتا میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

گنجے بدمعاش اور گنگو سے دھینگا مشتی کرتے ہوئے کلپنا کا یہ بلاؤز بھی پھٹ گیا تھا اور اُس کا سانولا سینہ عریاں ہو رہا تھا۔ میری نظریں اُس کے سینے کے گداز زیر و بم کے ساتھ متحرک ہو رہی تھیں۔ میں بار بار نگاہوں کا زاویہ بدلنے کی کوشش کرتا مگر نظریں پھر وہیں ٹِک جاتیں۔ کمرے میں آ کر میں نے اُسے پلنگ پر ڈال دیا۔ کلپنا نے اب بھی چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا رکھا تھا۔ سیتا نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی نظروں میں شوخی تھی۔ وہ وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی اور کپڑوں کا ایک جوڑا نکال لیا جو لہنگے اور چولی پر مشتمل تھا۔

''کلپنا!'' اُس نے کلپنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اُٹھو اور باتھ رُوم میں جا کر کپڑے بدل لو!''

کلپنا ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور سیتا کے ہاتھ سے کپڑے لے کر باتھ رُوم میں گھس گئی۔ چند منٹ بعد وہ کپڑے بدل کر باہر آ گئی۔ اُسے اس لباس میں دیکھ کر میرے منہ سے ایک بار پھر گہرا سانس نکل گیا۔ گھاگھرا منی اسکرٹ کی طرح گھٹنوں سے اُوپر تھا اور چولی بھی اس قدر اُونچی تھی کہ پورا پیٹ برہنہ ہو رہا تھا۔ گریبان بھی فراخ تھا۔ اس لباس میں تو اُس کے بدن سے کچھ اور بھی سیکس پھوٹنے لگی تھی۔

''اب میں الگ کمرے میں نہیں سوؤں گی دیدی..... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' کلپنا نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب تمہیں الگ کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں..... بلکہ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔'' سیتا نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر سیتا کی طرف دیکھا۔

''گنگو بھاگ گیا ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''اُس کا اپنا ہی ساتھی اُس کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس سے یہ توقع نہیں کہ وہ ہمارے خلاف پولیس کو اطلاع دے گا۔ اس طرح وہ خود بھی پھنس جائے گا۔ البتہ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس بڈھے ٹھاکر بلبیر سنگھ کو بتا دے کہ کلپنا کو ہم نے چھپا رکھا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ ہماری حویلی پر چڑھ دوڑے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ لاش کو غائب کر کے فرنیچر اور قالین سے خون کے دھبے صاف کر سکیں۔ ہم خود بھی پولیس کے پاس نہیں جا سکتے اس طرح میں نظروں میں آ جاؤں گی اور تم بھی محفوظ نہیں رہ سکو گے۔ اگر ٹھاکر بلبیر سنگھ ہماری حویلی کا رُخ کرتا ہے تو گنجے کی لاش کی موجودگی ہمارے لئے مصیبت کا باعث بن سکتی ہے۔''

''پھر..... کیا ارادہ ہے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''صبح ہوتے ہی ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔'' سیتا نے جواب دیا اور الماری کے اُوپر سے وہ بیگ اُتار لیا جو ہم نے پٹھان کوٹ سے خریدا تھا اور جس میں ہمارے کپڑے وغیرہ تھے۔ یہاں آنے کے بعد یہ بیگ کھولنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

بیگ کی سائیڈ زِپ کھول کر اُسے بڑا کیا جا سکتا تھا اور سیتا نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح بیگ میں اتنی گنجائش نکل آئی کہ اس میں کپڑوں کے کئی جوڑے اور بھی رکھے جا سکتے تھے۔ وہ وارڈ روب کھول کر اُس میں سے کپڑے نکالنے لگی۔ زنانہ جوڑوں کے علاوہ اُس نے تین چار مردانہ جوڑے بھی نکالے تھے۔

''اگر گنگو پکڑا گیا تو تمہارا راز چھپا نہیں رہ سکے گا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ پولیس کو بتا دے گا کہ یہاں تم سے سامنا ہوا تھا۔ اس طرح پولیس سمجھ جائے گی کہ.....''

''گنگو تو مجھے نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔'' سیتا نے میری بات کاٹ دی۔ ''وہ صرف یہی بتائے گا نا کہ اُس نے اس حویلی میں ایک عورت اور ایک مرد کو دیکھا تھا۔ وہ حلیہ بھی بتائے تو

پولیس مجھے شناخت نہیں کر سکے گی۔ میں کوئی ایسی ہستی تو نہیں ہوں کہ مجھے شہر کا ہر شخص پہچانتا ہو۔ اور تمہیں کون جانتا ہے مہابیر؟'' سیتا نے آخر میں میرے نام پر خاص زور دیا تھا۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''صرف چتون سنگھ ایک ایسا شخص ہے جو جیسلمیر میں میری موجودگی سے واقف ہے۔ لیکن وہ ہمارا وفادار ملازم ہے۔ ذات کا راجپوت ہے۔ اُس نے ہمارا نمک کھایا ہے وہ میرے بارے میں کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ البتہ یہاں سے جاتے ہی پہلی فرصت میں اُسے صورتحال سے آگاہ کرنا ہوگا۔''

''اس کا کیا کرو گی؟'' میں نے کلپنا کی طرف اشارہ کیا۔

''ظاہر ہے ہم اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ ہمارے ساتھ جائے گی.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''حالات کچھ بہتر صورت اختیار کریں گے تو اسے کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے گا جہاں یہ راکھشس اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔'' باتیں کرتے ہوئے وہ بیگ میں کپڑے بھی رکھتی جا رہی تھی۔

''یہاں سے نکل کر کہاں جائیں گے..... کوئی محفوظ جگہ؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یوں تو ہمارے لئے جیسلمیر میں بہت سی پناہ گاہیں ہیں لیکن فوری طور پر سلاوٹ پاڑے والا مکان ہمارے لئے زیادہ محفوظ رہے گا۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''سلاوٹ پاڑہ؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''شہر کے ایک محلے کا نام ہے..... اس کے بارے میں تفصیل بعد میں بتاؤں گی۔'' سیتا نے کہا اور اپنے کام میں مصروف رہی۔

کلپنا کو بھی پتہ چل گیا کہ ہم یہاں سے جانے والے ہیں۔ وہ بھی ذہنی طور پر ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی۔

ہماری تیاری مکمل ہوگئی۔ ہم دن کی روشنی طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ منہ اندھیرے نکلنا مناسب نہیں تھا۔ کسی کی نظروں میں آئے تو ہم پر کسی قسم کا شبہ کیا جا سکتا تھا۔

میں پستول ہاتھ میں لئے ہال کمرے میں برآمدے والے دروازے کے عین سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ گنگو کے فرار کے بعد میرے خیال میں کسی بھی لمحہ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور میں غیر محتاط نہیں رہنا چاہتا تھا۔

○○○

دن کی روشنی پھیلنے لگی۔

حویلی کے سامنے سڑک پر اِکا دُکا گاڑیوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ گھروں
دودھ سپلائی کرنے والوں کی سائیکلوں پر لگے ہوئے دودھ کے ڈبوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز
بھی سنائی دینے لگیں۔ پینتیس لاکھ کی آبادی کا شہر، گولڈن سٹی جیسلمیر اپنی تاریخ کی ایک نئی
کا آغاز کر رہا تھا۔

میرے ذہن میں جنم لینے والے خدشات کم از کم اس وقت تک بے بنیاد ثابت ہوئے
گنگو نے نہ تو پولیس کو اطلاع دی تھی اور شاید نہ ہی ٹھاکر بلبیر سنگھ سے رابطہ کیا تھا۔ اُس کے
ہاتھوں ایک قتل ہو چکا تھا اور شاید وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے کسی پناہ گاہ میں چھپ گیا تھا۔

صورتحال اگرچہ ابھی تک پُرسکون اور ہمارے حق میں تھی لیکن میں غیر محتاط نہیں رہنا چا
تھا۔ باہر سے آنے والی ہر آواز پر میں ہوشیار ہو جاتا۔ معاملہ صرف گنگو کا ہی نہیں تھا۔ بھار
فوج کا ایک ذمہ دار آفیسر کیپٹن گوپال سنگھ بھی اس حویلی کی زمین میں دفن تھا۔ گزشتہ رات
اُسے آفیسرز میس سے بلا کر لائی تھی اور پھر اُسے واپس جانا نصیب نہیں ہوا تھا۔

کیپٹن گوپال اکثر و بیشتر آوارہ عورتوں کے ساتھ دادِ عیش دینے کے لئے اس حویلی میں
رہتا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کے دوست بھی ہوتے تھے اور ظاہر ہے وہ بھی فوجی آفیسر ہی تھے
گزشتہ رات کیپٹن گوپال کی غیر حاضری سے شاید وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ گوپال کسی عورت
لے کر حویلی میں آیا ہوا ہے۔ آج صبح اُس کی واپسی کا انتظار ہوگا اور جب وہ اپنی ڈیوٹی پر
پہنچے گا تو اُس کے افسروں کو تشویش ہوگی۔ اُس کے دوستوں سے پوچھا جائے گا اور پھر اُس
بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے اس حویلی کا رُخ کیا جائے گا۔ اور اگر کوئی فو
آفیسر ہماری موجودگی میں یہاں تک پہنچ گیا تو ہمارے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گ
میں نے سیتا کے سامنے بھی اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تھا۔

''تمہاری سوچ غلط نہیں ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا خیال ہے وہ لوگ گوپا
کے بارے میں پہلے چھاؤنی ہی میں پتہ لگانے کی کوشش کریں گے۔ چھاؤنی میں بعض فو
افسروں کے بنگلے بھی عیاشی کے اڈے بنے ہوئے ہیں۔ پہلے وہ اس طرف پتہ لگائیں گے۔
اگر کسی کو حویلی کا خیال آ بھی گیا تو دوپہر سے پہلے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اور ظاہر ہے ہم اُ
وقت تک یہاں نہیں ہوں گے۔''

یہ بیس پچیس منٹ پہلے کی بات تھی۔ سیتا کچھ دیر میرے پاس بیٹھی کھڑکی سے بیرونی گیٹ کو دیکھتی رہی پھر اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا باہر دیکھتے ہوئے یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ پھر میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ کلپنا ایک صوفے پر آڑھی ترچھی پڑی اونگھ رہی تھی اور سیتا کچن میں تھی۔ میں ایک بار پھر گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ مزید پندرہ منٹ بعد میں سیتا کی آواز سن کر پیچھے مُڑا۔ وہ سینٹر ٹیبل پر ناشتہ لگا رہی تھی۔ اُس نے کلپنا کو آواز دی تو وہ بھی ہڑبڑا کر اُٹھ گئی۔

یہ اُس حویلی میں ہمارا آخری ناشتہ تھا۔ ذہن منتشر ہونے کے باوجود میں نے سیر ہو کر ناشتہ کیا۔ البتہ چائے کی طلب باقی رہی۔ سیتا نے چائے کہیں اور پینے کا پروگرام بنایا تھا۔ اُس وقت آٹھ بج رہے تھے۔ شہر میں کاروبارِ حیات کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے اور سیتا کے خیال میں اب زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔ اُس نے اشارہ کیا اور ہم روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔

سیتا نے تمام کمروں کی بتیاں بجھا دیں۔ میں بیگ اُٹھا کر برآمدے میں آ گیا۔ اُس ایک بیگ میں ہم تینوں کے کپڑے تھے۔ سیتا نے برآمدے والا دروازہ بھی بند کر دیا اور ہم برآمدے سے نکل کر گیٹ کی طرف چلنے لگے۔

سیتا نے پہلے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھر ہمیں اشارہ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ پہلے کلپنا اور پھر میں گیٹ سے باہر آیا۔ سامنے کشادہ سڑک پر ٹریفک کی آمد و رفت جاری تھی۔ لیکن رہائشی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔

ہم حویلی سے نکل کر دائیں طرف چلنے لگے۔ سیتا اور کلپنا آگے تھیں۔ میں بیگ کندھے پر لادے کسی مزدور کی طرح اُن سے چند قدم پیچھے چل رہا تھا۔ سیتا اور کلپنا نے ایک ہی جیسے لباس پہن رکھے تھے۔ گھٹنوں سے اُوپر منی اسکرٹ کی طرح اونچے گھاگھرے اور اُوپر مختصر سی چولیاں۔ یہ بڑا عجیب سا لباس تھا۔ کپڑا چولی کے صرف سامنے والے حصے پر تھا جس سے سینے کا کچھ حصہ ڈھکا ہوا تھا جبکہ پشت پر باریک ڈوریوں کی بندشیں تھیں۔ دونوں کی پشت بالکل برہنہ تھی۔ لیکن حویلی سے باہر نکلنے سے پہلے اُن دونوں نے چنریاں اوڑھ لی تھیں۔ ان سے نہ صرف پشت ڈھک گئی بلکہ اُن دونوں نے سامنے اس طرح گھونگھٹ نکال لئے کہ چہرے بھی چھپ گئے۔

میری نظریں بار بار اُن دونوں کی پنڈلیوں کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ کلپنا اگرچہ دُبلی پتلی سی تھی لیکن اُس کی پنڈلیاں گداز اور بھری بھری سی تھیں۔ سیتا کی پنڈلیاں تو اُس سے بھی زیادہ غضب ناک تھیں۔

ہمارے قریب سے اگرچہ ایک دو خالی ٹیکسیاں اور آٹو رکشے بھی گزرے تھے لیکن سیتا نے کسی کو نہیں روکا۔ صبح کے وقت چونکہ لوگ اپنے کام دھندوں پر جاتے تھے اس لئے رکشے اور ٹیکسیوں والے بھی سواریاں مل جانے کی اُمید پر ایسے علاقوں میں گھومتے رہتے تھے۔ تقریباً پچاس گز آگے جا کر ہم بائیں طرف ایک اور سڑک پر مُڑ گئے۔ اُس طرف تقریباً پچاس گز مزید

آگے ایک چھوٹی مارکیٹ تھی۔ اس طرف سامنے سے آتے ہوئے ایک رکشے کی رفتار ہمارے قریب پہنچ کر سست ہوگئی۔ سیتا نے اشارہ کیا تو رکشہ رُک گیا۔

ہم تینوں آسانی سے آٹو رکشہ میں بیٹھ گئے۔ بیگ بھی پیروں کے قریب رکھ لیا گیا۔ سیتا نے ڈرائیور کو ریلوے سٹیشن چلنے کو کہا تو رکشہ فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔

ریلوے سٹیشن کے سامنے اُس وقت خاصا رش تھا۔ جے پور سے آنے والی ٹرین اُس وقت وہاں پہنچی تھی اور پندرہ بیس منٹ بعد بیکانیر کی طرف ایک ٹرین روانہ ہونے والی تھی۔

رکشہ چھوڑ کر ہم ریلوے سٹیشن کی طرف چلنے لگے۔ لیکن ظاہر ہے ہمیں ٹرین پر سفر نہیں کرنا تھا اس لئے سٹیشن میں داخل ہونے کی بجائے ایک جگہ پر رُک گئے۔ یہاں جے پور سے آنے والی ٹرین سے اُترنے والے بہت سے مسافر جمع تھے۔ سامان بھی بکھرا ہوا تھا۔ رکشہ ٹیکسیوں کے ڈرائیور اور بگھیوں کے کوچوان بھی اُنہیں پریشان کر رہے تھے۔ صرف دو منٹ رُکنے کے بعد ہم ایک آٹو رکشہ پر سوار ہو گئے۔ سیتا نے اس مرتبہ ڈرائیور کو سلاوٹ پاڑہ چلنے کو کہا تھا۔

رکشہ فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔ سلاوٹ پاڑہ شہر کی گنجان آبادی کا علاقہ تھا۔ ہم ایک جگہ رکشے سے اُتر گئے اور تنگ سی گلیوں میں پیدل چلنے لگے۔ اس مرتبہ میں درمیان میں تھا، سیتا میرے دائیں اور کلپنا بائیں طرف چل رہی تھی۔ ہم جس گلی میں چل رہے تھے وہ کافی کشادہ تھی۔ دونوں طرف دُکانیں اور اُوپر رہائشی مکانات تھے۔ گلی کا فرش پتھروں سے بنا ہوا تھا اور چلنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ آس پاس کے مکان سلاوٹ طرزِ تعمیر کا حسین شاہکار تھے۔ دروازوں کے ساتھ دیواروں اور بالکونیوں پر پتھروں پر بہت حسین اور باریک میناکشی کا کام تھا۔ مجھے دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی تھی۔

یہ سلاوٹ پاڑہ تھا۔ جہاں آبادی کی اکثریت سلاوٹوں پر مشتمل تھی۔ ان کے علاوہ اس علاقے میں محبور، سپاہی، بنجارے، چھیپا اور چوڑی گر ذات کے لوگ بھی بکثرت آباد تھے۔

سیتا چلتے چلتے مجھے مختصر طور پر سلاوٹوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ پتھروں پر باریک اور نہایت خوبصورت نقش و نگار بنانے والی یہ ہنرمند قوم صدیوں سے یہاں آباد تھی۔ گولڈن سٹی (جیسلمیر) کے پیلے پتھروں سے بنے ہوئے محلات اور حویلیوں پر نقش و نگار اور سنگ تراشی اُن کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ راجستھان کے علاوہ ہندوستان کے بیشتر مندروں کی دیواروں اور ستونوں پر نازک اور حسین نقش و نگار بھی انہی سلاوٹوں کی مہارت اور محنت کے مرہونِ منت ہیں۔ انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو جیسلمیر کے سلاوٹوں نے سندھ کی طرف نقل مکانی شروع کر دی۔ یہ لوگ پہلے حیدرآباد میں آباد ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ لوگ کراچی کا رُخ کرنے لگے۔

پتھروں پر نازک نقش و نگار اُبھارنے والے ان سلاوٹوں کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔ ان کے ہاتھوں میں کمال کی صفائی ہے۔ چھینی کو ایک خاص انداز میں پتھر پر رکھا جاتا ہے اور ہتھوڑی

کی نازک ضربوں سے پتھر پر نازک اور خوبصورت نقش اُبھرنے لگتے ہیں۔

ہم ایک اور کشادہ گلی میں نکل آئے۔ یہاں بھی رہائشی مکان تھے جو علاقے کے دوسرے مکانوں سے خاصے بڑے تھے۔ یہ خالص رہائشی علاقہ تھا۔ دُکانیں اِکا دُکا ہی تھیں۔ ہم تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کر کے اس سڑک سے ایک اور کشادہ اور پتھریلی گلی میں مُڑ گئے۔ مجھے حیرت تھی کہ سیتا نے میل ڈیڑھ میل دُور رکشہ کیوں چھوڑ دیا تھا؟ جبکہ ان کشادہ گلیوں میں گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی اور ہمارا رکشہ بھی آسانی سے اس طرف آ سکتا تھا۔ لیکن ذرا سا سوچنے کے بعد اپنے اس سوال کا جواب بھی خود ہی مل گیا تھا۔ سیتا خاصی محتاط واقع ہوئی تھی۔ حویلی سے نکل کر ہم رکشہ یا ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھے یہاں آ سکتے تھے۔ لیکن محض اس خیال سے کہ رکشہ یا ٹیکسی کے ذریعے ہماری منزل کا پتہ نہ لگا لیا جائے ہم پہلے ریلوے سٹیشن گئے تھے پھر دوسرے رکشے میں بیٹھ کر سلاوٹ پاڑہ آئے تھے اور رکشہ چھوڑ کر پیدل ہی ان گلیوں میں گھوم رہے تھے۔

لیکن اس مرتبہ ہمیں زیادہ نہیں چلنا پڑا۔ اس پتھریلی گلی میں تقریباً بیس گز آگے سیتا ایک مکان کے سامنے رُک گئی۔ مکان کا لکڑی کا دروازہ خاصا اُونچا اور اتنا چوڑا تھا کہ ایک کار آسانی سے اندر داخل ہو سکتی تھی۔ آبنوسی رنگت کی لکڑی کا محرابی دروازہ خاصا بھاری لگتا تھا۔ اس پر بھی سنگ تراشی کی طرح دیدہ زیب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ دروازے کے دونوں طرف دیواروں کے ساتھ پتھر کی ایک چوکی بنی ہوئی تھی۔ چوکی پر ایک آدمی آسانی سے بیٹھ سکتا تھا۔ ان چوکیوں کے ساتھ ہی دیواروں کے ساتھ آرائشی ستون بنے ہوئے تھے جن پر ہنومان اور دوسری دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں کندہ تھیں۔ دیواروں پر بھی نیچے سے اوپر تک نازک اور خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ دروازے کے عین اُوپر جہاں محراب تھی، ایک بڑا طاقچہ بنا ہوا تھا جس میں وشنو کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔

سیتا نے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ میں نے بیگ کندھے سے اُتار کر دیوار کے ساتھ چوکی پر رکھ دیا۔ گلی میں لوگوں کی آمد و رفت تھی لیکن کوئی خاص طور پر ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ تقریباً دو منٹ بعد بھاری دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر عورت کی صورت دکھائی دی۔ اتفاق سے اس وقت میں اور کلپنا سامنے تھے۔ وہ عورت اُلجھی ہوئی نظروں سے باری باری ہماری طرف دیکھنے لگی۔

''کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' عورت نے میری طرف دیکھتے ہوئے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

''ارے..... میں ہوں دُرگا! دروازہ پوری طرح کھولو۔ ہمیں اندر تو آنے دو! پھر پوچھنا کس کو ملنا ہے۔'' سیتا کی آواز سن کر دُرگا نامی اُس عورت نے مزید آگے ہو کر دروازے سے باہر جھانکا اور سیتا کو دیکھ کر اُچھل پڑی۔

''سیتا دیوی آپ.....'' اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''میں بڑی ابھاگیہ ہوں کہ تمہارے درشن ہوئے۔ آؤ..... اندر آؤ! آپ بھی پدھاریئے مہاراج..... اندر آ جایئے!'' اُس نے بات کرتے ہوئے ہم تینوں کو پرنام بھی کیا۔

میں نے پہلے سیتا اور کلپنا کو اندر داخل ہونے کا موقع دیا پھر بیگ اُٹھا کر خود بھی اندر داخل ہو گیا۔ دُرگا نے دروازہ بند کر دیا۔ سیتا کو دیکھ کر وہ کھلی جا رہی تھی۔ لگتا تھا سیتا کے آنے سے اُسے بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی۔

میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ باہر سے معمولی نظر آنے والا یہ مکان اندر سے کسی حویلی کی طرح بہت شاندار اور بہت بڑا تھا۔ دروازے سے آگے ایک کشادہ اور پختہ روش تھی جو سامنے عمارت کے پورٹیکو تک چلی گئی تھی۔ پختہ روش کے دونوں طرف سرسبز لان تھے جن کے کناروں پر پھولدار پودوں کی کیاریاں تھیں۔ ایک طرف کا لان نسبتاً بڑا تھا اور اُس کے عین وسط میں فوارہ بھی لگا ہوا تھا جس کے اطراف میں تین جگہوں پر بانس کی کھپچیوں کے آرام دہ بینچ بنے ہوئے تھے۔ ہر بینچ پر دو آدمی آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔ دوسرے لان میں بھی تین بینچ رکھے ہوئے تھے۔ دونوں لانز کے اطراف میں ناریل کے اُونچے درختوں کی قطاریں تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ آہنی جالی کا ایک بہت بڑا پنجرہ تھا جس میں دو مور ٹہل رہے تھے۔

میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ گنجان آبادی میں ہونے کے باوجود یہ حویلی الگ تھلگ سی لگتی تھی۔ دائیں بائیں فصیل نما دیواریں خاصی اُونچی تھیں اور ان اطراف کے مکان اُن کے پیچھے چھپ کر رہ گئے تھے۔ حویلی کی عمارت دو منزلہ تھی۔ اُس کے پیچھے بھی کوئی مکان نظر نہیں آ رہا تھا جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس حویلی کے اطراف میں تمام مکان چھوٹے تھے۔ حویلی کی دو منزلہ عمارت بہت خوبصورت تھی۔ اُوپر کی منزل پر کئی خوبصورت محرابیں اور بالکونیاں تھیں۔ سب سے اُوپر ایک بہت بڑی اور خوبصورت چھتری بنی ہوئی تھی۔

''پدھاریئے مہاراج..... آپ رُک کیوں گئے؟'' دُرگا کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے بیگ اُٹھایا اور اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

وسیع و عریض پورٹیکو میں نیلے رنگ کی ایک پرانی سی کار کھڑی تھی۔ یہ پرانی کار اس شاندار حویلی سے بالکل لگا نہیں کھاتی تھی۔ پورٹیکو کے ساتھ برآمدے تک پہنچنے کے لئے تین کشادہ سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ سیڑھیاں اور وسیع و عریض برآمدے کا فرش دودھیا ماربل کا تھا۔ برآمدے کے ستونوں پر بھی ماربل لگا ہوا تھا۔ برآمدے کے کناروں پر پودوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ ہر ستون کے ساتھ رکھے ہوئے گملے میں بیلیں لگی ہوئی تھیں۔ اُن کی پتیاں چاول کے دانوں کی طرح گول، ملائم اور کسی قدر لمبی تھیں اور یہ بیلیں اُوپر تک ستون کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔ ماربل صرف اُس برآمدے ہی میں نظر آ رہا تھا۔ باقی عمارت پیلے پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ میں نے شہر میں اب تک جتنی بھی عمارتیں دیکھی تھیں سب پیلے پتھروں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ سیتا نے بتایا تھا کہ شہر کے گرد و نواح میں پہاڑیاں پیلے پتھروں ہی کی تھیں اور شہر کی تعمیر کے لئے پتھر وہیں سے لائے جاتے تھے۔ ریگستان میں پائی جانے والی پہاڑیوں کے پیلے

پتھروں کی ایک خاصیت یہ تھی کہ اُن میں سونے کی طرح چمک تھی۔ اور یہ چمک کبھی ماند نہیں پڑتی تھی۔ اور غالباً اسی وجہ سے اس شہر کو گولڈن سٹی کہا جاتا تھا۔

برآمدے کے دروازے سے آگے آٹھ فٹ چوڑا اور دس فٹ لمبا ایک کمرہ تھا اور اُس کے اندرونی دروازے کے دوسری طرف ایک وسیع لابی یا ہال تھا ایک کمرہ دائیں طرف تھا اور دو بائیں طرف۔ دائیں طرف والا کمرہ ہال ہی کی طرح بہت لمبا چوڑا تھا جس میں درمیانے درجے کا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور دروازہ تھا اور اُس طرف غالباً کچن تھا۔ بائیں طرف بھی دراصل دو ہی دروازے تھے۔ ایک تو بیڈ رُوم تھا اور دوسرے دروازے سے آگے ایک کشادہ راہداری تھی۔ اُس میں بھی آمنے سامنے ایک ایک کمرہ تھا۔ یہ دونوں کمرے بھی بیڈ رُومز تھے۔ اور سامنے باتھ رُوم کا دروازہ تھا۔

لابی کے آخر میں اُوپر جانے کے لئے لکڑی کا کشادہ اور بل کھاتا ہوا گول زینہ تھا۔ زینے کے ساتھ سامنے والی دیوار کے آدھے حصے میں بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے اور باقی آدھے حصے میں باریک جالی تھی۔ اس طرف سے تازہ ہوا اور روشنی اندر آ رہی تھی۔ اُس لابی میں بھی ایک الگ کارپٹ بچھا ہوا تھا اور آمنے سامنے والی دیواروں کے ساتھ ذرا ہلکے قسم کے مگر آرام دہ صوفے لگے ہوئے تھے۔ میں نے بیگ قریبی صوفے پر رکھ دیا تھا۔

''اوپر آ جاؤ..... وہیں چل کر بیٹھیں گے۔'' سیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے دوبارہ بیگ اُٹھانا چاہا تو سیتا کے اشارے پر میں نے بیگ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ میں اور کلپنا، سیتا کے ساتھ گول زینے پر چڑھتے ہوئے اُوپر آ گئے۔ اُوپر کا نقشہ بھی ویسے ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں برآمدے کی چھت پر بھی ایک کمرہ بنا ہوا تھا اور اُس سے آگے پورٹیکو کی چھت پر دبیز گھاس اُگی ہوئی تھی اور کناروں پر پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ زینے کے اختتام پر سامنے وسیع و عریض لابی تھی۔ مزید اُوپر جانے کے لئے دیوار کے ساتھ ماربل کی سیڑھیاں تھیں۔ ہم زینے کے سامنے لابی میں سے ہوتے ہوئے بائیں طرف والے ہال کمرے میں داخل ہو گئے۔ نیچے والا ہال کمرہ تو ڈرائنگ رُوم کے طور پر آراستہ تھا جبکہ یہ وسیع و عریض کمرہ بیڈ رُوم کا منظر پیش کر رہا تھا۔

اس خوابگاہ کو دیکھ کر میری آنکھیں مارے حیرت کے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وسط میں ایک بہت بڑا گول بیڈ تھا جس پر ہلکے گلابی رنگ کی ریشمی چادر بچھی ہوئی تھی۔ بیڈ کی ایک سائیڈ پر ٹیک بنی ہوئی تھی جس کے ساتھ خوبصورت تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ان تکیوں ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس گول بیڈ پر کس طرف سر ہونا چاہئے اور کس طرف پیر۔

ایک طرف بہت قیمتی اور آرام دہ صوفہ بھی آراستہ تھا جبکہ ایک دیوار کے قریب سرکنڈے سے بنے ہوئے موڑھے بھی رکھے ہوئے تھے۔ بیڈ کے پچھلی طرف ایک شاندار بار کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے پچھلی طرف دیوار کے ساتھ شیشے کی لمبی چوڑی الماری تھی جس میں لاتعداد

خوبصورت گلاس اور جام آراستہ تھے لیکن شراب کی کوئی بوتل کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ کھڑکیاں بھی محرابی اور کافی کشادہ تھیں جن کے سامنے ہرے رنگ کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے بعد سیتا نے آمنے سامنے کی دیواروں پر صرف دو بتیاں جلائی تھیں۔ بلبوں کے سامنے شیڈ لگے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ روشنی دیواروں سے پھوٹ رہی ہو۔ ماحول بڑا خواب آگیں سا لگ رہا تھا۔ چھت پر تین فانوس بھی ٹنگے ہوئے تھے۔ درمیان والا فانوس بڑا تھا اور دائیں بائیں والے نسبتاً چھوٹے۔ لیکن سیتا نے ان میں سے کوئی فانوس جلانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

سیتا بیڈ پر ڈھیر ہوگئی۔ میں صوفے پر بیٹھا تو کلپنا بھی میرے قریب ہی دوسرے صوفے پر ٹک گئی۔ اُس کی آنکھوں میں شدید اُلجھن تھی اور انداز میں جھجک نمایاں تھی۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا وہ پشت کے بل چت لیٹی ہوئی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اُس کے سینے کا زیر و بم بہت ہی قیامت ڈھا رہا تھا۔ منی اسکرٹ نما گھاگھرا بھی کچھ سمٹ گیا تھا۔

میرا سانس تیز ہونے لگا۔ میں صوفے سے اُٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ پردہ ہٹا کر کھڑکی کھول دی اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس کھڑکی سے سرسبز لان کا خوبصورت منظر نظر آ رہا تھا۔ مجھے وہاں کھڑے ہوئے چند منٹ سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ پیچھے سے ایک آواز سن کر میں مُڑ گیا۔ وہ دُرگا تھی جو دروازے میں کھڑی سیتا سے پوچھ رہی تھی کہ ہم لوگ چائے پئیں گے یا کچھ ٹھنڈا لینا پسند کریں گے۔

''چائے ہی چلے گی دُرگا دیوی!'' سیتا نے اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ٹیلی فون کہاں ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''ٹیلی فون تو نیچے ہے..... کہو تو اُوپر لا دُوں؟'' دُرگا نے پوچھا۔

''ہاں..... اُوپر لا دو! اور چائے بھی اُوپر ہی لے آنا۔'' سیتا نے کہا۔

دُرگا چلی گئی۔ سیتا اُٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ ''چتون سنگھ کو صورتحال سے آگاہ کرنا بہت ضروری ہے۔'' اُس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''ایسا نہ ہو کہ وہ بے خبری میں کسی مصیبت میں پھنس جائے۔''

''تمہارے اطمینان پر مجھے حیرت ہو رہی ہے.....'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اُس حویلی میں ہم اپنے بہت سے نشانات چھوڑ کر آئے ہیں جن سے جیسلمیر میں تمہاری موجودگی کا پتہ لگایا جا سکتا ہے..... اور جب تمہاری تلاش شروع ہوگی تو شاید یہ جگہ بھی محفوظ نہ رہے۔''

''تم اس کی چنتا مت کرو!'' سیتا نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''یہ جگہ ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔ اگر جیسلمیر میں میری موجودگی کا راز کھل بھی گیا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں اس حویلی میں آ سکتی ہوں۔''

مجھے سیتا کے سکون و اطمینان پر واقعی حیرت تھی۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ انڈین انٹیلی جنس ''را'' کے لئے کام کرتی ہے اور مجھے پکڑنے کے لئے ''را'' کے ہی ایک منصوبے کے تحت کشمیر گئی تھی۔ لیکن مجھے دیکھ کر اُس کی نیت بدل گئی..... کشمیری مسلمانوں پر ہندو فوجیوں کی زیادتیوں کو دیکھ کر بھی وہ اپنوں سے متنفر ہوگئی تھی۔ اُس کے سینے میں پہلے ہی ایک چنگاری سلگ رہی تھی۔ انتقام کی آگ..... گوپال سنگھ کے ہاتھوں اپنی عزت لٹنے کے بعد اُس نے اُس چنگاری کو بجھنے نہیں دیا تھا اور پھر کشمیر میں سب کچھ دیکھ کر یہ چنگاری بھڑک اُٹھی۔

ڈوڈا میں اپنے ماما کی بستی کے قریب غار کے سامنے، جہاں میں پناہ لئے ہوئے تھا، دو ہندو فوجیوں نے جب اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو یہ شعلہ جوالا بن گئی اور غالباً اُسی وقت اُس نے طے کر لیا تھا کہ ہندو فوجیوں کے خلاف اپنی جنگ شروع کر دے گی۔

جموں کے قریب مانسر جھیل کے کنارے ہندو فوجی افسروں کے قتل عام میں ہمارا ساتھ دے کر اُس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ واقعی ان بھیڑیوں کو اُن کی خونخواری کا مزہ چکھانا چاہتی ہے۔ لیکن وہ مجھے میدانِ جنگ سے نکال لائی۔ وہ میری رکھشا چاہتی تھی۔ مجھے بچانا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کزن گوپال سے بھی اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔

اُس کی واپسی چوری چھپے ہوئے تھی۔ اُس نے کسی کو اپنے بارے میں اطلاع نہیں دی تھی۔ کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر واپس آ رہی ہے۔ لیکن جب ہنومان گڑھ کے گیسٹ ہاؤس میں ''را'' کے ایک ایجنٹ نے اُسے دیکھ لیا تو سیتا نے بڑی بے رحمی سے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ''را'' کے اُس ایجنٹ نے اپنی زبان بند رکھنے کے لئے اُس کے حسن و شباب سے لطف اندوز ہونے کی رشوت مانگی تھی اور سیتا کا کہنا تھا کہ وہ اُسے یہ رشوت دے بھی دیتی تو وہ اُس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ اُسے بار بار بلیک میل کرتا اور پھر کسی بھی وقت اُس کے بارے میں دوسروں کو خبر دے سکتا تھا۔ ایسی صورتحال سے بچنے کے لئے سیتا نے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

اور پھر جیسلمیر پہنچتے ہی وہ ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ اُس نے کیپٹن گوپال سنگھ سے اپنا انتقام لے لیا تھا۔ وہ کیپٹن گوپال کو نامرد کر کے چھوڑ دینا چاہتی تھی تاکہ وہ زندگی بھر اس سزا کو یاد رکھ سکے۔ لیکن کیپٹن گوپال نے فرار ہونے کی کوشش کر کے خود اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ اُس کی لاش حویلی کے پچھلی طرف گڑھا کھود کر دبا دی تھی۔

یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا۔ کیپٹن گوپال کے قتل کو چھپایا جا سکتا تھا۔ صبح چتون سنگھ کو بلا لیا جاتا اور اگر کوئی کیپٹن گوپال کا پوچھنے آتا تو چتون سنگھ اُسے ٹال دیتا اور اس طرح ہم بھی اُس حویلی میں محفوظ رہتے۔ لیکن کلپنا کے آنے سے معاملہ گڑبڑ ہوگیا۔ ہم نے کلپنا کو حویلی میں پناہ دی تھی۔ دو غنڈے بھی اُس کا پوچھتے ہوئے حویلی کے پھاٹک تک آئے تھے اور میں نے اُنہیں بھگا دیا تھا۔ اُن غنڈوں کو بھگا دینے سے ہم مطمئن ہو گئے تھے اور یہی ہماری غلطی تھی۔ اگر ہم

اُسی وقت کلپنا کو کہیں چھپا دیتے اور گنگو کو اندر بلا کر اُسے خود کلپنا کو حویلی میں تلاش کرنے کا موقع دیتے تو وہ یقیناً مطمئن ہو جاتا اور دوبارہ اس طرف کا رُخ نہ کرتا۔ لیکن میں نے پستول کی زد پر اُسے چلے جانے پر مجبور کر دیا اور اُس کے دل میں شاید یہ شبہ جاگزیں ہو گیا تھا کہ کلپنا اسی حویلی میں موجود ہے۔ اور پھر رات کے آخری پہر وہ اپنے گنجے ساتھی کے ساتھ حویلی میں گھس آیا۔ لیکن اُسے اپنے ساتھی کی لاش چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

گنگو کا فرار ہو جانا ہی ہمارے لئے پریشانی کا باعث بنا تھا۔ وہ گنجا اگرچہ گنگو کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اُس کے سینے میں گنگو کا خنجر پیوست تھا اور خنجر کے دستے پر اُس کی اُنگلیوں کے نشان تھے۔ ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم اس قتل کے معاملے میں پولیس کو مطمئن کر سکتے تھے لیکن اس طرح سیتا کو سامنے آنا پڑتا۔ سیتا کے سامنے آنے کا مطلب یہ ہوتا کہ یہاں میری موجودگی بھی راز میں نہ رہ سکتی اور اس طرح ہم ایک نئے چکر میں پھنس جاتے۔ سیتا نے وہ حویلی چھوڑ دی۔ اُس کے خیال میں یہ نئی پناہ گاہ ہمارے لئے سب سے زیادہ محفوظ تھی۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ ہم یہاں بھی زیادہ دنوں تک محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔

دُرگا کے آنے سے میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ وہ نیچے سے ٹیلی فون لے آئی تھی۔ اُس نے ٹیلی فون سیٹ صوفے کے ساتھ شیشے کے ٹاپ والی ایک چھوٹی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور اُس کا پلگ پیچھے دیوار کے ساکٹ میں لگا دیا۔

''میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' دُرگا کہتے ہوئے باہر چلی گئی۔

سیتا میرے قریب سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی اور فون کا ریسیور اُٹھا کر نمبر ملانے لگی۔ رابطہ قائم ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ کال کسی اور نے ریسیو کی تھی لیکن تھوڑی دیر بعد چتون سنگھ لائن پر آ گیا.....

''ہیلو چتون سنگھ! میں سیتا بول رہی ہوں..... کیسے ہو؟'' اُس نے کہا۔

جواب میں جو کچھ کہا گیا اُسے سن کر سیتا کی آنکھوں میں تشویش سی اُبھر آئی۔ وہ تقریباً دس منٹ تک بات کرتی رہی۔ اُس نے چتون سنگھ کو کیپٹن گوپال کے بارے میں کچھ بتائے بغیر حویلی کی صورتحال سے آگاہ کر دیا۔

''مجھے اس حادثے کا سن کر افسوس ہوا چتون سنگھ!'' وہ آخر میں کہہ رہی تھی۔ ''تم میری بات کا برا مت ماننا۔ کیونکہ یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا۔ اس طرح تم پولیس کے جھنجھٹ سے بچ جاؤ گے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ میری باتوں کا دھیان رکھنا! میں کسی مناسب وقت پر تم سے ملنے کی کوشش کروں گی۔'' اُس نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا..... کس حادثے کی بات کر رہی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کل سہ پہر حویلی سے نکلنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد اُس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔'' سیتا کہنے لگی۔ ''وہ ایک آٹو رکشہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ رفتار خاصی تیز تھی۔ ایک موڑ پر اچانک ہی ایک کار

سامنے آ گئی۔ رکشہ ڈرائیور کے کنٹرول میں نہ رہ سکا اور کار سے ٹکرا کر قلابازیاں کھاتا ہوا ایک اور آٹو رکشے سے ٹکرا گیا۔ چتون سنگھ کے سر اور بازو پر چوٹیں لگی تھیں۔ خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ڈرائیور بھی زخمی ہوا تھا۔ لوگوں نے اُنہیں سرکاری ہسپتال پہنچا دیا جہاں آدھی رات کے قریب چتون سنگھ کو ہوش آ گیا۔ اس دوران اُس کے سر اور بازو کے ایکسرے لئے جا چکے تھے۔ تمام ہڈیاں محفوظ تھیں۔ اُس کے زخموں کی ڈریسنگ کر کے رات بھر اُسے ہسپتال ہی میں رکھا گیا۔ صبح اُس نے اپنے عزیز دلبر سنگھ کو اطلاع بھجوا دی جو آج صبح آٹھ بجے کے قریب اُسے ہسپتال سے گھر لے آیا۔ بہرحال! اُس کی حالت زیادہ تشویش ناک نہیں ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''یہ حادثہ چتون سنگھ کے حق میں ہی بہتر ثابت ہوگا۔ وہ اس طرح کہ اگر آج ہمارے آنے کے بعد حویلی کی صورتحال پولیس کے علم میں آ چکی ہو یا کسی وقت پولیس وہاں پہنچ جائے تو چتون سنگھ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ پولیس اُسے پریشان نہیں کرے گی۔ وہ کل سہ پہر سے آج صبح آٹھ بجے تک سرکاری ہسپتال میں تھا اور حویلی میں جو کچھ بھی ہوا اُس کی عدم موجودگی میں ہوا۔ اس طرح اُس پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔''

''ہاں..... یہ بات تو ہے۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پولیس دیگر ذرائع سے بھی حویلی میں ہماری موجودگی کا پتہ لگا سکتی ہے۔ ہم وہاں بہت سے نشان چھوڑ کر آئے ہیں۔ مثلاً وہ خون آلود قالین جو ہم نے چھت پر ڈال دیا تھا، ہمارے بیڈ رُوم میں پڑے ہوئے کلپنا کے پھٹے ہوئے کپڑے، کلپنا والے بیڈ رُوم میں دھینگا مشتی کے آثار اور گنجے کی لاش۔ پولیس ان باتوں سے بہت کچھ اخذ کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ.....''

''اس کے علاوہ کیا؟'' سیتا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''میری اور تمہاری اُنگلیوں کے نشان جگہ جگہ پر موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس کے باوجود فوری طور پر ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا اور دُرگا کی طرف دیکھنے لگی جو ٹرے اُٹھائے اندر آ رہی تھی۔ سیتا نے مزید کوئی بات نہیں کی۔

دُرگا بھی وہیں بیٹھ گئی۔ چائے کے دوران وہ سیتا سے باتیں کرتی رہی۔ اُس سے اُس کے حالات پوچھتی رہی۔ میرے اور کلپنا کے بارے میں اُس نے سیتا سے ایک لفظ بھی نہیں پوچھا تھا۔

''تم لوگ بیٹھو! میں بھوجن کا بندوبست کروں۔ دوپہر کے کھانے پر کھل کر باتیں ہوں گی۔'' دُرگا اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

''دُرگا دیوی!'' سیتا نے کہا۔ ''میں یہاں نہیں ہوں..... کہیں بھی نہیں ہوں..... تم نے میرے بارے میں کچھ نہیں سنا۔''

''میں نے تمہارے بارے میں کچھ سنا نہ تمہیں دیکھا.....'' دُرگا نے مسکرا کر کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

کلپنا اُس وقت سے اب تک خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر شدید اُلجھن کے تاثرات تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آنکھوں کی سرخی تو شاید رات بھر جاگنے کا نتیجہ تھی اور اُلجھن کے تاثرات اس بات کی عکاسی کر رہے تھے کہ وہ رات سے لے کر اب تک کی صورتحال کو نہیں سمجھ سکی تھی۔ پہلے چند گھنٹے اُس پر سخت گراں تھے۔ میرے خیال میں پچھلے چند گھنٹے تو کیا وہ پچھلے کئی مہینوں سے اذیت کا شکار تھی۔

بوڑھا ٹھاکر بلبیر سنگھ اُس کی جوانی کو شکار کرنے کے لئے گھات لگائے بیٹھا تھا۔ وہ کئی مہینوں تک اُس بوڑھے شکاری سے خوفزدہ رہی تھی۔ پھر اُسے دھوکے سے یہاں لے آیا گیا۔ اُس کی ماں کو ٹھاکر سے کلپنا کی شادی کا جھانسہ دیا گیا تھا اور جب حقیقت آشکارہ ہوئی تو اُس نے بیٹی کو لے کر ٹھاکر کی حویلی سے بھاگنے کی کوشش کی مگر پکڑی گئی اور رام چند دھوبی کے ہاتھوں ماری گئی اور وہیں سے کلپنا کے بدترین ابتلا کا سمے شروع ہوا۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ ہمارے پاس پہنچ گئی۔ اور پھر گزشتہ رات تو وہ زندگی کے سنگین ترین تجربے سے دوچار ہوئی تھی۔ اُس جیسی لڑکیاں بہت دیر میں ایسے صدمات سے سنبھلتی ہیں۔ اور میرا خیال تھا کہ کلپنا بھی ابھی تک اُس صدمے سے نہیں سنبھل سکی تھی۔ اُس کے چہرے کی کشیدگی اور سراسیمگی اُس کی اندرونی کیفیت کا اظہار کر رہی تھی۔

''کلپنا!'' سیتا نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم رات بھر جاگی ہو۔ ذہنی صدمے سے بھی دوچار ہوئی ہو..... چاہو تو سو جاؤ! دوپہر کے کھانے کے سمے تمہیں جگا دوں گی۔''

''میری آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی ہے۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے ہیں۔ میں واقعی سونا چاہتی ہوں۔'' کلپنا فوراً ہی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''مجھے بھوجن سے مت جگانا دیدی! بھوک بالکل نہیں ہے۔''

''آؤ..... میں تمہیں دوسرے کمرے میں چھوڑ دوں۔'' سیتا بھی اُٹھ گئی اور میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ نجانے مجھے کیوں اُس کمرے میں اُلجھن سی محسوس ہو رہی تھی اور میں کسی اور جگہ بیٹھنا چاہتا تھا۔

ہم تینوں اُس کمرے سے نکل آئے اور لان کے آخر میں بائیں طرف والے دروازے میں داخل ہو گئے۔ سیتا نے دروازہ پوری طرح کھول کر کھٹکا لگا دیا تاکہ وہ دوبارہ بند نہ ہو جائے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں اُوپر کی منزل کا نقشہ بھی نیچے جیسا ہی تھا۔ اُس دروازے سے ایک کشادہ اور مختصر راہداری تھی۔ دائیں بائیں ایک ایک کمرہ تھا اور سامنے باتھ رُوم کا دروازہ تھا۔

سیتا دائیں طرف والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی اور بتی جلا دی۔ یہ بھی ایک شاندار بیڈ رُوم تھا۔ ڈبل بیڈ پر ہلکے نیلے رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ ملحقہ باتھ رُوم بھی تھا اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

''تم یہاں آرام سے سو جاؤ..... ہم سامنے والے کمرے میں ہیں۔'' سیتا نے کہا۔

کلپنا میری طرف دیکھ کر جھجکتی ہوئی بستر پر لیٹ گئی۔ سیتا اور میں سامنے والے بیڈ رُوم میں آ گئے۔ یہ کمرہ دوسرے کمرے سے نسبتاً بڑا تھا اور اُس کی ایک کھڑکی سے بھی لان کے ایک حصے کو دیکھا جا سکتا تھا۔ سیتا نے اگرچہ بتی جلا دی تھی لیکن میں نے کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا اور کھڑکی پوری طرح کھول دی۔ تازہ ہوا کے ساتھ کچھ دُھوپ بھی اندر آنے لگی۔ اکتوبر کے مہینے کی نرم دُھوپ بری نہیں لگ رہی تھی۔

بیڈ کے علاوہ یہاں دو آرام دہ کرسیاں اور ایک کوچ بھی بچھا ہوا تھا۔ میں ایک کرسی کھینچ کر کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ سیتا میرے سامنے کوچ پر پہلو کے بل دراز ہوگئی۔ بازو کی کہنی کشن پر ٹکا کر سر ہتھیلی پر رکھ لیا تھا۔ سیتا کا رُخ میری طرف تھا۔ چنری تو اُس نے حویلی میں داخل ہوتے ہی اُتار پھینکی تھی۔ اس طرح اس پہلو کے بل لیٹنے سے مختصر سی چولی کچھ اور سمٹ کر رہ گئی تھی اور گداز سینے کے اُبھار جیسے چولی کی قید سے آزاد ہونے کو مچل رہے تھے۔

''یہ دُرگا دیوی کون ہے..... اور یہ حویلی کس کی ہے؟'' میں نے اُس کی طرف سے نظریں ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''دُرگا دیوی.....'' سیتا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ''تم اسے میرے پتا جی کی رکھیل کہہ سکتے ہو۔''

''کیا.....؟'' میں اُچھل پڑا۔ ''تم شاید مذاق کر رہی ہو۔''

''ایسی باتیں تو مذاق میں بھی کسی سے نہیں کہی جا سکتیں۔ لیکن چونکہ تم نے پوچھا اس لئے میں نے سچ سچ بتا دیا۔''

''اور یہ حویلی؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''یہ بھی پتا جی کی ملکیت ہے..... بلکہ تھی۔'' سیتا مسکرائی۔ ''کئی سال پہلے یہ حویلی پتا جی نے دُرگا دیوی کو دان کر دی تھی۔''

''دلچسپ!'' میں نے کہا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ راجستھان کے ہر بڑے شہر میں تمہارے پتا جی کے مکان اور حویلیاں ہیں۔ تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ راجوں مہاراجوں کی سرزمین ہے۔ تمہارے ہی کہنے کے مطابق ہند سرکار نے تمام ریاستیں ختم کر کے راجوں مہاراجوں کے اختیارات سلب کر لئے ہیں اور گزارے کے لئے اُن کے الاؤنس یا وظیفے مقرر کر دیئے ہیں۔ کیا تمہارے پتا جی بھی کسی ریاست کے راجہ تھے؟ اتنی جائیداد تو کسی راجہ ہی کی ہو سکتی ہے۔ ایسی شاندار حویلیاں..... میری تو عقل دنگ رہ گئی ہے۔''

سیتا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''تمہارا اندازہ درست ہے۔'' وہ بولی۔ ''میرے پتا جی مہاراجہ سدھرشن سنگھ جے پور کی بغل میں ایک چھوٹی سی ریاست کے والی تھے۔ تمام ریاستوں سے اُن کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ سارسکا میں اُن کے شاندار محل میں آئے دن راجستھان کے تمام راجاؤں کی

دعوتیں ہوتی رہتیں۔ یہ محفلیں کئی کئی روز تک جمتیں۔ سارسکا میں میلوں دُور تک پھیلا ہوا بہت بڑا جنگل ہے جس میں چوہے سے لے کر شیر اور چیتے جیسے خونخوار درندے بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ میرے پتا جی ان راجاؤں کے لئے شکار کا بندوبست کرتے اور جب تک وہ سارسکا میں رہتے اُن کی دل لگی کو ہر سامان مہیا کیا جاتا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''تمام راجاؤں نے پتا جی کو اپنے اپنے علاقے میں مفت زمینیں دیں۔ جن پر پتا جی نے شاندار حویلیاں تعمیر کروائیں۔ کچھ قدیم حویلیاں اُنہوں نے خرید لی تھیں جن میں سے بیشتر کو بعد میں ہندسرکار نے قومی ورثہ قرار دے کر اپنے قبضے میں لے لیا اور ملک کا بٹوارہ ہونے کے بعد جب ریاستیں ختم کر دی گئیں تو سارسکا پیلس بھی ہندسرکار نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ پتا جی گھر والوں کو لے کر جے پور منتقل ہو گئے اور وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ جے پور میں بھی اُن کی کئی حویلیاں ہیں اور یہاں جیسلمیر میں بھی۔ یہ دو حویلیاں جو تم دیکھ چکے ہو انہی میں سے ہیں۔''

''میں نے تمہارے پتا جی کی حویلیوں کی تعداد نہیں دُرگا دیوی کے بارے میں پوچھا تھا۔'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''ان کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ اور دُرگا ان میں سے ایک ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''جیسا کہ میں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں کہ راجاؤں کے پاس فوجوں کو لڑانے اور بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ اُن کے راج ختم ہوئے، تمام اختیارات سلب ہو گئے تو اُنہوں نے دوسرے مشغلے اختیار کر لئے۔ ریچھ اور کتوں کی لڑائی، مرغ لڑانا، ریس کے گھوڑے پالنا، راگ رنگ کی محفلیں جمانا اور عورتیں پالنا اُن کے محبوب ترین مشاغل ہیں۔ جس طرح عربوں نے حرم بنا رکھے ہیں اسی طرح راجاؤں نے بھی خوبصورت عورتیں جمع کر رکھی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عرب شیخ کسی عورت سے باقاعدہ نکاح کر کے اپنے تصرف میں لاتے ہیں اور دو چار مرتبہ برتنے کے بعد اُسے حرم میں ڈال کر بھول جاتے ہیں۔ وہ اُن کی قانونی بیویاں ہوتی ہیں۔ لیکن ہندوستان کے راجے ان معاملات کو قانون اور دھرم سے بالکل الگ رکھتے ہیں۔ کوئی عورت پسند آ گئی تو اُسے اپنے دل میں بٹھا لیا۔ جی بھر گیا تو اُسے میلے کپڑوں کی طرح اُتار کر پھینک دیا۔ انہیں تم رکھیل کہہ لو یا داشتہ، وہ اپنے کسی حق کا دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ ان کی اولادیں دوسری چیزوں کی طرح باپ کے نام سے بھی محروم رہتی ہیں۔ دُرگا دیوی کا شمار بھی ایسی ہی عورتوں میں ہوتا ہے۔ مگر اس کی داستان دوسری عورتوں سے مختلف اور دلچسپ ہے۔''

''اور میں وہی داستان سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''چند سال پہلے پتا جی اپنے دوستوں کے ساتھ جودھپور گئے تھے۔'' سیتا کہنے لگی۔ جودھپور میں قیام کے دوران ایک روز وہ کیلانا جھیل پر چلے گئے۔ بہت خوبصورت جھیل ہے۔ بہت دُور

دُور سے لوگ سیر و تفریح کے لئے وہاں آتے ہیں۔ وہاں چند اچھے ریسٹورنٹ اور رہائشی ہوٹل بھی ہیں۔ دُرگا سے پتا جی کی ملاقات جھیل کنارے ایک رہائشی ہوٹل ہی میں ہوئی تھی۔ دُرگا اپنے ماتا پتا کے ساتھ مکرانا سے آئی ہوئی تھی۔ وہ بھی کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مکرانا میں سنگ مرمر کے پہاڑ ہیں اور دنیا کا بہترین سنگ مرمر اور ماربل انہی پہاڑوں میں ہوتا ہے۔ دُرگا کے پتا جی بھی سنگ مرمر ہی کے بزنس سے وابستہ تھے۔ پتا جی سے پہلی ملاقات میں ہی دُرگا اُن پر مرمٹی، اور پھر یہ ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ وہ لوگ ایک ہفتہ جھیل والے ہوٹل میں رہے پھر شہر آ گئے۔ پتا جی کا قیام تو وہاں اپنی ایک چھوٹی سی حویلی میں تھا جبکہ دُرگا اپنے ماتا پتا کے ساتھ ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ حویلی میں آ کر پتا جی سے ملتی رہی۔ دُرگا کے ماں باپ نے صورتحال کی نزاکت کا اندازہ لگا لیا اور وہ دُرگا کو زبردستی مکرانا واپس لے گئے۔ دُرگا مکرانا سے جے پور آتی رہی اور چوری چھپے پتا جی سے ملتی رہی۔

بیوی یعنی میری ماتا جی کے ہوتے ہوئے پتا جی دوسری شادی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن وہ دُرگا سے بھی دستکش ہونے کو تیار نہیں تھے۔ وہ جب بھی جے پور آتی پتا جی اُسے دوسری حویلی میں ٹھہراتے اور راتیں اُس کے ساتھ گزارتے۔ ایک روز وہ دُرگا کو ماتا جی والی حویلی میں لے آئے۔ ماتا جی اُسے دیکھ کر بھڑک اُٹھیں۔ ٹھاکروں اور راجہ مہاراجوں کی پتنیاں اس قسم کی صورتحال کی عادی ہوتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ ان کے پتی دوسری عورتوں کے ساتھ بھی دادِ عیش دیتے ہیں۔ لیکن یہ دیویاں اپنے پتیوں کے ان معاملات میں بھی مداخلت نہیں کرتیں۔ دُرگا کو دیکھ کر ماتا جی کے بھڑکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ جے پور یونیورسٹی میں اُن کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ دُرگا نے ماسٹرز کی ڈگری اسی یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔

گھر میں خوب ہنگامہ ہوا..... پتا جی دُرگا کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ ماتا جی جانتی تھی کہ پتا جی نے حویلی کے باہر دوسری عورتیں بھی رکھی ہوئی ہیں جن سے وہ وقتاً فوقتاً دل بہلاتے رہتے ہیں۔ اُنہوں نے اس شرط پر دُرگا کو برداشت کرنے کی اجازت دے دی کہ وہ اسے جے پور میں نہیں رکھیں گے۔ دُرگا کے ماں باپ نے بھی اُس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ پتا جی اُسے مکرانا بھی نہیں لے جا سکتے تھے۔ وہ اسے جیسلمیر لے آئے اور یہ حویلی اُس کے سپرد کر دی۔ وہ مہینے میں ہفتہ دس دن کے لئے یہاں ضرور آتے۔ لیکن حسب عادت اُن کا دل بھر گیا۔ آمد و رفت میں وقفے آنے لگے جو طویل ہوتے گئے۔ پتا جی نے دُرگا کے ساتھ یہ مہربانی ضرور کی کہ یہ حویلی قانونی طور پر اس کے نام منتقل کر دی اور اس کے لئے تاحیات ایک معقول رقم کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ تین چار مہینوں بعد پتا جی کو جب دُرگا کی یاد آتی ہے تو چند روز کے لئے یہاں آ جاتے ہیں۔ وہ بیڈ روم جہاں ہم پہلے گئے تھے پتا جی کے لئے مخصوص ہے۔''

''لیکن دُرگا سے تمہارے اتنے خوشگوار تعلقات کیوں ہیں؟'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ ''اُس نے تمہاری ماں کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ تمہیں تو اُس سے نفرت ہونی

چاہئے تھی۔''

''دُرگا دیوی بہت اچھی مہیلا (خاتون) ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''رہی میری ماتا کے حق پر ڈاکے کی بات تو میری ماتا جی کو کس چیز کی کمی ہے؟ اور دوسری عورتیں..... اُن کا کیا کروں؟ اور میں نے تو ویسے بھی کبھی بڑوں کے معاملے میں مداخلت کی کوشش نہیں کی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''اس حویلی میں منتقل ہونے کے بعد بھی دُرگا دیوی وقتاً فوقتاً جے پور کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ یہ مجھے شروع ہی سے بہت اچھی لگتی تھی۔ یہ جب بھی جے پور آتی پتا جی مجھے اُس سے ملانے کے لئے ضرور لے جاتے۔ ماتا جی کو بھی اس کا پتہ چل گیا۔ بالآخر اُنہوں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ وہ دُرگا سے بھی ملنے لگیں اور کبھی یہاں بھی آنے لگیں۔ دُرگا مجھ سے عمر میں تیرہ چودہ سال ہی بڑی ہے۔ لیکن مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتی ہے۔''

دُرگا کے بارے میں میرا اندازہ بھی یہی تھا کہ اُس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی اور اب سیتا کی باتوں نے اس کی تصدیق کردی تھی۔

ہم دونوں بھی رات بھر نہیں سوئے تھے۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ ہم دونوں میں سے کسی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ ہم دوپہر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر دُرگا ہمیں نیچے لے گئی۔

کھانے میں دو تین چیزیں تھیں۔ میتھی آلو کی بھجیا، پالک کے کوفتے جن میں پنیر استعمال کیا گیا تھا۔ سبزی کی ایک اور ڈش تھی اور اُس میں بھی پنیر شامل تھا۔ گوشت نہ ہونے کے باوجود کھانا بے حد عمدہ اور لذیذ تھا۔ سیتا نے دُرگا کو بھی میرا نام مہابیر ہی بتایا تھا۔ اگر اُسے بتایا جاتا کہ میں مسلمان ہوں تو شاید وہ میرے لئے گوشت بھی پکالیتی لیکن سیتا کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھی اس لئے اُس نے مجھے ہندو کے نام سے ہی متعارف کرایا تھا۔

کھانے کے بعد سستی طاری ہوگئی اور دماغ بوجھل ہونے لگا۔ میں سیتا کو وہیں چھوڑ کر اُوپر والے بیڈرُوم میں آگیا اور بستر پر لیٹا تو چند منٹ میں ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

بستر پر لیٹنے سے پہلے میں نے بتی بجھا دی تھی۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا سا تھا۔ دماغ پر ابھی تک نیند کا خمار طاری تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے کروٹ لی تو میرا ہاتھ کسی سے ٹکرا گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ سیتا ہوگی جو کسی وقت یہاں آکر لیٹ گئی تھی۔ میں نے اُسے بازو کی لپیٹ میں لے کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ذرا کسمسائی تو میں نے اُسے سینے سے لپیٹ کر دونوں بانہوں میں سمیٹ لیا..... اُس کا گداز بدن میرے سینے میں ہلچل مچانے لگا۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی..... میں نے اُسے کچھ اور بھینچ لیا۔

ایسا کرنے میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ میں نے مجاہدانہ زندگی گزاری تھی۔ میرے ہاتھ رائفلوں اور گولہ بارود سے تو بہت اچھی طرح کھیلنا جانتے تھے لیکن کسی عورت کی طرف تو میں نے کبھی میلی نظر سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ انگوری طویل عرصہ میرے ساتھ رہی تھی۔ ہم پہاڑوں میں کئی مرتبہ ساتھ لپٹ کر سوئے تھے مگر میرے سینے میں شہوانی جذبات نے کبھی سر

نہیں اُبھارا تھا۔

اور پھر ڈوڈا میں سیتا سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے ایک نئی زندگی دی تھی۔ وہ مجھ سے پیار کرنے لگی تھی۔ اور پھر غار ہی میں اُس نے مجھے زندگی کی ایک نئی لذت سے روشناس کرایا تھا..... میں اُس وقت انجانے سے جذبات کے سیلاب میں بہہ گیا تھا اور بہت دیر بعد جب حواس بحال ہوئے تھے تو مجھے اس طرح بہک جانے پر افسوس بھی ہوا تھا۔

اس کے بعد بھی سیتا نے ایک دو مرتبہ مجھے زیر کیا تھا۔ میں اگرچہ اُس سے بچنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن وہ مجھے گھیر ہی لیتی تھی۔ میں نے ازخود کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس وقت نجانے مجھے کیا ہوا تھا..... نیند کا خمار تھا یا کچھ اور بات تھی میں اُسے اپنے آپ میں سمیٹنے کی کوشش کررہا تھا۔

اور پھر وہ آواز سن کر میں چونک گیا..... میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور پھر یوں لگا جیسے میرے سر پر بم پھٹا ہو..... دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ وہ سیتا نہیں کلپنا تھی..... میں نے اُسے اپنے سے الگ ہٹا دیا اور ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کلپنا بستر پر پڑی میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں سرخی اور چہرے پر سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں اور دماغ میں سنسناہٹ تھی۔ سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں پلنگ سے اُتر کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوگیا اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

جس لڑکی نے عزت بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی، جسے ہم نے غنڈوں سے بچا کر اپنے پاس پناہ دی تھی وہ کس طرح میری آغوش میں آنے کو مچل رہی تھی۔ کئی منٹ بعد میں اپنی کیفیت پر قابو پاسکا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا کلپنا پلنگ پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اُس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر اُس کے قریب آگیا۔

''کلپنا!'' میں نے دھیمے لہجے میں اُسے پکارا۔ ''اپنے کمرے میں جاؤ! اگر سیتا نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو نجانے کیا سمجھے گی۔''

''مجھے معاف کردو مہابیر جی!'' اُس نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں یہاں آکر کھاٹ کے کنارے پر لیٹ گئی اور تم نے مجھے اپنی طرف کھینچا تو.....''

''بھول جاؤ اس بات کو۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''کچھ نہیں بگڑا۔ اگر مجھے بروقت ہوش نہ آجاتا تو..... بہرحال! تم اپنے کمرے میں جاؤ!''

کلپنا نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا، پلنگ سے اُتر کر وہ میرے سامنے جھک گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرے پیر چھوئے اور باہر چلی گئی۔ میں کچھ دیر اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ میرا دماغ

اب بھی سلگ رہا تھا۔ کلپنا کے گداز بدن کا لمس سینے میں ہلچل مچائے ہوئے تھا۔

میں نے دروازہ بند کر دیا اور باتھ رُوم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے میرے دماغ کی تپش کچھ کم ہوگئی۔ میں دیر تک شاور کے نیچے کھڑا رہا۔

جب میں نیچے آیا تو لابی میں دُرگا سے آمنا سامنا ہوگیا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ میں نے پہلی مرتبہ اُسے گہری نظروں سے دیکھا۔ میک اَپ کے بغیر بھی وہ بے حد حسین تھی۔ دراز قامت، بھرا بھرا گداز جسم، چہرے کے نقوش بڑے دلفریب اور غزال جیسی موٹی آنکھیں۔ میں آٹھ دس سال پیچھے چلا گیا اور چشم تصور سے اُسے دیکھنے لگا۔ بھرپور جوانی میں تو وہ واقعی قیامت رہی ہوگی۔

''کیا دیکھ رہے ہو شمروز؟'' دُرگا کے منہ سے اپنا نام سن کر میں اس طرح اُچھلا جیسے میرے پیروں کے نیچے آگ بھڑک اُٹھی ہو..... میرا دماغ سنسنا اُٹھا۔

''سیتا لاکھ کوشش کرے، اُس کی کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی۔'' دُرگا میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول پڑی۔ ''وہ تمہیں اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر گرفتار کرنے کے لئے کشمیر گئی تھی۔ میں جانتی ہوں وہ جس کام کا عزم کر لیتی ہے اُسے ادھورا نہیں چھوڑتی۔ مجھے اُس کے واپس آنے کا پتہ چل گیا تھا اور یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ تم اُس کے ساتھ ہو۔ وہ جس طرح تمہیں ساتھ لئے چھپتی پھر رہی تھی اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ تمہیں اپنا بھگوان مان چکی ہے۔ جس شخص کے لئے اُس نے ہندسرکار سے دشمنی مول لی، اپنے کزن کو موت کے گھاٹ اُتار دیا وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہوسکتا۔ میں اُس کے انتخاب کی داد دیتی ہوں۔''

میرا دماغ سن ہو رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے سلب ہو چکی ہوں..... میں خاموش کھڑا متوحش نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

''یہ..... یہ سب کچھ تمہیں..... سیتا نے بتایا ہے؟'' بالآخر میرے ہونٹوں کو حرکت ہوئی میری آواز کپکپا رہی تھی۔

''بالکل نہیں.....'' دُرگا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''تمہارے اُوپر جانے سے تھوڑی دیر بعد وہ بھی سوگئی تھی اور ابھی تک سو رہی ہے۔''

''تو پھر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ.....''

''ایوننگ پیپر سے۔'' دُرگا نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی۔ ''بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز سٹوری ہے۔ میں بتاؤں گی تو سارا سسپنس ختم ہو جائے گا۔ وہ اخبار رکھا ہے..... خود ہی پڑھ لو!'' اُس نے صوفے کے سامنے شیشے کے ٹاپ والی کافی ٹیبل پر پڑے ہوئے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔ ''ایک گھنٹہ پہلے میں سبزی بھاجی لینے کے لئے بازار گئی تھی تو اخبار بھی لے آئی تھی۔ تم وہاں بیٹھو، میں تمہارے لئے چائے لے کر آتی ہوں۔''

''میں باہر لان میں بیٹھوں گا..... چائے وہیں لے آنا۔'' میں نے جواب دیا۔ میں

برآمدے میں آ گیا۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ میں برآمدے سے نکل کر فوارے والے لان کی طرف چلنے لگا۔ میں نے دبیز گھاس پر پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ دونوں لانز کے فینسی لیمپ پوسٹوں کی بتیاں جل اُٹھیں۔ یہ بتیاں اندر ہی سے دُرگا نے جلائی تھیں۔ میں ایک لیمپ پوسٹ کے قریب بینچ پر بیٹھ گیا اور اخبار کھول کر اپنے سامنے پھیلا لیا۔

ہندی اخبار تھا۔ میں ہندی بول تو سکتا تھا مگر پڑھنا میرے لئے آسان نہیں تھا۔ میں اٹک اٹک کر پڑھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کوئی بات پلے نہیں پڑی سوائے اس کے کہ پولیس اُس حویلی تک پہنچ گئی تھی اور گنجے بدمعاش کی لاش دریافت کر لی تھی۔

برآمدے کی طرف سے آہٹ پا کر میں نے اُس طرف دیکھا، سیتا چلی آ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ ستا ہوا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ آنکھ کھلتے ہی باہر چلی آئی تھی۔

''میں کچھ زیادہ ہی گہری نیند سو گئی تھی۔'' وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم..... اوہ.....'' وہ بات کرتے کرتے رُک گئی۔ اُس کی نظریں بھی میری گود میں پڑے ہوئے اخبار پر جم گئیں۔ وہ خبر ہیڈ لائن میں تھی۔ اُس نے اخبار اُٹھا کر اپنے سامنے کر لیا۔ میں اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اُس کے چہرے پر سنسنی اور آنکھوں میں وحشت سی پھیلتی جا رہی تھی۔ پوری خبر پڑھنے کے بعد ہی اُس نے سر اُوپر اُٹھایا تھا۔

''یہ پڑھا تم نے؟'' اُس نے متوحش نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کوشش کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''ہندی ٹھیک سے نہیں پڑھ سکتا۔ صرف اتنا سمجھ سکا ہوں کہ پولیس حویلی میں پہنچ گئی ہے۔ البتہ دُرگا نے کچھ باتیں بتائی تھیں جو شاید اس اخبار میں نہیں ہیں۔''

''پولیس نے کپتان گوپال کی لاش برآمد کر لی۔'' سیتا نے کہا۔

''کیا.....؟'' میں اُچھل پڑا۔

''میں تمہیں پوری بات بتاتی ہوں۔'' سیتا نے اخبار پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''ایک خفیہ اطلاع ملنے پر پولیس حویلی میں داخل ہوگئی تھی۔ مہارانا دھرمیش سنگھ کی حویلی میں پولیس کا داخل ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔ وہ اطلاع ملنے کے بعد پولیس کمشنر نے حویلی پر چھاپہ مارنے کے لئے ڈپٹی کمشنر سے اجازت حاصل کی اور پولیس پارٹی ایک مجسٹریٹ کے ساتھ حویلی پہنچ گئی۔ پہلے حویلی کے ملازم چتون سنگھ کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن ناکام ہو کر پولیس والے دیوار پھلانگ کر حویلی میں داخل ہوگئے اور اندر سے پھاٹک کھول دیا۔ عمارت میں داخل ہونے کے لئے اُنہیں برآمدے والے دروازے کا تالا توڑنا پڑا تھا۔ یہ آج دن کے گیارہ بجے کی بات ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''پولیس نے گنجے کی لاش فوراً ہی دریافت کر لی۔ حویلی کی تلاش کے دوران ہمارے بیڈ رُوم سے اُنہیں کلپنا کے اور میرے پھٹے ہوئے کپڑے بھی مل گئے اور چھت پر خون آلود قالین بھی مل گیا۔ قالین پر خون کے دھبے خشک ہو چکے تھے جس سے پولیس کو شبہ ہوا کہ اُس گنجے کے

علاوہ وہاں قتل کی کوئی اور واردات بھی ہوئی تھی۔ پوری حویلی کی تلاشی لی گئی۔ گیٹ کے پاس روش کی بجری پر بھی خون کے دھبے ملے تھے۔ ہم کیپٹن گوپال کی لاش کو وہاں سے گھسیٹ کر پچھلی طرف لے گئے تھے۔ پولیس جگہ جگہ خون کے دھبوں کا تعاقب کرتی ہوئی حویلی کے پچھلی طرف پہنچ گئی جہاں تازہ کھدی ہوئی جگہ دیکھ کر اُنہیں شبہ ہوا اور گڑھا کھود کر کیپٹن گوپال کی لاش بھی برآمد کر لی گئی۔ کیپٹن گوپال کی لاش دیکھ کر پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وہ کسی عورت کے انتقام کا نشانہ بنا ہے۔ حویلی کے ایک کمرے سے ملنے والے پھٹے ہوئے زنانہ کپڑے بھی پولیس کے اس شبے کو تقویت دیتے ہیں۔ پولیس نے حویلی سے لاتعداد فنگر پرنٹس محفوظ کر لئے ہیں اور گنجے کی لاش میں پیوست خنجر بھی اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ اُن کی رپورٹ ملنے کے بعد ہی کوئی حتمی نتیجہ اخذ کیا جا سکے گا۔

کیپٹن گوپال کی لاش ملنے کے بعد چھاؤنی میں بھی اطلاع دے دی گئی اور فوج کے بعض بڑے افسران وہاں پہنچ گئے تھے۔ حویلی کے ملازم چتون سنگھ کو بھی دوپہر دو بجے کے قریب تلاش کر لیا گیا مگر اُس نے اس سارے واقعہ سے لاعلمی کا اظہار کیا اور گزشتہ روز اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بتایا۔ ہسپتال کے ذرائع نے اس امر کی تصدیق کر دی کہ چتون سنگھ کو کل شام چھ بجے کے قریب زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا تھا اور وہ پوری رات ہسپتال رہا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب اُس کا ایک عزیز اطلاع پا کر اُسے لے گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق کیپٹن گوپال اور گنجے کو گزشتہ رات دس بجے سے صبح چار بجے کے دوران کسی وقت موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا۔ پولیس نے جے پور میں پتا جی کو بھی خبر کر دی ہے۔ وہ کل دوپہر سے پہلے کسی وقت یہاں پہنچ جائیں گے۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق مہارانا دھرمیش سنگھ کی حویلی میں دوہرے قتل کی واردات نے شہر میں سنسنی پھیلا دی ہے۔ ایک فوجی آفیسر کا قتل کوئی معمولی بات نہیں۔ انتظامیہ کی مشینری اور پورے شہر کی پولیس حرکت میں آ گئی ہے۔''

''صورتحال واقعی سنگین ہو گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''گنگو اور اُس بڑے ٹھاکر کے بارے میں کوئی خبر؟'' میں نے کہتے ہوئے برآمدے کی طرف دیکھا۔ کلپنا اور دُرگا برآمدے سے نکل کر اس طرف آ رہی تھیں۔ کلپنا نے ٹرے اُٹھا رکھی تھی جس میں چائے کے کپ رکھے ہوئے تھے۔

''پورے اخبار میں کہیں بھی اُن دونوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''وہ گنجا گنگو کے ہاتھوں مارا گیا اور یہ تو ممکن نہیں کہ قتل کی اطلاع اُس نے پولیس کو دی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''البتہ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے واپس جا کر بوڑھے ٹھاکر اور رام چند دھوبی کو صورتحال سے آگاہ کر دیا ہو اور اُن دونوں میں سے کسی نے خفیہ طور پر پولیس کو خبر کر دی ہو۔''

''ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔ لیکن.....'' دُرگا اور کلپنا کے قریب آ جانے سے اُس

نے جملہ مکمل نہیں کیا۔

دُرگا ہماری طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی دوسرے بینچ پر بیٹھ گئی۔ کلپنا نے ٹرے فوارے والے حوض کی منڈیر پر رکھ دی اور ایک کپ اُٹھا کر پہلے سیتا کو دیا اور دوسرا کپ میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے چائے دیتے ہوئے اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس نے تیسرا کپ دُرگا کے ہاتھ میں تھما دیا اور آخری کپ اُٹھا کر دُرگا کے قریب بینچ پر بیٹھ گئی۔ گزشتہ رات حویلی میں ذات پات کے حوالے سے سیتا کی باتیں سن کر اور اپنے ساتھ اُس کا رویہ دیکھ کر اُس نے بھی فوراً ہی ذہن سے ایسی باتیں نکال دی تھیں اور ہمارے برابر اُٹھتی بیٹھتی تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ وہ نہا کر آئی تھی اور نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہے سیتا؟'' دُرگا نے چائے کی چسکی لے کر سیتا کی گود میں پڑے ہوئے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہاری کسی بات سے اختلاف کروں گی یا تمہارے ساتھ غیروں جیسا سلوک کروں گی... تم نے ایسا کیوں سوچا سیتا؟''

سیتا نے اُٹھ کر چائے کا کپ حوض کی منڈیر پر رکھ دیا اور دُرگا کے سامنے گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھ کر اپنا سر اُس کی گود میں رکھ دیا۔

''دُرگا دیوی.....'' وہ منمنائی۔ ''تم واقعی دیوی ہو۔''

دُرگا نے اپنا کپ بینچ کی سائیڈ میں گھاس پر رکھ دیا۔ ایک نظر میری طرف دیکھا اور سیتا کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگی۔ اور پھر جھک کر اُس کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔

سیتا اس طرح اُچھلی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو..... وہ متوحش نظروں سے دُرگا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

○○○

''کیا ہوا..... میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟'' دُرگا نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ ''کس طرح چھپاؤ گی اس ہیرے کو لوگوں کی نظروں سے؟''

اب میں سمجھ گیا کہ دُرگا نے سیتا کے کان میں کیا سرگوشی کی ہوگی۔ سیتا نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ دُرگا کے سامنے سے ہٹ گئی اور حوض کی منڈیر سے اپنا چائے کا کپ اُٹھا کر میرے قریب آ گئی۔

''دُرگا دیوی!'' وہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہیروں کی پہچان ہر ایک کو نہیں ہوتی۔ اور پھر جو شخص ایسی قیمتی چیز اپنے پاس رکھتا ہے اُس کی حفاظت کرنا بھی جانتا ہے۔ اور جانتی ہو کہ میں نے ہمیشہ اپنی ہر چیز کی حفاظت کی ہے۔ ایک شخص نے دھوکے کے بل بوتے پر میری ایک متاع چھینی تھی اور اُس کا انجام بھی تم دیکھ چکی ہو۔'' سیتا نے کیپٹن گوپال کا نام لئے بغیر کہا۔ جسے وہ اپنے انتقام کا نشانہ بنا چکی تھی۔ ''اور یہ مجھے اپنی متاع سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں اپنی جان لڑا دُوں گی مگر اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دُوں گی۔''

''میں جانتی ہوں.....'' دُرگا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے کب تک دوسروں کی نظروں سے چھپاؤ گی۔''

''جب تک ممکن ہوگا۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

''ٹھیک ہے.....'' دُرگا نے گہرا سانس لیا۔ ''تم وشواش لے کر میرے پاس آئی ہو اور میں تمہارے وشواش کو ٹھیس نہیں لگنے دُوں گی۔ اور مجھ سے جو ہو سکے گا تمہاری مدد کروں گی۔''

''اگر مجھے وشواش نہ ہوتا تو یہاں نہ آتی۔'' سیتا نے کہا۔ ''بہرحال! باقی باتیں بعد میں کر وقت ہوں گی۔ اس وقت کوئی ایسا ذکر مناسب نہیں۔'' اُس نے آنکھ سے کلپا کی طرف اشارہ کیا۔ پھر بولی۔ ''اس اخبار میں لکھا ہے کہ پتا جی کی حویلی میں ہونے والی درگھٹنا کے بارے میں اطلاع دی جا چکی ہے اور وہ کل دوپہر کے بعد کسی وقت یہاں پہنچ جائیں گے۔ کیا پتا جی اب بھی یہیں آ کر ٹھہرتے ہیں..... میرا مطلب ہے تمہارے پاس؟''

''تمہارے پتا جی کو شاید اب مجھ سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔'' دُرگا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''آخری مرتبہ وہ پانچ مہینے پہلے آئے تھے۔ اور میرے پاس صرف ایک رات رہے تھے۔ اُن کا زیادہ وقت جیٹھا نند کے ساتھ گزرتا ہے۔ اُس کی حویلی میں راگ رنگ کی

محفلیں سجتی ہیں..... اب دیکھو وہ کہاں ٹھہرتے ہیں؟ مجھے تو ابھی تک انہوں نے فون پر اطلاع نہیں دی۔''

''جیٹھا نند تو سنا تھا کہ ہندوستان سے باہر جانے والا ہے۔ اُس نے شاید سوئٹزرلینڈ میں جگہ خرید لی ہے۔ باقی زندگی وہیں گزارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔'' سیتا نے کہا۔

''گیا تھا.....'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ایک مہینہ رہ کر واپس آ گیا۔ چٹی چمڑی والی میموں نے اُس کے نخرے برداشت نہیں کئے۔ یہ ہندوستانی عورتیں ہی ہیں جو ان بڈھوں کے نخرے برداشت کر لیتی ہیں۔ انہیں جیسے بھی نوچا کھسوٹا جائے اُف تک نہیں کرتیں۔ لیکن وہ چٹی چمڑی والے..... اُنہوں نے اس بڈھے کو حد سے نہیں بڑھنے دیا اور وہ منہ لٹکائے واپس آ گیا۔ اب ہندوستانی عورتوں کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں تھکتا وہ۔''

میں نے اُن کی باتوں میں مداخلت نہیں کی۔ کلپنا بھی خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے جب بھی کلپنا کی طرف دیکھا تھا اُسے اپنی طرف ہی متوجہ پایا تھا لیکن ہر مرتبہ اُس نے نظریں جھکا لی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُس نے خالی کپ ٹرے میں جمع کئے اور ٹرے اُٹھا کر اندر چلی گئی۔

''یہ لڑکی کون ہے..... کہاں سے ملی تمہیں؟'' دُرگا نے کلپنا کے جانے کے بعد سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کلپنا نام ہے اس کا..... لاوارث ہے۔ بڑا انیائے ہوئے ہے اس پر۔'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور پھر اُسے کلپنا کے بارے میں بتانے لگی۔

''میں نے اسے دو باتوں کے کارن چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''اگر اسے چھوڑ دیا جاتا تو یہ یا تو دوبارہ بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ جاتی یا پولیس کے..... دونوں صورتیں ہمارے حق میں نہ ہوتیں۔ یہ ہمارے بارے میں سب کچھ اُگل دیتی جس سے ہمارے لئے مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ ویسے میں اس خیال سے بھی اسے اپنے ساتھ لے آئی ہوں کہ اب اس دنیا میں اس کا ہے کون؟ کسی کے ہاتھ لگ گئی تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔''

''کیا یہ تمہاری اصلیت سے واقف ہے؟'' دُرگا نے پوچھا۔

''یہ ہماری اصلیت سے واقف نہیں..... لیکن اسے جیجا جی کہتی ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''بڑی بے شرم ہو گئی ہو تم.....'' دُرگا بھی مسکرا دی۔

''کلپنا بہت اچھی لڑکی ہے۔'' سیتا نے اُس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک ہی رات میں اس کے بارے میں اندازہ لگا چکی ہوں۔ تم بہت عرصے سے اکیلی رہ رہی ہو۔ تم اسے اپنے پاس رکھ لو! تمہارے کام کر دیا کرے گی اور تمہیں بھی آسانی ہو جائے گی۔''

''اگر تم یہ بات نہ بھی کہتیں تو میں اسے تم سے مانگ لیتی۔'' دُرگا نے کہا۔ ''واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے میں کچن میں برتن دھو رہی تھی تو یہ بھی وہاں آ گئی اور زبردستی مجھے ہٹا

کر برتن دھونے لگی۔ اور چائے بھی اسی نے بنائی تھی۔''

''کیا واقعی؟'' سیتا اُچھل پڑی۔ ''بڑی خوش ذائقہ چائے تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ واقعی تمہارے کام کی ہے۔ لیکن اگر کبھی پتا جی کی نظر اس پر پڑ گئی تو.....''

''چپ رہو.....'' دُرگا نے اُسے ڈانٹ دیا۔ ''اپنے باپ کے بارے میں ایسی باتیں تمہیں شوبھا نہیں دیتیں۔''

''باپ ہی ایسا ہو تو کیا، کیا جائے؟'' سیتا ڈھٹائی سے مسکرا دی۔ ''اس کا تجربہ تو تمہیں بھی ہے دُرگا دیوی!''

''ٹھیک کہتی ہو۔'' دُرگا نے گہرا سانس لیا۔ ''اس بڈھے کا ویسے کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ مجھے اُس کا خیال رکھنا پڑے گا۔''

کلپنا کے واپس آ جانے سے موضوع بدل گیا۔

''اچھا بھئی..... تم لوگ باتیں کرو میں رات کے بھوجن کی تیاری کروں۔'' دُرگا کہتے ہوئے اُٹھی تو کلپنا بھی اُس کے ساتھ ہی اُٹھ گئی۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ کام میں ہاتھ بٹاؤں گی۔'' اُس نے کہا۔ دُرگا کچھ کہنے کی بجائے مسکرا کر رہ گئی۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی موضوع تھا۔ کل رات حویلی میں رونما ہونے والے واقعات..... پولیس کی تفتیش کس نتیجے پر پہنچے گی؟ کیپٹن گوپال کی لاش دیکھ کر پولیس کا یہ اندازہ تو بالکل درست ثابت ہوا تھا کہ وہ کسی عورت کے انتقام کا نشانہ بنا ہے۔ بیڈ رُوم سے سیتا اور کلپنا کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ لیکن اُس گنجے کی لاش کو کہاں فٹ کیا جائے گا؟

پولیس کے لئے یہ کیس یقیناً بہت پیچیدہ ثابت ہو گا لیکن میرے خدشات بہرحال اپنی جگہ پر موجود تھے۔ پولیس نے حویلی سے فنگر پرنٹس بھی اُٹھائے تھے۔ میرے پرنٹس کی تو ظاہر ہے شناخت نہیں ہو سکے گی۔ لیکن پولیس کسی شبے کی بنا پر اگر سیتا کے پرنٹس کو چیک کرنے کی کوشش کرے تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ پولیس بعض اوقات سامنے کی ایسی باتوں کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے جن سے فوری طور پر کوئی مثبت نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہو۔ لیکن بعض اوقات بال کی کھال نکالتے ہوئے یہ پولیس والے بہت دُور تک پہنچ جاتے ہیں۔

سیتا نے کیپٹن گوپال کو مردانگی سے محروم کر دیا تھا۔ کٹے ہوئے عضو سے ہی پولیس اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ گوپال کسی عورت کے انتقام کا نشانہ بنا تھا۔ کوئی ایسی عورت جو اپنی مرضی کے خلاف کیپٹن گوپال کی ہوس کا شکار ہوئی تھی۔

اگر کسی ذہین پولیس آفیسر نے کسی طرح یہ پتہ چلا لیا کہ کبھی سیتا کیپٹن گوپال کی زیادتی کا شکار ہوئی تھی تو گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ سیتا کے ساتھ وہ افسوس ناک واقعہ جے پور میں پیش آیا تھا۔

مجرم تو گوپال تھا مگر اُس نے فوج میں اپنے عہدے اور تعلقات سے کام لے کر سیتا کے ایک غریب مسلمان دوست کو پھنسا دیا تھا اور پولیس نے اُسے مار مار کر موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ سیتا ہی کے کہنے کے مطابق جے پور میں اس واقعہ کو خاصی شہرت بھی ملی تھی۔ جیسلمیر اگرچہ جے پور سے ساڑھے چھ سو کلومیٹر دُور تھا مگر آج کے دور میں فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ کسی خبر کو دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگتے۔

وہ خبر جیسلمیر کے اخبارات میں بھی چھپی ہو گی۔ اور اگر کسی پولیس آفیسر کے ذہن میں وہ یاد تازہ ہو گئی تو وہ گڑھے مُردے اُکھاڑنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ حویلی سے ملنے والے اُنگلیوں کے نشانات کو سیتا کی اُنگلیوں کے نشانات سے ملانے کی کوشش ضرور کی جائے گی۔ جے پور میں اُس کے گھر سے ایسی چیزیں منگوالی جائیں گی جو اُس کے استعمال میں رہی ہوں گی۔ اور جب نشانات مل جائیں گے تو پولیس کو دوا اور دو کا نتیجہ اخذ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

دوسری طرف گنگو تھا جو فرار ہو گیا تھا۔ پولیس کو کسی خفیہ ذریعے سے حویلی کے بارے میں اطلاع ملی تھی۔ ہو سکتا ہے پولیس کو یہ اطلاع گنگو ہی نے دی ہو، یا ممکن ہے وہ حویلی سے فرار ہو کر سیدھا بوڑھے ٹھاکر بلبیر سنگھ کے پاس پہنچا ہو اور بلبیر سنگھ نے پولیس کو گمنام اطلاع دے دی ہو۔

ہو سکتا ہے پولیس کو اطلاع ان دونوں میں سے کسی نے نہ دی ہو کوئی تیسرا شخص..... رات کو حویلی میں فائرنگ بھی ہوئی تھی اور کلپنا کی چیخیں بھی گونجی تھیں۔ کوئی ایسا شخص جس نے چیخوں اور فائرنگ کی آوازیں بھی سنی ہوں، اور اُس نے گمنام رہ کر پولیس کو خبر کر دی ہو۔ لیکن میں نے یہ خیال بھی ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر کسی کو کسی گڑبڑ کا شبہ ہوا بھی تھا تو اُسے رات ہی کو پولیس کو اطلاع دے دینی چاہئے تھی آج دن کے گیارہ بجے تک انتظار کیوں کیا؟

میں جتنا سوچتا اُتنا ہی میرا ذہن اُلجھتا چلا گیا۔ معاملہ خاصا پیچیدہ ہو گیا تھا۔ سیتا کو اب بھی میرے خیالات سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ خاصی مطمئن تھی۔ اُس کے خیال میں پولیس کسی طرح بھی جیسلمیر میں اُس کی موجودگی کا سراغ نہیں لگا سکتی تھی۔

ہم دونوں لان ہی میں بیٹھے رہے۔ اور جب کلپنا نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو ہم اُٹھ کر اندر آ گئے۔ اس وقت بھی کھانے میں دو تین ڈشیں تھیں جو سب کی سب سبزیوں سے تیار کی گئی تھیں۔ میں سبزی خوروں میں پھنس گیا تھا اور کئی روز سے گوشت کھانے کو نہیں ملا تھا۔

کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کلپنا کچن دھونے کے بعد صفائی وغیرہ کر رہی تھی۔ اُس نے دُرگا کو کئی کاموں سے فارغ کر دیا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر وہ بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اُسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ اُس کے ذہن سے ہر قسم کا ڈر خوف نکل گیا تھا اور یہاں وہ پوری طرح مطمئن تھی۔

رات کا ایک بج گیا۔ مجھے نیند آنے لگی تو میں اُٹھ کر اُوپر اُس کمرے میں آ گیا جو ہم نے

یہاں پہلے ہی منتخب کرلیا تھا۔ میں بستر پر لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا تھا۔

○

صبح مجھے بری طرح جھنجھوڑ کر جگایا گیا..... میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس طرح جگائے جانے سے آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں اور دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

''اے مہابیر سنگھ..... اُٹھو! جلدی کرو۔'' سیتا میرے کندھے کو جھٹکا دیتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔

''کیا ہے.....؟'' میں نے خوابیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''قیامت آگئی ہے کیا؟''

''وہ قیامت سے بھی بڑی چیز ہے۔'' سیتا بولی۔ ''پتا جی آگئے ہیں..... جلدی اُٹھو! بھاگو یہاں سے۔''

میرے دماغ میں زوردار دھماکہ ہوا اور آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''کہاں ہیں تمہارے پتا جی؟'' میں بدحواسی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''وہ باہر گلی میں موجود ہیں۔ اندر آنے ہی والے ہیں۔'' سیتا نے کہا۔ میرے دماغ میں ایک اور دھماکہ ہوا۔ میں بیڈ سے اُتر کر جوتے پہننے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں سوچ رہا تھا کہ اگر سیتا کا باپ باہر گلی میں موجود ہے تو ہم حویلی سے کیسے نکل سکیں گے؟ حویلی کی دیواریں بھی اتنی اُونچی تھیں کہ ان پر چڑھنا محال تھا اور باہر جانے کا کوئی اور راستہ بھی مجھے اب تک نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے اُٹھ کر سیتا کی طرف دیکھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''جلدی آؤ!'' وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''کلپنا کہاں ہے؟'' میں نے کہتے ہوئے سیتا کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور اُسی لمحہ میری نظر کلپنا پر پڑ گئی۔ وہ دروازے کے سامنے راہداری میں کھڑی تھی۔ اُس کے جسم پر وہی لباس تھا جو کل شام کو پہن رکھا تھا۔ اُس کے بال بھی بکھرے ہوئے، چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں سرخ تھیں۔ ہم سیتا کے پیچھے تیزی سے چلتے ہوئے نیچے آگئے جہاں لابی میں دُرگا ہماری منتظر تھی۔ اُس کے چہرے پر بھی تشویش نمایاں تھی۔

ہم دُرگا کے ساتھ اسی راہداری میں آگئے جس کے عین اُوپر وہ راہداری تھی جس کے دائیں بائیں ہمارے وہ کمرے تھے جہاں سے ہم ابھی نکل کر آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ دُرگا ہمیں کسی کمرے میں چھپا دے گی، اور میرے خیال میں یہ حماقت ہی ہوتی۔ اگر یہاں کسی کمرے میں چھپانا تھا تو اُوپر والا کمرہ کیا برا تھا؟ مگر دُرگا کسی کمرے کا رُخ کرنے کی بجائے سامنے باتھ رُوم میں گھس گئی اور ہمیں بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔

میری آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔ کیا وہ ہمیں باتھ رُوم میں بند کرنا چاہتی تھی؟ میں نے

اندر قدم رکھتے ہوئے سوچا۔ لیکن میرا یہ خیال بھی غلط نکلا۔

باتھ رُوم کسی کمرے ہی کی طرح بہت کشادہ تھا۔ ایک طرف سنگ مرمر کا بہت بڑا باتھ ٹب بھی تھا اور یہ باتھ رُوم جدید ترین سہولتوں سے آراستہ تھا۔ فرش پر سنگ مرمر کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ تین دیواروں پر پانچ فٹ تک ٹائلز لگے ہوئے تھے۔ تمام ٹکڑے پانچ پانچ اِنچ کے تھے اور بڑی نفاست سے لگائے گئے تھے۔

دُرگا باتھ رُوم کا دروازہ بند کر ہی رہی تھی کہ باہر سے کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ دائیں طرف کموڈ لگا ہوا تھا۔ اُس کے پیچھے دیوار کے ساتھ فلش ٹینکی تھی۔ اُس نے ٹینکی کا ڈھکنا اُٹھا دیا اور اندر بھرے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولنے لگی۔ ٹینکی میں بھرا ہوا پانی پُرشور آواز کے ساتھ کموڈ میں بہہ گیا اور دوسرے ہی لمحہ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پہلے تو میں اُسے اپنا واہمہ سمجھا تھا لیکن وہ جو کچھ بھی تھا حقیقت تھا۔ میں متوحش نظروں سے سامنے والی اُس دیوار کو دیکھ رہا تھا جس پر فرش سے چھت تک سنگ مرمر کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ وہ دیوار بیچ سے شق ہو رہی تھی۔ اُس کا ایک حصہ آہستہ آہستہ سرکتا ہوا بائیں طرف کی دیوار میں غائب ہو رہا تھا۔ اُس دیوار میں اتنا راستہ بن گیا تھا کہ ایک پہلوان قسم کا موٹا تازہ آدمی آسانی سے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ ہم تینوں اُس دیوار کے دوسری طرف آگئے اور دیوار آہستہ آہستہ دوبارہ اپنی جگہ پر آنے لگی۔

''جیسے ہی موقع ملا میں آنے کی کوشش کروں گی۔'' دُرگا نے کہا۔ ''ویسے چنتا کرنے کی ضرورت نہیں..... یہاں تم لوگ بالکل محفوظ رہو گے۔''

دیوار اپنی جگہ پر آگئی۔ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے سیتا کی طرف دیکھا اور پھر دیوار کو اُوپر سے نیچے تک گھورنے لگا۔ اس طرف اگرچہ سنگ مرمر کے ٹکڑے نہیں لگے تھے، عام پلستر تھا جس پر رنگ کیا ہوا تھا لیکن اُس میں کوئی بال برابر لکیر بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی جس سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ یہ دیوار دو حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔

یہ ایک کشادہ کمرہ تھا جس میں چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور کچھ فرنیچر بے ترتیبی سے پڑا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ نامعلوم مدت تک ہمیں اس کمرے میں ہی قید رہنا پڑے گا۔ لیکن جب میں دوسری طرف گھوما تو بائیں طرف کی دیوار میں ایک دروازہ دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ سیتا مجھ سے پہلے ہی اُس دروازے کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔

میں نے کلپنا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے اُبھر آئے تھے۔ اس دوران سیتا دروازہ کھول چکی تھی۔ اس سے آگے ایک مختصر سی راہداری تھی۔ میں کلپنا کا ہاتھ پکڑ کر راہداری میں آگیا۔ راہداری کے اختتام پر ہال نما بڑا کمرہ تھا۔ اُس میں اوسط درجے کا فرنیچر لگا ہوا تھا۔ ایک ایک کمرہ اُس راہداری کے دائیں بائیں تھا اور ایک سامنے۔ اس کمرے کے ساتھ ایک اور راہداری تھی۔ دوسری طرف بھی ایک دروازہ تھا۔

مجھے تو یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ سیتا کی آنکھوں میں بھی حیرت اور اُلجھن کے تاثرات نمایاں تھے۔ ہم لوگ ایک ایک کمرے میں گھومتے ہوئے کچن میں آ گئے۔ یہاں ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔

یہ تین بیڈ رُومز کا ایک مکمل مکان تھا اور اُس کی آراستگی اور سامان دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں کسی کی رہائش بھی ہے۔

سیتا نے آخری دروازہ کھولا تو میری آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی..... سامنے ایک کشادہ پختہ صحن تھا جس کے عین بیچ میں ایک گول کیاری تھی جس کے گرد تین چار انچ اُونچی پختہ منڈیر تھی اور اس کیاری میں تلسی کا پودہ لگا ہوا تھا۔ صحن کی دیواروں کے ساتھ بھی تین تین فٹ چوڑی کیاریاں تھیں جن میں پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ سامنے والی دیوار میں وہ دروازہ تھا جو غالباً گلی میں کھلتا تھا۔

سیتا اُس دروازے کی طرف بڑھی تو میں بھی اُس کے ساتھ ہی تھا۔ اُس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا، میں بھی گردن آگے نکال کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ ایک تنگ سی گلی تھی جس میں مکانوں کے دروازے ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ یہ تمام مکان پرانی طرز کے تھے۔ دروازوں کے درمیانی فاصلے بتا رہے تھے کہ یہ مکان اندر سے کافی کشادہ ہوں گے۔

گلی تقریباً سو گز لمبی تھی۔ اس کے اختتام پر غالباً کوئی بازار تھا۔ اِکا دُکا لوگوں کی آمد و رفت دکھائی دے رہی تھی۔ البتہ گلی بالکل سنسان تھی۔ سیتا نے دروازہ بند کر کے کنڈا چڑھا دیا اور ہم ہال کمرے میں آ گئے جہاں کلپنا کھڑی متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے باپ کو ایسی کیا پڑی تھی کہ راتوں رات ساڑھے چھ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے صبح سویرے یہاں پہنچ گیا۔'' میں نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میری مخاطب ظاہر ہے سیتا ہی تھی۔

''مہاراج دھرمیش سنگھ کی حویلی میں دو افراد کا قتل کوئی معمولی بات نہیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اور پھر کیپٹن گوپال سنگھ اُن کا بھتیجا تھا۔ اُس فوجی آفیسر کے قتل نے تو انتظامیہ کو ہلا کر رکھ دیا ہو گا۔ کل کے اخبار میں تو یہی لکھا تھا کہ پتا جی کو جے پور میں اطلاع دے دی گئی ہے اور وہ کل دوپہر تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس دھماکے نے پتا جی کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہو گا اور وہ رات ہی کو وہاں سے چل پڑے۔''

''ہمیں تو اُنہوں نے گھر سے بے گھر کر دیا ناں۔'' میں نے کہا۔ ''کتنی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ میرا خیال ہے ابھی تو سات بھی نہیں بجے ہوں گے۔''

''سوا سات.....'' سیتا نے دیوار پر آویزاں گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور کیا تمہیں یہ گھر نہیں لگ رہا؟ ہر چیز موجود ہے یہاں۔ اگر تم چاہو تو کسی بھی کمرے میں جا کر سو سکتے ہو۔''

''اب اگر جاگ گئے ہیں تو دوبارہ سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیند تو تمہارے پتا کا نام سنتے ہی اُڑ گئی تھی۔ لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' سیتا نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''شاید ہمیں بھوکا رہنا پڑے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک تمہارے پتا کہیں چلے نہیں جاتے۔ اور اس وقت تک.....''

اپنے عقب میں گھنٹی کی آواز سن کر مجھے یوں لگا جیسے میرے سر پر بم پھٹا ہو..... میں اپنی جگہ سے کئی فٹ اُوپر اُچھل پڑا تھا۔ سیتا اور کلپنا بھی وحشت زدہ سی ہو گئی تھیں۔

میں سنبھل کر پیچھے مُڑا تو میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ صوفے کے ساتھ ذرا پیچھے ایک چھوٹی تپائی پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا اور اُس کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں اُلجھی ہوئی نظروں سے سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ مکان پتہ نہیں کس کا تھا اور فون کال بھی نجانے کس کے لئے..... ابھی تک تو ہمیں اس مکان میں کوئی ذی رُوح نظر نہیں آیا تھا۔

سیتا نے اشارہ کیا تو میں نے فون کا ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا لیکن بولا کچھ نہیں۔ دوسری طرف سے کسی کے بولنے کا منتظر تھا۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور ایک لمحہ بعد ہی ایک نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''سیتا..... میں دُرگا بول رہی ہوں۔''

''اوہ! دُرگا جی۔'' میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

''مہابیر جی.....!'' دُرگا کی آواز سنائی دی۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں راجیو نام کا ایک آدمی مکان پر پہنچ جائے گا۔ وہ تم لوگوں کے ناشتے کھانے کا بندوبست کر دے گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''شکریہ دُرگا جی!'' میں نے کہا۔ ''تم نے جس طرح ہمیں حویلی سے نکالا تھا میں تو یہی سمجھا تھا کہ ہمیں فاقہ ہی کرنا پڑے گا۔'' جواب میں ہنسی کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور پھر لائن بے جان ہو گئی۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔

''راجیو گاندھی ہمارے لئے ناشتہ لے کر آ رہے ہیں۔'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟'' سیتا نے مجھے گھورا۔ ''اُس کی تو راکھ بھی اب تک نیست و نابود ہو چکی ہو گی۔ پر شاید اُس کی آتما تم سے ملنے کے لئے آنے والی ہو۔''

''آتما ہو یا کوئی جیتا جاگتا انسان.....'' میں نے کہا۔ ''بہرحال! ہمارے کھانے پینے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں.....''

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی باہر کے دروازے پر دستک کی آواز اُبھری تو میں اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ ''وہ آ گیا ہے۔''

میں باہر آ گیا۔ بیرونی دروازے کے قریب پہنچ کر کنڈا گرانے سے پہلے میں نے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا، وہ آدمی دروازے کے بالکل قریب کھڑا تھا اور اُس کے صرف کپڑے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اُسی لمحہ دستک ایک بار پھر اُبھری اور ساتھ ہی ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''مہابیر جی! دروازہ کھولو..... راجیو آیا ہوں۔''

میں نے کنڈا گرا دیا۔ دُرگا نے اُسے میرا نام بھی بتا دیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی جو آدمی اندر داخل ہوا اُسے دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی..... اُس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے بھی کچھ نکلتا ہوا تھا۔ آبنوسی رنگت، اُس نے دھوتی اور قمیض پہن رکھی تھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اُس کا چوڑا سینہ ریچھ کی طرح سیاہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ شیو تو شاید اُس نے کچھ دیر پہلے ہی بنایا ہو گا اور مونچھیں رُخساروں تک پھیلی ہوئی تھیں جس سے اُس کا چہرہ خاصا خوفناک ہو گیا تھا۔ موٹی موٹی سرخ آنکھیں، ایک کان میں چوڑی کی طرح بڑا سا بالا اور سر پر گوالوں کی طرح کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں چھوٹی پیتل کی ڈولی تھی جس میں دُودھ تھا اور دوسرے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھا جس میں غالباً ناشتے کا سامان تھا۔

''نمسکار مہابیر جی!'' اُس نے دونوں ہاتھ کسی قدر اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آدھا گھنٹہ پہلے مجھے دُرگا دیوی نے بتایا تھا کہ مہمان آئے ہیں۔ ان کے کھان پین کا بندوبست کروں۔ ڈھابے پر دیر ہو گئی۔''

''اچھا..... ٹھیک ہے۔ پہلے ہمارے لئے چائے بناؤ، پھر ناشتہ تیار کرنا۔'' میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

وہ اندر داخل ہوا تو میں بھی اُس کے پیچھے ہی تھا۔ اُس نے سیتا کا نام لے کر پرنام کیا تو میں چونک پڑا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سیتا کو جانتا تھا۔ سیتا کے منہ سے بھی گہرا سانس نکل گیا۔

''کیسی ہو سیتا جی.....؟'' راجیو بولا۔ ''بہت عرصہ سے درسن نا ہی دیا ہو۔ پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

''بس ٹھیک ہی جا رہی ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''تمہیں دُرگا نے یہاں بھیجا ہے نا..... اور اُس نے تمہیں کچھ سمجھایا بھی ہو گا۔''

''تم چنتا مت کرو سیتا جی!'' راجیو جلدی سے بولا۔ ''ہم نے سیتا دیوی کے بارے میں کچھ نہیں سنتا۔ ورنتوں سے اُسے نہیں دیکھا ہوں۔''

''ٹھیک ہے..... اب جاؤ! پہلے ہمارے لئے چائے بناؤ۔'' سیتا نے کہا۔ راجیو کچن والی راہداری میں چلا گیا اور میں سیتا والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''یہ کیا چیز ہے؟'' میں نے کچن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بڑی کتی شے ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بچپن سے ہمارے گھر میں

پلا ہے۔ پتا جی نے دُرگا کو یہ حویلی لے کر دی تو اسے بھی ساتھ بھیج دیا۔ کتے کی طرح وفادار ہے۔ جان دے دے گا پر مالک پر آنچ نہیں آنے دے گا۔ کل میں نے اسے حویلی میں نہیں دیکھا تو یہی سمجھی تھی کہ شاید دُرگا نے اسے واپس بھیج دیا ہے۔''

''اگر تمہارے پتا سے اس کا سامنا ہو گیا تو تمہارے بارے میں بتا تو نہیں دے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں.....'' سیتا بولی۔ ''دُرگا نے اسے سمجھا کر ہی یہاں بھیجا ہو گا۔ اور پھر مجھے حویلی کی بجائے یہاں دیکھ کر بھی بہت کچھ سمجھ گیا ہو گا۔''

''یہ مکان.....'' میں نے کہتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''میں نے سنا تھا کہ محلات اور حویلیوں میں زیرِ زمین سرنگیں اور خفیہ راستے ہوتے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ.....''

''ذرا سکون ہونے دو..... میں تمہیں یہاں کے تاریخی محلات اور حویلیوں میں خفیہ راستے اور سرنگیں دکھاؤں گی۔ انہیں دیکھ کر تم اطمینان سے حیران ہوتے رہنا۔ فی الحال تو میں حیران ہو رہی ہوں۔'' سیتا نے کہا۔

''کس بات پر حیرت ہے تمہیں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اس مکان پر.....'' سیتا بولی۔ ''میں دُرگا کی حویلی میں کئی بار آئی ہوں۔ حویلی میں تہہ خانوں کے بارے میں تو میں جانتی ہوں لیکن باتھ رُوم سے خفیہ راستہ اور یہ مکان..... مجھے اس کا علم نہیں تھا۔''

''پھر تو واقعی حیرت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے باپ کی حویلی اور تمہیں اس خفیہ راستے کا علم نہیں تھا۔''

''یہ ہندوستان ہے مائی ڈیئر!'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ خطہ تو راجوں مہاراجوں کا ہے جہاں گدی کے لئے اپنے مخالفین کو موت کے گھاٹ اُتار دینا بہت معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ اقتدار بہت بری چیز ہے۔ تم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرو گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ یہاں تخت و تاج اور گدی کے لئے باپ نے بیٹے کو اور بیٹے نے باپ کو موت کے گھاٹ اُتارنے میں بھی کبھی عار محسوس نہیں کیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں تو محلاتی سازشیں بہت مشہور ہیں۔ برسرِ اقتدار شہنشاہ یا راجہ کو اپنی اولاد پر بھی بھروسہ نہیں ہوتا تھا۔ اولاد، خصوصاً بیٹا پیدا ہوتے ہی وہ اپنے بچاؤ اور فرار کے راستے بھی تیار کر لیتے تھے۔ کسی راجہ کے محل کے خفیہ خانوں اور سرنگوں کا علم اس کی اولاد کو بھی نہیں ہوتا تھا اور مصیبت کے وقت راجہ اپنی جان بچانے کے لئے وہی خفیہ راستے استعمال کرتا تھا۔''

''تو گویا تمہارے باپ کو بھی اپنی اولاد پر بھروسہ نہیں تھا؟'' میں نے کہا۔

''میرے باپ کا کوئی بیٹا نہیں تھا جس سے اُسے کوئی خطرہ محسوس ہوتا۔'' سیتا نے جواب

دیا۔ ''ہم صرف دو بہنیں ہیں۔ میری دیدی شادی کر کے امریکہ جا چکی ہے اور میں تو ویسے ہی
بے ضرر سی لڑکی ہوں۔ اپنے باپ کی بہت لاڈلی۔ مجھ سے اُسے کیا خطرہ ہوگا جو وہ ایسی باتیں
مجھ سے چھپانے کی کوشش کرے گا؟ اور ویسے بھی ہم دونوں بہنوں کی پیدائش سے پہلے ہی پ
جی کا راج سنگھاسن چھن چکا تھا۔ اور یہ حویلی.....'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''
حویلی تو اُنہوں نے بنی بنائی خریدی تھی جو بعد میں دُرگا کو دے دی تھی۔ اگر اُنہیں اس خفیہ
راستے کا پتہ بھی تھا تو ہمیں کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن ہوسکتا ہے دُرگا کو اس کا علم ہو۔''

''اور اُس نے تم لوگوں کو کبھی نہیں بتایا۔'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''
تمہارے باپ کی رکھیل ہے۔ کروڑوں روپے مالیت کی یہ حویلی اُس نے دُرگا کو بخش دی تھی
دُرگا کو یقیناً تمہاری ماں کی طرف سے کوئی خطرہ ہوگا۔ اسی لئے تو اُس نے کسی ہنگامی صورتحال
میں اپنے بچاؤ کا یہ راستہ چھپا کر رکھا ہوگا۔''

''بہت ذہین آدمی ہو۔'' سیتا مسکرائی۔ ''تمہارے دل میں ایسی بہت سی باتیں آسکتی ہیں
اور آنی بھی چاہئیں۔ لیکن دُرگا کو میری ماں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ابتدائی چند برسوں میں ما
جی اُس سے کچھ ناراض رہی تھیں لیکن پھر رفتہ رفتہ اُن کے دل سے میل نکل گیا اور اُنہوں نے
دُرگا سے ملنا بھی شروع کر دیا۔ ماتا جی کو اس بات کا کوئی افسوس نہیں تھا کہ پتا جی نے یہ حویلی
دُرگا کے نام ٹرانسفر کیوں کرائی تھی۔ اور ایک موقع پر تو دُرگا نے حویلی کے کاغذات ماتا جی کے
چرنوں میں رکھ دیئے تھے اور حویلی سے دستبرداری کا اعلان کیا تھا مگر ماتا جی نے نہ تو کاغذات
لئے اور نہ ہی حویلی پر حق جتایا۔ اُن کے پاس کیا کمی ہے۔''

''ہوں.....'' میں نے گہرا سانس لیا۔ ''لیکن دُرگا نے یہ راز اب تک کیوں چھپائے رکھا؟''

''ہوسکتا ہے اسے کبھی بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''لیکن میں
سمجھتی ہوں کہ اگر اس کے دل میں کوئی کھوٹ ہوتا تو آج بھی ہمیں اس راز سے آگاہ نہ کرتی بلکہ
پتا جی کی نظروں سے بچانے کے لئے ہمیں کسی اور طریقے سے حویلی سے نکالنے کی کوشش کرتی۔''

ہماری باتیں جاری تھیں کہ راجیو چائے لے کر آ گیا۔ اُس نے ہم تینوں کے سامنے ایک
ایک کپ رکھا اور ہمارے سامنے ہی فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

کلپنا اتنی دیر تک ڈری سہمی بیٹھی رہی تھی لیکن اب ایک بار پھر اُس کا خوف بتدریج کم ہونے
لگا۔ راجیو سیتا سے باتیں کر رہا تھا اور وہ دلچسپی سے باتیں سن رہی تھی۔

''راجیو!'' سیتا نے چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد راجیو کی برہنہ توند کی طرف اشارہ کیا
''سب سے پہلے تم جا کر کوئی کرتہ پہنو اور اس توند کو چھپاؤ جسے دیکھ کر ڈر لگ رہا ہے۔''

''لوسن لو سیتا جی کی باتاں۔'' راجیو نے ہنس کر کہا۔ ''سیتا جی! سارا جیون تو تم نے راجیو
اس توند پر کھیلتے ہوئے بتایا ہے۔ اب ڈر لگنے لگا تیرے کو۔''

میرے منہ میں چائے بھری ہوئی تھی۔ راجیو کی اس بات پر میں اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکا

منہ میں بھری ہوئی چائے کا فوارہ چھوٹ گیا اور سامنے بیٹھا ہوا راجیو ہی اُس کی زد میں آیا تھا۔

سیتا اور کلپنا بھی قہقہے لگانے لگیں۔ راجیو نے معصومیت سے جو بات کہہ دی تھی وہ اُس کا
مفہوم نہیں جانتا تھا۔ وہ سر سے کپڑا اُتار کر اپنا چہرہ پونچھنے لگا جہاں میرے منہ کی چائے گری
تھی۔ سیتا بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پا سکی تھی۔ راجیو ہونقوں کی طرح ہمارا منہ تک رہا تھا۔
اُس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ اُس نے کیا غلط بات کہہ دی تھی۔

''کیا ہوا آپ لوگوں کو؟'' وہ باری باری ہمیں گھورتے ہوئے بولا۔ ''کیا کہہ دیا ہم نے؟''

''تم یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں بچپن میں تمہاری گود میں کھیلی ہوں۔'' سیتا نے کہا۔

''ہاں..... ہم تو یہی کہت ہوں۔'' راجیو بولا۔

''مگر تم نے تو یہ کہہ دیا کہ اپنا جیون تمہاری توند پر کھیلتے ہوئے بتایا ہے۔ بھئی اس کا مطلب تو
یہ ہوا کہ میں جوان ہونے کے بعد بھی.....''

''رام رام..... رام رام۔'' راجیو کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا اُٹھ گیا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو سیتا جی؟
تم تو ہماری بٹیا ہو..... اچھا ہم ناشتہ بنانے جا رہے ہیں۔'' وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ اُس کے
جانے کے بعد بھی ہم دیر تک ہنستے رہے۔

چائے پینے کے بعد ہم نے ایک بار پھر تینوں بیڈ رُومز میں جھانکا۔ تینوں کے ساتھ اٹیچ باتھ
تھے۔ ہم ایک ایک کمرے میں گھس گئے۔

تقریباً نو بجے ہم نے ناشتہ کیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد راجیو سودا لینے کے لئے بازار جانے
لگا تو سیتا نے اُسے مرغی کا گوشت لانے کو بھی کہہ دیا تھا۔ ہندوؤں نے اگرچہ گائے کا گوشت
اپنے اُوپر حرام کر رکھا تھا لیکن بیشتر لوگ بکرے یا مرغی وغیرہ کا گوشت بھی نہیں کھاتے تھے۔

ہم لوگوں نے وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے جو کل رات ہمارے جسموں پر تھے۔ سیتا نے
شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ صبح اس قدر افراتفری میں وہاں سے بھاگے تھے کہ کپڑے
بدلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب راجیو واپس آ گیا۔ وہ کچھ پھل بھی لے آیا تھا۔ اُس نے پھل دھو کر
پلیٹ میں ہمارے سامنے رکھ دیئے اور خود کچن میں جا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ہم پھل
کھاتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ ایک اندرونی راہداری سے دُرگا کو برآمد ہوتے
دیکھ کر ہم سب ہی چونک گئے۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا کہ اچانک دُرگا کہاں سے آ گئی۔
لیکن پھر میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ مجھے وہ خفیہ راستہ یاد آ گیا۔

دُرگا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ سیتا کے قریب بیٹھ گئی۔

''تم تینوں سے سوری بھئی!'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم لوگوں کو اچانک ہی
وہاں سے نکالنا پڑا۔ اگر چند منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو معاملہ گڑبڑ ہو جاتا۔ اور ہاں..... ناشتہ کیا
یا نہیں؟''

''ناشتہ کرلیا۔ اور اب تو دوپہر کے کھانے کا انتظار ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ڈیڈی گئے؟'' سیتا نے پوچھا۔

''ہاں..... تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے گئے ہیں۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''وہ رات ایک بجے پور سے روانہ ہوئے تھے۔ ناشتہ اُنہوں نے یہاں پر ہی کیا تھا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ اُن کے آنے کی اطلاع دو تین منٹ پہلے مل گئی تھی۔'' چند لمحوں کو دُرگا خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''دراصل ہوا یوں کہ اُن کے گارڈز کی آگے آنے والی گاڑی حویلی کے دروازے پر پہنچ گئی تھی اور ایک گارڈ نے دروازہ کھلوانے کے لئے کال بیل بجادی تھی۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ تمہارے پتاجی کی گاڑی گلی کے موڑ پر دودھ والی ایک پک اَپ سے ٹکرا گئی تھی۔ اُس بے چارے کے دودھ کے سارے کین اُلٹ گئے۔ معاملے کو سلجھانے میں تمہارے پتاجی کو چند منٹ کی دیر ہوگئی۔ اگر یہ حادثہ نہ ہوتا تو تم لوگوں کو وہاں سے نکلنے کا موقع نہ ملتا۔''

''پتاجی کہاں گئے ہیں؟'' سیتا نے ایک اور سوال کیا۔

''پولیس ہیڈ کوارٹر.....'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''پہلے وہ ٹیلی فون پر مختلف لوگوں سے رابطے کے اس سلسلے میں معلومات حاصل کرتے رہے اور پھر آدھا گھنٹہ پہلے پولیس ہیڈ کوارٹر گئے ہیں۔''

''واپس آئیں گے یا.....؟'' سیتا نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

''آج کی رات وہ جیسلمیر میں ہی رہیں گے۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''یہ نہیں بتایا کہ رات کو یہاں رہیں گے یا کسی دوست کے ہاں ٹھہریں گے۔ لیکن بہرحال تم لوگوں کو آج رات اسی مکان میں گزارنی پڑے گی۔''

سیتا اپنے باپ کے بارے میں کچھ اور باتیں پوچھتی رہی۔ پھر بولی۔ ''ایک بات اور دُرگا دیوی!'' اُس نے نظریں دُرگا کے چہرے پر جما دیں۔ ''یہ اس مکان کا کیا چکر ہے..... اور یہ خفیہ راستہ؟ پہلے تو تم نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔''

''تم کتنے عرصے بعد یہاں آئی ہو؟'' دُرگا نے پوچھا۔

''تقریباً دو سال بعد۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''دو سال پہلے جب آخری مرتبہ تم یہاں آئی تھیں تو ایسی کوئی صورتحال نہیں تھی۔'' دُرگا نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' سیتا نے اُسے گھورا۔

''تقریباً ڈیڑھ سال پہلے راجیو نے مجھے بتایا کہ یہ مکان بک رہا ہے۔ قیمت اگرچہ زیادہ تھی لیکن میرے پاس رقم موجود تھی۔ میں نے خرید لیا۔ راجیو اس گلی میں رہتا ہے۔ اس نے سامنے والا مکان کرائے پر لے رکھا ہے۔ کیا اُس نے تمہیں کچھ بتایا نہیں؟''

''کچھ نہیں..... لیکن وہ تو تمہارا خدمتگار ہے۔ اُس نے الگ مکان کیوں لیا؟'' سیتا نے پوچھا۔

''اُس نے شادی کر لی ہے۔'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''یہ ان دنوں کی بات ہے جب دو سال پہلے تم آخری مرتبہ یہاں سے ہو کر گئی تھیں۔ تمہارے جانے کے چند روز بعد ہی اُس نے شادی کر لی تھی۔''

''اچھا..... یہ بات ہے۔ ابھی اُس کی گردن ناپتی ہوں۔ اُس نے یہ بات ابھی تک مجھ سے چھپائے رکھی..... لیکن پہلے اس مکان کے بارے میں بتاؤ۔'' سیتا بولی۔

''میرا خیال تھا کہ بیچ کی دیواریں بھی تڑوا کر میں اس مکان کو حویلی میں شامل کرلوں گی۔ لیکن پھر اچانک ہی ایک اور خیال آیا اور میں نے اس میں وہ خفیہ راستہ بنالیا۔ اس کے لئے میں نے کاریگر جودھ پور سے منگوائے تھے اور لاکھوں روپے خرچ ہوئے تھے۔ راجیو کے علاوہ کسی اور کو اس مکان اور اس خفیہ راستے کا پتہ نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم پتاجی سے ڈرنے لگی ہو۔'' سیتا نے اُسے گھورا۔

''تمہارے پتاجی سے کیوں ڈرنے لگی۔'' دُرگا نے کہا۔ ''خوف تو مجھے اپنوں سے آنے لگا ہے جنہیں کئی سال بعد عزت کا خیال آیا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں.....'' سیتا نے اُسے گھورا۔

''جب تمہارے پتاجی سے ملاقات ہوئی تھی تو میری منگنی ہو چکی تھی۔'' دُرگا کہنے لگی۔ ''ہے تو وہ ہمارے خاندان کا لیکن اُس وقت وہ ایک چھوٹا آدمی تھا۔ اُس کے ماں باپ کی مالی حالت بھی بہت کمزور تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں نے دولت کے لالچ میں مہاراج کو اپنے حسن کے جال میں پھنسایا ہے۔ وہ ہر قیمت پر مجھے حاصل کرنا چاہتا تھا مگر ایک تو وہ مہاراج سے ڈرتا تھا اور پھر احساسِ کمتری میں بھی مبتلا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کے پاس بہت سی دولت ہوگی تو میں تمہارے پتاجی کو چھوڑ کر اس کے پاس چلی جاؤں گی۔ اُس نے دن رات محنت کی، کچھ فراڈ بھی کئے اور آج اُس کے پاس دولت کی ریل پیل ہے۔ تقریباً دو ہی سال پہلے وہ جیسلمیر منتقل ہو گیا تھا۔ اُس نے مین بازار کے عقب میں ایک چھوٹی سی حویلی بھی خرید لی تھی۔ ایک دو مرتبہ اُس نے دبے لفظوں میں اپنے من کی بات کہنے کی کوشش کی مگر میری طرف سے کورا جواب سن کر دھمکیوں پر اُتر آیا۔''

''اوہ.....'' سیتا بولی۔ ''تم نے پتاجی کو بتایا؟''

''میں تمہارے پتاجی کو بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''ان دنوں میں یہ مکان خرید چکی تھی اور اچانک ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیلاش جیسے آدمی کا کوئی بھروسہ نہیں..... ہوسکتا ہے کسی رات وہ غنڈوں کو لے کر حویلی پر چڑھ آئے۔ اس لئے میں نے بڑی رازداری سے اس مکان اور حویلی کے درمیان یہ خفیہ راستہ بنوا لیا۔ اور آج پہلی بار صحیح معنوں میں یہ راستہ استعمال ہوا ہے۔''

''اور کیلاش..... میرا مطلب ہے تمہارا منگیتر؟'' سیتا نے پوچھا۔

''وہ یہیں ہے..... جیسلمیر میں۔'' دُرگا نے بتایا۔ ''کبھی کبھی کسی جگہ سامنا ہو جاتا ہے۔ دھمکیاں تو ہر بار دیتا ہے مگر آج تک کسی دھمکی پر عمل نہیں کر سکا۔''

''ذرا حالات پُرسکون ہو لینے دو..... اُس سے بھی نمٹ لیں گے۔'' سیتا نے کہا۔ دُرگا اُسے گھور کر رہ گئی مگر بولی کچھ نہیں۔

دُرگا نے دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا۔ اس کے بعد بھی وہ ہمارے پاس بیٹھی رہی۔

''تم یہاں بیٹھی ہو، ایسا نہ ہو کہ پتا جی واپس آئیں تو گیٹ کی گھنٹیاں بجا بجا کر پریشان ہو جائیں۔'' سیتا نے کہا۔

''میں نے تمام بندوبست کر رکھے ہیں۔'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں حویلی میں ایک ایسا سوئچ آن کر آئی ہوں کہ حویلی کے گیٹ پر کال بیل کا بٹن دبایا جائے گا تو یہاں گھنٹی بج اُٹھے گی۔'' اُس نے اندرونی راہداری والے دروازے کے اُوپر لگی ہوئی گھنٹی کی طرف اشارہ کیا جس کے ساتھ ہی ایک سرخ بلب بھی لگا ہوا تھا۔

اور پھر شام سات بجے ہم آنگن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو وہ گھنٹی بج اُٹھی..... ساتھ ہی بلب روشن ہو گیا تھا اُس کی سرخ روشنی یہاں سے بھی دکھائی دے گئی تھی۔

دُرگا چائے کا کپ میز پر رکھ کر اندر کی طرف لپکی۔ میں اور سیتا بھی اُس کے ساتھ ہی اُٹھ گئے تھے۔ اس کمرے میں پہنچ کر دُرگا نے سوئچ بورڈ پر ایک سوئچ آن کر دیا اور اس کے ساتھ والا سوئچ آف کر دیا۔ سامنے والی دیوار شق ہو گئی۔ دُرگا ہماری طرف ہاتھ ہلاتی ہوئی اُس میں داخل ہو گئی اور چند سیکنڈ بعد ہی وہ خفیہ راستہ بند ہو گیا۔ ہمیں دونوں طرف سے اس خفیہ راستے کے میکنزم کا پتہ چل گیا تھا۔

ہم دوبارہ آنگن میں آ گئے اور چائے پینے لگے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ سیتا نے دوڑ کر ریسیور اُٹھا لیا۔ وہ دُرگا ہی کی کال تھی۔ سیتا تقریباً دو منٹ تک بات کرتی رہی، پھر ریسیور رکھ دیا اور میرے سامنے آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''دُرگا بتا رہی تھی کہ پتا جی بہت غصے میں ہیں۔ وہ آج رات ہی کسی وقت جے پور کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ وہ بعد میں ہمیں تفصیل سے سب کچھ بتائے گی۔''

چائے کے خالی کپ ابھی میز پر پڑے ہوئے تھے۔ راجیو کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ کپ اُٹھانے کے لئے آیا تو سیتا کو اچانک ہی جیسے کوئی بات یاد آ گئی۔

''ارے راجیو.....!'' وہ اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''سچ بتاؤ..... تمہاری توند پر کون کھیلتا ہے؟''

''لاجونتی.....'' راجیو کے منہ سے بے اختیار نکلا، پھر وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔ ''وہ..... وہ جی! بات یہ ہے کہ.....''

راجیو کی سادگی پر ہم بے اختیار ہنس پڑے۔

''تم نے اپنی شادی کی بات کیوں چھپائی..... ہمیں بتایا کیوں نہیں؟'' سیتا نے کہا۔

''تم نے بتانے کا موقع ہی کب دیا سیتا دیوی؟'' راجیو نے کہا۔

''وہ سامنے والے گھر میں رہتی ہے نا؟'' سیتا نے کہا۔ ''کھانا تیار ہو جائے تو اُسے لے کر آنا..... وہ کھانا ہمارے ساتھ کھائے گی۔''

''اچھا بٹیا..... لے آؤں گا اُسے۔ پر میں نے اُسے تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' راجیو نے کہا۔

''کوئی بات نہیں.....'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں خود ہی بتا دُوں گی کہ اس سے پہلے میں تمہاری توند پر کھیلا کرتی تھی۔''

''سیتا جی.....!'' راجیو چیخ اُٹھا۔ ''وہ مجھے گھر سے نکال دے گی۔''

''ڈرتے ہو اُس سے؟'' سیتا نے اُسے گھورا۔

''وہ میری جورو ہے..... وہ رُوٹھ گئی تو میرا گھر برباد ہو جائے گا۔'' راجیو کی آواز رو دینے والی تھی۔

''اچھا جاؤ..... اپنا کام کرو! کچھ نہیں کہوں گی اُس سے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم مذاق کر رہی ہو۔'' راجیو نے کہا اور کچن کی طرف چلا گیا۔

ہم دیر تک اُس کی سادگی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

رات کے کھانے پر لاجونتی بھی موجود تھی۔ وہ عمر میں راجیو سے کم از کم پندرہ سال چھوٹی تھی۔ یہی کوئی چوبیس پچیس سال کی تھی۔ دھان پان سی، پتلے ہونٹ اور تیکھے نقوش، اُس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ کھانے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک ہمارے پاس رہی۔

دُرگا کی طرف سے اطلاع ہمیں صبح ہی ملی تھی، بلکہ صبح سات بجے وہ خود ہی آئی تھی اور ہمیں اپنے ساتھ حویلی میں لے گئی تھی اور ناشتہ ہم نے وہیں کیا تھا۔

''تمہارے پتا جی صبح چار بجے یہاں سے گئے تھے۔ دو چار روز بعد شاید پھر واپس آئیں گے ایک دن کے لئے۔'' دُرگا نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں ہوا کیا؟ وہ تو بتاؤ!'' سیتا نے پوچھا۔ اُس کی طرح میں بھی صورتحال سے واقف ہونے کے لئے بے چین تھا۔

''تمہارے پتا جی بہت غصے میں تھے۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''اُنہوں نے اس درگھٹنا کی ساری ذمہ داری کیپٹن گوپال پر ہی ڈال دی ہے جو خود بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی اور پھر سیتا کے باپ سے حاصل ہونے والی معلومات سے ہمیں آگاہ کرنے لگی۔

اُس کے مطابق حویلی کے ملازم چتون سنگھ نے مہاراج دھرمیش سنگھ (سیتا کا باپ) کو بتا
تھا کہ کیپٹن گوپال دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ اکثر یہاں آتا تھا۔ وہ عورتوں کو بھی لے
آتے تھے۔ بعض اوقات دو تین گھنٹہ رہ کر چلے جاتے تھے اور بعض اوقات رات یہیں گزار
تھے۔ ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب تو یہاں خوب ہڑبونگ ہوتی تھی۔ رات بھر راگ رنگ کی
محفل جمتی تھی۔ کیپٹن گوپال اور اُس کے فوجی دوست بھی ننگے ہو کر ناچتے تھے۔ یہ ہنگامہ صبح تک
جاری رہتا تھا۔ اور پھر وہ لوگ سارا دن مرے ہوئے کتوں کی طرح پڑے رہتے تھے۔

چتون سنگھ نے بتایا کہ اُس شام بھی کیپٹن گوپال اپنے دو فوجی افسر دوستوں کے ساتھ آیا
تھا۔ اُن کے ساتھ دو لڑکیاں بھی تھیں۔ کیپٹن گوپال نے چتون سنگھ کو چھٹی دے دی اور وہ اپنے
کزن کے گھر کی طرف جاتے ہوئے راستے میں حادثے کا شکار ہو گیا اور رات بھر ہسپتال میں
پڑا رہا۔ اُسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اُس کی عدم موجودگی میں حویلی میں کیا ہوا تھا۔

چتون سنگھ کے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ یا تو کیپٹن گوپال اور اُس کے دوستوں
میں جھگڑا ہوا تھا جس سے گوپال اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ دوستوں نے اُسے حویلی کے پچھلی
طرف زمین کھود کر دفن کر دیا، یا وہ کسی عورت کے ہاتھوں مارا گیا۔ ممکن ہے گوپال سے کوئی بدلہ
لینے کے لئے اُس کے فوجی دوستوں نے بھی اُسی عورت کا ساتھ دیا ہو جس نے کسی تیز دھار
آلے سے گوپال کو مردانگی سے محروم کیا تھا۔

ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ جب وہ فوجی آفیسر گوپال کے کریا کرم سے فارغ ہوئے تھے تو اُس
وقت وہ بدمعاش کسی طرح حویلی میں گھس آئے تھے۔ شاید اُن لڑکیوں کی وجہ سے گوپال کے
دوستوں اور بدمعاشوں میں معرکہ ہوا تھا جس میں ایک بدمعاش مارا گیا اور دوسرا بھاگ گیا
فوجی آفیسر بھی ان عورتوں کے ساتھ حویلی سے بھاگ گئے۔ عورتوں نے حویلی چھوڑنے سے
پہلے کپڑے بھی بدلے تھے۔ حویلی کے ایک بیڈ روم سے دو عورتوں کے پھٹے ہوئے کپڑے ملے
تھے جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ حویلی میں آنے والی عورتوں کی تعداد دو تھی۔

حویلی میں پائی جانے والی گنجے بدمعاش کی لاش کی شناخت ہو گئی تھی۔ وہ بازار حسن کا
مشہور بدمعاش رنگا تھا۔ پچھلے تین چار روز سے اُسے گنگو نامی بدمعاش کے ساتھ دیکھا جا رہا
تھا۔ پولیس کو شبہ تھا کہ اُس رات گنگو ہی رنگا کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد سے گنگو غائب تھا اور
پولیس اُسے تلاش کر رہی تھی۔ پولیس کو ان دو عورتوں کی بھی تلاش تھی جو اُس رات کیپٹن گوپال
اور اُس کے دوستوں کے ساتھ حویلی میں آئی تھیں۔ اور اُن فوجی افسروں کو بھی تلاش کیا جا رہا تھا
جو کیپٹن گوپال کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے لئے حویلی میں آتے رہتے تھے۔

پولیس ہیڈ کوارٹر میں مہارانا کی ملاقات ایک اعلیٰ فوجی آفیسر سے بھی ہوئی تھی جو کیپٹن گوپال
اور دوسرے فوجی آفیسروں کا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور مہارانا نے اُس کی دھمکیوں
سے مرعوب ہوئے بغیر اُسے وارننگ دی تھی کہ وہ اپنے افسروں کو پٹا ڈال کر رکھیں جو کتوں کی

طرح اِدھر اُدھر منہ مارتے پھر رہے ہیں۔

چتون سنگھ کو میں بہت سیدھا سادھا سمجھتا تھا لیکن وہ بہت چالاک ثابت ہوا تھا۔ اُس کے
بیان نے ساری کہانی ہی بدل کر رکھ دی تھی اور اس کہانی میں سیتا کا نام تک نہیں آیا تھا۔

''مہاراج نے حویلی کی نگرانی کے لئے اب تین اور آدمی رکھے ہیں اور اُنہیں سختی سے حکم دیا
ہے کہ جو بھی شخص حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کرے اُسے گولی سے اُڑا دیا جائے۔'' دُرگا
نے آخر میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اب ہم اس حویلی کا رُخ نہیں کر سکتے۔'' سیتا نے کہا۔

''ظاہر ہے.....'' دُرگا نے سر ہلایا۔ ''اگر تمہیں اپنی موجودگی راز میں رکھنی ہے تو اُس حویلی
میں قدم رکھنا بھی خطرناک ہوگا۔''

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کب تک اس طرح چھپ کر بیٹھے رہیں گے؟'' میں نے
اُن کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو اب تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ سیتا مجھے یہاں
لے کر کیوں آئی ہے۔ کیا محض.....''

''دھیرج..... دھیرج.....'' سیتا ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ اُس نے کن انکھیوں سے کلپنا کی طرف
دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اُس کی موجودگی میں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ''یہاں آ کر تم
گھاٹے میں نہیں رہو گے۔'' وہ بولی۔ ''وقت آنے پر سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔''

''سیتا ٹھیک کہہ رہی ہے.....'' دُرگا نے اُس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہاں بھی
تمہارے کرنے کو بہت کچھ ہے۔ سیتا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ بات اگر صرف پریم کی ہوتی
تو سیتا تمہیں جیسلمیر کی بجائے کہیں اور لے جاتی۔ شملہ، ڈلہوزی، نینی تال یا کوئی اور ایسی جگہ
جہاں کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ لیکن یہ تمہیں ایک خاص مقصد سے یہاں لے کر آئی ہے اور تم یہاں رہ
کر اپنے لئے بہت کچھ کر سکتے ہو..... مگر تھوڑا انتظار کرو! دُھول ذرا بیٹھنے دو..... مطلع صاف
ہونے دو۔''

اُس وقت کلپنا کی موجودگی میں کھل کر کوئی بات نہیں ہو سکی تھی لیکن شام کو لان میں چائے
کے دوران کھل کر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ کلپنا اُس وقت اندر کسی کام میں مصروف تھی۔

بات ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات سے شروع ہوئی تھی۔ پاکستان کو آزاد ہوئے
ترپن سال ہو چکے ہیں مگر ہندوستان نے آج تک پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔
تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان کو جب بھی موقع ملا اس نے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی بھرپور
کوشش کی..... بنگالیوں نے غداری کی تو ہندوستان نے اُن کا بھرپور ساتھ دیا اور پاکستان کے
دو ٹکڑے کر دیئے۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا دیا۔

ہندو ذہنیت سے کون واقف نہیں..... اُن کی گھناؤنی سازشیں اس حصے کے امن کے لئے
ہمیشہ ہی خطرہ بنی رہی ہیں۔ اس کے توسیع پسندانہ عزائم سے کون واقف نہیں؟ پہلے آسام کو

ہڑپ کیا، پھر سکم اور بھوٹان پر طاقت کے بل بوتے پر تسلط جمایا۔ ''گوا'' پر پنجے گاڑے۔ کشمیر
فوج کشی کی، مگر کشمیری حریت پسندوں نے ہندوؤں کی حاکمیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا
کشمیری عوام کے مطالبہ آزادی کو قابل گردن زدن جرم قرار دیا گیا۔ اس قوم پر ظلم و بربریت
کے وہ پہاڑ ڈھائے گئے کہ ہلاکو اور چنگیز خان جیسے ظالم اور جابر لوگوں کی رُوح بھی کانپ گئی
گی۔ ہندوستان نے مظلوم کشمیریوں پر دہشت اور بربریت کی انتہا کر دی کہ کوئی بھی انسان ا
رُوح فرسا مظالم کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا۔

ایک تو ہندوستان نے پاکستان کے وجود کو شروع دن سے ہی دل سے تسلیم نہیں کیا ا
دوسرے مظلوم کشمیری عوام سے پاکستان کی ہمدردی بھی ہندوستان کو کھل گئی اور پاکستان کو اس
سزا دینے کے لئے بھارتی حکمران شروع ہی سے گھناؤنی سازشوں میں مصروف رہے۔ پاکستا
کا ایک حصہ الگ کر کے بھی اُن کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ وہ اب بھی پاکستان کے وجود کو مٹانے
درپے ہیں۔

ہندوستان نے پاکستان میں اپنے ایجنٹوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔ تخریب کاری، بموں
دھماکے اور دہشت گردی سے اُس نے پاکستان کی سلامتی کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ پاکستا
کے مختلف شہروں میں اگرچہ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کے بے شمار تربیت یافتہ ایجنٹ مو
ہیں لیکن تخریب کاری اور دہشت گردی کے ذریعے خونریزی کے لئے وہ زیادہ تر پاکس
باشندوں کو آلہ کار بناتے ہیں۔

کسی بھی ملک میں ایسے بے ضمیر لوگوں کی کمی نہیں جو پیسے کی خاطر ملک تو کیا اپنی ماں کا
کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ پاکستان میں بھی ایسے بے ضمیر لوگوں کی کمی نہیں ہے جو پیسے
لالچ میں آ کر ''را'' کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دہشت گردی اور تخریب کاری
باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔

''اور یہ تربیت راجستھان میں دی جاتی ہے.....'' سیتا کہہ رہی تھی۔

''عورت اور دولت کے لالچ میں اپنے دیش کا سودا کرنے والے بے ضمیر لوگوں کو سندھ
طرف سے سرحد پار کر کے راجستھان پہنچا دیا جاتا ہے جہاں مختلف کیمپوں میں اُنہیں تخری
کاری اور دہشت گردی کی تربیت دے کر واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ ان کیمپوں میں اُن کی ا
طرح برین واشنگ کر دی جاتی ہے کہ اُن کے دلوں میں اپنے دیش یا اپنے لوگوں کے
ہمدردی ختم ہو جاتی ہے۔ اُنہیں جلاد بنا دیا جاتا ہے اور وہ واپس جا کر اپنے ہی بے گناہ لوگو
موت برساتے ہیں۔ بے گناہوں کو خون میں نہلا دیا جاتا ہے اور سڑکوں پر اُن کی لاشیں بچھا
جاتی ہیں۔''

سیتا خاموش ہو گئی۔ یہ میرے لئے ایک نیا انکشاف تھا..... میرے جسم میں سنسنی کی لہ
پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔

''بھارتی حکمرانوں کی تخریب کاری اور دہشت گردی کی پالیسی اب پاکستان تک محدود نہیں رہی۔'' سیتا کہہ رہی تھی۔ ''را'' نے ایک اور خوفناک منصوبہ بنایا ہے۔ اور وہ منصوبہ یہ ہے کہ پاکستانی نوجوانوں کے ذریعے جموں اور کشمیر میں وسیع پیمانے پر تخریب کاری اور دہشت گردی کی وارداتیں کرائی جائیں۔ کشمیریوں کو جب یہ پتہ چلے گا کہ اُن کے ہمدرد بن کر آنے والے، اُن میں گھل مل جانے والے پاکستانی اُن پر موت برسا رہے ہیں تو اُنہیں پاکستان سے بھی نفرت ہو جائے گی۔ پاکستان اور کشمیریوں میں اختلافات بڑھیں گے جن کا فائدہ ہندوستان اُٹھائے گا۔ اور اس منصوبے کا ایک اور خوفناک پہلو یہ ہے کہ اسرائیلی انٹیلی جنس ''موساد'' کے ماہرین ان نوجوانوں کو تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت دے رہے ہیں۔''

مجھے رگوں میں اپنا خون جمتا ہوا محسوس ہونے لگا..... یہ منصوبہ واقعی بہت خوفناک تھا۔ اگر یہ سازش کامیاب ہو گئی تو کشمیری عوام پاکستان کی حمایت اور ہمدردی سے بھی محروم ہو جائیں گے اور یہ بے گناہ اور معصوم لوگوں کی سرزمین، جنت نظیر وادی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے متعصب ہندوؤں کے انتقام کی آگ میں جلتی رہے گی۔

''نہیں نہیں..... ایسا نہیں ہونا چاہئے۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''تو اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں تمہیں جیسلمیر کیوں لائی ہوں۔'' سیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیمپ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

سیتا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے دُرگا کی طرف دیکھا اور پھر میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ سیتا اُن کیمپوں کے بارے میں بتا رہی تھی جہاں پاکستان سے اغواء کر کے لائے ہوئے نوجوانوں کی برین واشنگ کر کے اسرائیلی ''موساد'' کے ایجنٹ اُنہیں تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت دے رہے تھے۔

میں خاموش بیٹھا اُس کی باتیں سن رہا تھا اور میرے رگ و پے میں سنسنی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔

○○○

شدید سردی کی ایک لہر تھی جو میری ریڑھ کی ہڈی میں برقی رو کی طرح دوڑ رہی تھی۔ اور رگوں میں خون تو جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ دماغ پر سناٹا سا چھا گیا۔

بہت ہی خوفناک منصوبہ تھا۔ پاکستانی نوجوان کشمیر جائیں گے۔ کوئی ان پر شبہ نہیں کرے گا۔ انہیں اپنا سمجھ کر اُن کے لئے اپنے گھروں کے دروازے وا کر دیئے جائیں گے اور ان کی خدمت خاطر میں کوئی کمی نہیں چھوڑی جائے گی۔ اور جب یہی نوجوان اُن کی عورتوں کو بے آبرو کریں گے، اُن کے گھروں کو جلا کر ملبے کا ڈھیر بنا دیں گے اور اُن کے لئے موت کے فرشتے بن جائیں گے تو اُن کے دلوں میں پاکستان کے لئے نفرت پیدا ہو گی، اعتماد اُٹھ جائے گا۔ نفرت اور بے اعتمادی کی یہ خلیج وسیع اور گہری ہوتی جائے گی اور اس طرح پاکستان اور کشمیری عوام ایک دوسرے سے دُور ہوتے جائیں گے۔ اور اس کا فائدہ بھارت اُٹھائے گا۔

کشمیر پاکستان کی ہمدردیوں سے محروم ہو جائے گا یا اس میں کمی آ جائے گی۔ بھارت کو کشمیر پر اپنی گرفت مزید مضبوط کرنے کا موقع مل جائے گا۔ ان پر مظالم بڑھ جائیں گے اور آزادی کی وہ تحریک جو نصف صدی سے جاری تھی دم توڑ دے گی۔ کشمیر کی آزادی کے لئے جو ہزاروں قربانیاں دی گئی تھیں وہ رائیگاں نہیں جائیں گی۔ مظلوم کشمیری ظلم کی چکی میں پستے رہیں گے اُن کی چیخیں گونجتی رہیں گی مگر سننے والا کوئی نہیں ہو گا۔ ان کی عورتوں کی عصمتیں لٹتی رہیں گی مگر کوئی انہیں بچانے والا نہیں ہو گا۔ ان کے گھر جلتے رہیں گے اور شعلے پھیلتے رہیں گے۔

''نہیں..... ایسا نہیں ہو گا۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''ایسا ہونا بھی نہیں چاہئے۔'' سیتا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کب اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ''اگر ایسا ہو گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ تمام قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔ آزادی کی ساری تحریکیں ختم ہو جائیں گی۔ شہیدوں کی روحیں تڑپ اُٹھیں گی۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے..... بالکل نہیں ہونا چاہئے۔''

''نہیں ہو گا..... بالکل نہیں ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بتاؤ! وہ کیمپ کہاں ہے؟ میں تباہ کر دُوں گا اُسے۔''

''دھیرج..... دھیرج۔'' سیتا نے میرا کندھا دبایا۔ ''اب یہ بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ میں تمہیں یہاں کیوں لائی ہوں۔ کشمیر میں رہ کر تم بھارتی سیناؤں کے خلاف لڑتے رہتے۔ ایک کو مارتے تو اُس کی جگہ دس اور آ جاتے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ پھر کوئی پاکستانی نوجوان

تمہارے گروہ میں گھس جاتا۔ تم اُس پر اعتماد کرتے اور موقع پا کر وہی تمہاری پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتا۔ تمہیں یہاں لانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ ایسا موقع ہی نہ آنے دو۔ آزادی کی تحریکوں کو نقصان ہمیشہ غداروں نے پہنچایا ہے اور غداروں کو شناخت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور جب شناخت ہوتی ہے تو تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ اگر شیخ مجیب الرحمٰن غداری نہ کرتا تو مشرقی پاکستان بنگلہ دیش نہ بنتا۔ اُس نے آخری وقت قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ وہ ڈھاکہ پہنچتے ہی اپنے لوگوں کو سمجھائے گا اور اُنہیں بتائے گا کہ پاکستان ایک رہے گا تو مضبوط رہے گا۔ پاکستان کی سلامتی ہی میں ان کی بقا ہے۔ لیکن ڈھاکہ پہنچتے ہی وہ سب کچھ بھول گیا۔ اُس نے پاکستان کے خلاف اتنا زہر اُگلا جس کی مثال نہیں ملتی۔ مکتی باہنی کو آشیرباد دیا اور اُسی مکتی باہنی نے مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے باشندوں پر اس قدر ظلم کئے کہ ہٹلر کی رُوح بھی شرمندہ ہو گئی ہو گی۔ بے گناہوں کے قتل عام سے خون کے دریا بہا دیئے اور وہ بے گناہ دھوکے میں اپنوں ہی سے مارے گئے۔ یہی سب کچھ کشمیر میں ہو گا۔ مشرقی پاکستان میں بھی ہندوؤں کی سازش کام کر رہی تھی اور کشمیر میں بھی ایسی ہی گھناؤنی سازش کے ذریعے خون کے دریا بہائے جائیں گے۔ کشمیریوں کو تنہا کر دیا جائے گا۔ پاکستانی تمہارے اپنے ہیں۔ وہ کشمیر کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں تم لوگوں سے سچی ہمدردی ہے لیکن جب پاکستانی نوجوان ہی تم لوگوں پر موت برسائیں گے تو کتنا دُکھ ہو گا تم لوگوں کو..... اور وہ پاکستانی نوجوان بھی یہ نہیں جانتے ہوں گے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ اُن کی تو یہاں برین واشنگ کر دی گئی ہو گی۔ اُن کے دماغ تو یہودیوں اور ہندوؤں کے طابع ہوں گے۔ وہ لوگ وہی کریں گے جو اُنہیں کہا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ کشمیر کی تحریک آزادی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ یہ جذبے سرد نہیں ہونے چاہئیں۔ صرف وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو اپنا حق چھیننا جانتی ہوں۔ کشمیری اپنا حق لینے کی کوشش کر رہے ہیں اور مجھے وشواش ہے کہ ان کی کوششیں ضرور کامیاب ہوں گی۔ لیکن..... اگر بھارت کی یہ نئی سازش کامیاب ہو گئی تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ مٹ جائے گا سب کچھ.....''

''مجھے بتاؤ وہ کیمپ کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔

''راجستھان میں ایک نہیں بہت سے کیمپ ہیں جہاں پاکستان سے اغواء کئے ہوئے نوجوانوں کو تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت دی جا رہی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''اُنہیں ٹریننگ دے کر سرحد پار پاکستانی شہروں میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک کیمپ ایسا ہے جہاں اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی ''موساد'' کے ماہرین بھارتی ماہرین کے ساتھ اُن لوگوں کو خاص ٹریننگ دے رہے ہیں جنہیں جموں اور کشمیر بھیجا جائے گا۔ یہ گروپ ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔ ابھی صرف ان نوجوانوں کی برین واشنگ ہو رہی ہے۔ جو نوجوان اس مرحلے میں کامیاب ہوں گے اُنہیں اگلے مرحلے کے لئے

منتخب کیا جائے گا۔ اور جن پر شبہ ہوگا کہ اُن کے کام کے نہیں ہیں یا وہ آگے چل کر اُن کے لئے مشکلات پیدا کریں گے اُنہیں گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ اُس کیمپ کا وجود کشمیر کے لئے بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے۔ تمہارے لئے اس کیمپ کو ختم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے لئے جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔ اس کیمپ کو تباہ کر کے تم اپنے دیش کی ایسی خدمت کرو گے جسے تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔''

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ سیتا ''را'' کی ایجنٹ تھی۔ وہ ایک منصوبے کے تحت مجھے گرفتار کرنے کے لئے کشمیر گئی تھی۔ وہ اتفاق سے مجھ تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن مجھے اپنے جال میں پھنسانے کی بجائے خود میری محبت کا شکار ہوگئی۔ اور پھر اُس نے یہ دلچسپ انکشاف کیا کہ اُسے بھارتی فوجیوں سے شدید نفرت اور کشمیری مسلمانوں سے ہمدردی ہے۔ وہ کشمیریوں کو مظلوم اور بھارتی فوجیوں کو ظالم اور غاصب سمجھتی تھی۔ اُس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ خود بھی ایک فوجی کے ستم کا شکار ہو کر اپنی عزت کھو بیٹھی تھی۔ ویران پہاڑوں میں دو اور ہندو فوجیوں نے اُسے مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اُسے بچا لیا تھا۔

سیتا کے جذبات کچھ اور شدید ہو گئے تھے۔ اپنی محبت اور اپنے خلوص کا یقین دلانے کے لئے اُس نے مجھے اپنی سپردگی میں دے دیا تھا۔ اور پھر جموں میں مانسر جھیل کے کنارے رنگ رلیاں مناتے ہوئے بھارتی فوج کے اعلیٰ افسروں پر مجاہدین کے ساتھ حملے میں حصہ لے کر اُس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اُسے بھارتی فوجیوں سے واقعی شدید نفرت اور کشمیری مسلمانوں سے ہمدردی ہے۔ وہ مجھے میرے محاذ سے دُور لے آئی تھی۔ اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی کہ مجھے کشمیر کے محاذ سے ہٹا دے گی۔ میرے دل میں قدم قدم پر سیتا کے بارے میں شبہات جنم لیتے رہے۔ مجھے ہر لمحہ یہ دھڑکا لگا رہتا کہ وہ کسی بھی وقت مجھے کسی اتھارٹی کے حوالے کر دے گی۔ لیکن میرے یہ اندیشے غلط ثابت ہوتے رہے۔

سیتا مجھے جیسلمیر لے آئی۔ راستے میں ہنومان گڑھ کے ایک گیسٹ ہاؤس میں ''را'' کے ایک آدمی نے اُسے دیکھ لیا۔ سیتا میری اور اپنی آمد کو مخفی رکھنا چاہتی تھی۔ اُس نے ''را'' کے اُس ایجنٹ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور مجھے لے کر جیسلمیر پہنچ گئی۔ اور یہاں اگلے ہی روز اُس نے اپنے کزن کیپٹن گوپال کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس طرح اُس نے اپنا انتقام لے لیا بلکہ ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ اُسے بھارتی فوجیوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ کیپٹن گوپال کے قتل کے فوراً ہی بعد کلپنا والا واقعہ پیش آ گیا اور ہمیں وہ حویلی چھوڑنی پڑی۔ سیتا مجھے اس طرح حفاظت میں لئے ہوئے تھی جیسے میں ہی اُس کے لئے سب کچھ ہوں۔ اور کل تو اُس نے دُرگا کے سامنے کہہ بھی دیا تھا کہ وہ میرے لئے اپنی جان بھی لڑا دے گی۔

میری وجہ سے سیتا اپنوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکی تھی۔ اُس نے اپنے کزن کیپٹن گوپال کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ مانسر جھیل کے کنارے کئی اعلیٰ فوجی افسروں کو موت کی نیند

سلا دیا۔ اور اب وہ میرے ہاتھوں ایک ایسا کیمپ تباہ کروانا چاہتی تھی جہاں جنونیوں اور قاتلوں کی کھیپ تیار کی جا رہی تھی۔ جو سیتا کے بقول کشمیر میں خوفناک تباہی پھیلانے والے تھے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ سیتا یہ سب کچھ کیوں کر رہی تھی؟ کیا کسی کے دل میں انتقام کا جذبہ اتنا شدید ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی سلامتی کو داؤ پر لگا دے.....؟

ہندوستان نصف صدی سے جموں اور کشمیر پر طاقت کے بل بوتے پر تسلط جمائے ہوئے تھا اور یہ تسلط برقرار رکھنے کے لئے ہر سال کروڑوں روپے کا بجٹ خرچ ہو رہا تھا۔ اُس کے ہزاروں فوجی مارے گئے تھے اور سیتا اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لئے بھارتی حکمرانوں کی نصف صدی کی محنت پر پانی پھیر دینا چاہتی تھی۔

سیتا ''را'' کی ایجنٹ کی حیثیت سے مجھے گرفتار کرنے کے لئے کشمیر گئی تھی۔ وہ مجھ تک پہنچ گئی اور میرے عشق میں مبتلا ہوگئی۔ وہ مجھے وہاں سے لے بھی آئی تھی۔ اُس نے کیپٹن گوپال کو قتل کر کے اپنی بے عزتی کا بدلہ بھی لے لیا تھا۔ اس کے بعد سب کچھ ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ وہ مجھے لے کر کسی اور پُرسکون جگہ پر چلی جاتی اور مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کرتی کہ آگ اور خون کے کھیل میں کچھ نہیں رکھا۔ کشمیریوں کو لڑنے دو۔ ہم میدانِ جنگ سے بہت دُور پُرسکون جگہ پر آ گئے ہیں جہاں کوئی خطرہ نہیں۔ آؤ! ہم سب کچھ بھول کر پریم کے گیت گائیں اور ایک دوسرے کی محبت میں کھو کر جیون بیتا دیں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اُس نے دہشت گردی کے کیمپ کی بات کر کے میرے جذبات کو اور مہمیز کیا تھا۔ سینے میں دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دے کر بھڑکایا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ کیا واقعی وہ کشمیر کو ایک گھناؤنی سازش سے بچانا چاہتی تھی یا اُس کے من میں کچھ اور تھا؟ وہ کوئی خاص مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی؟ ایسا مقصد جو اُس کے لئے کشمیر کی قیمت سے بھی زیادہ اہم تھا؟''

سیتا ایک سابق راجہ کی بیٹی تھی۔ سازشیں ان راجاؤں کی فطرت کا خاصہ تھیں۔ وہ اپنی ریاست کی وسعت اور اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کے تانے بانے بنتے ہی رہتے تھے۔ اور سیتا بھی ایک راجہ ہی کی بیٹی تھی جس سے اُس کا راج پاٹ چھن گیا تھا۔ سیتا اُس راجہ کی بیٹی تھی۔ سازش کے جراثیم اُس کے خون میں بھی ہوں گے۔ لیکن وہ ایسی کیا بات تھی جس کے لئے وہ اپنے ہی دیش کو داؤ پر لگانے کو تلی ہوئی تھی؟

میں جیسے جیسے سوچتا گیا میرا ذہن اُلجھتا گیا۔ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو..... کہاں کھو گئے؟'' سیتا کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میرے خیالات منتشر ہو گئے۔

''اوہ..... کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہاری باتوں نے مجھے بری طرح اُلجھا دیا ہے۔''

''اس میں کون سی اُلجھن ہے مہابیر!'' اس مرتبہ دُرگا نے لب کشائی کی۔ وہ جس طرح

شروع سے ہماری گفتگو میں حصہ لے رہی تھی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے کچھ جانتی تھی۔ ''سیتا تو تمہیں ایک موقع فراہم کر رہی ہے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''اگر تم نے ذہانت اور عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس کیمپ کو تباہ کر دیا اور اس سازش کو بے نقاب کر دیا تو تم اپنے کشمیر کے لئے بہت بڑا کارنامہ انجام دے سکو گے۔ بھارت کو عالمی تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وقتی طور پر اس کی توجہ بٹ جائے گی اور کشمیر میں جاری آزادی کی تحریک ایک ایسے سیلاب کی صورت اختیار کر جائے گی جسے روکنا بھارتی سیناؤں کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔''

''اور پھر ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔'' سیتا نے اُس کے خاموش ہوتے ہی کہا۔ ''کشمیر تمہاری طرح میرا بھی خواب بن چکا ہے۔ ہم دونوں ایک ساتھ اُس سرزمین پر قدم رکھیں گے کتنا اچھا لگے گا۔''

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور پھر اُس نے دُرگا کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر میری طرف جھک کر میرے سینے پر سر رکھ دیا۔

میں گڑبڑا سا گیا..... میں نے کن انکھیوں سے دُرگا کی طرف دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''یہ مت سمجھنا کہ تم اکیلے ہو گے۔'' دُرگا نے کہا۔ ''ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور تم جانتے ہو جب نیت صاف ہو تو دنیا کی کوئی طاقت بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکتی۔ میں پورے وشواس سے کہہ سکتی ہوں کہ تم سے سیتا کا پریم اور وطن سے تمہاری محبت ضرور رنگ لائے گی۔ وطن سے دُور وطن کی سیوا کے اس محاذ پر بھی کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔''

''میں نے اپنے وطن کی خدمت اور آزادی کے لئے رائفل اُٹھائی تھی۔'' میں نے سیتا کا سر اپنے سینے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''رائفل اب میرے ہاتھ میں نہیں رہی لیکن یہاں بھی اگر مجھے موقع مل رہا ہے تو میں اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش ضرور کروں گا خواہ اس کے لئے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ لیکن میں اس کیمپ کے بارے میں ذرا اور تفصیل سے جاننا چاہتا ہوں۔''

''دیش سے محبت کا جذبہ اتنا سچا اور اتنا شدید ہو تو طوفان بھی راستہ نہیں روک سکتا۔'' دُرگا نے کہا۔ ''سیتا تمہیں اس کیمپ کے بارے میں بتائے گی۔ تم لوگ باتیں کرو، میں اور چائے کر لاتی ہوں۔''

وہ خالی کپ اُٹھا کر برآمدے کی طرف چلی گئی۔ سیتا اُٹھ کر ایک بار پھر میرے سامنے والی بینچ پر بیٹھ گئی۔

''تم اُس کیمپ کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''وہ کیمپ یہاں سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔'' سیتا کہنے لگی۔ ''راجستھان کی تاریخ بہت دلچسپ ہے اور جیسلمیر کی تاریخ دلچسپ ترین۔ یہ شہر راجستھان کے تمام شہروں میں قدیم ترین ہے۔ اس کی بنیاد 1156ء میں بھٹی حکمرانوں نے رکھی تھی اور اسے راجستھان کا پہلا دارالخلافہ ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ اس کا قدیم نام لودروا تھا۔ ہر طرف سے ریت کے ٹیلوں میں گھرا ہوا یہ شہر زیادہ عرصہ تک آباد نہ رہ سکا۔ بعد میں آنے والے بھٹی خاندان کے حکمرانوں ہی نے وہاں سے دس گیارہ میل دُور کھلی جگہ پر ایک اور بستی بسانا شروع کر دی جہاں پانی وافر مقدار میں موجود تھا۔ یہ بستی آباد ہوتی چلی گئی اور لودروا اُجڑتا چلا گیا۔ نئی بستی جیسلمیر کے نام سے ایک شہر کی صورت اختیار کر گئی اور لودروا وقت کے حوادث کا شکار ہو کر کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا۔ چاروں طرف سے ریت کے ٹیلوں میں گھرے ہوئے لودروا کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ ریت کے بعض ٹیلے تو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی طرح ٹھوس ہو چکے ہیں جبکہ بیشتر ٹلے ایسے ہیں جو ہوا سے اپنی جگہ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ہوا سے ریت پر ایسی ایسی لہریں اور ایسے ایسے نقش معرض وجود میں آ جاتے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

لودروا کے کھنڈرات پہلے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ لیکن چند سال پہلے اس طرف سیاحوں کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی گئی اور ان قدیم کھنڈرات کو شہر ممنوعہ قرار دے دیا گیا۔ اور وہ علاقہ فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ لوگ یہی سمجھتے رہے کہ ان کھنڈروں میں شاید کوئی بہت بڑا خزانہ دریافت ہوا ہے اور اس علاقے کو فوج کے حوالے کر کے سیاحوں کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی گئی ہے لیکن میں جانتی ہوں وہاں کیا ہے۔'' وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''مجھے ایک مرتبہ وہاں جانے کا موقع ملا تھا جب ''را'' کی طرف سے مجھے ٹریننگ دی جا رہی تھی۔ ان دنوں فوج کی نگرانی میں وہاں جگہ جگہ کچھ تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ کھنڈرات اپنی جگہ موجود تھے۔ اُن کے بیچ میں ایسی چھوٹی چھوٹی نئی عمارتیں بھی معرض وجود میں آ رہی تھیں جن کا مقصد اُس وقت میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ مجھے ایک ہفتہ وہاں رکھ کر جے پور واپس بھیج دیا گیا۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں دہشت گردی کی تربیت کے لئے ایک جدید ترین کیمپ بنایا گیا ہے۔ یہاں سے تربیت حاصل کرنے والوں کو سری لنکا اور پاکستان بھیجا جاتا۔ پاکستان کی طرح بھارتی حکمرانوں نے سری لنکا میں بھی طویل عرصہ سے پنگا بازی شروع کر رکھی ہے۔ سری لنکا کے باغیوں کو بھی یہاں تخریب کاری، دہشت گردی اور گوریلا جنگ کی تربیت دی جاتی ہے جو واپس جا کر اپنے ہی شہروں میں آگ اور خون کا کھیل کھیلتے ہیں۔

اُس کیمپ کے علاوہ راجستھان میں اور بھی بہت سے کیمپ ہیں جہاں پاکستانی نوجوانوں کو دہشت گردی اور تخریب کاری کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ بھارتی حکمرانوں نے طے کر رکھا ہے کہ پاکستان میں امن اور شانتی نہیں ہونے دیں گے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک پاکستان میں

کوئی بھی حکومت جم کر نہیں رہ سکی۔ ایک تو وہاں کے سیاستدانوں کو اپنے دیش سے کوئی محبت نہیں۔ وہ قوم کی خدمت کا جذبہ لے کر نہیں دولت سمیٹنے کے لئے سیاست میں آتے ہیں۔ وہاں کی سیاست پرمٹ اور پلاٹ کے گرد گھومتی ہے۔ اسمبلیوں میں آ کر بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں سے لمبے لمبے قرضے لینا اور ڈکار لئے بغیر انہیں ہضم کر لینا وہاں کے سیاستدانوں کا وطیرہ بن چکا ہے۔ سرکار میں کرپشن اس سے بھی زیادہ ہے۔ وہاں تو رشوت کے بغیر کوئی جائز کام بھی نہیں ہوتا۔ سرکار سے آٹھ دس ہزار روپیہ مہینہ تنخواہ پانے والے سرکاری آفیسر جاگیرداروں جیسی ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان سے بڑے افسروں کی تو بات ہی کیا وہ تو شہنشاہ ہیں۔ عالیشان کوٹھیاں، قیمتی کاریں..... اور ٹھاٹھ باٹھ معمولی بات ہے۔ معمولی درجے کے ملازمین بھی اپنی حیثیت سے بڑھ کر زندگی گزار رہے ہیں۔

سارا دباؤ عوام پر ہے۔ مہنگائی کے عفریت نے عام آدمی کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ بیروزگاری بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان یا تو منشیات یا جرائم کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ وہ چوری، ڈکیتی اور راہزنی کی وارداتیں کرنے پر مجبور ہیں اور ایسے ہی مایوس نوجوان غیر ملکی ایجنٹوں کا آسانی سے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ ''را'' کے ایجنٹ پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں خوبصورت لڑکیاں بھی ہیں جو ایسے نوجوانوں کو تلاش کر کے پھانستی ہیں۔ چند چھوٹی چھوٹی آزمائشوں کے بعد جب ان ایجنٹوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ شکار ان کے مطلب کا ہے تو اس کے گرد جال تنگ کر دیا جاتا ہے۔ بعض کو بلیک میلنگ سے پھانسا جاتا ہے اور بعض کو حسین عورتوں، شراب اور دولت کا لالچ دے کر شکنجے میں جکڑ لیا جاتا ہے۔ ایسے نوجوانوں کو سرحد پار کروا کے راجستھان پہنچا دیا جاتا ہے جہاں پہلے اُن کی برین واشنگ کی جاتی ہے۔ اُن کے ذہنوں میں اپنے ہی ملک کے خلاف نفرت اور تعصب کا زہر بھر دیا جاتا ہے اور پھر انہیں تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت دے کر واپس بھیج دیا جاتا ہے اور وہ اپنوں ہی کے لئے عذاب بن جاتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے بھارتی حکمرانوں نے جموں و کشمیر کے حوالے سے ایک نئی پالیسی اختیار کی۔ پالیسی نہیں گھناؤنی سازش..... اس کی تفصیل میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ کس طرح پاکستانی نوجوانوں کو تخریب کاری کی تربیت دے کر کشمیر بھیجا جائے گا اور اُن کی سرگرمیوں سے کس طرح کشمیریوں کے دلوں میں پاکستان سے نفرت پیدا کی جائے گی۔ دونوں کے تعلقات بگڑ بھی گئے تو ان کا فائدہ بھارت کو پہنچے گا۔

راجستھان میں مختلف مقامات پر تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت کے ڈیڑھ سو سے زیادہ کیمپ ہیں۔ کشمیر کے حوالے سے نئی پالیسی کے تحت بھارتی حکمرانوں نے اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی ''موساد'' سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ موساد پہلے بھی مختلف معاملات میں ''را'' کی مدد کرتی رہی ہے۔ ''موساد'' کو ایسی تخریبی سرگرمیوں کا نصف صدی کا تجربہ ہے۔ تخریب کاری

دہشت گردی اور ایسی ہی گھناؤنی سازشوں سے اپنا وجود برقرار رکھا ہوا ہے۔ ''موساد'' کے ماہرین کے معاہدے کے بعد اُنہیں یہاں بلا لیا گیا۔ ان یہودی ماہرین نے راجستھان کے مختلف کیمپوں کا دورہ کر کے ڈیڑھ سو نوجوانوں کو منتخب کیا جنہیں لودروا کے اس کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ چھ مہینے پہلے اس کیمپ میں تربیتی پروگرام شروع ہو جانا چاہئے تھا مگر وہاں ایک مندر کی وجہ سے اُس پر عمل نہ ہو سکا۔''

''مندر کی وجہ سے.....؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں.....'' سیتا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہاں ایک بہت بڑا جین مندر ہے۔ اُس علاقے پر سیاحوں کے لئے پابندی لگنے سے پہلے جین کے بعض پیروکار مندر کی یاترا کے لئے جاتے رہتے تھے۔ پابندی لگنے کے بعد جین مندر کمیٹی نے جے پور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی۔ یہ کیس صرف پانچ مہینے چل سکا۔ سکیورٹی کے نقطہ نظر سے ہائی کورٹ نے یاتریوں کی آمدورفت پر تو پابندی عائد رکھی البتہ یہ اجازت دے دی کہ دو پنڈت یا پجاری مندر کی دیکھ بھال کے لئے وہاں رہ سکتے ہیں۔ وہ مندر کھنڈر نگر کے شروع ہی میں ہے۔ اس کے آس پاس صرف تین چار چھوٹی چھوٹی عمارتوں کے کھنڈر ہیں۔ اُس کیمپ کی انتظامیہ نے ایک بہت لمبی اور اونچی دیوار کھڑی کر کے اس جین مندر کو کیمپ سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ مندر میں رہنے والا کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ اس دیوار کے دوسری طرف کیا ہو رہا ہے۔''

''اُس کیمپ تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟'' میں نے سیتا کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''جب کسی کام کا ارادہ کر لیا جائے تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آتا ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیمپ کا رُخ کرنے سے پہلے ہمیں شہر میں چند چھوٹے چھوٹے کام کرنے ہوں گے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے تم شہر کے راستوں سے مانوس ہو جاؤ۔ اس طرح تمہیں یہاں کی کچھ تاریخی عمارتیں دیکھنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ اور میرا خیال ہے تم یہ کام کل ہی سے شروع کر دو۔''

''یعنی میں اکیلا؟'' میں سیتا کی اس تجویز پر گڑبڑا سا گیا۔

''یہاں تمہیں کوئی جانتا تو نہیں کہ تم کون ہو۔ پینتیس لاکھ کی آبادی میں کون تم پر توجہ دے گا؟'' سیتا نے کہا۔ ''میرا باہر نکلنا فی الحال خطرناک ہو گا۔ کلپنا کو بھی تمہارے ساتھ نہیں بھیجا جا سکتا۔ البتہ دُرگا تمہارا ساتھ دے سکتی ہے۔'' وہ خاموش ہو کر برآمدے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بھی گردن گھما کر دیکھا، کلپنا ٹرے اُٹھائے چلی آ رہی تھی جس میں چائے کے تین کپ تھے۔ اُس کے پیچھے ہی دُرگا بھی تھی۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' دُرگا نے ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''مہابیر کھلی فضا میں رہنے کا عادی ہے..... حویلی کی قید سے اس پر بوریت طاری ہونے لگی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''یہ شہر کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے ساتھ۔''

''میرے ساتھ.....'' دُرگا ہنس پڑی۔ ''مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ مگر دو چار دن رُک جاؤ! مہاراج کی حویلی والا معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے۔ ہوسکتا ہے اس دوران مہاراج خود بھی ایک دن کے لئے یہاں آ جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں تو تمہارے ساتھ باہر کی سیر کر رہی ہوں اور پیچھے مہاراج یا اس کا کوئی آدمی یہاں پہنچ جائے۔ ایسی صورت میں سیتا کے لئے پریشانی ہوسکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے..... دو چار روز بعد ہی سہی۔'' میں نے کہتے ہوئے کلپنا کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا۔ کلپنا اپنے لئے چائے نہیں لائی تھی۔ اُس نے ایک کپ سیتا کو دے دیا اور دوسرا دُرگا کو اور حوض کی منڈیر پر بیٹھ کر پانی سے کھیلنے لگی۔ اُس نے اُس وقت سیتا کا دوسرا جوڑا پہن رکھا تھا جو اُس پر بہت اچھا لگ رہا تھا۔

چائے کے دوران ہم مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ کلپنا حوض کی منڈیر پر بیٹھی پانی سے کھیلتی ہوئی بار بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

○

مہارانا دھرمیش سنگھ صبح آ کر شام کو واپس چلا گیا تھا۔ اور ہمیں وہ پورا دن دوسرے مکان میں گزارنا پڑا تھا۔

مہارانا نے پولیس کی تفتیش سے یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیا تھا کہ وہ روز روز جے پور سے یہاں نہیں آ سکتا۔ البتہ پولیس کسی مزید تفتیش کے لئے کسی وقت حویلی میں داخل ہونا چاہے تو چتون سنگھ اُن کی خواہش کا احترام کرے گا۔

پولیس ابھی تفتیش کا کوئی راستہ متعین نہیں کر سکتی تھی۔ کیپٹن گوپال سنگھ کے قتل کے حوالے سے فوج کا پولیس پر خاصا دباؤ تھا، لیکن پولیس ابھی تک اندھیرے ہی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔ نہ تو گنگو کا سراغ ملا تھا اور نہ ہی پولیس ان عورتوں میں سے کسی کا پتہ چلا سکی تھی جو اُس رات حویلی میں موجود تھیں۔ اور پولیس اُن دو عورتوں کا سراغ لگا بھی کیسے سکتی تھی؟ جبکہ وہ دونوں (سیتا اور کلپنا) اس وقت محفوظ ترین پناہ گاہ میں تھیں۔ البتہ پولیس نے بعض ایسی عورتوں کو ضرور پکڑا تھا جو اس سے پہلے کیپٹن گوپال اور اُس کے فوجی دوستوں کے ساتھ حویلی میں آ کر دادِ عیش دیتی رہی تھیں۔ اُن میں دو تو سوسائٹی گرلز تھیں اور ایک کسی دولت مند ٹھاکر کی بیٹی تھی۔ لیکن اُن تینوں نے اُس رات جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی کا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ وہ تو اُس رات ایک نائٹ کلب میں تھیں اور تیسری فوجی میس میں آفیسروں کا جی بہلا رہی تھی۔ اس طرح پولیس کی تفتیش اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

میں اس خوبصورت حویلی کی قید میں واقعی بور بلکہ بیزار ہو گیا تھا۔ اور دُرگا نے بھی میری اس کیفیت کو بھانپ لیا اور اُس نے وعدہ کیا کہ آج وہ مجھے گھمانے کے لئے لے جائے گی۔

اُس روز موسم بھی خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد دُرگا تیار ہونے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی اور تقریباً ایک

گھنٹے بعد جب وہ باہر نکلی تو اُسے دیکھ کر میں سانس لینا بھول گیا۔ اور پلک جھپکے بغیر اُس کی طرف دیکھتا رہا.....

وہ واقعی قیامت تھی۔ ہلکے سے میک اَپ نے اُسے چلتی پھرتی قیامت بنا دیا تھا۔ نیلی ساڑھی بھی اُس پر خوب جچ رہی تھی۔ ساڑھی ناف سے نیچے تھی اور بلاؤز بھی بہت مختصر تھا۔ گلے میں سونے کی چین تھی جس میں لگا ہوا لاکٹ سینے سے چپکا ہوا تھا۔ کانوں میں ہیرے کے بندے اور ناک میں بھی کیل تھی جس میں لگا ہوا ننھا سا ہیرا روشنی سے چمک رہا تھا۔ میں دس سال پیچھے جا کر چشمِ تصور سے اُسے دیکھنے لگا۔ دس سال پہلے سیتا کا باپ دُرگا پر مرمٹا تھا تو اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

''کہاں کھو گئے؟'' دُرگا نے میرے چہرے کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

''ماضی میں.....!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور پھر سیتا اور دُرگا کے قہقہوں کی آواز سن کر میں جھینپ سا گیا۔

''دُرگا جی! خیال رکھنا..... یہ میری امانت ہے۔'' سیتا نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

دُرگا اُسے گھور کر رہ گئی۔

دُرگا مجھے لے کر خفیہ راستے سے حویلی کے عقبی مکان میں لے آئی اور مجھے عقبی گلی میں نکال دیا۔ ''آگے بازار میں بائیں طرف مُڑ کر چلتے رہنا۔ میں تمہیں اُس طرف ملوں گی۔'' اُس نے گلی میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ دُرگا مجھے ساتھ لے کر حویلی کے گیٹ سے نہیں نکلنا چاہتی تھی تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ یہ احتیاط بہرحال اچھی تھی۔ میں گلی میں چلتا ہوا تقریباً سو گز آگے بازار میں بائیں طرف مُڑ گیا اور فٹ پاتھ پر ٹہلنے والے انداز میں چلنے لگا۔ خاصا بڑا اور بارونق بازار تھا۔ میرے دل کی دھڑکن بے ربط ہو رہی تھی حالانکہ مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہاں میرا صورت آشنا کوئی نہیں تھا لیکن نجانے میرے دل میں یہ خوف کیوں تھا جیسے اچانک ہی درجنوں رائفلیں مجھے زد پر لے لیں گی۔ لیکن میرے یہ خدشے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ میں فٹ پاتھ پر چلتا ہوا تقریباً ایک فرلانگ آگے نکل چکا تھا۔ پھر نیلے رنگ کی ایک کار پیچھے سے میرے قریب آ کر رُکی اور ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''مہابیر..... آ جاؤ!''

میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ دُرگا تھی جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

اُس نے جھک کر دروازے کے لاک کی ناب اُٹھا دی۔ میں نے دروازہ کھولا اور اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دُرگا نے سیدھے ہوتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یہ کار دیکھنے میں پرانی سی لگتی تھی لیکن اُس کا انجن بہترین حالت میں تھا اور آواز پیدا کئے بغیر چل رہا تھا۔

دُرگا ہلکی رفتار سے گاڑی چلا رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ مجھے راستوں اور مشہور عمارتوں کے

بارے میں بتاتی جا رہی تھی۔

''سب سے پہلے ہم شہر کے زیریں حصے کی طرف جائیں گے۔'' دُرگا نے ایک سڑک پر گاڑی موڑتے ہوئے کہا۔ ''اُس طرف چند تاریخی حویلیاں ہیں جنہیں دیکھنے کے لئے لاتعداد سیاح آتے ہیں۔ ان میں سالم سنگھ کی حویلی، نتھ مل جی کی حویلی اور پتوؤں کی حویلیاں خاصی مشہور ہیں۔ انہیں تو قدیم طرزِ تعمیر کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔'' اُس نے گاڑی ایک اور سڑک پر موڑ دی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ انگریزوں نے اپنی حکومت کے آخری دور میں ان حویلیوں کو اُکھاڑ کر انگلستان لے جانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن اسی دوران ہندوستان کو سرکار انگلشیہ سے آزادی مل گئی اور پہلی ہند سرکار نے ان حویلیوں کو قومی ورثہ قرار دے دیا۔''

ایک اور سڑک پر موڑ کر اُس نے کار روک لی۔ سامنے ہی پتوؤں کی حویلیاں تھیں۔ اُن تک پہنچنے کے لئے ہمیں ایک چوڑی گلی تک پیدل چلنا پڑا۔ وہ پانچوں حویلیاں واقعی فنِ تعمیر کا حسین ترین شاہکار تھیں۔ پانچوں حویلیاں ساتھ ساتھ تھیں۔ اُن میں لگے ہوئے پتھروں پر نہایت خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ پتھروں کی خوبصورت نازک جالیاں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اُن حویلیوں کی تعمیر میں کہیں بھی سیمنٹ، چونے یا کسی اور مسالے کا استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ پتھروں کو تراش کر ایک دوسرے سے اس طرح جوڑا گیا تھا کہ کہیں کوئی معمولی سا رخنہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اُس وقت لاتعداد ملکی اور غیر ملکی سیاح وہاں موجود تھے اور اُن کی طرح میں بھی حیرت سے انسانی ہاتھوں سے بنائے ہوئے یہ شاہکار دیکھ رہا تھا۔ دُرگا مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک حویلی کے اندر لے گئی۔ اندر کا منظر اس سے بھی زیادہ حسین تھا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ بعض سیاح انسانی ہاتھوں سے بنائے ہوئے اس شاہکار کے علاوہ میرے پہلو میں قدرت کے اس حسین شاہکار کو بھی دیکھ رہے تھے جس کا نام دُرگا تھا۔ ہم دونوں ایک ستون کے قریب کھڑے اُس پر بنے ہوئے خوبصورت نقش و نگاہ دیکھ رہے تھے کہ کسی کیمرے کی فلیش گن چمکی..... ایک لمحہ کو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

وہ غالباً کوئی مقامی سیاح تھا جس نے تصویر کھینچی تھی۔ میں اُس شخص کی طرف بڑھا مگر دُرگا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''چھوڑو..... رہنے بھی دو! اُس نے اپنے شوق کے لئے تصویر کھینچی ہے ہمارا کیا جائے گا؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں وہاں سے نکل کر دوسری حویلی میں آ گئے۔ یہ حویلی بھی پہلی حویلی کی طرح حسین تھی اور دُرگا مجھے ان حویلیوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''پتوؤں کی یہ حویلیاں 1800ء سے 1860ء کے درمیانی عرصہ میں بافنا خاندان نے تعمیر کروائی تھیں۔ یہ خاندان پانچ بھائیوں پر مشتمل تھا۔ ہر بھائی نے اپنی ضرورت اور عیش و آرام

مدنظر رکھتے ہوئے اپنی اپنی حویلی تعمیر کروائی اور ان حویلیوں میں اب بھی اسی خاندان کے لوگ آباد ہیں۔ پتوا تجارت پیشہ تھے۔ اُن کی تجارت سندھ، افغانستان، سنٹرل ایشیا اور دوسری طرف چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ لوگ افیون، سونا چاندی، گرم مصالحے اور ہر اُس چیز کی تجارت کرتے تھے جس سے منافع کی توقع ہو۔ یہ لوگ اس قدر مالدار تھے کہ اودھے پور اور جیسلمیر کے راجواڑے بھی اُن سے بڑی بڑی رقمیں سود پر اُدھار لیتے تھے۔ اس طرح ان لوگوں نے راجواڑوں سے بھی بہت کمایا۔''

میں بڑی توجہ سے دُرگا کی باتیں سن رہا تھا۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے بار بار اُس تصویر کا خیال آ رہا تھا جو اُس آدمی نے کھینچی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک عورت اور دو بچے بھی تھے۔ اُس آدمی پر اگرچہ کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن نجانے کیوں میں اپنے آپ میں بے نام سی بے کلی محسوس کرنے لگا تھا۔ اگر دُرگا مجھے نہ روکتی تو میں اُس شخص سے کیمرہ چھین کر فلم ضائع کر دیتا۔ میں حویلیوں میں گھومتا ہوا اب بھی اُس شخص کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ مگر وہ شخص مجھے دوبارہ نظر نہیں آیا۔

ہم پتوؤں کی حویلی سے فارغ ہو کر سالم سنگھ کی حویلی میں آ گئے۔ قلعے کے پچھلی طرف واقع سالم سنگھ کی حویلی بھی اپنی ایک منفرد تاریخ رکھتی تھی۔ اس حویلی تک پہنچنے کے لئے ہمیں کئی تنگ سی گلیوں سے گزرنا پڑا تھا۔ اُس وقت آسمان پر بادل چھٹ گئے تھے اور ڈوبتے ہوئے سورج کی الوداعی کرنوں میں حویلی کی چھتریاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ حویلی ایک اُونچے چبوترے پر تعمیر کی گئی تھی۔ نیچے سے کسی قدر تنگ مگر اُوپر جا کر بالکونیوں اور چھتریوں کی صورت میں پھیلتی چلی گئی تھی۔ جیسلمیر کے مخصوص پیلے پتھروں سے بنی ہوئی اس حویلی کی دیواروں اور ستونوں پر جاذبِ پھول پتیاں، مور، ہرن اور دوسرے جانوروں اور پرندوں کے نقش بڑی خوبصورتی سے تراشے گئے تھے۔ سالم سنگھ اپنی اس سات منزلہ حویلی سے قلعے تک ایک پل تعمیر کرانا چاہتا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

میں دُرگا کو سیاحوں کی ایک ٹولی کے پاس چھوڑ کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں کا ماحول پتوؤں کی حویلی سے بالکل مختلف تھا۔ اندر ہو کا عالم طاری تھا۔ لمبی لمبی راہداریاں اور غلام گردشیں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ چھتوں پر جنگلی کبوتروں نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ اُن کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ ماحول پر عجیب سی وحشت طاری کئے ہوئے تھی۔ میں ایک تنگ سی گول سیڑھی پر چڑھتا ہوا اُوپر بالکونی میں چلا گیا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور باہر بھی ملگجا اندھیرا پھیلا رہا تھا۔ میں نے بالکونی سے نیچے جھانکا تو حویلی کے گیٹ کے قریب دو تین سیاح کھڑے تھے اور سامنے والی گلی سنسان پڑی تھی۔

میں واپس جانے کے لئے مُڑا تو ایک کونے سے سسکیوں کی آواز سن کر چونک سا گیا..... میں نے اُس طرف دیکھا، مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ میں اُسے اپنا واہمہ سمجھ کر آگے بڑھ

گیا۔ لیکن سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر ٹھٹھک گیا..... سسکیوں کی آواز پھر سنائی دی تھی...

میں نے مُڑ کر اُس طرف دیکھا تو سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا..... قدیم راجستھانی لباس میں ملبوس ایک لڑکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اگرچہ شام کا اندھیرا تھا مگر اُس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں بے پناہ اُداسی تھی۔ وہ ہلکی ہلکی سسکیاں بھر رہی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً ہی خیال آیا کہ شاید وہ کوئی سیاح ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ اس حویلی میں آئی ہو گی اور بچھڑ گئی۔ وہ اندھیرے سے ڈر کر یہاں بیٹھ کر رونے لگی تھی۔ یا ہو سکتا ہے وہ کوئی گائیڈ لڑکی ہو اور اُس کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی صورتحال پیش آئی ہو۔

''کیا بات ہے لڑکی..... کیوں رو رہی ہو؟'' میں نے اُس کے قریب پہنچ کر نرم اور ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

اُس نے پلکوں کی بھاری جھالر آنکھوں پر سے اُٹھائی اور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا سب لوگ چلے گئے.....؟'' اُس کی آواز میں عجیب سا ترنم تھا۔

''ہاں..... سب چلے گئے۔'' میں نے بدستور نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''تم کون ہو..... کس کے ساتھ آئی تھیں؟''

وہ خاموش رہی اور پلکیں جھپکے بغیر میری طرف دیکھتی رہی۔

''میرا خیال ہے تم اپنی فیملی کے ساتھ آئی تھیں اور اُن سے بچھڑ گئی ہو..... یا تم کوئی گائیڈ ہو۔ کن لوگوں کے ساتھ آئی تھیں؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''میں کسی کے ساتھ نہیں آئی..... یہیں رہتی ہوں میں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور اُس نے پلکیں اب بھی نہیں جھپکی تھیں۔

''کیا مطلب.....'' میں اُچھل پڑا۔ ''کیا تم کہنا چاہتی ہو کہ تم اسی اُجاڑ اور سنسان حویلی میں رہتی ہو؟''

''ہاں.....'' اُس نے جواب دیا۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آواز میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔ ''میرا نام کنیا کماری ہے..... میں اسی حویلی میں رہتی ہوں۔ سالم سنگھ نے مجھے اپنی خوابگاہ میں طلب کیا۔ میں اُس کے دروازے تک تو آ گئی پھر خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلی۔ میں جانتی تھی وہ میرے ساتھ کیا کرے گا۔ وہ خوبصورت لڑکیوں کو اپنی خواب گاہ میں بلاتا ہے، رات بھر اُن کے شریر کو نوچتا ہے، جھنجھوڑتا ہے اور صبح اُس کی لاش ملتی ہے حویلی کی کسی ویران نکر میں۔ میں جانتی تھی وہ میرے ساتھ بھی یہی کرے گا..... میں ڈر کر بھاگ نکلی۔ سالم سنگھ کے آدمیوں نے مجھے پکڑنے کے لئے میرا پیچھا کیا۔ میں دوڑتی رہی۔ اندھیری راہداریوں میں مجھے باہر کا راستہ نہیں ملا۔ میں یہاں چھپ کر بیٹھ گئی۔''

''تمہیں کس نے اپنی خواب گاہ میں طلب کیا تھا.....؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔ سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی چلی گئی..... سردی محسوس ہونے کے باوجود

میری پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا..... زبان سوکھ کر کانٹے کی طرح تالو میں چبھنے لگی۔ ''کیا تم اُسے جانتی ہو.....؟'' میری آواز میں بھی ہلکی سی کپکپاہٹ آ گئی تھی۔

''ہاں.....!'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''اگر جانتی نہ ہوتی تو تمہیں یہ سب کچھ کیسے بتاتی؟'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''سالم سنگھ کے پتا دیوان سروپ سنگھ کو راجہ کے ایک قریبی رشتے دار نے قتل کر دیا تھا۔ سالم سنگھ نے راجہ سے فریاد کی مگر اُسے انصاف نہیں ملا۔ سالم سنگھ کے سینے میں بدلے کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اُس نے سوگند اُٹھائی کہ راجہ کے خاندان کو برباد کر دے گا..... ختم کر ڈالے گا اُن سب کو۔ لیکن اُس وقت وہ چھوٹا تھا اور ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وقت کا انتظار کرنے لگا۔ سمے گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑکتی رہی۔'' وہ خاموش ہو کر سنسان اور اندھیری راہداری کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس نے پہلی مرتبہ میرے چہرے سے نظریں ہٹائی تھیں۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

اُس کی نظریں ایک بار پھر میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ اس بار بھی اُس کی پلکوں کو جنبش نہیں ہوئی تھی۔

''سالم سنگھ جب جوان ہوا تو اُسے اُس کے باپ کی چھوڑی ہوئی جگہ پر ریاست کا دیوان مقرر کر دیا گیا۔'' کنیا کماری نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ دیوان سالم سنگھ بہت نرم گفتار تھا۔ اُس کا شریر بھی عورتوں کی طرح نرم اور نازک تھا۔ وہ جین تھا..... یہ امن اور شانتی کا دھرم ہے۔ کسی ذی رُوح کو دُکھ پہنچانا اس دھرم میں بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا ہے۔ جانوروں تک سے نرمی اور رحم کا سلوک جین دھرم کی تعلیمات کا ایک خاص پہلو ہے۔ اس تعلیم کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ رات کو شمع نہ جلائی جائے تاکہ کوئی پروانہ اُس میں جل کر اپنی جان نہ دے دے۔ لیکن سالم سنگھ کو دھرم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس کے اصولوں کا پابند نہیں سمجھتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں ریاست کا دیوان (وزیر اعظم) ہونے کے ناطے اُسے بہت سے اختیارات حاصل تھے اور اختیارات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ اُس نے بہت جلد راجہ مول راج کو بے دست و پا کر دیا اور ریاست کے سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔

سالم سنگھ انسان سے بھیڑیا بن گیا..... وہ بہت ظالم آدمی تھا۔ اُس نے رعایا کو بھی اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینے کے لئے اُس نے شاید ریاست کو تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ راجہ مول راج اُس کی شکتی کے سامنے مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بے بسی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُسے اپنی جان کا بھی خوف تھا۔ اُسے یقین تھا کہ سالم سنگھ اُسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ سالم سنگھ کے مظالم بڑھتے جا رہے تھے۔ تاجروں پر تو اُس نے

مظالم کی انتہا کر دی۔ وہ خوفزدہ ہو کر راتوں کو اندھیرے میں شہر سے بھاگنے لگے مگر سالم سنگھ کے ہرکارے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کرنے والے بے شمار لوگ اُس کے ہاتھوں مارے گئے۔''

وہ خاموش ہو گئی..... میں بھی خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر بالکونی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ میں اب بھی خاموش تھا۔ بالآخر اُس نے خود ہی کہنا شروع کیا۔

''راجہ مول راج گھٹ گھٹ کر مر گیا۔ اُس کے بیٹے گج سنگھ نے راج گدی سنبھال لی۔ اُس نے موقع پاتے ہی پہلی فرصت میں بڑی ہوشیاری سے سالم سنگھ کو قتل کروا دیا۔ اس طرح جیسلمیر کے لوگوں کو دیوان سالم سنگھ کے ظلم و ستم سے نجات مل گئی۔''

''مگر تم یہ سب کچھ کیسے جانتی ہو؟'' میں نے بے اختیار ہو کر پھر اپنا وہی سوال دُہرایا۔

کنیا کماری نے تیزی سے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور اُس کی پلکوں کو اب بھی جنبش نہیں ہوئی تھی۔

''میں سالم سنگھ کی کنیز ہوں.....'' اُس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔ ''اب چلے جاؤ..... اُس کے آدمی میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے دیکھ لیا تو تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔ جاؤ..... چلے جاؤ.....''

میں کچھ کہنے کی بجائے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس ساری گفتگو کے دوران اُس نے ایک مرتبہ بھی پلکیں نہیں جھپکی تھیں۔ ایک انجانے خیال سے میرے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں پھیلنے لگیں۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اُس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی اور میرے دماغ میں سنسناہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا..... اور پھر میرے اندر کھڑے رہنے کی بھی سکت نہیں رہی..... اور میں اسی جگہ بیٹھتا چلا گیا.....

○

وہ آواز بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی..... کوئی میرا نام لے کر پکار رہا تھا۔

''مہابیر..... مہابیر کہاں ہو تم.....؟''

دُور سے آتی ہوئی یہ شیریں اور مترنم آواز کانوں میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں بالکونی سے چند گز دُور سیڑھیوں کے قریب ایک ستون سے ٹیک لگائے اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ میری ٹانگیں سامنے کو پھیلی ہوئی تھیں۔

وہ آواز ایک بار پھر سنائی دی..... اس مرتبہ میں نے پہچان لیا۔ وہ دُرگا کی آواز تھی جو حویلی کے نچلے حصے میں کسی جگہ سے مجھے پکار رہی تھی۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں..... مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں کچھ وقت لگ گیا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ وہاں کسی ذی رُوح کا وجود نہیں تھا۔ اُس کے قدموں کے نشان تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ کہاں گئی؟

کیا وہ حقیقت تھی یا میں نے جاگتے میں کوئی خواب دیکھا تھا..... یا وقت مجھے پیچھے لے گیا تھا کہیں بہت دُور..... ماضی میں.....!

میرا ذہن بری طرح اُلجھ گیا تھا۔ شاید ہمارے دماغ میں کچھ ایسے خلیے موجود ہیں جو گزرے واقعات کی ذہنی تصویر بھی اُتار سکتے ہیں۔ شاید جو کچھ گزرتا ہے مرتا نہیں ہے۔ ہمارے آس پاس دُھندلے دُھندلے نقوش کی صورت میں، خواب جیسی سلیف حالت میں موجود رہتا ہے۔ شاید کسی بہت حساس دماغ کا انٹینا ٹی وی کی لہروں کی طرح انہیں گرفت میں لے کر دماغ کی سکرین پر لا سکتا ہے.....

دُرگا کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ وہ مجھے اپنے آس پاس نہ پا کر پریشان ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کئے اور تیزی سے سیڑھیاں اُترتا ہوا نیچے آ گیا۔ مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا..... جب میں حویلی میں داخل ہوا تھا تو راہداریاں تاریک اور سنسان تھیں۔ اور جب اوپر سے بالکونی سے جھانک کر دیکھا تھا تو اُس وقت بھی حویلی کے دروازے کے سامنے دو تین آدمی دکھائی دیئے تھے، اور سامنے والی گلی سنسان پڑی تھی۔ لیکن اس وقت حویلی میں بہت سے سیاح موجود تھے۔ راہداریاں بالکل تاریک نہیں تھیں تاہم ملگجا سا اندھیرا تھا۔ لیکن دُور سے کسی کو دیکھ کر شناخت کیا جا سکتا تھا۔

دُرگا مجھے نظر آ گئی..... وہ پریشانی سے مجھے تلاش کرتی ہوئی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ اور پھر اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔

''ارے..... کہاں غائب ہو گئے تھے تم مہابیر؟'' اُس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

''اُوپر چلا گیا تھا.....'' میں نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''میں تو پریشان ہو گئی تھی۔'' دُرگا بولی۔ ''آؤ! اب واپس چلیں۔ اب اتنا وقت نہیں ہے کہ حویلی اور حویلی دیکھ سکیں۔ کہیں بیٹھ کر تھوڑی دیر آرام کرتے ہیں۔''

حویلی میں موجود سیاح بھی واپس جا رہے تھے۔ میں دُرگا کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑا۔ اس نے اب بھی میرا ایک ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور بعض لوگ مُڑ مُڑ کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

حویلی کے باہر آ کر میں رُک گیا اور گردن اُٹھا کر اُوپر بالکونی کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا..... کیا دیکھ رہے ہو؟'' دُرگا نے پوچھا۔

''میرے ساتھ ایک عجیب سی بات ہوئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ میں اُسے کنیا کماری کے بارے میں بتاتے ہوئے جھجک رہا تھا کہ وہ میرا مذاق اُڑائے گی۔

''کیا.....'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں چند لمحے خاموش کھڑا اُوپر بالکونی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر جھجکتے ہوئے اُس پراسرار نشے کے بارے میں بتانے لگا جس نے میرا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔

''اور وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا.....'' دُرگا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اور پھر اپنے ہاتھ کی

پشت سے میری پیشانی کو چھوتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا مہابیر؟''

''ہاں..... میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے اُس کا ہاتھ ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بعض لوگ عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ''وہ شاید میرا واہمہ تھا یا میں نے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھا تھا۔''

''وہ نہ تو تمہارا واہمہ تھا نہ تم نے جاگتے میں کوئی خواب دیکھا تھا۔'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''اس علاقے میں خوبصورت گائیڈ لڑکیاں گھومتی رہتی ہیں جو سیاحوں کو بیوقوف بنانے کے لئے ایسے ڈرامے کرتی رہتی ہیں۔ وہ بھی کوئی گائیڈ لڑکی ہوگی جو تمہیں بیوقوف بنا گئی۔''

''لیکن وہ غائب کہاں ہوگئی؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تم نے کہا ہے نا کہ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی تھی اور تمہارا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا تھا اور تم وہیں بیٹھ گئے تھے۔ اور پھر تمہاری آنکھ میری آواز سے کھلی تھی۔'' دُرگا نے کہا۔

''ہاں..... یہ درست ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ لڑکی یقیناً ہپناٹزم جانتی ہوگی۔'' دُرگا نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اُس نے تمہیں ہپناٹائز کر دیا تھا۔ ذرا اپنی جیبیں ٹٹول کر دیکھو! وہ تمہیں کوئی چپت تو نہیں لگا گئی؟''

میں چند لمحے دُرگا کو گھورتا رہا۔ وہ میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔ لیکن اُس کے دوبارہ کہنے پر جب میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا تو میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ پراسرار لڑکی کنیا کماری واقعی مجھے چپت لگا گئی تھی..... میری جیبیں خالی تھیں۔

○

گنجان آبادی والی تنگ سی گلیوں سے گزر کر ہم اُس کشادہ گلی میں آ گئے جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔ دُرگا نے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور میں پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کار گلیوں سے نکل کر ایک بارونق سڑک پر آ گئی۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور بازار میں برقی قمقموں کی رنگ برنگی روشنیاں جگمگا اُٹھی تھیں۔ میں اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھا کبھی سامنے اور کبھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا۔

''کیا ہوا مہابیر.....'' دُرگا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم یکایک خاموش کیوں ہو گئے؟''

''کچھ نہیں..... ''کچھ بھی نہیں ہوا۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''سمجھ گئی۔'' دُرگا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''تم نے اس واقعہ کا ضرورت سے زیادہ ہی اثر لیا ہے۔ ارے بھول جاؤ اس بات کو۔ بڑے شہروں میں اس قسم کے واقعات رونما ہوتے

ہی رہتے ہیں۔ بس ذرا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔''

''اُس لڑکی نے کس خوبصورتی سے مجھے بیوقوف بنا دیا۔'' میں نے کہا۔ ''اُس نے کتنی شاندار کہانی گھڑی تھی۔ میں تو اُس کی باتوں کے سحر میں کھو کر ماضی میں پہنچ گیا تھا اور یہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔''

''اگر وہ اتنی شاندار کہانی نہ گھڑتی تو تم اُس کے جال میں کیسے پھنستے؟'' دُرگا نے کہا۔ ''وہ پلک جھپکے بغیر مسلسل تمہاری طرف دیکھتی رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ باتوں کے دوران تمہیں ٹرانس میں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور بالآخر اس میں کامیاب ہوگئی۔''

''ہاں..... شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن.....''

''ارے بھول جاؤ سب کچھ۔'' دُرگا نے ہاتھ اسٹیئرنگ سے اُٹھا کر میری ران پر مارا۔ ''بس آئندہ ذرا محتاط رہنا۔'' میں اُچھل پڑا۔ مجھے دُرگا سے اس بے تکلفی کی توقع نہیں تھی۔ اُس نے ہاتھ ہٹا کر دوبارہ اسٹیئرنگ پر رکھ لیا۔

اگلے چوک پر ہماری گاڑی ٹریفک جیم میں پھنس گئی۔ گاڑیوں کے ہارنوں کی آوازوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تنگ سا بازار تھا اور اس ٹریفک میں منی ٹرک بھی نظر آ رہے تھے، کاریں بھی، اُونٹ گاڑیاں اور گدھا گاڑیوں کے علاوہ آٹو رکشہ اور سائیکل رکشے بھی نظر آ رہے تھے۔ پتہ چلا کہ آگے چوک پر ایک بڑا مال بردار ٹرک فٹ پاتھ سے ٹکرا کر اُلٹ گیا تھا جس کی وجہ سے راستہ بلاک ہو گیا تھا۔ سڑک کے فٹ پاتھ دُکانداروں نے اپنا سامان پھیلا کر گھیر رکھے تھے جس سے ٹریفک میں مزید رُکاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔

دُرگا نے اپنی کار بڑی مشکل سے ہجوم سے نکال کر ایک تنگ سی گلی میں موڑ دی۔ بعض چھوٹی گاڑیاں اور آٹو رکشے اس گلی سے بھی نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عجیب سی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ جس کو جس طرف راستہ نظر آتا اُس طرف اپنی گاڑی گھسائے لئے جا رہا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد کئی تنگ گلیوں کے چکر کاٹ کر بالآخر ہم ایک اور بازار میں نکل آئے۔ اور پھر مختلف سڑکوں پر گھومنے کے بعد مین بازار میں پہنچ گئے۔ دُرگا اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اور بالآخر اُس نے ایک بہت بڑے شاپنگ سنٹر کے سامنے کار روک کر انجن بند کر دیا اور اپنی طرف کا شیشہ چڑھانے لگی۔ میں نے بھی اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا اور دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا۔

شاپنگ سنٹر بہت بڑا تھا۔ سینکڑوں دُکانیں تھیں جہاں ہر قسم کا مال بھرا ہوا تھا۔ دُرگا نے ایک ہاتھ کندھے پر لٹکے ہوئے پرس پر رکھا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام کر وہ بڑی شان سے شاپنگ سنٹر میں داخل ہوئی۔

سرینگر میں، میں نے کچھ بڑی دُکانیں دیکھی تھیں۔ لیکن اس قسم کا اتنا بڑا شاپنگ سنٹر وہاں نہیں تھا۔ میں اندر داخل ہو کر حیرت بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ روشنیوں سے

جگمگاتی دُکانوں میں گاہکوں کی بھرمار تھی اور گاہکوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ بیشتر عورتیں ساڑھیوں میں ملبوس تھیں۔ بہت سی عورتیں راجستھانی لباس میں بھی نظر آ رہی تھیں۔ بعض عورتوں کے ساتھ مرد بھی تھے۔ لیکن وہ سب اُلو کے پٹھے لگ رہے تھے۔ کسی نے بچے کو گود میں اُٹھایا ہوا تھا اور کوئی سامان اُٹھائے بیگم کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

دُرگا مجھے لے کر گارمنٹس کی ایک بہت بڑی دُکان میں داخل ہو گئی۔ یہاں خواتین کے ملبوسات بھی تھے اور مردانہ بھی۔ دونوں پورشن الگ الگ تھے۔ شوکیسز میں صرف ساڑھیاں اور زنانہ راجستھانی ملبوسات ہی ڈسپلے کئے ہوئے تھے۔ صرف ایک شوکیس میں ایک ڈمی پر مردانہ راجستھانی لباس ڈسپلے کیا ہوا تھا۔ اُس دکان میں زیادہ گاہک زنانہ ملبوسات والے شعبے میں تھے اور ظاہر ہے خریدار بھی عورتیں ہی تھیں۔ دُرگا مردانہ ملبوسات والے شعبے کے ایک کاؤنٹر کے سامنے رُک گئی۔ اس طرف بھی کچھ گاہک تھے لیکن ایک سیلز مین فوراً ہی ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔

''ان کے سائز کی کچھ شرٹس اور پینٹس دکھاؤ.....!'' دُرگا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں گڑبڑا سا گیا۔ سیلز مین فوراً ہی اِنچی ٹیپ سے میری کمر اور گردن ناپنے لگا اور پھر اُس نے ہمارے سامنے پینٹوں اور شرٹوں کا ڈھیر لگا دیا..... دُرگا نے اپنی پسند سے میرے لئے چھ پینٹس اور چھ شرٹس منتخب کیں اور مجھے ٹرائی رُوم کی طرف دھکیل دیا۔

اس طرف سے فارغ ہو کر دُرگا نے زنانہ شعبے سے سیتا اور کلپنا کے لئے بھی کچھ کپڑے خریدے۔ اُن میں زیادہ تر ساڑھیاں اور راجستھانی لباس تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم اُس دُکان سے باہر نکلے۔ دوسری دُکانوں سے کچھ اور چیزیں بھی خریدی گئیں۔ جب ہم شاپنگ سنٹر سے باہر نکلے تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ تمام سامان پچھلی سیٹ پر ڈال دیا گیا۔ کار ایک بار پھر مختلف سڑکوں پر گھومنے لگی اور بالآخر دُرگا نے کار رام باغ روڈ پر واقع عالیشان رام گڑھ پیلس ہوٹل کی پارکنگ میں روک لی۔

بہت شاندار ہوٹل تھا اور اُسے غالباً جیسلمیر کا سب سے بڑا ہوٹل ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ فائیو اسٹار رہائشی سہولتوں کے علاوہ یہاں ایک شاندار ریسٹورنٹ، بار رُوم، کلب اور سوئمنگ پول بھی تھا۔ اس قسم کے ہوٹلوں میں وہی لوگ آ سکتے تھے جن کی جیبوں میں نوٹ مچلتے تھے۔

ہم ریسٹورنٹ میں آ گئے۔ یہ شام کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ ایسے ہوٹلوں میں اصل رونق تو دس گیارہ بجے کے بعد دیکھنے میں آتی ہے۔ اس وقت بھی بہرحال لوگوں کی معقول تعداد وہاں موجود تھی۔

ہم ایک میز کے قریب پہنچے تو ایک باوردی ویٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر ہمارے لئے کرسیاں کھینچ دیں۔ بیٹھنے کے بعد دُرگا نے کافی کا آرڈر دے دیا۔

''سیتا پریشان ہو رہی ہو گی..... خاصی دیر ہو گئی ہے ہمیں گھر سے نکلے ہوئے۔'' میں نے

دُرگا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کافی پی کر چلتے ہیں..... ویسے میں نے سیتا کو بتا دیا تھا کہ ہمیں دیر ہو جائے گی۔'' دُرگا نے جواب دیا۔

اور پھر باتیں کرتے کرتے وہ چونک گئی..... وہ میرے پیچھے کسی کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ ایک دراز قامت آدمی خونخوار نظروں سے دُرگا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ساتھ بھی ایک عورت تھی اور اُس نے بھی دُرگا کی طرح نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

''کون ہے یہ آدمی؟'' میں نے دُرگا سے پوچھا۔

''کیلاش۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ میں سمجھ گیا وہ دُرگا کا سابق منگیتر تھا۔

''ڈر رہی ہو؟'' میں نے دُرگا کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''ڈرے میری جوتی.....'' دُرگا نے خالص عورتوں کے انداز میں کہا۔ ''یہاں اگر اس نے کوئی بدتمیزی کی تو اسے پچھتانا پڑے گا۔''

ویٹر نے ہمارے سامنے کافی سرو کر دی۔ کافی پیتے ہوئے میں نے ایک بار پھر پیچھے مُڑ کر اور اِدھر اُدھر دیکھا، کیلاش نظر نہیں آیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ میں نے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی تھی۔ ہم وسیع و عریض برآمدے سے نکل کر پارکنگ کی طرف آ گئے۔ اور پھر اچانک ہی دو آدمیوں نے کسی طرف سے نکل کر ہمارا راستہ روک لیا..... میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور میں باری باری اُن دونوں کے چہروں کو تکنے لگا.....!!

○○○

وہ دونوں صورتوں سے چھٹے ہوئے ہی لگتے تھے۔

وہ دونوں قد میں برابر ہی تھے..... مگر ساڑھے پانچ کے اُوپر کوئی نہیں تھا۔ ایک نے جینز اور نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی، سر کے بال تیل میں چپڑے ہوئے تھے اور پیچھے کی طرف بنے ہوئے تھے۔ مانگ درمیان میں تھی۔ اُس کی داڑھی سفید تھی مگر اُوپر کو اُٹھی ہوئی مونچھیں بڑی خطرناک تھیں۔ دائیں آنکھ کے اُوپر تقریباً ایک اِنچ لمبا زخم کا پرانا نشان تھا۔ اُس کے ایک کان میں سونے کی بالی تھی جو کان کی لو سے چپکی ہوئی تھی۔

دوسرے نے بیل باٹم قسم کی پتلون اور میرون کلر کی اُونچی شرٹ پہن رکھی تھی جس کے اُوپر والے دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور گلے میں سونے کی چین صاف نظر آ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر مونچھیں نہیں تھیں البتہ مغل کٹ گول چھوٹی داڑھی تھی۔ سر کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے جنہیں قابو میں رکھنے کے لئے اُس نے الاسٹک کا ایک اِنچ چوڑا بینڈ لگا رکھا تھا۔

آدھا گھنٹہ پہلے دُرگا نے ریسٹورنٹ میں اپنے سابق منگیتر کیلاش کو دیکھا تھا۔ کیلاش کو دیکھ کر دُرگا پریشان ہو گئی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ کوئی بدتمیزی ضرور کرے گا اور میں نے بھی اپنے آپ کو کسی ناخوشگوار صورتحال سے نمٹنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔

میں نے بھی کیلاش کو دیکھا تھا۔ وہ نہایت مہذب شکل وصورت کا مالک تھا اور لباس بھی مہذبانہ تھا۔ اُس کے ساتھ عورت بھی خاصی مہذب لگتی تھی۔ رام گڑھ پیلس جیسے فائیو اسٹور ہوٹلوں میں ایسے ہی مہذب لوگوں کی آمد ورفت اچھی لگتی تھی۔ دُرگا اگرچہ اُسے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی مگر نجانے مجھے یہ یقین کیوں تھا کہ اس جگہ کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا۔ وہ ایک معزز آدمی تھا۔ اُسے اپنی عزت کا بھی خیال ہو گا۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جس سے اُسے بھی ذلت اُٹھانی پڑے۔

میرا یہ خیال تو درست نکلا تھا کہ وہ یہاں ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ دُرگا کو برے انجام کی دھمکیاں دے چکا تھا۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف تھا کہ دُرگا مہارانا دھرمیش سنگھ کی رکھیل ہے۔ بڑے لوگوں کی داشتاؤں کو بھی ایسے معاشرے میں بڑی عزت حاصل ہوتی ہے۔ اُن کا بھی احترام ہوتا ہے اور اُنہیں بھی ایک معزز مقام حاصل ہوتا ہے۔

یہ تو میں دیکھ چکا تھا کہ جتنی دیر ہم ریسٹورنٹ میں بیٹھے رہے تھے اس دوران تین چار آدمیوں

اور عورتوں نے دُرگا کو پرنام کیا تھا۔ وہ بھی معززین ہی تھے۔ آگے پیچھے خود وہ دُرگا کو طوائف سمجھ کر گالیاں دیتے ہوں گے مگر اُس کے سامنے تو وہ لوگ اُس کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔

کیلاش خود سامنے نہیں آیا تھا مگر اُس نے دو غنڈے بھیج دیئے تھے۔ اور ان غنڈوں کا انتظام بھی اُس نے شاید ٹیلی فون کے ذریعے کیا تھا۔ اُن دونوں غنڈوں کو سامنے دیکھ کر دُرگا کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی..... اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی۔ چند روز پہلے میں سیتا کی حویلی میں دو غنڈوں سے نمٹ چکا تھا اور مجھے کچھ آئیڈیا ہو گیا تھا کہ ایسے لوگوں سے کس طرح نمٹنا چاہئے۔

ہم نے اُن سے بچ کر آگے نکلنے کی کوشش کی۔ دُرگا کی گاڑی پیچھے کھڑی تھی۔ ہم دو کاروں کے بیچ سے گزر کر آگے نکل گئے۔ لیکن وہ دونوں غنڈے بھی اس طرف آ گئے اور عین اُس وقت ہمارا راستہ روک لیا جب دُرگا اپنی کار کے قریب پہنچ رہی تھی۔

''کیا گڑبڑ ہے دُرگا دیوی؟'' داڑھی والے نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ ''اُس بڈھے سے جی بھر گیا جو اس لونڈے کو ساتھ لئے گھوم رہی ہو؟''

''شٹ اَپ!'' دُرگا نے اُسے جھاڑ دیا۔ ''راستہ چھوڑو میرا..... ورنہ تم جانتے ہو میں کیا کر سکتی ہوں۔''

''تمہیں کون نہیں جانتا دُرگا جی.....!'' اُس شخص نے جواب دیا۔ ''بہت اُونچے درجے کی طوائف ہو جو صرف مہارانا دھرمیش سنگھ کے کھونٹے سے بندھی ہوئی ہو..... چیز تو واقعی غضب کی ہو۔ اسی لئے تو اُس بڈھے نے خوش ہو کر تمہیں وہ حویلی بخشش میں دے دی۔ اگر کوٹھے پر بیٹھتی تو تمہارا جیون انت ہو جانے پر بھی اتنی دولت جمع نہیں کر سکتی تھیں۔''

''بند کرو یہ بکواس!'' دُرگا نے چیختے ہوئے اُس پر ہاتھ اُٹھا دیا۔ وہ تھپڑ مارنا چاہتی تھی مگر اُس غنڈے نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''زیادہ غصہ مت دکھاؤ دُرگا دیوی!'' وہ غرایا۔ ''ایک بار ہمارے ساتھ چلی چلو..... چودہ طبق روشن نہ کر دیئے تو دریودن کا نام بدل کے رَ

''تم ضرورت سے زیادہ پھیلتے جا رہے ہو

آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اپنی جگہ پر کھڑا رہ لونڈے!'' مونچھوں وا

میں نے اُس کی طرف دیکھا اور اُسے سوچ

ہوئے اُس کے پیٹ میں زوردار گھونسہ رسید کر د

توقع نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس قسم کی لڑائی

میں نے پہل کر دی تھی۔

وہ غنڈہ کراہتا ہوا دوہرا ہوا تو میں نے گھٹنے

ا

ب دوڑا

دوسری طرف

وہ غنڈہ شاید اُس

ہو گیا۔ میں نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اُس کی مونچھیں پکڑ لیں اور نیچے جھکتا چلا گیا..... اُس کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔ میں نے پشت کے بل زمین پر ٹک کر اُسے پیروں کی مدد سے اُوپر اُچھال دیا۔ وہ میرے اُوپر سے اُلٹی قلابازی کھاتا ہوا دھب کی آواز سے پشت کے بل گرا۔ میں تیزی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اُسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اُس پر ٹھوکریں برسانا شروع کر دیں۔

دوسرا غنڈہ شاید اس غیر متوقع صورتحال پر کنفیوژ ہو گیا تھا۔ وہ اب بھی دُرگا کا ہاتھ پکڑے حیرت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ دُرگا نے اُس کے کنفیوژن سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ پہلے اُس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پرس غنڈے کے منہ پر مارا اور پھر اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے اُس کی کلائی پر دانت گاڑ دیئے..... وہ غنڈہ بلبلا اُٹھا۔ اُس نے دُرگا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا کر دُرگا پر پل پڑا۔ اُس پر شاید جنون طاری ہو گیا تھا۔ اُس نے دُرگا کی ساڑھی کھینچ دی اور اُس کے بلاؤز پر ہاتھ ڈال کر زور سے اپنی طرف کھینچا..... دُرگا نے ایک بار پھر اُس کی کلائی پر دانت گاڑ دیئے۔

دُرگا کا بلاؤز تو اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا لیکن اس مرتبہ اُس غنڈے نے دُرگا کے بال پکڑ لئے اور زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔

میں مونچھوں والے سے بھڑا ہوا تھا لیکن اس دوران مجھے دُرگا کی مدد کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے پیر کی ایک زوردار ٹھوکر داڑھی والے کی پنڈلی پر ماردی..... ہڈی پر چوٹ پڑنے سے وہ بلبلا اُٹھا اور ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا..... اُس نے دُرگا کے بال چھوڑ دیئے تھے۔

مونچھوں والے غنڈے کو اس دوران سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی تو میری پوزیشن کچھ اور نازک ہو گئی۔ مونچھوں والے نے مجھے کچھ اس طرح گرفت میں لیا تھا میرا سر نیچے تھا اور ٹانگیں اُوپر..... اُس نے میری کمر کو بانہوں کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ میرا سر زمین سے تقریباً آٹھ اِنچ اُوپر تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون دماغ میں جمع ہو رہا ہو.....

اُس غنڈے نے مجھے کسی قدر اوپر اُٹھا کر نیچے کی طرف جھٹکا دیا، میرا سر پختہ فرش سے ٹکرایا۔ میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا، آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی ناچنے لگیں..... غنڈے نے ایک بار پھر مجھے اُوپر اُٹھایا اور دوبارہ میرا سر فرش سے ٹکرانا چاہتا تھا لیکن اس مرتبہ میں نے اُسے موقع نہیں دیا اور دونوں پیر اُس کی گردن پر لپیٹ دیئے۔ وہ گردن چھڑانے کے لئے زور تھا سے سر جھٹکنے لگا۔ میں نے ٹانگوں کو زوردار جھٹکا دیا۔ وہ غنڈہ پہلو کے بل نیچے گرا۔ میں نے میں بڑی سے اپنی ٹانگیں اُس کی گردن سے الگ کیں اور اُٹھ کر اُس کی کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر حاصل ہوتا ہے وہ بلبلا اُٹھا۔

یہ تو میں دیکھ چکا سرے غنڈے کی طرف متوجہ ہو گیا جو دُرگا کو رگید رہا تھا۔ میں نے اُس کی

کھوپڑی پر بھی ٹھوکر رسید کر دی۔ اس دوران مونچھوں والا غنڈہ بھی اُٹھ گیا تھا۔ میں تیزی سے اُس پر پل پڑا۔ میں دُرگا کے سامنے کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں کون ہوں..... جموں کشمیر میں بھارتی فوج کے لئے میرا نام دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ میری گرفتاری پر کروڑوں روپے کے انعامات مقرر تھے اور کئی سازشی منصوبے عمل میں لائے گئے تھے۔ میں کسی کے ہاتھ نہیں لگا تھا اور یہاں دو غنڈوں کے درمیان اپنے آپ کو کمزور ثابت کر کے اپنے نام کی توہین نہیں کرانا چاہتا تھا۔

مجھ پر اُس وقت جنون طاری ہو رہا تھا اور میں نتیجے کی پرواہ کئے بغیر پلٹ پلٹ کر اُن دونوں غنڈوں پر حملے کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑے غنڈے سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے لونڈا سمجھ کر میرا مذاق اُڑایا تھا اور یہ لونڈا اُن کے لئے قہر بن گیا تھا۔

اُن دونوں کے ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا تھا اور اب وہ میرا مقابلہ کرنے کی بجائے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دُرگا کو شاید وہ بھول ہی گئے تھے جسے وہ اُٹھانے کے لئے آئے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنے بڑے ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں اتنا زوردار ہنگامہ ہو رہا تھا اور ابھی تک کسی کو خبر نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ پارکنگ پلاٹ گیٹ سے ہٹ کر بہت فاصلے پر تھا اور اتفاق سے اس وقت کوئی نئی گاڑی ہوٹل میں داخل نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی ہوٹل سے جانے کے لئے پارکنگ کی طرف آیا تھا۔

اس مار دھاڑ میں ایک غنڈے کا ہاتھ ایک بار پھر دُرگا کے منہ پر پڑ گیا۔ اس مرتبہ دُرگا نے عقلمندی یہ کی کہ اُس نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ دُرگا کی یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ لابی میں اُس کی چیخوں کی آواز سن لی گئی۔ چند لوگ دوڑتے ہوئے باہر آ گئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ دُرگا بدستور چیخ رہی تھی۔ کئی آدمی چیختے ہوئے پارکنگ کی طرف دوڑ پڑے۔ اُن میں دو ہوٹل کے سکیورٹی گارڈز بھی تھے۔

وہ دونوں غنڈے اب بھاگنے کے چکر میں تھے۔ اُن میں ایک تو کسی طرح اپنے آپ کو چھڑا کر عقبی دیوار کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، دوسرے نے بھی کوشش تو کی مگر وہ اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں اُسے نیچے گرا کر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور دُرگا نے بھی اُس کے سر پر سینڈل برسانے شروع کر دیئے تھے۔

پانچ چھ آدمی دوڑتے ہوئے پارکنگ میں پہنچ گئے۔ لمبے تڑنگے دو سکیورٹی گارڈز سب سے آگے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ ایک نے تو وہیں رُک کر پستول اُس غنڈے کی کھوپڑی سے لگا دی جسے میں نے گرفت میں لے رکھا تھا اور دوسرا عقبی دیوار کی طرف دوڑا جہاں دوسرا غنڈا دیوار پر چڑھ چکا تھا۔ گارڈ نے فائر کر دیا مگر وہ غنڈہ دیوار کے دوسری طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ گارڈ بھی دیوار پر چڑھ گیا، لیکن پھر اُتر کر واپس آ گیا۔ وہ غنڈہ شاید اُس طرف گلی کی تاریکی میں غائب ہو چکا تھا۔

دونوں سکیورٹی گارڈز نے پہلے تو اُس غنڈے کی خوب اچھی طرح دھنائی کی تھی جسے میں نے پکڑا تھا پھر اُسے دونوں طرف سے پکڑ کر اُٹھا دیا۔ ہوٹل کا منیجر بھی اس ہنگامے کی اطلاع پا دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ فوراً ہی دُرگا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دُرگا کی حالت کافی ناگفتہ بہ تھی۔ لباس پھٹ گیا تھا..... بال بکھر گئے تھے۔

''کیا ہوا..... یہ کون ہے؟'' منیجر نے غنڈے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

''میں اپنے دوست کے ساتھ کافی پی کر واپس جا رہی تھی کہ یہاں اس نے اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ ہمارا راستہ روک لیا۔'' دُرگا نے بتایا۔ ''یہ لوگ مجھے زبردستی اُٹھا لے جانا چاہتے تھے۔ میرا یہ دوست مزاحمت نہ کرتا تو وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاتے۔''

''دوسرا کہاں ہے؟'' منیجر نے اس مرتبہ گارڈز سے پوچھا۔

''وہ بھاگ گیا سر.....!'' ایک گارڈ نے جواب دیا۔ ''اس کو اِن شریمان نے پکڑ رکھا۔'' اُس نے میری طرف اشارہ کیا۔

''یہ غنڈے ہوٹل میں داخل کیسے ہوئے؟'' منیجر بولا۔

''ہم لوگ اندر کی ڈیوٹی پر تھے سر! یہ تو باہر والے گارڈز بتائیں گے کہ یہ اندر کیسے آئے تھے۔'' اُس گارڈ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے..... اسے اندر لے چلو!'' منیجر نے کہا پھر دُرگا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ بھی تشریف لائیے دُرگا دیوی! جو کچھ بھی ہوا مجھے اس کا افسوس ہے۔''

ہم لوگ منیجر کے دفتر میں آ گئے۔ زخمی غنڈے کو ایک طرف قالین پر بٹھا دیا گیا۔ ایک گارڈ اُس پر پستول تان کر کھڑا ہو گیا۔

میرا نچلا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا جس سے خون رِس رہا تھا۔ منیجر نے الماری سے فرسٹ ایڈ بکس نکالا اور مجھے کرسی پر بٹھا کر میرا ہونٹ صاف کر کے بینڈیج لگا دی۔ دُرگا ایک کرسی پر بیٹھی اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کا بلاؤز پھٹ گیا تھا اور اُس نے ساڑھی سے اپنا سینہ ڈھک رکھا تھا۔ تین چار اور آدمی بھی کمرے میں موجود تھے۔ وہ سب اس شہر کے معززین تھے اور وہ سب لوگ دُرگا کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔

ایک بار پھر ساری کہانی دُہرائی گئی۔

''ٹھیک ہے دُرگا جی!'' منیجر نے دُرگا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب صورتحال یہ ہے کہ اگر پولیس میں رپورٹ آپ کی طرف سے لکھوائی جائے تو آپ کی بھی کھینچا تانی ہو گی۔ ہوٹل ہے یہ خبر سن کر مہارانا بھی ناراض ہوں۔ وہ پہلے ہی اپنی حویلی میں ہونے والے واقعہ سے پریشان ہیں اور ہم اُنہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ اور یقیناً آپ بھی ایسا نہیں چاہیں گی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یہ کوئی ایسی معمولی بات

بھی نہیں جسے نظر انداز کر دیا جائے۔ میں فون کر کے پولیس کو بلوا لیتا ہوں اور بہتر ہو گا کہ اس معاملے سے پولیس ہی کو نمٹنے دیا جائے۔ آپ حضرات کا کیا خیال ہے؟'' اُس نے کمرے میں موجود دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں مسٹر گردھاری!'' ایک آدمی نے گویا سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ دوسروں نے بھی تائید میں سر ہلا دیئے۔

''تو یہ طے ہوا کہ اس معاملے سے پولیس کو ہی نمٹنے دیا جائے۔'' منیجر گردھاری نے اس مرتبہ دُرگا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ شانت رہئے گا دیوی جی! ان لوگوں کو سزا ضرور ملے گی۔''

''تو پھر.....'' دُرگا نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''تو پھر میرا اور میرے دوست کا نام نہیں آنا چاہئے۔''

''آپ کو پریشانی سے بچانے کے لئے ہی تو ہم نے یہ سوچا ہے۔'' منیجر نے کہا۔ ''ویسے آپ نے شریمان جی کا تعارف نہیں کرایا۔''

''یہ میری دیدی کے دیور ہیں..... آج ہی مکرانا سے آئے ہیں۔ اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں اور آتے ہی یہ درگھٹنا پیش ہو گئی۔''

''ویری سیڈ!'' منیجر نے کہا۔ اور ایک بار پھر ہم دونوں سے اس واقعہ کی معذرت کرنے لگا۔ پھر بولا۔ ''آپ جائیے دیوی جی! آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں اپنے دو گن مین آپ کے ہمراہ کر دُوں؟''

''نہیں..... اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''ایسے دو چار لوگوں کے لئے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔''

دُرگا نے کرسی چھوڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی منیجر اور دوسرے لوگ بھی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سب نے ہاتھ جوڑ کر دُرگا کو پرنام کیا۔ منیجر تو پارکنگ تک ہمارے ساتھ آیا تھا۔ وہ بار بار معذرت کر رہا تھا۔

دُرگا کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ گاڑی چلا سکتی۔ اس لئے ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی اور دُرگا پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں زیادہ اچھی طرح ڈرائیونگ نہیں جانتا تھا مگر اتنا اناڑی بھی نہیں تھا۔

ہوٹل کی پارکنگ سے گاڑی نکال کر میں سڑک پر لے آیا اور دُرگا کے کہنے پر اُسے بائیں طرف موڑ دیا۔ دُرگا مجھے ایسے راستے بتا رہی تھی جہاں ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ وہ اپنی سیٹ پر بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے کچھ اندرونی چوٹیں لگی ہوں گی جن میں غالباً اب تکلیف شروع ہو گئی تھی۔

ایک مرتبہ اُس نے پہلو بدلا تو ساڑھی کا پلو ڈھلک کر نیچے لٹک گیا۔ اُس وقت میں نے بھی

اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کا بلاؤز چیتھڑے کی طرح جھول رہا تھا۔ میری نظر اُس کے عریاں سینے پر پڑی تو میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسٹیئرنگ پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور گاڑی سڑک پر لہرا گئی.....

''گاڑی سنبھالو.....!'' دُرگا چیخی۔

میں فوراً ہی حواس میں آ گیا اور اگر اسٹیئرنگ نہ سنبھال لیتا تو گاڑی سڑک کے کنارے درخت سے ٹکرا جاتی۔ دُرگا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُس نے فوراً ہی ساڑھی کے پلو سے سینہ ڈھانپ لیا تھا۔

اُس بازار میں داخل ہوتے ہی میں نے پہچان لیا۔ جب حویلی سے الگ الگ نکلے تھے تو میں یہیں سے دُرگا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا تھا۔ میں نے کار کی رفتار کم کی تو دُرگا بول پڑی۔

''اس وقت ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ ہماری گلی میں سناٹا ہوگا۔ تمہیں یہاں اُترنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ ہی چلو!''

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اُس بازار میں زیادہ تر راشن اور اناج کی دُکانیں تھیں۔ بہت سی دُکانیں بند ہو چکی تھیں، اِکا دُکا کھلی ہوئی تھیں یا نچلے درجے کے ایک دو ریسٹورنٹ تھے جہاں پُرشور آواز میں فلمی گانوں کے ریکارڈ چل رہے تھے۔

دُرگا کے کہنے پر میں نے کار دائیں طرف ایک کشادہ گلی میں موڑ لی اور سو گز کا فاصلہ طے کر کے اُسے ایک بار پھر دائیں طرف کی گلی میں موڑ دیا۔ دُرگا نے ٹھیک کہا تھا۔ حویلی والی گلی میں اس وقت سناٹا تھا۔ میں نے پھاٹک کے سامنے کار روک کر ہارن بجایا۔ دو منٹ بعد پھاٹک میں ایک مربعہ اِنچ کی ایک کھڑکی سے کسی نے جھانک کر دیکھا اور پھر پھاٹک کھل گیا۔ میں کار اندر لیتا چلا گیا۔

پھاٹک سیتا نے کھولا تھا۔ گاڑی اندر داخل ہوتے ہی اُس نے پھاٹک بند کر دیا اور جس وقت میں اور دُرگا کار سے اُتر رہے تھے اُسی وقت گیٹ کی طرف سے آتی ہوئی سیتا اور لالہ سے کلپنا بھی ہمارے قریب پہنچ گئی تھی۔ ہماری حالت دیکھ کر وہ دونوں اُچھل پڑیں۔ کلپنا کے چہرے پر تو ہوائیاں سی اُڑنے لگی تھیں۔

''یہ..... یہ کیا ہوا دُرگا جی؟'' سیتا باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم ٹھیک تو ہونا.....؟'' وہ مجھے ٹٹولنے لگی۔ ''یہ سب کیا ہوا..... کیسے ہوا؟''

''ایک وقت میں صرف ایک ہی سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مسکرانے کی کوشش میں ہونٹ کی تکلیف کی وجہ سے میرے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ ''تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ لفڑا ہو گیا تھا۔ اور دوسرے سوالوں کا جواب بعد میں دیا جائے گا۔''

''دُرگا جی..... تم ہی بتاؤ! یہ سب کیا ہے..... تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے؟'' سیتا دُرگا کی

طرف متوجہ ہو گئی۔

''مہابیر کا جواب درست ہے۔'' دُرگا نے بھی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''لفڑا ہو گیا تھا۔ باقی تفصیل بعد میں۔'' دُرگا ساڑھی سنبھالتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کے دو منٹ بعد میں بھی سیتا اور کلپنا کو حیران و پریشان چھوڑ کر بیڈ رُوم میں آ گیا۔

میں تقریباً ایک گھنٹے بعد اپنی مرمت کر کے اور لباس بدل کر باہر آیا تو دُرگا ہال کمرے میں سیتا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور کلپنا کچن میں تھی۔ دُرگا نے شب خوابی کا لباس، بش شرٹ اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ شرٹ کا اُوپر والا بٹن کھلا ہوا تھا۔ دُرگا کے بائیں رُخسار پر نیل سا پڑ گیا تھا جس پر اُس نے شاید کوئی کریم لگا لی تھی۔ وہ بار بار دایاں پہلو بھی دبا رہی تھی۔

سیتا بڑی توجہ سے دُرگا کی باتیں سن رہی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھا تو وہ اُٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ ''دُرگا جی نے مجھے سب بتا دیا ہے۔'' وہ ایک بار پھر مجھے ٹٹولتے ہوئے بولی۔ ''آج تم نے دُرگا جی کے سامنے میری لاج رکھ لی۔ تم نے ثابت کر دیا کہ میرا انتخاب غلط نہیں ہے۔''

''مہابیر واقعی بہت ہمت والا ہے۔'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر آج یہ ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو صورتحال کچھ اور ہی ہوتی۔ اب بات میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ کشمیر میں بھارتی سورماؤں پر تمہارے نام کی دہشت کیوں ہے۔ تم دو بدو لڑائی میں اتنے زیادہ خطرناک ہو تو جب رائفل تمہارے ہاتھوں میں ہو تو تم تو قیامت بن جاتے ہو گے۔''

''مجھے افسوس ہی رہے گا کہ سیتا نے میرے ہاتھوں سے رائفل چھین لی۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

سیتا کی آنکھوں میں اُداسی بھر گئی۔ ''پریشان کیوں ہوتے ہو؟'' وہ میرے چہرے کو تکتے ہوئے بولی۔ ''میدان جنگ نہ سہی لیکن یہاں بھی تم اپنے محاذ پر ہو..... اور سیتا تمہارے ساتھ ہے۔ یہاں رہ کر تم جو کچھ بھی کرو گے وہ تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ تم ابھی صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے لیکن یہ ایک کامیابی حاصل کرنے کے بعد تم کشمیر میں جنگ کا نقشہ بدل دو گے۔ اور تمہارا یہ کارنامہ ڈھکا چھپا نہیں رہے گا۔ کشمیر کا بچہ بچہ جان لے گا کہ آزادی کا پرچم بلند کرنے والوں میں تمہارا بھی ہاتھ ہے اور.....'' وہ کلپنا کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

''کھانا لگاؤں دیدی..... بارہ بجنے والے ہیں۔'' کلپنا نے قریب آ کر کہا۔

''ہاں..... لگا دو! بھوک لگ رہی ہے۔'' دُرگا بولی۔

''اتنی مار کھانے کے بعد بھی پیٹ نہیں بھرا دُرگا جی؟'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری.....'' دُرگا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ایسی باتیں تم سے نہیں تو اور کس سے کروں گی دُرگا جی؟'' سیتا اُٹھ کر اُس سے لپٹ گئی۔ اُس کے اس طرح لپٹنے سے دُرگا بے اختیار کراہ اُٹھی۔

کھانے کے بعد دُرگا کو وہ گولڈن سیب یاد آ گئے جو ہوٹل جانے سے پہلے ہم نے بازار سے

خریدے تھے۔

''اوئے..... میری تو مت ہی ماری گئی۔'' وہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں نے باز سے پھل اور تم لوگوں کے لئے کچھ چیزیں خریدی تھیں۔ گاڑی میں رکھی ہوئی ہیں ابھی لے کر آ ہوں۔ مہابیر! تم میرے ساتھ آؤ۔''

میں میز سے اُٹھا تو سیتا بھی اُٹھ گئی۔ وہ پیچھے نہیں رہنا چاہتی تھی۔ ہم باہر نکلے تو دُرگا پور میں کھڑی ہوئی کار کا پچھلا دروازہ کھول چکی تھی۔ میں نے اور سیتا نے پچھلی سیٹ پر سے چیزیں اُٹھالیں اور اندر آ کر صوفوں کے درمیان قالین پر ڈھیر کر دیں اور ہم لوگ بھی قالین پر بیٹھ گئے۔

''کلپنا! تم بھی آؤ..... برتن بعد میں سمیٹ لینا۔'' دُرگا نے اُسے آواز دی۔

کلپنا بھی ہمارے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ دُرگا نے سب سے پہلے وہ چیزیں نکالیں جو کلپنا کے لئے خریدی گئی تھیں۔ اُن میں تین ساڑھیاں اور تین جدید تراش کے راجستھانی لباس تھے۔ کلپنا کے چہرے سے اُس کی خوشی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ مارے عقیدت کے وہ بار بار دُرگا کے پاؤں چھو رہی تھی۔ اس کے بعد سیتا کی چیزیں اُس کے حوالے کی گئیں۔ سیتا بھی اس قدر خوش ہوئی کہ وہ دُرگا سے لپٹ گئی اور اُسے زور سے بھینچ لیا۔ دُرگا کراہ اُٹھی۔

''سوری دُرگا جی!'' سیتا نے اُسے چھوڑ دیا۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم زخمی زخمی ہو رہی ہو۔''

دُرگا نے جواب میں مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

اور پھر میرے لئے خریدے گئے کپڑے بھی اُنہیں دکھائے گئے۔

''اور تم دُرگا جی.....'' سیتا اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم نے اپنے لئے کچھ نہیں خریدا؟''

''میرے پاس اتنے کپڑے ہیں کہ روزانہ دو دو جوڑے بھی تبدیل کروں تو سال بھر میں ختم نہ ہوں۔''

''اور ایک جوڑا تو کم ہو گیا ناں۔'' سیتا بولی۔ ''میرا مطلب ہے وہ ساڑھی جو تم پھڑوا آئی ہو۔''

''یہ درگھٹنا بعد میں پیش آئی تھی۔ بہرحال! موقع ملے گا تو اپنے لئے بھی تمہاری پسند سے ایک ساڑھی خرید لوں گی۔'' دُرگا نے جواب دیا۔

سیتا اور کلپنا دیر تک چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر دیکھتی رہیں۔ پھر سیتا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس لفڑے سے قطع نظر آج کا دن کیسا رہا..... کہاں کہاں گئے تھے! کیا کچھ دیکھا؟''

''چند حویلیاں دیکھی ہیں جنہیں فن تعمیر کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں بتاتی ہوں.....'' دُرگا جلدی سے بولی۔ اُس کے ہونٹوں پر شوخ سی مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ ''سالم سنگھ کی ایک کنیز سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی۔''

میں نے دُرگا کو گھور کر دیکھا مگر وہ اس وقت تفریح کے موڈ میں تھی۔

''اوہو.....'' سیتا نے میری طرف دیکھا۔ ''کیسی تھی وہ..... بہت بوڑھی ہو گئی ہو گی۔ دو ڈھائی سو سال.....''

''بالکل جوان تھی وہ.....'' دُرگا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''تمہاری اور کلپنا کی طرح۔ خوبصورت بھی تم جیسی ہو گی۔ اس لئے تو یہ اپنا سب کچھ ہار گئے۔''

''کہاں ہے وہ حرافہ..... میں اُس کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہوں گی۔ اُس کی ٹانگیں توڑ دوں گی، اُس کی آنکھیں پھوڑ دوں گی اور.....''

''اُس کی آنکھوں ہی میں تو سب کچھ ہے۔'' دُرگا نے ایک بار پھر اُس کی بات کاٹ دی۔

اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مزے لے لے کر میرے ساتھ سالم سنگھ کی حویلی میں پیش آنے والا واقعہ سنانے لگی۔

میں اپنی بیوقوفی پر شرمندگی اور ندامت سی محسوس کر رہا تھا اور سیتا اور کلپنا قہقہے لگا رہی تھیں۔

ہم رات کو بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر کلپنا اور سیتا قالین پر بکھری ہوئی چیزیں سنبھالنے لگیں اور میں اُٹھ کر بیڈ رُوم میں آ گیا۔ ہونٹ کے علاوہ میرے جسم کے بعض دوسرے حصوں میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ بائیں کندھے میں تکلیف زیادہ تھی۔ میں بستر پر لیٹتے ہی ہاتھ سے کندھا دباتے دباتے سو گیا۔

میری آنکھ صبح دیر سے کھلی تھی۔ سیتا بھی میرے بیڈ پر سو رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک خاموش لیٹا سامنے والی دیوار کو گھورتا رہا، پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بج رہے تھے۔ میں نے سیتا کو جگانے کی کوشش کی مگر وہ کروٹ بدل کر سو گئی۔ ''کیا ہے..... سونے دو نا!'' وہ نیند میں بڑبڑائی۔ میں نے اُسے چھوڑ دیا اور باتھ رُوم میں گھس گیا۔

سیتا گیارہ بجے کے قریب بیدار ہوئی تھی۔ ظاہر ہے ہمارے پاس سونے کے علاوہ اور کام ہی کیا تھا۔ دیر تک سوتے رہیں اور رات کو دیر تک دنیا جہاں کی باتیں کرتے رہیں۔ میں ہال کے کمرے میں آیا تو کلپنا قالین پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھی اور دُرگا صوفے پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ کلپنا مجھے دیکھ کر چائے بنانے کے لئے اُٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

''کوئی خاص خبر؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے دُرگا کی طرف دیکھا۔

''خاص تو نہیں کہہ سکتے لیکن دلچسپ خبریں ہیں۔'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''مثلاً؟'' میں نے پوچھا۔

''رات کو رام گڑھ پیلس سے جس غنڈے کو پولیس کے حوالے کیا تھا اُس نے یہ اعتراف کر لیا ہے کہ کیلاش نے اُنہیں مجھ پر حملہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ اُن کا منصوبہ تو مجھے اغواء کرنے کا تھا لیکن اُنہیں کیلاش سے یہ حکم بھی ملا تھا کہ کسی وجہ سے اغواء میں ناکام ہونے کی صورت میں مجھے زخمی کر دیا جائے یا کم از کم میرا چہرہ بگاڑ دیا جائے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''پولیس نے کیلاش کو بھی پکڑ لیا تھا لیکن اُس نے کوئی الزام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پولیس

اسے باقاعدہ گرفتار کرنا چاہتی تھی لیکن یہاں اُس نے بھی سوسائٹی میں کچھ جگہ بنا رکھی ہے اُس کے چند حواری آڑے آ گئے۔ اُن میں ایک سابق ریاست جیسلمیر کا سابق دیوان ہے۔ ظاہر ہے اُس کا اثر و رسوخ اب بھی ہے۔ اُس کی وجہ سے کیلاش گرفتاری سے بچ گیا۔''

''اور کیا تمہارا مہارانا کچھ نہیں کرے گا؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ تو سابق مہاراجہ ہے۔ اُس کے تو دیوان سے زیادہ تعلقات ہونے چاہئیں۔''

''میں مہارانا کو اس معاملے میں نہیں گھسیٹنا چاہتی تھی۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''کیلاش اگرچہ بہت عرصہ سے میرے راستے میں آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے مہارانا کو کبھی کچھ نہیں بتایا۔ لیکن اب تو بات سامنے آ گئی ہے۔ مہارانا کو بھی پتہ چل جائے گا۔ اور ظاہر ہے اُس کے پوچھنے پر مجھے سب کچھ بتانا پڑے گا اور مہارانا خاموش نہیں بیٹھے گا۔ وہ تو کیلاش کو مچھر کی طرح چٹکی میں مسل کر رکھ دے گا۔''

''تمہیں شروع ہی میں مہارانا کو بتا دینا چاہئے تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اُسی وقت کیلاش کا بندوبست ہو جاتا تو بات یہاں تک نہ پہنچتی۔''

''میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ہنگامہ ہو.....'' دُرگا بولی۔ ''لیکن بہرحال اس معاملے نے سر اُٹھایا ہے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ کیلاش کو اپنے جرم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس نے کچھ دولت جمع کر لی ہے تو اس کے اندر بہت شکتی آ گئی ہے۔''

''اور دوسرے غنڈے کا کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ پکڑا گیا یا نہیں؟''

''نہیں..... پولیس اُسے تلاش کر رہی ہے۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ ایک اور دلچسپ خبر ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اخبارات بڑے لوگوں کے بارے میں سکینڈل بنانے میں موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''کل رات تم میرے ساتھ تھے اور تم نے غنڈوں کو مار مار کر لہولہان کر دیا تھا۔ اخبار والوں نے میرے اور تمہارے بیچ ناطے جوڑنے کے لئے بڑی دلچسپ سرخیاں لگائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دُرگا دیوی کے ساتھ وہ سورما کون تھا جس نے شہر کے نامی گرامی بدمعاشوں کا بھرکس نکال دیا..... کیا دُرگا دیوی بوڑھے مہارانا سے اُکتا چکی ہے؟ کیا مہارانا دھرمیش سنگھ دُرگا کے ساتھ کسی نوجوان کو برداشت کر لے گا؟ وغیرہ وغیرہ.....'' بات ختم کرتے ہوئے دُرگا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''بہت خوش ہو رہی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ خبر تمہارے مہارانا تک پہنچ گئی تو وہ تم سے اس نوجوان کے بارے میں ضرور پوچھے گا۔''

''مہارانا کو مجھ پر پورا وشواش ہے۔'' دُرگا نے مسکراتے جواب دیا۔ ''اگر وشواش نہ ہوتا تو وہ مجھے یہاں اکیلا نہ چھوڑتا۔ میری نگرانی کے لئے کسی کو یہاں ضرور رکھا ہوتا۔ اس سے پہلے بھی

ایسی باتیں ہوتی رہی ہیں مگر مہارانا نے کبھی ایسی باتوں پر توجہ نہیں دی۔''

''لیکن اس مرتبہ تو معاملہ کچھ سنگین نظر آتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ دونوں خبریں ایک ساتھ چھپی ہیں..... اس کا کچھ نہ کچھ اثر تو ہوگا۔''

''دیکھا جائے گا..... مجھے اس کی پرواہ نہیں۔'' دُرگا نے کندھے اُچکا دیئے۔

''ویسے تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت جلدی خیال آ گیا.....'' دُرگا مسکرا دی۔ ''تم لوگ تو سو گئے تھے مگر میں رات بھر تکلیف سے کراہتی رہی۔ صبح چار بجے کے قریب میں نے کلپنا کو جگایا۔ اُس نے کڑوے تیل میں ہلدی ملا کر مالش کی تو کچھ سکون ملا۔ ذرا دیکھو تو یہاں سوجن ہو رہی ہے کیا؟'' وہ میری طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت اُس نے وہی رات والا سلیپنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے بش شرٹ کو پکڑ کر اُوپر اُٹھا دیا۔ اُس کی پشت بالکل برہنہ ہو گئی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ دائیں شولڈر بلیڈ پر نیلا سا دھبہ تھا اور وہ جگہ واقعی سوجی ہوئی تھی۔ دُرگا ہاتھ موڑ کر اُنگلیوں سے اُس جگہ کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ..... اس جگہ..... بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'' وہ بولی۔

میں نے اُنگلیوں سے اس جگہ کو ٹٹولا تو دُرگا کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔ میں نے کلپنا کو کچن کی طرف سے آتے دیکھ کر دُرگا کی شرٹ نیچے کھینچ دی۔

''نیل پڑ گیا ہے.....'' میں نے کہا۔ ''دو تین روز کڑوے تیل اور ہلدی کی مالش سے ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسی چوٹوں کے لئے ہمارے ہاں یہی علاج ہوتا ہے۔ ہلدی درد کو کھینچتی ہے۔''

''ہاں..... تمہیں تو ایسی باتوں کا خاصا تجربہ ہوگا۔'' دُرگا مسکرائی۔

''ہاں..... میں نے بھی بہت چوٹیں کھائی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

اسی دوران کلپنا نے ہم دونوں کے سامنے کافی ٹیبل پر چائے رکھ دی اور قالین پر بیٹھ کر دوبارہ سبزی بنانے لگی۔ میرا خیال تھا کچن کی طرف سے آتے ہوئے اُس نے مجھے دُرگا کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ سر جھکائے سبزی بناتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

سیتا اُس روز دوپہر کے کھانے کے وقت بیدار ہوئی تھی۔ اگر اُسے جھنجھوڑ کر نہ جگایا جاتا تو وہ شاید شام تک سوتی رہتی۔

اور پھر اُسی رات دس بجے کے قریب جے پور سے سیتا کے پتاجی کا فون آ گیا۔ میں اور سیتا صوفے پر فون کے قریب بیٹھے ہوئے تھے مگر ہم میں سے کسی نے فون کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ کلپنا نے دُرگا نے ریسیو کی تھی۔ وہ پندرہ بیس منٹ تک کل رات ہوٹل میں پیش آنے والے غنڈہ گردی کے واقعہ کے بارے میں بات کرتی رہی، اور پھر میں نے اُسے یہ کہتے ہوئے سنا۔

''مہارانا! وہ میرا عاشق نہیں رشتے دار ہے۔ مکرانا سے آیا ہوا ہے۔ میں اُسے کھانا کھلانے کے لئے ہوٹل لے گئی تھی..... نہیں۔ وہ اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ اخبار والے

تو ایسے ہی ہیں۔ انہیں تو اخبار بیچنا ہے۔ تمہارے بارے میں بھی تو کئی بار ایسی باتیں لکھ چکے ہیں۔ ہاں ہاں..... میں سمجھ رہی ہوں۔ ٹھیک ہے..... حویلی والے معاملے میں مجھے کوئی زیادہ جانکاری نہیں ہے۔ بس اخبار ہی سے پتہ چلتا ہے۔ ویسے مجھے وشواش ہے کہ پولیس کچھ نہیں کر سکے گی اور یہ معاملہ ٹھپ ہو جائے گا۔ ہاں ٹھیک ہے..... جے رام جی کی۔'' اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ سیتا اور میں سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

''تمہارے پتا جی بھی کسی کے پیچھے پڑ جائیں تو اُسے چھوڑتے نہیں۔'' اُس نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو وہ کیلاش کو جان سے مار ڈالنے کی بات کر رہے تھے پھر کہنے لگے کہ وہ اُسے شہر سے ہی نکلوا دیں گے۔''

''اس قسم کے لوگوں کو تو واقعی شہر سے نہیں دنیا ہی سے نکال دینا چاہئے۔'' سیتا نے اپنے باپ کی حمایت کی۔ میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ وہ دونوں دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتی رہیں۔

تین چار روز گزر گئے..... ہم لوگ عملی طور پر حویلی کے قیدی بن کر رہ گئے تھے۔ دُرگا ہی وہ واحد ہستی تھی جس کا حویلی کے باہر آنا جانا تھا۔ کلپنا اس لئے باہر نہیں جا سکتی تھی کہ وہ معاملہ ابھی تک دبا ہوا تھا۔ گنگو ابھی تک مفرور تھا۔ یا تو وہ شہر سے بھاگ گیا تھا یا شہر ہی میں کسی جگہ چھپا ہوا تھا اور پولیس اُسے تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔ رام چند دھوبی اور بوڑھا ٹھاکر ظاہر ہے اس شہر میں تھے۔ یہ اندیشہ بہرحال موجود تھا کہ اگر کلپنا حویلی سے باہر نکلی تو دیکھ نہ لی جائے۔ سیتا بھی فی الحال باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی۔ میرے لئے فی الحال کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ شمروز کی حیثیت سے مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں آزادی سے گھوم پھر سکتا تھا مگر ہوٹل والے ہنگامے سے گڑبڑ ہو گئی تھی جس وجہ سے میں باہر نکلنے سے گریز کر رہا تھا۔ اور یوں بھی بگڑے ہوئے چوکھٹے کے ساتھ باہر نکلنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔

دو روز اور گزر گئے..... اور پھر یہ دلچسپ خبر سننے میں آئی کہ چند مسلح ڈاکوؤں نے کیلاش کی حویلی پر حملہ کر دیا تھا۔ یہ حملہ رات کے وقت ہوا تھا۔ کیلاش کے دوست بھی موجود تھے اور کرائے کی عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں۔ ڈاکوؤں نے کیلاش اور اُس کے دوستوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ کیلاش کو گن پوائنٹ پر لے کر اُس کی تجوری خالی کروالی تھی اور گھر کا سارا قیمتی فرنیچر اور قالین وغیرہ آنگن میں ڈھیر کر کے آگ لگا دی گئی تھی۔ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ تمام سامان کیلاش اور اُس نے دوستوں ہی سے اُٹھوا کر باہر ڈھیر کروایا گیا تھا۔ سامان پر گھاسلیٹ چھڑک کر اُسے آگ بھی کیلاش ہی کے ہاتھوں لگوائی گئی تھی۔ اور وہ ڈاکو جاتے ہوئے اُن تینوں عورتوں کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ ستم بر آں..... کیلاش جب اس واقعہ کی رپورٹ لکھوانے تھانے پہنچا تو ساری بات سننے کے بعد پولیس نے نقدی اور زیورات لوٹے جانے کی تو نامعلوم ڈاکوؤں کے خلاف رپورٹ درج کر لی لیکن قیمتی ساز و سامان کو نذرِ آتش

کئے جانے کی رپورٹ نہیں لکھی کیونکہ پولیس کے مطابق سامان کو آگ کیلاش نے خود اپنے ہاتھوں سے لگائی تھی۔ کسی دوسرے کو اس سلسلے میں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

اس سے اگلے روز رات کے وقت کیلاش کے ساتھ ایک اور افسوس ناک واقعہ پیش آیا..... بعض نامعلوم لوگوں نے اُس کے دفتر کا تالا توڑ کر تمام فرنیچر اور فائلیں وغیرہ باہر نکال کر آگ لگا دی تھی۔

ہمیں گفتگو کے لئے ایک نیا موضوع مل گیا تھا۔ ممکن ہے لوگ ان وارداتوں کو پراسرار سمجھ رہے ہوں لیکن ہمارے لئے اس میں کوئی پراسراریت نہیں تھی۔ سیتا کے پتا جی نے یہ طے کر لیا تھا کہ اُس کو اُس کی گستاخی کی سزا دیں گے اور اُسے اس شہر سے بھاگنے پر مجبور کر دیں گے اور مہاراناد ھرمیش سنگھ کے اس منصوبے پر عمل شروع ہو چکا تھا۔

میرا چوکھٹا ٹھیک ہو گیا تھا اور کوئی تکلیف بھی نہیں رہی تھی۔ اور پھر اُس روز میں نے ایک بار پھر حویلی سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اپنے ساتھ کلپنا کو بھی لے جانا چاہتا تھا۔ کلپنا زندگی بھر تو حویلی میں قید ہو کر نہیں رہ سکتی تھی۔ میں چاہتا تھا اُسے لے کر باہر نکلوں وہ کسی کی نظروں میں آئے اور جو ہونا ہے وہ ہو جائے۔ سر پر تلوار لٹکی ہوئی تھی اس سے تو نجات مل جائے گی۔

سیتا اور دُرگا میری اس تجویز سے متفق تھیں۔ لیکن کلپنا کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑنے لگی تھیں۔ لیکن بہرحال وہ میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ کلپنا نے نئے کپڑوں میں سے ایک جوڑا پہنا تھا۔ چولی، گھاگھرا اور چنری۔ اس لباس میں وہ واقعی بہت حسین لگ رہی تھی۔ چنری آج کل صرف فیشن کے طور پر استعمال ہوتی تھی لیکن اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اس سے گھونگھٹ نکال کر چہرہ چھپایا جا سکتا تھا۔

ہم جب خفیہ راستے سے پچھلے مکان میں آئے تو سیتا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر بار بار مسکرا رہی تھی۔

''واپس آؤ گے نا؟'' اُس نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اُسے گھورا۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کہ میں کہیں بھاگ جاؤں گا؟''

''کوئی بھروسہ نہیں.....'' سیتا مسکرائی۔ ''کلپنا بہت حسین لڑکی ہے۔ اس کے لئے ایک دیوانہ بھی ہو چکا ہے..... کیا پتہ تم اسے لے کر کہیں بھاگ جاؤ اور میں یہاں بیٹھی تمہارا انتظار کرتی رہوں۔''

''اگر کبھی بھاگنے کی ضرورت پیش آئی تو تم بھی میرے ساتھ ہو گی..... فکر مت کرو۔'' میں نے کہا۔

ہم دروازہ کھول کر پچھلی گلی میں نکل گئے۔ سیتا اُس وقت تک دروازے میں کھڑی رہی جب تک ہم گلی سے نکل کر بازار کا موڑ نہیں گھوم گئے۔ کچھ دُور تک ہم لوگ پیدل چلتے رہے پھر سامنے ایک ٹیکسی رُکوالی اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

''کہاں جانا ہے مہاراج؟'' ڈرائیور نے اپنے سامنے لگا ہوا آئینہ درست کرتے ہوئے کہا۔

''کہیں بھی لے چلو بھایا!'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم تو اس شہر میں نئے آئے ہیں سیر و تفریح کرنے..... جہاں دل چاہے لے چلو.....''

''پنوڑی کی حویلیاں.....؟''

''وہ سب ہم دیکھ چکے ہیں۔'' میں نے ڈرائیور کی بات کاٹ دی۔ ''کسی تفریح کی جگہ لے چلو..... گھومنے پھرنے کی جگہ۔''

''سمجھ گیا مہاراج.... آپ کو سیر کرنی ہے۔'' ڈرائیور نے کہتے ہوئے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

ٹیکسی شہر کی مختلف سڑکوں پر ہلکی رفتار سے دوڑتی رہی اور ڈرائیور کسی ماہر گائیڈ کی طرح راستوں اور عمارتوں کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔ اُس نے کئی مرتبہ کسی عمارت یا کسی چوک پر ٹیکسی روکی تھی اور اُن جگہوں کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا تھا۔ اور بالآخر شہر کے مختلف علاقے گھمانے کے بعد وہ ہمیں امر ساگر لے گیا۔ یہ وسیع و عریض علاقہ تالابوں، چھوٹی چھوٹی مصنوعی جھیلوں، کنوؤں اور خوبصورت چھتریوں پر مشتمل تھا۔ کئی خوبصورت پارک تھے۔ یہ چھتریاں دراصل راجاؤں اور مہاراجاؤں کی سمادھیاں تھیں۔ خوبصورت قبرستان..... جس جگہ کسی راجہ کی چتا جلائی گئی تھی وہاں چبوترہ بنا کر خوبصورت بارہ دری اور اُس کے اُوپر نہایت خوبصورت چھتری بنا دی گئی تھی۔ لا تعداد چھتریاں تھیں اور یہ چھتریاں یعنی راجوں مہاراجوں کا قبرستان لوگوں کے لئے ایک بہترین تفریح گاہ بن گئی تھیں۔

ہم بہت دیر تک مختلف جگہوں پر گھومتے رہے۔ کلپنا چنری کا گھونگھٹ نکالے میرے ساتھ جڑ کر چل رہی تھی۔ بعض لوگ مسکرا مسکرا کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہم ایک پارک میں بینچ پر بیٹھ گئے۔ بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ میں نے ایک ٹھیلے سے بھیل پوری منگوالی۔ یہ چاٹ کھانے کے لئے کلپنا کو گھونگھٹ اُٹھانا پڑا تھا۔ اسی دوران ایک پارسی جوڑا ہمارے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ یہ لوگ بمبئی سے آئے ہوئے تھے۔ مرد کی عمر پچاس اور عورت کی پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔

''نئی نئی شادی ہوئی ہے.....!'' عورت نے پہلے کلپنا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کلپنا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے پارسی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھی جوڑی ہے..... نجر نہ لگے۔'' پارسی عورت مسکرا دی۔

ہم تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے اور پھر اُٹھ کر ایک طرف کو چل دیئے۔ سورج غروب ہونے والا تھا..... چہل پہل میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کلپنا نے بھیل پوری کھانے کے لئے گھونگھٹ اُٹھایا تھا تو دوبارہ چنری کو چہرے پر ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

ہم سڑک پر آ گئے..... کلپنا اب بے جھجک سی ہو کر چل رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دُور تک

پیدل چلا جائے لیکن ایک خالی ٹیکسی ہمارے قریب آ کر رُک گئی۔ میں نے پیدل چلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ویسے بھی ان پارکوں میں، چھتریوں میں اور کنوؤں اور تالابوں میں گھوم گھوم کر کلپنا تھک گئی تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ شہر کے کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کافی یا چائے پئیں اور پھر حویلی کا رُخ کریں۔

میں نے دروازہ کھول کر کلپنا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھ کر دوسری طرف سرکنے لگی۔ میں ٹیکسی میں بیٹھنے کے لئے جھکا ہی تھا کہ نجانے کس طرف سے ایک آدمی میرے اُوپر آ گرا..... اُس آدمی نے مجھے پکڑ کر ایک طرف کھینچا، پیٹ پر زوردار گھونسہ مارا اور زوردار دھکا دے کر گرا دیا.....

ٹیکسی اس دوران حرکت میں آ چکی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ مجھے دھکا دینے والا شخص دوڑتا ہوا ٹیکسی میں بیٹھ گیا..... دروازہ دھڑ سے بند ہوا اور ٹیکسی کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی..... میں نے کلپنا کی چیخ بھی سنی تھی۔

میں ایک دم بدحواس ہو گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میرے ساتھ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ یہ کوئی سنسان اور ویران جگہ نہیں تھی، تفریح گاہ تھی۔ سڑک پر بیسیوں لوگ کھڑے تھے اور اتنے لوگوں کی موجودگی میں کسی لڑکی کو چھین کر لے جانے کی کوشش واقعی دیدہ دلیری تھی۔ لیکن مجھ سے کوئی چیز چھین لینا معمولی بات نہیں تھی۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو ایسی کوشش میں دو غنڈے میرے ہاتھوں اپنا بھرتہ بنوا چکے تھے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس اچانک صورتحال نے ایک لمحہ کو میرے حواس مختل کر دیئے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا..... ٹیکسی بہت دُور نکل چکی تھی۔ لوگ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک آدمی موٹر سائیکل سٹارٹ کر رہا تھا۔ اُس کے قریب شاید اُس کی بیوی کھڑی تھی۔ میں دوڑ کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔

''بھائی صاحب پلیز.....!'' میں نے سماجت کی۔ ''غنڈے میری پتنی کو اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ موٹر سائیکل مجھے دے دیں..... وعدہ کرتا ہوں ایک گھنٹے سے پہلے پہلے اس جگہ واپس لے آؤں گا۔''

وہ کوئی شریف آدمی تھا۔ اُس نے موٹر سائیکل میرے حوالے کر دی۔ موٹر سائیکل سٹارٹ ہو چکی تھی۔ میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہی ہینڈل سنبھالا اور پیر سے گیئر بدلتے ہوئے ایکسی لیٹر گرپ گھما دی۔ مجھے کشمیر کے پہاڑوں میں موٹر سائیکل چلانے کا تجربہ تھا اور یہ تو ہموار سڑک تھی۔ ٹریفک بھی زیادہ نہیں تھا۔ میں موٹر سائیکل کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

وہ ٹیکسی آگے والے چوک سے بائیں طرف گھوم چکی تھی۔ اُس چوک پر پہنچ کر میں نے بھی موٹر سائیکل اُسی طرف موڑ دی۔ اس طرف ٹریفک کچھ اور کم تھا۔ میرے اور ٹیکسی کے درمیان تقریباً دو سو گز کا فاصلہ تھا۔ میں بائیک کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

ٹیکسی ایک اور سڑک پر گھوم گئی تھی اور مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ یہ سڑک شہر سے باہر جانے والی تھی۔ آبادی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی اور سامنے بہت دُور پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

میرے اور ٹیکسی کے درمیان فاصلہ بھی بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ آبادی اب پیچھے رہ گئی تھی۔ سڑک سے ہٹ کر دُور دُور اِکا دُکا چھوٹی چھوٹی عمارتیں یا احاطے سے نظر آ رہے تھے۔ وہ ٹیکسی سڑک سے اُتر کر ایک ایسی ہی عمارت کے سامنے رُک گئی جس کے گرد بہت لمبا چوڑا احاطہ تھا۔ ٹیکسی رُکتے ہی پہلے ڈرائیور نیچے اُترا اور پھر دوسرے آدمی نے نیچے اُتر کر کلپنا کو باہر کھینچ لیا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے احاطے کے پھاٹک کی طرف دوڑنے لگا۔ کلپنا چیختے ہوئے مزاحمت کر رہی تھی۔ احاطے کا لکڑی کا پھاٹک ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ لوگ پھاٹک میں داخل ہو چکے تھے۔

میں نے موٹر سائیکل پھاٹک کے سامنے روک لی اور اُسے چھوڑ کر دوڑتا ہوا پھاٹک میں داخل ہو گیا..... ایک طرف بہت لمبا چوڑا شیڈ بنا ہوا تھا جس کے سامنے بڑے بڑے پیلے پتھروں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ شیڈ کے ساتھ ایک مختصر سی عمارت تھی اور وہ دونوں غنڈے کلپنا کو اس عمارت ہی میں لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ اندازہ تو میں نے پھاٹک میں داخل ہوتے ہی لگا لیا تھا کہ وہ عمارت ویران تھی اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی دُشواری پیش نہیں آئی کہ اس شیڈ میں کبھی پتھر کاٹنے اور تراشنے کی مشینیں لگی ہوں گی۔

اُن دونوں میں سے کسی کے پاس ریوالور یا پستول جیسا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو مجھے راستے ہی میں گرانے کی کوشش کی جاتی یا اب قریب آنے سے روکا جاتا۔ وہ مجھے بڑی آسانی سے گولی کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ لیکن اُس کے پاس ریوالور یا پستول نہیں تھا۔

ایک غنڈہ کلپنا کو کھینچتے ہوئے ویران عمارت کے اندر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ ڈرائیور نے لمبے پھل والا چاقو نکال لیا اور مجھے روکنے کے لئے تن کر کھڑا ہو گیا۔

میں دُور ہی سے کسی طاقتور سپرنگ کی طرح اُچھلا اور ہوا میں اُڑتا ہوا اُس کے اُوپر جا گرا۔ میرا ایک پیر اُس کے منہ پر اور دوسرا اُس کے سر پر لگا۔ وہ چیختا ہوا پشت کے بل گرا۔ اُس کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا..... اُس کے منہ سے نکلنے والی دوسری چیخ بڑی خوفناک تھی۔ اُس کی کھوپڑی پتھر سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی تھی۔ میں بھی اُس کے قریب ہی گرا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُٹھ کر اُس بدمعاش کی طرف لپکا جو کلپنا کو کھینچتا ہوا عمارت کی سیڑھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ عمارت ایک اُونچے چبوترے پر بنی ہوئی تھی اور پتھر کی چار کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ کلپنا ایک سیڑھی پر اڑ گئی اور وہ شخص اُسے اُوپر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اُس نے شاید اپنے ساتھی کا انجام دیکھ لیا تھا۔ وہ کلپنا کو چھوڑ کر شیڈ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اُس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ اُسی وقت کلپنا کی چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''مہابیر! پکڑ لو اسے..... مار ڈالو..... یہ رام چند دھوبی ہے۔ اس نے میری ماں کو مار ڈالا تھا۔ مار دو اسے.....''

تو وہ رام چند دھوبی تھا..... پہلے تو میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ اُس رات ہوٹل میں جو غنڈہ میرے ہاتھوں پٹ کر بھاگ گیا تھا یہ اُس کے ساتھی ہوں گے۔ لیکن معاملہ کچھ اور نکلا تھا۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ رام چند دھوبی شیڈ میں بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اُس کی گردن دبوچ لی اور اُسے مارتا ہوا کھلی جگہ پر لے آیا۔

یہاں اُس کا داؤ چل گیا۔ وہ مجھے زمین پر گرا کر میرے سینے پر سوار ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگا..... مگر میں نے اُس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی اور اُسے دُور اُچھال دیا اور پھر اُسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر میں نے اُسے دبوچ لیا۔

''تم سمجھتے تھے کہ اس طرح کلپنا کو لے دوڑو گے؟'' میں نے اُس کا گلا دباتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اس کی ماں کو مار ڈالا تھا اور اس کی زندگی بھی برباد کرنے کی کوشش کی تھی۔ تم انسان نہیں بھیڑیئے ہو..... تمہیں جینے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔ تمہاری شامت ہی آئی تھی جو اس وقت تم نے کلپنا کو اغواء کرنے کی کوشش کی تھی۔ گنگو کہاں ہے؟ جلدی بتاؤ..... ورنہ تمہارا گلا گھونٹ دُوں گا۔''

''ب..... بتاتا ہوں۔'' رام چند دھوبی کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔ میں نے اُس کے گلے پر گرفت ڈھیلی کر دی۔ ''وہ..... وہ.....'' رام چند دھوبی بولا۔ ''وہ رام ڈیوڑے میں واقع کالی کے پرانے مندر میں چھپا ہوا ہے۔''

''اور وہ بوڑھا ٹھاکر..... وہ کہاں ہے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''وہ..... وہ اپنی حویلی میں ہے۔'' رام چند دھوبی نے جواب دیا۔

''وہ دونوں تو پولیس کی گرفت میں آ ہی جائیں گے۔ مگر تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ تم کلپنا کی ماں کے ہتھیارے ہو۔ اس کی سزا تمہیں ہم دیں گے۔''

رام چند دھوبی نے اچانک ہی مجھے پیروں سے دھکیل کر پیچھے گرا دیا۔ میں ریت پر گرا اور سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ رام چند دھوبی کی خوفناک چیخ سن کر چونک گیا اور پھر دوسرے ہی لمحہ میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں۔ کلپنا ایک طرف کھڑی رام چند دھوبی کو دیکھ رہی تھی جس کا سر کچلا جا چکا تھا۔ کلپنا نے اُس کے سر پر جو پتھر مارا تھا وہ بھی اُس کے قریب ہی پڑا تھا اور خون سے تر ہو چکا تھا۔

کلپنا نے بڑی ہمت سے کام لیا تھا۔ وہ ایک بڑا سا پتھر اُٹھائے موقع کی تاک میں تھی اور جونہی موقع ملتے ہی اُس نے وار کر دیا تھا..... وہ اُس کی ماں کا قاتل تھا اور اُس نے بدلہ لے لیا تھا اور اب وہ ایک طرف کھڑی دہشت زدہ سی نظروں سے رام چند دھوبی کی لاش کو دیکھتے

ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

میں کلپنا کی طرف بڑھا تو وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ کسی انجانے خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اُس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

''ڈرو نہیں.....'' میں اُسے تسلی دے رہا تھا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

دس بارہ منٹ بعد ہی کلپنا اپنے خوف پر قابو پا سکی تھی۔ اُس وقت اندھیرا کچھ گہرا ہو گیا تھا۔ میں کلپنا کا ہاتھ پکڑ کر احاطے سے باہر لے آیا۔ موٹر سائیکل ریت پر گری ہوئی تھی۔ میں نے اُٹھا کر کک لگاتے ہوئے انجن سٹارٹ کیا اور کلپنا کو اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ وہ پہلی مرتبہ موٹر سائیکل پر بیٹھی تھی۔ اُس نے مردوں کی طرح ایک پیر ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف رکھا تھا۔ اُس نے میرے ساتھ چمٹ کر دونوں بانہیں میرے سینے پر لپیٹ لی تھیں۔

ہمیں پارک کے قریب پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ وہ آدمی اپنی بیوی کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ میں نے موٹر سائیکل اُس کے حوالے کرتے ہوئے اُس کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ وہ بدمعاش میری پتنی کو ایک سنسان سڑک پر پھینک کر بھاگ گئے تھے۔

میں کلپنا کو لے کر ایک آٹو رکشہ میں بیٹھ گیا۔ میں نے رکشہ ایک بارونق بازار میں ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رُکوا لیا اور کلپنا کو لے کر ریسٹورنٹ میں ایک فیملی کیبن میں بیٹھ گیا۔ کلپنا اب بھی دہشت زدہ سی تھی لیکن چائے پینے کے بعد اُس نے اپنی کیفیت پر بڑی حد تک قابو پا لیا۔

ریسٹورنٹ سے نکلتے ہوئے دروازے کے ساتھ ہی نیوز اسٹینڈ پر ایک میگزین دیکھ کر میں رُک گیا۔ میگزین کے سرورق پر پتوڑی کی ایک حویلی کی تصویر میں نے پہچان لی اور بغیر کسی ارادے کے وہ میگزین خرید لیا۔ حویلی تک واپس جانے کے لئے بھی میں نے آٹو رکشہ کو ترجیح دی تھی۔

دُرگا اور سیتا ہماری حالت دیکھ کر چونک گئیں اور پھر اُنہیں وہ سب کچھ بتانا پڑا۔

کلپنا اب بھی خوفزدہ تھی۔ دُرگا اُٹھ کر اُس کے پاس آ گئی اور اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

اُس رات ہم دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ سیتا نے میز پر سے وہ میگزین اُٹھا لیا اور پھر ایک دم چیخ اُٹھی۔

''اوہ دُرگا جی..... یہ دیکھو! میگزین میں تمہاری تصویر۔''

پہلے وہ رسالہ دُرگا نے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھا دیا۔ پورے صفحہ کی رنگین تصویر تھی۔ وہ پتوؤں کی حویلی میں نفیس ستون کے قریب کھڑی تھی۔ میرا چہرہ بھی نمایاں تھا۔ ستون پر نقش و نگار اور دُرگا کے حوالے سے کیپشن تھا۔ ''قدرت اور انسانی ہاتھوں کی خطاطی کے دو شاہکار۔''

یہ تصویر دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی.....!

○○○

دُرگا کی عمر اگرچہ پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ میک اپ کے بغیر بھی بہت حسین لگتی تھی۔ لیکن اُس روز ہلکے سے میک اپ سے اُس کا حسن اس طرح نکھر آیا تھا کہ میرا دل بھی دھڑکنا بھول گیا تھا۔ اللہ میاں نے شاید اُسے خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اُس روز جب میں اُس کے ساتھ گیا تھا تو لوگ مُڑ مُڑ کر اُس کی طرف دیکھتے تھے اور پتوؤں کی حویلی میں اُس فوٹو گرافر نے بھی اُسے تاڑ لیا تھا اور تصویر کھینچ لی تھی۔

اُس فوٹو گرافر کے ساتھ ایک عورت اور دو بچے بھی تھے۔ ہو سکتا ہے وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح سیر و تفریح کے لئے یہاں آیا ہو اور اُس نے یہ تصویر شوقیہ طور پر کھینچ لی ہو۔ لیکن جب یہ تصویر ڈیویلپ ہو کر اُس کے سامنے آئی تو اُس نے سوچا ہو گا کہ اس تصویر کو کسی رسالے میں چھپنا چاہئے۔ اور شاید اس خیال سے اُس نے یہ تصویر اس رسالے کو بھیج دی تھی۔

یہ رسالہ قدیم فن تعمیر اور پتھروں پر نقش کاری کے حوالے سے ہی مضامین اور تصاویر شائع کرتا تھا۔ اور اُس کے سرورق پر پتوؤں کی حویلی کی تصویر دیکھ کر ہی میں نے خرید لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس رسالے کے مضامین پڑھنے سے راجستھان کی قدیم عمارتوں اور مختلف شہروں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ ہو گا اور مجھے بہت کچھ جاننے کا موقع ملے گا۔ مگر اس رسالے میں یہ تصویر دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا تھا..... اگر صرف دُرگا کی تصویر ہوتی تو میرے لئے پریشانی کی کوئی بات نہ ہوتی۔ لیکن اس تصویر میں میرا چہرہ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے..... تم یہ تصویر دیکھ کر پریشان کیوں ہو گئے..... اچھی نہیں لگی کیا؟'' میں دُرگا کی آواز سن کر چونک گیا۔ میرے خیالات منتشر ہو گئے۔

''تصویر بہت اچھی ہے..... تم واقعی قدرت کا ایک حسین شاہکار ہو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں اس تصویر کی اشاعت کے بعد آنے والے حالات کی تصویر دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور وہ تصویر جس قدر بھیانک ہو گی اُس کا اندازہ لگانا دُشوار ہے؟''

''کیا مطلب؟'' دُرگا نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میری بات سن کر سیتا بھی چونک گئی تھی۔

''مطلب بعد میں بتاؤں گا..... اس وقت تو میں کلپنا کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تمہیں اس کا مطلب بھی سمجھانا پڑے گا۔'' دُرگا بولی۔

''کلپنا بھی ہماری طرح دشمنوں میں گھری ہوئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آج یہ پہلا دن میرے ساتھ نکلی تھی اور اتفاق سے رام چند دھوبی کی نظروں میں آ گئی۔ وہ دنیا کا سب سے احمق آدمی تھا جس نے دن دیہاڑے اُسے اغواء کرنے کی کوشش کی اور میرے نہیں بلکہ کلپنا کے ہاتھوں مارا گیا۔ رام چند دھوبی اکیلا نہیں تھا۔'' میں خاموش ہو کر کلپنا کی طرف دیکھنے لگا۔ ''اُس کا اصل دشمن تو وہ بوڑھا ٹھاکر ہے جو اُسے حاصل کرنا چاہتا ہے اور اُس پر ہزاروں روپے خرچ کر چکا ہے۔ گنگو بدمعاش کے ساتھی کے قتل کی وجہ سے شاید وہ دبک کر بیٹھ گیا ہے۔ لیکن معاملہ جیسے ہی ٹھنڈا ہو گا یا اُسے پتہ چلے گا کہ کلپنا اسی شہر میں ہے تو وہ اُسے حاصل کرنے کی دوبارہ کوشش کرے گا۔''

''میرے خیال میں ایسا نہیں ہو گا.....'' سیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اُسے جب یہ پتہ چلے گا کہ رام چند دھوبی بھی اس چکر میں مارا گیا ہے تو شاید وہ یہ شہر ہی چھوڑنے کی کوشش کرے۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ بڈھے جو ہوتے ہیں نا بہت ضدی ہوتے ہیں۔ اور پھر ٹھاکر..... جس نے کلپنا کے لئے اپنی عزت تک داؤ پر لگا ڈالی۔ کلپنا تو واقعی ایسی چیز ہے کہ اس کے لئے دو چار قتل بھی کئے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ تین قتل اب تک ہو چکے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ معاملہ یہاں نہیں رُکے گا۔ گنگو بھی اسی شہر میں موجود ہے اور ٹھاکر بھی۔ اس سے پہلے کہ اُن کی طرف سے کسی ردعمل کا اظہار ہو ہمیں اُن کی طرف قدم بڑھا دینا چاہئے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' سیتا نے مجھے گھورا۔

''جب تک کلپنا کے دشمن ختم نہیں ہو جاتے یہ سکون سے نہیں رہ سکے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ.....!'' سیتا نے گہرا سانس لیا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ اب ٹھاکر اور گنگو کو بھی ختم کر دیا جائے؟''

''ہاں..... نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔'' میں نے کہا۔

''تین قتل ہو چکے ہیں.....'' سیتا نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''دو قتل اور کرنا چاہتے ہو..... اس کے بعد اگر کوئی اور ایسا شخص سامنے آ گیا تو.....؟''

''میرا خیال ہے اور کوئی سیتا کو نہیں جانتا۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''اگر ہمیں کلپنا سے واقعی ہمدردی ہے تو ہمیں اس کی حفاظت کو یقینی بنانا ہو گا۔ یا پھر ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ہم اس کی سرکھشا سے ہاتھ اُٹھا لیں اور اسے ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلتا کر دیں۔''

''نہیں نہیں..... میں نہیں جاؤں گی یہاں سے۔'' کلپنا جلدی سے بولی۔ اُس کے چہرے پر اب بھی خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔

''تمہیں یہاں سے کوئی نہیں نکال رہا۔'' دُرگا نے اُسے ایک بار پھر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ''تم اس لڑکی کو مزید خوفزدہ کرنے کی کوشش مت کرو مہابیر! جب تک ہم زندہ ہیں کوئی اس کی طرف

آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر دُرگا نے کلپنا کو سونے کے لئے اُس کے کمرے میں بھیج دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''اس لڑکی کے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آ رہے ہیں۔ اُس رات مہارانا کی حویلی میں اُسے اُٹھانے کی کوشش میں اُس کے سامنے ایک قتل ہو گیا اور آج دو آدمی اور مارے گئے۔ وہ پہلے ہی خوفزدہ ہے۔ ہمیں اس کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

''اُس کے سامنے ایسی باتیں کرنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سب کچھ اُس کے لئے ہو رہا ہے۔ ہم کوئی پیشہ ور قاتل نہیں ہیں کہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارتے پھریں۔ اُس کے اندر بھی تو کچھ اعتماد پیدا ہو۔''

''کسی میں اعتماد پیدا کرنے کا یہ طریقہ کچھ عجیب سا نہیں؟'' دُرگا نے مجھے گھورا۔

''عجیب تو ہے..... لیکن ہمیں ایسا کرنا پڑے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا چھوڑو..... یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔'' دُرگا نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم میری اس تصویر کے بارے میں بات کر رہے تھے اور تم نے کچھ خدشات کا اظہار کیا تھا۔'' اُس نے میگزین کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں.....'' میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''اس تصویر میں تمہارے ساتھ میرا چہرہ بھی بہت واضح نظر آ رہا تھا۔'' میں نے میگزین کھول کر تصویر کی طرف اشارہ کیا اور انہیں اپنے خدشات سے آگاہ کرنے لگا۔

دُرگا نے تو شاید اس بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن سیتا کی آنکھوں میں تشویش اُبھر آئی تھی۔

''لیکن..... میرا خیال ہے کہ کشمیر کی پولیس، بھارتی فوج یا انٹیلی جنس کے پاس تمہاری کوئی تصویر نہیں ہے۔'' سیتا نے کہا۔

''یہ اپنے آپ کو تسلی دینے والی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر اُن کے پاس میری کوئی تصویر ہوتی تو سینکڑوں بار اخبارات میں چھپ چکی ہوتی۔ اور میں اس طرح آزادی سے نہ گھوم رہا ہوتا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کشمیر میں مجھے بائی فیس تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ پولیس، فوج یا انٹیلی جنس ہی کا کوئی آدمی مجھے پہچانتا ہو۔ یہ تصویر لوگوں کی نظروں میں تو آئے گی اور اُن میں میرا کوئی دشمن بھی ہو سکتا ہے۔'' میں خاموش ہو کر باری باری دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ''غدار ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جن کی وجہ سے ہم بار بار نقصان اُٹھاتے رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ملک و قوم کا نہیں صرف اور صرف اپنا ذاتی مفاد عزیز ہوتا ہے۔ اگر کسی ایسے ہی شخص نے میری یہ تصویر دیکھ لی تو وہ انعام کے لالچ میں پولیس، فوج یا انٹیلی جنس سے رابطہ کر سکتا ہے۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے.....'' دُرگا گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں زیادہ پریشان اس لئے نہیں ہوں کہ اس قسم کے میگزین کتنے لوگ پڑھتے ہیں، میرا خیال ہے ان کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ آج کل تو شوبز کے میگزین ہی چلتے ہیں۔ اُن میں ایکٹریسوں کی بڑی خوبصورت نیم عریاں رنگین تصاویر بھی ہوتی ہیں اور اُن کے بارے میں دلچسپ معلومات بھی۔ ایسے میگزین کون خریدنا یا پڑھنا پسند کرتا ہے؟ یہ تو صرف بُک سٹالوں کی زینت بن کر ہی رہ جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں محتاط تو رہنا ہی پڑے گا۔''

''ہاں..... ہم تو محتاط رہیں گے۔ لیکن میرے خیال میں پتے ہمارے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

دُرگا نے میری ہر بات غور سے سنی تھی۔ اُسے کچھ تشویش بھی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے محتاط رہنے کا مشورہ بھی دے دیا تھا۔ لیکن میرے خیال میں وہ اس معاملے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھی۔ شاید وہ سمجھتی ہو کہ اس تصویر کے ذریعے ہمارا سراغ لگانا ممکن نہیں ہوگا۔ پولیس اور انٹیلی جنس ویسے بھی بعض معمولی باتوں پر گڑھے مُردے اُکھاڑ پھینکتی ہے۔ اور یہ تو بہت معمولی سی بات تھی۔ اُنہیں صرف یہ کرنا تھا کہ دہلی میں میگزین کے دفتر سے یہ معلوم کر کے کہ یہ تصویر انہیں کہاں سے ملی تھی؟ آیا اُن کے اپنے فوٹو گرافر نے کھینچی تھی یا کسی فری لانسر نے اُنہیں فروخت کی تھی۔ فوٹو گرافر کوئی بھی ہو اُس سے آسانی سے پتہ چلایا جاسکتا تھا کہ اُس نے یہ تصویر کب اور کہاں کھینچی تھی۔ اور دُرگا تو اس شہر کی معروف ہستی تھی۔ اُسے تلاش کرنا زیادہ مشکل نہ ہوتا۔

دُرگا نے احتیاط کا مشورہ دیا تھا اور احتیاط یہی ہوسکتی تھی کہ ہم اس حویلی کو چھوڑ دیں اور جہاں بھی جائیں اس کے بارے میں دُرگا کو بھی نہ بتایا جائے۔ لیکن ہوسکتا ہے میرے یہ اندیشے بھی بے بنیاد ہوں..... اُس میگزین میں عام آدمی کی دلچسپی کی کوئی بات نہیں تھی۔ اُسے تو وہی خرید سکتا تھا جسے تاریخ اور قدیم فن تعمیر سے کوئی دلچسپی ہو۔ دُرگا نے ٹھیک کہا تھا کہ لوگ فلم ایکٹریسوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

اگلے روز میں صبح دس بجے کے قریب بیدار ہوا تو دُرگا بازار سے سودا وغیرہ لے آئی تھی۔ میز پر اخبار بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ اخبار اُٹھا لیا۔ پہلے صفحہ پر ہی وہ خبر تھی۔ اس کے ساتھ رام چند دھوبی اور اُس کے ساتھی ٹیکسی ڈرائیور اور ٹیکسی کی تصویر بھی چھپی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کی تصویر تو پہچانی جارہی تھی لیکن رام چند دھوبی کا چہرہ ناقابل شناخت تھا۔ کلپنا نے پتھر سے اُس کا سر اس طرح کچل دیا تھا کہ اُس کا چہرہ قابل شناخت نہیں رہا تھا۔

اس خبر کو اخبار نے اپنے مخصوص رنگ میں شائع کیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور خبر بھی تھی۔ امرساگر سے ایک لڑکی کو زبردستی اغواء کرلیا گیا تھا۔ عینی شاہدوں کے بیانات بھی چھاپے گئے تھے۔ اُن کے مطابق وہ لڑکی شادی شدہ تھی اور اپنے پتی کے ساتھ سیر کرنے آئی تھی کہ اُسے ایک ٹیکسی میں اغواء کرلیا گیا۔ لڑکی کے پتی نے ایک موٹر سائیکل پر ٹیکسی کا پیچھا کیا تھا۔ اُن میں

کوئی بھی ٹیکسی کا نمبر نوٹ نہیں کرسکا تھا۔ اُنہیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ نوجوان اپنی پتنی کو اُن غنڈوں سے چھڑانے میں کامیاب ہوسکا تھا یا نہیں؟ البتہ اخبار نے اپنے طور پر ان دونوں خبروں میں تعلق جوڑنے کی کوشش کی تھی۔

رپورٹ کے مطابق شہر سے دُور اُس ویران احاطے کے باہر جہاں ٹیکسی کھڑی تھی قریب ہی ریت پر موٹر سائیکل کے پہیوں کے نشان بھی پائے گئے تھے۔ رپورٹ نے قیاس آرائی کی تھی کہ ممکن ہے اُس لڑکی کا پتی موٹر سائیکل پر اُن غنڈوں کا پیچھا کرتا ہوا اس ویران احاطے تک پہنچ گیا ہو اور وہ دونوں غنڈے اُس کے ہاتھوں مارے گئے ہوں۔ اخبار میں بہرحال اُس شخص کا بیان نہیں تھا جس کی موٹر سائیکل پر میں نے ٹیکسی کا پیچھا کیا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ اب وہ اس سلسلے میں پولیس سے رابطہ بھی نہیں کرے گا۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ وہ دونوں غنڈے میرے ہاتھوں مارے گئے تھے اور اس واردات میں اُس کی موٹر سائیکل استعمال ہوئی تھی۔ پولیس اُسے پریشان کرسکتی تھی۔ اور ظاہر ہے وہ اپنی گردن نہیں پھنسوانا چاہے گا۔

دُرگا کچن میں تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور ہم دونوں اخبار کی اُس خبر پر تبصرے کرنے لگے۔

''تم تو واقعی بڑے ظالم ہو۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ ''تم نے ان دونوں کا کیا حشر کردیا..... اس کی تو صورت ہی پہچانی نہیں جاتی۔'' اُس نے اخبار میں رام چند دھوبی کی ناقابل شناخت تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ رام چند دھوبی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ظلم کا مقابلہ تو طاقت سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو تم سوچ سکتی ہو کہ وہ لوگ کلپنا کا کیا حشر کرتے۔''

ہم کافی دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

وہ دن بڑا بوریت میں گزرا۔ کلپنا تو دن بھر اپنے کمرے میں پڑی رہی تھی۔ کل والے واقعہ سے وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہوگئی تھی اور اُسے بخار بھی ہوگیا تھا۔ میں بھی ایک مرتبہ اُسے دیکھ کر آیا تھا اور سیتا اور دُرگا تو بار بار اُس کے کمرے کے چکر لگا رہی تھیں۔ شام کو میں پھر سیتا کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلا گیا۔ کلپنا کی باتوں سے پتہ چلا کہ اب وہ گنگو اور ٹھاکر سے خوفزدہ تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ٹھاکر اُس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ وہ اس وقت تک محفوظ تھی جب تک اس حویلی میں تھی۔ اور ظاہر ہے وہ زندگی بھر حویلی کی دیواروں میں قید ہوکر نہیں رہ سکتی تھی۔

''اگر تم چاہو تو ہم تمہیں کہیں اور چھوڑ دیں؟'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے دُور کسی دوسرے شہر جہاں تمہارے کوئی رشتہ دار ہوں..... جہاں تم اپنے آپ کو محفوظ سمجھ سکو۔''

''میں اپنے آپ کو صرف یہاں سرکشت سمجھتی ہوں۔ آپ لوگوں کے پاس۔'' کلپنا نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے علاوہ میرے لئے کوئی جگہ محفوظ نہیں۔ میں

جہاں بھی جاؤں گی وہ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔ اور پھر میرا اب آپ لوگوں کے سوا ہے بھی کون؟ مجھے اپنے پاس ہی رہنے دیں۔ میں جیون بھر آپ لوگوں کی سیوا کرتی رہوں گی۔''

''ہم زبردستی تمہیں کہیں نہیں بھیجیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''تم ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن ان چند دنوں کے دوران تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہم کانٹوں بھرے راستے پر چل رہے ہیں..... ہمارے چاروں طرف موت کے سائے منڈلا رہے ہیں اور آگے چل کر تو ہمارا راستہ اور بھی دُشوار ہو جائے گا۔ کیا تم اس راستے پر ہمارا ساتھ دے سکو گی؟''

''کوشش کروں گی مہابیر جی.....!'' کلپنا نے جواب دیا۔ ''لیکن میں ایک بات کا آپ کو وشواش دلاتی ہوں۔ آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچنے دُوں گی۔ جیون دے دُوں گی پر اپنے کارن آپ لوگوں پر کوئی آنچ نہیں آنے دُوں گی۔''

''تو پھر یہ ڈر خوف کیسا؟'' میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''صرف دو لاشیں دیکھ کر تمہیں بخار چڑھ گیا۔ تم تو ویسے بڑی بہادر لڑکی ہو۔ تم نے کل رات جس طرح رام چند دھوبی کا سر کچلا تھا اُس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ زیادہ حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ تم جیسی بہادر لڑکی نے اپنے آپ پر اس طرح خوف طاری کر لیا کہ بخار چڑھ گیا۔''

''کل میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی مہابیر جی.....!'' کلپنا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں کچھ دیر کلپنا سے باتیں کرتا رہا پھر باہر آ گیا۔ سیتا وہیں بیٹھی رہی تھی۔

اس وقت شام کا جھٹپٹا تھا۔ مجھے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے کچن میں جھانکا، دُرگا وہاں نہیں تھی۔ میں اُس راہداری میں گھسا جہاں ایک بیڈ رُوم دُرگا کے استعمال میں تھا اور دوسرا خالی پڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ دُرگا اپنے کمرے میں ہوگی اور میں اُسے چائے کے لئے کہہ کر باہر لان میں چلا جاؤں گا۔

میں دُرگا والے کمرے کا دروازہ کھول کر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ مگر پہلا قدم اندر رکھتے ہی جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لئے ہوں..... دُرگا باتھ رُوم سے نہا کر نکلی تھی۔ اُس کے بدن پر مختصر سا تولیہ لپٹا ہوا تھا۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور دروازہ بند کر کے تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا باہر لان میں آ کر ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میرے اس طرح بے دھڑک کمرے میں گھس آنے پر دُرگا نے اگرچہ کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن مجھے اپنی اس حرکت پر ندامت ہو رہی تھی۔ مجھے اس طرح بے دھڑک کمرے میں داخل نہیں ہونا چاہئے تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد سیتا کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں..... اُس کے ساتھ کلپنا بھی تھی۔ اس کے پندرہ بیس منٹ بعد دُرگا بھی چائے بنا کر لے آئی۔ اُس نے میکسی قسم کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا تھا اور سر پر تولیہ پگڑی کی طرح بندھا ہوا تھا۔ میری طرف چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے اُس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''لودروا کیمپ جانے کا کوئی پروگرام تم نے بنایا یا نہیں؟'' میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے سیتا کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس حساس موضوع پر بات کرتے ہوئے میں نے کلپنا کی موجودگی کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے کمرے میں اُس سے جو باتیں ہوئی تھیں اس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر وہ میری اور سیتا کی اصلیت سے واقف ہو بھی گئی تو اس راز کو سینے میں ہی چھپائے رکھے گی۔

''میں سمجھتی ہوں اب ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''لودروا والے مندر کی دیکھ بھال جین دھرمی کمیٹی کے ذمے ہے اور یہ کمیٹی چند پنڈتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں دو پنڈتوں کا تعلق جیسلمیر ہی سے ہے۔ وہ دونوں جیسلمیر کے جین مندر میں ہوتے ہیں۔ ان سے کسی طرح یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ لودروا والے مندر تک کس طرح رسائی ہو سکتی ہے۔''

''کیا وہ تمہیں آسانی سے بتا دیں گے.....؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''نہیں..... اس کے لئے ہمیں کوئی حکمت عملی اختیار کرنی پڑے گی۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ میں اُن سے بہت کچھ اُگلوا لوں گی۔''

''اور یہ جین مندر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''زیادہ دُور نہیں ہے.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''ہم کل دن میں وہاں جا کر اُن دونوں پنڈتوں میں سے کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔''

''تم..... میرا مطلب ہے کہ تم جاؤ گی؟'' میں نے کہا۔

''چھپ کر بیٹھے رہنے سے تو کام نہیں چلے گا۔ باہر نکلنا ہی ہوگا۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر وہ بتانے لگی کہ جین مندر جانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

''لیکن اگر کسی نے تمہیں پہچان لیا تو.....؟''

''میں اپنے چہرے پر ایسی تبدیلی لانے کی کوشش کروں گی کہ میرا کوئی جاننے والا بھی مجھے سیتا کی حیثیت سے شناخت نہ کر سکے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اُس سے تفصیل جاننے کی کوشش نہیں کی۔

اگلے روز دُرگا نے مجھے جلدی جگا دیا۔ سیتا گزشتہ رات میرے کمرے میں نہیں سوئی تھی۔ میں اُٹھ کر باتھ رُوم میں گھس گیا اور تقریباً پون گھنٹے میں تیار ہو کر جب میں کمرے سے نکل کر راہداری میں آیا تو دُرگا کے ساتھ ایک عورت کو کھڑے دیکھ کر چونک گیا..... وہ کوئی پجارن تھی۔ اُس نے پھولدار کپڑے کی چولی اور گھاگھرا پہن رکھا تھا۔ لیکن اُس نے اُوپر سیندوری رنگ کی ایک چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ جسم کا کچھ حصہ آگے اور کچھ پیچھے سے اس چادر میں چھپ گیا تھا۔ سر کے عین وسط میں بالوں کا جوڑا تھا، کانوں میں بُندے اور دونوں کلائیوں میں سونے کے کڑے تھے۔ اُس کی آنکھیں گہری نیلی اور پیشانی پر کشکا بنا ہوا تھا۔

وہ سیتا تھی..... اُس کے گال کسی قدر پھولے پھولے سے تھے۔ اُس کے ان پھولے ہوئے گالوں اور گہری نیلی آنکھوں کی وجہ سے پہلی نظر میں تو میں بھی اُسے نہیں پہچان سکا تھا۔

سیتا میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

''بہت خوب.....'' میں نے کہا۔ ''پہلی نظر میں تو میں بھی تمہیں نہیں پہچان سکا تھا۔''

''سچ بتانا.....'' سیتا نے کہا۔ ''کیا ایسی حسین گوپی دیکھ کر کوئی پنڈت یا پجاری اپنی زبان پر قابو رکھ سکتا ہے؟''

''میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''چلو..... تم لوگ ناشتہ کر لو!'' دُرگا نے کہا۔ ''زیادہ دیر ہوگئی تو مندر میں یاتریوں کی بھیڑ لگ جائے گی اور تم لوگ کسی پنڈت سے اطمینان سے بات نہیں کر پاؤ گے۔''

ہم میز پر بیٹھ گئے اور دُرگا نے ہمارے سامنے ناشتہ لگا دیا۔ ناشتے کے بعد دس بجے کے قریب دُرگا نے ہمیں حویلی کے خفیہ راستے سے پچھلی گلی میں نکال دیا۔

ہم گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ بازار میں رونق تھی۔ میں نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ ٹی شرٹ پینٹ سے باہر تھی، پیروں میں ہوائی چپل تھی۔ ہمیں چونکہ مندر کے اندر جانا تھا اس لئے میں نے جوگرز نہیں پہنے تھے اور سیتا نے بھی سینڈل ہی پہن رکھے تھے۔

میرا اور اُس کا ساتھ عجیب سا تھا لیکن میرے خیال میں یہاں کوئی بھی بات عجیب نہیں تھی۔ اور بقول شخصے یہاں سب چلتا تھا۔ سامنے سے آنے والے لوگ سیتا کو دیکھ کر پرنام کے لئے دونوں ہاتھ اُٹھا دیتے اور بعض لوگ اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر رہ جاتے۔

تھوڑی دُور چلنے کے بعد ہمیں ایک آٹو رکشہ مل گیا جس نے دس منٹ میں ہمیں جین مندر پہنچا دیا۔ شہر میں اگرچہ اور بھی جین مندر تھے لیکن سب سے بڑا مندر یہی تھا جہاں ہم آئے تھے۔ اور سیتا کے خیال میں پنڈت بھولے ناتھ سے اس مندر میں ملاقات ہو سکتی تھی یا یہاں سے اُس کا پتہ معلوم ہو سکتا تھا۔

رکشہ چھوڑ کر ہمیں تنگ سی گلیوں میں کچھ دُور تک پیدل چلنا پڑا تھا۔ مندر کے سامنے والی گلی کسی قدر کشادہ تھی اور یہاں سے وہاں تک لاتعداد دُکانیں تھیں جن میں ہار، پھول، ناریل، مٹھائیاں، مورتیاں اور ایسی ہی لاتعداد چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ یاتری انہی دُکانوں سے یہ چیزیں خرید کر مندر میں چڑھاوا چڑھاتے تھے۔ دُکانوں کے علاوہ گلی میں لاتعداد ٹھیلے بھی تھے جن پر یہی سب کچھ لدا ہوا تھا۔

مندر کا چبوترہ بہت اُونچا تھا۔ اُس کے عالیشان گیٹ تک پہنچنے کے لئے سنگ مرمر کی تین کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے دونوں طرف اُوپر سے نیچے تک لاتعداد بھکاری بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں کچھ تو واقعی ایسے تھے جو معذور تھے اور کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن بہت سے ہٹ حرام بھی تھے جنہیں اس مندر سے مفت میں کھانے کو مل جاتا تھا اور یہی لوگ ایسی جگہوں

پر جیب تراشی کی وارداتیں بھی کرتے تھے۔

سیڑھیوں کے اختتام پر سنگ مرمر ہی کا بہت کشادہ چبوترہ تھا۔ اُس سے آگے مندر کا گیٹ تھا جس کے دونوں طرف بہت بڑے اور بہت اُونچے ستون تھے۔ ان ستونوں پر نقش کاری کا بڑا خوبصورت کام تھا۔ چبوترے پر بھی اور مندر کے اندر بھی یاتریوں کی بھیڑ تھی۔ گیٹ کے دونوں طرف جوتے رکھنے کی جگہ تھی۔ جوتوں کی نگرانی کے لئے دونوں طرف ایک ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے سینڈل اُتار کر ایک طرف رکھ دیئے اور اندر داخل ہو گئے۔ یاتری سیتا کو ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر پرنام کر رہے تھے اور میں حیرت زدہ سی نظروں سے مندر کو دیکھ رہا تھا۔ اُس روز دُرگا کے ساتھ میں نے جتنی تاریخی عمارتیں دیکھی تھیں وہ فن تعمیر کا شاہکار تھیں۔ اُن میں پتھروں پر نقش کاری کا کام دیکھ کر میں عش عش کر اُٹھا تھا۔ مگر وہ عمارتیں اب اس مندر کے سامنے مجھے ہیچ لگ رہی تھیں۔

بہت وسیع و عریض ہال تھا۔ چھت بہت اُونچی تھی اور لاتعداد سنگ مرمر کے بڑے بڑے ستون تھے۔ ہر ستون کا پھیلاؤ اتنا بڑا تھا کہ مجھ جیسے تین تین آدمی بھی ہاتھ سے ہاتھ ملا کر اُسے بانہوں کے گھیرے میں نہیں لے سکتے تھے۔ سنگ مرمر کے ان ستونوں پر نقش کاری کا اتنا باریک اور حسین کام تھا کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ انہی پتھروں پر جگہ جگہ مورتیاں بھی تراشی ہوئی تھیں۔ فرش سے لے کر چھت تک کہیں ایک اِنچ بھی ایسی جگہ نظر نہیں آتی تھی جو خالی ہو۔ اُوپر چاروں طرف کشادہ بالکونیاں تھیں۔

اُس مرکزی ہال میں عین سامنے سنگ مرمر ہی کے چبوترے پر ایک بہت بڑی مورتی تھی۔ یہ مورتی بھی سنگ مرمر کے بہت بڑے پتھر کو تراش کر بنائی گئی تھی۔ میں حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سیتا مجھ سے چند گز آگے نکل گئی تھی۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔

یاتریوں کا بہت رش تھا۔ لوگ اس جین مندر کی یاترا کے لئے بہت دُور دُور سے آتے تھے۔

سیتا ایک پجاری کے قریب رُک گئی۔ وہ پجاری شکل ہی سے کچھ بدمعاش قسم کا لگتا تھا۔ درمیانہ قد، گٹھا ہوا جسم، گنجا سر اور سرخ آنکھیں۔ گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی کئی مالائیں تھیں۔ وہ بڑی گہری نظروں سے سیتا کو دیکھ رہا تھا۔

''پنڈت بھولا ناتھ جی کے درشن کہاں ہوں گے مہاراج؟'' سیتا نے دونوں ہاتھوں سے پرنام کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں پہلی بار آئی ہو؟'' پجاری نے اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے سوال کر ڈالا۔

''جی مہاراج!'' سیتا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''بہت دُور سے مندر یاترا کو آئی ہوں۔ پنڈت بھولا ناتھ جی کے درشن بھی کرنا چاہتی ہوں۔''

''ہمیں ہی بھولا ناتھ کیوں نہیں سمجھ لیتیں؟ اس طرف چلو تو ہم تمہیں اپنے درشن کرا دیں۔''

پجاری نے آنکھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔

میرا خون کھول اُٹھا۔ کمبخت مندر جیسی پوتر جگہ پر کھڑا تھا اور اُس کے من میں کھوٹ بھرا ہوا تھا۔ میرا دل تو چاہا تھا کہ اُس کی گردن مروڑ دُوں مگر میں کوئی نیا ہنگامہ کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مہاراج.....'' سیتا نے ناگواری نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔

میں نے اُس پجاری کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر بڑا وحشیانہ پن سا تھا۔ اُس نے سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں کندھے اُچکاتا ہوا سیتا کے پیچھے چل پڑا۔

پنڈت بھولا ناتھ کو تلاش کرنے میں زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اُس کی تلاش میں ہم نے مندر کے بہت سے حصے گھوم لئے تھے اور مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ مندر کا مرکزی ہال بہت بڑا تھا جہاں ایک چبوترے پر بھگوان کی مورتی بھی نصب تھی۔ کسی اور جگہ پر اس قسم کی مورتی نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن عمارت میں لا تعداد راہداریاں اور غلام گردشیں تھیں۔ کئی بڑے بڑے کمرے تھے۔ دو تین کمروں میں، میں نے بعض پنڈتوں اور پجاریوں کو جاپ میں مصروف دیکھا تھا۔

ایک پجاری ہمیں اُس کمرے میں لے گیا جہاں پنڈت بھولا ناتھ موجود تھا۔ وہ اس مندر کا پروہت تھا اور اُس کی شان ہی نرالی تھی۔ وہ اس وقت راجہ اندر بنا بیٹھا تھا..... پنڈت بھولا ناتھ کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ بھاری بھرکم جسم اور قد مناسب ہی تھا۔ گنجا سر، ماتھے پر کشکا، کانوں میں سونے کی بالیاں اور ایک کلائی میں سٹیل کے تین چار کڑے تھے۔ گلے میں آبنوسی لکڑی کے موتیوں کی مالا تھی۔ پنڈت کی اپنی رنگت بھی آبنوسی ہی تھی۔ وہ کلین شیو تھا اور لگتا تھا جیسے کچھ دیر پہلے ہی شیو بنا کر آیا ہو۔

پنڈت بھولا ناتھ کے چہرے پر اُس پجاری کی طرح وحشیانہ پن نہیں تھا جو ہمیں راستے میں ملا تھا۔ وہ ایک گدی پر براجمان تھا اور ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر ایک ٹانگ آگے کو پھیلا رکھی تھی۔ دوسرا گھٹنا کھڑا تھا۔ اُس کے اِردگرد حسین گوپیوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ اُن میں دو عورتیں ایسی بھی تھیں جن کا تعلق مندر سے نہیں تھا۔ اُن میں سے ایک نے قیمتی ساڑھی پہن رکھی تھی اور وہ پنڈت کی ٹانگ دبا رہی تھی۔ دوسری عورت دوسری ٹانگ دبا رہی تھی۔ اُس نے چولی اور گھاگھرا پہن رکھا تھا۔ وہ دونوں اس طرح بیٹھی ہوئی تھیں کہ فراخ گریباں سے اُن کے سینے جھانک رہے تھے۔ ایک گوپی پنڈت بھولا ناتھ کے سر پر بہت ہولے ہولے چمپی کر رہی تھی۔ ایک اور گوپی کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا۔ وہ وقفے وقفے سے گلاس پنڈت کے ہونٹوں سے لگا دیتی۔ پنڈت ایک چسکی لیتا اور وہ گلاس ہٹا لیتی۔

مندروں کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا اور آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ مندر واقعی عیاشی کے اڈے تھے۔ دنیا کی کوئی بھی قوم اپنی عبادت گاہوں کے تقدس کو اس طرح پامال نہیں کرتی۔ مسلمان، عیسائی، سکھ، یہودی اور ہر قوم اپنی عبادت گاہوں کے تقدس کا

خیال رکھتی ہے۔ اور ہندو اپنی عبادت گاہوں کو عیاشی کے اڈے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہاں شراب بھی پی جاتی ہے اور عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں بھی منائی جاتی ہیں۔ گوپیاں مندر کی سیوک کہلاتی ہیں لیکن یہ دراصل پنڈتوں اور پجاریوں کی سیوا کرتی ہیں۔ اُن کی ہوس کی آگ ٹھنڈی کرتی ہیں۔

اُس کمرے میں دو پجاری بھی تھے۔ ایک دروازے کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا اونگھ رہا تھا لیکن میرے خیال میں وہ آنکھوں میں باریک سی جھری پیدا کئے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دوسرا پجاری کمرے کے دوسری طرف دیوار کے قریب آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھی بند تھیں لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ آنکھیں بند کئے بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

میں ایک طرف کھڑا ہو گیا اور سیتا نے جھک کر پنڈت بھولا ناتھ کے چرن چھوئے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

''میں آپ کے درشن کو بہت دُور سے آئی ہوں مہاراج!'' وہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے آپ کا آشیرباد چاہئے۔''

''کیا چاہتی ہو.....؟'' پنڈت بھولا ناتھ نے پوچھا۔ اُس کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔

''میں مندر یاترا پر نکلی ہوں مہاراج!'' سیتا نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنا جیون مندروں اور آپ جیسے مہا پرشوں کے لئے وقف کر دیا ہے مہاراج۔''

''یہ مورکھ کون ہے؟'' پنڈت بھولا ناتھ نے میری طرف اشارہ کیا۔

''یہ میرا پتی ہے مہاراج!'' سیتا نے جواب دیا۔ ''مہابیر نام ہے ان کا۔''

''تو دھرم سے واقف نہیں ہے۔'' پنڈت نے کہا۔ ''تو نہیں جانتی کہ مندر سیوا وہی کر سکتی ہے جو کنواری ہو۔ کوئی شادی شدہ ناری گوپی نہیں بن سکتی۔''

''میں کنواری ہوں مہاراج!'' سیتا نے کہا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو.....؟'' پنڈت نے اُسے گھورا۔ ''وہ تمہارا پتی ہے اور تم کنواری کیسے ہو سکتی ہو؟''

''مہاراج.....'' سیتا نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''مجھے بچپن ہی سے دھرم، مندر اور آپ جیسے مہا پرشوں کی سیوا کا شوق تھا۔ میری شادی ہوئی تو میں نے سہاگ رات ہی کو اپنے پتی سے اپنے من کی بات کہہ دی تھی۔ میرے پتی نے مجھے چھوا تک نہیں۔ پتی کے ہوتے ہوئے بھی میں کنواری ہوں مہاراج!''

''کیا چاہتی ہو؟'' پنڈت بھولا ناتھ نے پوچھا۔

''میں مندروں کی یاترا کے لئے نکلی ہوئی ہوں مہاراج!'' سیتا نے جواب دیا۔ ''سنا ہے یہاں سے کچھ دُور لودروا میں بھی ایک بہت قدیم مندر ہے۔ لیکن مجھے بتایا گیا کہ اُس طرف یاتریوں کو جانے کی اجازت نہیں۔ میں اُس مندر کی یاترا کے لئے آپ کی آگیا لینے آئی ہوں

مہاراج!''

پنڈت بھولا ناتھ لودروا مندر کے نام پر چونک گیا۔ اُس نے پہلے میری طرف دیکھا، پھر سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ سیتا اس دوران اپنا حربہ استعمال کر چکی تھی۔ وہ دوزانو ہو کر کسی قدر آگے کو جھکی بیٹھی تھی۔ اُس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے اُوپر سے چادر ہٹا دی اور وہ منظر دیکھ کر میں اُچھل پڑا..... سیتا نے جو چولی پہن رکھی تھی اُس کے سامنے کے رُخ پر کپڑا نہیں تھا جالی تھی۔ اور جالی سے اُس کا سینہ پوری طرح برہنہ ہو رہا تھا۔

سیتا نے چند سیکنڈ کے توقف سے چادر اپنے جسم پر درست کر لی۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے یہ سب کچھ اتفاقیہ طور پر ہوا ہو مگر یہ اتفاق اپنا کام کر گزرا تھا۔

''مجھے نراش مت کیجئے مہاراج!'' وہ پنڈت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں بہت دُور دیش سے آئی ہوں۔ لودروا مندر کی یاترا ضرور کروں گی۔''

''لودروا مندر کی یاترا پر ہماری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔'' پنڈت بھولا ناتھ نے کہا۔ ''یہ پابندی تو سرکار نے لگا رکھی ہے۔''

''مجھے نراش مت کیجئے مہاراج.....'' سیتا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے چادر ایک بار پھر سرکا دی اور جھلک دکھا کر چادر درست کر لی۔

''کوئی وچار کرنا پڑے گا۔'' پنڈت بھولا ناتھ بولا۔ پھر دروازے کے قریب کھڑے ہوئے پجاری کو مخاطب کیا۔ ''موتن داس..... اس ناری کو ہمارے پوجا والے استھان پر لے جاؤ!''

سیتا کھل اُٹھی۔ وہ پنڈت کے سامنے سے اُٹھ کر میری طرف آ گئی اور وہ پجاری ہمیں لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔

ہم وہاں سے تیسرے کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک طرف چبوترے پر بھگوان کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ اُس کے آگے تازہ پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لوبان کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ سیتا مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور میں اُس پجاری موتن داس کے ساتھ دروازے کے قریب ہی کھڑا رہا۔

تقریباً دس منٹ بعد سامنے کی دیوار شق ہوئی اور اُس میں پیدا ہونے والے خلا سے پنڈت بھولا ناتھ کو برآمد ہوتے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس مندر کا یہ پہلا خفیہ راستہ تھا جو میری نظروں میں آیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہاں اور بھی ایسے بہت سے خفیہ راستے ہوں گے۔

پنڈت بھولا ناتھ نے مورتی کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑے اور گردن گھما کر میرے قریب کھڑے ہوئے موتن داس کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ میں نے اُس کا اشارہ دیکھ لیا تھا لیکن انجان بنا کھڑا رہا۔ موتن داس نے کچھ کہے بغیر میرا بازو پکڑ لیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

موتن داس دروازے کے سامنے کھڑا رہا اور میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر مندر کے ستونوں اور

دیواروں پر کاشی کاری کا کام دیکھتا رہا۔ مندر میں یاتریوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔

پنڈت بھولا ناتھ نے جس طرح سیتا کو الگ کمرے میں پہنچایا تھا اس سے میں اُس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ لیکن مجھے سیتا کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ پوری تیاری کر کے آئی تھی۔ اُس کے ساتھ زبردستی بھی نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ وہ دو آدمیوں کے قابو میں آنے والی نہیں تھی۔ اور پنڈت بھولا ناتھ تو اکیلا تھا۔

لیکن میرے ذہن میں یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر سیتا کو وہاں سے کسی اور کمرے میں لے جایا گیا جہاں اُس کے اور گرگے بھی ہوئے تو سیتا کیا کر سکے گی اور میں اُس کی کیا مدد کر سکوں گا..... لیکن بہرحال سیتا اپنی حفاظت کرنا جانتی تھی۔ مجھے اُس کی طرف سے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں مندر میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ میں اس وقت ایک ستون کے سامنے کھڑا کاشی کاری کے کام اور اُس پتھر پر تراشی ہوئی ایک مورتی دیکھ رہا تھا کہ اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے چونک گیا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ سیتا تھی..... اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

''چلو..... اب چلیں۔'' اُس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم دونوں مندر سے باہر آ گئے۔ سیڑھیاں اُتر کر بائیں طرف والی گلی میں مُڑے ہی تھے کہ اُس پجاری نے ہمارا راستہ روک لیا جس سے شروع میں ملاقات ہوئی تھی.....

''دیوی جی.....!'' وہ سیتا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ سی مسکراہٹ تھی۔ ''ہمارے بھی درشن کر لیتی تو اچھا تھا..... تمہاری تمام آشائیں پوری ہو جاتیں۔''

سیتا نے بلا توقف اُس کے منہ پر چانٹا رسید کر دیا..... چانٹا اس قدر زوردار تھا کہ اُس کی آواز بھی اُبھری تھی اور وہ پجاری بھی لڑکھڑا کر رہ گیا تھا۔ آس پاس کے لوگ گھوم کر اُس طرف دیکھنے لگے۔ پجاری گال سہلاتا ہوا سیتا کی طرف بڑھا..... اُس کی آنکھیں تو پہلے ہی سرخ تھیں۔ چانٹا کھا کر خون اُتر آیا۔ میں تیزی سے اُس کے سامنے آ گیا۔

''مہاشے.....!'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری کوئی اور آشا ہو تو میں پوری کر دُوں؟'' سیتا اُس پجاری کو بے نقط سنا رہی تھی۔ دو تین آدمی آگے آ گئے۔ اُنہوں نے صورتحال کی نزاکت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ پجاری کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے ایک طرف لے گئے۔

ہم گلیوں سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔

''اب کیا پروگرام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب گھر ہی چلیں گے..... اس طرح پھرنا ٹھیک نہیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ میں نے سیتا

کی طرف دیکھا کچھ بال اُس کے جوڑے سے نکل کر بکھر گئے تھے۔ چہرے کا میک اَپ بھی کچھ پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ بار بار چادر کے اندر سینے پر لے جا رہی تھی۔

میں نے ایک آٹو رکشہ روک لیا۔ یہی سواری ہمارے لئے سب سے زیادہ محفوظ تھی۔ رکشہ تیزی سے سڑکوں پر دوڑتا رہا۔ بازار میں گلی کے موڑ سے پہلے ہم نے رکشہ چھوڑ دیا اور جب گلی میں داخل ہوئے تو تیسرے مکان سے ایک بوڑھا آدمی اور دو عورتیں باہر نکلیں۔ اُن کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ مرد اور عورتوں نے ہاتھ اُٹھا کر سیتا کو پرنام کیا۔

دُرگا کے خدمت گار راجیو کا مکان اُس مکان کے سامنے تھا۔ میں نے اپنے مکان کا رُخ کرنے کی بجائے راجیو والے مکان کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ دستک کے جواب میں ہمارے والے مکان کا دروازہ کھل گیا۔

''میں یہاں ہوں مہابیر جی!'' راجیو کی آواز سن کر میں نے اُس طرف دیکھا۔ ''مجھے دُرگا دیوی نے بتا دیا تھا کہ آپ لوگ باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں یہاں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔''

ہم مُڑ کر دروازے میں داخل ہو گئے اور اُس کے دو تین منٹ بعد ہم حویلی میں موجود تھے۔ دُرگا سے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد سیتا اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی تھا۔ میں دراصل سیتا سے پنڈت بھولا ناتھ سے تنہائی میں ملاقات کا حال جاننا چاہتا تھا۔

سیتا نے دروازہ بند کر دیا اور میری طرف گھومتے ہوئے جسم پر اوڑھی ہوئی چادر اُتار کر پھینک دی۔ اور میں اُس کی حالت دیکھ کر اُچھل پڑا..... اُس کی چولی سامنے سے پھٹی ہوئی تھی اور دائیں طرف سینے کے اُبھار پر قریب قریب دو سرخ نشان نظر آ رہے تھے جیسے کسی نے اُس جگہ دانت گاڑھ دیئے ہوں.....

''یہ..... یہ کیا ہوا؟'' میری آنکھوں میں تشویش اُبھر آئی۔

''میں پنڈت بھولا ناتھ سے آشیرباد لینے گئی تھی۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو آشیرباد دینے کا ان پنڈتوں اور پجاریوں کا یہی طریقہ ہے۔ کمبخت نے بھوکے بھیڑیئے کے طرح دانت گاڑھ دیئے اور چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔''

''پنڈت سے بات کیا ہوئی؟ میرا مطلب ہے.....''

''تم باہر چلو..... میں تھوڑی دیر میں آ کر بتاتی ہوں۔'' سیتا نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میں کمرے سے نکلا تو سیتا نے دروازہ بند کر لیا۔ میں ہال کی طرف جانے کی بجائے کلپنا والے کمرے میں آ گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ میں واپس مُڑنا چاہتا تھا کہ کلپنا کی آواز سن کر رُک گیا۔

''میں جاگ رہی ہوں مہابیر جی.....!''

میں نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ کلپنا کے ہونٹوں پر اگرچہ خفیف سی مسکراہٹ تھی لیکن اُس کا چہرہ ستا ہوا سا لگ رہا تھا۔ میں اُس کے بیڈ کے قریب آ گیا۔ کلپنا نے اُٹھنے کی کوشش کی تو

دوبارہ ڈھیر ہو گئی۔ میں نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں چونک گیا..... مجھے یوں لگا جیسے دہکتا ہوا انگارہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا گیا ہو۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اُس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔ پیشانی بھی تپ رہی تھی۔ اُسے تیز بخار تھا۔

''ارے..... تمہیں تو تیز بخار ہو رہا ہے۔ لیٹ جاؤ..... میں دُرگا کو بلا کر لاتا ہوں تاکہ تمہارے دوا دارو کا کوئی بندوبست کیا جائے۔'' میں نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر دوبارہ لٹا دیا۔

کلپنا نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں بھی سرخی بھری ہوئی تھی۔ میں جب وہاں سے ہٹنے لگا تو کلپنا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''میرے پاس بیٹھ جاؤ مہابیر جی! تھوڑی دیر کو.....''

اُس کے لہجے میں نجانے کیا بات تھی کہ میں انکار نہیں کر سکا اور پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں ہولے ہولے اُس کا ہاتھ سہلاتا رہا۔ اور پھر میں نے آہستگی سے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کلپنا نے آنکھیں کھول دیں۔

''بخار بہت تیز ہو رہا ہے.....'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''آرام سے لیٹی رہو..... میں دُرگا سے بات کرتا ہوں۔ شاید ڈاکٹر کو بلانا پڑے۔''

کلپنا میری طرف دیکھتی رہی اور میں اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ دُرگا مجھے ہال ہی میں مل گئی۔ میں نے اُسے کلپنا کے بارے میں بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔

''ایک گھنٹہ پہلے تو وہ بالکل ٹھیک تھی..... یہاں میرے ساتھ بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔'' دُرگا نے کہا۔ وہ میرے ساتھ کلپنا والے کمرے میں آ گئی۔ اُسے دیکھ کر دُرگا مزید پریشان ہو گئی۔ میں کلپنا کے قریب بیڈ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر کرب کے تاثرات بھی نمودار ہو رہے تھے۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔

''یہاں..... یہاں پیڑ ہو رہی ہے.....''

میں نے دُرگا کی طرف دیکھا اور پھر کلپنا کے سینے پر ہاتھ سے ہلکا ہلکا دباؤ ڈالنے لگا۔

''یہاں درد ہو رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں.....'' کلپنا نے اپنا ہاتھ بھی میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

میں کچھ دیر تک اُس کے سینے اور پسلیوں کو ٹٹولتا رہا، پھر دُرگا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یا تو ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑے گا یا ڈاکٹر کو یہاں بلانا ہو گا۔''

دُرگا بھی سمجھ گئی تھی کہ بخار اور پسلیوں میں درد کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اُس کی آنکھوں کی تشویش بڑھ گئی۔

''میرا خیال ہے ڈاکٹر کو یہیں بلانا ہو گا..... مگر یہاں نہیں۔ دوسرے گھر میں۔'' دُرگا نے کہا۔ ''تم اسے لے کر آؤ..... میں راجیو کو بھیجتی ہوں ڈاکٹر کو بلانے کے لئے۔''

دُرگا باہر چلی گئی۔ میں نے کلپنا کی طرف دیکھا اور اُسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ اُس کا جسم

ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور میرے خیال میں وہ اپنے پیروں پر نہیں چل سکتی تھی۔ میں نے جھک کر اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ کلپنا کے چہرے کی سرخی کچھ اور گہری ہو گئی۔ اور جب میں کلپنا کو گود میں اُٹھائے کمرے سے نکل رہا تھا تو ٹھیک اُسی وقت سیتا والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سیتا کلپنا کو میری آغوش میں دیکھ کر چونک گئی۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی آنکھیں سلگ اُٹھیں.....

''یہ..... یہ کیا حرکت ہے مہابیر.....؟'' اُس کی آواز میں تلخی تھی۔

''کلپنا کو تیز بخار ہے..... اور سینے میں درد ہو رہا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ نمونیہ نہ ہو گیا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''دُرگا دوسرے مکان میں گئی ہے۔ چلو..... تم بھی آگے چلو!''

سیتا اپنا غصہ بھول گئی۔ اُس نے آگے بڑھ کر ہاتھ کی پشت سے کلپنا کی پیشانی کو چھوا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں کلپنا کو اُٹھائے اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ دوسرے مکان میں کلپنا کو بستر پر لٹا دیا۔ دُرگا جھک کر پیار سے کلپنا کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''راجیو گیا ہے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے..'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''ٹھیک ہو جاؤ گی۔ گھبراؤ نہیں۔''

''یہاں..... یہاں بہت پیڑ ہو رہی ہے۔'' کلپنا ایک ہاتھ سے سینہ دباتے ہوئے کراہنے لگی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

''سردی لگ رہی ہے؟'' دُرگا نے پوچھا تو کلپنا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دُرگا دوسرے کمرے سے کمبل لے آئی۔ اُس نے کلپنا کو کمبل اوڑھا دیا اور سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم اس کے پاس بیٹھو! میں بوتل میں پانی گرم کر کے لاتی ہوں۔ ڈاکٹر آتا ہی ہو گا۔ اور اس مکان میں میرا ڈاکٹر کے سامنے آنا درست نہیں ہے۔'' دُرگا حویلی میں چلی گئی۔ سیتا، کلپنا کے پاس پلنگ کی پٹی پر ٹک گئی اور میں بھی ایک کرسی گھسیٹ کر قریب ہی بیٹھ گیا۔

کلپنا سینے کے درد سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بار بار اپنی ماں کو یاد کر رہی تھی۔ سیتا پلنگ پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور اُسے اپنی گود میں سمیٹ لیا۔

''پریشان کیوں ہو رہی ہو..... ہم ہیں نا۔'' وہ اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد راجیو ڈاکٹر کو لے کر آ گیا۔ وہ ادھیڑ عمر ڈاکٹر مسلمان تھا۔ سیتا نے کلپنا کو لٹا دیا اور خود بھی بیڈ سے اُتر آئی۔ پندرہ منٹ کے معائنے کے بعد ڈاکٹر نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ نمونیہ ہی تھا..... اُس وقت ڈاکٹر کے بتانے پر کلپنا نے یہ انکشاف کیا کہ اُس نے ٹھنڈے پانی سے نہالیہ تھا۔ ہلکا سا بخار تو اُسے دو تین دن سے ہو رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی میں نہانے سے نمونیہ کا حملہ ہو گیا تھا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں.....'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''انجکشن میں نے لگا دیا ہے۔ اور یہ دوائیں بھی باقاعدگی سے استعمال کرائیے۔'' اُس نے نسخہ لکھ کر سیتا کے حوالے کر دیا۔ ''کہیں سے اچھا شہد مل جائے تو استعمال کرائیے۔ خدانخواستہ رات کو بھی کسی وقت تکلیف ہو تو مجھے بلا سکتے ہیں۔ اس کاغذ پر میرے کلینک اور گھر کا فون نمبر بھی لکھا ہوا ہے..... لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی

ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''خالص شہد کستوری لال پنساری کی دُکان پر مل جائے گا..... میں ابھی لے کر آتا ہوں۔'' راجیو نے کہا۔

''تم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہی چلے جاؤ اور یہ دوائیں بھی لیتے آنا۔'' میں نے سیتا کے ہاتھ میں پکڑا ہوا نسخہ اور جیب سے چند نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ڈاکٹر کو اُس کی فیس بھی ادا کر دی اور اُس کا شکریہ ادا کر کے اُسے رخصت کرنے کے لئے دروازے تک اُس کے ساتھ آیا۔ میرے منہ سے بے اختیار ''اللہ حافظ'' کے الفاظ نکلے تو اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

سیتا ایک بار پھر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ کلپنا اب بھی ایک ہاتھ سے سینہ دبا رہی تھی۔ اس دوران دُرگا بھی آ گئی۔ وہ ربڑ کی بوتل گرم پانی سے بھر کر لے آئی تھی۔ وہ بھی پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی اور بوتل کمبل کے اندر اُس کے سینے پر رکھ دی۔

دس پندرہ منٹ بعد کلپنا کے چہرے پر کرب کے تاثرات کم ہونے لگے۔ اُس کی تکلیف کم ہو رہی تھی اور وہ بتدریج پُرسکون ہوتی چلی گئی۔ راجیو بھی شہد اور دوائیں لے کر آ گیا۔ کلپنا کو دوائیں دینے کے علاوہ شہد کا ایک چمچہ بھی چٹا دیا گیا۔ اُن دواؤں میں شاید کوئی نیند کی گولی بھی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد کلپنا سو گئی۔ سینے کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ اُس کی سانس کی رفتار خاصی تیز تھی۔

میں بھی ایک مرتبہ نمونیے کا شکار ہو چکا تھا اور میرا خیال تھا کہ کلپنا اب کم از کم ایک ہفتے تک بستر سے نہیں اُٹھ سکے گی۔

ہم نے اپنا ڈیرہ بھی وہیں جما لیا تھا۔ رات دو بجے کے قریب کلپنا پھر بے چین ہونے لگی۔ میں نے ڈاکٹر کو فون کر دیا۔ اُس کا گھر شاید زیادہ دُور نہیں تھا۔ اُسے پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اُس نے کلپنا کو دیکھا اور انجکشن دیا اور اُسے دیکھنے کے لئے تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا رہا اور پھر مطمئن ہو کر رخصت ہو گیا۔ وہ کہہ گیا تھا کہ صبح کلینک پر جانے سے پہلے اسے دیکھتا جائے گا۔

کچھ دیر بے چین رہنے کے بعد کلپنا سو گئی۔ ہم کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھے رہے اور پھر دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ بیچ کا دروازہ کھول دیا گیا تھا تاکہ کلپنا کو بھی دیکھتے رہیں۔ دُرگا بھی ہمارے پاس ہی رہی۔ راجیو البتہ اپنے گھر چلا گیا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو اُسے بلا لیا جائے گا۔ لیکن رات کو اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

صبح پانچ بجے کے قریب دُرگا حویلی میں چلی گئی۔ رات بھر جاگنے سے سیتا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ رات کو میں نے کئی مرتبہ اُسے اپنا سینہ سہلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ دُرگا نے بھی یہ بات نوٹ کی تھی، اُس نے سیتا سے کچھ پوچھا بھی تھا مگر سیتا نے اُسے ٹال دیا تھا۔ رات کو مجھے سیتا سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا اور اب دُرگا کے جانے کے بعد میں نے سب سے پہلا

سوال یہی کیا۔

''پنڈت بھولا ناتھ سے کیا معلوم ہوا؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یا اُس نے تمہیں ٹھینگا دکھا دیا؟''

''ٹھینگا تو میں نے اُسے دکھایا تھا۔'' سیتا مسکراتے ہوئے اُٹھ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اُس نے میکسی پہن رکھی تھی۔ دونوں گھٹنے اُٹھائے تو میکسی پنڈلیوں سے اُوپر تک سرک گئی۔ ''یہ پنڈت اور پجاری شراب اور عورت کے لئے تو اپنے بھگوان کو بھی بیچ ڈالتے ہیں اور میں تو اُس سے چند باتیں ہی معلوم کرنا چاہتی تھی۔

''کیا بتایا اُس نے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ سرکار نے لودروا مندر کی یاترا پر پابندی لگا رکھی ہے۔ کسی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں اور یہ بات ہم پہلے سے جانتے ہیں۔'' سیتا نے کہا۔ ''دوسری بات یہ کہ مندر کی دیکھ بھال کے لئے دو پجاریوں کی ڈیوٹی لگائی ہوتی ہے۔ اور ہر پندرہ دن بعد پجاری بدل جاتے ہیں۔ اس مندر پر ڈیوٹی دینے والے پجاری اپنا دو ہفتوں کا کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر جاتے ہیں کیونکہ یہاں سے اُن کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رکھا جاتا۔ بس یہ ہوتا ہے کہ نئے دو پجاری مندر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں پہلے سے ڈیوٹی دینے والے واپس آ جاتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ وہ لوگ ایک دوسرے کو جانتے بھی ہوں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم بھی چند روز کے لئے اُس مندر کی دیکھ بھال کی سیوا کر سکتے ہیں۔'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''میں بھی یہی کہنا چاہتی تھی۔'' سیتا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اور پجاریوں کی یہ ڈیوٹی کب تبدیل ہو گی..... میرا مطلب ہے کس دن؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اگلے سنیچر کو۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''آج منگل ہے.....'' میں نے کہا۔ ''آج کا دن ملا کر پانچ دن۔ ٹھیک ہے..... اُس وقت تک کلپنا بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ سنیچر کے دن صبح ہی جانا ہو گا؟''

''نہیں..... شام کو۔'' سیتا نے کہا۔ ''شام کو سورج غروب ہونے کے بعد ہی نئے پجاری وہاں پہنچتے ہیں اور پہلے والے واپس آ جاتے ہیں۔ اور ہمیں دس گیارہ میل کا یہ فاصلہ پیدل ہی طے کرنا ہو گا۔''

''میں تو پہاڑوں میں میلوں سفر کرنے کا عادی ہوں۔ تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تم یہ فاصلہ طے کر سکو گی یا نہیں؟'' میں نے کہا۔

''جب ہم ڈوڈا میں ماما کے گاؤں سے بھاگے تھے تو میں نے وہ کٹھن سفر تمہارے کندھوں پر بیٹھ کر تو نہیں کیا تھا۔'' سیتا نے کہا۔

''کچھ فاصلہ تو واقعی ایسے ہی طے ہوا تھا جیسا تم کہہ رہی ہو۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اب تمہیں یہ کشٹ نہیں اُٹھانا پڑے گا۔'' سیتا نے کہا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ راجیو آ گیا۔ اُس نے صورتحال کا جائزہ لیا۔ کلپنا کے بارے میں پوچھا اور پھر ہمارے لئے چائے بنانے کے لئے کچن میں گھس گیا۔

تین چار روز تک کلپنا کی حالت خاصی ابتر رہی اور پھر وہ آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی۔ اس بیماری نے اُسے نچوڑ کر رکھ دیا اور وہ سوکھ کر بالکل کانٹا ہو گئی تھی۔

اُسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے کے لئے کئی روز درکار تھے اور ظاہر ہے ہم اتنا لمبا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔

وہ ہفتے کا دن تھا..... سیتا اور میں نے تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ ہمارے پاس اتنا راشن تھا کہ ہم پندرہ دن آرام سے کھا سکتے تھے۔ ویسے ہمیں اتنے روز اُس مندر میں رہنا نہیں تھا۔

سہ پہر کے قریب ہم شہر سے نکل کر لودروا کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑے۔ شہر سے تین چار میل نکلنے کے بعد ہم ریت کے ایک ٹیلے کے قریب رُک گئے۔ ریت تپی ہوئی تھی۔ شدید گرمی تھی۔ ہم پسینے میں تر ہو رہے تھے لیکن ہمیں یہ گرمی برداشت کرنی تھی۔ اور اس کے بعد رات کو ہونے والی سردی بھی۔

سورج غروب ہو گیا..... اندھیرا پھیلنے لگا۔ موسم میں بھی بتدریج خنکی پیدا ہو رہی تھی۔

اور پھر ہمیں وہ نظر آ گئے جن کا ہمیں انتظار تھا.....

وہ دونوں پجاری شہر سے آنے والے راستے پر باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ تاروں کی مدھم سی روشنی میں اُن کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ لحہ بہ لحہ قریب آ رہے تھے۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا اور ہم دونوں آنے والے لمحات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے.....!

○○○

آسمان پر چاند نہیں تھا۔ تاروں کی لو میں نظر کسی حد تک کام کر رہی تھی۔ ہم شہر سے دو میل سے زیادہ دُور نہیں تھے لیکن ریت کے پہاڑی نما ٹیلوں کی وجہ سے شہر ہماری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ تاہم ان ٹیلوں کے دوسری طرف اُٹھتی ہوئی مدھم روشنی سے یوں لگ رہا تھا کہ اُس طرف زمین پر آگ لگی ہوئی ہو۔

ہمارے چاروں طرف ریگستان تھا..... ٹیلے تھے۔ ہوا زیادہ تیز نہیں تھی لیکن ریت پر اُس کی سرسراہٹ عجیب پراسرار سا تاثر پیدا کر رہی تھی۔ یہ وہی ریگستان تھا جہاں دن کے وقت گرمی کی شدت سے دماغ تک پگھل جاتا تھا لیکن شام ڈھلتے ہی انگاروں کی طرح تپتی ہوئی ریت ٹھنڈی ہونا شروع ہوگئی تھی اور اس وقت ہوا کے سرسراتے ہوئے جھونکے بہت خوشگوار لگ رہے تھے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ جیسے جیسے رات بیتتی جائے گی سردی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور رات کے آخری پہر تو سردی بڑھ جائے گی۔

میں ریگستان میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ پہلو میں ہلکی سی ٹھیس لگنے سے میں چونک گیا..... میرے قریب بیٹھی ہوئی سیتا مجھے کہنی سے ٹھوکے دیتی ہوئی شہر کی طرف سے آنے والے راستے کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ میں نے گردن گھما کر اُن کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہیولے قریب آ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے اور اُن کے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ رہا ہوگا جو بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر کچھ دیر بعد آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ ہم دونوں صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے..... میں نے جو پروگرام بنایا تھا وہ اگرچہ کسی حد تک شرمناک تھا مگر سیتا کو شاید اُس کی پرواہ نہیں تھی۔ شہر کے جین مندر میں پنڈ بھولا ناتھ پر بھی یہی حربہ استعمال کر کے وہ لودروا مندر کے بارے میں مفید معلومات حاصل کر چکی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی حسین عورت کو دیکھ کر مرد پھسلنے میں دیر نہیں لگاتا۔ اور ان پنڈتوں اور پجاریوں کو تو میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ یہ تو عورتوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ سیتا جیسی حسین عورت ہو، رات کا سناٹا ہو تو کون کافر اپنے آپ پر قابو رکھ سکے گا.....؟

وہ لوگ قریب آ گئے۔ سیتا نے مجھے ایک بار پھر کہنی سے ہلکا سا ٹھوکا مارا اور خود ریت پر لیٹ کر ہولے ہولے کراہنے لگی۔ میں بھی اُونچی آواز میں بولنے لگا۔ سیتا کے کراہنے اور میرے اُونچی آواز میں بولنے کا مقصد یہ تھا کہ آنے والے ہماری طرف متوجہ ہو جائیں۔

ہمارا اندازہ غلط نہیں نکلا..... وہ دونوں ٹیلے کے دوسری طرف رُک گئے۔ پہلے آپس میں کچھ باتیں کرتے رہے، پھر اُن میں سے ایک کی اُونچی اور کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اُس آواز میں ہلکا سا خوف بھی تھا۔

''اِدھر کون ہے..... ٹیلے کے پرلی اور کون ہے؟''

میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ اُس کے کراہنے کی آواز کچھ بلند ہوگئی۔ میں بڑبڑاتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ٹیلے پر چڑھ کر دوسری طرف آ گیا۔ اُن دونوں پجاریوں کو دیکھ کر میں نے ڈنڈوت کیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''آپ دونوں کو بھگوان نے فرشتہ بنا کر ہماری مدد کو بھیج دیا ہے مہاراج!''

''تم کون ہو مہاراج؟'' اُن میں سے لمبے قد والے پجاری نے کہا۔ میرے لباس سے وہ مجھے کوئی پنڈت یا پجاری ہی سمجھا تھا۔ ''تمہارے ساتھ کون ہے؟ مجھے تو کوئی ناری لگتی ہے۔''

''جی ہاں مہاراج!'' میں نے جواب دیا۔ ''کالی ماں کی سیوک ہے..... ہم دونوں شام سے پہلے پتوا سے چلے تھے۔ جیسلمیر کے دُرگا مندر جانے کے لئے۔ اندھیرا ہونے کے بعد راستہ بھٹک گئے۔ سمتری دیوی کے سینے میں پیڑ اُٹھی ہے..... بہت بیاکل ہو رہی ہے۔ اچھا ہوا آپ اس طرف آ گئے۔ ہماری مدد کرو مہاراج!''

''اوہ..... کہاں ہے وہ؟'' اُس پجاری نے پوچھا۔

''اُدھر..... ٹیلے کے پرلی اور پڑی ہے۔'' میں نے اشارہ کیا۔

''چلو دیکھتے ہیں۔'' وہ دونوں میرے ساتھ ٹیلے کے دوسری طرف آ گئے جہاں سیتا ریت پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔

وہ دونوں پجاری اُس کے پاس بیٹھ گئے۔

''کیا ہوا گوپی..... کہاں تکلیف ہے؟'' لمبے قد والے اُس پجاری نے پوچھا۔

''یہاں..... اس جگہ۔'' سیتا اپنا سینہ مسلنے لگی۔ پھر اُس نے پجاری کا ایک ہاتھ پکڑ کر سینے پر رکھ لیا۔ ''یہاں پنڈت جی..... اس جگہ.....'' وہ پجاری کا ہاتھ پکڑے اپنے سینے کے اُبھار پر پھیر رہی تھی۔ ''یہاں..... ذرا اچھی طرح دیکھیں پنڈت جی!'' سیتا کراہی۔

''مہاراج..... آپ دونوں ذرا پرلی اور کو چلے جاؤ! میں گوپی کو اچھی طرح دیکھ لوں..... بہت کشٹ ہے اس کو۔'' پجاری نے کہا۔

''گئی بھینس پانی میں۔'' میں بڑبڑایا اور دوسرے پنڈت کا ہاتھ پکڑ کر ٹیلے کے دوسری طرف آ گیا اور اُسے ساتھ لے کر ریت پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک ٹیلے کی اوٹ سے سیتا کے کراہنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں، پھر ایسے لگا جیسے اُن دونوں میں اٹھا پٹخ ہو رہی ہو..... دونوں کے غرانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

''شاید ناری کو کشٹ زیادہ ہے۔ میرا متر کوئی منتر کر رہا ہے۔'' میرے ساتھ بیٹھے ہوئے

پجاری نے کہا۔

''سنا ہے کبھی کبھی منتر اُلٹے بھی ہو جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ اور اُسی وقت ٹیلے کی اوٹ سے دوسرے پجاری کی چیخ سنائی دی۔

''یہ..... یہ کیا ہوا؟'' میرے پاس بیٹھا ہوا پجاری اُچھل پڑا۔

''منتر اُلٹا ہو گیا مہاراج.....'' میں نے کہا۔ ''اب تمہارا منتر میری منتری کے قابو میں آ گیا ہے۔ وہ اُس کی گردن توڑ دے گی۔ اور میں تمہاری گردن مروڑ دُوں گا۔''

''کیا مطلب..... کیا کہہ رہے ہو مورکھ؟'' وہ اُچھل پڑا۔ اُس کے لہجے میں ہلکا سا خوف تھا۔ اُس نے اپنی جگہ سے ہٹنا چاہا تو میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ چھڑانے کے لئے زور آزمائی کرنے لگا اور دوسرے ہاتھ سے اُس نے میرے سینے پر زوردار گھونسہ مار دیا۔ ساتھ ہی وہ اُونچی آواز میں چیخ بھی رہا تھا۔ اگر وہ لاؤڈ اسپیکر پر بھی چیختا تو مجھے پرواہ نہ ہوتی۔ یہاں میلوں دُور تک کوئی اُس کی آواز سننے والا نہیں تھا۔

میں نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور ہم میں زور آزمائی ہونے لگی۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میں بھی اُس کے ساتھ اُٹھتا چلا گیا۔ ٹیلے کے دوسری طرف سے بھی اُٹھا پٹخ اور غرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے شبہ تھا کہ کہیں سیتا اُس کے قابو میں نہ آ جائے۔

میرا حریف درمیانے قد اور چھریرے بدن کا مالک تھا لیکن مجھ سے زیادہ طاقتور نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے پوری قوت استعمال کر رہا تھا۔ اور میرے خیال میں وہ خوفزدہ سا ہو گیا تھا اور مقابلہ کرنے کی بجائے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگنے کے چکر میں تھا..... میں جانتا تھا کہ جب کسی بڑے سے بڑے سورما پر بھی کسی قسم کا خوف طاری ہو جائے تو اُسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی تھی۔

اُس نے مجھے ٹانگ سے اڑنگا دے کر گرانے کی کوشش کی مگر اُس کا اپنا ہی پیر ریت میں دھنس گیا جس سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر گر گیا..... میں بھی اُس کے ساتھ ہی گرا تھا لیکن سنبھل کر فوراً ہی اُس کی گردن گرفت میں کر لی۔ وہ اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن میرے بازو کی لپیٹ بڑی سخت تھی۔ اُس کے منہ سے خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے دونوں پیر ریت پر جمانے کی کوشش کی لیکن پیر ریت میں دھنس رہے تھے۔ اس طرح پوری طاقت استعمال نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ بھی اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے پوری طاقت استعمال کر رہا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ میری کلائی پر تھے اور ٹانگیں بری طرح پٹخ رہا تھا۔

میں نے بازو کو زوردار جھٹکا دیا، اُس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی چیخ نکلی۔ وہ بری طرح مچلا۔ میں نے ایک اور جھٹکا دیا..... اس مرتبہ کڑک کی آواز سنائی دی۔ وہ اس طرح تڑپنے لگا جیسے بیل کو گرفت میں لے کر اُس کے گلے پر چھری پھیر دی گئی ہو..... میں اُس کی گردن کو مسلسل جھٹکے دیتا رہا۔ اگرچہ گردن کی ہڈی پہلے ہی جھٹکے میں ٹوٹ چکی تھی لیکن میں نے اپنی کارروائی

جاری رکھی۔ اور پھر سیتا کی چیخ سن کر چونک گیا.....

''شمروز! پکڑو اُسے..... وہ بھاگ رہا ہے۔'' میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ سیتا کا حریف پجاری اپنے آپ کو سیتا سے چھڑا کر ایک طرف بھاگ رہا تھا۔ اصولی طور پر اُسے اُس طرف بھاگنا چاہئے تھا جس طرف سے وہ آئے تھے لیکن بدحواسی میں اُسے سمت کا خیال نہیں رہا تھا اور وہ صحرا کے اندر بھاگ رہا تھا۔

میں نے اپنے حریف کو چھوڑ دیا۔ وہ ریت پر پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے دوسرے پجاری کی طرف دوڑ لگا دی جو تقریباً پچاس گز دُور جا چکا تھا۔ ریت میں پیر دھنس رہے تھے اور دوڑنے میں خاصی دُشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ پجاری بھی ایسی ہی مشکل سے دوچار تھا اور بار بار گر رہا تھا۔ میں فاصلہ کم کرنے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر اُس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ پجاری دوڑتے ہوئے مدد کے لئے چیخ رہا تھا لیکن ظاہر ہے شہر سے دو میل دُور اس لق و دق صحرا میں اُس کی مدد کے لئے کون آتا؟

وہ ایک بار پھر لڑکھڑا کر گرا اور اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے دُور ہی سے چھلانگ لگا دی..... اُس کا ایک پیر میری گرفت میں آ گیا۔ وہ پھر منہ کے بل گرا۔ اس مرتبہ میں نے اُسے اُٹھنے کا موقع نہیں دیا اور اُس کے اُوپر سوار ہو کر اُس کی گردن گرفت میں لے لی۔ اُس پجاری کی گردن مروڑنے میں، میں نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔

میں کچھ دیر تک کھڑا ہانپتا رہا اور پھر بڑی مشکل سے اُس کی لاش کو ریت پر گھسیٹتا ہوا اُس طرف لے آیا۔ سیتا بھی تقریباً بیس گز میری طرف آ چکی تھی۔ وہ بھی لاش گھسیٹنے میں میری مدد کرنے لگی۔

دوسرا پجاری بھی ختم ہو چکا تھا..... دونوں کی لاشیں قریب قریب ڈال دی گئیں۔ ہم کچھ دیر ریت پر بیٹھے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے پھر اُن دونوں لاشوں کو ٹھکانے لگانے کی سوچنے لگے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز تو تھی نہیں جس سے گڑھا کھودا جاتا۔ ریت نرم تھی، ہم دونوں آرام سے ریت کو ہٹاتے رہے۔

آدھے گھنٹے میں اتنا گڑھا بن گیا کہ ان دونوں لاشوں کو اندر ڈال کر اُوپر ریت ڈال دی گئی۔ گڑھا ہم نے ٹیلے کے دوسری طرف ہوا کے رُخ پر کھودا تھا تاکہ ہوا سے ٹیلے کی ریت اُڑ اُڑ کر اس پر پڑتی رہے۔

میں نے فارغ ہو کر سیتا کی طرف دیکھا، اُس کے جسم پر بہت مختصر لباس تھا۔ سیندوری رنگ کا چوغا پھٹ کر اُس کے جسم سے الگ ہو گیا تھا، یا پھر اُس کمبخت پجاری نے ہی اُسے بے لباس کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اپنا چوغہ سیتا کو دے دیا اور سیتا والا چوغہ چادر کی طرح اپنے اُوپر ڈال لیا۔ میں نے ایک طرف پڑی ہوئی پوٹلیا اُٹھائی اور لودروا کی طرف جانے والے راستے پر تیز تیز چلنے لگے۔ ہم ایک گھنٹہ لیٹ ہو چکے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ مندر میں موجود

پجاری ہم پر شبہ نہ کریں۔

چاند نکل آیا تھا۔ مدھم سی چاندنی میں دُور تک پھیلا ہوا ریگزار بڑا پراسرار منظر پیش کر رہا تھا۔ چاندنی میں مندر کا ہیولہ دُور سے دکھائی دینے لگا۔ چاندنی رات، دُور دُور تک پھیلی ہوئی ویرانی اور اُس ویرانے میں مندر کا ہیولہ بڑا پراسرار لگ رہا تھا۔

ہم مندر سے تقریباً دو سو گز دُور تھے کہ دو ہیولے اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

''وہ ہمارے انتظار میں تھے..... اور میرا خیال ہے وہ ہمیں دیکھتے ہی چل پڑے تھے۔'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ قریب پہنچیں تو تم ذرا الگ ہٹ کر بیٹھ جانا۔ اُنہیں شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ تم عورت ہو۔''

''تم فکر مت کرو..... قریب آنے دو اُنہیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔

ہمارے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ سیتا راستے سے تقریباً دس گز دُور ہٹ کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے فطری ضرورت نے اُسے مجبور کر دیا ہو۔ میں بھی رُک گیا۔

وہ دونوں پجاری قریب پہنچ گئے۔ وہ دونوں ہٹے کٹے اور لمبے تڑنگے تھے۔ وہ میرے سامنے آ کر رُک گئے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر اُنہیں پرنام کیا۔ اُن دونوں نے بھی ہاتھ جوڑ دیئے۔

''دیر ہو گئی مہاراج.....'' میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''راستے میں متر کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، اس لئے آہستہ آہستہ چل کر آ رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں مہاراج.....'' اُن میں سے ایک نے کہتے ہوئے گردن گھما کر سیتا کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے لائق کوئی سیوا ہو تو.....''

''نہیں مہاراج! اب وہ ٹھیک ہو گئی..... میرا مطلب ہے اُس کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ آپ اپنی منزل کھوٹی نہ کریں۔ آپ سدھاریئے!''

اُن دونوں کو 'ہو گئی' کے لفظ پر شبہ نہیں ہوا تھا۔ اور یہ لفظ میرے منہ سے بھی بے اختیار نکل گیا تھا۔ لیکن میں نے بروقت اپنی زبان پر قابو پا لیا تھا۔

''اچھا..... ہم چلتے ہیں۔ جے رام جی کی۔''

''جے رام جی کی۔'' میں نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

وہ تقریباً بیس گز آگے نکل گئے تو سیتا اُٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ ''یہ کیا حماقت تھی.....'' اُس نے مجھے گھورا۔ ''اگر اُنہیں شبہ ہو جاتا تو.....؟''

''اب تو بات ختم ہو گئی نا۔'' میں نے کہا۔ ''چلو! وہ مندر اپنے سیوکوں کا انتظار کر رہا ہے۔''

ہم دونوں چلتے ہوئے مندر کے قریب آ گئے۔ مندر کی عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بس سمجھ لیجئے کہ تقریباً ہزار مربع گز رقبے پر زمین کی سطح سے تقریباً چھ فٹ اُونچی کنکریٹ کی چوکی جس پر وہ عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ اُوپر پہنچنے کے لئے پانچ کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ یہ عمارت دو عریض بارہ دری کی طرح تھی۔ کوئی گیٹ نہیں تھا۔ چاروں طرف سے کھلا ہوا تھا۔ چھت

بڑے بڑے ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ عمارت کے چاروں کونوں پر البتہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ بارہ دری کے وسط میں بڑے ستون کے ساتھ ایک پانچ فٹ اُونچا چبوترہ تھا جس پر ایک بڑی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ اُس مورتی کا سر غائب تھا، ایک بازو بھی نہیں تھا، دوسرا بازو کہنی سے غائب تھا۔ اور یہی ٹوٹا پھوٹا بھگوان جین مت کے پیروکاروں کے لئے مقدس تھا۔

یہ مندر صدیوں پرانا تھا۔ یہ مورتی بھی اُسی وقت یہاں رکھی گئی ہو گی۔ لیکن صدیوں کے حوادث نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا اور بگڑے ہوئے حلیے کا یہی پتھر ہندوؤں کا وہ بھگوان تھا جس کی یاترا کے لئے وہ دُور دُور سے آتے تھے۔ ایک کونے میں واقع کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر کوئی لیمپ یا مشعل جل رہی تھی جس کی زرد روشنی دروازے کے باہر بھی جھلک رہی تھی۔

سیتا دروازے پر رُک کر اندر جھانکنے لگی۔ اور پھر وہ اندر چلی گئی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی اندر آ گیا۔ یہ کمرہ آٹھ بائی آٹھ فٹ سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ آٹھ فٹ اُوپر چاروں دیواروں میں کھڑکیاں تھیں جن میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ اُن سے نیچے کوئی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی۔ البتہ دو دیواروں میں ایک ایک دو دو اینٹیں اُکھڑی ہوئی تھیں۔ ایک سوراخ سے باہر دُور تک ریگستان میں دیکھا جا سکتا تھا جبکہ دوسری دیوار سے مندر کا عقبی کمپاؤنڈ اور وہ اُونچی دیوار نظر آ رہی تھی جس سے اس مندر اور لودروا کھنڈر اور شہر کو ایک دوسرے سے الگ کیا گیا تھا۔

ایک دیوار میں لگے ہوئے کنڈے میں وہ مشعل اٹکی ہوئی تھی جس میں کسی جانور کی چربی جل رہی تھی۔ دروازہ اور چاروں طرف کھڑکیاں کھلی ہونے کی وجہ سے کمرے میں نہ تو مشعل کے دھوئیں کے گھٹن تھی اور نہ ہی چربی جلنے کی تیز بو تھی۔ موم سے ملتی جلتی بو بہت ہلکی تھی اور قابل برداشت تھی۔ فرش پر ایک حصے میں چٹائی بچھی ہوئی تھی جس پر دو آدمی آسانی سے سو سکتے تھے۔ کمرے کی دیوار میں کوئی الماری وغیرہ نہیں تھی۔ ایسی عمارتوں میں عام طور پر دیواروں ہی میں جگہ بنا کر طاقچے یا سلیب وغیرہ لگا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں کچھ نہیں تھا۔ البتہ چاروں دیواروں میں تقریباً چار فٹ کی بلندی پر آٹھ انچ اُونچے اور چھ انچ چوڑے طاقچے بنے ہوئے تھے جن میں یا تو مورتیاں رکھی جاتی ہوں گی یا چراغ جلائے جاتے ہوں گے۔ لیکن اب کچھ نہیں تھا۔

میں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گٹھڑی ایک دیوار کے قریب رکھ دی۔ اُس گٹھڑی میں ہمارے کپڑے اور کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ سیتا نے شہر والے جین مندر کے پنڈت بھولا ناتھ سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ اس مندر میں ایک باورچی خانہ بھی ہے جہاں ضروری برتن موجود ہیں۔ وہاں رہنے والے پجاری اپنا کھانا خود تیار کرتے ہیں۔ سیتا اپنے ساتھ خاصی مقدار میں چاول، مصالحے اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی لے آئی تھی۔ خوراک کے مہر بند ڈبے پھلوں کے علاوہ تھے۔

سیتا تھک گئی تھی۔ وہ فرش پر بچھی ہوئی پیال پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور ٹانگیں آگے کو پھیلا لیں۔ میں بھی تھک گیا تھا۔ میں بھی دوسری دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سیتا کچھ دیر تک

باتیں کرتی رہی۔ پھر اُس نے مزید ٹانگیں پسار لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں بھی تھک چکا تھا اور مجھ پر بھی غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔

کمرے کے دروازے پر کوئی پٹ وغیرہ نہیں تھا جسے بھیڑ لیا جاتا۔ لیکن میرے خیال میں یہاں ہمیں کوئی خطرہ تو نہیں تھا۔ اس ویرانے میں کون آئے گا؟ تھوڑی دیر بعد میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔

میں پتہ نہیں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ سیتا نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے خوابیدار سے لہجے میں پوچھا۔

''باہر کوئی ہے.....!'' سیتا نے سرگوشی کی۔ ''آواز آ رہی ہے..... جیسے کوئی پیر گھسٹ کر چل رہا ہو۔'' اُس کے لہجے میں ہلکا سا خوف بھی تھا۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سیتا میرے اُوپر لدی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے ایک طرف ہٹایا اور آواز سننے کی کوشش کرنے لگا لیکن سناٹے میں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

''یہاں کون آئے گا اس ویرانے میں.....'' میں نے کہا۔ ''تمہارا وہم ہو گا۔ آرام سے سو جاؤ!'' اور ٹھیک اسی لمحہ وہ آواز سنائی دی۔ صاف محسوس ہوا تھا جیسے کوئی پیر گھسٹ کر چل رہا ہو۔ سرسراہٹ کی آواز میرے اعصاب پر طاری ہونے لگی..... قدیم عمارتوں میں بھوتوں اور بدروحوں کی بہت سے باتیں سن رکھی تھیں اور یہ تو مندر تھا..... یہاں نجانے کیا کیا گل کھلتے رہے ہوں گی..... کتنی معصوم عورتوں کی عصمتیں لٹی ہوں گی یہاں..... اُن کی روحیں اب بھی کہیں بھٹک رہی ہوں گی۔

یہ خیال آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... اگر واقعی یہاں بھوتوں یا بدروحوں کا ڈیرہ ہے تو ہم یقیناً پھنس گئے تھے۔ اور شاید اُس وقت سیتا کے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا۔

''وہ کسی کی بھٹکتی ہوئی آتما تو نہیں؟'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' میں نے اُس کے ساتھ اپنے آپ کو بھی تسلی دی۔ ''آؤ..... دیکھتے ہیں باہر کون ہے؟''

سیتا نے جلدی سے پوٹلی کھول کر چاقو نکال لیا۔ ہم اپنے ساتھ کسی قسم کا اسلحہ یا کوئی بھی ہتھیار نہیں لانا چاہتے تھے۔ لیکن سیتا نے مہر بند خوراک کے ڈبے کھولنے کے لئے یہ رام پوری چاقو رکھ لیا تھا۔ اُس نے بٹن دبا کر چاقو کھول لیا۔ اُس کا پھل تقریباً چھ انچ لمبا تھا..... اُس نے چاقو میرے ہاتھ میں تھما دیا اور میرے دائیں بازو سے لپٹ کر کھڑی ہو گئی۔

''اگر واقعی کوئی بدروح ہوئی تو کیا یہ چاقو ہماری کوئی مدد کر سکے گا؟'' میں نے کہا۔

''ہو سکتا ہے وہ کوئی آتما نہ ہو، کوئی انسان ہو۔'' سیتا بولی۔

ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ اُس وقت تیز ہوا چل رہی تھی اور سیٹیاں سی بجتی ہوئی محسوس رہی تھیں۔ پہلے ہم اُس طرف آئے جہاں سے مندر میں داخل ہوئے تھے۔ چاند آسمان کے وسط

میں پہنچ چکا تھا۔ ویرانہ، سرسراتی ہوئی ہوا اور چاندنی..... تینوں نے مل کر ماحول کو خاصا خوفناک بنا دیا تھا۔

اس طرف دُور دُور تک کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہم دوسری طرف آ گئے۔ سیتا نے دونوں ہاتھوں سے میرا بایاں بازو پکڑ رکھا تھا اور وہ میرے ساتھ چپکی ہوئی چل رہی تھی۔

دوسری طرف کمپاؤنڈ خاصا وسیع و عریض تھا۔ وہ دیوار مندر کے چبوترے سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھی۔ اور اُس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ بھی بنا ہوا تھا جس کے قریب ہی لکڑیوں اور خشک جھاڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں کمپاؤنڈ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ بائیں طرف سے وہ آواز سنائی دی۔ سیتا چیختی ہوئی میرے ساتھ لپٹ گئی۔ مجھے بھی سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا..... لیکن دوسرے ہی لمحہ میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

وہ ایک بڑی سی خشک جھاڑی تھی و ہوا کے زور سے ایک طرف سرک رہی تھی اور اُس کے سرکنے سے سرسراہٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسے کوئی پیر گھسٹ کر چل رہا ہو۔

''وہ رہی بدروح..... میں نے دیکھ لیا ہے اُسے۔ اب وہ میرے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکتی۔'' میں نے سیتا کو اپنے سے الگ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ ''بھب..... بھاگو.....'' وہ ہکلائی۔ ''بھاگ چلو یہاں سے..... ہم آتماؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

''دیکھو تو سہی..... کتنی حسین ہے وہ۔ اور اُس کے بکھرے ہوئے بال کتنے لمبے ہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ اُس کے بالوں کو چھو کر دیکھوں۔''

''نہیں نہیں.....'' وہ چیخی۔ ''قریب مت جانا۔ وہ تمہیں مار ڈالے گی۔'' سیتا بہادر لڑکی تھی، اس میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ لیکن اس وقت وہ جس طرح ڈر رہی تھی مجھے اس پر بھی زیادہ حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ روحوں پر ان کا عقیدہ بہت پختہ تھا۔ وہ تلوار سے نہیں ڈرتے تھے لیکن آتماؤں کے نام سے اُن کی جان نکلتی تھی۔

میں نے زبردستی سیتا کو اپنے سے الگ کیا اور جھاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''وہ دیکھو..... وہ ہے بدرُوح جس سے تم ڈر رہی ہو۔''

ٹھیک اُسی وقت جھاڑی نے اپنی جگہ سے پھر حرکت کی، اس کے ساتھ ہی سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ سیتا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اور اُس نے اپنا سر میرے سینے سے ٹکا دیا۔

میں نے اُسے اپنے سے الگ کیا اور چبوترے سے اُتر کر نیچے آ گیا اور وہ جھاڑی اُٹھا کر اس کمرے کے قریب پہنچ گیا جہاں لکڑیوں اور سوکھی ہوئی جھاڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

یہ کوئی باقاعدہ کمرہ نہیں تھا۔ کمپاؤنڈ کی فصیل کے ساتھ دو دیواریں کھڑی کر کے ٹین کی چھت ڈال دی گئی تھی۔ دروازے پر کوئی پٹ وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔

پتھر رکھ کر دو چولہے بنے ہوئے تھے اور کچھ برتن ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔

''یہ کچن ہے.....'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پوٹلی میں ٹارچ بھی رکھی ہوئی ہے۔ لے کر آؤ! دیکھیں اس میں کیا کیا ہے؟''

''ابھی کون سا ہمیں کچھ پکانا ہے..... صبح دیکھ لیں گے۔'' سیتا نے کہا۔

اُس وقت آدھی رات بیت چکی تھی۔ ہم خاصی دیر سو لئے تھے اور اس وقت نیند نہیں آ رہی تھی۔ کمرے میں جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ ہم چبوترے کی سیڑھی پر بیٹھ گئے اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میرا تجسّس بڑھ رہا تھا اور میں لودروا کے اُن کھنڈرات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان لینا چاہتا تھا جہاں دہشت گردی اور تخریب کاری کا کیمپ قائم کیا گیا تھا۔

رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ ریگستان کی ہوا میں خنجر کی سی کاٹ آ گئی تھی۔

''چلو..... اندر چلیں۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' سیتا نے کہا۔

میں نے گردن گھما کر سیتا کی طرف دیکھا۔ اور تب مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اُس نے چوغہ نہیں پہنا تھا۔ اُس کے جسم پر وہی مختصر لباس تھا جو گھر سے روانہ ہوتے وقت چوغے کے نیچے پہنا تھا۔ مختصر سی چولی اور گھٹنوں کے اُوپر تک کا گھاگھرا۔ میں نے بھی چوغا اُتار رکھا تھا۔ میں نے پاجامہ اور کرتہ پہن رکھا تھا لیکن مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ میری ساری زندگی کشمیر کے برف پوش پہاڑوں میں گزری تھی۔ راجستھان کی سردی میرا کیا بگاڑ سکتی تھی؟

ہم کمرے میں آ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ باہر کے مقابلے میں کمرے کی فضا گرم تھی۔ مگر سیتا کو اب بھی سردی لگ رہی تھی اور وہ میرے ساتھ لپٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور پھر وہ اس طرح نیم دراز ہو کر سو گئی کہ اُس کا سر میری گود میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے ہٹانے کی کوشش نہیں کی اور خود بھی آنکھیں بند کر لیں۔

اور پھر تڑتڑاہٹ کی آواز سے میری آنکھ کھلی گئی..... سیتا بھی بدحواس ہو کر اُٹھ گئی۔ تڑتڑاہٹ کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آٹو میٹک رائفلوں کی مسلسل فائرنگ کی آوازیں تھیں۔ میں بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر چھلانگ لگا کر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا..... فائر کی یہ آوازیں کمپاؤنڈ وال کے دوسری طرف سے سنائی دے رہی تھیں۔

''میں تو ڈر ہی گئی تھی۔'' اپنے قریب سیتا کی آواز سن کر میں نے ڈر کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ ''ادھر دہشت گردی کی تربیت کا کیمپ ہے۔ اور ظاہر ہے.....''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہر طرف چٹی دُھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق صبح آٹھ بجے کا وقت ہو رہا ہو گا۔ فصیل کے دوسری طرف سے رہ رہ کر فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اور کبھی کبھار بم کا کوئی

دھماکہ بھی فضا میں گونج پیدا کر دیتا۔

ہم کچھ دیر یہ آوازیں سنتے رہے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ میں نے کچن کا جائزہ لیا۔ وہاں ضرورت کے برتن موجود تھے۔ تین پتیلیاں، چائے دانی اور تام چینی کی تین چار پلیٹیں۔ یہ ساری چیزیں دُھلی ہوئی تھیں اور لکڑی کی ایک چوکی پر رکھی ہوئی تھیں۔ کچن کی دیواریں اور چھت دُھویں سے کالی ہو رہی تھی۔ اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُس کچن میں ایک نلکا بھی تھا جس کے نیچے پلاسٹک کی ایک بالٹی پانی سے بھری ہوئی رکھی تھی۔ نلکے کا پائپ پچھلی دیوار سے نکلا ہوا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مندر کے لئے پانی کا یہ انتظام کیمپ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ کیمپ میں یقیناً پانی کا معتدل انتظام ہو گا اور مجھے یقین تھا کہ کسی بڑے جنریٹر وغیرہ کے ذریعے بجلی کا نظام بھی ہو گا۔ مگر مندر کو بجلی نہیں دی گئی تھی۔

سیتا نے اپنی پوٹلی کھول لی..... اُس میں چائے کی پتی اور خشک دودھ وغیرہ بھی موجود تھا۔ میں نے کچن کے اندر ایک چولہے میں آگ جلا دی اور سیتا چائے تیار کرنے لگی۔

ہم نے مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر چائے پی اور پھر گھوم پھر کر مندر کا جائزہ لینے لگے۔ باقی تین کمروں میں بھی کسی دروازے کے پٹ نہیں تھے۔ وہ تینوں کمرے بھی پہلے کمرے سے مختلف نہیں تھے۔ البتہ ایک کمرہ کسی قدر بڑا تھا اور اُس میں اُوپر جانے کے لئے ایک تنگ سا زینہ بھی تھا جو دیواروں کے ساتھ ساتھ گھومتا ہوا اُوپر چلا گیا تھا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا اور گرد آلود سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔ سیتا بھی میرے پیچھے آ رہی تھی۔

اُوپر کشادہ بالکونیاں تھیں جو نیچے سے بھی نظر آتی تھیں۔ بالکونیوں کے باہر کی طرف تقریباً چار فٹ اُونچی دیوار تھی اور یہ دیوار کئی جگہوں سے ٹوٹ چکی تھی۔ بعض جگہوں پر دیوار تو موجود تھی مگر مختلف جگہوں سے چند اینٹیں نکلی ہوئی تھیں اور ان سوراخوں سے باہر جھانکا جا سکتا تھا۔ ہم دونوں چاروں طرف گھوم کر اس طرف آ گئے جہاں سے کھنڈروں کے اس شہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ کھنڈر مندر کی دیوار سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے سے شروع ہوتے تھے۔ مندر کے آگے وہی اُونچی دیوار تھی جو نجانے کب تعمیر کی گئی تھی اور اُس دیوار سے آگے دونوں طرف خار دار تاروں کی باڑھ تھی جو دُور تک چلی گئی تھی۔ باڑھ تقریباً دس فٹ اُونچی تھی اور اس قدر گنجان تھی کہ انسان تو کیا بلی کا بچہ بھی اُس میں سے نہیں گزر سکتا تھا۔

لودروا نام کا یہ قدیم شہر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بلکہ اُسے ایک گاؤں کہنا ہی مناسب رہے گا۔ گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیدل چلتے ہوئے زیادہ سے زیادہ پچیس تیس منٹ میں فاصلہ طے کیا جا سکتا تھا۔ کئی گلیاں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے چوراہے تھے۔ قدیم کھنڈروں میں چند چھوٹی عمارتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ بعض عمارتیں دو منزلہ تھیں اور میرا خیال تھا کہ ان عمارتوں کو تعمیر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ دو بنگلہ ٹائپ کی عمارتیں بالکل الگ تھلگ کھڑی تھیں۔ گاڑیاں بھی مختلف سمتوں میں آتی جاتی نظر آ رہی تھیں اور کچھ فوجی جیپیں مختلف

جگہوں پر کھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔

کھنڈروں کی اُس بستی کے دوسری طرف صحرا میں ایک جگہ غبار سا اُٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہاں بم کا دھماکہ ہوا تھا۔

''وہ جو بنگلہ نما عمارتیں دیکھ رہے ہو نا.....'' سیتا نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اسرائیلی انٹیلی جنس ''موساد'' کے ماہرین کی رہائش گاہیں ہیں۔ کم از کم چار اسرائیلی ماہرین اس وقت اس بستی میں موجود ہیں۔ انڈین ماہرین بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور اس کیمپ میں کم از کم ڈیڑھ سو نوجوانوں کو تربیت دی جا رہی ہے۔ اگر یہ کیمپ تباہ کر دیا جائے تو تم اپنی قوم کی بہت بڑی خدمت کر سکو گے۔''

''کیا اس کیمپ کی تباہی سے پاکستان میں دہشت گردی اور تخریب کاری کی سرگرمیاں ختم ہو جائیں گی..... اور کیا کشمیر کے حوالے سے انہوں نے جو منصوبہ بنایا ہے وہ خاک میں مل جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کہنا مشکل ہے.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''جودھ پور، اودھے پور اور دوسری جگہوں پر بھی تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت کے کیمپ کام کر رہے ہیں۔ لیکن اسرائیلی ماہرین صرف اسی کیمپ میں ہیں۔ اور یہاں صرف اُن لڑکوں کو تربیت دی جا رہی ہے جنہیں کشمیر بھیجا جائے گا۔ اس لئے تمہارے لئے سب سے پہلے اس کیمپ کو تباہ کرنا ضروری ہے۔''

''لیکن اس کیمپ میں داخل ہونے کا تو کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں کشمیر میں فوجی کیمپوں کی تباہی کا تجربہ ہے۔ یہاں تو اتنی زیادہ سکیورٹی بھی نہیں ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''ویسے ابھی ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ اندر داخل ہونے کی کوئی نہ کوئی ترکیب مل ہی جائے گی۔''

باتیں کرتے ہوئے میں گہری نظروں سے کھنڈروں کی اس بستی کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک شکستہ مکان کے سامنے درخت کے نیچے بیس بائیس آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہو سکتا ہے اُن کی تعداد زیادہ ہو۔ ایک لمبا تڑنگا آدمی اُن کے ساتھ کھڑا ہاتھوں کو مختلف انداز میں حرکت دے رہا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں کوئی چیز بھی تھی لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا دُشوار تھا کہ وہ کیا چیز تھی؟ وہ شخص کیا کہہ رہا تھا؟

اور پھر ایک جیپ کو بستی کی گلیوں میں گھوم کر اس طرف آتے دیکھ کر میں چونک گیا..... وہ جیپ بائیں طرف مُڑ گئی۔ میری نظریں بھی اُس جیپ کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھیں۔ ڈرائیور کے علاوہ جیپ میں صرف ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اب جیپ کا رُخ بستی میں آمد و رفت کے اس گیٹ کی طرف تھا جو بائیں طرف مندر سے تقریباً پانچ سو گز کے فاصلے پر تھا۔ گیٹ کے اندر کی طرف ایک گارڈ رُوم بھی تھا لیکن وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

جیپ گیٹ کے سامنے رُک گئی اور اُسی وقت گارڈز رُوم سے ایک لمبا تڑنگا آدمی نکل کر

سامنے آ گیا۔ اُس نے جیپ میں بیٹھے ہوئے شخص سے کوئی بات کی اور پھر خاردار تاروں والا گیٹ کھول دیا۔ جیپ گیٹ سے نکل کر جیسلمیر شہر کی طرف جانے والے راستے پر دوڑنے لگی۔ وہ راستہ بھی مندر سے تقریباً پانچ سو گز کے فاصلے سے گزر گیا تھا۔ میرا خیال تھا وہ جیپ شہر کی طرف جا رہی تھی۔ لیکن پھر جیپ کا رُخ مندر کی طرف مُڑ گیا.....

''وہ جیپ اسی طرف آ رہی ہے..... نیچے چلو! جلدی۔'' میں نے کہا۔ میں اور سیتا دوڑ کر اُس محراب کے پاس پہنچ گئے جہاں نیچے جانے کے لئے زینہ تھا۔ نیچے آتے ہی سیتا اُس کمرے میں گھس گئی جہاں ہمارا سامان رکھا ہوا تھا۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی تھا۔ ہم دونوں نے زرد کپڑے والے چوغے پہنے اور کمرے سے نکل آئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہمیں اپنی کیا مصروفیات ظاہر کرنی چاہئیں؟ اور پھر ایک ستون کے قریب دو تین جھاڑو دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ رات بھر تیز ہوا سے فرش پر ریت کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس مندر میں پجاریوں کی ڈیوٹی لگانے کا مقصد مندر کی دیکھ بھال تھا۔ اور دیکھ بھال کا مطلب یہ تھا کہ مندر میں ریت جمع نہ ہونے دی جائے۔ میں نے ایک جھاڑو اُٹھا کر سیتا کی طرف اُچھال دیا اور دوسرا خود سنبھال لیا اور ہم دو مختلف سمتوں سے فرش پر ریت صاف کرنے لگے۔

میرے کان جیپ کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک منٹ بعد ہی جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی تو میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔

مزید ایک منٹ بعد جیپ مندر کے سامنے نمودار ہو کر رُک گئی۔ میں اور سیتا اپنا کام چھوڑ کر اُس طرف دیکھنے لگے۔ اگر جیپ کے رُکنے کے بعد بھی ہم اُس پر توجہ دینے کی بجائے اپنے کام میں مصروف رہتے تو ہمارا کردار مشتبہ ہو سکتا تھا۔

وہ آدمی جیپ سے اُتر آیا..... اُس نے جینز کی پتلون اور سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اُس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ کلین شیو اور سر کے بال چھوٹے تھے۔ اُس کی گردن سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آیا تو ہم دونوں نے اُسے پرنام کیا۔ پرنام کرتے ہوئے بھی جھاڑو ہم دونوں کے ہاتھوں میں تھے۔

اُس شخص نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیئے لیکن سیتا کو دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ شاید اُس کے خیال میں یہاں مرد پجاریوں ہی کو ہونا چاہئے تھا مگر یہاں ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر وہ اُلجھ گیا تھا۔ اس دوران ڈرائیور بھی جیپ سے اُتر کر اُوپر آ گیا۔

''حکم کیجئے مہاراج!'' سیتا نے کہا۔ ''آپ کون ہیں اور یہاں کیسے آنا ہوا؟''

''میں اس علاقے کا سکیورٹی انچارج ہوں.....'' وہ شخص بولا۔ ''جگل نام ہے میرا۔ مجھے

معلوم ہے کہ ہر پندرہ دن بعد یہاں پجاریوں کی ڈیوٹی بدل جاتی ہے اور میں یہاں آنے والے پجاریوں کو یہ وارننگ دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ وہ صرف مندر کی سیوا کریں۔ تاروں کی باڑھ میں داخل ہونے کی کوشش اُن کے لئے خطرناک ثابت ہوگی۔ تم لوگوں کو باڑھ کے اندر دیکھ کر کسی وارننگ کے بغیر گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔''

''ہم سمجھ گئے مہاراج!'' میں نے جھاڑو نیچے پھینک کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''ہم صرف مندر کی سیوا کو آئے ہیں..... یہ ہمارا سبھاگیہ ہے کہ ہمیں اس سیوا کے لئے چنا گیا ہے۔ ہم اپنے کام سے کام رکھیں گے۔''

''تمہارا سامان کہاں ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''پوٹلی اس کمرے میں رکھی ہے مہاراج!'' میں نے اشارے سے بتایا۔ ''جگل نامی اُس شخص نے ڈرائیور کو اشارہ کیا وہ کمرے میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد واپس آ کر اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تم لوگوں کے پاس کوئی ہتھیار؟'' جگل نے کہتے ہوئے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

''ہم یوگی اور سادھو لوگ ہیں مہاراج! کسی ہتھیار کا ہمارے پاس کیا کام؟'' میں نے کہا۔

''میں اپنے اطمینان کے لئے تلاشی لینا چاہوں گا۔'' جگل بولا۔

''ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

جگل نے ایک بار پھر ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور میرا چوغہ اُتروانے کے بعد اس طرح میری جامہ تلاشی لینے لگا جیسے کوئی ہتھیار بہت چھوٹی سی چیز ہو جسے پاجامے کے نیفے میں بھی چھپایا جا سکتا ہو۔

ڈرائیور میری تلاشی لے رہا تھا اور جگل خود سیتا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اُس کا چوغہ بھی اُتروا دیا گیا۔ جگل نے چوغہ جھٹک کر اُسے زمین پر ایک طرف ڈال دیا اور سیتا کے لباس کو ٹٹولنے لگا۔ میں کن انکھیوں سے اس طرف دیکھ رہا تھا۔ سیتا اپنا بدن چرانے کی کوشش کر رہی تھی اور جگل اُس کے جسم کو ٹٹول رہا تھا۔ اُس نے سیتا کے گریبان میں بھی ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اُس وقت سیتا کسمسا کر رہ گئی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو سیتا اُس کے چہرے کا نقشہ بدل چکی ہوتی لیکن اس وقت وہ خاموش رہی۔

''ٹھیک ہے.....'' جگل پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تم لوگوں کو خبردار کر دیا ہے۔ تاروں کی باڑ کے قریب جانے کی کوشش مت کرنا ورنہ نتائج کی ذمے داری تم لوگوں پر ہوگی۔''

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''شہر کے مندروں میں تو گوپیوں کو دیکھا ہے لیکن مجھے خیال نہیں تھا کہ تم جیسی حسین لڑکی کو ایسے ویرانے میں بھی بھیج دیا جائے گا۔ کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا؟''

''ڈر کاہے کا مہاراج؟'' سیتا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم دھرم چاری

ہیں..... سیوا ہمارا دھرم ہے۔ ہمیں ڈر کیوں لگنے لگا۔''

''ٹھیک ہے..... شاید تم لوگوں سے دوبارہ ملاقات ہو۔'' جگل نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور سیڑھیاں اُتر کر جیپ میں جا بیٹھا۔ ڈرائیور نے بھی سیٹ سنبھال لی اور انجن سٹارٹ کر کے جیپ کو دائرے کی صورت میں گھماتا ہوا واپس لے گیا۔ جگل بار بار مُڑ کر سیتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں سے اُس کی نیت کو تاڑ لیا تھا۔ اور میرا خیال بلکہ یقین تھا کہ وہ دوبارہ بھی ضرور آئے گا۔ اور اُس وقت تک آتا رہے گا جب تک ہم یہاں ہیں۔''

''کتے کا بچہ.....'' سیتا نے دانت کچکچائے اور اس طرح کپڑے جھاڑنے لگی جیسے اُس کے ہاتھ لگانے سے کپڑے میلے ہو گئے ہوں۔

''شانتی..... شانتی۔'' میں نے کہا۔ ''شانت رہو مائی ڈیئر! اس راستے کا انتخاب تم نے ہی کیا تھا۔ غصہ کرنے یا تلملانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ابھی تو وہ تمہاری صورت دیکھ کر گیا ہے۔ لیکن وہ دوبارہ بھی آئے گا۔ غصہ کھانے کی بجائے بہتر ہے کہ ہم کچھ اور کھانے کے بارے میں سوچیں..... مثلاً ناشتے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اوہ.....'' سیتا مسکرا پڑی۔ ''اُس کمبخت کی وجہ سے میں بھول ہی گئی تھی کہ ہم نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا۔''

ہم نے جھاڑو وہیں چھوڑ دیئے۔ سیتا تھیلے میں سے اُبلے ہوئے مٹروں والا ایک ڈبہ نکال لائی۔ اُس نے پتیلی میں پانی بھر کر چولہے پر رکھ دیا اور جب پانی کھول گیا تو ڈبہ اُس میں ڈال دیا۔ میں پانی کی بالٹی اُٹھا کر باہر لے آیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوا تو سیتا ڈبہ کھول کر ایک پلیٹ میں مٹر نکال چکی تھی۔ دس منٹ ڈبہ کھولتے ہوئے پانی میں رہنے سے مٹر اس طرح گرم ہو گئے تھے جیسے تازہ پکے ہوئے ہوں۔ اُن کے ذائقے میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

ہم مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے مٹر کھاتے رہے۔ یہی ہمارا ناشتہ تھا۔ اس دوران ہم جگل کے بارے میں باتیں بھی کرتے رہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی شرارت کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں جو چمک دیکھی تھی اس سے میں نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔

ہمارے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا سوائے اس کے کہ بیٹھے باتیں کرتے رہتے یا مندر کا معائنہ کرتے رہتے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سب سے پہلے ہم نے مندر کے فرش سے ریت صاف کی کہ ہم اس سیوا کے لئے یہاں آئے تھے۔ اگر یہ بھی نہ کرتے تو جگل کی طرح آنے والا کوئی شخص کسی قسم کے شبہے میں مبتلا ہو سکتا تھا۔

ریت اُڑنے سے ہمارے حلیے بگڑ گئے تھے۔ یہ غنیمت تھا کہ یہاں پانی بھی موجود تھا۔ میں بالٹی بھر کر کھلی جگہ پر بیٹھ گیا اور پاجامے سمیت نہانے لگا۔ نہا کر میں نے تھیلی میں سے دوسرا چوغہ نکال کر پہن لیا اور پاجامہ اور کرتہ دھو کر ریت پر پھیلا دیا۔ میں نے پانی کی بالٹی بھر کر رکھ دی تھی۔

سیتا نہانے بیٹھی تو میں مندر کے سامنے والی طرف کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور رہگزر کی طرف تکنے لگا۔ اُس وقت تقریباً دس بج رہے تھے۔ تیز دُھوپ چمک رہی تھی اور تپش بڑھ رہی تھی۔ دُھوپ میں جھلملاتی ہوئی ریت پر نظریں ٹکانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

اپنے پیچھے ہلکی سی آہٹ پا کر میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ سیتا میرے قریب کھڑی تھی۔ وہ ننگے پیر تھی۔ جسم پر ساڑھی کی طرح زرد چادر لپیٹ رکھی تھی اور بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

''گرمی بڑھ رہی ہے اور ہمیں کئی روز یہاں رہنا ہوگا۔'' وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ابھی تو دس بجے ہوں گے..... جیسے جیسے سورج اُوپر آتا جائے گا گرمی کی شدت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔'' میں نے کہا۔

ہم کافی دیر وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ حدت بڑھ گئی تھی۔ گرم ہوا کے تھپیڑے ہمارے چہروں سے ٹکرا رہے تھے۔ ہم باہر والی سیڑھیوں سے اُٹھ کر مندر کے اندرونی حصے میں آ گئے اور ایک بار پھر گھوم پھر کر مندر کا معائنہ کرنے لگے۔ اس دوران اُوپر کا ایک چکر بھی لگا کر آئے تھے۔

سیڑھیاں اُترتے ہوئے سیتا کا دھکا لگنے سے میں لڑکھڑا گیا۔ سنبھلنے کی کوشش میں میرا ایک پیر سب سے نیچے والی سیڑھی پر دیوار کے بالکل ساتھ پڑا اور مجھے یوں لگا جیسے اُس جگہ پیر کا بوجھ پڑنے سے اینٹ نیچے دب گئی ہو..... میں اُچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ سیتا نے بھی میرے ساتھ ہی چھلانگ لگائی تھی۔

اور پھر ہلکی سی کھٹ کھٹ کی آواز سن کر ہم دونوں چونک گئے..... یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہتی ہو لیکن کوئی رُکاوٹ پیش آ رہی ہو..... یہ آواز سیڑھیوں کے نیچے سے آ رہی تھی۔

میں نے معنی خیز نگاہوں سے سیتا کی طرف دیکھا اور جھک کر سیڑھیوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ کھٹ کھٹ کی بہت ہلکی سی یہ آواز سیڑھیوں کے نیچے دیوار کے بالکل قریب سے آ رہی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس جگہ کو گھورنے لگا۔ مگر اُس جگہ گہری تاریکی تھی اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ہاتھ سے دیوار کو ٹٹولنے لگا۔ دیوار کے ساتھ فرش پر ہاتھ رکھا تو بری طرح چونک گیا۔ میرے ہاتھ کو بہت ہلکا سا جھٹکا لگا تھا..... میں نے ہاتھ اُسی جگہ پر روکے رکھا۔ وہ اینٹ بہت خفیف سے انداز میں اپنی جگہ پر آگے پیچھے حرکت کر رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ اینٹ اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہتی ہو مگر کوئی رُکاوٹ تھی جس سے وہ معمولی سی حرکت کر کے رہ جاتی تھی۔

''یہ..... یہ دیکھو سیتا! یہ اینٹ اپنی جگہ سے حرکت کر رہی ہے۔'' میں نے سیتا سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں مندروں کے اندر خفیہ راستوں اور تہہ خانوں کا تصور اُبھر آیا۔

سیتا میرے قریب بیٹھ گئی۔ اینٹ کو متحرک پا کر وہ بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ کھٹ کھٹ کی ہلکی سی آواز اُس اینٹ سے اُبھر رہی تھی۔

''کوئی گڑبڑ ہے.....!'' سیتا بڑبڑائی۔

''ٹارچ لے کر آؤ! مجھے لگتا ہے یہاں کوئی خفیہ راستہ موجود ہے۔'' میں نے کہا اور سیتا اُٹھ کر اُس کمرے سے باہر چلی گئی۔ ہم اپنے ساتھ ایک ٹارچ اور کچھ فاضل ڈرائی سیل بھی لے کر آئے تھے۔

اُس کمرے میں بھی ریت کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ غالباً یہاں آنے والے پجاریوں نے ہمیشہ مندر کے مرکزی ہال اور اُوپر کی بالکونیوں اور دیواروں وغیرہ کی صفائی پر ہی توجہ مرکوز رکھی تھی اور ان کمروں پر کبھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ ایک رہائشی کمرے کے علاوہ تمام کمروں کے فرش ریت کی تہوں میں چھپے ہوئے تھے۔ میں اُس اینٹ کے آس پاس سے ریت ہٹانے لگا۔

چند منٹ بعد سیتا ٹارچ لے کر آ گئی۔ اُس کی تیز روشنی میں پہلے میں نے اُس اینٹ کا جائزہ لیا۔ وقفے وقفے سے اُس میں بہت معمولی سی حرکت پیدا ہو رہی تھی۔ میں روشنی میں فرش کے دوسرے حصوں اور سیڑھیوں کے نیچے دیوار کا جائزہ لینے لگا لیکن کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا.....

''سیتا.....!'' میں نے کہا۔ ''سب سے نیچے والی سیڑھی پر دیوار کے بالکل ساتھ والی اینٹ پر پیر رکھ کر کھڑی ہو جاؤ!''

سیتا میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی سیڑھی پر ڈالی۔ سب سے نیچے والی سیڑھی سنگ مرمر سے تراشی ہوئی اینٹوں سے بنائی گئی تھی اور اس سے اوپر کی سیڑھیوں کی تعمیر میں عام اینٹیں استعمال کی گئی تھیں۔

سیتا اُس سیڑھی پر دیوار کے بالکل ساتھ ملی ہوئی اینٹ پر پیر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ اینٹ دب گئی اور سیتا اُچھل کر نیچے اُتر آئی۔

''یہ..... یہیں پر کوئی گڑبڑ ہے۔'' وہ اُس اینٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ اُس کے لہجے میں سنسنی کی سی کیفیت نمایاں تھی۔

میں ٹارچ کی روشنی میں اُس اینٹ کا جائزہ لینے لگا۔ وہ دوسری اینٹوں کے برابر آ چکی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ دوسری مرتبہ اس اینٹ کے دبنے سے کھٹ کھٹ کی وہ ہلکی سی آواز ختم ہو گئی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں سیڑھیوں کے نیچے والی اینٹ کا جائزہ لیا۔ اُس میں بھی اب کوئی حرکت نہیں تھی۔ میں نے ٹارچ سیتا کو تھما دی اور اُس کی روشنی میں اُس جگہ سے ریت صاف کرنے لگا۔

میں نے خاصا لمبا چوڑا رقبہ ریت سے صاف کر دیا۔ پورا فرش سنگ مرمر کی اینٹوں کا تھا اور انہیں اس طرح جوڑا گیا تھا کہ اُن میں بہت معمولی سی جھریاں نظر آ رہی تھیں جن میں ریت بھری ہوئی تھی۔ میں ناخنوں سے اُس اینٹ کی اطراف کی جھریوں سے ریت نکالنے لگا۔

سیتا نے ایک بار پھر سیڑھی والی اینٹ کو دبایا۔ فرش والی اینٹ میں پھر حرکت پیدا ہوئی۔ اس مرتبہ یہ حرکت پہلے سے نمایاں تھی۔

''ایک منٹ..... میں چاقو لے کر آتی ہوں۔ اس کی نوک سے ریت صاف کرو!'' سیتا نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس میں اب شبہے کی کوئی بات نہیں رہی تھی کہ سیڑھی والی اینٹ کا کوئی تعلق فرش کی اینٹ سے بھی تھا۔ اندر کوئی ایسا میکنزم تھا جو دونوں میں کوئی رابطہ قائم کئے ہوئے تھا۔ اور اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی خفیہ تہہ خانہ یا خفیہ راستہ موجود ہے۔ سیتا مجھ سے بھی زیادہ سنسنی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ وہ دو منٹ بعد ہی چاقو لے کر واپس آ گئی۔ میں نے چاقو کی نوک سے فرش کی اینٹ کے اطراف کی جھریوں سے ریت اچھی طرح صاف کر دی اور سیتا کو اشارہ کیا۔ وہ سیڑھی والی اینٹ پر پیر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ فرش کی اینٹ میں پھر حرکت پیدا ہوئی۔ اس مرتبہ وہ اپنی جگہ سے تقریباً ایک سینٹی میٹر اُوپر اُٹھ آئی تھی..... مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جھریوں میں ریت بھری ہوئی ہونے کی وجہ سے اس اینٹ کو پوری طرح اُوپر آنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں چاقو کی نوک سے جھریوں میں ریت صاف کرتا رہا۔

تقریباً ایک گھنٹے کی کوشش کے بعد سیڑھی والے پتھر کے میکنزم کو بار بار استعمال کرنے سے فرش کی اینٹ تقریباً تین اِنچ اُوپر آ گئی جسے میں نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر تھوڑی سی محنت سے باہر کھینچ لیا۔ اُس اینٹ کے نیچے تقریباً آٹھ انچ گہرا کھڈ تھا جس میں نیچے ایک آہنی کنڈا لگا ہوا تھا..... میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر سنسنی کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''اس کنڈے کو کھینچو..... یہاں یقیناً کوئی تہہ خانہ ہے۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

میں نے دو اُنگلیاں کنڈے میں پھنسا لیں اور اُسے اِدھر اُدھر حرکت دینے کے بعد اوپر کھینچنے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ ذرا سی کوشش سے کنڈا اُوپر آ گیا..... اور اس کے ساتھ ہی بہت خفیف سی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دینے لگی..... ہم دونوں اُس کنڈے کو دیکھ رہے تھے۔ گرم ہوا ہمارے چہروں سے ٹکرائی تو ہم دونوں نے بیک وقت سر اُٹھا کر دیکھا۔ سیڑھیوں کے نیچے ہمارے سامنے والی دیوار شق ہو رہی تھی اور گرم ہوا اسی خلا سے آ رہی تھی۔ اُس ہوا میں گیس جیسی بو تھی۔ میں جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور سیتا کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے باہر آ گیا۔

ہم دونوں اُس کمرے سے دُور جا کر کھڑے ہو گئے اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگے۔ سیتا بار بار اُس کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے وہاں سے کسی جن کے برآمد ہونے کی توقع ہو۔

''میرا خیال ہے ہندوستان کا کوئی مندر ایسا نہیں جس کے نیچے کوئی تہہ خانہ یا خفیہ راستہ نہ ہو۔'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی طرح مندروں کے پنڈت اور پجاری بھی روز اوّل ہی سے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے ہیں۔'' سیتا نے اس کمرے کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کی ایک معقول وجہ سامنے بھی موجود ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''سیڑھی کی وہ اینٹ جس کے نیچے وہ میکنزم ہے، بالکل دیوار کے ساتھ ہے۔ سیڑھیاں چڑھنے یا اُترنے والا کوئی بھی شخص دیوار کے ساتھ جڑ کر نہیں چلتا۔ عام طور پر سیڑھیوں کے درمیان میں ہی قدم رکھا جاتا ہے۔ اور میرا پیر تو اتفاق سے اس جگہ پر پڑ گیا تھا۔ اگر تمہارا دھکا لگنے سے میں لڑکھڑا نہ جاتا تو میرا پیر اس جگہ پر نہ پڑتا اور ہم بھی اس خفیہ راستے سے لاعلم رہتے اور پندرہ دن تک یہاں جھاڑو دیتے رہتے۔''

جھاڑو دینے والی بات پر سیتا مسکرائے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

ہمیں اُس کمرے سے نکلے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ اس قسم کے تہہ خانے جو طویل عرصہ سے بند ہوں اُن میں زہریلی گیس بھر جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ دیوار شق ہوتے ہی اندر سے خارج ہونے والی ہوا میں، میں نے وہ بو محسوس کر لی تھی اور ہم فوراً وہاں سے پیچھے ہٹ گئے تھے۔

''میکنزم اتنا جام نہیں تھا۔'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے بیس، تیس یا پچاس سال پہلے بھی کسی اور کو اس خفیہ راستے کا پتہ چل گیا ہو۔ بہرحال! ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس تہہ خانے میں ہمارے لئے کیا بچا ہے۔''

مزید آدھا گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد ہم اُس کمرے میں آ گئے..... اب اس خلا سے آنے والی ہوا گرم نہیں تھی اور اُس میں پہلے جیسی بو بھی نہیں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ٹارچ کی روشنی میں اندر جھانکا۔ وہ خلا اتنا کشادہ تھا کہ دو آدمی پہلو بہ پہلو اندر داخل ہو سکتے تھے۔ آگے سیڑھیاں تھیں اور اُن سیڑھیوں پر بھی دو آدمی ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ میں اُس خلا کے اندر داخل ہو گیا..... میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ سب سے پہلے میں نے ٹارچ کی روشنی میں اندر کی طرف سے دیوار اور سیڑھیوں کا جائزہ لیا۔ میں اندر سے اُس راستے کا میکنزم تلاش کرنا چاہتا تھا تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہمارے نیچے اُترنے کے بعد یہ راستہ بند ہو جائے اور یہ مندر ہمارا مقبرہ بن جائے۔

دائیں طرف ایک دیوار کے قریب سیڑھی کے ساتھ ایک آہنی کنڈا نظر آیا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کنڈے کو اپنی طرف کھینچا۔ دیوار کا راستہ بند ہو گیا۔ میں نے کنڈے کو دوبارہ اپنی طرف کھینچا، دیوار دوبارہ شق ہو گئی۔ میں مطمئن ہو کر اُٹھ گیا۔

سیتا بھی اندر آ گئی۔ راستہ بند کرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ اندر کسی قدر گھٹن تھی۔ ہوا کی آمد و رفت کا راستہ بند ہو جانے سے ہمیں سانس لینے میں دُشواری پیش آ سکتی تھی۔

اس بند تہہ خانے میں سانپ اور بچھو وغیرہ بھی ہو سکتے تھے۔ ہم دونوں ننگے پیر تھے اور ٹارچ کی روشنی میں بہت محتاط ہو کر قدم اُٹھا رہے تھے۔

دس سیڑھیوں کے بعد کشادہ لینڈنگ تھی۔ وہاں سے سیڑھیاں دائیں طرف مُڑ گئی تھیں۔ اِ
طرف بھی دس ہی سیڑھیاں تھیں جن کے اختتام پر بہت وسیع و عریض ہال تھا۔ یہ ہال مندر کے
مرکزی ہال کے عین نیچے تھا اور چار بڑے بڑے ستون تھے جنہوں نے چھت کو سہارا دے رکھا
تھا۔ اُس تہہ خانے کے اطراف میں کمرے بھی تھے۔ بعض کمروں کے دروازے غائب تھے اور
بعض میں دروازے موجود تھے۔ میں ایک ایسے کمرے میں داخل ہو گیا جس کا دروازہ نہیں تھا
سیتا بھی میرے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ میں دروازے کے قریب ہی رُک کر ٹارچ کی روشنی میں
اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحہ سیتا چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی.....

وہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا جو بائیں طرف والی دیوار کے قریب فرش پر پڑا ہوا تھا.....
ڈھانچے پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ سیتا مارے خوف کے میرے ساتھ لپٹی جا رہی تھی۔

ہم اُس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے کی طرف آ گئے..... بند دروازہ کھولنے میں مجھے
زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی ہم ایک بار پھر اُچھل پڑے..... اس کمرے کا
منظر پہلے کمرے سے کسی حد تک مختلف تھا۔ کمرے کے وسط میں لکڑی کا ایک صندوق پڑا ہوا تھا
اور اُس کے قریب ہی فرش پر ایک انسانی ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ اُس انسانی ڈھانچے پر لباس موجود
تھا اور وہ پنڈتوں یا پجاریوں والا لباس تھا۔

صندوق کا ڈھکنا چند انچ کے قریب کھلا ہوا تھا۔ میں نے پیر سے وہ ڈھکنا پوری طرح ہٹا دیا
اور جیسے ہی ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی میں اُچھل پڑا..... صندوق کے اندر کچھ طلائی زیورات
پڑے ہوئے تھے جن میں جڑے ہوئے ہیرے ٹارچ کی روشنی میں جگمگا اُٹھے تھے۔

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی تھی۔ اُس نے
جلدی سے جھک کر وہ زیور اُٹھا لئے۔ ایک نیکلس تھا، دو ہیرے کی انگوٹھیاں اور ایک تاج جس
میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ سیتا نے نیکلس اور انگوٹھیاں پہن لیں اور تاج سر پر بالوں میں
پھنسا لیا۔ اُس کا خوف زائل ہو گیا تھا اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

مجھے اس صندوق کی کہانی سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ کوئی اس صندوق میں بھرا ہوا خزانہ چرانے
کی کوشش کر رہا تھا اور پنڈت اُسے بچانے کی کوشش میں مارا گیا تھا اور چور خزانہ لے جانے میں
کامیاب ہو گیا تھا۔ اُس کی عجلت کی وجہ سے یہ چیزیں صندوق میں رہ گئی تھیں جن پر سیتا نے بلا
تردّد قبضہ کر لیا تھا۔

تیسرے کمرے میں ایک الماری تھی جس کے پٹ بھڑے ہوئے تھے۔ میں نے پٹ
کھولے تو ہم دونوں اُچھل پڑے..... تین خانے تھے اور تینوں میں زر و جواہر بھرے ہوئے
تھے..... ایک خانے میں سونے کی دس بارہ مختلف سائز کی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سیتا آگے
بڑھی تو میں نے اُسے روک لیا۔

''فی الحال ان چیزوں کو باہر لے جانا خطرناک ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی انہیں مت

چھیڑو! جب ہمیں جانا ہو گا تو یہ سب کچھ ساتھ لے جائیں گے۔''

بات سیتا کی سمجھ میں آ گئی۔ ہم اُس کمرے سے نکل کر دوسرے کمروں میں دیکھتے رہے۔
ایک کمرے میں ایک اور ڈھانچہ ملا تھا اور یہ بھی کسی عورت کا تھا۔ قریب ہی گرد میں دبے ہوئے
اُس کے کپڑے بھی موجود تھے۔

ہم ایک اور دروازے کے سامنے آ گئے۔ یہ دراصل سرنگ نما راستہ تھا جس کے آگے
جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میں جھاڑیاں ہٹا کر آگے بڑھ گیا اور جیسے ہی سیتا میرے پیچھے اندر
آئی اُس کے منہ سے خوفناک چیخ سن کر میں اُچھل پڑا..... مُڑ کر دیکھا تو میرا دل ہی اُچھل کر
حلق میں آ گیا.....

ایک انسانی ڈھانچہ سیتا سے لپٹا ہوا تھا اور سیتا بری طرح چیخ رہی تھی.....!

○○○

میں سیتا سے تقریباً پانچ گز آگے تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں جو کچھ دیکھا تھا اُس نے مجھے بھی بدحواس کر دیا تھا..... مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہُوا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن میں نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پالیا اور دوڑ کر سیتا کے قریب پہنچ گیا جو بری طرح چیخ رہی تھی۔

وہ انسانی ڈھانچہ سیتا کی پشت پر اس طرح لدا ہوا تھا کہ اُس کے دونوں بازو سیتا کے کندھوں پر سے ہوتے ہوئے اُس کے سینے پر جھول رہے تھے اور اُس کی کھوپڑی سیتا کی گردن سے لگی ہوئی تھی..... لگتا تھا جیسے اُس نے اپنے دانت سیتا کی گردن میں پیوست کر رکھے ہوں۔

یہ صورتحال دیکھ کر میں بھی کانپ اُٹھا..... سنسنی کی ایک لہر میرے پورے جسم میں دوڑتی چلی گئی اور دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس ڈھانچے کو سیتا کے اُوپر سے ہٹایا تو سیتا کی چادر اُس کے ایک ہاتھ کی استخوانی اُنگلیوں میں اُلجھ گئی اور اس طرح زرد رنگ کی وہ چادر بھی سیتا کے اُوپر سے ہٹ گئی..... اُس کے جسم کا بالائی حصہ برہنہ ہو گیا اور وہ چیختی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی..... وہ خوف سے مسلسل چیخ رہی تھی اور اُس کا بدن خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اُس نے مجھے سختی سے اپنی بانہوں کی گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں ایک ہاتھ سے اُس کی پشت تھپتھپانے لگا۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کا رُخ نیچے کی طرف تھا اور اُس کی روشنی میں ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔ نیچے گرنے سے ڈھانچے کے کچھ حصے ٹوٹ گئے تھے۔ سیتا کی چادر کا ایک کونا اب بھی اُس کے ہاتھ کی استخوانی اُنگلیوں میں پھنسا ہوا تھا۔

''ہوش میں آؤ سیتا.....'' میں نے ایک بار پھر اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''تم تو ایک بہادر لڑکی ہو..... ہڈیوں کے ایک ڈھانچے سے ڈر گئیں۔ وہ دیکھو اُس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں۔''

''مم..... میری چادر اُس نے..... پپ..... پکڑ رکھی ہے۔'' سیتا گھگھیائی۔ ''وہ..... وہ مجھے کھینچ رہا ہے۔''

''پاگل ہو گئی ہو..... وہ بے جان ڈھانچہ تمہیں کیسے کھینچ سکتا ہے؟'' میں نے کہا اور چادر کو جھٹکا دے کر ڈھانچے کی اُنگلیوں سے چھڑا لیا۔ میں سیتا کو بزدلی کا طعنہ نہیں دے سکتا تھا۔ ایسی صورتحال سے کوئی بھی دوچار ہوتا تو اُس کی یہی حالت ہوتی۔ وہ ڈھانچہ اگر میرے اُوپر گرتا تو یقیناً میری بھی اسی طرح چیخیں نکل جاتیں۔

سیتا اب بھی میرے ساتھ لپٹی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اُسے اپنی حالت سنبھالنے میں چار پانچ منٹ لگ گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے اپنے آپ سے الگ ہٹا کر چادر اُس کے جسم پر لپیٹ دی اور اس کا پلو کندھے پر سے آگے لا کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُس کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا اور ہاتھ اب بھی کانپ رہے تھے۔

''جو لڑکی موت کے منہ میں چھلانگ لگا کر مجھ جیسے موت کے فرشتے کو گرفتار کرنے نکلی ہو میں اُسے اتنا بزدل نہیں سمجھتا۔'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''انسانوں سے لڑنا اور بات ہے۔ اور یہ ڈھانچے.....'' وہ زمین پر پڑے ہوئے ڈھانچے کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

''یہ تو اور بھی بے ضرر ہیں.....'' میں نے کہا اور ٹارچ کی روشنی میں بکھرے ہوئے ڈھانچے کا جائزہ لینے لگا۔ ڈھانچے کے قریب ہی گرد آلود فرش پر وہ تاج بھی پڑا ہوا تھا جو سیتا کے سر سے گر گیا تھا۔ میرے حلق سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔

''کیا بات ہے..... اس طرح کیوں ہنس رہے ہو؟'' سیتا نے مجھے گھورا۔

''عورت کی جان پر بنی ہو لیکن زیور کے لئے وہ موت کے جبڑوں میں بھی ہاتھ ڈال سکتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرا مذاق اُڑا رہے ہو؟'' وہ چیخی۔

''نہیں..... یہ تاج تم پر اچھا لگ رہا ہے۔ نجانے کس بدقسمت راجکماری کا ہو گا جو تمہارے سر پر آ کر سج گیا ہے۔''

''تم یہ بھول رہے ہو کہ میرے پتا جی بھی ایک ریاست کے راجہ تھے۔ اور میں بھی راجکماری ہوں۔'' سیتا نے کہا۔

''اور اسی لئے تو یہ تاج تمہارے سر پر سج رہا ہے۔'' میں نے جواب دیا اور ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر روشنی کا رُخ اُوپر ہوتے ہی میں اُچھل پڑا..... سیتا بھی اُچھل کر دوبارہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے اُبھر آئے تھے۔

اُس دروازے کے اُوپر ایک تنگ سی دوچھتی تھی جس پر نیچے اُوپر کئی انسانی ڈھانچے پڑے ہوئے تھے..... اس راستے کو جھاڑیاں لگا کر بند کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جھاڑیوں کی کچھ لمبی شاخیں اُوپر دوچھتی تک پہنچی ہوئی تھیں۔ مجھے صورتحال کی تہہ تک پہنچنے میں دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔ سیتا جب اندر داخل ہوئی تھی تو جھاڑیوں کی شاخیں ہلنے سے اتفاق سے وہ ڈھانچہ نیچے آ گیا تھا اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ وہ ڈھانچہ سیتا پر اس طرح گرا تھا جیسے سیتا کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے ہی اُس پر چھلانگ لگائی ہو اور سیتا کا خوفزدہ ہو کر چیخنا کوئی غیر فطری بات نہیں تھی۔''

''واپس چلو..... یہاں سے۔'' سیتا اُوپر رکھے ہوئے اُن ڈھانچوں کو دیکھ کر خوفزدہ لہجے

میں بولی۔ ''مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے۔''

''یہ ڈھانچے میرا یا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔ حالانکہ میرا دل بھی اندر سے کانپ رہا تھا۔ ''لگتا ہے اس مندر کو قتل گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔''

''اسی لئے تو مجھے اپنے دھرم سے نفرت ہوگئی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''ہمارے یہ مندر عبادت گاہیں نہیں قتل گاہیں ہیں۔ کبھی دولت کے حصول کے لئے کسی کا گلا کاٹ دیا جاتا ہے اور کبھی دھرم کے نام پر پتھر کی مورتیوں کے سامنے جیتے جاگتے انسانوں کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ ڈھانچے دیکھ کر اس مندر کے بارے میں بہت سے اندازے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ چلو..... واپس چلیں یہاں سے۔''

''اب ڈرنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اب یہاں نہ پنڈت ہیں اور نہ مورتیاں۔ ذرا آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ یہ سرنگ کس طرف اور کہاں تک جاتی ہے؟ ممکن ہے یہ سرنگ ہمیں کھنڈروں کے شہر کے اندر تک لے جائے۔''

''یہ سرنگ یقیناً شہر کی کسی عمارت تک ہی جاتی ہوگی۔'' سیتا نے کہا۔ ''لیکن ہمیں تہہ خانے میں اُترے ہوئے بہت دیر ہو چکی ہے۔ اگر وہ جنگل کمبخت دوبارہ اس طرف آ گیا تو.....''

''ہم زیادہ آگے نہیں جائیں گے۔'' میں نے سیتا کی بات کاٹ دی۔

ہم ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھنے لگے۔ سرنگ اتنی کشادہ تھی کہ تین آدمی آسانی سے پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ جگہ جگہ مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔ تقریباً بیس گز آگے جا کر سرنگ بائیں طرف مُڑ گئی اور ہم وہیں رُک گئے۔

میں چند لمحے ٹارچ کی روشنی میں آگے کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا اور پھر واپسی کے لئے مُڑ گیا۔ سیتا نے میرا بایاں ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ میرے ساتھ جڑی ہوئی چل رہی تھی۔

واپس ہوتے ہوئے سیتا اُس کمرے میں رُک گئی جہاں الماری میں خزانہ بھرا ہوا دیکھا تھا۔ اُس نے سر پر سے سونے کا تاج، گلے سے نیکلس اور ہیرے کی انگوٹھی اُنگلی سے اُتار کر الماری میں دوسری چیزوں کے ساتھ رکھ دیئے اور ہم تہہ خانے سے باہر آ گئے۔ تہہ خانے کا راستہ بند کر کے میں نے فرش پر دوبارہ ریت پھیلا دی تاکہ صرف اتنی جگہ کو صاف ستھرا دیکھ کر کسی کو شبہ نہ ہو۔

اُس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ لو کے تھپیڑے چل رہے تھے اور اس وقت ہمیں بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ سیتا نے تھیلے میں سے مہر بند خوراک کا ایک ڈبہ نکال لیا اور کچن میں جا کر پانی گرم کرنے لگی تاکہ ڈبے کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈال کر اسے گرم کیا جا سکے۔

وہ بڑا ڈبہ تھا اور اُس میں چکن کی فرائی رانیں تھیں۔

کھانے کے بعد ہم مندر کے مرکزی ہال کے وسط میں مورتی والے چبوترے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ مندر بارہ دری کی طرح چاروں طرف سے

کھلا ہوا تھا۔ صحرا کی طرف سے آنے والی گرم ہوا ہمارے چہروں کو جھلسائے دے رہی تھی اور جسم پسینے میں شرابور تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر واقعی ہمیں دو ہفتے یہاں رہنا پڑا تو ہم گرمی کے ہاتھوں ہی خرچ ہو کر رہ جائیں گے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سیتا اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد اُس نے مجھے بھی آواز دے کر بلا لیا۔

''یہاں زیادہ گرمی نہیں ہے۔'' سیتا نے کہا۔

میں اُس کے قریب ہی پیال پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہاں واقعی زیادہ گرمی نہیں تھی۔ دُھوپ کی تپش کو موٹی دیوار نے روک رکھا تھا اور سنگ مرمر کی جالیوں سے آنے والی ہوا بھی زیادہ گرم نہیں لگ رہی تھی۔

ہم دیر تک بیٹھے مندر کے تہہ خانے میں ڈھانچوں اور الماری میں بھرے ہوئے اُس خزانے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ سیتا کے خیال میں وہ خزانہ کروڑوں روپے کی مالیت کا تھا۔ باتیں کرتے کرتے سیتا اونگھنے لگی..... میری بھی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

چھ بجے کے قریب میں کمرے سے باہر آ گیا۔ سیتا بھی جاگ گئی تھی۔ وہ بھی میرے پیچھے چلی آئی تھی۔ اُس نے بالٹی سے پانی لے کر منہ ہاتھ دھویا اور تھیلے میں سے چیزیں نکال کر کچن میں لے گئی اور چائے تیار کرنے لگی۔

اُس وقت اگرچہ چھ بج رہے تھے لیکن دُھوپ میں اب بھی تپش تھی اور ہوا بھی گرم تھی۔ لیکن جیسے جیسے سورج اُفق پر جھک رہا تھا دُھوپ کی حدت میں کمی آتی جا رہی تھی۔ اور پھر غروب آفتاب کا وہ منظر بہت ہی قیامت خیز تھا..... سورج اُفق پر جیسے اٹک کر رہ گیا تھا اور اُس کی سرخی نے ریگستان کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ لگتا تھا جیسے ہمارے سامنے خون کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔

چائے پینے کے بعد سیتا نے تھیلے میں سے دال چاول نکال لئے اور اُنہیں صاف کر کے اُٹھا ہی ایک پتیلی میں بھگو دیا۔ ایک چھوٹی مشعل کچن کی دیوار میں بھی ٹنگی ہوئی تھی اور کچن ہی میں ایک طرف موم سے بھرا ہوا ایک کنستر بھی رکھا ہوا تھا۔ گرمی سے موم پگھلی ہوئی تھی اور یہی موم مشعلوں میں استعمال ہوتی تھی۔

سورج غروب ہونے کے بعد ہی سیتا نے مشعل بھی جلا دی اور چولہے میں آگ جلا کر دال چاول کی پتیلی چڑھا دی۔ اُس میں چٹکی بھر نمک بھی ڈال دیا تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ ہمارا کھانا اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد تیار ہوا تھا۔ سیتا نے سارے چاول ایک تھالی میں اُلٹ دیئے اور ہم دونوں چبوترے کی سیڑھی پر ہی بیٹھ کر کھانے لگے۔

ابھی ہم کھانا کھا رہے تھے کہ جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہوا کے دوش پر انجن کی آواز کبھی قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتی اور کبھی بہت دُور سے۔

میں اُٹھ کر مندر کے سامنے والے حصے کی طرف چلا گیا۔ چبوترے کے کونے پر پہنچ کر میں کیمپ کے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ پانچ سو گز دُور گیٹ پر تیز روشنی کا بلب جل رہا تھا اور جیپ اُس وقت گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ اُس کے ہیڈ لیمپس روشن تھے۔ جیپ کچھ دُور تک سیدھی چلتی رہی اور پھر اُس کا رُخ مندر کی طرف مُڑ گیا۔

میں دوڑتا ہوا سیتا کے پاس آ گیا۔ ''جیپ اس طرف آ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے وہ جگل کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تم نے اس چادر کے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا..... جلدی سے اندر چلی جاؤ اور اس کے نیچے کپڑے پہن لو! اُس کی آنکھوں میں سور کا بال ہے۔ بڑی خوفناک ہیں اُس کی نظریں۔''

''اگر اُس نے پھر تلاشی لینے کی کوشش کی تو؟'' سیتا اُٹھتے ہوئے بولی۔

''اب اگر اُس نے ایسی کوئی کوشش کی تو میں اُس کے ہاتھ توڑ دُوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اور میرا خیال ہے تمہیں بھی اب اُسے کوئی ایسا موقع نہیں دینا چاہئے۔''

''ٹھیک ہے..... جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔'' سیتا کہتے ہوئے دوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔

میں مندر کے سامنے والے رُخ کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اُس طرف جیپ کے ہیڈ لیمپس کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ اور پھر تقریباً اُسی وقت سیتا بھی باہر آ گئی۔ اُس نے وہی صبح والا لباس پہن لیا تھا اور اُوپر زرد چادر اوڑھ لی تھی۔

جیپ مندر کے قریب رُک گئی تھی۔ جیپ کا رُخ اس طرح تھا کہ اُس کی روشنی مندر کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے دال چاول کھاتے رہے۔

جگل اس وقت اکیلا ہی آیا تھا۔ وہ جیپ کا انجن بند کر کے نیچے اُترا اور جب چبوترے پر چڑھ کر ہماری طرف آیا تو ہم دونوں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور پرنام کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

''اوہو..... مجھے دیر ہو گئی۔'' وہ ہمارے قریب آ کر بولا۔ ''میں تو آپ لوگوں کے لئے کھانا لے کر آیا تھا۔'' اُس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ٹفن آگے کر دیا۔

''بھوجن تو ہم کھا چکے ہیں مہاراج! آپ نے تکلیف کیوں کی؟'' میں نے کہا۔ ٹفن کی طرف نہ میں نے ہاتھ بڑھایا تھا اور نہ سیتا نے۔

''اچھا چلو ٹفن رکھ لو! صبح ناشتے میں کام آئے گا۔'' اُس نے کہتے ہوئے ٹفن سیتا کی طرف بڑھا دیا۔

''یہاں تو گرمی میں خراب ہو جائے گا مہاراج!'' سیتا نے جواب دیا۔ ''آپ یہ واپس لے جائیے۔ کسی اور کے کام آ جائے گا۔''

بات جگل کی سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے اصرار نہیں کیا۔

''آپ بڑے دیالو ہیں مہاراج.....'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ ان پجاریوں کی بھی ایسے ہی سیوا کرتے تھے جو ہم سے پہلے یہاں آتے رہے ہیں؟''

''ہم تو مندر کا راستہ ہی بھولے ہوئے تھے پنڈت جی!'' جگل نے کہا۔ ''ہمارا خیال تھا کہ مندر صرف آپ جیسے مہا پرشوں کے لئے ہے۔ اب یہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ ہمیں بھی مندر کی کوئی نہ کوئی سیوا کرنی چاہئے۔ ہم آپ کی سیوا کریں گے تو یہ مندر کی سیوا ہوگی۔ اگر آپ حکم دیں مہاراج تو میں رات کو یہاں دو سنتری بھیج دیا کروں؟''

''کس لئے.....؟'' میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''آپ کے ساتھ یہ جوان اور سندر دیوی ہیں۔ ان کی رکھشا کے لئے۔'' جگل نے جواب دیا۔

''بھگوان ہماری رکھشا کرے گا۔ آپ ایسی کوئی تکلیف نہ کریں مہاراج!'' میں نے کہا۔

وہ کمبخت تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں رہا۔ اس دوران اُس نے بہت سی باتیں کر ڈالیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اس مندر میں بجلی کی ضرورت ہے۔ کم از کم چار بلب تو ضرور ہونے چاہئیں۔ اُس نے وعدہ کیا کہ اس سلسلے میں وہ اپنے آفیسر سے بات کرے گا۔ ہم نے اُس سے کیمپ کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں پوچھی جس سے اُسے ہم پر کسی قسم کا شبہ کرنے کا موقع ملتا۔ بلکہ اُس نے خود ہی بتا دیا کہ یہاں سرکار ایک اہم اور خفیہ پراجیکٹ پر کام کر رہی ہے اور اس لئے اس مندر میں یاتریوں کی آمد پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

اس مرتبہ اُس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ البتہ اُس کی نظریں زیادہ تر سیتا ہی کا طواف کرتی رہی تھیں۔ اُس کے جانے کے بعد ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ اور سیتا نے پھر چاولوں کی تھالی نکال لی جسے اُس نے سنبھال کر رکھ دیا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم چبوترے کی سیڑھیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اور اس وقت ہمارا موضوع جگل تھا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ آگے چل کر ہمارے لئے کوئی سنگین مسئلہ پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔

''کیوں نہ جگل کو استعمال کرنے کی کوشش کی جائے؟'' سیتا نے کہا۔

''اس میں شبہ نہیں کہ اُس کی نظریں تم پر ہیں..... آج صبح تمہیں دیکھتے ہی اُس کی نیت میں فتور آ گیا تھا۔ اس وقت وہ کھانا بھی لے کر آیا، ہمیں کچھ اور سہولتوں کی پیشکش بھی کی۔ کیا تمہارے خیال میں وہ ہمیں مندر اور اس کے سیوک سمجھ کر ہماری سیوا کر رہا ہے؟'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''یہ سب کچھ تمہارے لئے ہے۔ لیکن وہ اتنا سیدھا سادھا بھی نہیں کہ اتنے بڑے پراجیکٹ کی تباہی میں ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہو جائے۔''

''تم نہیں جانتے عورت میں کتنی طاقت ہوتی ہے.....'' سیتا مسکرائی۔

''جانتا ہوں..... بہت اچھی طرح جان چکا ہوں۔ تم مجھے کشمیر سے یہاں لے آئی ہو۔ عورت کی طاقت کے استعمال کا اس سے بڑا مظاہرہ اور کیا ہوگا؟ لیکن.....'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''جگل کی نیت سے تم واقف ہو چکی ہو۔ اندازہ لگا لو کہ تم

اُسے کہاں تک لے جاسکتی ہو۔''

''میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔ لیکن آزما لینے میں کیا حرج ہے؟'' سیتا نے کہا۔

''یہ تجربہ مہنگا پڑے گا..... اور ہم یہاں تجربات کرنے نہیں آئے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر وہ ہماری آزمائش پر پورا نہ اُترا تو ہم یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکیں گے۔''

سیتا گہرا سانس لے کر خاموش ہوگئی۔

''مجھے تمہاری صلاحیتوں پر کوئی شبہ نہیں۔'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جگل ایک مختلف قسم کا آدمی ہے۔ اُس کی نظریں تمہارے حسن و شباب پر ہیں اور وہ کوشش کرے گا کہ اُس کا مقصد جلد سے جلد پورا ہو جائے۔ اس کے لئے وہ تمہارے ساتھ زبردستی بھی کرسکتا ہے۔ اور جب اُس کا مقصد پورا ہو جائے گا تو اس کے بعد جو کچھ بھی ہوگا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' سیتا نے ایک بار پھر گہرا سانس لیا۔

''اُس نے آج صبح جس انداز میں تمہاری تلاشی لی تھی اس سے تمہیں بھی اُس کی نیت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ ایسا کوئی دوسرا موقع آئے ہمیں اپنے کام کے لئے کوئی ذریعہ تلاش کر لینا چاہئے۔''

''ہمیں اس کیمپ کے اندر داخل ہونے کے لئے کسی نہ کسی جگل کی ضرورت تو پڑے گی۔'' سیتا نے کہا۔ ''اس لئے میرا خیال تھا کہ اسی جگل کو آزما لیا جائے۔ بلکہ اسے اس طرح شکنجے میں کس لیا جائے کہ وہ ہماری بات ماننے سے انکار نہ کرسکے۔''

اس مرتبہ میں سیتا کے خیال سے اختلاف نہیں کرسکا۔ ہم مندر میں بیٹھ کر کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ ہمیں کیمپ میں داخل ہونے کے لئے واقعی کسی آدمی کی ضرورت تھی۔ اور کیمپ کے کسی آدمی تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ اتفاق سے جگل یہاں آ گیا تھا اور سیتا کو دیکھ کر اُس کی رال ٹپک پڑی تھی۔ سیتا کا خیال غلط نہیں تھا۔ رسک ضرور تھا لیکن ایک کوشش کی جاسکتی تھی۔

''ٹھیک ہے.....'' میں نے کہا۔ ''اُسے آزمانے کی کوشش ضرور کریں گے۔ لیکن پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ مندر کے تہہ خانے کی سرنگ ہمیں کہاں لے جاتی ہے۔ اگر اُس سرنگ کے ذریعے ہمیں کوئی محفوظ راستہ مل جاتا ہے تو ہمیں جنگ والا خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔

''ہاں ٹھیک ہے..... پہلے ادھر قسمت آزما لیتے ہیں۔'' سیتا نے کہا۔

''دراصل ہم نے یہاں آنے کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں چاہئے تھا کہ شہر میں رہتے ہوئے اس کیمپ سے تعلق رکھنے والے کسی آدمی کو تلاش کرتے اور اُس کے ذریعے کیمپ کے اندر پہنچنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح ہمیں کچھ کرنے کا موقع مل جاتا۔ لیکن ہم تو کسی پلاننگ کے بغیر اس مندر کی طرف دوڑ پڑے اور دو بندے بھی ہمارے

ہاتھوں مارے گئے۔

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' سیتا بولی۔ ''لیکن حماقتیں انسان ہی سے ہوتی ہیں اور ہم بھی انسان ہی ہیں۔''

ہم دیر تک بحث مباحثے میں اُلجھے رہے لیکن یہ بحث بھی لا حاصل ہی رہی۔ کوئی نتیجہ اخذ نہیں ہوسکا۔

تقریباً دس بجے کے قریب ہم نے دوبارہ تہہ خانے میں اُترنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سے پہلے اُوپر جا کر کھنڈروں کے شہر کا جائزہ لیا۔ رات کے وقت کھنڈروں کا وہ شہر بہت ہی پراسرار قسم کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بکھری ہوئی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ اُن روشنیوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہاں ایک چھوٹا سا بجلی گھر ضرور بنایا گیا ہوگا۔

میں نے کمرے میں جلتی ہوئی مشعل اُٹھا لی۔ سیتا نے احتیاطاً ٹارچ بھی لے لی تھی۔ سیڑھیوں والے کمرے میں ایک بار پھر ریت صاف کرنی پڑی لیکن اس مرتبہ فرش کا وہ پتھر نکالنے میں زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ شق ہونے والی دیوار سے اندر داخل ہونے کے بعد میں نے اندر لگا ہوا کنڈا کھینچ کر راستہ بند کر دیا۔ صبح ہم سے حماقت ہوگئی تھی لیکن اس وقت میں اس راستے کو کھلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

تہہ خانے میں اُتر کر ہم سیدھے اُس سرنگ کی طرف ہی آئے تھے۔ میں نے جھاڑیاں ایک طرف ہٹا دیں۔ سیتا نے میرا بازو پکڑ لیا اور میرے ساتھ چپک کر چلنے لگی۔

بیس گز آگے ہم بائیں طرف مُڑ گئے۔ مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے جن کی وجہ سے ہمیں چلنے میں خاصی دُشواری پیش آ رہی تھی۔ سیتا نے یہ عقل مندی کی تھی کہ ایک لمبی سی لکڑی اُٹھالی تھی جس سے وہ جالے صاف کرتی جا رہی تھی۔

تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم رُک گئے۔ اُس جگہ سرنگ انگریزی کے حرف وائی (Y) کی طرح آگے دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ ''اس طرف چلو..... پہلے ادھر دیکھتے ہیں۔'' سیتا نے بائیں طرف اشارہ کیا۔

''ایسا کیوں نہ کریں کہ تم اس طرف چلی جاؤ اور میں دوسری طرف.....''

''نہ بابا.....'' سیتا نے جلدی سے میری بات کاٹ دی۔ ''میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گی۔''

''تو پھر چلو..... اس طرف چلتے ہیں۔'' میں نے سیتا کی بتائی ہوئی سمت میں اشارہ کیا۔

ہم بائیں طرف والی سرنگ میں داخل ہوگئے۔ کسی قدر گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ گرمی تھی جس سے ہمارے کپڑے بھی پسینے میں تر ہو رہے تھے۔ سیتا نے چادر اُتار کر پٹکے کی طرح کمر سے باندھ لی تھی۔ لیکن ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے گھٹن کم ہو رہی تھی۔ اور کسی طرف سے تازہ ہوا کی آمد کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ اُس سنگم سے روانہ ہو کر تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں رُک جانا پڑا۔ آگے سرنگ بند ہوگئی تھی اور ایک دیوار کے ساتھ اُوپر جانے

کے لئے چند سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ اینٹوں کی یہ سیڑھیاں اگرچہ ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں لیکن استعمال کے قابل تھیں۔ تازہ ہوا یہیں کہیں سے آ رہی تھی۔

میں مشعل کی روشنی میں سرنگ کی چھت اور دیواروں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک جگہ مشعل کا شعلہ حرکت کرنے لگا۔ میں مشعل کو دوبارہ اُسی جگہ لے آیا۔ چھت کے قریب دیوار میں غالباً کوئی چھوٹا سا سوراخ تھا جس سے آنے والی تازہ ہوا مشعل کے شعلے کو متحرک کئے ہوئے تھی۔ میں نے ہاتھ اُس جگہ پر رکھا تو پتہ چل گیا کہ یہاں پر واقعی کوئی سوراخ موجود ہے جس سے ہوا اندر آ رہی تھی۔ میں اگر چاہتا تو کوئی اینٹ اُکھاڑ کر اُس سوراخ کو بڑا کر سکتا تھا لیکن یہ حماقت ہوتی۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہم کھنڈروں والی آبادی کے کس حصے میں تھے؟ اگر باہر سے روشنی کو دیکھ لیا گیا تو ہمارے لئے صورتحال خطرناک ہو سکتی تھی۔

یہاں سرنگ ختم ہو رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ یہاں کوئی نہ کوئی خفیہ راستہ ضرور ہونا چاہئے۔ میں مشعل کی روشنی میں فرش اور دیواروں کا جائزہ لینے لگا۔ سیتا بھی ٹارچ کی روشنی میں کوئی ایسی ہی چیز تلاش کر رہی تھی۔

''یہ..... یہ دیکھو!'' سیتا کی آواز سن کر میں تیزی سے اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بائیں طرف کی دیوار سے ایک اُکھڑی ہوئی اینٹ نکال رہی تھی۔ میں نے مشعل ایک طرف رکھ دی اور دونوں ہاتھوں سے اینٹ کو پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ اینٹ کے پیچھے ایک طاقچہ سا تھا جس میں ایک آہنی کنڈا لگا ہوا تھا۔

''ٹارچ بجھا دو اور اسے اپنے ہاتھ میں ہی رکھو!'' میں نے کہا اور مشعل بجھا کر دیوار کے قریب رکھ دی۔ سیتا نے بھی ٹارچ بجھا دی۔ میں نے اُس کنڈے کو حرکت دی تو مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ کنڈے والی دیوار کا ایک حصہ سرک کر پیچھے ہٹ گیا اور اتنی خلا پیدا ہو گئی کہ ایک آدمی آسانی سے گزر سکتا تھا۔ تازہ ہوا ہمارے چہروں سے ٹکرائی تو جان میں جان آئی۔

ہم اُس خلا سے دوسری طرف نکل آئے۔ یہ اس کھنڈر کا تہہ خانہ تھا جس کی چھت گری ہوئی تھی اور اُس راستے کے سامنے بھی اینٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

میں نے سیتا کو وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھتا ہوا اُوپر آ گیا۔ یہ مکان بالکل کھنڈر بن چکا تھا۔ دو چار شکستہ دیواریں ہی کھڑی تھیں۔ میں بہت محتاط انداز میں چلتا ہوا اُوپر آ گیا اور کھنڈر سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تقریباً سو گز دائیں طرف سامنے والی لین میں ایک بنگلہ نما مکان میں روشنی ہو رہی تھی۔ دوسری روشنیاں اُس سے چند گز آگے تھیں۔ بائیں طرف بھی تقریباً اتنے ہی فاصلے پر اِکا دُکا روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ تاہم اُس کھنڈر کے آس پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جسے آباد کہا جا سکتا۔

میں تین چار منٹ تک وہاں کھڑا صورتحال کا جائزہ لیتا رہا۔ اور پھر اینٹوں کے ڈھیر پر چلتا ہوا نیچے آ گیا اور سیتا کو صورتحال سے آگاہ کرنے لگا۔

''اوہ!'' سیتا چونکنے والے انداز میں بولی۔ ''قریب قریب دو بنگلے یہ یقیناً وہ بنگلے ہیں جہاں ''موساد'' کے ماہرین یا ''را'' کے آفیسر مقیم ہوں گے اور ہمارے لئے بہتر موقع ہے۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کر گزرنا چاہئے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونک گیا۔ اور سیتا مجھے سرگوشیوں میں اپنا مطلب سمجھانے لگی۔ اُس کا خیال برا نہیں تھا۔ ہمیں ایک موقع مل رہا تھا اور ہمیں اس سے فائدہ ضرور اُٹھانا چاہئے تھا۔

''لیکن ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے، جس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں چاقو ساتھ لے آئی تھی.....'' سیتا نے کہتے ہوئے اپنے لباس میں چھپا ہوا چاقو نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

''سب سے پہلے ہمیں اس خفیہ راستے کا باہر والا میکنزم تلاش کرنا پڑے گا۔ ہم اس راستے کو کھلا تو نہیں چھوڑ سکتے۔'' میں نے کہا۔

اور پھر ہم وہ میکنزم تلاش کرنے لگے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ میکنزم باہر کی طرف بھی اس جگہ ہونا چاہئے جہاں اندر کی طرف دیوار میں وہ کنڈا تھا۔ میں وہاں سے اینٹیں ہٹاتا رہا۔ ٹارچ روشن کرنا خطرناک تھا۔ اینٹوں کے نیچے کوئی زہریلا کیڑا یا سانپ، بچھو وغیرہ ہو سکتا تھا۔ لیکن میں اس خطرے سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہا اور مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ اُس طرف بھی ایک کنڈا ہی تھا جسے دو تین مرتبہ استعمال کر کے اطمینان کر لیا۔ سیتا نے اپنی چادر سرنگ کے اندر ڈال دی۔ میں نے بھی اپنا چوغہ اُتار کر اندر پھینک دیا اور کنڈا کھینچ کر راستہ بند کر دیا۔ چند اینٹیں کنڈے کے آگے اس طرح رکھ دیں کہ میں اُن کے پیچھے ہاتھ ڈال کر کنڈے کو استعمال کر سکتا تھا۔ لیکن ان اینٹوں کی وجہ سے دن کی روشنی میں بھی وہ کنڈا نظر نہیں آ سکتا تھا۔

ہم رات کی تاریکی میں کھنڈروں کے اُس شہر میں شکار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے..... ہماری منزل وہ بنگلے تھے جہاں روشنی ہو رہی تھی۔

چاقو میرے ہاتھ میں تھا اور ٹارچ سیتا کے پاس تھی۔ میں نے سیتا کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ کسی بھی موقع پر ٹارچ جلانے کی کوشش نہ کرے۔ چاندنی میں ہر طرف پھیلے ہوئے کھنڈر بڑا پُراسرار تاثر دے رہے تھے اور ان کھنڈرات میں کہیں جلتی ہوئی برقی روشنیاں اس پُراسراریت کو مزید گہرا کر رہی تھیں۔

ہم شکستہ دیواروں اور ملبے کے ڈھیروں کی آڑ لئے آگے بڑھتے رہے۔ ایک جگہ گلی پار کر کے ہم دوسری طرف آ گئے۔ اب ہم اُس لائن میں تھے جس لائن میں قریب قریب وہ دو بنگلے تھے جہاں بتیاں جل رہی تھیں۔

پہلا بنگلہ اب ہم سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا..... ہم دونوں ایک جگہ رُک گئے اور اینٹوں کے ڈھیر کی آڑ سے بنگلے کی طرف دیکھنے لگے۔ بنگلے کے سامنے کمپاؤنڈ وال پانچ فٹ سے زیادہ اُونچی نہیں تھی۔ گلی میں چلتے ہوئے اندر نہیں دیکھا جا سکتا تھا لیکن ہم اُونچی جگہ پر تھے

اس لئے ہمیں وہ لان بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ لان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ گھاس پر تین چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک کافی ٹیبل بھی تھی لیکن کسی ذی رُوح کا نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ہم محتاط انداز میں چلتے ہوئے بنگلے کے پچھلی طرف آ گئے۔ اُس طرف بھی بنگلے کے سامنے مختصر سا لان تھا مگر چار دیواری نہیں تھی۔ دو کھڑکیوں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ دونوں کھڑکیاں مختلف کمروں کی تھیں۔ ہم دبے قدموں ایک کھڑکی کی طرف بڑھتے رہے۔

کھڑکی کے سامنے اندر کی طرف بہت باریک سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے شیشے کے ساتھ آنکھیں لگا کر اندر جھانکا۔ یہ بیڈ رُوم تھا مگر یہاں بھی کوئی انسان نظر نہیں آیا۔ میں نے سیتا کو اشارہ کیا اور ہم دبے قدموں چلتے ہوئے دوسری کھڑکی کی طرف آ گئے اور یہاں شیشے سے آنکھ لگاتے ہی میں اُچھل پڑا..... یہ نشست گاہ قسم کا کمرہ تھا جہاں تین افراد نظر آ رہے تھے۔ دو مرد تھے اور ایک عورت..... مرد غیر ملکی تھے۔ چٹی چمڑی والے اور عورت ہندوستانی تھی۔

اُس عورت کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اُس کا رنگ بھی اگرچہ گورا تھا مگر چٹی چمڑی والوں کے نقطہ نظر کے مطابق اُس کا تعلق رنگ دار نسل سے تھا۔ اُس کا لباس بہت مختصر سا تھا۔ گداز بدن، لانبا قد اور چہرے کے نقوش بڑے تیکھے تھے۔ یوں تو اُس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن سب سے زیادہ کشش اُس کے سینے میں تھی..... سینے کے اُبھاروں کو قابو میں رکھنے کے لئے چولی کا کپڑا کم پڑ رہا تھا۔

دونوں آدمی چٹی چمڑی والے تھے۔ بالفاظ دیگر اُن کا تعلق یورپی نسل سے تھا اور مجھے سو فیصد یقین تھا کہ یہ دونوں اسرائیلی ''موساد'' کے ایجنٹ تھے۔ یہودیوں..... اور ان حرامیوں کی عیاشی کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ اُن دونوں کی عمریں چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوں گی۔ ایک دراز قامت تھا جبکہ دوسرا درمیانے قد اور قدرے بھاری بھرکم جسم کا مالک۔ اُس کا سر درمیان سے گنجا تھا جو بلب کی روشنی میں انڈے کے چھلکے کی طرح چمک رہا تھا۔ اُس نے صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ جسم کے بالائی حصے پر نہ بنیان تھی اور نہ کوئی اور کپڑا۔ جبکہ دراز قد والے نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔

وہ دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹی کافی ٹیبل تھی جس پر انگلش اسکاچ کی بوتلیں اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ دونوں گلاسوں میں شراب موجود تھی۔ وہ لڑکی کبھی ایک کی گود میں جا گرتی اور کبھی دوسرے کی گود میں..... وہ دونوں اُس سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ اُس کے جسم پر چٹکیاں لیتے تو لڑکی ہنس پڑتی۔ ظاہر ہے اُسے اُن کا دل بہلانے کے لئے یہاں بھیجا گیا تھا۔ اُسے اپنے کام میں خاص مہارت حاصل تھی۔ اور وہ اُن کی دلجوئی اور اُن کے جذبات بھڑکانے کا ہر حربہ استعمال کر رہی تھی۔

دراز قد والے نے اپنا گلاس اُٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور ایک جھٹکے سے اُٹھ کر

لڑکی کا بازو پکڑ لیا اور اپنے ساتھی سے کچھ کہا۔ گنجا کندھے اُچکا کر رہ گیا۔ دراز قد والا لڑکی کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ گنجا صوفے پر بیٹھا رہ گیا۔ اُس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ کندھے ڈھلک گئے تھے اور چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی۔ اُسے شاید اپنے ساتھی کی یہ حرکت بری لگی تھی کہ وہ اُس لڑکی کو لے کر چلا گیا تھا۔

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس نے بھی کمرے میں سب کچھ دیکھا تھا مگر اُس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ دراز قامت شخص اُس لڑکی کو لے کر بنگلے کے کسی دوسرے کمرے میں گیا ہوگا۔ لیکن چند سیکنڈ بعد ہی وہ دونوں کسی پہلو والے دروازے سے باہر آ گئے۔ ہم کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے۔ اگرچہ باریک پردہ پڑا ہوا تھا لیکن مدھم سی روشنی میں بھی اُنہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے سیتا کو اشارہ کیا اور ہم دونوں تیزی سے نیچے جھک گئے۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے دوسرے بنگلے کی طرف چلے گئے۔ اور وہ جیسے ہی نگاہوں سے اوجھل ہوئے میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ایک بار پھر اندر جھانکنے لگا۔ اور پھر ٹھیک اُسی وقت ایک پست قامت ہندوستانی آدمی اُس کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ اُس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے گنجے یہودی سے کچھ کہا تو وہ ایک دم چیخ اُٹھا۔

''جاؤ..... بھاگ جاؤ..... مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اور صبح سے پہلے مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔'' اُس نے یہ الفاظ اُردو اور ہندی میں کہے تھے۔ ''اور اُس حرامی امرناتھ سے کہنا صبح سات بجے مجھے رپورٹ کر دے۔ اور دروازہ بھڑ جانا۔ کتے اندر آ جاتے ہیں۔''

اُس ہندوستانی نے کچھ کہا، دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کمرے سے نکل گیا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ہندوستانی اُس کا خدمت گار تھا اور اُس کے جانے کے بعد یہ گنجا یہودی اب اس بنگلے میں اکیلا ہی رہ گیا تھا۔ ہم نے چند منٹ اور انتظار کیا۔ میں نے ایک بار پھر اندر جھانکا۔ وہ گنجا یہودی اس طرح اُداس بیٹھا ہوا تھا جیسے اُس کی ماں مر گئی ہو۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا اور ہم دبے پاؤں دیوار کے ساتھ ساتھ سرکنے لگے۔ اُس بنگلے کے پہلو میں بھی ایک دروازہ تھا جس سے وہ دراز قامت یہودی اور اُس کی ساتھی لڑکی نکل کر دوسرے بنگلے میں گئے تھے۔ دوسرا بنگلہ تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھا اور درمیان میں اینٹیں وغیرہ بکھری ہوئی تھیں۔

دروازے میں داخل ہونے سے پہلے سیتا نے ٹارچ وہیں رکھ دی اور میری طرف دیکھتے ہوئے چولی کی سامنے والی ڈوری کھول کر چولی کو ذرا نیچے کھینچ لیا۔ اس طرح اُس کے سینے کا اوپر کا حصہ برہنہ ہو گیا..... ''نظریں دوسری طرف رکھو! یہ منظر تمہارے لئے نہیں ہے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔ میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

ہم دونوں دبے قدموں اندر داخل ہوئے۔ میرے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا اور سیتا اپنے

شباب کے ہتھیاروں سے لیس تھی۔ وہ مجھ سے دو قدم آگے چل رہی تھی۔ یہ وسیع و عریض کمرہ قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ ان حرامی یہودیوں کے لئے ان کھنڈروں میں بھی ضرورت اور عیاشی کی ہر چیز مہیا کی گئی تھی۔

سیتا نے مجھے وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور خود کمرے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی جہاں وہ گنجا یہودی بیٹھا ہوا تھا۔ میں ایک صوفے کی آڑ میں دبک گیا تھا۔

''ہیلو سر.....!'' سیتا کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ آ گئی تھی۔

میں نے صوفے کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ کمرے کے اندر صوفے پر بیٹھا ہوا وہ گنجا یہودی اُچھل پڑا۔ سیتا کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی..... وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ارے..... کون ہے تو؟'' اُس نے پوچھا۔

''مجھے امرناتھ نے بھیجا ہے.....'' سیتا نے بڑے اطمینان سے یہ نام لے دیا جو کچھ دیر پہلے اس یہودی کے منہ سے سنا تھا۔ ''تمہاری اُداسی دُور کرنے کے لئے۔''

''آؤ..... آگے آؤ!'' وہ بولا۔ ''میں واقعی اُداس تھا۔ وہ حرامی بشارہ اُس لڑکی کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ حالانکہ اُسے میں آج کی رات اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا مگر..... میرے صبر کا پھل مجھے مل گیا۔ تم اُس سے کہیں زیادہ حسین ہو۔ آج کی رات خوب گزرے گی۔''

وہ سیتا کے سامنے رُک گیا۔ پہلے سر تا پا اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا پھر اُسے کندھوں کے قریب دونوں بانہوں سے پکڑ لیا۔ ''آؤ..... وہاں بیٹھو اور مجھے اپنے ہاتھ سے شراب پلاؤ۔ آج مجھے لیزا بہت یاد آ رہی ہے۔'' اُس کی آواز میں ہلکی سی لکنت تھی جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اب تک پی جانے والی شراب اُس کے دماغ پر کسی حد تک اثر انداز ہو چکی تھی۔

''لیزا کون.....؟'' سیتا نے اس انداز میں کہا جیسے وہ لیزا کا نام سن کر جل گئی ہو۔

''اوہ..... وہ میری دوست ہے۔ اسرائیل میں ہے، یہاں نہیں ہے۔ تم فکر مت کرو! وہ ہماری تنہائی میں مخل نہیں ہو گی۔'' گنجے نے کہا۔ ''آؤ..... میرے پاس بیٹھو! کیا نام ہے تمہارا ڈارلنگ؟''

''میرا نام ڈارلنگ ہے.....'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اُس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

گنجے یہودی نے اپنا ایک ہاتھ اُس کی کمر میں حمائل کر دیا اور اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ سیتا اُس کی طرف جھکتی چلی گئی۔ گنجے یہودی نے سیتا کے لبوں پر کس کرنے کے لئے اپنا چہرہ جھکایا تو سیتا ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔

''صبر سے کام لو ڈیئر.....'' وہ اُنگلی سے اُن کے ہونٹوں کو چھوتے ہوئے بولی۔ ''ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔''

سیتا نے ایک گلاس میں شراب انڈیلی اور گلاس اُٹھا کر اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ گنجے یہودی نے ایک چسکی لی اور گلاس اپنے ہاتھ میں لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''بیڈ رُوم میں چلو..... میں یہاں بیٹھے بیٹھے بور ہو چکا ہوں۔''

سیتا نے اُٹھتے ہوئے میز پر سے شراب کی بوتل بھی اُٹھا لی۔ اُس گنجے نے ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس سنبھال رکھا تھا اور دوسرا سیتا کی کمر میں حمائل کر رکھا تھا۔ وہ جیسے ہی بیڈ رُوم میں داخل ہوئے میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر دروازے کے قریب آ گیا۔

سیتا نے شراب کی بوتل بیڈ کے ساتھ ملی ہوئی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ ابھی سیدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ گنجے یہودی نے اُسے دھکا دے کر بیڈ پر گرا دیا اور شراب کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر سیتا پر چھلانگ لگا دی۔ اُس کی یہ حرکت سیتا کے لئے غیر متوقع تھی۔ سیتا اُس کے بوجھ کے نیچے دب گئی۔ وہ ایک لمحہ کو بدحواس ہوئی اور پھر ہنستے ہوئے اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑانے لگی۔

اُس گنجے یہودی پر شاید جنون طاری ہو گیا تھا۔ وہ سیتا کو بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا..... کھینچا تانی سے سیتا کی چولی کی ڈوری ایک کندھے پر سے ٹوٹ گئی اور چولی نیچے لٹک گئی۔ سیتا اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر سائیڈ ٹیبل سے شراب کی بوتل کو گردن سے پکڑ کر اُٹھایا اور اُس گنجے یہودی کے سر پر وار کیا..... لیکن بوتل سر کی بجائے اُس کے کندھے پر لگی۔ وہ کراہ اُٹھا۔ اُس نے سیتا کو چھوڑ دیا اور اُچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ دنیا کی خطرناک ترین انٹیلی جنس ایجنسی ''موساد'' کا ایجنٹ تھا۔ اس قسم کی صورتحال سے پہلے بھی دوچار رہا ہو گا اور ان سے نمٹنا بھی جانتا ہو گا۔ اس وقت بھی اُس نے فوراً ہی صورتحال کو تاڑ لیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ اُس کے ساتھ کسی قسم کا دھوکہ ہوا ہے۔ اُس نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا۔

مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں ایک لمحہ کو اُلجھن سی اُبھری۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ اُس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ سیتا نے بڑی پھرتی سے اُس کا ایک پیر پکڑ لیا۔ وہ منہ کے بل اس طرح گرا کہ اُس کا اُوپر کا آدھا دھڑ بیڈ سے نیچے لٹک گیا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر ٹانگ کو زوردار جھٹکا دے کر پیر کو سیتا کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اس دوران میں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل سے اُس پر ایک اور حملہ کیا۔ یہ وار بھی اوچھا پڑا اور بوتل بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ شراب کے چھینٹے میرے اُوپر بھی پڑے تھے، اُس گنجے یہودی پر اور سیتا پر بھی۔

میں نے پہلے بوتل اُٹھانے کے لئے چاقو بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور یہی مجھ سے غلطی ہوئی

تھی۔ مجھے شروع ہی میں اُس پر چاقو سے حملہ کرنا چاہئے تھا۔

گنجا یہودی اُلٹی قلابازی کھاتا ہوا پلنگ سے گرا۔ اُس کا ایک پیر میرے سینے پر لگا اور میں لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی صوفہ نما سیٹی پر گرا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی یہودی نے میرے اُوپر چھلانگ لگا دی..... میں پھرتی سے ایک طرف ہٹا اور یہودی جیسے ہی سیٹی پر گرا میں نے سنبھل کر چاقو سے اُس پر حملہ کر دیا۔ چاقو اُس کے پہلو میں لگا، لیکن وار زیادہ کاری نہیں تھا۔ یہودی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ لیکن اُس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور پلٹ کر میری کھوپڑی پر زوردار گھونسہ رسید کر دیا..... میرا دماغ جھنجنا اُٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی سی چنگاریاں رقص کرنے لگیں۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ دوسرا گھونسہ میرے سینے پر لگا اور میں کراہتا ہوا سیٹی سے نیچے گر گیا۔ اُس کمبخت میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ اُس کے گھونسے لوہار کے ہتھوڑے کی طرح وزنی تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ تیسرا حملہ کرتا سیتا نے اُس پر چھلانگ لگا دی اور اُسے ساتھ لیتی ہوئی قالین پر گری..... سیتا نے پہلے سے اُسے بانہوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یہودی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر سیتا کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ اُس نے ٹھیک کہا تھا بھوتوں اور بدروحوں سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا جبکہ انسانوں سے مقابلہ کرنا دوسری بات تھی۔ وہ بھی ''را'' کی تربیت یافتہ تھی۔ وہ بزدل نہیں تھی۔ اُس کی جرأت اور بہادری میں پہلے بھی مختلف موقعوں پر دیکھ چکا تھا اور اب بھی وہ اسی دلیری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

گنجے نے کہنیاں چلاتے ہوئے سیتا پر وار کئے۔ ایک کہنی کی ضرب سیتا کی پسلیوں پر لگی۔ وہ کراہ اُٹھی..... لیکن اُس نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ لیکن اس کے بعد لگنے والی ضربوں نے اُس کی گرفت کمزور کر دی۔ گنجا یہودی مچل کر اُس کی گرفت سے نکلا اور اُس نے سائیڈ ٹیبل کی طرف چھلانگ لگا دی۔ وہ ٹیبل کی دراز کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سیتا ہوا میں اُڑتی ہوئی اُس کے اُوپر جا گری اور اُسے ساتھ لیتی ہوئی بیڈ پر ڈھیر ہو گئی.....

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ گنجا یہودی بیڈ سائیڈ ٹیبل سے پستول یا ریوالور نکالنا چاہتا تھا۔ سیتا نے اُسے وہاں سے تو ہٹا دیا تھا لیکن خود اُس کے نیچے دب گئی تھی۔ گنجا اُس کے گلے پر گرفت جمانے کی کوشش کر رہا تھا اور سیتا پوری طرح مزاحمت کر رہی تھی۔

میرے دماغ میں اب تک دھماکے ہو رہے تھے لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا..... چاقو بھی میرے ہاتھ سے نکل کر قالین پر گر گیا تھا۔ میں نے چاقو اُٹھانے کی بجائے اُس گنجے پر چھلانگ لگا دی اور بازو اُس کی گردن میں ڈال کر اُسے پیچھے کھینچنے لگا۔ سیتا مچل کر اُس کے نیچے سے نکل گئی۔

گنجے یہودی نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کسی قدر اُوپر اُٹھایا اور مجھے ایک طرف پٹخ دیا۔ میں قلابازی کھاتا ہوا بیڈ کے دوسری طرف گرا۔ لیکن اس سے پہلے کہ گنجا خود سنبھل سکتا سیتا نے

اُس پر چھلانگ لگا دی اور اُسے بیڈ ٹیبل سے دُور رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔

میں اُٹھ کر اُن کی طرف لپکا ہی تھا کہ ایک آواز سن کر چونک گیا.....

''اے..... یہ کیا ہو رہا ہے..... کون ہو تم لوگ؟''

میں نے آواز کی طرف دیکھا۔ دروازے میں اُس یہودی کا وہی ہندوستانی خادم کھڑا تھا جسے کچھ دیر پہلے اُس یہودی نے رخصت کیا تھا۔ وہ وحشت زدہ سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہ مُڑ کر باہر کی طرف بھاگا۔ یہ ہمارے لئے خطرے کا الارم تھا..... وہ ہندوستانی اگر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو ہماری زندگیوں کی ضمانت بھی نہیں دی جا سکتی تھی۔

میں نے پوری قوت سے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور دروازے کے قریب گرا۔ وہ ہندوستانی اس دوران دوسرے کمرے کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ میں ایک بار پھر اُچھلا اور اُسے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی جا لیا..... وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ اُس کے منہ پر رکھا اور دوسرا بازو اُس کی گردن پر لپیٹ دیا۔ وہ چھوٹے قد اور دُبلے پتلے جسم کا مالک تھا اس لئے اُس پر قابو پانے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔

بھاگتے ہوئے وہ بری طرح چیختا رہا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ اُس کی آواز قریب والے بنگلے یا کسی اور جگہ پر نہ سن لی گئی ہو۔ سناٹے میں تو آواز ویسے بھی دُور تک پھیلتی ہے اس لئے میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اس سے نمٹ کر اُس گنجے یہودی کا بھی قصہ تمام کر دیا جائے۔ کیونکہ اگر کوئی اس طرف آ گیا تو ہمارا بچنا مشکل ہو جائے گا۔

میں اُس کی گردن کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا..... کڑک کڑک کی دو تین آوازیں اُبھریں۔ وہ میری گرفت میں بری طرح مچل رہا تھا۔ میں نے ایک اور زوردار جھٹکا دیا اور اُسی وقت بیڈ رُوم سے فائر کی آواز سن کر چونک گیا.....

میں نے اُس ہندوستانی کو چھوڑ دیا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اُس کے منہ سے خرخراہٹ کی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے بیڈ رُوم کی طرف چھلانگ لگا دی اور دروازے کے قریب ہی ٹھٹک کر رُک گیا..... گنجا یہودی قالین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اُس کے سر سے خون اُبل رہا تھا اور سیتا دو تین قدم دُور کھڑی اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

''اس کمبخت نے دراز سے پستول نکالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میرا ہاتھ اس سے پہلے پستول پر پہنچ گیا۔'' سیتا نے کہا۔

''اب بھاگو یہاں سے.....'' میں نے کہا اور دوڑ کر اپنا چاقو اُٹھا لیا۔ سیتا کی چولی کندھے کا ایک سرا ٹوٹ جانے سے سینے پر لٹکی ہوئی تھی۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے چولی درست کرنے

کی کوشش کی اور دروازے کی طرف لپکی۔ دوسرے کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے پستہ قامت ہندوستانی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ ہوسکتا ہے اُس کی چیخوں کی آواز نہ سنی گئی ہو۔ اگر سنی گئی ہو تو اُس پر زیادہ توجہ نہ دی گئی ہو۔ لیکن گولی چلنے کی آواز نے تو یقیناً ساتھ والے بنگلے میں گنجے یہودی کے دوسرے ساتھی بشارہ اور اُس لڑکی کو چونکا دیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے آس پاس کچھ اور لوگوں نے بھی یہ آواز سن لی ہو.....

میں نے باہر نکلتے ہوئے ایک بار پھر پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ کمرے کی سامنے والی دیوار پر لگی ہوئی گھڑی سوا بارہ کا وقت بتا رہی تھی۔ میں نے سیتا کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ سیتا باہر نکلتے ہوئے دروازے کے قریب رکھی ہوئی ٹارچ اُٹھانا نہیں بھولی تھی۔ اُس کے سیدھے ہاتھ میں پستول بھی موجود تھا۔

ہم اُس بنگلے سے نکل کر عقبی سمت میں بھاگ رہے تھے کہ ساتھ والے بنگلے کی طرف سے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ارے..... کون ہے..... رُک جاؤ!''

اس کے ساتھ ہی فضا فائر کی آواز سے گونج اُٹھی..... گولی ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر گئی۔ سیتا نے بھی مُڑ کر جوابی فائر کر دیا۔

ہم دونوں بکھری ہوئی اینٹوں میں تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ دفعتہً سیتا کو ایک اینٹ سے ٹھوکر لگی۔ وہ بری طرح لڑکھڑا گئی۔ اگر میں اُسے نہ سنبھال لیتا تو وہ منہ کے بل گرتی۔

اُس بنگلے کی طرف سے اب شور کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہم اینٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے پہنچ گئے اور ٹھیک اسی وقت فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھی.. اس مرتبہ آٹومیٹک رائفل استعمال کی گئی تھی لیکن ہم اینٹوں کے ڈھیر کی آڑ مل جانے سے گولیوں سے محفوظ ہی رہے تھے۔

ہم ملبے کے ڈھیر اور کھنڈروں کی شکستہ دیواروں کی آڑ لیتے ہوئے گلی پار کر کے اُس کھنڈر میں پہنچ گئے جہاں سرنگ کا راستہ تھا۔ یہاں سیتا ایک بار پھر پتھروں سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچی تھی۔ فائرنگ کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ وہ لوگ گلی کے دوسری طرف والے کھنڈروں میں اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ میں نے دیوار کے قریب اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے ہاتھ ڈال کر اُس کنڈے کو کھینچا مگر کچھ نہیں ہوا۔ دو تین زوردار جھٹکے دیئے مگر وہ دیوار ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ میرے جسم کے مسام تیزی سے پسینہ اُگلنے لگے..... پورے بدن پر کینچوے سے رینگتے ہوئے محسوس ہونے لگے اور دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

''کیا ہوا.....؟'' سیتا کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔

''میکنزم کام نہیں کر رہا..... شاید جام ہو گیا ہے۔'' میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

''کوشش کرو.....'' سیتا نے کہا۔

آوازیں قریب آ رہی تھیں..... اور پھر اس کھنڈر کے عین سامنے گلی میں دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی.....

''اُس طرف کھنڈروں میں دیکھو.....'' وہ جو کوئی بھی تھا چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''جو بھی نظر آئے گولی مار دو اُسے..... بچ کر نہیں جانا چاہئے۔''

مجھے سینے میں سانس ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا..... موت ہمارے سروں پر پہنچ چکی تھی اور ہمارے فرار کا راستہ بظاہر مسدود ہو چکا تھا..... سیتا کے پاس پستول تھا اور مجھے نہیں معلوم اس میں کتنی گولیاں تھیں؟ اگر پستول کا میگزین بھرا ہوا بھی ہو تو ہم کتنی دیر تک اُن کا مقابلہ کر سکتے تھے؟ چند منٹ..... گویا ہماری زندگی کے چند منٹ رہ گئے تھے.....

سیتا بھی شاید میری ہی طرح سوچ رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

''کوشش کرو شمروز.....'' اُس نے میرے کان کے قریب بہت ہلکی سی سرگوشی کی۔ اُس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ ''وہ لوگ سامنے گلی میں موجود ہیں اور کسی بھی لمحہ کوئی اس طرف آ سکتا ہے۔''

میں نے جھنجھلا کر کنڈے کو زوردار جھٹکا دیا۔ اس مرتبہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی..... دیوار کا ایک حصہ آواز پیدا کئے بغیر آہستہ آہستہ شق ہونے لگا۔ میں نے کنڈے کو چھوڑ دیا اور بڑی احتیاط سے چند اینٹیں دیوار کے ساتھ رکھ دیں تاکہ اگر کوئی اس طرف آ کر تلاش بھی کرے تو کنڈا نظر نہ آ سکے۔ میں نے پہلے سیتا کو اندر دھکیلا اور پھر خود اندر داخل ہو کر اندر والا کنڈا کھینچ لیا۔ دیوار آہستہ آہستہ اپنی جگہ پر آنے لگی۔ تقریباً ایک اِنچ خلا باقی رہ گئی تھی کہ اُوپر اینٹوں کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی اور پھر ایک انسانی ہیولہ دکھائی دیا..... میں نے سیتا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنا سانس روک لیا.....

دیوار کی ایک اِنچ کی خلا بھی غائب ہو گئی۔ باہر سے اینٹوں کے لڑھکنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور ہم دونوں سانس روکے بیٹھے رہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا واپس چلا گیا تھا۔ اگر اُس نے دیوار میں خلا دیکھ لی ہوتی تو اب تک ہنگامہ مچ چکا ہوتا اور ممکن ہے دیوار کو گولیوں سے چھلنی کیا جا چکا ہوتا۔ سامنے گلی سے آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ سیتا میرے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔ میں نے اُسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ ابھی ٹارچ نہ جلائے۔ دیوار میں کسی سوراخ سے ہوا آ رہی تھی اور اُس سوراخ سے باہر روشنی بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

ہم تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے۔ اب سامنے گلی میں آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں تاہم وقفے وقفے سے فائرنگ کی آوازیں بدستور ہماری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں اور یہ آوازیں کبھی قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتیں اور کبھی دُور سے۔ میں نے سیتا کے ہاتھ سے ٹارچ لے کر اُسے ایک لمحہ کو روشن کیا اور زمین پر پڑی ہوئی مشعل اُٹھا کر ٹارچ بجھا دی۔ سیتا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم تاریکی میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔

تقریباً پچیس گز آگے نکل آنے کے بعد میں نے ٹارچ جلا لی۔ ہم کافی دُور نکل آئے تھے اور باہر سے روشنی دیکھ لئے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ ہم ٹارچ کی روشنی میں تیز تیز قدم

اُٹھاتے ہوئے چلتے رہے اور سرنگ کے دوشاخے پر پہنچ کر رُک گئے۔

''اب اس طرف دیکھا جائے.....'' سیتا نے دوسری سرنگ کی طرف اشارہ کیا۔

''پاگل ہوگئی ہو کیا.....؟'' میں نے اُسے گھورا۔ ''اس وقت کھنڈروں کے اس پورے شہر میں ہنگامہ مچا ہوا ہوگا۔ وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کسی شبے کی بناء پر جنگل بھی مندر کی طرف آ نکلے۔ ایسی صورت میں ہمارا مندر میں موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ دوسری سرنگ کو کل یا ایک دو دن بعد دیکھیں گے۔ اس وقت تک یہ ہنگامہ کسی قدر ٹھنڈا پڑ چکا ہوگا۔''

''یہ ہنگامہ آسانی سے ٹھنڈا نہیں ہوگا.....'' سیتا نے کہا۔ ''اس کیمپ میں ایک اسرائیلی ایجنٹ مارا گیا ہے۔ قاتل کی تلاش میں وہ ان کھنڈروں کی ایک ایک اینٹ اُکھاڑ پھینکیں گے۔ ہوسکتا ہے زیر تربیت آدمیوں ہی میں سے کوئی اُن کے قابو آ جائے۔ بعض لوگ ذرا سرکش قسم کے ہوتے ہیں اور مشکل سے قابو میں آتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ شبے کی زد میں آئیں گے۔''

''ہمارے مشن کا پہلا مرحلہ کامیاب ہوگیا..... ہم نے کیمپ میں کھلبلی مچا دی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایک دو دن ہمیں بھی سکون سے بیٹھنا چاہئے تاکہ جنگل جیسے شخص کو ہم پر کسی قسم کا شبہ نہ ہونے پائے۔ اب چلتی رہو! یہاں رُک کر وقت ضائع مت کرو۔''

''ایک منٹ.....'' سیتا بولی۔ ''یہ ڈوری کندھے پر باندھ دو! مجھے بڑی اُلجھن ہو رہی ہے۔'' اُس نے چولی اپنے سینے پر درست کی اور میں نے اُس کے کندھے پر ڈوری کی گرہ لگا دی۔ سیتا نے وہاں سے آتے ہوئے اپنی چادر اور میرا چوغہ بھی اُٹھا لیا تھا۔ یہ دونوں چیزیں اُس نے اپنے بازوؤں پر ڈال رکھی تھیں۔

ہمیں مندر کے تہہ خانے سے باہر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ باہر آنے سے پہلے سیتا نے پستول دیوار کے اندر کی طرف رکھ دیا تھا۔ ہمارے پاس اس پستول کی موجودگی ہمارے لئے موت کا پیغام ثابت ہوسکتی تھی۔ تہہ خانے سے باہر آتے ہی میں نے سیڑھیوں کے نیچے پورے فرش پر ریت پھیلا دی تھی تاکہ فرش صاف ستھرا دیکھ کر کسی کو شبہ نہ ہوسکے۔

میں نے کچن سے ماچس لی اور مشعل روشن کر کے کمرے میں اٹکا دی اور ٹارچ بجھا کر تھیلے میں ڈال دی اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں اور سیتا مندر کی اُوپر والی بالکونی میں کھڑے کھنڈروں کے شہر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں اِدھر اُدھر متحرک نظر آ رہی تھیں جس کا مطلب تھا کہ کیمپ کے اندر ہنگامی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ حرکت کرتی ہوئی روشنیاں بہت دُور دُور تک نظر آ رہی تھیں۔ اور پھر ان متحرک روشنیوں کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ دو گاڑیاں تھیں جن کے اُوپر بھی ایک ایک سرچ لائٹ لگی ہوئی تھیں اور وہ گاڑیاں خاردار جنگلے کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھیں۔ جنگل کے ساتھ ساتھ طویل چکر کاٹ کر وہ گاڑیاں تقریباً چالیس منٹ بعد گیٹ کے قریب تھوڑی دیر کو رُکیں اور پھر آگے بڑھنے

لگیں..... اب اُن کا رُخ مندر کی طرف تھا۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا اور ہم کھلی جگہ سے ہٹ کر دیوار کی آڑ میں ہو گئے۔ وہ دونوں جیپیں تھیں جن کے اُوپر سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں جن کی روشنی خاردار تاروں کے جنگلے پر پڑ رہی تھی۔ مندر کے قریب اُن جیپوں کی رفتار کچھ اور سست ہوگئی۔ سرچ لائٹوں میں جنگلہ پوری طرح نظر آ رہا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لوگ یہ دیکھ رہے تھے کہ کسی جگہ سے جنگلہ تو نہیں توڑا گیا تھا؟

وہ جیپیں تیز روشنی میں جنگلے کو چیک کرتی ہوئی آگے بڑھ گئیں، اور شہر کے اندرونی حصے کی طرف سے آنے والی ایک اور گاڑی کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اُس گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیوں کا رُخ گیٹ کی طرف تھا..... وہ گاڑی وہاں ایک لمحہ کو رُکی اور پھر آگے بڑھنے لگی۔

''وہ گاڑی اسی طرف آ رہی ہے.....'' سیتا نے میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ جنگل کے علاوہ کون ہوسکتا ہے.....'' میں نے جواب دیا۔ ''غنیمت ہے اُسے یہ خیال کافی دیر بعد آیا۔ بہرحال اب نیچے چلو!''

ہم دونوں نیچے اُتر کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ میں نے مشعل اُٹھا کر دروازے کے باہر دیوار میں لگے ہوئے ایک ہُک میں پھنسا دی اور اپنا پجاریوں والا چوغہ پہن لیا۔ سیتا نے بھی زرد چادر ساڑھی کی طرح لپیٹ لی اور پیال پر لیٹ گئی۔ میں بھی اُس سے کچھ فاصلے پر لیٹ گیا۔

میرے کان گاڑی کے انجن کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ تقریباً تین منٹ بعد قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ دو یا اُس سے زیادہ آدمیوں کے قدموں کی آواز تھی..... میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ وہ ٹانگیں سمیٹے کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا۔ قدموں کی آواز کمرے کے سامنے آ کر رُک گئی۔ اور پھر ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''جگاؤ اِن کو.....!''

دوسرے ہی لمحہ میرے پیر پر ٹھوکر لگی اور اس کے ساتھ ہی ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''پنڈت جی..... اُٹھو.....! ضروری کام ہے تم سے۔''

میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں..... اُن میں سے کسی نے ٹارچ جلا رکھی تھی جس کی تیز روشنی میں میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

''کک..... کون ہے..... کیا بات ہے..... کون ہو تم لوگ؟'' میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے چہرے سے بدحواسی عیاں تھی۔

ٹارچ کی روشنی میرے چہرے سے ہٹی تو میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوسکا۔ وہ چار آدمی تھے

جن میں سے تین نے رائفلیں ہماری طرف تان رکھی تھیں اور چوتھے کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ جگل اُن میں نہیں تھا۔

مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا..... کیا ان لوگوں کو ہمارے بارے میں پتہ چل گیا تھا.....؟

میں نے سیتا کو بھی جگا دیا۔ اُس نے مجھ سے بھی زیادہ بدحواسی کا مظاہرہ کیا اور ہم دونوں خوفزدہ سی نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگے.....

صورتحال خاصی سنگین ہوگئی تھی.....!

○○○

وہ چاروں اگرچہ سادہ لباس میں تھے لیکن اُن کا تعلق آرمی یا کسی اور سکیورٹی ایجنسی سے تھا۔ ریوالور والا غالباً اُن کا آفیسر تھا۔ کیونکہ وہی احکامات جاری کر رہا تھا اور ہم سے سوالات کرنے والا بھی وہی تھی۔ اُس کی جگہ اگر جگل ہوتا تو بات مختلف ہوتی۔ میں سمجھ لیتا کہ وہ چیکنگ کے بہانے سیتا کے رُوپ سے نظریں سینکنے کے لئے آیا ہے۔ لیکن وہ جگل نہیں تھا۔ اُس شخص کے چہرے پر جگل سے زیادہ کرختگی تھی اور لگتا تھا کہ وہ کسی بات پر ہمارا لحاظ نہیں کرے گا۔ میں پنڈت تھا اور سیتا گوپی۔ ہم اس مندر کی سیوا کے لئے یہاں آئے تھے۔ پنڈتوں اور پجاریوں کو دیکھ کر تو لوگ ویسے بھی نمسکار کے لئے ہاتھ اُٹھا دیتے تھے۔ مگر اس شخص نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سرد مہری نظر آ رہی تھی۔

''تم لوگ کب سے یہاں ہو؟'' اُس نے باری باری ہم دونوں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''چند روز ہوئے مہاراج!'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم مندر کی سیوا کیلئے یہاں آئے ہیں۔''

''مندر کی سیوا کے لئے کسی پنڈت یا پجاری والی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر شہر سے میلوں دُور اس ویرانے میں ایک ناری کا کیا کام؟'' اُس کی نظریں سیتا کی طرف اُٹھ گئیں۔

''یہ کوئی عام ناری نہیں مہاراج، گوپی ہے۔ دھرم کی سیوک۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دھرم کی سیوا تو کوئی بھی کر سکتا ہے، شہر کی آبادی ہو یا ویرانہ۔ یہ مندر ہے تو بھگوان کا استھان۔ اگر ایک گوپی سیوا کی لگن لے کر یہاں آ گئی ہے تو.....''

''یہاں تمہارے پاس کوئی اور بھی آتا ہے؟'' اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''اس ویرانے میں کون آئے گا مہاراج؟'' میں نے جواب دیا۔ ''پر ہاں..... شری جگل ایک بار یہاں ضرور آئے تھے۔ اُنہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اپنے افسروں سے بات کر کے مندر کے لئے بتی کا بندوبست کر دیں گے۔''

''شری جگل.....'' اُس نے نام دُہرایا۔ ''تمہارا مطلب ہے اس کیمپ کا سکیورٹی انچارج شری جگل ناتھ؟''

''اُنہوں نے یہی بتایا تھا مہاراج!'' میں نے جواب دیا۔ ''اب کے آویں گے تو میں اُنہیں کہوں گا کہ مندر میں بتی کا بندوبست ذرا جلدی کر دیں۔''

''کچھ دیر پہلے..... میرا مطلب ہے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے تم لوگوں نے کیمپ کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں مہاراج..... ہم تو سو رہے تھے۔ آپ لوگوں نے جگایا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کوئی اس طرف بھاگ کر تو نہیں آیا..... میرا مطلب ہے کیمپ کی طرف سے۔ دیوار یا جنگلہ پھاند کر؟'' اُس نے کہتے ہوئے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''ہم سو رہے تھے مہاراج.....'' میں نے اپنا جواب دُہرایا۔ ''ہم نے نہ گولیاں چلنے کی آواز سنی نہ کسی کے دیوار پھاندنے کی۔''

وہ خاموش ہو کر دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اُس نے اپنے ایک ماتحت کو اشارہ کیا، اُس نے اپنی رائفل دوسرے کو تھما دی اور آگے بڑھ کر ہمارے بیگ کی تلاشی لینے لگا۔ دو منٹ بعد ہی اُس نے اُٹھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''تم دونوں ادھر آ جاؤ.....'' پارٹی انچارج نے اشارہ کیا۔

ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ کمرے میں حالانکہ مشعل جل رہی تھی لیکن اُن سب نے اپنی ٹارچیں بھی روشن کر رکھی تھیں۔ آفیسر نے ٹارچ اپنے ایک ماتحت کو تھما دی، ریوالور جیب میں ڈال لیا اور میری جامہ تلاشی لینے لگا۔ اُس نے میرے جسم کو اُوپر سے نیچے تک ٹٹول کر دیکھا اور پھر سیتا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سیتا نے اپنے بدن پر اوڑھی ہوئی چادر زمین پر پھینک دی اور چولی بھی اُتار دی۔

''یہ..... یہ کیا کر رہی ہو تم.....؟'' آفیسر بدحواس سا ہو گیا۔

''تم میری بھی تلاشی لینا چاہو گے۔'' سیتا بولی۔ ''میں تمہیں اپنے شریر کو ہاتھ نہیں لگانے دُوں گی۔ کپڑے اُتار کر پھینک رہی ہوں..... انہیں اچھی طرح چیک کر لو۔ اور چاہو تو نظروں سے میرے شریر کو بھی ٹٹول لو۔ پر میں تمہیں ہاتھ نہیں لگانے دُوں گی۔''

''شما کر دو دیوی جی!'' آفیسر نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے، پھر زمین پر پڑی ہوئی چولی اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی۔ ''آپ کپڑے پہن لیجئے دیوی جی! میں آپ کے شریر کو چھونے کی گستاخی نہیں کر سکتا۔'' یہ شخص جنگل کے مقابلے میں شریف ثابت ہوا تھا۔ اُس نے نظریں بھی جھکا رکھی تھیں۔ سیتا نے چولی پہنی اور پھر چادر بھی اُٹھا کر اوڑھ لی۔

''اگر آ گیا ہو تو ہم مندر کی تلاشی لے لیں مہاراج؟'' اُس نے پہلی مرتبہ مجھے مہاراج کہہ کر مخاطب کیا۔ اس مرتبہ اُس کے لہجے میں نرمی تھی۔

''میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ مگر مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے کیمپ میں ایک درگھٹنا ہو گئی ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''یہاں سرکار کی طرف سے ایک اہم منصوبے پر کام ہو رہا ہے جس پر کچھ بدیشی ماہرین سے بھی مدد لی جا رہی ہے۔'' ڈھائی گھنٹے پہلے کسی نے ایک بدیشی کے بنگلے میں گھس کر اُس کی ہتھیا کر دی ہے۔ اُس کا پستول بھی چوری ہو گیا ہے..... بلکہ اُسے اُس کے پستول سے گولی ماری گئی تھی۔ ایک مقامی آفیسر بھی مارا گیا ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ہو سکتا ہے یہ

کارروائی اندر ہی کے کسی آدمی نے کی ہو..... مگر باہر کا بھی کوئی آدمی ہو سکتا ہے جو کسی طرح اندر گھس گیا ہو۔ یہاں کی سکیورٹی کا انتظام فول پروف ہے مگر.....''

''مجھے یہ سن کر دُکھ ہوا مہاراج!'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''تم یہاں تلاشی لے لو..... اپنی تسلی کر لو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ یہ بھگوان کا استھان ہے۔ یہاں شانتی ملتی ہے۔ من کا سکھ ملتا ہے، ہتیاروں کو یہاں شرن (پناہ) نہیں مل سکتا۔''

آفیسر نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ اطراف میں پھیل گئے۔ ہمارے کمرے کی تلاشی وہ لے چکے تھے۔ اُنہوں نے باقی تینوں کمروں کو بھی چیک کر لیا۔ دو آدمی اُوپر چلے گئے اور ایک باورچی خانے کی طرف۔ آفیسر بھی اُس کمرے میں آ گیا جہاں اُوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی اُوپر جائے گا مگر وہ وہیں رُک کر ٹارچ کی روشنی میں اُس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ میں بھی اُس کے ساتھ تھا۔ ٹارچ کی روشنی سیڑھیوں کے پیچھے دیوار پر رینگتی ہوئی فرش پر اُس جگہ رُک گئی جہاں کنکریٹ کا وہ بلاک کسی قدر نمایاں تھا.....

''یہ اینٹ.....''

''سارا فرش اُکھڑ رہا ہے مہاراج!'' میں نے جلدی سے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''یہ صدیوں پرانا ہے۔ اس کی اینٹیں جگہ جگہ سے اُکھڑ رہی ہیں۔ اُوپر چھت کو دیکھو مہاراج..... اور اُدھر.....'' میں اُسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے آیا اور چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ دیکھو مہاراج..... چھت کا سارا پلستر اُدھڑ گیا ہے۔ دیواروں کی اینٹیں بھی اُکھڑ رہی ہیں۔ ہم شہر واپس جا کر پربندھک کمیٹی سے کہیں گے کہ اس مندر کی مرمت کا وچار کیا جائے ورنہ چند برسوں میں یہ چھت گر جائے گی۔''

آفیسر ٹارچ کی روشنی میں چھت اور دیواروں کا جائزہ لیتا رہا۔ چھت کا پلستر واقعی کئی جگہوں سے اُدھڑا ہوا تھا اور دیواروں پر بھی کئی جگہوں سے اینٹیں اُکھڑی ہوئی تھیں۔

''یہ کام تو سرکار کا ہے مہاراج!'' میں نے کہا۔ ''مندروں کی مرمت تو سرکار کو کروانی چاہئے۔''

''سرکار مندروں کی مرمت اس لئے نہیں کروا سکتی کہ مندروں کا پیسہ سرکار کے خزانے میں نہیں جاتا۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''یہ تو پربندھک کمیٹی کا کام ہے، اُنہیں مرمت کروانی چاہئے۔''

''پر مہاراج.....'' میں نے کہا۔ ''کچھ روز پہلے جانکاری ہوئی تھی کہ سرکار نے مسلمانوں کی کئی مسیتوں (مسجدوں) کو آثارِ قدیمہ قرار دے کر اوقاف کی تحویل میں دے دیا ہے اور اب سرکار کے خرچے پر اُن مسیتوں کی مرمت ہو گی۔ اگر سرکار کے خرچ پر مسیتوں کی مرمت ہو سکتی ہے تو مندر کی کیوں نہیں؟''

''بڑے بے وقوف ہو.....'' اُس نے مجھے گھورا۔ ''وہ سرکار کی ایک الگ پالیسی ہے۔ مسیتوں کو سرکاری تحویل میں لے کر بند کیا جا رہا ہے۔ تم تو پنڈت ہو..... تمہیں مجھ سے زیادہ جانکاری ہونی چاہئے۔''

''سرکار کی پالیسیوں کو ہم کیا سمجھیں سرکار.....'' میں نے بے بسی سے کہا۔ اُس کے تینوں ماتحتوں کے واپس آ جانے سے بات ادھوری رہ گئی۔

''کچھ نہیں سر.....!'' اُن میں سے ایک آفیسر سے کہا۔ ''سب جگہوں پر دیکھ لیا..... بالکل کلیئر ہے۔''

''ٹھیک ہے.....'' آفیسر نے کہا اور پھر میری طرف مُڑ گیا۔ ''شما کیجئے مہاراج۔ اور دیوی جی! آپ سے بھی شما چاہتا ہوں، آپ کی نیند خراب کی۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہم تو سیوک ہیں، دھرم کے بھی اور دیش کے بھی۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ چاروں مندر سے نکل کر جیپ کی طرف چل پڑے۔ میں اور سیتا سیڑھیوں پر رُک گئے۔ وہ چاروں جیپ میں بیٹھ گئے۔ انجن اسٹارٹ ہوا اور جیپ یوٹرن لیتی ہوئی واپس چلی گئی۔ ہم اُس وقت تک وہاں کھڑے رہے جب تک جیپ کیمپ میں داخل نہیں ہو گئی۔

''بچ گئے.....'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا، اور واپس جانے کے لئے مُڑ گئے۔

''تمہاری ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے۔'' سیتا میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ''جب اُس کمبخت نے سیڑھیوں کے پیچھے فرش پر اُس اینٹ کے بارے میں پوچھا تھا تو میں تو کانپ اُٹھی تھی۔ لیکن تم بڑی عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اُسے باہر نکال لائے اور اُس کا دھیان ہٹ گیا۔''

''اگر میں عقلمندی سے کام نہ لیتا تو شاید اُس اُکھڑی ہوئی اینٹ پر اُسے شک ہو جاتا۔ تہہ خانے کا راز کھل جاتا اور موت ہمارا مقدر بنتی..... ہمارے بچاؤ کا کوئی راستہ نہ رہتا۔''

ہم کمرے میں جانے کی بجائے اُوپر چلے گئے اور کیمپ کی طرف دیکھنے لگے۔ متحرک روشنیاں ثابت کر رہی تھیں کہ وہاں یہودی کے قاتلوں کی تلاش کے سلسلے میں سرگرمیاں اب بھی جاری تھیں۔

''اور تم نے وہ کیا حرکت کی تھی؟'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سی حرکت.....؟'' سیتا نے پوچھا۔

''اُن کے سامنے کپڑے کیوں اُتارنے لگی تھیں؟'' میں نے کہا۔

''میں ایسا نہ کرتی تو وہ بھی اُس حرامی جنگل کی طرح میری تلاشی لیتا۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''وہ میرے شریر کو ٹٹولتا، نوچتا۔ اس سے بچنے کے لئے ہی میں نے یہ نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا جو کامیاب رہا۔''

''اگر اس قسم کا کوئی نفسیاتی حربہ ناکام ہو گیا تو سر پکڑ کر روتی رہو گی۔'' میں نے کہا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک اُوپر کھڑے کیمپ کی طرف دیکھتے رہے اور پھر نیچے اپنے کمرے میں آ گئے۔ ہم ایک سنگین صورتحال سے دوچار ہوتے ہوتے بچے تھے۔ دراصل ہم دونوں کی ذہانت کام کر گئی تھی۔ تہہ خانے سے باہر نکلتے ہوئے سیتا نے پستول اندر ہی چھوڑ دیا تھا، اور اگر وہ پستول ساتھ لے آتی اور تلاشی کے دوران برآمد ہو جاتا تو اُسے شناخت بھی کر لیا جاتا اور پھر

ہماری زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ میں نے پہلی عقلمندی یہ کی تھی کہ سیڑھیوں کے نیچے فرش پر ریت پھیلا دی تھی۔ اگر وہ جگہ صاف ستھری ہوتی تو اُکھڑی ہوئی اینٹ کو دیکھ کر اُسے یقیناً شک ہوتا۔ اُکھڑی ہوئی اینٹ پر اُس کی نظر پڑ گئی تھی لیکن میں نے مندر کی خستہ حالی کا رونا رو کر اُس کی توجہ ہٹا دی تھی۔

مسجدوں کا ذکر میں نے جان بوجھ کر چھیڑا تھا، لیکن اس سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ ہندوستان کی اقلیتوں کے حوالے سے ہندسرکار کس قسم کی پالیسیوں پر عمل پیرا تھی۔ کشمیر میں پچھلے 54 برسوں سے جو کچھ ہو رہا تھا وہ میں دیکھ رہا تھا۔ ہندوستان میں بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ آئے دن نسلی فسادات ہندسرکار کی انہی پالیسیوں کی عکاسی کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ بابری مسجد اور رام مندر کا مسئلہ اُٹھا تھا تو انتہا پسند ہندو تنظیموں نے پوری طرح حکومت پر دباؤ ڈالا تھا۔ پاکستان کی سرزمین پر جنم لینے والا لال کشن ایڈوانی مسلمانوں اور بابری مسجد کے خلاف چلائی جانے والی تحریکوں میں پیش پیش تھا اور وہی ایڈوانی آج کل ہندوستان کا وزیر داخلہ بنا ہوا تھا۔ اُس جیسے انتہا پسند اور متعصب اور کٹر ہندوؤں کے ہوتے ہوئے ہندوستان میں آباد اقلیتیں سکھ کا سانس نہیں لے سکتیں۔ مسلمانوں کے ساتھ تو 54، 55 سال سے پنگے بازی ہو رہی تھی، اب اُنہوں نے عیسائیوں کا جینا بھی حرام کر دیا تھا۔ گرجا گھروں کو نذرِ آتش کیا جا رہا تھا، پادریوں کو زندہ جلایا جا رہا تھا۔ یسوع مسیح کے ماننے والوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اور اب متعصب ہندوؤں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا تھا۔ ہندوستان کی سینکڑوں قدیم مسجدوں کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ یہ مسجدیں مندروں کی جگہ بنائی گئی ہیں اور اب انہیں توڑ کر دوبارہ مندر بنایا جائے گا۔ ہندسرکار اُن کٹر اور متعصب ہندوؤں کا پوری طرح ساتھ دے رہی تھی۔ انتہا پسند ہندو تنظیموں نے جن سینکڑوں مسجدوں کی نشاندہی کی تھی ہندسرکار نے اُنہیں آثارِ قدیمہ قرار دے کر اُنہیں اوقاف کی تحویل میں دے دیا تھا اور اُن پر تالے ڈال دیئے گئے تھے۔

''یہی تو سرکار کی پالیسی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''لڑاؤ اور حکومت کرو۔ سیاسی شرانگیزیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں مگر ہندو حکمرانوں کو زیادہ فائدہ نسلی فسادات سے ہوتا ہے۔''

''سکھوں کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا ہے.....'' میں نے جواب دیا۔ ''اُن پر غداری کے الزامات لگا کر اُن کے حقوق سلب کئے گئے۔ یہاں تو کوئی بھی اقلیت محفوظ نہیں ہے۔''

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نیند آنے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور ہمیں یہ رات باتوں ہی میں گزارنی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور سیتا میرے گھٹنے پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور ہم باتیں کرتے رہے۔ ایک کے بعد دوسرا موضوع چھڑ جاتا۔

رات آنکھوں میں بیت گئی۔ رات کا اندھیرا رخصت ہونے لگا تھا۔ بس یہ شائبہ تھا کہ دن کا اُجالا جنم لینے والا ہے۔ بیٹھے بیٹھے میری کمر دُکھنے لگی تھی۔ سیتا اُس وقت اونگھ رہی تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اُسے اپنے سے الگ ہٹایا اور لیٹنا ہی چاہتا تھا کہ ایک آواز سن کر چونک گیا.....

پہلے تو میں نے اُسے اپنا واہمہ سمجھا لیکن پھڑ پھڑاہٹ کی وہ آواز بتدریج واضح ہوتی چلی گئی.....

''ہیلی کاپٹر.....!''

ہاں وہ ہیلی کاپٹر ہی تھا جس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سیتا کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

''کیا ہے.....؟'' وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''یہ آواز سن رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''کیسی آواز.....؟'' وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اُس کے دماغ پر غالباً نیند کا خمار طاری تھا اور وہ بدحواس سی نظروں سے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''ہیلی کاپٹر.....'' میں نے کہا۔ ''فضا میں ہیلی کاپٹر کی آواز سن رہی ہو؟''

سیتا نے سر کو ایک دو جھٹکے دیئے اور پھر وہ بھی چونک گئی اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اب اُس کے حواس قابو میں آ چکے تھے۔

''تم یہیں بیٹھو..... میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔'' میں اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

''میں بھی چلتی ہوں۔'' سیتا بھی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ ہیلی کاپٹر کی آواز دائیں طرف سے آ رہی تھی لیکن وہ دکھائی نہیں دیا۔ میں نے مندر کے باہر کھلی جگہ پر نکلنا مناسب نہیں سمجھا اور سیڑھیوں والے کمرے میں گھس گیا۔ سیتا بھی میرے پیچھے ہی تھی۔

ہیلی کاپٹر کی آواز ہمارے سروں کے عین اُوپر سنائی دے رہی تھی۔ ہم دیوار کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ فضا میں ابھی اندھیرا سا تھا۔ زیادہ دُور تک کوئی چیز واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ہیلی کاپٹر مندر کے اُوپر سے گزر کر کیمپ کی طرف آ گیا۔ اُس کی بتیاں جل رہی تھیں اور نیچے کی ایک سرچ لائٹ بھی روشن تھی۔ کاپٹر کا رُخ کیمپ کے مشرقی حصے کی طرف تھا جبکہ وہ بنگلہ مغرب کی طرف تھا جہاں رات کو ہم نے ایک یہودی ایجنٹ اور اُس کے ہندوستانی خدمتگار کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔

ہیلی کاپٹر زمین پر اُتر گیا..... مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہاں کوئی ہیلی پیڈ تھا اور کاپٹر یقیناً پہلے بھی آتے رہتے ہوں گے۔ اُس کاپٹر کے لینڈ کرنے کے تقریباً دس منٹ بعد کھنڈروں کے مغربی حصے سے تین گاڑیوں کی روشنیاں نظر آنے لگیں..... وہ روشنیاں کھنڈروں میں چکر کھاتی ہوئی مشرق کی طرف جا رہی تھیں۔ اور بالآخر کاپٹر کے قریب پہنچ کر رُک گئیں۔

کاپٹر کی ساری سرچ لائٹیں روشن تھیں۔ آس پاس کا وسیع علاقہ بھی روشنی کی زد میں تھا۔ اور اب ویسے بھی تاریکی چھٹ گئی تھی اور دن کا اُجالا پھیلنے لگا تھا اور ہیلی کاپٹر اور گاڑیوں کے آس پاس کچھ لوگوں کی نقل و حرکت بھی دکھائی دینے لگی تھی۔

دو اسٹریچر اُن گاڑیوں سے اُتار کر ہیلی کاپٹر میں منتقل کر دیئے گئے۔ ان کے ساتھ دو آدمی بھی ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گئے اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کاپٹر آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہونے لگا۔ کاپٹر نے دوسری طرف کا ایک چکر لگایا اور فضا میں بتدریج بلند ہوتا ہوا ہماری طرف آنے لگا۔ ہم دیوار کی آڑ میں اس طرح کھڑے ہو گئے کہ اُوپر سے ہمیں نہ دیکھا جا سکے۔

اب دن کی روشنی پھیل رہی تھی اور ہر چیز واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ وہ فوجی ہیلی کاپٹر تھا جو مندر کے اُوپر سے گزر کر جیسلمیر کی طرف چلا گیا تھا۔ میں مُڑ کر سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔

''اُن دونوں کی لاشیں بھیجی گئی ہیں۔'' سیتا نے کہا۔

''اُن کے ساتھ دو آدمی بھی گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا ایسا ممکن ہے کہ اپنے ایک ساتھی کی ہلاکت کے بعد اسرائیلی ایجنٹ واپس چلے گئے ہوں؟''

''صرف دو آدمی گئے ہیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اگر وہ دونوں یہودی بھی تھے تو کم سے کم پانچ اسرائیلی ایجنٹوں کو یہاں موجود ہونا چاہئے۔ کیونکہ میری معلومات کے مطابق اس کیمپ میں ٹریننگ کے لئے آٹھ یہودی ایجنٹوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ایک مر گیا۔ اگر دو چلے گئے تو پانچ کو اب بھی کیمپ میں موجود ہونا چاہئے۔''

کیمپ میں اب زندگی بیدار ہو رہی تھی۔ لوگوں کی نقل و حرکت دکھائی دینے لگی۔ ہم نیچے آ گئے۔ میں مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور سیتا چائے بنانے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی۔ میں رات کو اگرچہ ایک لمحہ کو بھی سو نہیں سکا تھا لیکن اُس وقت بھی نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ میں اُس یہودی کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے گزشتہ رات ہم نے موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اُس کے قتل کی اطلاع نہ صرف دہلی بلکہ اسرائیل بھی پہنچ چکی ہوگی۔ دہلی اور تل ابیب میں تو کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ یہ یہودی ایجنٹ ایک باقاعدہ معاہدے کے تحت یہاں آئے تھے اور اُن کی حفاظت کی ذمہ داری ہندسرکار پر عائد ہوتی تھی۔ ہوسکتا ہے اس ایک یہودی کے قتل سے اسرائیل یہ معاہدہ منسوخ کر کے اپنے آدمیوں کو واپس بلا لے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ مسلمانوں کے خلاف یہود و ہنود کے عزائم سے پوری دنیا واقف تھی۔ اُنہیں تو ہر ملک میں اور ہر سطح پر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا۔ یہ دونوں شیطانی قوتیں دنیا بھر میں مسلمانوں کے خلاف ایک دوسرے سے تعاون کرنے کو تیار تھیں۔ پاکستان کے ایٹمی قوت بننے سے کئی سال پہلے بھی یہودیوں اور ہندوؤں نے پاکستان کے خلاف ایک نہایت گھناؤنی سازش تیار کی تھی۔ اسرائیلیوں اور ہندوؤں کا وہ منصوبہ بڑا خوفناک تھا۔

وہ منصوبہ اسلام آباد سے چند میل دُور کہوٹہ پر حملہ کر کے اٹامک لیبارٹری کو تباہ کرنے کا تھا۔ انڈین ایئر فورس کے جیگوار طیارے سرینگر ایئر پورٹ پر تیار کھڑے تھے۔ اُن طیاروں کے پائلٹ اسرائیلی تھے جو پرواز کے لئے اشارے کے منتظر تھے لیکن پاکستان کو بروقت اس سازش کی اطلاع مل گئی اور آن واحد میں کسی بھی صورتحال سے نمٹنے کی تیاری مکمل کر لی گئی..... پاک

فضائیہ کے شاہین شکار کی تلاش میں فضا میں پہنچ چکے تھے۔ مگر بھارتی حکمرانوں کو بھی پاکستان کی طرف سے اس تیاری کی اطلاع مل گئی اور اس طرح اُن کی یہ سازش ناکام ہوگئی۔

اور اب ان دونوں شیطانی قوتوں نے پاکستان اور کشمیر کے خلاف جو منصوبہ بنایا تھا وہ بہت خطرناک تھا اور اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اسرائیلی انٹیلی جنس ''موساد'' کے چند خطرناک ایجنٹ یہاں آئے ہوئے تھے جن میں سے ایک گزشتہ رات ہمارے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ ایک یہودی کے مارے جانے سے یہ منصوبہ ختم کر دیا جائے گا۔

چائے پینے کے دوران بھی میں اور سیتا اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ سورج طلوع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد موسم میں تبدیلی آنے لگی۔ پہلے ہوا کے جھونکے بڑے خوشگوار اور فرحت بخش لگ رہے تھے۔ لیکن اب آہستہ آہستہ ہوا میں ریگستان کی گرمی شامل ہوتی جا رہی تھی۔

آٹھ بجے کے قریب ایک جیپ کو مندر کی طرف آتے دیکھ کر ہم محتاط ہو گئے۔ جیپ مندر کے سامنے آ کر رُکی اور جگل ٹفن اُٹھائے جیپ سے اُتر کر ہماری طرف آنے لگا۔ میں نے معنی خیز نظروں سے سیتا کی طرف دیکھا۔ سیتا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی اور وہ اپنے جسم پر چادر درست کرنے لگی۔

جگل ہمارے لئے ناشتہ لے کر آیا تھا۔ ٹفن کے ایک ڈبے میں اُبلے ہوئے چار انڈے تھے، ایک میں آلو میتھی کی بھاجی اور تیسرے ڈبے میں چار پراٹھے تھے۔ سیتا نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا اور ہم بے تکلفی سے یہ دعوت اُڑانے لگے۔ اگر جگل کسی لالچ میں ہمیں تر مال کھلانے پر تلا ہوا تھا تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

ناشتے کے دوران زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔ ہم نے گزشتہ رات کیمپ میں ہونے والی گڑبڑ کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ تاہم میں نے رات کو یہاں آنے والے سکیورٹی آفیسروں اور مندر کی چیکنگ کا ذکر کرنا ضروری سمجھا تھا۔

''وہ کشوری لال ہوگا..... میرا ایک ڈپٹی ہے۔'' جگل نے کہا۔ ''اُس پر بھی بہت ساری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ رات کو کیمپ میں جو درگھٹنا ہوئی تھی اس کے پیش نظر اُس نے مندر کو چیک کرنا ضروری سمجھا ہوگا۔ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی اُس نے؟'' جگل نے کہتے ہوئے معنی خیز نظروں سے سیتا کی طرف دیکھا۔

''نہیں سرکار..... اُنہوں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ پر درگھٹنا کیا ہوئی تھی کیمپ میں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''کسی نے دو آدمیوں کی ہتیا کر دی۔ اُن میں ایک بدیشی مہمان بھی تھا۔'' جگل نے کہا اور پھر خود ہی رات کو کیمپ میں ہونے والی گڑبڑ کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ''اُن دونوں کی لاشیں آج صبح ہیلی کاپٹر سے جے پور بھیج دی گئی ہیں۔ وجے کی لاش اُس کے وارثوں کے حوالے کر دی جائے گی اور بدیشی کی ڈیڈ باڈی ایک خصوصی طیارے سے تل ابیب

روانہ کر دی جائے گی۔''

میں نے تل ابیب کے حوالے سے کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

''ہتیارے پکڑے گئے یا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''رات کو دو آدمیوں کو حراست میں لیا گیا تھا.....'' جگل نے بتایا۔ ''وہ دونوں ٹربل میکر سمجھے جاتے تھے۔ اُن سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ اُن پر سختی کی جائے گی تو وہ اس درگھٹنا کی ذمہ داری قبول کر لیں گے۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اصل ہتیارے ہماری گرفت میں آ سکیں گے۔''

''کیوں.....؟'' میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''یہ کوئی گہری سازش ہے.....'' جگل نے جواب دیا۔ ''اس قسم کی سازش تیار کرنے والے لوگ آسانی سے بے نقاب نہیں ہوتے۔''

جگل تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھا رہا۔ سیتا نے ٹفن دھوئے بغیر اُس کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ جب جانے لگا تو سیتا نے جان بوجھ کر اپنے ایک کندھے پر سے چادر ڈھلکا دی۔ جگل کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی۔ اور پھر جیپ پر بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا تھا کہ وہ ہمارے لئے رات کا کھانا لے کر آئے گا۔

''تمہاری یہ ''آ بیل مجھے مار'' والی حرکتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔'' جگل کے جانے کے بعد میں نے سیتا کو گھورتے ہوئے کہا۔

''کبھی کبھی تو تم بہت بیوقوفی کی باتیں کرنے لگتے ہو۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں یہ سب کچھ پیش بندی کے طور پر کرنا چاہتی ہوں۔ تہہ خانے کا راستہ ہی تلاش کر لینا کافی نہیں۔ ہمیں کچھ اور معلومات بھی درکار ہیں اور اس سلسلے میں جگل ہی ہمارے کام آئے گا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔ اس لئے میں اُس کی آتش شوق کو اس حد تک بھڑکا دینا چاہتی ہوں کہ جب وقت آئے تو وہ میرے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار نہ کرے۔''

''تم ''را'' میں رہ چکی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم جانتی ہو کہ سیکرٹ ایجنٹوں سے تعلق رکھنے والے آسانی سے زبان نہیں کھولتے۔''

''اور میں زبان کھلوانے کے طریقے جانتی ہوں۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے چادر اُتار دی۔

''مجھ سے دُور رہنا!'' میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔

سیتا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کمرے کی طرف چل پڑی۔

''دُھوپ تیز ہو رہی ہے..... مجھے تو گرمی لگ رہی ہے اور نیند بھی آنے لگی ہے۔'' سیتا کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔

میں سیڑھیوں پر بیٹھا کچھ دیر تک سامنے پھیلے ہوئے ریگزار کو گھورتا رہا پھر اُٹھ کر کمرے میں آیا۔ سیتا سو چکی تھی۔ میں بھی اُس سے کچھ فاصلے پر لیٹ گیا۔ اب میری آنکھیں بوجھل ہو رہی

تھیں۔ لیٹنے کے کچھ ہی دیر بعد میں بھی نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

دو دن اور گزر گئے.....!

جگل ہمارے لئے صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا لے کر آتا رہا۔ سیتا اُسے جھلکیاں دکھا کر اُس کے جذبات کو بھڑکا رہی تھی۔ اور میرے خیال میں یہ ایک خطرناک حرکت تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ سرنگ کا راستہ مل جانے کے بعد ہمیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ لیکن سیتا نجانے اُس سے کیا اُگلوانا چاہتی تھی؟

وہ تیسرا دن تھا..... جگل حسب معمول ہمارے لئے رات کا کھانا لے کر آیا تھا۔ کھانے کے بعد میں ہاتھ دھونے کے لئے کچن میں لگے ہوئے نلکے کی طرف چلا گیا۔ ابھی میں کچن ہی میں تھا کہ سیتا کی ہلکی سی چیخ سن کر چونک گیا اور تیزی سے کچن سے باہر آ گیا۔ اور پھر وہ منظر دیکھ کر میرے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی.....

جگل نے سیتا کو اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور سیتا اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر جگل نے سیتا کو چھوڑ دیا اور جب میں قریب آیا تو وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔

''دیوی جی کا پیر رپٹ گیا تھا..... اگر میں تھام نہ لیتا تو گر پڑتیں۔''

''ہاں..... انہوں نے مجھے بچا لیا۔'' سیتا نے بھی کھسیانے انداز میں کہا۔

ہم اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ جگل کے سامنے کسی قسم کا جھگڑا مول لے سکتے۔ البتہ اُس کے جانے کے بعد میں سیتا پر پھٹ پڑا۔

''یہ موقع میں نے خود ہی اُسے فراہم کیا تھا.....'' سیتا نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب.....؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''دیکھتے جاؤ..... آگے آگے ہوتا ہے کیا۔'' وہ ایک بار پھر مسکرا دی۔

''ہو گا یہ کہ تمہاری نچی کھچی لاش ریگستان میں کہیں پڑی ہوئی ملے گی۔'' میں نے غصے میں جواب دیا۔

''ایسا نہیں ہو گا مہابیر جی!'' سیتا مجھ سے لپٹ گئی۔ ''سیتا مصری کی ڈلی نہیں جسے اُٹھا کر منہ میں ڈال لیا جائے۔ تم کیوں گھبراتے ہو؟ مجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اور ویسے کیا خیال ہے آج رات کھنڈروں کا ایک چکر لگا لیا جائے؟ میں نے جگل سے کام کی ایک دو باتیں معلوم کر لی ہیں۔''

''مثلاً؟'' میں نے اُسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تمام یہودی کیمپ میں موجود ہیں۔ اور کیمپ کی سرگرمیاں معمول کے مطابق جاری ہیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''ان یہودی ایجنٹوں کا کیپٹن توشے دایان ہیلی پیڈ کے قریب ایک

بنگلے میں مقیم ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اُس بنگلے کے آس پاس کوئی رہائشی مکان نہیں ہے۔ اُس کے پاس صرف ایک خدمت گار ہے۔ جگل کے کہنے کے مطابق پہلے یہودی کے قتل کے بعد دوسرے یہودیوں کی رہائش گاہوں پر سکیورٹی گارڈز تعینات کر دیئے گئے تھے مگر اُنہوں نے گارڈز کو ہٹا دیا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھتے ہیں۔ بہرحال کیوں نہ آج کیپٹن توشے دایان سے ملاقات کی جائے؟''

''ہم جس جگہ سرنگ سے باہر نکلے تھے وہ مغرب کی طرف ہے۔ اور ہیلی پیڈ مشرق میں وہاں سے بہت دُور ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا ہم دوسروں کی نظروں سے بچ کر وہاں تک پہنچ سکیں گے؟''

''آج ہم دوسری سرنگ کو آزمائیں گے۔'' سیتا نے کہا۔ ''اُس سرنگ کا رُخ مشرق کی طرف ہے اور مجھے اُمید ہے کہ ہم اپنی مطلوبہ جگہ کے آس پاس ہی کہیں نکلیں گے۔''

''ٹھیک ہے..... آزما لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ظاہر ہے ہم یہاں مندر کی سیوا کے لئے یا آرام کرنے نہیں آئے تھے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ بیکار بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ہم دس بجے کے قریب مندر کے تہہ خانے میں اُتر گئے اس مرتبہ ڈھانچوں کے قریب سے گزرتے ہوئے سیتا کو کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے میں وہ پستول جو تین دن پہلے اُس یہودی کو قتل کر کے سیتا نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ سیتا نے ایک لمبی سی لکڑی اُٹھا لی تھی جو آگے سے غلیل کی طرح دو شاخوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ سرنگوں کے سنگم پر پہنچ کر ہم کچھ دیر کو رُکے اور پھر دوسری سرنگ میں داخل ہو گئے۔ سیتا لکڑی سے سرنگ میں تنے ہوئے جالے صاف کرتی جا رہی تھی۔

یہ سرنگ دوسری سرنگ کی نسبت زیادہ طویل ثابت ہوئی۔ اس کے اختتام پر ایک کشادہ کمرہ سا بنا ہوا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ پوری سرنگ میں کہیں بھی گھٹن کا احساس نہیں ہوا تھا اور اس جگہ پر بھی لگتا تھا جیسے کسی طرف سے تازہ ہوا آ رہی ہو..... وہ ہوا اگرچہ ناکافی تھی لیکن گھٹن نہیں ہو رہی تھی۔ صدیوں پہلے جب یہ خفیہ سرنگیں تعمیر کی گئی تھیں اُس وقت بھی اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ ہوا کی آمد و رفت جاری رہے۔

میں نے ٹارچ کی روشنی میں کمرے کی دیواروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ مایوسی نہیں ہوئی۔ چند منٹ کی جستجو کے بعد ہی میکنزم میری نظروں میں آ گیا..... میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ وہ آج کی اس مہم کے لئے پوری طرح تیار ہو کر آئی تھی۔ چولی بہت مختصر تھی اور گھاگھرا بھی گھٹنوں سے بہت اُوپر تھا۔ اُس کی دائیں کلائی میں چاندی کا کڑا تھا جسے اُس نے اُتارنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو.....؟'' سیتا نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تمہارے جال میں پھنس جانے کے بعد شکار زندہ بچ جانے کے کتنے فیصد امکانات ہیں۔'' میں نے کہا۔

''صفر.....!'' سیتا نے جواب دیا۔ ''میرے جال میں پھنس کر کوئی زندہ نہیں بچ سکتا۔

میں نے میکنزم پر ہاتھ رکھ کر ٹارچ بجھا دی..... دو تین مرتبہ حرکت دینے سے میکنزم نے کام شروع کر دیا اور سامنے والی دیوار شق ہو گئی۔

دوسری طرف بھی ایک کمرہ تھا اور میرے خیال میں یہ تہہ خانہ تھا جس کی آدھی چھت ٹوٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف سیڑھیاں تھیں جو ٹوٹی ہوئی تھیں۔ سب سے نیچے والی دو سیڑھیاں سلامت تھیں۔ بیچ کی دو سیڑھیاں اس طرح ٹوٹی ہوئی تھیں کہ کنارے پر صرف ایک پیر رکھنے کی گنجائش تھی۔ کھلی ہوئی چھت سے آسمان نظر آ رہا تھا اور تاروں کی بہت مدھم سی روشنی اگرچہ زمین تک پہنچ رہی تھی لیکن تہہ خانے میں اندھیرا تھا۔ میں نے سیتا کو ٹارچ تھما دی۔ وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور احتیاط سے سیڑھیوں پر چڑھ کر اُوپر آ گیا۔

اُوپر چاروں طرف شکستہ دیواریں تھیں۔ ایک دیوار تقریباً آٹھ فٹ اُونچی تھی جبکہ باقی دیواروں میں سے کوئی دیوار تین فٹ تک تھی اور کوئی پانچ فٹ تک۔ میں اُن دیواروں سے باہر آ گیا اور محتاط انداز میں آگے بڑھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی..... ہم بالکل ٹھیک جگہ پر سرنگ سے باہر آئے تھے۔ اُس لین میں تقریباً سوگز آگے وہ چھوٹا سا بنگلہ تھا جس کی کئی کھڑکیوں میں روشنی نظر آ رہی تھی اور اُس سے تقریباً تین سوگز آگے ہیلی پیڈ تھا جہاں ایک پول پر سرخ بتی جل رہی تھی۔ سیتا کو جنگل سے ملنے والی یہ اطلاع بالکل درست تھی کہ اُس بنگلے کے آس پاس کوئی اور رہائشی مکان نہیں تھا۔ آس پاس بالکل سناٹا تھا اور کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

میں شکستہ تہہ خانے میں واپس آ گیا اور سیتا کو صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے سرنگ کے باہر کی طرف میکنزم تلاش کرنے لگا۔ اس میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے اُس میکنزم کو چار پانچ مرتبہ چیک کر کے دیکھا تاکہ پہلے کی طرح عین وقت پر کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ اور پھر ہم تہہ خانے سے نکل کر محتاط انداز میں اُن کھنڈروں میں چلتے ہوئے اُس بنگلے کی طرف بڑھنے لگے۔ اُس بنگلے کے اطراف میں بھی کچھ فاصلے پر کھنڈر تھے۔ ہم مکان کے سامنے والے رُخ پر واقع ایک کھنڈر میں رُک کر دُور سے اُس کا جائزہ لینے لگا۔ اُس بنگلے کے سامنے کوئی کمپاؤنڈ وغیرہ نہیں تھا۔ اس طرف بھی کھڑکیوں میں روشنی تھی جن کے سامنے باریک پردے پڑے ہوئے تھے۔

ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک کھڑکی کے اندر ایک آدمی کا سایہ نظر آیا۔ وہ شخص ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور کچھ دیر بعد وہ برآمدے میں نمودار ہوا۔ وہ ہندوستانی تھا۔ وہ چند لمحے برآمدے میں رُکا رہا پھر اندر چلا گیا۔

''کیا خیال ہے.....؟'' سیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

''جاؤ.....!'' میں نے کہا۔ ''میں تمہیں یہاں سے کور دُوں گا۔ اور اگر کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو یہاں سے بھاگنے میں دیر مت لگانا۔''

سیتا کھنڈر سے نکل کر محتاط انداز میں بنگلے کی طرف بڑھنے لگی۔ بنگلے کے سامنے تین چار درخت تھے۔ وہ ایک درخت کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ میں پستول لئے تیار بیٹھا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ تقریباً دس منٹ گزر گئے..... اور یہ دس منٹ دس صدیوں پر بھاری ثابت ہوئے تھے۔

وہ آدمی ایک بار پھر برآمدے میں نمودار ہوا..... اُس کے ہاتھ میں شراب کی خالی بوتل تھی۔ برآمدے سے نکل کر چند گز آگے بڑھا اور بوتل ایک طرف اُچھال دی۔ اور جیسے ہی واپس مُڑا درختوں کی طرف سے 'شی' کی آواز سن کر رُک گیا اور مُڑ کر اس طرف دیکھنے لگا۔

پستول پر میری گرفت مضبوط ہو گئی اور اُنگلی ٹرائیگر پر پہنچ گئی۔ یہ سیتا کے لئے سنگین ترین وقت تھے۔ اُسے اگرچہ اپنے آپ پر پورا اعتماد تھا لیکن اُس شخص کو اگر ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو سیتا کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

سیتا درخت کے سائے سے نکل کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ اُس نے دونوں ہاتھ پشت پر رکھے ہوئے تھے اور سینہ تان کر مٹک مٹک کر چل رہی تھی۔ وہ شخص چند لمحے متحیر سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اُس کے قریب پہنچ گیا۔

''اے..... کون ہو تم؟''

میرا فاصلہ بیس گز سے کم نہیں تھا۔ اُس شخص کی آواز بہت صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ سیتا نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ سرگوشیانہ لہجے میں کچھ کہا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے درختوں کے سائے میں لے آئی۔ برآمدے میں جلنے والی مدھم سی روشنی یہاں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ سیتا اُس آدمی سے چپکی کھڑی تھی۔ اور پھر اُس شخص نے ایک ہاتھ اس کی کمر میں حمائل کر دیا..... میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ سیتا کا جادو کام کر گیا۔ اُس شخص کی زندگی کی مہلت کی اُلٹی گنتی شروع ہو چکی تھی۔ اُس نے سیتا کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اپنا چہرہ اُس پر جھکانے لگا۔ وہ سیتا کے ہونٹوں پر بوسہ دینا چاہتا تھا مگر سیتا نے بڑی ہوشیاری سے اُسے پیچھے ہٹا دیا اور کچھ کہتے ہوئے اُس کھنڈر کی طرف اشارہ کیا جس میں چھپا ہوا تھا۔

وہ دونوں اسی طرف آ رہے تھے۔ میں نے پستول جیب میں ڈال لیا..... اب مجھے جو کچھ کرنا تھا خالی ہاتھوں سے کرنا تھا۔ سیتا اُس شخص کو لے کر ایک شکستہ دیوار کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ خاصا بے چین نظر آ رہا تھا۔

''جلدی کیا ہے..... اطمینان سے بیٹھو!'' سیتا کی سرگوشی سنائی دی۔

''وہ سالا تو شے دایان بڑا حرامی ہے.....'' اُس شخص نے کہا۔ ''زیادہ دیر ہو گئی تو چھڑی سے

میری کھال ادھیڑ دے گا۔ یہ سالے یہودی پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔''

'ڈرو نہیں..... دایان مجھے تمہارے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے دیکھے گا تو سارا غصہ بھول جائے گا۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''ویسے تم ہو کون..... پہلی مرتبہ تمہیں دیکھ رہا ہوں۔'' وہ شخص بولا۔

''تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے؟'' سیتا نے کہا۔ ''ویسے تم جانتے ہو ان یہودیوں کو خوش رکھنے کے لئے ہم جیسی حسین ناریوں کو یہاں لایا جاتا ہے۔ مجھے شری جگل لے کر آیا تھا۔ اُس یہودی کے پاس جانے سے پہلے میں نے سوچا کہ تمہیں بھی خوش کر دیا جائے۔''

''بڑی کرپا ہے تمہاری..... بڑی دیالو ہو تم۔'' وہ شخص کہتے ہوئے سیتا کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔

اور ٹھیک اُسی وقت میں نے دیوار پر چڑھ کر اُس پر چھلانگ لگا دی..... میں نے اُسے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا موقع نہیں دیا۔ میرا ایک ہاتھ اُس کے منہ پر تھا اور دوسرا بازو اُس کی گردن پر لپٹ گیا۔ سیتا اُچھل کر دُور ہٹ گئی۔ وہ شخص بری طرح مچل رہا تھا۔ لیکن اُس کی گردن پر میری گرفت آہنی شکنجے کی طرح تھی۔ میں نے اُس کی گردن کو لگاتار کئی جھٹکے دیئے۔ وہ آخری مرتبہ بری طرح مچلا۔ وہ کچھ دیر تک زمین پر ایڑیاں رگڑتا رہا، پھر اُس کے جسم کو آخری جھٹکا لگا اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا..... میں نے اُسے چھوڑ دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اُس کی گردن توڑنے میں مجھے دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔

''چلو..... اب زیادہ دیر مت کرو!'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں اُس کھنڈر سے نکل کر بنگلے کے سامنے درختوں کے نیچے آ گئے۔ میں نے پستول جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میں وہیں رُک گیا اور سیتا تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی برآمدے میں پہنچ گئی اور بتی بجھا دی۔ میں بھی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا اور ٹھیک اُسی لمحہ اندر سے ایک گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''رنجیت.....! کہاں مر گیا تم؟''

میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ اندر کسی کمرے سے توشے دایان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ رنجیت کو پکار رہا تھا اور رنجیب اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

میں بھی سیتا کے قریب پہنچ گیا اور دوسرے دروازے سے جھانک کر اندر دیکھنے لگا۔ وہ سٹنگ رُوم تھا۔ رنگین ٹی وی چل رہا تھا۔ سکرین پر عبرانی زبان کا کوئی پروگرام آ رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ اسرائیل کا کوئی چینل تھا۔ یہاں کھنڈروں میں بھی اُن یہودیوں کو ہر سہولت فراہم کی گئی تھی۔ دائیں طرف صوفے پر توشے دایان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ قدرے بھاری بھرکم اور درمیانے قد کا آدمی تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا اور دونوں پیر اُس نے سامنے کافی ٹیبل پر

پھیلا رکھے تھے جس پر ایک طرف شراب کی بوتل بھی رکھی ہوئی تھی۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ اُس نے کھلے ہوئے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو گئی..... توشے دایان نے مُڑ کر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔ اُس نے شراب کا گلاس میز پر رکھ دیا۔

''مجھے شری جگل نے آپ کی سیوا کے لئے بھیجا ہے..... اور رنجیت کو آج کی رات کے لئے اپنی بلا لیا ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

توشے دایان گہری نظروں سے سیتا کو گھور رہا تھا۔ سیتا کے حسن و شباب نے اُسے زیادہ متاثر نہیں کیا تھا۔ وہ جب سیدھا ہوا تو اُس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مجھے سینے میں سانس ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا.....

''ٹھیک ہے..... اس طرف کھڑی ہو جاؤ!'' اُس نے سیتا کو پستول سے اشارہ کیا اور اُٹھ کر سامنے کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ اُس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ جگل سے تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے جیسے ہی ریسیور پر ہاتھ رکھا میں اُچھل کر سامنے آ گیا..... اُس وقت میں نے پستول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ آواز سن کر دایان نے میری طرف دیکھا اور پستول والا ہاتھ اُوپر اُٹھا دیا۔ لیکن میں نے اُسے فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔

میں یکے بعد دیگرے پستول کا ٹرائیگر دباتا چلا گیا..... میں نے تین فائر کئے اور تینوں بار نشانے پر بیٹھی تھیں..... ایک گولی اُس کی کھوپڑی میں اور دو سینے میں لگی تھیں..... وہ ٹیلی فون پر گرا اور میز سمیت دوسری طرف اُلٹ گیا..... پستول اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

سیتا نے لپک کر اُس کا پستول اُٹھا لیا اور ہم باہر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے..... بنگلے سے نکل کر چند ہی گز دُور پہنچے تھے کہ اچانک ہی ایک آدمی نے کسی طرف سے نکل کر ہمارا راستہ روک لیا۔

''کون ہو تم لوگ.....؟ رُک جاؤ!'' وہ چیخا۔

اُس کے ہاتھ میں پستول تھا اور میرے اور اُس کے درمیان تقریباً پانچ گز کا فاصلہ تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُچھلا اور ہوا میں اُڑتا ہوا اُس کے اُوپر جا گرا۔ اُس کے لئے شاید میری یہ حرکت غیر متوقع تھی۔ اُس نے بدحواسی میں ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی لیکن میں اُسے لپیٹ میں لئے ہوا زمین پر گر گیا۔ زمین پر گرتے ہوئے اُس شخص نے ٹرائیگر دبا دیا تھا..... گولی زناٹے سے میرے سر کے قریب سے گزر گئی۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول سے اُس کی کھوپڑی پر وار کیا..... اُس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ پستول اُس کے ہاتھ سے نکل گیا..... وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

''بھاگو کرو شمروز!'' سیتا چیخی۔ ''اس طرف کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔''

میں نے سیدھا ہو کر اُس شخص کی کھوپڑی کی طرف پستول تان لیا اور ٹرائیگر دبانا ہی چاہتا تھا کہ ایک اور خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا..... میں نے بڑی پھرتی سے جھک کر اُسے بے ہوش شخص کو کندھے پر اُٹھایا اور سیتا کے پیچھے دوڑنے لگا.....

اُس کھنڈر میں پہنچ کر سیتا نے وہاں چھپائی ہوئی ٹارچ اُٹھائی اور ٹوٹی ہوئی چھت سے لگا دی۔ اُس نے ایک لمحہ کو ٹارچ روشن کر کے بجھا دی۔ میں نے کندھے پر لدے ہوئے شخص کو نیچے لٹکا کر چھوڑ دیا۔ سیتا نے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھد سے زمین پر گرا۔ میں نے بھی اُوپر سے چھلانگ لگا دی اور دوڑ کر اُس دیوار کے قریب پہنچ گیا جہاں میکنزم تھا۔ اندھیرے میں بھی وہ میکنزم تلاش کرنے اور اُسے استعمال کرنے میں مجھے کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے اور سیتا نے بے ہوش آدمی کو اُٹھا کر اندر ڈال دیا اور اندر سے میکنزم دبا دیا..... دیوار آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی اپنی جگہ پر آ گئی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ یہ تہہ خانہ تھا اور وہ آواز بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ گاڑی اس کھنڈر کے سامنے سے گزری تھی۔ میں نے جھک کر اُس شخص کو کندھے پر لاد لیا۔ سیتا ٹارچ روشن کر کے آگے آگے چلنے لگی اور میں اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ میرے کندھے پر لدا ہوا وہ شخص کسمسانے لگا..... میں نے سیتا کو رُکنے کا اشارہ کیا اور اُس شخص کو زمین پر ڈال دیا۔

''میں نہیں سمجھ سکی کہ تم اس شخص کو اُٹھا کر کیوں لے آئے ہو..... اسے وہیں پر گولی مار دی ہوتی۔'' سیتا نے ٹارچ کی روشنی میں اُس شخص کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اور پھر چونک کر بولی۔ ''ارے... یہ تو اُن چار محافظوں میں سے ایک ہے جو اُس رات مندر کی تلاشی لینے آئے تھے۔''

اُس شخص کا چہرہ دیکھ کر میں بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

دو تین منٹ بعد وہ ہوش میں آ گیا اور اُسے اپنے حواس بحال کرنے میں مزید دو منٹ لگ گئے۔ ہماری شکلیں دیکھ کر وہ اُچھل پڑا.....

''اوہ..... تم دونوں.....'' وہ بولا۔ ''کشوری لال جی کا شبہ درست تھا..... جیمز کو تم ہی لوگوں نے قتل کیا تھا۔''

''ہاں.....'' میں نے جواب دیا۔ ''اور آج ہم نے تو شے دایان کا پتہ بھی کاٹ دیا ہے..... وہ بھی جہنم میں پہنچ چکا ہے۔''

''تم لوگ بچ کر نہیں جا سکو گے۔ کشوری لال.....''

''اپنی بکواس بند کرو اور میری بات غور سے سنو...'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''میری بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا! اگر تم نے غلط بیانی سے کام لیا تو ہڈیوں کا سرمہ بنا دُوں گا۔''

''ہڈیوں کا سرمہ تو تمہارا بنے گا جب تم پکڑے جاؤ گے۔'' اُس نے کہا۔

''جب ہم پکڑے جائیں گے تب نا!'' میں نے کہا۔ پھر اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''اس کیمپ کا ایمونیشن سٹور کہاں ہے؟''

''کیا.....؟'' وہ اُچھل پڑا۔ ''نہیں..... میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔''

سیتا بھی میرا سوال سن کر اُچھل پڑی تھی اور اب یہ بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ میں اس شخص کو اُٹھا کر کیوں لایا تھا۔

''میں تمہیں صرف تیس سیکنڈ دے رہا ہوں.....'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے جواب نہ دیا تو گولی مار دُوں گا۔''

میری بجائے سیتا نے اُس پر پستول تان لیا اور تیس سے اُلٹی گنتی شروع کر دی۔ اُس شخص کا چہرہ دُھواں ہو گیا۔ وہ خوفزدہ تھا لیکن زبان کھولنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ سیتا نے ایک کہتے ہی ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اُس شخص کی ٹانگ میں لگی اور وہ بری طرح چیخنے لگا۔

''خاموش.....! تمہارے منہ سے آواز نہیں نکلنی چاہئے۔'' میں نے اُس کے جبڑے پر زوردار گھونسہ رسید کر دیا۔ ہم اگرچہ تقریباً پچیس فٹ زمین کی گہرائی میں تھے لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ گولی اور اس کی چیخوں کی آواز باہر کسی جگہ پر نہ سن لی گئی ہو۔

''اب میں تمہیں صرف پندرہ سیکنڈ دے رہی ہوں.....'' اس مرتبہ سیتا نے غراتے ہوئے کہا۔ ''اور اس مرتبہ گولی تمہاری کھوپڑی میں لگے گی۔''

سیتا نے پندرہ سے اُلٹی گنتی شروع کر دی اور اس کے ساتھ ہی پستول کا رُخ اُس کی پیشانی کی طرف کر دیا۔ سیتا نے دو کہا تو وہ چیخ اُٹھا.....

''بب..... بتاتا ہوں..... یہ پپ..... پستول ہٹاؤ.....!''

سیتا نے پستول ہٹا لیا۔ ''جلدی بتاؤ..... ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' وہ غرائی۔ ''ایمونیشن ڈپو کس طرف ہے؟''

وہ سمجھ گیا تھا کہ اُس کا اب کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ فرفر بتاتا چلا گیا۔ میں اُس سے مختلف سوالات کرتا رہا اور اُس نے ہر سوال کا جواب دیا تھا۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا..... اُس نے ایک بار پھر پستول کی نال اُس کی پیشانی کی طرف لہرا دی۔

''مم..... مجھے مت مارو.....'' وہ شخص پیچھے کی طرف گھسٹتا ہوا ہکلایا۔ خوف سے اُس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ ''تت..... تم لوگوں نے جو کچھ پوچھا میں نے بتا دیا۔ اب مجھے کیوں مارتے ہو؟''

''تمہیں زندہ چھوڑ کر ہم اپنی موت کے پروانے پر دستخط نہیں کریں گے۔'' سیتا نے کہا اور ساتھ ہی ٹرائیگر دبا دیا..... گولی اُس شخص کی پیشانی میں لگی۔ خون کی دھار بہہ نکلی اور وہ پلٹ کر تڑپنے لگا۔

ہم دونوں اُسے تڑپتا چھوڑ کر تیزی سے آگے دوڑنے لگے۔ ہمیں مندر کے نیچے پہنچنے میں

چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ہم نے اپنے پستول وہیں اندر کی طرف رکھ دیئے اور باہر نکلنے سے پہلے میں نے جھانک کر اطمینان کر لیا تھا کہ مندر میں کوئی موجود نہیں ہے۔

ہم کمرے میں آ کر بیٹھ گئے..... سیتا کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ وہ کچھ دیر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی رہی پھر اپنا سر میری گود میں رکھ دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

○○○

اُس رات مندر کو چیک کرنے کے لئے کوئی نہیں آیا۔ اگلا دن بھی خیریت سے گزر گیا۔ ایک اور لاش اسرائیل بھیج دی گئی تھی۔ ہم نے دن میں دو تین مرتبہ اُوپر جا کر کیمپ کی طرف دیکھا تھا۔ سرگرمیوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہاں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

اُس روز جگل بھی نہیں آیا تھا۔ البتہ اُس سے اگلے روز صبح سویرے ہی وہ ہمارے لئے ناشتہ لے کر آ گیا۔ سیتا اُس وقت باورچی خانے کے سامنے رکھی ہوئی بالٹی سے منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ اس وقت اُس کے جسم پر لباس مختصر تھا۔ گھاگھرا اور چولی..... جگل سیڑھیوں پر میرے قریب کھڑا تھا مگر اُس کی نظریں سیتا کی طرف تھیں۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد سیتا نے چادر لپیٹ لی اور ہم سیڑھیوں پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ مفت میں تگڑا ناشتہ اور مرغن کھانا مل رہا تھا تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

''آپ کچھ نراش نظر آ رہے ہیں مہاراج..... کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' میں نے جگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پریشانی اُس کے چہرے سے متوحش تھی۔

''مسئلہ ہی مسئلہ.....'' جگل بولا۔ ''چند روز پہلے ہمارے ایک بدیشی مہمان کی ہتیا ہو گئی تھی۔ ہم قاتل کا سراغ نہیں لگا سکے تھے کہ پرسوں رات ایک اور بدیشی مہمان اور اُس کے خدمت گار کو مار ڈالا گیا۔ ابھی تک پتہ نہیں چل سکا کہ قاتل کون ہے..... تاہم ہمارا ایک گارڈ بھی لاپتہ ہے اور شبہ ہے کہ ان دونوں درگھٹناؤں میں اُس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ وہ کھنڈروں ہی میں کہیں چھپا ہوا ہے اور اُسے تلاش کیا جا رہا ہے۔ اُس کے ملنے کے بعد ہی کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکے گا۔''

''ہتیارہ کوئی اندر ہی کا آدمی ہے مہاراج!'' میں نے کہا۔ ''آپ نے یہاں جو حفاظتی انتظامات کر رکھے ہیں اُنہیں دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ باہر کا کوئی آدمی اندر داخل نہیں ہو سکتا۔''

''ہاں..... ہمارا بھی یہی خیال ہے۔'' جگل بولا۔ ''ہم اُسے تلاش کر رہے ہیں اور اُمید ہے کہ جلد ہی اُس کا سراغ لگا لیں گے۔''

جگل ایک گھنٹے بعد چلا گیا۔ وہ اس کیمپ کا سکیورٹی انچارج تھا۔ اُس پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ اُسے تو بہت مصروف ہونا چاہئے تھا اور وہ یقیناً بہت مصروف تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمارے لئے ناشتہ اور کھانا لے کر آتا تھا۔ ہم اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ دھرم سیوکوں کی سیوا نہیں کر رہا تھا بلکہ سیتا کو دانہ ڈال رہا تھا اور میرا خیال ہے کہ اگر ہم نے کیمپ میں گڑبڑ نہ پھیلا رکھی ہوتی تو وہ اب تک کچھ کر گزرا ہوتا۔

دو دن اور گزر گئے.....

اب ہمارے پاس صرف چار دن رہ گئے تھے۔ ہمیں جو کچھ بھی کرنا تھا ان چار دنوں ہی میں کرنا تھا۔ جس سکیورٹی گارڈ کو ہم نے سرنگ میں ہلاک کیا تھا اُس سے بہت سی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ اس کیمپ کو تباہ کرنے کے لئے ہمیں بارود کی ضرورت تھی اور سکیورٹی گارڈ سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق ایمونیشن ڈپو مغرب میں اُس طرف واقع تھا جہاں سب سے پہلے ہم نے ایک اسرائیلی کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ جس کھنڈر میں وہ سرنگ نکلتی تھی اُس سے تقریباً ڈیڑھ سو گز بائیں طرف ایمونیشن ڈپو تھا جہاں صرف دو آدمی ڈیوٹی دیتے تھے۔

اور پھر اُسی رات ہم اس نئے اور پہلے سے زیادہ خطرناک مشن پر روانہ ہو گئے.....! میرے پاس پستول تھا اور سیتا حسب معمول حسن و شباب کے ہتھیاروں سے لیس تھی۔

اندر کے تہہ خانے میں اُتر کر سرنگ کے مغربی دہانے تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ٹارچ ہم نے وہیں دیوار کے قریب اینٹوں کے پیچھے چھوڑ دی اور اُس کھنڈر سے باہر نکل آئے۔ دائیں طرف دو سو گز دُور وہ بنگلہ تھا جہاں پہلی رات ہم نے پہلے یہودی کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ ہم بائیں طرف چل دیئے۔ عقب سے کسی گاڑی کی آواز سن کر ہم جلدی سے اینٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے دبک گئے۔ چند سیکنڈ بعد ہی ایک گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی بائیں طرف مُڑی۔ وہ بغیر چھت کی جیپ تھی۔ دو محافظ آٹومیٹک رائفلیں سنبھالے سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ حفاظتی انتظامات سخت کر دیئے گئے تھے۔ یہودی ایجنٹوں کی مشکوک گاہوں پر مسلح محافظ تعینات کر دیئے گئے تھے اور گشت بھی شروع کر دیا گیا تھا۔

ایمونیشن ڈپو زیادہ دُور نہیں تھا۔ ایک پرانے کھنڈر پر نئی دیواریں تعمیر کر کے مکان بنا لیا گیا جہاں اسلحے کا ڈپو قائم کر دیا گیا تھا۔ اُس ڈپو کا انتخاب میں نے اس لئے کیا تھا کہ یہاں سے ضرورت کی چیزیں مل سکتی تھیں۔

مکان کے قریب پہنچ کر ہم ایک آڑ میں کھڑے رہے۔ مکان کے سامنے پانچ فٹ اُونچی دیواری بھی تھی جس کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ کمپاؤنڈ کا باہر والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اُس کے اُوپر بھی مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا اور ایک مسلح محافظ دروازے کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔

عین سامنے والے کھنڈر میں اینٹوں کے ڈھیر میں دبک گیا۔ سیتا آگے نکل گئی۔ دو منٹ بعد مسلح محافظ کے سامنے موجود تھی جو اُسے دیکھ کر ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

چند سیکنڈ..... صرف چند سیکنڈ اور سیتا اُسے پٹا کر اپنے ساتھ لے آئی۔

''تیری جگل کو تم لوگوں کا کتنا خیال ہے.....'' سیتا کھنڈر میں داخل ہوتے ہوئے محافظ سے بولی تھی۔ ''اُس نے خاص طور پر مجھے تم لوگوں کو خوش کرنے کے لئے یہاں بھیجا ہے۔ تاکہ تم ذمہ داری سے اپنی ڈیوٹی انجام دے سکو۔''

''ہاں..... ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے۔ شری جگل واقعی بہت اچھے.....''

وہ اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔ میں نے عقب سے اُچھل کر اُس کا گلا اپنے بازو کی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ بری طرح مچلا لیکن میری یہ گرفت آہنی شکنجے سے زیادہ سخت تھی۔ دو تین جھٹکوں میں اُس کی گردن ڈھلک گئی۔ میں نے اُسے دیوار کے پیچھے زمین پر ڈال دیا۔

سیتا اگلی مہم پر روانہ ہوگئی..... اس مرتبہ میں بھی اُس کے پیچھے ہی تھا۔ میں نے پستول جیب میں ڈال کر محافظ کی رائفل اُٹھالی تھی۔ میں اُس مکان کے دروازے کے باہر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ سڑک پر سے گزرنے والا کوئی شخص میرا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ گشت کرنے والی جیپ کے علاوہ کسی اور کے اس طرف آنے کی توقع ہی نہیں تھی۔

سیتا دروازے کے اندر جا چکی تھی۔ کمپاؤنڈ زیادہ بڑا نہیں تھا۔

''شری جگل ناتھ جی..... کہاں ہیں آپ؟ میں آگئی ہوں شری جگل ناتھ جی!''

سیتا کی آواز سن کر میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ خود جگل ناتھ سے تو ہم کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکے تھے سوائے اس کے کہ وہ ہمیں تگڑے ناشتے اور مرغن کھانے کھلا رہا تھا۔ البتہ اُس کے نام سے ہم خوب فائدہ اُٹھا رہے تھے۔

''اے..... کون ہو تم.....؟'' ایک گن مین اچانک ہی کہیں سے نکل کر سامنے آگیا۔

''مجھے شری جگل ناتھ جی نے یہاں بلایا تھا..... کہاں ہے وہ؟'' سیتا بولی۔

''جگل ناتھ جی تو یہاں نہیں آئے سندری..... ہم یہاں موجود ہیں۔ کہو تو ہم تمہاری سیوا کر دیں؟'' محافظ بولا۔

''سیوا کرنے تو میں آئی ہوں.....'' سیتا نے کہا۔ ''کیا سیوا کروں تمہاری؟''

''ادھر کو آؤ..... ہم بتاتے ہیں۔'' محافظ نے کہا اور سیتا کا بازو پکڑ کر مکان کے پہلو میں ایک تنگ سی راہداری میں لے گیا۔

میں اُٹھ کر کمپاؤنڈ میں آگیا اور دروازہ بند کر کے تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اُس راہداری میں پہنچ گیا..... مجھے دیکھ کر محافظ اُچھل پڑا لیکن میں نے اُسے ہلنے کا موقع نہیں دیا۔ سیتا نے اُس کی ٹانگیں پکڑ لیں اور میں نے اُس کا گلا دبوچ لیا..... اُسے جہنم کے سفر پر روانہ کرنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا۔

''تم باہر کے دروازے پر جاؤ!'' میں نے سیتا سے کہا اور خود برآمدے کی طرف دوڑ گیا۔ سیتا رائفل اُٹھا کر باہر والے دروازے کی طرف چلی گئی۔ لیکن وہ دروازے سے باہر نہیں نکلی۔ رائفل سنبھالے اندر کی طرف کھڑی رہی۔

سٹور کا دروازہ بند تھا۔ موٹا سا تالا لٹکا ہوا تھا۔ میں نے رائفل کی نال تالے میں پھنسا کر زوردار جھٹکا دیا۔ پہلے ہی جھٹکے میں تالا لٹک گیا۔ میں نے تالا نکال کر نیچے پھینک دیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ اندر کی دیوار ٹٹول کر بتی جلائی اور دروازہ بھیڑ دیا۔

یہ بھی بڑا کمرہ تھا..... اُس سے آگے دو کمرے تھے۔ اسلحہ کی پیٹیاں بھی تھیں اور دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے شیلفوں میں مختلف چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے مطلب کی چیزیں تلاش کرنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ میں نے مطلوبہ چیزیں ایک بیگ میں بھر لیں اور کمرے میں سے نکل کر بتی بجھا دی۔ بیگ خاصا وزنی ہوگیا تھا۔ جیسے ہی میں بیرونی دروازے کے قریب پہنچا سیتا نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور مجھے اشارہ کر دیا۔ ہم دوڑتے ہوئے سڑک پار کر کے کھنڈروں میں پہنچ گئے اور پھر کھنڈروں ہی میں ہوتے ہوئے تہہ خانے والے کھنڈر میں پہنچ گئے۔

اگلے دن کے ہنگامے بھی قابلِ دید تھے..... اُس شام جگل بھی آیا تھا۔ اُس نے یہ دلچسپ انکشاف کیا کہ کیمپ میں دو اور آدمی قتل ہوگئے ہیں۔ لیکن پوری بات نہیں بتائی۔

اُس رات میں اور سیتا مندر کے تہہ خانے میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ کشمیر میں مختلف اسلحہ کی تربیت میرے کام آگئی تھی۔ ٹائم بم بنانے کی مہارت میں نے کشمیر میں کمانڈر عبدالرشید سے حاصل کی تھی۔ اُس رات ہم نے دس ٹائم بم تیار کئے..... ایک اور تھیلے میں، میں نے وہ سارا خزانہ بھر لیا جو بہت دنوں سے ہمارا منتظر تھا۔

اگلی رات ہم پھر کیمپ میں گھس گئے..... پہلے ایک سرنگ سے نکل کر مختلف جگہوں پر ٹائم بم فٹ کئے اور پھر دوسری سرنگ میں گھس گئے۔ اُس سرنگ میں اُس محافظ کی لاش سڑ رہی تھی۔ شدید تعفن پھیلا ہوا تھا۔ ہم تیزی سے دوڑتے ہوئے وہاں سے گزر گئے۔

سرنگ سے نکل کر ہمارے لئے قدم قدم پر خطرہ تھا۔ لیکن ہم خطرات کی پرواہ کئے بغیر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ باقی پانچ ٹائم بم مختلف جگہوں پر فٹ کر کے ہم واپس آرہے تھے کہ اچانک ہی ایک محافظ نے ہمیں للکارا۔ ہم ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے..... وہ محافظ ہم سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ اُس نے پہلے فائرنگ کی اور پھر ہمارے پیچھے لپکا۔

سیتا ٹھوکر کھا کر گری..... محافظ نے اُس پر چھلانگ لگا دی۔ سیتا نے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تو محافظ نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ میں دوڑ کر قریب پہنچ گیا اور محافظ کی کھوپڑی پر گولی چلا دی..... سیتا اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگی۔

فائرنگ کی آوازوں کے بعد مختلف سمتوں سے سیٹیوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں لیکن ہم کسی اور ناخوشگوار واقعہ سے دوچار ہوئے بغیر سرنگ میں پہنچ گئے اور پھر ہم نے مندر میں پہنچ کر ہی سانس لیا تھا۔

اور پھر سیتا بیٹھے بیٹھے اچانک ہی اُچھل پڑی..... وہ اپنی ایک کلائی سہلا رہی تھی۔

''کیا ہوا.....؟'' میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''میرا کڑا.....'' سیتا بولی۔ ''اُس محافظ نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ کھینچا تانی میں شاید کڑا کہیں کی جگہ گر گیا۔''

میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ لیکن یہ سوچ کر سیتا کو بھی تسلی دینے لگا کہ اگر وہ

کڑا کسی کی نظروں میں آ بھی گیا تو ضروری نہیں کہ اس کا تعلق ہم سے جوڑنے کی کوشش کی جائے۔

ہم رات بھر جاگتے رہے۔ اور پھر ٹھیک چار بجے کیمپ میں پہلا دھماکہ ہوا..... ہم دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو چکا تھا..... ہر پانچ منٹ بعد کیمپ میں کسی نہ کسی جگہ دھماکہ ہو رہا تھا.....

ہم مندر کے اُوپر والے حصے میں آ کر کھڑے ہو گئے اور اس طرح کیمپ کی طرف دیکھنے لگے جیسے آتش بازی کا نظارہ کر رہے ہوں۔

صبح پانچ بجے ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔ صورتحال نہایت سنگین ہونے کے باوجود مجھے نیند آ گئی.....

صبح دس بجے سیتا نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا.....

''ایک جیپ ادھر آ رہی ہے۔'' وہ بولی۔ ''ایک ہی آدمی ہے اور میرا خیال ہے وہ جگل ہے۔''

سیتا کا خیال غلط نہیں تھا..... وہ جگل ہی تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جگل دروازے کے سامنے نمودار ہوا۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو..... بیٹھے رہو!'' جگل کے لہجے میں کرختگی تھی اور ہاتھ میں ریوالور..... سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ میں دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا مہاراج..... کیا بات ہے..... رات کو یہ دھماکے کیسے تھے؟'' میں نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اور آپ کے ہاتھ میں یہ پستول.....''

''تفصیل تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو۔'' جگل بولا۔ ''ویسے تمہارا یہ کڑا رات کو ایک محافظ کے ہاتھ میں رہ گیا تھا دیوی جی!'' اُس نے جیب سے کڑا نکال کر دکھایا۔

سیتا کا چہرہ دُھواں ہو گیا..... اور مجھے بھی اپنی آنکھوں کے سامنے موت ناچتی ہوئی نظر آنے لگی.....!

○○○

''یہ..... یہ کڑا.....'' سیتا ہکلائی۔ ''شاید یہاں کہیں گر گیا تھا۔ میں تو دو دن سے اسے ڈھونڈ رہی تھی۔''

''یہاں نہیں..... یہ کڑا ہمیں کیمپ سے ملا ہے۔'' جگل نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''کل شام کو جب میں یہاں آیا تھا تو یہ کڑا تمہاری کلائی میں تھا اور آج صبح کیمپ کے اندر ایک سکیورٹی گارڈ کے ہاتھ میں ملا ہے جسے سر میں گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج.....'' میں نے کہا۔ ''ہمارا کیمپ کے کسی گارڈ سے کیا سمبند؟ ہم تو اس مندر سے باہر کبھی نہیں گئے۔ کیمپ میں ہم کیسے جا سکتے ہیں؟''

''یہ بات مجھے اُسی وقت سمجھ لینی چاہئے تھی جب کیمپ کے اندر اُس بنگلے میں یہودی آفیسر اور اُس کے خدمتگار کی ہتیا کی گئی تھی۔ کیمپ میں پے در پے قتل کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ دو دن پہلے ایمونیشن ڈپو کے دو محافظوں کو قتل کر کے ڈپو سے بہت سی چیزیں چرا لی گئیں لیکن ہم چور یا ہتیاروں کا سراغ نہیں لگا سکے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اس کیمپ کا سکیورٹی انچارج ہوں۔ یہاں میں نے سکیورٹی کے ایسے کڑے انتظامات کر رکھے ہیں کہ بلی کا بچہ بھی نظروں میں آئے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن پے در پے قتل کی وارداتیں ہوتی رہیں اور ہم قاتل کا سراغ نہیں لگا سکے۔ پھر ایمونیشن ڈپو میں چوری کی واردات ہوئی اور آج صبح چار بجے بموں کے پے در پے دھماکے ہوئے جن سے آدھے سے زیادہ کیمپ تباہ ہو گیا اور کئی لوگ مارے گئے۔ ممکن ہے ہم یہی سمجھتے رہتے کہ یہ اندر کے کسی آدمی کا کام ہے۔ لیکن ایک کھنڈر کے قریب اپنے ایک گن مین کی لاش دیکھی تو اُس کے ہاتھ میں یہ کڑا نظر آ گیا۔ اور اب کہانی کچھ اس طرح سمجھ میں آتی ہے کہ اُس محافظ نے تمہیں پکڑ لیا تھا۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش میں تمہارا یہ کڑا کلائی سے اُتر کر اُس کے ہاتھ میں رہ گیا اور تم اُسے گولی مار کر بھاگ نکلیں۔ میں واقعی بیوقوف تھا جو پہلے صورتحال کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ یہ مندر.....''

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا کہ ان قدیم مندروں میں تہہ خانے اور خفیہ راستے ہوتے ہیں۔ اور تم لوگوں کو ان راستوں کا علم تھا۔ تم لوگ انہی خفیہ راستوں سے کیمپ میں داخل ہوتے اور اپنا کام کر کے واپس آ جاتے اور ہم مجرموں کی تلاش میں ٹاپتے رہ جاتے۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

لیکن ان نازک ترین لمحات میں بھی اُس نے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ سے اس طرح حرکت کی کہ چادر کا پلو اُس کے کندھے سے ڈھلک کر نیچے گر گیا۔

جگل کی آنکھوں میں ایک لمحہ کو چمک سی اُبھری لیکن دوسرے ہی لمحہ سرد مہری لوٹ آئی۔ میں گہری نظروں سے اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے اور اُس کے درمیان آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ ریوالور اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اگر میں اُس پر چھلانگ لگاتا تو وہ ٹرائیگر دبا دیتا اور گولی مجھے اُس تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر کر دیتی۔

''اب صورتحال یہ ہے.....'' جگل باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے علاوہ کسی اور کو اس کڑے کے بارے میں علم نہیں ہے۔ گارڈ کی لاش کے ہاتھ میں یہ کڑا دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا تھا اور کسی کو بتائے بغیر اس طرف چلا آیا۔ تم لوگ کون ہو یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن سادھوؤں کے بھیس میں یہاں کس مقصد سے آئے تھے وہ اب سمجھ چکا ہوں۔ اب تم لوگ میرے رحم و کرم پر ہو۔ میں اگر چاہوں تو ابھی تم دونوں کے بھیجے اُڑا دوں یا تمہیں کیمپ میں لے جاؤں۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ لیکن.....''

وہ خاموش ہو کر سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔

''لیکن کیا.....؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ ویسے میں اُس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

''ہم جس پیشے سے وابستہ ہیں اس میں اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔'' جگل نے کہا۔ اُس کی نظریں بدستور سیتا پر مرکوز تھیں جس نے اپنی چادر کچھ اور نیچے گرا دی تھی۔ ''اُس کیمپ میں اگرچہ چند لاشیں گر گئی ہیں یا بموں کے چند دھماکے ہوئے ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف میں جانتا ہوں کہ ان دو گھنٹاؤں کا ذمہ دار کون ہے۔ اور میں یہ سب کچھ نظر انداز کرنے کو تیار ہوں لیکن.....''

''لیکن کیا مہاراج؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اگر یہ دیوی جی چاہیں تو.....'' اُس کا لہجہ معنی خیز تھا اور اُس کا مطلب ہماری سمجھ میں آ گیا تھا۔

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''لیکن.....''

''اگر تم لیکن ویکن کے چکر میں پڑ گئیں تو بہت کشٹ اُٹھاؤ گی۔'' جگل نے سیتا کی بات کاٹ دی۔ ''تم جانتی ہو تم لوگوں سے کتنا سنگین جرم ہوا ہے۔ کئی لوگ تم لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ آدھا کیمپ تباہ ہو گیا ہے۔ تین اسرائیلی تم لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ اسرائیل سے بھارت سرکار کے تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ تم دونوں کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔'' وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''لیکن مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہاں

کیا ہو رہا ہے۔ سکیورٹی انچارج کی حیثیت سے میری نوکری بلکہ زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے لیکن میں یہ سب کچھ بھولنے کے لئے تیار ہوں..... میں صرف دو باتیں چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ مجھے مندر سے کیمپ تک کا خفیہ راستہ بتا دیا جائے اور دوسرے یہ لڑکی میرے ساتھ کچھ وقت گزارے۔''

''مہاراج.....''

''ایک منٹ!'' اُس نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش کر دیا۔ ''میں نہیں جانتا تم لوگ کون ہو۔ لیکن وہ نہیں ہو جو اپنے آپ کو ظاہر کر رہے ہو۔ تم لوگوں کی وجہ سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ہمارے اسرائیلی دوست آج واپس جا رہے ہیں۔ کیمپ کو دوبارہ سیٹ کرنے میں مہینوں لگ جائیں گے۔ لیکن میں یہ سب کچھ نظر انداز کرنے کو تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے مسٹر جگل!'' مجھ سے پہلے سیتا بول پڑی۔ ''میں تمہاری خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اُس نے اپنے اُوپر سے چادر اُتار کر ایک طرف پھینک دی۔ ''مہابیر! اسے تہہ خانے کا راستہ بتا دو۔ اور اب جو کچھ بھی ہوگا تہہ خانے ہی میں ہوگا۔''

جگل کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میں بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ یہ تھی ہندو ذہنیت..... ہمارے ہاتھوں ان کے کئی آدمی مارے گئے تھے۔ کیمپ تباہ ہو گیا تھا، اسرائیل سے سمجھوتہ خطرے میں پڑ گیا تھا اور جگل اپنی ہوس کی پیاس بجھانے کی خاطر یہ سب کچھ بھول جانے کو تیار تھا۔ قوم پرستی نے ہوس کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ اگر ان میں حب الوطنی کا جذبہ ہوتا تو اب تک کشمیر کا بھی فیصلہ کر چکے ہوتے۔ لیکن 54 سال سے اپنی اس گندی ذہنیت کی بدولت یہ کشمیر میں بھی مار کھا رہے تھے۔ اور مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن کشمیر اُن کے چنگل سے ضرور آزاد ہوگا۔

''چلو مہاراج!'' میں نے ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ سیتا نے اُس کی آتش شوق بھڑکانے کے لئے ایک کندھے پر سے چولی کی ڈوری سرکا دی تھی۔ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے جگل کی آنکھوں کی چمک کچھ اور گہری ہو گئی۔ میں نے باہر نکلتے ہوئے ٹارچ لے لی تھی۔ سیڑھیوں والے کمرے میں آ کر میں نے ریت صاف کر کے فرش پر کنکریٹ کا بلاک ہٹا کر گڑھے کے اندر وہ ہُک کھینچ لیا۔ جگل بڑی دلچسپ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

دیوار شق ہو گئی۔ میں اُٹھ کر جلدی سے اندر داخل ہو کر دیوار کے ساتھ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ جگل اندر داخل ہو تو دیوار کے ساتھ سیڑھیوں پر پڑے ہوئے پستول کو نہ دیکھ سکے۔ میرے بعد جگل اندر داخل ہوا۔ ریوالور اب بھی اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اُس کے پیچھے سیتا تھی۔

''خیال سے مہاراج..... آگے سیڑھیاں ہیں۔'' میں نے سیڑھیوں پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

جگل محتاط انداز میں دو سیڑھیاں نیچے اُتر گیا۔ سیتا اُس کے پیچھے تھی۔ اُس نے اچانک ہی جگل کے کولہوں پر زوردار لات رسید کر دی..... جگل چیختا ہوا سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے گرا۔ سیتا نے بڑی پھرتی سے مُڑ کر دیوار کے قریب رکھا ہوا پستول اُٹھایا اور پے در پے ٹرائیگر دباتی چلی گئی..... تہہ خانہ فائرنگ اور جگل کی چیخوں سے گونج اُٹھا۔ میں جگل کو ٹارچ کی روشنی کے حلقے میں لئے ہوئے تھا۔ جگل مرا نہیں زخمی ہوا تھا اور وہ اُٹھ کر ایک طرف بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیتا نے ایک بار پھر ٹرائیگر دبا دیا۔ اس مرتبہ اتفاق سے گولی جگل کی کھوپڑی میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

''تم یہیں رُکو..... میں دیکھتا ہوں۔'' میں کہتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ سیتا وہاں رُکنے کی بجائے میرے پیچھے آ گئی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں جگل کا جائزہ لیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے ٹارچ کا رُخ سیتا کی طرف کر دیا۔ اُس کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔

''سالا حرامی.....'' وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔ ''میرے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔'' اُس نے لاش پر تھوک دیا اور ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔

''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے..... جلدی سے میرے ساتھ آؤ!'' میں نے کہا۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے اُس کمرے میں پہنچ گئے۔ ایک تھیلے میں خزانہ بھر کر رکھا گیا تھا۔ میں نے تھیلا اُٹھایا اور ہم دونوں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

اُوپر آ کر میں نے تہہ خانے کا راستہ بند کیا اور کمرے میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''رہنے دو سب کچھ...'' سیتا چیخی۔ ''اگر کوئی اس طرف آ گیا تو ہمارا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔''

میں نے سیتا کی چادر اُٹھا لی اور باہر کی طرف دوڑا۔ سیتا مجھ سے پہلے ہی جیپ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ اچک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور انجن اسٹارٹ کرنے لگی۔ میں اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور تھیلا اپنے پیروں کے قریب رکھ لیا۔

جیپ ایک مختصر سا چکر لگا کر اُس راستے پر نکل آئی جو شہر کی طرف چلا گیا تھا۔ یہ راستہ بھی ریتلا ہی تھا مگر ریت سخت اور جمی ہوئی تھی۔ سیتا ایکسیلیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھاتی چلی گئی۔ جیپ ریت کے بادل اُڑاتی ہوئی طوفانی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پیچھے مُڑ کر دیکھا لیکن گرد و غبار کے بادلوں کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

ہمیں شہر کے نواح میں پہنچنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ سیتا نے ایک ویران سی جگہ پر جیپ روک کر انجن بند کر دیا۔ میں نے چادر اُس کی طرف بڑھا دی۔ سیتا نے ویران سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور چادر جسم پر ڈال لی۔

''یہ تھیلا بھی چادر کے اندر چھپا لو!'' میں نے تھیلا اُس کی طرف بڑھا دیا۔ سیتا نے تھیلا کندھے پر لٹکا کر چادر میں چھپا لیا اور ہم تیز تیز قدموں سے ایک طرف چلنے لگے۔ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں ایک آٹو رکشہ مل گیا۔ رکشے میں بیٹھتے ہی سیتا نے شہر

کے ایک علاقے کا نام لے دیا اور رکشہ حرکت میں آ گیا۔

تین رکشے بدل کر ہم سلاوٹ پاڑہ کے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہ آخری رکشہ ہم نے دُرگا کی حویلی سے تقریباً نصف میل دُور پچھلی والی سڑک پر رُکوایا تھا کیونکہ ہم حویلی کے سامنے سے جانے کی بجائے عقبی گلی سے جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

رکشے سے اُتر کر ہم نے چند ہی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک ہی ایک بھاری بھرکم پنڈت نے ہمارا راستہ روک لیا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے ہمارے سامنے کھڑا تھا.....

''آگے مت جائیے مہاراج!'' وہ بولا تو اُس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

''کیوں کیا بات ہے.....؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''میری بات کو سمجھو مہابیر جی.....!''

''کون ہو تم.....؟'' میں اُس کے منہ سے اپنا نام سن کر اُچھل پڑا اور ذرا غور سے اُس کی طرف دیکھا تو میں نے اُسے پہچان لیا..... وہ دُرگا کا ملازم راجیو تھا۔ اُس کمبخت نے ایسا زبردست حلیہ بدلا تھا کہ اگر وہ میرا نام نہ لیتا تو میں اُسے نہ پہچان سکتا۔ سیتا کی آنکھوں میں بھی اُلجھن تیر رہی تھی۔ مجھے کسی گڑبڑ کا اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے راجیو کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''حویلی کے حالات اچھے نہیں ہیں.....'' راجیو نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پہلے سے بھی مدھم لہجے میں کہا۔ لوگ ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے۔ ''یہاں بات کرنے کا موقع نہیں ہے۔ میرے ساتھ آ جائیے!'' راجیو نے کہا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا اور ہم اُس کے پیچھے چل پڑے۔ اگلے موڑ پر راجیو نے ایک آٹو رکشہ رُکوا لیا اور ہم تینوں اُس میں ٹھنس کر بیٹھ گئے۔

شہر کے مشرقی علاقے میں پہنچ رکشہ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد بھی ہمیں تقریباً ایک میل تک پیدل چلنا پڑا۔ یہ شہر کا وہ علاقہ تھا جہاں ایک نئی آبادی پھیل رہی تھی۔ لوگوں نے جگہوں پر قبضے کر کے تاروں کی باڑیں کھینچ رکھی تھیں۔ جس کے پاس زیادہ پیسے تھے اُس نے اپنے پلاٹ کے گرد اینٹوں کی چار دیواری کھڑی کر دی تھی۔ کہیں کہیں کچے مکان بھی بنے ہوئے تھے۔ اس طرف ناریل اور تاڑ کے درختوں کی بھی بہتات تھی۔ بعض مکان تو ایسے تھے جن میں تاڑ کے درختوں کے جھنڈ تھے۔

ہم ایک مکان کے سامنے سے گزرے تو درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے آدمی اور دو عورتوں نے اُٹھ کر ہمیں پرنام کیا۔ جواب میں ہم نے بھی ہاتھ جوڑ دیئے اور راجیو کے ساتھ چلتے رہے۔

وہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو گز آگے ناریل اور تاڑ کے درختوں کے جھنڈ میں ایک کچا مکان تھا۔ اُس کے اطراف میں کچی اینٹوں کی چار دیواری بھی تھی۔ چار دیواری کے اندر داخل ہونے کے راستے پر بوری کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔

راجیو بلند آواز میں ہری اوم ہری اوم کی گردان کرتا ہوا پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ میں اور سیتا باہر ہی رُک کر اُلجھی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ چند سیکنڈ بعد ہی راجیو واپس آ گیا۔

''ارے پدھاریئے ناں..... آپ لوگ رُک کیوں گئے؟'' وہ بولا۔

''یہ کس کا گھر ہے؟'' سیتا نے پوچھا۔

''ارے اپنا ہی ہے..... آپ پدھاریئے تو سہی!'' راجیو نے کہا۔

ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ صحن خاصا وسیع و عریض تھا اور ناریل اور تاڑ کے کئی درخت چار دیواری کے اندر بھی نظر آ رہے تھے۔

وہ مکان تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرہ ایک طرف اور دو ایل (L) شیپ کی صورت میں دوسری طرف۔ چند گز کے فاصلے پر ٹین کی چادر کا ایک شیڈ بنا ہوا تھا جسے کچن کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔

''کلپنا..... شوبھا..... دیکھو کون آیا ہے۔'' راجیو ایک کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

ہم درختوں کے نیچے ہی رُک گئے تھے۔ لیکن راجیو کے منہ سے کلپنا اور شوبھا کے نام سن کر چونک گئے۔ چند سیکنڈ بعد ہی راجیو کی بیوی شوبھا اور کلپنا ایک کمرے سے باہر آ گئیں۔ کلپنا دوڑ کر سیتا سے لپٹ گئی۔ اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے۔

''کیا ہوا کلپنا..... خیریت تو ہے؟ دُرگا کہاں ہے..... اور تم لوگ یہاں''

''آؤ..... آؤ! اندر آؤ.....'' راجیو نے سیتا کی بات کاٹ دی۔ ''اندر آؤ..... آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔''

ہم لوگ گرمی میں کافی دُور سے پیدل چل کر آئے تھے اور پسینے میں گرمی سے شرابور ہو رہے تھے۔ باہر ہوا بھی گرم چل رہی تھی۔ اندر قدرے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ سیتا نے چادر اُتار کر ایک طرف پھینک دی اور کندھے پر اٹکا ہوا تھیلا بھی ایک طرف رکھ کر کھاٹ پر بیٹھ گئی۔ میں بھی اُس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا اور میں نے بھی چوغہ اُتار کر ایک طرف پھینک دیا گیا۔

''شوبھا!'' راجیو بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مہابیر جی اور سیتا دیوی کو جل پلاؤ! دُھوپ سے آئے ہیں۔''

شوبھا فوراً ہی باہر نکل گئی۔ کلپنا سیتا کے گھٹنے سے لگی بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں مسلسل بھیگی ہوئی تھیں۔ سیتا بھی سمجھ گئی تھی کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ راجیو نے جب راستے میں ہمیں روک کر کہا تھا کہ حویلی کے حالات ٹھیک نہیں ہیں تو میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ دُرگا کی بھی اب تک کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سیتا نے کلپنا سے دُرگا کے بارے میں پوچھنا چاہا تو راجیو نے بات کو ٹال دیا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد شوبھا جل زیرہ سے بھرے ہوئے دو گلاس لے آئی۔ ایلومینیم کے

گلاس خاصے بڑے بڑے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں پورا گلاس نہیں پی سکوں گا۔

جل زیرہ..... بھنا ہوا زیرہ پوڈر اور ابلس میں لیموں کی کھٹائی جس میں چٹکی بھر نمک ملا دیا گیا تھا۔ یہ راجستھان جیسے گرم علاقے کی خاص شراب تھی۔ یہ نہ صرف گرمی اور لو سے بچاتا تھا بلکہ اس سے پیاس بھی بجھ جاتی تھی۔ اس میں اگرچہ برف نہیں تھی لیکن مٹکے کا پانی بھی خاصا خوشگوار تھا اور یہ جل زیرہ پینے سے واقعی لطف آ گیا تھا۔

''ہم نے سانس بھی لے لیا اور جل زیرہ بھی پی لیا.....'' سیتا نے خالی گلاس کھاٹ پر رکھ دیا۔ اُس کی نظریں راجیو کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ''اب بتاؤ..... کیا معاملات ہیں، حویلی میں کیا گڑبڑ ہے اور دُرگا کہاں ہے؟''

''حالات حویلی کے تو کیا پورے شہر کے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔'' راجیو نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''پولیس تم دونوں کو تلاش کر رہی ہے۔''

''اور دُرگا کہاں ہے؟'' سیتا نے جلدی سے پوچھا۔

''اُسے پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ اور اُس پر اتنا تشدد کیا کہ وہ بیچاری.....''

''کیا ہوا اُسے.....؟'' اس مرتبہ میں بول پڑا۔

''دُرگا اب ہم میں نہیں رہی مہابیر جی.....!'' راجیو کے منہ سے یہ الفاظ بڑی مشکل سے نکلے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''اوہ.....'' میرے منہ سے بھی سسکی سی نکل گئی۔ ''مگر یہ سب کچھ کیسے ہوا؟''

راجیو کئی منٹ تک ہچکیاں بھرتا رہا اور پھر اُس نے جو کہانی سنائی وہ واقعی بڑی سنسنی خیز تھی۔ وہی سب کچھ ہوا تھا جس کا مجھے کئی روز سے اندیشہ تھا.....

راجیو کے کہنے کے مطابق میگزین میں شائع ہونے والی میری اور دُرگا کی وہ تصویر کشمیر میں پولیس کی نظروں میں آ گئی تھی۔ کشمیر کی خفیہ پولیس نے مجھے شمروز کی حیثیت سے شناخت کر لیا تھا۔ وہ تصویر ایک رپورٹ کے ساتھ دہلی کی خفیہ پولیس کو بھیجی گئی۔ دہلی پولیس نے میگزین کے دفتر میں رابطہ کر کے اُس فوٹو گرافر کے بارے میں معلومات حاصل کیں جس نے یہ تصویر کھینچی تھی۔ جلد ہی اُس فوٹو گرافر کو بھی تلاش کر لیا گیا جس نے بتایا کہ یہ تصویر اُس نے جیسلمیر میں پتوؤں کی حویلی میں کھینچی تھی۔

خفیہ پولیس کے وہ ایجنٹ وہ تصویر لے کر جیسلمیر پہنچ گئے اور جب اُنہوں نے یہاں کی پولیس سے رابطہ کیا تو اُنہوں نے دُرگا کی تصویر پہچان لی۔ پولیس میں اچھے برے سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی پولیس والے نے دُرگا جی کو فون کر کے بتا دیا کہ دہلی کی خفیہ پولیس اُسے گرفتار کرنے کے لئے آ رہی ہے۔ دُرگا، کلپنا کو لے کر فوراً ہی پچھلے مکان میں پہنچ گئی اور کلپنا کو نوکر کے حوالے کر کے اُسے ہدایت کی کہ وہ کلپنا اور اپنی بیوی کو لے کر فوراً یہاں سے بھاگ جائے۔ راجیو اُن دونوں کو لے کر اس مکان میں آ گیا۔ یہ اُس کے دوست کا مکان تھا جو چابی

اُسے دے کر ہردوار گیا ہوا تھا۔

دُرگا نے حویلی سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی مگر اُسے موقع نہیں مل سکا۔ پولیس اُسے پکڑ کر لے گئی اور تین دن تک تشدد کرتی رہی۔ پولیس کے کہنے کے مطابق رسالے میں شائع ہونے والی تصویر میں نظر آنے والا وہ آدمی کشمیری مجاہد شمروز تھا جس نے کشمیر میں طویل عرصے تک تباہی پھیلا رکھی تھی اور بھارتی فوج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ بھارتی انٹیلی جنس ''را'' نے اپنی ایک حسین ترین اور ذہین ایجنٹ کو شمروز کی گرفتاری کے لئے کشمیر بھیجا تھا لیکن یہ ایجنٹ سیتا بھی اپنا دھرم اور قومیت سب کچھ بھول کر شمروز کے ساتھ مل گئی اور جموں میں مانسر جھیل پر اعلیٰ فوجی افسروں کے قتل عام کی کارروائی میں سیتا بھی اُس کے ساتھ شریک تھی۔ اس کے بعد وہ دونوں غائب ہو گئے تھے۔

شمروز کی تصویر دُرگا کے ساتھ جیسلمیر میں پتوؤں کی حویلی میں پہنچ گئی تھی جس سے پولیس اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ شمروز اور سیتا جیسلمیر میں موجود تھے اور دُرگا نے اُنہیں پناہ دے رکھی تھی۔ بعض اور ذرائع سے بھی پولیس نے اس امر کی تصدیق کر لی تھی کو دُرگا کو کئی مرتبہ شہر کے مختلف ہوٹلوں اور کلبوں میں دیکھا گیا تھا۔ پولیس کو سیتا کے بارے میں کچھ اس لئے بھی یقین تھا کہ دُرگا مہارانا دھرمیش سنگھ کی رکھیل تھی اور سیتا مہارانا کی بیٹی۔ دُرگا پہلے تو شمروز سے کسی تعلق کے بارے میں انکار کرتی رہی لیکن پھر اُس نے اعتراف کر لیا کہ اُس نے اُن دونوں کو پناہ دے رکھی تھی لیکن بروقت پولیس کارروائی کی اطلاع مل جانے سے اُس نے ان دونوں کو بھگا دیا۔ وہ اس وقت تک بمبئی پہنچ چکے ہوں گے۔ لیکن وہ پولیس کو ان کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ جبکہ پولیس کو یقین تھا کہ وہ دونوں جیسلمیر ہی میں موجود ہیں۔ اُن کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے پولیس نے دُرگا پر اس قدر تشدد کیا کہ وہ ختم ہو گئی۔ مہارانا دھرمیش سنگھ کو بھی حراست میں لے رکھا تھا۔ سیتا اُس کی بیٹی تھی اور اُس سے بھی سیتا کے بارے میں پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔

پولیس نے کیپٹن گوپال کے قتل کو بھی سیتا سے جوڑ دیا تھا..... پولیس نے کسی طرح یہ معلوم کر لیا تھا کہ کئی سال پہلے کیپٹن گوپال نے جب وہ لیفٹیننٹ ہوا کرتا تھا سیتا کے ساتھ بلادکار کیا تھا۔ اور سیتا نے بدلہ لینے کے لئے بالآخر اُسے قتل کر دیا تھا۔ پولیس نے وہ حویلی بھی اپنے قبضے میں لے لی تھی جہاں پہلے کیپٹن گوپال اور بعد میں ایک اور قتل ہوا تھا۔ یہاں سے پولیس کو سیتا کی اُنگلیوں کے نشان مل گئے تھے جن کے بارے میں تصدیق کر لی گئی تھی۔ پولیس کو شبہ ہی نہیں یقین تھا کہ کشمیری مجاہد شمروز بھی سیتا کے ساتھ اسی حویلی میں ٹھہرا ہوا تھا اور بعد میں وہ دُرگا والی حویلی میں منتقل ہو گئے تھے۔ پولیس نے حویلی کے ملازم چتون سنگھ کو بھی پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر وہ فرار ہو گیا تھا اور پولیس ابھی تک اُس کا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔

''میں بہت عرصہ سے دُرگا دیوی کی سیوا کر رہا ہوں۔'' راجیو کہہ رہا تھا۔ ''لیکن پولیس کو شاید ابھی تک میرا خیال نہیں آیا یا میرے بارے میں ابھی تک پولیس کو معلوم نہیں ہو سکا۔ میں

نے پولیس سے چھپنے کے لئے یہ بہروپ دھار لیا۔ اس بہروپ میں میرے بہت سے جاننے والے بھی مجھے نہیں پہچان سکے اور آپ دونوں بھی دھوکہ کھا گئے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا تھا آپ لوگ آج واپس آنے والے ہیں۔ اگرچہ واپسی کی اُمید شام کے سمے تھی مگر میں صبح ہی سے اس علاقے میں گھوم رہا تھا۔ بھگوان کی دیا سے آپ دونوں میری نظروں میں آ گئے۔ اگر آپ حویلی کی طرف چلے جاتے تو بڑے آرام سے دھر لئے جاتے۔''

''یہ جگہ کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ جگہ محفوظ ہے..... یہاں سب لوگ مجھے پنڈت سمجھتے ہیں اور کسی کو مجھ پر شبہ نہیں ہے۔''

''تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟'' سیتا نے پوچھا۔

''سب کچھ پتروں میں لکھا ہے سیتا جی.....'' راجیو نے جواب دیا۔ ''میں نے وہ سارے پتر سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔'' راجیو نے دوسری کھاٹ کے نیچے رکھا ہوا ایک ٹرنک باہر کھینچ لیا اور اُس میں سے اخبارات کا ایک پلندہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

ان میں پہلا اخبار جس میں دُرگا کی گرفتاری کی خبر چھپی تھی، ہمارے جانے کے چار دن بعد کا تھا۔ اور اس کے بعد کے گزشتہ روز کی تاریخ تک کے تمام اخبارات اُس نے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ آج کا اخبار اُس نے اپنے تھیلے میں سے نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

میں اور سیتا وہ اخبارات دیکھتے رہے۔ اُن میں وہ تمام تفصیلات موجود تھیں جو راجیو نے مختصراً بتا دی تھیں۔ ہمارے جیسلمیر آنے کے بعد یہاں جو کچھ بھی ہوا تھا وہ تمام اخبارات میں موجود تھا۔ رپورٹروں نے کھوج کھوج کر خبریں تلاش کی تھیں لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ پچھلے پندرہ ہفتے کے دوران یہاں سے صرف گیارہ کلومیٹر دُور لودروا کیمپ میں جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے سے ایک لفظ تک کسی اخبار میں شائع نہیں ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ کیمپ کی کوئی بات باہر نہیں نکلنے دی گئی تھی۔ اور اسرائیلی ایجنٹوں کی ہلاکتوں کو بھی راز ہی میں رکھا گیا تھا۔

میں نے اخبارات ایک طرف رکھ دیئے اور سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر پناہ افسردگی تھی اور آنکھیں نم تھیں۔ مجھے بھی دُرگا کی موت کا بہت دُکھ ہوا تھا۔ اُس نے بدترین حالات میں ہمیں پناہ دی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ میں کون ہوں..... مجھے پناہ دینا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ دوسری طرف سیتا بھی منحرف ہو چکی تھی۔ وہ بھی موسٹ وانٹڈ تھی۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی دُرگا نے اپنے گھر کے دروازے ہمارے لئے کھول دیئے تھے۔ ہمیں نہ صرف ہر آسائش مہیا کی تھی بلکہ ہماری حفاظت کے لئے بھی نہایت مکمل بندوبست کر لیا تھا۔

میگزین میں شائع ہونے والی اس تصویر کے بارے میں مجھے پہلے ہی شبہ تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ تصویر کسی نہ کسی وقت رنگ ضرور لائے گی، اور وہی ہوا تھا..... اور اتفاق سے میں اور سیتا

اُس روز وہاں موجود نہیں تھے۔ دُرگا کو ہمارے ساتھ کلپنا اور راجیو وغیرہ کا بھی خیال تھا۔ اُس نے بروقت اطلاع ملنے پر ان تینوں کو وہاں سے بھگا دیا تھا لیکن خود پکڑی گئی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو اپنی جان بچانے کے لئے ہمارے بارے میں بتا دیتی لیکن اُس نے جان دے دی پر ہمارے بارے میں ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالا۔

سیتا کو اپنے باپ کا بھی افسوس تھا۔ وہ بے گناہ پکڑا گیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے ہم اس پوزیشن میں اُس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ہم دیر تک بیٹھے دُرگا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ دوپہر کو گرمی ہوگئی۔ یہاں بجلی تو نہیں تھی، دستی پنکھے ہی استعمال کرتے رہے۔

کلپنا اور شوبھا اُٹھ کر باہر چلی گئی تھیں۔ میں اور سیتا دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر سیتا بھی اُٹھ کر باہر چلی گئی تو میں کھاٹ پر لیٹ گیا۔ ہم رات بھر جاگے تھے اور پورا وقت بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ میں بری طرح تھک گیا تھا۔ چارپائی پر لیٹنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر مجھے اتنا غفیل ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی.....!

○

صورتحال ہمارے لئے بہت سنگین ہوگئی تھی.....

اگلے روز کے اخبارات کی ہیڈ لائن لودروا کیمپ میں ہونے والے دھماکوں اور ہنگاموں سے متعلق تھی۔ اخبارات نے پہلی مرتبہ انکشاف کیا کہ شہر سے گیارہ کلومیٹر دُور ان قدیم کھنڈروں میں دہشت گردوں کو تربیت دینے کا کیمپ قائم ہے۔ اور اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی ''موساد'' کے ایجنٹ یہاں جدید ترین ٹیکنیکس کے تحت دہشت گردی کی تربیت دیتے تھے۔

اخبارات نے گزشتہ روز ہونے والے دھماکوں سے پہلے کیمپ کے اندر قتل کی پراسرار وارداتوں کا تذکرہ بھی کیا تھا جن میں کئی مقامی ماہرین کے علاوہ تین اسرائیلی ایجنٹوں کو بھی ہلاک کر دیا گیا تھا۔

ایک دلچسپ خبر یہ تھی کہ کیمپ سکیورٹی کا انچارج جگل ناتھ لاپتہ تھا۔ کیمپ کے گیٹ پر متعین گارڈز کے بیان کے مطابق دھماکوں کے بعد صبح دس بجے جگل کو مندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اور پھر اُس کی جیپ شہر کی طرف جاتے ہوئے دیکھی گئی تھی۔ گارڈز نے یہ بیان بھی دیا تھا کہ جگل ناتھ روزانہ مندر کے پجاریوں کے لئے ناشتہ اور کھانا لے کر جایا کرتا تھا۔ آخری مرتبہ وہ مندر کی طرف گیا تو واپس نہیں آیا۔ اُس کے ایک گھنٹے بعد اُسے کیمپ میں نہیں دیکھا گیا تھا اور اُسے بھی بڑی سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا تھا۔ اُس کی جیپ شہر کے نواحی علاقے میں کھڑی پائی گئی تھی اس لئے اُس کی تلاش میں شہر میں مختلف لوگوں سے رابطہ کیا جا رہا تھا۔

ایک دلچسپ خبر مندر کے حوالے سے بھی تھی۔ کیمپ سکیورٹی انچارج کے نائب کشوری لال کے بیان کے مطابق مندر کی سیوا کے لئے جو دو سادھو وہاں موجود تھے اُن میں ایک خوبصورت

لڑکی تھی۔ اور رات کو جب شہر میں جین مندروں کی پربندھک کمیٹی سے رابطہ کر کے اُن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ انکشاف ہوا کہ کسی عورت کو اس مندر میں نہیں بھیجا گیا تھا۔ دو ہفتے پہلے جو دو پنڈت وہاں بھیجے گئے تھے وہ دونوں ادھیڑ عمر مرد تھے۔ انہیں کل شام واپس آنا چاہئے تھا لیکن وہ واپس نہیں پہنچے تھے۔ لہٰذا پولیس کو اُن دو ادھیڑ عمر پنڈتوں کے علاوہ اُس نوجوان، خوبصورت عورت اور اُس کے ساتھی کی تلاش تھی جو مندر کے سیوکوں کے بہروپ میں دو ہفتے وہاں مقیم رہے تھے۔

ہمارے لئے اب چند روز تک باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ راجیو ہی ہمیں باہر کے حالات سے آگاہ کرتا رہا تھا۔ وہ پنڈت ہی کے بھیس میں دن میں ایک دو مرتبہ باہر جاتا۔ بازار سے ضرورت کی چیزیں بھی لے آتا اور حالات کے بارے میں تازہ ترین معلومات بھی۔

اور پھر ایک روز راجیو نے یہ دل خوش کن خبر سنائی کہ سیتا کے باپ کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ اُس کے بارے میں تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ سیتا کا اُس سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ پولیس سے چھٹکارا ملتے ہی مہارانا جے پور چلا گیا تھا۔

ہم ایک طرح سے اس مکان میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ یہاں ہمارے لئے دلچسپی کی کوئی چیز نہیں تھی سوائے اس کے کہ پڑے پڑے اینٹھتے رہتے۔ ہم اپنی چارپائیاں اُٹھا کر کبھی درختوں کے نیچے لے آتے اور کبھی کمرے میں۔

اسی شہر میں سیتا کے باپ کی ایک اور چھوٹی سی حویلی بھی تھی جو عرصہ سے بند پڑی تھی۔ سیتا کا خیال تھا کہ ہمیں اس حویلی میں منتقل ہو جانا چاہئے لیکن میں نے اس تجویز کی مخالفت کی تھی۔ پولیس کو سیتا کی تلاش تھی اور یقیناً ہر اُس عمارت کی نگرانی ہو رہی تھی جس کو کبھی سیتا یا اُس کے باپ سے کوئی تعلق رہا ہو۔

دو ہفتوں میں معاملات کچھ ٹھنڈے پڑ گئے اور ہم نے یہ دو ہفتے بڑی اذیت میں گزارے تھے۔ اس دوران میں نے اپنی داڑھی مونچھیں بڑھانا شروع کر دی تھیں تاکہ حلیے میں کسی قدر تبدیلی آ سکے۔ ہم نے وہ تھیلا ابھی تک نہیں کھولا تھا جو مندر سے لے کر آئے تھے۔ سیتا نے تھیلا اپنی کھاٹ پر تکیے کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اُس روز دوپہر کو جبکہ راجیو بھی موجود تھا سیتا نے کھاٹ پر چادر بچھا کر وہ تھیلا پلٹ دیا اور اُن تینوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں.....

''یہ..... یہ سب کہاں سے آیا سیتا جی؟'' راجیو کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔ اُس نے ایک مورتی اُٹھا لی۔ چند لمحے اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''خالص سونے کی ہے۔ کہاں سے ملا یہ سب کچھ؟''

''لودروا کے مندر سے.....'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم سے پہلے بھی بہت سے پنڈت اور پجاری وہاں جاتے رہے ہیں لیکن یہ خزانہ ہماری ہی قسمت میں تھا۔''

''بہت قیمتی خزانہ ہے یہ.....'' راجیو بولا۔ وہ ایک ایک چیز اُٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ کلپنا اور شوبھا

بھی مختلف چیزیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگیں۔ کلپنا نے وہ تاج سر پر اُٹھا لیا جو مندر کے تہہ خانے میں سیتا نے بھی پسند کیا تھا۔

''کیسی لگ رہی ہوں مہابیر جی؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''راجکماری۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہائے رے مرد کی ذات.....'' سیتا گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''مندر میں جب یہ مُکٹ میں نے اپنے سر پر رکھا تھا تو اس وقت بھی تم نے یہی الفاظ کہے تھے۔ اور اب کلپنا کو بھی گولی دے رہے ہو..... نہیں کلپنا! تم اس کی باتوں پر یقین نہ کرنا۔ یہ مُکٹ تم پر بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ لاؤ..... یہ مجھے دے دو!'' اور پھر اُس نے خود ہی وہ تاج کلپنا کے سر سے اُتار کر اپنے سر پر سجا لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں کیسی لگ رہی ہوں مہابیر جی؟''

''راجکماری۔'' میں نے کہا۔ اور پھر وہ سب ہی قہقہے لگانے لگے۔

میرے خیال میں وہ خزانہ کروڑوں روپے مالیت کا تھا۔ بہت سے زیورات ایسے تھے جن کے ڈیزائن بہت قدیم تھے اور بعض چیزیں تو ایسی تھیں جنہیں قدیم تاریخی ورثہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ سیتا نے ان میں سے کچھ چیزیں الگ کر لیں۔ اُن میں عام لاکٹ، چوڑیاں، کڑے اور انگوٹھیاں وغیرہ شامل تھیں۔ یہ ڈیزائن نہایت معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی مروّج تھے اور اُنہیں بازار میں فروخت کرنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جبکہ قدیم ڈیزائن کی کوئی چیز دیکھ کر کسی کو شبہ ہو سکتا تھا۔ باقی چیزیں سیتا نے دوبارہ تھیلے میں ڈال لی تھیں۔

''اب صورتحال یہ ہے راجیو!'' سیتا اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس جگہ رہنا ہم سب کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ گرمی تو ہے ہی لیکن پانی کا بھی مسئلہ ہے۔ تمہیں کتنی دُور سے پانی لانا پڑتا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم رہائش کے لئے کوئی اور بندوبست کر لیں۔''

''لیکن یہ جگہ بہت محفوظ ہے سیتا دیوی!'' راجیو نے کہا۔

''ہم کسی محفوظ جگہ کا ہی بندوبست کریں گے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''تم یہ چار چوڑیاں اور یہ ہار لے جا کر فروخت کر دو! ہمارے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں۔ ان چیزوں کے بیچنے سے اچھی خاصی رقم مل جائے گی۔ ہم کرائے پر کوئی مکان لے لیں گے۔''

''میں جس کے پاس بھی یہ زیور بیچنے جاؤں گا وہ اس کی رسید مانگیں گے سیتا جی!'' راجیو نے کہا۔ ''اگر کسی کو مجھ پر شک ہو گیا تو پکڑ لیں گے مجھے۔''

''راجیو ٹھیک کہہ رہا ہے.....'' میں نے کہا۔ ''یہ ٹھیک سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ اگر شبہ ہو گیا تو اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔''

''تو پھر.....؟'' سیتا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''میں اور تم چلتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ظاہر ہے ہم ہمیشہ کے لئے اس چار دیواری میں بند ہو کر نہیں رہ سکتے۔ اور ویسے بھی اب معاملات کچھ ٹھنڈے پڑ گئے ہیں..... وہ سرگرمی

نہیں رہی۔''

''ہاں..... رسک تو لینا ہی پڑے گا۔'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور پھر اُس روز شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہم بازار جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ کلپنا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ سیتا نے شوبھا کے کپڑے پہن لئے تھے۔ گھاگھرا، چولی اور چنری۔ کلپنا نے بھی ایسا ہی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ چنری سے گھونگھٹ نکال کر چہرہ چھپایا جا سکتا تھا۔ میں نے بھی راجیو کا لباس پہنا تھا۔ دھوتی، خاص تراش کا کرتہ اور سر پر ست رنگے چنری جیسے کپڑے کی بل کھاتی ہوئی پگڑی۔ میری داڑھی اور مونچھیں بے ترتیب تھیں۔ ماتھے پر سیتا نے ٹیکا بھی لگا دیا تھا۔ میں نے اپنے لباس میں پستول بھی چھپا لیا تھا تاکہ کسی ہنگامی صورتحال میں اپنا بچاؤ کیا جا سکے۔

ہمیں بہت دُور تک پیدل چلنا پڑا تھا۔ آبادی میں جا کر بھی ہم نے کوئی رکشہ وغیرہ نہیں لیا اور پیدل ہی چلتے ہوئے مین بازار میں آ گئے۔ یہی شہر کا سب سے بڑا کاروباری اور تجارتی مرکز تھا۔ یہاں ہر قسم کی دُکانیں تھیں۔ یوں تو مین روڈ پر بھی جوہریوں کی بڑی بڑی دُکانیں تھیں۔ ایک طویل گلی پر مشتمل صرافہ بازار بھی تھا۔

شہر میں بڑی رونق تھی۔ ہم بازار میں چلتے ہوئے صرافہ والی گلی میں گھس گئے اور جگمگاتی ہوئی دُکانوں کو دیکھتے ہوئے چلتے رہے اور بالآخر ایک دُکان میں داخل ہو گئے۔ یہاں دو سیلز مین تھے اور سیٹھ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سیلز مین دو عورتوں کو انگوٹھیاں دکھا رہا تھا۔ دوسرا سیلز مین فوراً ہی ہماری طرف متوجہ ہو گیا لیکن ہم اُس طرف بڑھ گئے جہاں سیٹھ بیٹھا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اُٹھ گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''فرمایئے مہاراج..... کیا سیوا کی جائے آپ کی؟'' وہ باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہم کچھ خریدنے نہیں آئے مہاراج!'' میں نے بھی ہاتھ جوڑتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجبوری ہمیں یہاں لے آئی ہے۔''

''کچھ بیچنا چاہتے ہیں؟'' سیٹھ بولا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے بہت شرمندگی ہو رہی ہو۔

''کوئی بات نہیں مہاراج! جیون میں اُونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔ کبھی ایسا سمے بھی آتا ہے۔ فرمایئے! آپ کیا چیز لائے ہیں؟''

میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ اُس نے اپنے لباس میں سے ایک پوٹلی نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی۔ میں نے وہ پوٹلی سیٹھ کی طرف سرکا دی۔ اُس نے پوٹلی کھولی اور ایک ایک چیز اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی تھی۔

''ان زیوروں کی رسید ہو گی آپ کے پاس مہاراج؟'' بالآخر اُس نے میری طرف دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

''تم ہم کا چور سمجھو سیٹھ؟'' مجھ سے پہلے سیتا بول اُٹھی۔ ''یہ ہمارنانی کا جیور ہے جو ماتا جی نے ہم کا بیاہ پر دیا تھا۔ اس کی رسید کون سنبھال رکھت ہے؟ لینا ہے تو لو، نئی تو واپس کر دو یہ سب چیزاں۔ ہم کوئی اور دُکان دیکھت ہیں۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا دیوی جی! کہ یہ زیور آپ نے کہیں سے چرائے ہیں۔'' سیٹھ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی ہم سے پوچھے کہ یہ گہنے ہم نے کہاں سے خریدے ہیں تو ہمیں کچھ تو بتانا پڑے گا نا۔''

''ہم سب سمجھت ہیں.....'' سیتا نے کہا۔ ''ہم انگوٹھا لگاوت دیں گے ناکورے کاکج پر۔''

اس مرتبہ سیٹھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اُن زیوروں کو ایک ایک کر کے کانٹے پر تولنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کچھ حساب کتاب بھی کرتا جا رہا تھا۔ اور پھر اُس نے جو قیمت بتائی وہ چوتھائی سے بھی کم تھی۔

''نہ بھایا.....'' سیتا بولی۔ ''اس سے دوگنا تو ہمار گاڑی کا مہاجن پنڈت دولت رام دیوت کو تیار ہے۔ نہ جی..... ہم نہ بیچت ہیں۔''

''بات یہ ہے دیوی جی.....'' سیٹھ بولا۔ ''یہ ڈیزائن بہت پرانے ہو گئے ہیں۔ میں نے تو ٹانکے کی قیمت کاٹی ہے۔ ہم انہیں گلا کر نئے ڈیزائن تیار کریں گے تب ان کی کچھ قیمت وصول ہو گی۔''

''ہمار سب سمجھت ہیں سیٹھ جی.....'' سیتا نے کہا۔ ''ان کو دھو کر تم یہاں سجا دیو گے اپنے شو کیس ما..... ہمار گہنے ہم کا واپس کر دیو۔''

''تو پھر آپ کیا لیں گی دیوی جی؟'' سیٹھ نے کہا۔ وہ اب زیادہ تک سیتا ہی سے مخاطب تھا۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ میں تو محض اُلو کا پٹھا ہوں۔ جو بھی فیصلہ کرنا ہے اس دیوی جی نے ہی کرنا ہے۔ کلپنا بھی میری طرح خاموش کھڑی شو کیسوں میں سجے ہوئے جگمگاتے ہوئے زیورات کو دیکھ رہی تھی۔

سیتا نے میری طرف دیکھا، میرے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ سکا تھا کہ اُس نے کیا کہا تھا۔ میں نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے جو قیمت بتائی وہ سیٹھ کی پیشکش سے بھی دُگنی تھی۔ لیکن بہر حال معاملہ آدھی قیمت پر طے ہو گیا۔ ہمیں ان زیورات کی اس سے زیادہ قیمت بھی مل سکتی تھی لیکن اُنہیں لے کر دُکان دُکان لئے پھرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کسی کو ہم پر شبہ بھی ہو سکتا تھا اس لئے پہلی دُکان پر ہی ہم نے قصہ ختم کر دیا۔

سیٹھ نے ایک سادے کاغذ پر رسید لکھوا لی۔ اُس نے جب پتہ پوچھا تو سیتا نے بڑے اطمینان سے دُرگا کی حویلی کا پتہ لکھوایا۔ ظاہر ہے وہ نمبر لکھوایا گیا تھا جو میونسپلٹی کی طرف سے اس

حویلی کو الاٹ کیا گیا تھا اور محض نمبر پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رسید پر دستخط میں نے ہی پریم چند کے نام سے کئے تھے اور نوٹ سیتا نے وصول کئے۔ چند نوٹ میری طرف بڑھا کر باقی نوٹ اُس نے اُسی پوٹلی میں باندھ لئے جس میں زیورات لائے گئے تھے اور وہ پوٹلی وہیں کھڑے کھڑے چولی کے گریبان میں ڈال لی۔

واپس جاتے ہوئے ہم مختلف بازاروں میں گھومتے رہے۔ ضرورت کی کچھ چیزیں بھی خریدی گئیں۔ ایک جگہ فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ایک خوانچہ فروش سے امرود خریدنے کے لئے رُک گئے۔ امرود خریدنے کے بعد ہم جیسے ہی آگے بڑھے کلپنا کی چنری کا نیچے لٹکا ہوا پلو خوانچے میں اٹک گیا۔ چنری اُس کے سر سے اُتر گئی اور کلپنا بدحواس سی ہو کر چنری کا پلو خوانچے سے چھڑانے لگی۔ اور جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو ایک آدمی ہمارے پیچھے لگ چکا تھا.....

وہ دراز قامت آدمی اُس وقت ہمارے قریب سے گزر رہا تھا۔ اور جب کلپنا کا آنچل گرا تھا تو وہ اُس کا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا اور چند گز آگے جا کر رُک گیا تھا۔ میں نے بھی سرسری سے انداز میں اُس کی طرف دیکھا تھا اور نجانے کیوں مجھے اُس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا تھا لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کب اور کہاں دیکھا تھا؟ میرے ذہن میں ایک لمحہ کو یہ شبہ بھی اُبھرا تھا کہ شاید اُس شخص نے ہمیں زیورات فروخت کرتے اور رقم وصول کرتے دیکھ لیا ہو اور وہ اس رقم کے چکر میں ہمارے پیچھے لگ گیا ہو۔ ہم دیہاتیوں کے حلیے میں تھے اور دیہاتیوں کو شہر میں آسانی سے بیوقوف بنایا جا سکتا تھا یا اُنہیں ڈرا دھمکا کر لوٹا جا سکتا تھا۔ بہر حال میں نے کلپنا اور سیتا کو نہیں بتایا۔

وہ شخص تقریباً بیس قدم کے فاصلے پر ہمارے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہمارے ہی چکر میں ہے..... میں ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ کون ہے اور اُسے کہاں دیکھا تھا.....؟ ہم گنجان آبادی سے دُور نکل آئے۔ آگے شہر کا وہ علاقہ شروع ہو رہا تھا جہاں حویلی نما بڑے بڑے مکان تھے۔ سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا، اور روشنی کا انتظام بھی مناسب نہیں تھا۔ اگر کسی ایک کھمبے پر بلب جل رہا تھا تو آگے کے تین چار کھمبوں کے بلب یا تو فیوز تھے یا سرے سے تھے ہی نہیں۔

''ایک آدمی ہمارے تعاقب میں لگا ہوا ہے۔'' سیتا نے میرے ساتھ لگتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''کیا ایسی صورت میں سیدھا گھر کی طرف جانا ہمارے لئے مناسب ہو گا؟''

میں سیتا کی بات سن کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کا مطلب تھا کہ اُس نے بھی تعاقب کرنے والے کو بہت پہلے سے دیکھ لیا تھا۔

''میں بھی اُسے دیکھ چکا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''فی الحال تو اپنے راستے پر چلتی رہو۔ کوئی مناسب جگہ دیکھ کر اُس سے نمٹنے کی کوشش کی جائے گی۔''

ہم ایک گلی میں مُڑ گئے۔ میں ایک دم دیوار کی آڑ میں ہو گیا اور پیچھے مُڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ

دراز قامت آدمی سفاری سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ باریک مونچھیں اور فرنچ کٹ داڑھی، سر کے بال بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت ایک کھمبے پر جلنے والے بلب کی روشنی میں تھا اس لئے اُس کا چہرہ بھی مجھے نظر آ گیا تھا۔ میں مُڑ کر سیتا اور کلپنا کے قریب پہنچ گیا۔ وہ دونوں بڑے اطمینان سے امرود کھاتی ہوئی چل رہی تھیں۔ سیتا نے کلپنا کو تعاقب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

اُس گلی سے نکل کر ہم کھلی جگہ پر نکل آئے۔ آگے ایک دوسرے سے فاصلے پر اکا دُکا مکان تھے۔ کہیں کہیں ناریل اور تاڑ کے درخت بھی تھے اور اُنہی مکانوں اور درختوں میں وہ راستہ بھی تھا جو راجیو کے مکان کی طرف چلا گیا تھا۔ ہم اُس راستے پر ابھی چند ہی گز آگے بڑھے تھے کہ وہ شخص تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ میں نے سیتا کو کہنی سے ٹہوکا دے کر اشارہ کیا اور ہم نے جان بوجھ کر اپنی رفتار سست کر دی۔

''اے شریمان جی..... ذرا رُک جاؤ! تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔'' اُس شخص کی آواز سن کر ہم رُک گئے۔ آواز کے ساتھ ہی میرے دماغ میں دھماکہ سا ہوا۔ میں نے بیٹھی بیٹھی اور بھاری آواز سے اُس شخص کو پہچان لیا تھا۔ وہ گنگو تھا.....

میری یہ داستان پڑھنے والے اُن دو بدمعاشوں کو نہیں بھولے ہوں گے جنہوں نے ایک رات سیتا کے پتا جی کی حویلی میں گھس کر کلپنا کو اغواء کرنے کی کوشش کی تھی اور میری اور سیتا کی بروقت مداخلت سے ہم نے کلپنا کو بچا لیا تھا۔ ایک بدمعاش نے میرے سینے میں خنجر اُتارنے کی کوشش کی تھی۔ میں بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا تھا اور خنجر اُس بدمعاش کے دوسرے ساتھی کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا اور قاتل کھڑکی سے چھلانگ لگا کر فرار ہو گیا تھا۔ اور اُسی رات ہمیں وہ حویلی چھوڑنی پڑی تھی۔ فرار ہونے والا وہ بدمعاش گنگو تھا جسے ہم بھی تلاش کرتے رہے تھے اور پولیس بھی۔ لیکن اُس کا سراغ نہیں ملا تھا۔ ہم دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے اور گنگو کا خیال بھی ذہن سے نکل گیا تھا اور اب وہی گنگو ہمارے تعاقب میں تھا.....

لباس بھی شخصیت کو کس طرح بدل دیتا ہے۔ اگر یہ اپنے اصل حلیے میں ہوتا تو بازار میں پہلی نظر دیکھتے ہی میں اُسے پہچان لیتا۔ لیکن اس شریفانہ لباس نے تو اُس کی شخصیت ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ اور پھر اُس نے گردن تک لمبے بال کٹوا دیئے تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں پنسل ٹائپ میں تبدیل ہو گئی تھیں اور ٹھوڑی پر فرنچ کٹ داڑھی نے بھی اُس کی شخصیت کو تبدیل کرنے میں بڑی مدد دی تھی۔ وہ بدمعاش کی بجائے اب ایک شریف آدمی ہی لگتا تھا لیکن اُس کی آواز نے اس کا راز فاش کر دیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ بازار میں ہمیں دیکھ کر محض شک کی بنا پر ہمارے پیچھے لگا تھا اور جب اتفاق سے کلپنا کے سر سے چنری اُتر گئی تھی تو اُس کا چہرہ دیکھ کر گنگو ہمارے تعاقب میں یہاں تک چلا آیا تھا۔ لباس اور حلیے سے اُس کی شخصیت بدل گئی تھی تو کیا ہوا؟ اُس کی فطرت تو نہیں

بدلی تھی۔ اُس کی رگوں میں تو وہی گندا خون دوڑ رہا تھا۔

میں سیتا اور کلپنا سے دو تین قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا تا کہ گنگو اگر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے تو ہم تینوں بیک وقت اُس کی زد میں نہ آ سکیں۔ وہ ہمارے قریب آ کر رُک گیا۔ اُس جگہ اندھیرا تھا۔ ہم اگرچہ ایک دوسرے کی شکل واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن بہرحال ایک دوسرے کو جان چکے تھے.....

''کیا بات ہے.....'' میں نے کہا۔ ''تم کون ہو اور کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''میں تم سے ایک سودا کرنے آیا ہوں شریمان جی!'' اُس نے کہا۔ ''میں اگر چاہتا تو تم لوگوں کو بازار ہی میں کسی جگہ روک سکتا تھا۔ لیکن میں کوئی ہنگامہ نہیں کرنا چاہتا اس لئے تمہارے پیچھے یہاں تک چلا آیا ہوں۔''

''حیرت ہے.....'' میں نے کہا۔ ''ہماری کوئی جان پہچان نہیں اور تم.....''

''میں تم لوگوں کو پہچان گیا ہوں.....'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''تم وہی ہو جو مہارانا دھرمیش سنگھ کی حویلی میں چھپے ہوئے تھے۔ میں اس لونڈیا کو اُٹھانے گیا تھا لیکن گڑبڑ ہو گئی۔ میرا ساتھی میرے ہی ہاتھوں مارا گیا اور مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا..... میں پولیس سے بچنے کے لئے اجمیر کی طرف بھاگ گیا تھا۔ چند روز پہلے ہی واپس آیا ہوں۔ پولیس کو اب بھی میری تلاش ہے لیکن پولیس اب تک میرا سراغ نہیں لگا سکی۔''

''کیا چاہتے ہو گنگو؟'' میں نے اُسے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تو تم نے مجھے پہچان لیا۔'' گنگو بولا۔

''میں نے تمہیں اُسی وقت دیکھ لیا تھا جب امرود والے خوانچے کے قریب تم نے ہمارا تعاقب شروع کیا تھا۔ اور جب تم نے یہاں ہمیں رُکنے کو کہا تھا تو میں نے آواز سے تمہیں پہچان لیا تھا۔ کیا چاہتے ہو تم؟''

''چند روز پہلے مجھے پتہ چلا تھا کہ یہ دوسری لونڈیا مہارانا دھرمیش سنگھ کی بیٹی ہے۔ اور تم وہ کشمیری مجاہد ہو جسے ''را'' اور یہاں کی پولیس تلاش کر رہی ہے۔ میری طرح تم لوگ بھی اب تک پولیس کو دھوکہ دینے میں کامیاب رہے ہو۔ اگر اس لونڈیا کے سر سے چنری نہ ہٹتی تو شاید میں بھی اجنبیوں کی طرح تمہارے قریب سے گزر جاتا۔ لیکن اس کی صورت دیکھ کر میں ٹھٹک گیا اور اب میں اس پوزیشن میں ہوں کہ تم سے کوئی سودا کر سکوں۔''

گنگو سے جب پہلی مرتبہ آمنا سامنا ہوا تھا تو وہ خالص راجستھانی لہجے میں بات کر رہا تھا۔ لیکن اب وہ بڑی صاف اُردو بول رہا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اُس کی اصلیت کچھ اور تھی۔

''تم پڑھے لکھے لگتے ہو لیکن.....''

''میں نے جے پور یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا۔'' گنگو نے میری بات کاٹ دی۔ ''لیکن میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ اتنا علم حاصل کرنے کے بعد بھی میں اندھیرے میں کیوں بھٹک گیا تھا؟

اس وقت میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لونڈیا میرے حوالے کر دو! میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ مجھے یاد بھی نہیں رہے گا کہ تم لوگ کون ہو..... اور ویسے بھی اس لونڈیا سے تمہارا کوئی تعلق تو ہے نہیں۔ اس سے کہو یہ خاموشی سے میرے ساتھ چلی چلے۔'' اُس نے بات ختم کرتے ہی جیب سے چاقو نکال لیا.....

کلپنا خوفزدہ ہو کر سیتا کے ساتھ جڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ سیتا بھی دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے گنگو!'' میں نے کہا۔ ''اگر تم ہمارے بارے میں ایسی باتوں کا انکشاف نہ کرتے تو شاید میں تمہیں یہاں سے زندہ جانے کا موقع دے دیتا۔ لیکن اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''بہت سورما ہو.....'' گنگو غرایا۔ ''اُس رات میں کسی وجہ سے بھاگ گیا تھا۔ میرا ساتھی میرے ہی ہاتھوں مارا گیا تھا۔ لیکن آج یہاں کھلا میدان ہے۔ میں ہوں..... تم ہو اور یہ لونڈیا ہے۔ ویسے میں ایک بار پھر تمہیں یہ آفر دے رہا ہوں کہ اسے میرے حوالے کر دو اور اپنی سیتا کو لے کر چلے جاؤ! ہم دونوں ایک دوسرے کو بھول جائیں گے۔''

''اس بات کو ذہن سے نکال دو کہ میں اس لونڈیا کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر تیار ہو جاؤ!'' گنگو غرایا۔ ''یہ سمجھ لو کہ آج اس لونڈیا کے لئے سوئمبر ہو گا۔ جو جیت گیا وہ اس لونڈیا کو لے جائے گا اور دوسرا یہاں خاک و خون میں لوٹتا رہ جائے گا۔''

میرے دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگز تھے جنہیں میں نے نیچے پھینک دیا۔ میرے لباس میں اگرچہ پستول موجود تھا اور میں چاہتا تو ایک ہی گولی سے اُس کی کھوپڑی میں سوراخ کر سکتا تھا۔ لیکن میں پستول استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ فائر کی آواز سناٹے میں دُور تک پھیل جاتی اور ویسے بھی میں گنگو کو دو دو ہاتھ کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔

گنگو چاقو والا ہاتھ بلند کر کے دھاڑتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی بجائے اُس کا وار روکا، اُس کی کلائی دونوں ہاتھوں میں تھام کر نیچے جھکتے ہوئے اُسے زوردار جھٹکا دیا..... وہ منہ کے بل آگے کو جھکا میں نے اُس کی کلائی چھوڑ دی اور بڑی پھرتی سے سیدھا ہوتے ہوئے اُس کے کولہے پر لات رسید کر دی۔ وہ منہ کے بل نیچے گر پڑا۔ اُس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ لیکن وہ حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُٹھ گیا اور اس بھی زیادہ پھرتی سے دوبارہ حملہ کر دیا..... اس مرتبہ میں نے اُس کے وار کو ہاتھ سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اُس کا ہاتھ جیسے ہی نیچے آیا میں نے پیر سے زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ چاقو گنگو کے ہاتھوں سے نکل کر دُور جا گرا۔ اُس نے سنبھلنے کی کوشش کی تو میں نے ایک اور ٹھوکر لگا دی۔ یہ ٹھوکر اُس کے گھٹنے پر لگی اور وہ بلبلاتا ہوا ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔

گنگو کو سنبھلنے کا موقع دینا خطرناک تھا۔ میری اگلی ٹھوکر پر وہ نیچے گر چکا تھا لیکن میں پے در پے اُس پر ٹھوکریں ہی برساتا رہا۔ لیکن ایک مرتبہ اُس کا بھی داؤ چل گیا۔ اُس نے میرا پیر

کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گرا..... لیکن میں نے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ گنگو بھی اُٹھ کر مقابلے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

سیتا اور کلپنا ایک طرف کھڑی تھیں۔ سیتا تو خاموش تھی البتہ کلپنا چیخ چیخ کر میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

گنگو نے اُچھل کر حملہ کیا تو میں اپنے آپ کو بچا گیا۔ وہ دوسری مرتبہ سنبھل کر پھر میری طرف لپکا۔ اس مرتبہ وہ میرے پیٹ پر سر سے ٹکر مارنا چاہتا تھا۔ میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی اُس کی گردن پر زوردار گھونسہ رسید کر دیا۔ وہ کراہتا ہوا منہ کے بل گرا تو میں نے ایک بار پھر اُس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ گنگو مجھ سے زیادہ قد آور اور زیادہ طاقتور تھا اور میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ اگر میں اُس کی گرفت میں آ گیا تو وہ میری ہڈیوں کا سرمہ بنا دے گا۔ اس لئے میں اُسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن میں زیادہ دیر تک اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں رہ سکا۔ ایک ایسا موقع آیا کہ گنگو مجھ سے لپٹ گیا۔

گنگو کا انداز ایسا تھا جیسے بڑی مدت کے بعد اپنے کسی بچھڑے ہوئے دوست سے بغل گیر ہو رہا ہو۔ وہ مجھے دونوں بانہوں کے حصار میں لے کر سینے سے بھینچ رہا تھا۔ اُس کی بانہوں کا شکنجہ گزرنے والے ہر لمحہ کے ساتھ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا..... میرا سانس گھٹنے لگا۔ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میرے پاؤں خود بخود زمین سے اُٹھتے چلے گئے۔ میری حالت غیر ہوتی چلی گئی..... چند سیکنڈ اور گزرتے تو میں بے جان ہو کر اُس کی بانہوں میں جھول جاتا..... لیکن مجھے ایک موقع مل گیا۔ میں اپنا ایک ہاتھ آگے لانے میں کامیاب ہو گیا۔

میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال اُبھرا تھا۔ اب یا کبھی نہیں..... میں نے ہتھیلی پھیلا کر اُس کی ناک پر ضرب لگائی۔ کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ البتہ دوسری ضرب سے وہ اپنی جگہ سے ہل گیا..... میں نے اُس کی ناک پر ایک اور ضرب لگائی اور پھر میرا ہاتھ مسلسل حرکت کرتا رہا۔ سینے میں دم گھٹنے کے باوجود مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری ساری قوت میرے اُس ہاتھ میں سمٹ آئی ہو۔ میں ہتھیلی سے پے در پے اُس کی ناک پر ضربیں لگاتا رہا..... گنگو کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ اُس کی بانہوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے ایک زوردار جھٹکا دے کر اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑایا اور سینہ سہلاتے ہوئے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ گنگو بھی دُہرا ہو گیا تھا اُس کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔

اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہی میں نے گنگو پر حملہ کر دیا..... میری ٹھوکر اُس کے پیٹ پر لگی۔ وہ بلبلاتا ہوا منہ کے بل زمین پر گرا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں چاقو تھا..... وہ زمین پر گرا تھا تو اتفاق سے چاقو اُس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

گنگو وارنا بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا..... میں نے بچنے کی کوشش کی تو میرا

پیر رپٹ گیا اور میں سنبھلنے کی کوشش میں لڑکھڑا کر رہ گیا اور چاقو کی نوک میری بائیں آستین کو چیر کر بازو کی کھال پر چرکہ لگاتے ہوئے گزر گئی۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گر گیا..... گنگو نے دھاڑتے ہوئے چھلانگ لگا دی۔ میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو چاقو میرے سینے میں پیوست ہوتا۔

گنگو پے در پے حملے کرتا رہا اور میں بچتا رہا۔ اور بالآخر میں نے اُس کے تھوبڑے پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی..... وہ چیختا ہوا پیچھے اُلٹ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے سنبھل کر پھر حملہ آور ہوا مگر اس مرتبہ اُسے میرے قریب پہنچنے کا موقع نہیں مل سکا۔ سیتا نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اُس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا دی تھی اور کلپنا بھی حرکت میں آ گئی تھی۔ اُس نے ایک بڑا سا پتھر دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر دے مارا۔ گنگو لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ اگر یہ پتھر اُس کے سر پر لگ جاتا تو بھیجہ باہر نکل آتا۔

میں نے بھی اُٹھ کر گنگو کو ٹھوکروں پر رکھ لیا..... ایک مرتبہ گنگو کو اُٹھنے کا موقع مل گیا..... میرا خیال تھا کہ وہ مجھ پر یا کلپنا اور سیتا میں سے کسی پر حملہ کرے گا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس نے ایک طرف دوڑ لگا دی تو میں چونک گیا..... گنگو کا زندہ بچ نکلنا ہمارے لئے موت کا سندیسہ بن سکتا تھا۔ میں نے اپنے لباس میں چھپا ہوا پستول نکال لیا اور گنگو کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ اب پستول کا استعمال ناگزیر ہو گیا تھا۔ گنگو مجھ سے تقریباً بیس قدم آگے تھا۔ میں نے فائر کر دیا..... گولی گنگو کی پشت پر لگی۔ وہ چیختا ہوا لڑکھڑا کر گرا..... میں دوڑتا ہوا اُس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تو میں نے اُس کی کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر جما دی۔ وہ پھر پشت کے بل گر گیا۔ میں نے اُس کے سینے پر پیر رکھ دیا۔

''تم سوئمبر کی بازی ہار گئے گنگو!'' میں نے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ جو جیت جائے گا وہ لونڈیا کو لے جائے گا اور جو ہار جائے گا وہ خاک و خون میں لوٹ جائے گا۔ اور اب تم خاک و خون میں لوٹنے کے لئے تیار ہو جاؤ.....!''

''مجھے معاف کر دو.....'' گنگو گڑگڑایا۔ ''میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں..... تم واقعی بڑے سورما ہو۔ مجھے شما کر دو! تم جو کہو گے میں کرنے کو تیار ہوں۔''

''تمہیں زندہ چھوڑ کر ہم اپنے آپ کو موت کے حوالے نہیں کرنا چاہتے۔'' میں نے کہتے ہوئے پستول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اُس کے چہرے کی طرف تان لیا..... گنگو کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اُس کی پیشانی پر لگی اور خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ میں اُچھل کر دُور ہٹ گیا۔ گنگو زمین پر اس طرح لوٹ رہا تھا جیسے بکرے کو گلے پر چھری چلا کر چھوڑ دیا گیا ہو۔

میں گنگو کو تڑپتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اچانک ہی وہ آواز سن کر چونک گیا..... وہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز تھی۔ میں دوڑ کر سیتا اور کلپنا کے قریب پہنچ گیا۔ زمین پر پڑے ہوئے

شاپنگ بیگز اُٹھائے اور اُن دونوں کے ساتھ ایک طرف دوڑنے لگا..... گاڑی کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ ایک موقع پر مکانوں کی طرف سے اُس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی بھی چمکتی ہوئی نظر آئی تھی۔

میں نے کلپنا کا ہاتھ پکڑ لیا اور تاڑ کے درختوں میں دوڑتا چلا گیا۔ سیتا بھی ہمارے پیچھے دوڑی آ رہی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ اب اُس گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ گاڑی اُس طرف آ رہی تھی جہاں گنگو کی لاش پڑی تھی..... اور پھر وہ گاڑی رُک گئی۔

ہم تینوں تاڑ کے گنجان درختوں میں گھستے چلے گئے.....!

○○○

درختوں اور کچے مکانوں میں ہوتے ہوئے ہم وہاں سے بہت دور نکل آئے۔ مسلسل دوڑتے رہنے سے کلپنا ہانپنے لگی تھی۔ سیتا کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ اُن کی وجہ سے مجھے رُک جانا پڑا۔ میں جانتا تھا ہم خطرے سے باہر نہیں ہوئے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُس گاڑی میں کون لوگ تھے۔ پولیس کی گاڑی وہ بہرحال نہیں تھی لیکن وہ جو کوئی بھی تھے اگر اُنہوں نے لاش دیکھنے کے بعد گاڑی سے اُتر کر ہمارا پیچھا شروع کر دیا تو وہ ہمارے گھر تک بھی پہنچ سکتے تھے۔

دو منٹ بعد میں پھر اُنہیں ساتھ لے کر تیز تیز چلنے لگا۔ کلپنا کا ہاتھ میں نے اب بھی پکڑ رکھا تھا۔ ہم اُس کچے مکان کی پچھلی طرف سے گزرے جہاں پہلے روز دو عورتوں نے ہمیں دیکھ کر پرنام کیا تھا۔ اُس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ یہاں بجلی بھی نہیں تھی اور اس وقت کسی کے مکان کے باہر موجود ہونے کا امکان بھی نہیں تھا جو ہمیں دیکھ لیتا۔ لیکن میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

درختوں کے جھنڈ سے نکلنے کے تقریباً پانچ منٹ بعد ہم اپنے مکان پر پہنچ گئے۔ دروازے پر باہر کی طرف بوری کا پردہ پڑا ہوا تھا اور اندر ٹین کی چادر کا دروازہ تھا جو دن میں عام طور پر کھلا رہتا تھا مگر رات کو بند کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت وہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سیتا اور کلپنا کے اندر داخل ہونے کے بعد میں نے وہ دروازہ بھی بند کر دیا اور اُس میں لوہے کا کنڈا پھنسا دیا۔

راجیو اور شوبھا آنگن ہی میں تھے۔ شوبھا چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ پتیلی میں شاید چاول چڑھے ہوئے تھے۔ چاولوں کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ راجیو چارپائی پر بیٹھا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔

''بہت دیر کر دی تم لوگوں نے..... ہم تو پریشان ہو رہے تھے۔'' راجیو نے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بازار میں دیر ہو گئی..... اور پھر راستے میں ایک سمسیا میں اُلجھ گئے تھے۔'' میں نے اُس کے قریب کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا اور دونوں شاپنگ بیگز سیتا کے حوالے کر دیئے جنہیں لے کر سیتا اندر چلی گئی۔

شوبھا چولہے کے سامنے سے اُٹھ کر جلدی سے دوسری چارپائی اُٹھا لائی اور پہلی چارپائی کے قریب بچھا دی۔ کلپنا کے ہاتھ میں اب بھی امرودوں والا تھیلا تھا۔ اُس نے وہ تھیلا شوبھا کے

والے کر دیا اور کھاٹ پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ ایک کیراسین لیمپ چولہے والے کے قریب رکھا ہوا تھا اور دوسرا کمرے میں تھا۔ باہر والے لیمپ کی روشنی کلپنا کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور اُس کے چہرے پر خوف کے تاثرات بھی نظر آ رہے تھے۔

''کیسی سمسیا پڑ گئی تھی مہابیر جی؟'' راجیو نے پوچھا۔

''ایک پرانے پاپی سے آمنا سامنا ہو گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا اور پھر میں اُسے اُس واقعہ کے بارے میں بتانے لگا۔

''یہ تو بہت برا ہوا مہابیر جی!'' راجیو کے لہجے میں تشویش تھی۔

''ہمیں بہرحال محتاط رہنا پڑے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

سیتا کمرے سے نکل کر شوبھا کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اور شوبھا دو پلیٹوں میں چاول نکال کر دینے لگیں۔ ہندوستان کے عام باشندوں کی خوراک دال چاول ہی تھی۔ غریب طبقے میں تو زیادہ تر دال چاول ہی کھائے جاتے تھے کہ پیٹ بھرنے کے لئے سب سے سستی خوراک یہی تھی۔

ہم ابھی کھانا کھا رہے تھے کہ باہر کا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا..... سیتا، شوبھا اور کلپنا ایک چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں اور راجیو دوسری کھاٹ پر تھے۔ راجیو نے صرف دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اُس نے قریب پڑی ہوئی میلی چادر اُٹھا کر کندھے پر ڈال لی اور اُٹھ کر دروازے کی طرف چل دیا اور اس دوران دروازہ دوسری مرتبہ کھٹکھٹایا گیا تھا.....

''کون ہے بھایا..... آ رہا ہوں۔ ہری رام..... ہری اوم.....''

میں محتاط ہو کر بیٹھ گیا..... پستول نکال کر چاولوں کی پلیٹ کے ساتھ رکھ لیا۔ اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو پستول استعمال کرنے میں دریغ نہیں کروں گا۔

''نمسکار تھانیدار جی..... خیریت، کوئی چور بھاگ گیا کیا؟'' راجیو کی آواز سنائی دی۔

''چور نہیں پنڈت جی! ہمیں ایک ہتیارے کی تلاش ہے۔'' دوسری آواز سنائی دی۔ وہ غالباً اُسی پولیس والا تھا جسے راجیو نے تھانیدار کہا تھا۔ ''ایک گھنٹہ پہلے یہاں سے آگے ایک آدمی کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ قاتل شاید اب بھی اسی علاقے میں ہے۔ ہمیں اُس کی تلاش ہے۔ آپ نے کوئی مشتبہ آدمی نہیں دیکھا اس طرف؟''

''نہیں مہاراج!'' راجیو نے جواب دیا۔ ''میرے تو مہمان آئے ہوئے ہیں۔ بھوجن کر رہے ہیں اس وقت۔ آپ بھی پدھاریئے! کوئی جل پان.....''

''شکریہ پنڈت جی! پر آپ کے یہ مہمان کون ہیں؟'' وہی آواز سنائی دی۔

''وہ دیکھئے..... وہ بیٹھے بھوجن کر رہے ہیں۔'' راجیو نے دروازے کا بوری کا پردہ پوری طرح ہٹا دیا۔ ''وہ میری دیدی ہے اور وہ میرے جیجا جی۔ اور وہ میری دوسری بہن ہے اور اُس کے ساتھ میری پتنی بیٹھی ہوئی ہے۔ شوبھا نام ہے اُس کا، دال بھات بہت اچھی بناتی ہے۔ آپ

بھی.....''

''دھنے باد پنڈت جی!'' پولیس والے نے پھر اُس کی بات کاٹ دی۔ ''ویسے آپ لوگ محتاط رہئے! وہ ہتیارا ابھی اسی علاقے میں موجود ہے۔''

''آپ فکر نہ کرو مہاراج!'' راجیو نے جواب دیا۔ ''ہمیں مل گیا تو اُسے رسیوں سے باندھ کر آپ کو اطلاع دے دیں گے۔ جی اچھا..... جے رام جی کی۔''

راجیو دروازہ بند کر کے اندر آ گیا اور میرے سامنے بیٹھ کر دوبارہ پلیٹ میں ہاتھ ڈال دیا۔

''پولیس کو اُس قتل کی اطلاع ہو چکی ہے اور اُن کا خیال ہے کہ قاتل ابھی تک اسی علاقے میں موجود ہے۔'' وہ نوالہ منہ میں ڈالنے سے پہلے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''وہ غلط نہیں کہتا۔'' میں نے مسکا کر جواب دیا۔ ''ہم تو ابھی تک واقعی یہیں موجود ہیں۔''

''احمق کہیں کے.....'' سیتا ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو قاتل کو اس طرح تلاش کر رہے ہیں جیسے وہ اُن کے انتظار میں بیٹھا ہو۔''

کھانے کے بعد بھی ہم آنگن میں بیٹھے رہے۔ یہاں مچھر بڑے ظالم قسم کے تھے۔ بڑی بے رحمی سے ہمارا خون چوس رہے تھے اور ہم اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ کلپنا کی طرف سے اب میری پریشانی کچھ کم ہو گئی تھی۔ اُسے پہچاننے والوں میں ایک کے سوا سب مارے جا چکے تھے۔ رام چند دھوبی اور اُس کا ایک ساتھی کئی روز پہلے ہی میرے اور کلپنا کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ گنگو آج اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اب صرف وہ بوڑھا ٹھاکر رہ گیا تھا جو اس سارے فساد کی اصل جڑ تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ جب وہ گنگو کے بارے میں سنے گا تو سامنے آنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ کلپنا کو اب منہ چھپانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

ہمارا اس مکان میں رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ ابھی تک کسی کو شبہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن شبہ ہو جانے کی صورت میں یہ مکان محفوظ نہ ہوتا۔ اُسے چار آدمی بھی اگر چاروں طرف سے گھیر لیتے تو ہمارے فرار کا کوئی راستہ نہ رہتا۔ ہم آسانی سے مارے جا سکتے تھے۔ ہمارے پاس اتنی رقم آ چکی تھی کہ ہم کچھ عرصہ کے لئے کرائے کا کوئی مکان لے سکتے تھے۔

صبح راجیو اور شوبھا مکان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کلپنا بھی اُن کے ساتھ چلی گئی تھی۔ میں اور سیتا اُس مکان میں اکیلے رہ گئے۔ میں آنگن میں درختوں کے نیچے کھاٹ پر لیٹا صورتحال پر غور کرتا رہا۔ لودروا والے کیمپ کو ہم تباہ کر چکے تھے۔ اسرائیلی ایجنٹ واپس جا چکے تھے۔ کیمپ اس طرح تباہ ہوا تھا کہ اُسے دوبارہ قابل عمل بنانے کے لئے کئی مہینے درکار تھے۔ اس طرح وقتی طور پر بھارتی حکمرانوں کا یہ منصوبہ التوا میں پڑ گیا تھا۔

دہشت گردوں کو تربیت دینے کا ایک کیمپ جیسلمیر چھاؤنی میں بھی تھا لیکن وہاں ہمارا داخلہ ممکن نہیں تھا۔ سیتا فوراً ہی پہچان لی جاتی۔ اور ویسے ہمارا یہ خیال بھی غلط تھا کہ ہماری تلاش کی سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ لودروا کیمپ کی تباہی کے بعد ہم پہلی مرتبہ گزشتہ رات باہر نکلے تھے

اور میں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ شہر کی تمام اہم سڑکوں پر چیکنگ ہو رہی تھی۔ گاڑیوں کو روک کر پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ بعض گاڑیوں کی تلاشی بھی لی جا رہی تھی۔

پولیس کو ایک مرد اور ایک عورت کی تلاش تھی۔ ایسے جوڑوں کو روک کر اُن سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ میں اور سیتا یا میں اور کلپنا اکیلے ہوتے تو یقیناً ہمیں بھی کہیں نہ کہیں روکا جاتا۔ لیکن وہ چونکہ تین تھے، ایک مرد اور دو عورتیں، اس لئے ہم بچے رہے تھے۔ لیکن جس طرح چیکنگ ہو رہی تھی اُس کے پیش نظر میں جانتا تھا کہ ہم زیادہ عرصہ تک چھپے نہیں رہ سکیں گے۔ اور ظاہر ہے ہم گھر میں بھی بند ہو کر نہیں رہ سکتے تھے۔

سیتا کے پاس بھی کرنے کو کوئی کام نہیں تھا۔ وہ بھی میرے قریب دوسری کھاٹ پر لیٹ گئی۔ باتوں ہی باتوں میں دُرگا کا ذکر بھی آ گیا۔ دُرگا کے نام پر سیتا کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔

''میں اُس شخص کو زندہ نہیں چھوڑوں گی جس نے دُرگا پر تشدد کیا تھا۔'' سیتا نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

''وہ تو پولیس کی تحویل میں تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اور جب کوئی ملزم پولیس کی تحویل میں ہوتا ہے تو آنے جانے والا ہر پولیس اہلکار حسب توفیق ملزم کو ایک دو ہاتھ ضرور لگا دیتا ہے۔ ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ دُرگا پر تشدد کس نے کیا تھا؟''

''میں اُن پولیس اہلکاروں کی بات نہیں کر رہی۔'' سیتا بولی۔ ''یہ کوئی معمولی چوری یا دھوکہ دہی کا کیس نہیں تھا کہ دُرگا کو تھانے میں اس طرح رکھا گیا ہو گا کہ ہر آنے جانے والا ایک آدھ ہاتھ لگا دیتا۔ یہ بہت حساس اور اہم معاملہ تھا۔ دُرگا کو تو کسی ایسے جلاد قسم کے پولیس آفیسر کے حوالے کیا گیا ہو گا جس کو اپنے آپ پر بہت گھمنڈ ہو۔ اور میں اُس کا پتہ چلا لوں گی۔''

''میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں دُرگا کے قاتل کا گلا گھونٹ دُوں..... لیکن یہ نیا پنگا لے کر کیا اپنے لئے نئی مشکلات پیدا نہیں کر لیں گے؟'' میں نے کہا۔

''کیا دُرگا کی ہتیا ایسی بات ہے کہ اُسے فراموش کر دیا جائے؟'' سیتا نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''بالکل نہیں.....'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر تمہیں قاتل کو انجام تک پہنچانے میں میرا ساتھ دینا ہو گا۔'' سیتا نے کہا۔ ''وہ کون اور کہاں ہے؟ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو! میں اُسے تلاش کر لوں گی۔''

''میں تمہارا ساتھ دُوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دُرگا نے ہمارے لئے اپنی جان دے دی۔ وہ چاہتی تو پولیس کو بتا دیتی کہ ہم کہاں ہیں..... لیکن اُس نے اپنا جیون تو دان کر دیا پر ہم کو آنچ نہیں آنے دی..... میں اتنا احسان فراموش بھی نہیں ہوں کہ اس طرف سے آنکھیں بند کر لوں۔''

''ٹھیک ہے.....'' سیتا نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ''تو یہ وعدہ رہا کہ ہم دُرگا کے قتل کا

انتقام لئے بغیر اس شہر سے نہیں جائیں گے۔''

''وعدہ رہا.....'' میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

دوپہر ہوگئی تھی۔ راجیو وغیرہ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ سیتا اُٹھ کر چائے بنا لائی۔ اتنی گرمی میں چائے..... لیکن چائے تو بہر حال ایسی چیز تھی جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

راجیو وغیرہ کی واپسی چار بجے کے قریب ہوئی تھی۔ مکان مل جانے کی نوید کے علاوہ وہ ہمارے لئے کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی لے کر آئے تھے۔ میں اور سیتا صبح سے بھوکے بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے فوراً ہی اُن چیزوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

راجیو نے دھوبی پاڑے میں ایک مکان کرائے پر حاصل کر لیا تھا اور اگلے ہی روز ہم اُس مکان میں منتقل ہو گئے..... دھوبی پاڑہ اگرچہ گنجان آبادی کا علاقہ تھا لیکن وہ مکان میری منشا کے عین مطابق تھا۔ پرانی طرز کا یہ مکان چار کمروں پر مشتمل تھا اور وسیع پختہ صحن تھا جس میں مختلف فاصلوں پر چار درخت لگے ہوئے تھے۔ تین درخت ناریل کے تھے اور ایک نیم کا قد آور اور سایہ دار درخت۔ اُن درختوں کے اردگرد کچی زمین تھی اور اینٹوں کی منڈیر سے دائرے بنے ہوئے تھے۔ برآمدے کے سامنے اسی طرح تلسی کا ایک پودا بھی لگا ہوا تھا۔ ہندوؤں میں تلسی کے پودے کو بہت مقدس سمجھا جاتا ہے اور بعض طبقے تو اُس کی پرستش بھی کرتے ہیں۔

یہ مکان میری منشا کے مطابق تھا۔ اُس کے دونوں طرف گلیاں تھیں اور دونوں طرف دروازے تھے۔ ایک طرف کا دروازہ تو بہت ہی تنگ سی گلی میں کھلتا تھا۔ البتہ دوسری طرف کشادہ گلی تھی۔

یہ مکان ایک دولت مند ہندو بیوہ کا تھا۔ چند روز پہلے تک وہ خود یہاں رہتی تھی۔ اُس کا ایک بنگلہ بھی تھا جو اُس نے کرائے پر دے رکھا تھا۔ وہ بنگلہ خالی ہوا تو خود وہاں منتقل ہو گئی۔ یہاں فرنیچر وغیرہ موجود تھا البتہ ہمیں کچھ برتن اور ضرورت کی چیزیں لانی پڑی تھیں۔

تین چار دن تو ہم اُس مکان سے باہر نہیں نکلے۔ راجیو ہی سارے کام کر رہا تھا۔ کبھی کلپنا بھی اُس کے ساتھ چلی جاتی۔ گنگو کی موت کے بعد کلپنا کا خوف اب دُور ہو چکا تھا۔ ٹھاکر کے سوا اب کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جو اُسے شناخت کر سکتا اور ٹھاکر سے کہیں آمنا سامنا ہونے کی توقع نہیں تھی۔

اور پھر سیتا نے بھی مکان سے باہر آمد و رفت شروع کر دی..... پہلے تو اُس نے ملبوسات کے علاوہ ضرورت کی چند ایسی چیزیں خریدیں جن سے وہ اپنا حلیہ بدل سکتی تھی۔ اُس کی آنکھیں ہرنی کی طرح موٹی اور سیاہ تھیں۔ اُس نے ہلکے نیلے رنگ کے کنٹیکٹ لینز لگوا لئے۔ ان کنٹیکٹ لینز سے اُس کی آنکھوں کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن اُس میں کچھ تبدیلی ضرور آ گئی تھی۔ اُس نے بالوں کا سٹائل بھی بدل لیا اور میک اپ سے اُس کے چہرے میں بھی بڑی تبدیلی آ گئی۔ اُسے گہری نظروں سے دیکھے بغیر سیتا کی حیثیت سے شناخت کر لینا آسان نہیں تھا۔

میں نے بھی داڑھی مونچھوں کو مخصوص انداز میں تراش کر چہرے میں بڑی تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ آنکھوں کی رنگت تبدیل کرنے کے لئے مجھے بھی کنٹیکٹ لینز کا سہارا لینا پڑا تھا۔ میری آنکھیں بھی اگرچہ سیاہ تھیں لیکن میں نے اپنے لئے براؤن رنگت کے لینز پسند کئے تھے۔ دھوتی، مخصوص تراش کا کرتہ اور سر پر بل دار پگڑی۔ اس حلیے میں، میں کوئی ٹھاکر ہی لگتا تھا۔ اُس روز میں اور سیتا کئی روز بعد اکٹھے باہر نکلے تھے۔ سیتا نے گولڈن بارڈر والی سرمئی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس لباس میں وہ قیامت ہی لگ رہی تھی۔ میں مخصوص راجستھانی لباس میں تھا۔

ہم کشادہ گلی کی طرف مکان سے نکلے تھے۔ چند گز دائیں طرف جا کر یہ گلی بازار سے جا ملتی تھی۔ ہم اُس بازار میں کچھ دُور تک پیدل چلتے رہے پھر سیتا نے رکشہ رُکوا لیا۔ جب ہم گھر سے نکلے تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ رکشے نے بیس منٹ میں ہمیں مہاراجہ ہوٹل پہنچا دیا۔ اُس ہوٹل کا کلب سرکاری آفیسرز کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتا تھا۔ یہاں فوجی آفیسرز بھی آتے تھے، سرکاری محکموں کے کلیدی عہدوں پر فائز آفیسرز بھی اور پولیس کے آفیسرز بھی۔

''اسے تم گھوس خوروں کا اڈہ بھی کہہ سکتے ہو۔'' سیتا نے رکشے سے اُتر کر ہوٹل کے مرکزی گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سرکاری آفیسرز بھی آتے ہیں اور ٹھیکیدار اور کاروباری قسم کے لوگ بھی۔ یہ لوگ دفتروں میں جو بات نہیں کر سکتے یہاں کسی خوف کے بغیر اس پر تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ بریف کیس بھی ہاتھ بدلتے ہیں۔ اور جو کام دفتروں میں افسروں کی منت ہاجت سے نہیں ہو پاتا یہاں چٹکی بجاتے میں ہو جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں نوٹوں کی گڈیاں ایک جیب سے نکل کر دوسری جیب میں منتقل ہو جاتی ہیں۔''

''تم یہاں کس لئے آئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس ہوٹل کے کلب کو تم اطلاعات کا مرکز بھی کہہ سکتے ہو۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ایک گھنٹہ یہاں بیٹھو گے تو شہر کی بہت سی تازہ ترین معلومات حاصل ہو جائیں گی۔''

ہم برآمدے میں پہنچے تو دربان نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ وسیع و عریض لابی میں بھی خاصی رونق تھی۔ ہم ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ ایک ویٹر نے بڑے احترام سے ہمیں ایک خالی میز پر پہنچا دیا۔ اُس ہال میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ بہت سی نظریں سیتا کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔

''ہم بھوجن کریں گے۔'' سیتا نے ویٹر کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

ویٹر نے فوراً ہی دو خوبصورت مینو کارڈ پیش کر دیئے۔ میں نے اپنے لئے پنیر اور پالک کے کوفتے پسند کئے اور سیتا نے فرائی فش کا آرڈر نوٹ کروا دیا۔ بیس منٹ میں ہمارے سامنے کھانا حاضر کر دیا گیا۔ میں نے کئی روز بعد ڈھنگ کا کھانا کھایا تھا۔ پنیر اور پالک کے کوفتے میری پسندیدہ ڈش تھی۔ کھانا کھانے کا لطف آ گیا تھا۔ کھانے کے بعد ہم کلب ہال میں آ گئے۔

بہت وسیع و عریض ہال تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ بہت لمبا چوڑا بار کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے سامنے گول ریوالونگ اسٹولز پر بیٹھے ہوئے گاہک مے نوشی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے دیوار کے ساتھ شیشے کے شیلفوں پر رنگ برنگی شراب کی لاتعداد بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ ہال میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درجنوں میزیں ابھی خالی تھیں۔ گاہکوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ایسی جگہیں ظاہر ہے حسین عورتوں ہی کے دم سے آباد ہوتی تھیں۔

سامنے ایک وسیع خوبصورت سٹیج تھا جس کے سامنے جھلملاتا ہوا رنگ برنگی پردہ کھنچا ہوا تھا۔ موسیقی کی ہلکی آواز گویا دیواروں سے پھوٹ کر ہال کی فضا میں بکھر رہی تھی۔ ہم سٹیج سے ذرا ہٹ کر ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ٹھیک دس بجے سٹیج کا پردہ ہٹ گیا اور ایک رقاصہ کے درشن ہوئے۔ سٹیج کے ایک طرف پیچھے آرکسٹرا بھی موجود تھا۔ آرکسٹرا کی دُھنوں پر رقاصہ تھرکنے لگی.....

رقاصہ کا رقص شروع ہوا تو اُس کے جسم پر شریفانہ لباس تھا۔ لیکن ہیجان خیز موسیقی کی لہروں پر تھرکتے ہوئے وہ ایک ایک کر کے اپنے لباس سے بھی نجات حاصل کرتی جا رہی تھی۔ اور آخر کار اُس کے بدن پر دو چیتھڑے رہ گئے اور وہ سٹیج سے اُتر کر میزوں کے درمیان تھرکنے لگی۔

آہستہ آہستہ ہال کی رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ دو آدمی ہماری میز پر بھی آ کر بیٹھ گئے۔ اُنہوں نے ہم سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اور ہم نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ہمیں اعتراض کا کوئی حق بھی نہیں تھا کیونکہ ہم نے یہ میز ریزرو نہیں کرائی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ویٹر نے اُن دونوں کے سامنے شراب سے لبریز گلاس سرو کر دیئے۔ سیتا نے بھی سوفٹ ڈرنکس منگوا لئے۔

وہ دونوں آدمی شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے باتیں بھی کرتے رہے اور بار بار کن انکھیوں سے سیتا کی طرف بھی دیکھتے رہے۔ پہلے تو میں نے اُن کی باتوں پر توجہ نہیں دی تھی لیکن پھر ایک جملہ سنتے ہی چونک گیا..... ایک آدمی کہہ رہا تھا۔

''حیرت ہے..... اُنہیں اتنے روز بعد مندر میں کسی تہہ خانے کا خیال آیا۔ حالانکہ سب سے پہلے اُنہیں اس طرف توجہ دینی چاہئے تھی۔''

''اور میرا خیال ہے کہ لودروا کے اُس مندر کے تہہ خانے سے کوئی خزانہ تو برآمد نہیں ہوا ہو گا۔'' دوسرے نے کہا۔

میں نے سیتا کی طرف دیکھا، لگتا تھا وہ بھی اُن کی باتیں دلچسپی سے سن رہی تھی۔ پہلا آدمی کہہ رہا تھا۔ ''خزانہ تو نہیں ملا البتہ کیمپ کے سکیورٹی انچارج جگل ناتھ کی گلی سڑی لاش اور درجنوں انسانی ڈھانچے ملے ہیں۔ تہہ خانے کے اندر سے وہ طویل سرنگیں کیمپ کے اندر تک چلی گئی ہیں۔ اُن سرنگوں کے دریافت ہونے کے بعد کہانی کچھ بدل گئی ہے۔''

''کیا مطلب.....؟'' دوسرے آدمی نے پوچھا۔

''پہلے تو یہ سمجھا جا رہا تھا کہ کیمپ کے اندر ہی کا کوئی آدمی ہے جس نے قتل و غارت مچا رکھی

تھی اور دھماکے بھی اُسی نے کئے تھے۔ سرنگ کے اندر بھی ایک گارڈ کی گلی سڑی لاش ملی ہے۔ جگل ناتھ اور اُس گارڈ کو گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ان سرنگوں کو لاشوں کی دریافت کے بعد نظریہ بدل گیا ہے۔''

''اور اب نیا نظریہ کیا ہے؟'' دوسرے آدمی نے پوچھا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مہاراج! آپ ہماری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے؟''

''نہیں شریمان جی!'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ لوگ غالباً اُس لودروا کیمپ کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں جس کے بارے میں پچھلے دنوں بڑا چرچا رہا ہے۔''

''ہاں..... وہی لودروا کیمپ..... اُس کے بارے میں نئے نئے اور سنسنی خیز انکشافات ہو رہے ہیں۔ اور شریمتی جی! آپ تو ان باتوں سے بور نہیں ہو رہیں؟'' یہ بات پہلے آدمی نے کہی تھی جو مندر کے بارے میں انکشاف کر رہا تھا۔

''نہیں شریمان جی!'' سیتا مسکرا دی۔ اور اس طرح ہم بھی اُن کی طرف متوجہ ہو گئے اور اُن کی باتیں دلچسپی سے سننے لگے۔

''ہاں..... تو دوسرا نظریہ کیا ہے راؤ جی؟'' دوسرے آدمی نے پوچھا۔

''دوسرا نظریہ یہ ہے ٹھاکر پریم چند جی!'' پہلا آدمی گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''سرنگیں دریافت ہونے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ کارروائیاں کسی اندر کے آدمی کی نہیں، باہر کے آدمیوں کی تھیں اور باہر کے آدمیوں میں مندر کے پنڈت اور اُس کی خوبصورت ساتھی لڑکی کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ اس کے بارے میں فی الحال یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ لڑکی ''را'' کی سابق ایجنٹ سیتا اور وہ پنڈت کشمیری مجاہد شمروز تھا جس کے بارے میں پولیس اور انٹیلی جنس کو یہ جانکاری ہوئی ہے کہ وہ دونوں جیسلمیر میں موجود ہیں۔ کچھ دن پہلے تک وہ دونوں مہارانا ہریش سنگھ کی رکھیل دُرگا کی حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دُرگا کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ کی گئی مگر اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ اور خیال ہے کہ اُن دنوں وہ دونوں سادھوؤں کے بھیس میں اُس مندر میں موجود تھے۔ کیمپ کے سکیورٹی انچارج جگل ناتھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کیمپ سے اُن دونوں کے لئے ناشتہ اور کھانا لے کر آتا تھا۔ پہلے تو یہی سوچا گیا کہ وہ اُس دُرگو پی کے چکر میں ہے مگر دھماکوں کے بعد جب وہ بھی لاپتہ ہو گیا تو یہ سمجھا گیا کہ دھماکوں میں اُس کا ہاتھ تھا اور وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے غائب ہو گیا ہے۔ لیکن مندر کے تہہ خانے سے اُس کی لاش ملنے کے بعد سوچنے والوں کی سوچوں کا رُخ بھی بدل گیا ہے۔'' راؤ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اب اس نظریئے پر غور کیا جا رہا ہے کہ جگل ناتھ بھی اُن دونوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ وہ تہہ خانے کی سرنگوں کے ذریعے کیمپ میں داخل ہوتے اور لاشیں گرا کر غائب ہو جاتے۔ اُن کے لئے گولہ بارود بھی اُنہیں جگل ناتھ ہی نے فراہم کیا تھا۔ اور وہ گارڈ بھی اُن کے

ساتھ شامل تھا جس کی لاش سرنگ کے اندر پائی گئی ہے۔ اور جب اُن لوگوں کا مطلب پورا ہو گیا تو وہ اُس گارڈ اور جگل ناتھ کو بھی قتل کر کے فرار ہو گئے۔ انٹیلی جنس کو پورا یقین ہے کہ وہ سیتا اور شمروز ہی تھے جو اب بھی جیسلمیر میں موجود ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اُن کی گرفتاری اور نشاندہی کے لئے لاکھوں روپے کے انعام کا اعلان کیا جانے والا ہے۔ کل یا پرسوں کے پیپرز میں شمروز کی وہ تصویر بھی شائع کی جائے گی جو ایک میگزین میں چھپی تھی اور اُس سے اُسے شناخت کیا گیا تھا۔''

''ایک بات بتاؤ راؤ جی!'' پریم چند شراب کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟ ابھی تک تو کسی پیپر میں ایسی کوئی بات نہیں چھپی۔''

''تم بھول گئے ہو کہ میرا بھانجا بابو راؤ انٹیلی جنس میں ہے۔'' راؤ نے جواب دیا۔ ''میں گھر سے نکلنے والا تھا کہ وہ ملنے کے لئے آ گیا۔ سب کچھ اُس سے معلوم ہوا ہے۔ اور مندر کے نیچے تہہ خانے کا انکشاف بھی آج دوپہر کے وقت ہی ہوا ہے۔ اگر بابو راؤ انٹیلی جنس میں نہ ہوتا تو میں بھی دوسروں کی طرح ان باتوں سے بے خبر ہی رہتا۔ بہت سی باتیں تو اخباروں میں بھی نہیں چھپتیں۔ ایک بات اور.....'' راؤ جی نے شراب کا آخری گھونٹ پی کر ویٹر کو مزید شراب لانے کا اشارہ کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''وہ دونوں درگا نامی اُس عورت کے پاس جس حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے اُسے سیل کر دیا گیا تھا۔ لیکن اب کل کسی وقت وہ حویلی کھولی جائے گی اور انسپکٹر وشوا ناتھ حویلی کی تلاشی لے گا۔ ہو سکتا ہے حویلی سے اُن دونوں کا کوئی سراغ مل جائے۔''

''انسپکٹر وشوا ناتھ کوئی توپ قسم کی چیز لگتا ہے۔ میں نے پہلے بھی اہم معاملات میں اُس کا نام سنا ہے۔'' پریم چند نے کہا۔

''وہ واقعی توپ چیز ہے..... اپنے محکمہ میں وہ جلاد کے نام سے مشہور ہے۔ درگا نامی عورت سے تفتیش کی ذمہ داری بھی اُسی کو سونپی گئی تھی۔ اُس نے ایسے ایسے ہاتھ دکھائے کہ درگا کی آتما بھی بیاکل رہے گی۔ اُس نے درگا کی ٹانگیں چیر دیں۔ مگر درگا بھی بڑی سخت جان عورت تھی اُس نے جان دے دی مگر زبان نہیں کھولی۔''

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور جھرجھری لے کر رہ گئی۔ راؤ جی نے بھی اُس کی اس کیفیت کو نوٹ کر لیا اور جلدی سے بولا۔

''معاف کرنا دیوی جی! ہم بس آپ کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئے تھیں۔''

''کیا ایسے ظالم لوگ بھی اس دنیا میں موجود ہیں؟'' سیتا نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کسی کی زبان کھلوانے کے لئے پولیس کے اپنے کچھ طریقے ہوتے ہیں۔ اور پھر آپ یہ بھی تو سوچئے وہ عورت کسی ہمدردی کی مستحق نہیں تھی۔ اُس نے ایسے دو اُگروادیوں کو پناہ دے

رکھی تھی جنہوں نے سینکڑوں لوگوں کو بے دردی سے.....''

''معاف کیجئے شریمان جی!'' سیتا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''میں ایسی باتیں نہیں سن سکتی۔ چلئے سوامی جی! میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''شما چاہتا ہوں دیوی جی!'' راؤ جی نے اُٹھ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''میری باتوں سے آپ کو...''

''کوئی بات نہیں.....'' سیتا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر اُس کی بات کاٹ دی۔ ''میں کمزور دل عورت ہوں..... اور آپ کو عورتوں کے سامنے ایسی خوفناک باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

''آئندہ خیال رکھوں گا۔'' راؤ جی نے ایک بار پھر معذرت کی۔

ہم میزوں کے گرد گھومتے ہوئے دروازے کی طرف چلنے لگے۔ وقت گزرنے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور ہال بھر چکا تھا۔ ایک نئی رقاصہ میزوں کے درمیان تھرکتے ہوئے مختلف زاویوں سے اپنے جسم کی نمائش کر رہی تھی۔

ہم لابی سے گزرتے ہوئے باہر آ گئے۔ سیتا رُک کر تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لیتی رہی پھر میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگی۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔ اس وقت لان میں بھی خاصی رونق تھی۔ یہاں بھی لاتعداد گاہک موجود تھے۔ دائیں طرف کہیں بار بی کیو اسٹینڈ لگا تھا اور اُس طرف سے بڑی اشتہا آمیز خوشبو آ رہی تھی۔

''ہاں..... میں ٹھیک ہوں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''سنا تم نے..... اُس راکھشس نے درگا کو کس طرح ہلاک کیا تھا؟''

''خاموش رہو..... گھر جا کر بات کریں گے۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''اُس کا نام معلوم ہو گیا ہے۔ میں اُس درندے کو چھوڑوں گی نہیں۔ اُسے بھی اسی طرح ٹانگیں چیر کر.....''

''پلیز سیتا.....!'' میں نے اُس کا ہاتھ دبا دیا۔ ''ہمارے آس پاس لوگ موجود ہیں۔ بہتر ہے اپنی زبان بند رکھو!''

ہم گیٹ سے باہر آ گئے۔ سڑک کے ساتھ کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ سفر کے لئے میں نے وہی پرانی پالیسی اپنائی تھی۔ نصف فاصلہ طے ہونے کے بعد ہم نے ایک بارونق چوک پر وہ ٹیکسی چھوڑ دی۔ کچھ دُور تک پیدل چلتے رہے، پھر ایک آٹو رکشہ میں بیٹھ گئے۔ گھر پہنچتے ہی سیتا پلنگ پر گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی.....

''کیا ہوا..... سیتا دیوی کو کیا ہوا؟'' راجیو جلدی سے بولا۔ وہ تینوں ایک دم پریشان ہو گئے تھے اور کلپنا کے چہرے پر تو ہوائیاں سی اُڑنے لگی تھیں۔

''کچھ نہیں..... درگا کے بارے میں کچھ باتیں سن کر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی۔''

میں نے کہا۔

شوبھا دوڑ کر پانی کا گلاس لے آئی۔ کلپنا اُس کے قریب بیٹھ کر اُسے تسلی دینے لگی۔ سیتا اُس سے لپٹ کر پہلے سے بھی زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کلپنا بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی تھی۔

میں نے مداخلت نہیں کی۔ دل کا غبار نکل جائے تو اچھا ہے۔ تقریباً دس منٹ بعد سیتا اپنی حالت پر قابو پا سکی تھی۔ اور تب میں نے راجیو وغیرہ کو بتایا کہ سیتا کے جذبات کیوں بے قابو ہو گئے تھے۔

میں اب سیتا کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے جذبات کا یہ طوفان دیکھ کر مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ دُرگا کو کتنا چاہتی تھی۔

○

قد ساڑھے پانچ فٹ، کسرتی جسم، مضبوط ہاتھ پیر، تانبے جیسی رنگت، ٹوتھ برش ٹائپ کی بھاری مونچھیں، دائیں رُخسار پر تقریباً ڈیڑھ انچ لمبے زخم کا نشان، دانت میلے تھے جیسے کبھی منجن نہ کیا گیا ہو۔ تاہم سامنے اُوپر والے ایک دانت پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا۔ بائیں کان میں سونے کی بالی تھی اور سر کے بال بے تحاشہ لمبے تھے جنہیں گردن پر الاسٹک ہیئر بینڈ میں چٹیا کی صورت میں باندھ رکھا تھا۔ اُس نے ڈارک براؤن رنگ کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور دلچسپی کی بات یہ تھی کہ بش شرٹ کے آستین نہیں تھے۔ یہ شاید کوئی نیا فیشن ایجاد ہوا تھا۔ اور یہ لباس اُس پر بالکل نہیں جچ رہا تھا۔

شکل وصورت اور لباس سے وہ کوئی تھرڈ ریٹ سڑک چھاپ غنڈہ ہی لگتا تھا جسے اُس شاندار ہوٹل میں دیکھ کر حیرت بھی ہوئی تھی۔ لیکن وہ کوئی غنڈہ نہیں تھا۔ پولیس انسپکٹر وشوا ناتھ تھا جو اپنے محکمہ میں جلاد کے نام سے مشہور تھا اور یہ نام غلط نہیں دیا گیا تھا۔ وہ واقعی جلاد تھا اور دُرگا کا قاتل...!

اُس رات مہاراجہ ہوٹل کے کلب میں راؤ جی اور پریم چند نامی آدمیوں کی باتیں سننے کے بعد سیتا نے یہ عہد کر لیا تھا کہ اب وہ وشوا ناتھ کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس کلب کے بارے میں سیتا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہاں شہر کے بڑے بڑے لوگ جمع ہوتے تھے۔ فوج، پولیس اور سرکاری دفتروں کے اعلیٰ افسران نے بھی اس کلب کو اپنا اڈہ بنا رکھا تھا۔ اور یہاں صرف ایک گھنٹہ بیٹھ کر شہر کے بارے میں بہت سی تازہ ترین معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔ ہم اُس رات تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے وہاں رہے تھے اور ہمیں جو سنسنی خیز معلومات حاصل ہوئی تھیں اُس پر واقعی مجھے حیرت ہوتی تھی۔

مندر تہہ خانے اور جگل ناتھ اور دوسرے گارڈ کی لاشوں کی دریافت کے بارے میں وہ خبر تیسرے روز اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ اخبارات نے اور بھی بہت سے سنسنی خیز انکشافات کئے تھے اور اُن کا بہرحال ہم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایک انکشاف یہ بھی تھا کہ ایک غیر ملکی

سیکرٹ ایجنٹ بھی انٹیلی جنس آفیسر کے بھیس میں اُس کیمپ میں تھا۔ جو کیمپ کے تمام پروگرام اور سرگرمیوں کو خفیہ کیمروں کے ذریعے مائیکرو فلم میں محفوظ کرتا رہا تھا۔ اُس انٹیلی جنس آفیسر کو شہر میں ایک ایسے آدمی کے ساتھ دیکھا گیا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حکومتوں کو بلیک میل کرنے میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ اُس کا طریقہ کار بڑا دلچسپ تھا۔ وہ کروڑوں روپیہ خرچ کر کے حکومت ہی کے آدمیوں کے ذریعے حکومت کے اہم ترین راز حاصل کرتا اور اُن کی بنیاد پر حکومت کو بلیک میل کر کے اربوں روپے کماتا۔ اور اب تک تیسری دنیا کی کئی حکومتوں کو اس طرح بلیک میل کر چکا تھا۔ اخبار نے تو یہاں تک لکھا تھا کہ یہ انٹرنیشنل بلیک میلر کئی سال پہلے بھی چین کے حوالے سے ایک اہم راز کے سلسلے میں ہندسرکار کو بلیک میل کر کے تین ارب روپے وصول کر چکا تھا اور اب پھر جیسلمیر جیسی اہم ترین چھاؤنی میں اُس کی موجودگی اور ایک انٹیلی جنس آفیسر سے اُس کا میل ملاپ خطرے کی علامت سمجھا جا رہا تھا۔

اس سارے ڈرامے سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بہرحال ہم بروقت آگاہ ہو گئے تھے اور ہم نے محتاط رویہ اختیار کر لیا تھا۔ شہر میں ایک بار پھر ہلچل سی مچ گئی تھی اور مشتبہ لوگوں کو چیک کیا جا رہا تھا۔ میں نے سیتا کو مشورہ دیا تھا کہ دو چار روز تک ہمیں بھی اپنی پناہ گاہ میں دبک رہنا چاہئے لیکن دُرگا کے قاتل کے بارے میں آگاہ ہو جانے کے بعد سیتا کے لئے آرام سے بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا۔

اور پھر تیسرے ہی روز سیتا نے انسپکٹر وشوا ناتھ کو کھوج نکالا تھا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ وشوا ناتھ بھی اُس وقت مہاراجہ ہوٹل کے کلب میں موجود تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص پولیس آفیسر ہو سکتا ہے۔ اُس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت بھی تھی جس نے اپنے آپ کو جوان اور حسین بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ وہ دونوں اُس وقت ڈانس فلور پر تھے۔ تقریباً درجن بھر جوڑے موسیقی کی مدھ بھری تانوں پر ڈانس فلور پر تھرک رہے تھے۔

ایک راؤنڈ ختم ہوا تو انسپکٹر وشوا ناتھ ہمارے ساتھ والی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ پانچ منٹ کے وقفے سے رقص کا دوسرا راؤنڈ شروع ہوا تو سیتا اُٹھ کر دوسری میز کی طرف چلی گئی اور کچھ کہے بغیر وشوا ناتھ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اُسے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اُس جیسی حسین لڑکی کے سامنے کون کافر انکار کر سکتا تھا؟

وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ڈانس فلور پر پہنچ گئے۔ کئی اور جوڑے بھی اُٹھ اُٹھ کر تھرکنے لگے تھے۔ وشوا ناتھ نے سیتا کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ سیتا کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا ہاتھ اُس نے سیتا کی کمر پر حمائل کر رکھا تھا۔ اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اُس نے ہاتھ سے سیتا کو اپنے ساتھ دبا رکھا تھا۔ سیتا کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی اور وہ دونوں سرگوشیوں میں کچھ باتیں بھی کر رہے تھے۔

وہ راؤنڈ بھی ختم ہوا۔ انسپکٹر وشوا ناتھ اس مرتبہ سیتا کے ساتھ ہی ہماری میز پر آ گیا تھا۔

''یہ میرے پتی ہیں..... مہابیر سنگھ۔'' سیتا نے اُس نے میرا تعارف کرایا۔ ''چھ مہینے پہلے ہتھمبور میں اپنی زمینیں بیچ کر کاروبار کی نیت سے یہاں آئے تھے۔ ان کے ایک دوست نے وعدہ کیا تھا کہ آرمی میں فوڈ سپلائی یا کسی اور چیز کا ٹھیکہ دلوا دے گا۔ لیکن اب تک وہ انہیں ٹھینگا ہی دکھاتا رہا ہے۔''

ٹھیکہ اور ٹھینگا جیسی بات پر انسپکٹر وشواناتھ ہنس دیا۔ اور میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''اب یہ اُن کم کا ہوٹل یا کلب کھولنے کی سوچ رہے ہیں۔'' سیتا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مہابیر جی اگرچہ شرمیلے واقع ہوئے ہیں لیکن جوان اور حسین عورتوں میں رہ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے ان کے لئے ایسا ہی کاروبار مناسب رہے گا۔''

اس مرتبہ بھی وشواناتھ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''مہابیر جی.....'' وہ میرا نام لیتے ہوئے کچھ چونک سا گیا، پھر بولا۔ ''ہاں تو مہابیر جی! آپ کی پتنی اتنی سندر ہے..... آپ کو دوسری عورتوں کی طرف دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''دل کو ذرا تقویت ملتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ویسے سیتا دیوی! تم نے شریمان جی کا تعارف نہیں کرایا۔''

میرے منہ سے سیتا کا نام سن کر بھی وہ چونک گیا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے تھے..... لیکن اُس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ وہ ایک ایسے کیس پر کام کر رہا تھا جس میں سیتا کا نام اُس کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ ہوسکتا ہے سیتا کے ساتھ اُس نے مہابیر کا نام بھی سن رکھا ہو۔ اور اس وقت یہ دونوں نام سن کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''یہ وشواناتھ جی ہیں پولیس آفیسر۔'' سیتا نے اُس کا تعارف کرایا۔ ''تمہیں یاد ہے مہابیر جی! اُس رات مہاراجہ کلب میں کوئی بات ہو رہی تھی تو کسی نے کہا تھا کہ انسپکٹر وشواناتھ جاوید ہے۔ اب دیکھو! یہ ہمارے سامنے بیٹھے ہیں، ان میں ایسی کوئی بات نظر آتی ہے؟ خوش گفتار، نرم اور ہمدردانہ لہجہ، پُر وقار شخصیت۔ مجھے تو یہ بہت اچھے انسان لگے۔''

''ہاں واقعی..... مجھے تو ان میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔'' میں نے مسکرا کر کہا تو وشواناتھ بھی مسکرا دیا۔

اس دوران ایک ویٹر ٹرالی لے کر قریب سے گزرا تو وشواناتھ نے اُسے روک لیا۔ ٹرالی پر شراب سے لبریز گلاس اور چند بوتلیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ وشواناتھ نے شمپین کے دو گلاس اُٹھا کر میز پر رکھ لئے۔ تیسرا گلاس اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اُسے روک دیا۔

''ہم دارو نہیں پیتے وشواناتھ جی..... آپ زحمت نہ کریں۔''

وشواناتھ نے تیسرا گلاس نہیں اُٹھایا۔ میز پر رکھے ہوئے دو گلاسوں میں سے ایک گلاس اُٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

رقص کا ایک اور راؤنڈ شروع ہو چکا تھا۔ وشواناتھ سیتا سے باتیں کر رہا تھا۔ میں اگرچہ

ہونقوں کی طرح رقص کرتی ہوئی عورتوں کو گھورتا رہا لیکن میری تمام تر توجہ اُن کی باتوں پر مرکوز تھی۔ سیتا واقعی بہت ذہانت کا ثبوت دے رہی تھی۔ اُس نے باتوں ہی باتوں میں یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ انسپکٹر وشواناتھ کی کار کلب کے باہر سڑک کے کنارے پر کھڑی تھی۔ سیتا نے اُس کار کا ماڈل اور نمبر بھی اُس کے منہ سے اُگلوا لیا۔

وشواناتھ دوسرا گلاس بھی خالی کر چکا تھا۔ وہ آخری گھونٹ لے کر خالی گلاس میز پر پٹختے ہوئے سیتا کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ''ایک راؤنڈ ہو جائے.....؟''

''ضرور.....!'' سیتا نے کہتے ہوئے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں اُن سے پہلے ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں چلتا ہوا سیتا!'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کلپنا پریشان ہو رہی ہوگی..... تم فارغ ہو کر جلدی آ جانا۔''

''ٹھیک ہے ڈیئر..... میں جلدی آ جاؤں گی۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

انسپکٹر وشواناتھ نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ کباب سے ہڈی نکل جانے پر وہ خوش ہو رہا ہوگا۔

عمارت سے باہر آ کر میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کلب کا اپنا پارکنگ پلاٹ تھا جو بھرا ہوا تھا۔ بہت سی گاڑیاں دائیں بائیں دُور دُور تک سڑک کے ساتھ کھڑی تھیں۔ وشواناتھ کی نیلی کار تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ وہ کار کلب کے گیٹ سے تقریباً سو گز آگے فٹ پاتھ کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ وہاں فٹ پاتھ پر ایک قد آور گنجان شاخوں والا درخت بھی تھا جس کی شاخیں سڑک کے اُوپر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اُس درخت کی وجہ سے یہاں کسی قدر تاریکی تھی۔

مجھے کار کی ڈگی کھولنے میں زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ڈگی میں گھس گیا..... ڈگی کافی کشادہ تھی اور اُس میں کوئی سامان بھی نہیں تھا۔ ٹٹولتے ہوئے مجھے ربڑ کا ایک ٹکڑا مل گیا جسے میں نے ڈگی کے ڈھکنے میں پھنسا دیا تاکہ ڈھکنا پوری طرح بند نہ ہو سکے۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی سیتا اور انسپکٹر وشواناتھ پہنچ گئے..... دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ انجن سٹارٹ ہوا اور کار حرکت میں آ گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک کار مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی اور پھر اس طرح جھٹکے لگنے لگے جیسے کار کسی کچے راستے پر پہنچ گئی ہو۔ میں نے ڈگی کی جھری سے جھانک کر باہر دیکھا۔ یہ شاید شہر کا کوئی نواحی علاقہ تھا۔ اور پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ کہیں کہیں بنگلے تھے جن میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

پندرہ منٹ مزید چلتے رہنے کے بعد بالآخر کار رُک گئی..... اُن دونوں کے اُتر جانے کے تقریباً پانچ منٹ بعد میں بھی ڈگی سے نکل آیا اور گہرے گہرے سانس لیتا ہوا چاروں طرف

دیکھنے لگا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں یہ علاقہ ابھی آباد ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں بنگلے بن چکے تھے۔ جو آباد تھے وہاں روشنیاں ہو رہی تھیں۔

یہ بھی ایک بنگلہ ہی تھا..... اُس کی چار دیواری تو تھی لیکن گیٹ ابھی نہیں لگا تھا۔ قریب ترین آباد بنگلہ تقریباً سو گز کے فاصلہ پر تھا۔ یہ بنگلہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وشوا ناتھ نے اندر داخل ہو کر تمام بتیاں جلا دی تھیں۔ میں محتاط انداز میں قدم اُٹھاتا ہوا عمارت کے پہلو کی طرف نکل گیا اور ایک کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے لگا..... اندر کہیں سے سیتا کے ہنسنے کی آواز تو سنائی دے رہی تھی مگر اُن دونوں میں سے کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس بنگلے میں اس وقت ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اور میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ انسپکٹر وشوا ناتھ سیتا کو اس ویران بنگلے میں کیوں لایا تھا..... سیتا جیسی حسین لڑکی ہو تو کوئی بھی مرد اپنے حواس پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ اور میں سمجھتا تھا کہ وشوا ناتھ کی موت ہی اُسے یہاں لے آئی تھی۔

اُن دونوں کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں دوسری طرف چلا گیا۔ ایک کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں چوکھٹ پر چڑھ کر بڑی آہستگی سے دوسری طرف کود گیا۔ اُس بنگلے میں فرنیچر وغیرہ کچھ نہیں تھا اور میرے خیال میں یہ بنگلہ ابھی پوری طرح تیار نہیں ہوا تھا اس لئے یہاں کوئی سامان بھی نہیں لایا گیا تھا۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا اُس کونے کی طرف بڑھ گیا جہاں سے سیتا کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا..... اُس کمرے میں بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ایک میز بھی تھی جس پر شراب کی دو بوتلیں اور تین گلاس رکھے ہوئے تھے۔ دو کرسیاں اور ایک صوفہ بھی تھا۔ وشوا ناتھ نے پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پہلے بھی یہاں عورتوں کو لاتا رہا ہے۔

میرے لئے وہ سنسنی خیز منظر تھا جو میں دیکھ رہا تھا۔ سیتا بیڈ پر پشت کے بل پڑی ہوئی تھی۔ اُس کی دونوں ٹانگیں نیچے لٹکی ہوئی تھیں..... ساڑھی کا پلو بھی اُس پر سے ہٹا ہوا تھا اور وشوا ناتھ اس طرح اُس کے اُوپر جھکا ہوا تھا کہ اُس نے سیتا کے دونوں بازو اپنے ہاتھوں سے دبا رکھے تھے اور سیتا کا بوسہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیتا ہنستے ہوئے سر کو اِدھر اُدھر حرکت دیتے ہوئے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نہایت دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو گیا اور آگے جھک کر انسپکٹر وشوا ناتھ کا کندھا تھپتھپایا..... پہلی مرتبہ شاید اُس نے توجہ نہیں دی۔ میں نے دوبارہ ذرا زور سے ہاتھ مارا۔

''شریمان جی..... ہم بھی یہاں موجود ہیں۔''

وشوا ناتھ اُچھل پڑا..... وہ جیسے ہی سیدھا ہوا میں نے زوردار گھونسہ اُس کے جبڑے پر جما دیا..... وہ کراہتا ہوا پلنگ پر اُلٹ گیا۔

''کک..... کون ہو..... تم.....؟'' اُس نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا۔ میری صورت دیکھ کر اُسے

پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ میں کون ہوں۔

''میرے سامنے میری پتنی پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کر رہے ہو انسپکٹر! شرم آنی چاہئے نہیں۔'' میں نے کہا۔

''تت..... تم یہاں کیسے آئے؟'' وشوا ناتھ ہکلایا۔

''تمہاری کار کی ڈگی میں بیٹھ کر۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''تکلیف تو مجھے بہت ہوئی تھی مگر کوئی بڑا مقصد حاصل کرنے کے لئے کشٹ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''بڑا مقصد..... کیا مطلب؟'' وشوا ناتھ نے مجھے گھورا۔

''تمہاری بہت تعریفیں سنی تھیں مگر تم تو بڑے چغد نکلے۔'' میں نے کہا۔ اسی دوران سیتا بیڈ سے اُٹھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ ''تم ایک نہایت اہم کیس پر کام کر رہے ہو۔ تمہیں تو اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا چاہئے۔ لیکن اس حسین لونڈیا کو دیکھ کر تمہاری عقل گھاس چرنے چلی گئی۔ تم یہ بھی بھول گئے کہ تمہیں کسی سیتا کی تلاش تھی اور وہ سیتا کلب میں تمہارے ساتھ ڈانس کر رہی تھی۔ اور سیتا اس طرح آسانی سے تمہارے ساتھ آ گئی تو تم سمجھے کہ وہ پھنس گئی اور تمہاری رات عیش میں گزرے گی۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو.....؟'' اُس کے حواس شاید اب بھی قابو میں نہیں تھے۔

''تم واقعی بہت بیوقوف ہو.....'' میں نے کہا۔ ''تم جلاد مشہور ہو۔ لیکن تم صرف اُن لوگوں پر ظلم کر سکتے ہو جنہیں پکڑ کر تمہارے ہاتھوں میں دے دیا جائے۔ تمہاری اپنی کھوپڑی میں عقل نام کی کوئی چیز نہیں جس سے تم کام کر سکو۔ تم نے ایک عورت کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ اُس کی ٹانگیں چیر ڈالیں..... لیکن اب یہ دیکھنا ہے کہ تمہاری بانہوں میں کتنی شکتی ہے۔''

وشوا ناتھ کے چہرے پر وحشت سی طاری ہو گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا..... اُس نے بڑی پھرتی سے پتلون کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے اُچھل کر اُس کے ہاتھ پر پیر کی ٹھوکر مار دی۔ ٹھوکر سے اُس کی اُنگلیاں مُڑ گئیں اور وہ زور زور سے ہاتھ جھٹکنے لگا۔ میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر دوسری ٹھوکر اُس کے گھٹنے پر لگائی۔ وہ ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔ اگلی ٹھوکر اُس کی دوسری ٹانگ پر لگی۔ وہ اپنی جگہ پر اُچھلا اور کولہوں کے بل زمین پر گرا۔ میں وشوا ناتھ کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس نے زمین پر پڑے پڑے ایک بار پھر ہاتھ پتلون کی جیب کی طرف بڑھایا۔ اس مرتبہ میرے پیر کی ٹھوکر اُس کی کنپٹی پر لگی اور وہ بلبلا کر رہ گیا۔ دوسری ٹھوکر میں نے اُس کے کندھے پر لگائی، وہ ایک بار پھر چیخ اُٹھا۔

''تم نے اپنے لئے خود ہی اس جگہ کا انتخاب کیا تھا.....'' میں نے اُسے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''اس ویرانے میں تمہاری آواز کوئی نہیں سنے گا..... یہی بنگلہ تمہاری سمادھی بنے گا۔''

وشوا ناتھ اپنا سیدھا ہاتھ جھٹک رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ اور اچانک ہی اُس نے میری طرف چھلانگ لگا دی..... میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر اُس

کی زد میں آنے سے بچ گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں لڑکھڑاتا ہوا مجھ سے آگے نکلا تو میں نے اُس کے کولہوں پر لات رسید کر دی۔ اُس کا سر دیوار سے ٹکرایا..... میں نے لپک کر اُسے شرٹ کے کالر سے پکڑ لیا اور ذرا سا پیچھے کھینچ کر اُس کا سر پوری قوت سے دیوار سے ٹکرا دیا۔ وہ چیخ اُٹھا... اُس کا سر پھٹا تو نہیں لیکن چوٹ اچھی خاصی لگی تھی۔

وہ ایک بار پھر ہاتھ پتلون کی جیب کی طرف بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جیب سے پستول نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے اُس کا کالر چھوڑ کر اُس کی کلائی کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا اور اُسے پوری قوت سے موڑتا چلا گیا۔

سیتا اب تک ایک طرف کھڑی تھی۔ اور پھر اچانک ہی اُس نے آگے بڑھ کر وشواناتھ کی ٹانگوں کے بیچ میں زوردار ٹھوکر مار دی۔ وشواناتھ بلبلا اُٹھا..... بازو میری گرفت میں ہونے کے باوجود وہ جھکتا چلا گیا۔ سیتا نے اُس کی ٹھوڑی پر نیچے کی طرف سے گھٹنے سے ضرب لگائی۔ وہ ایک بار پھر چیخ اُٹھا۔

''تم جیون کا مزہ لوٹنے کے لئے مجھے اپنے ساتھ یہاں لائے تھے نا... میں تمہیں بتاتی ہوں جیون کا مزہ کیا ہوتا ہے۔'' سیتا کہتے ہوئے کمر پر لپٹی ہوئی ساڑھی کھولنے لگی۔ ساڑھی کی نال کو قابو میں رکھنے کے لئے دو بکل لگے ہوئے تھے اُس نے دونوں بکل کھول کر ساڑھی اُتار دی..... اب اُس کے جسم پر بلاؤز اور پیٹی کوٹ رہ گیا تھا.....

''لو دیکھو..... اور اچھی طرح دیکھ لو کہ میں تمہاری زندگی میں آنے والی آخری عورت ہوں۔'' سیتا تن کر وشواناتھ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ''تم بہت بہادر ہو نا..... جلاد ہو۔ لوگ تمہارا نام سن کر تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔ لیکن اب میں جان گئی ہوں تم میں کتنی شکتی ہے۔ تمہاری اصل شکتی تو اُن سپاہیوں میں ہے جو شکار کر کے تمہارے سامنے ڈال دیتے ہیں اور تم درندہ بن کر اُسے ادھیڑ دیتے ہو۔ لیکن جو اپنا شکار خود نہ کر سکے وہ تو درندہ بھی نہیں کہلا سکتا۔ مردار خور ہوتا ہے وہ..... اور تم مردار خور ہو۔'' وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی اور پھر اُسے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے چیخی۔ ''چند روز پہلے تم نے ایک عورت پر بہادری کے جوہر دکھائے تھے..... وہ تمہارے سامنے بے بس پڑی تھی۔ ہاتھ پیر نہیں ہلا سکتی تھی اور تم نے اُس کی ٹانگیں چیر دی تھیں۔ آج بھی تمہارے سامنے ایک عورت کھڑی ہے۔ آؤ..... آزماؤ اپنی شکتی اور.....''

وشواناتھ نے اچانک ہی جھٹکا دے کر اپنا بازو میری گرفت سے چھڑایا اور سیتا پر چھلانگ لگا دی۔ سیتا غافل نہیں تھی وہ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گئی اور وشواناتھ کی گردن پر اُس کے بالوں کی چٹیا پکڑ لی۔ بال اتنے لمبے تھے کہ سیتا نے اُنہیں ہاتھ پر ایک بل دے کر گرفت میں لیا اور زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔ وشواناتھ چیخ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے بال چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیتا نے اُس کے ایک گھٹنے کے پیچھے ٹھوکر ماری۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ سیتا اُس کے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے فرش پر گھسیٹتی رہی۔ پھر اُسے چھوڑ کر اچانک ہی

اوپر اُچھلی اور پیروں کے بل اُس کے پیٹ پر گری۔

وشواناتھ کے پاس اب سوائے چیخنے کے کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ سیتا نے دوڑ کر میز پر سے شراب کی بوتل اُٹھا لی اور اُسے گردن سے پکڑ کر وشواناتھ کی طرف لپکی۔ وشواناتھ اُس وقت اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیتا نے بوتل اُس کے سر پر دے ماری..... وشواناتھ کے منہ سے نکلنے والی یہ چیخ سب سے زیادہ زوردار اور خوفناک تھی۔ اُس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ نکلا تھا۔ زخم پر شراب پڑنے سے وہ اور بھی ناچ اُٹھا تھا۔

ٹوٹی ہوئی بوتل اب بھی سیتا کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا، اُس کے چہرے پر بے پناہ درندگی نظر آ رہی تھی۔ وشواناتھ کے دونوں ہاتھ سر پر تھے۔ اُس کا چہرہ خون سے تر تھا۔ وہ پشت پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

سیتا کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی بوتل ایک خطرناک ہتھیار بن گئی تھی۔ اُس کے ٹوٹے ہوئے کونے بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اُس نے ٹوٹی ہوئی بوتل کو خنجر کی طرح سر سے اُوپر اُٹھا کر اُس کے پیٹ پر وار کیا..... بوتل کے کونے وشواناتھ کے پیٹ میں پیوست ہو گئے..... وہ زمین سے تقریباً ایک فٹ اُوپر اُچھلا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ سیتا نے بوتل باہر کھینچی تو خون کے فوارے اُبل پڑے۔ وہ اُچھل کر ایک طرف ہٹ گئی۔

''میں تمہیں اس طرح ماروں گی جس طرح تم نے دُرگا کو مارا تھا.....'' وہ بوتل ایک طرف پھینکتے ہوئے غرائی۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''شمروز! اس کی ٹانگ پکڑو سختی سے... چھوڑنا نہیں۔''

وشواناتھ تڑپ رہا تھا۔ میں نے ٹخنے کے قریب سے اُس کی ایک ٹانگ گرفت میں لے لی۔ سیتا دوسری ٹانگ پکڑ کر کھینچنے لگی۔ وشواناتھ کی چیخیں بڑی خوفناک تھیں..... لیکن سیتا پر بھی درندگی سوار تھی۔ وہ وشواناتھ کی ٹانگ کو کھینچتی چلی گئی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے کڑک کڑک کی دو ملی جلی آوازیں اُبھریں..... سیتا نے ایک جھٹکے سے اُس کی ٹانگ چھوڑ دی اور بوتل اُٹھا کر اُس کی آنکھوں کے بیچ میں زوردار وار کیا..... پھر بوتل چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ وہ پسینے میں تر ہو رہی تھی۔

میں نے وشواناتھ کی طرف دیکھا وہ اب بھی بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ وہ ہلکا ہوتا چلا گیا..... وہ بے ہوش ہو گیا تھا یا مر گیا تھا اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اگر اُس میں کچھ سانس باقی بھی تھے تو میرے خیال میں وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔

سیتا کی حالت بھی بتدریج معمول پر آتی چلی گئی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ میں نے زمین پر پڑی ہوئی ساڑھی اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

''اب یہ پہن لو اور یہاں سے چلنے کا وچار کرو.....'' میں نے کہا۔ ''زیادہ دیر رُکنا مناسب نہیں ہو گا۔''

سیتا نے میری طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے ساڑھی کو لے کر پہلے اُسے جھاڑا، پھر اُس کے بکل الگ کئے اور اُسے کمر پر لپیٹ کر نال لگانے لگی۔ اُس نے ساڑھی پہننے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگائے۔ اس دھینگا مشتی میں اُس کے بال بکھر گئے تھے اور چہرے کا میک اپ بھی خراب ہو گیا تھا۔ اُس نے دیوار کے ساتھ ٹنگے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھوں سے بالوں کو درست کیا اور بیڈ پر سے اپنا پرس اُٹھا کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اُس نے مُڑ کر ایک لمحہ کو وشوا ناتھ کی لاش کی طرف دیکھا اور باہر نکل گئی۔

باہر نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ہمارا استقبال کیا اور برآمدے سے اُتر کر کار کے قریب آ گئے۔ میں نے ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر دیکھا چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ میں نے اندر بیٹھ کر دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ سیتا پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے انجن سٹارٹ کر کے کار کو ریورس گیئر میں ڈال کر گیٹ سے باہر نکلتے ہی اُسے بائیں طرف موڑ دیا اور رفتار بڑھا دی۔

''اس طرف آتے ہوئے میں ڈگی میں بند تھا.....'' میں نے کہا۔ ''مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ ہم کس طرف سے آئے تھے۔ تم راستہ بتاتی رہنا!''

''ابھی تو سیدھے چلتے رہو!'' سیتا نے اشارہ کیا۔

میں نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ سیتا خاموش بیٹھی سامنے دیکھتی رہی۔ وہ اُس وقت بولتی جب اُسے راستہ بتانا ہوتا۔ میں نے بھی اُسے مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

○

ہم تین چار دن تک مکان سے باہر نہیں نکلے۔ راجیو اور اخبارات کے ذریعے ہمیں صورتحال کا پتہ چلتا رہا۔ انسپکٹر وشوا ناتھ کے قتل نے ایک بار پھر شہر میں ہلچل مچا دی تھی۔ اُس کی کار ہم نے ایک ویران سڑک پر چھوڑ دی تھی اور وشوا ناتھ کی لاش بھی اگلے روز صبح ہی دریافت ہوئی تھی۔

ٹوٹی ہوئی بوتل اور کار کے اسٹیئرنگ سے اُنگلیوں کے نشانات ملے تھے۔ سیتا کے نشانات شناخت کر لئے گئے تھے جبکہ کار کے اسٹیئرنگ سے ملنے والے میری اُنگلیوں کے نشانات کے بارے میں یہ شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ کشمیری مجاہد شمروز کی اُنگلیوں کے نشان ہو سکتے ہیں۔ اور اخبارات نے ایک بار پھر اس خطرے کی نشاندہی کی تھی کہ ان دونوں کی جیسلمیر میں موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ اپنے کسی اور منصوبے پر بھی عمل کرنا چاہتے ہیں۔

جیسلمیر بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ یہاں بہت سی اہم تنصیبات بھی تھیں۔ انسپکٹر وشوا ناتھ کے قتل کے بعد تمام تنصیبات پر کڑا پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ پولیس ایک بار پھر چوکس ہو گئی تھی اور شہر

میں چیکنگ شروع کر دی گئی تھی۔ کئی مشتبہ لوگوں کو پکڑ کر حوالات میں بھی بند کر دیا گیا تھا۔

انسپکٹر وشوا ناتھ کے قتل کے حوالے سے یہ خبریں اخبارات میں شائع ہوئی تھیں کہ پچھلی رات اُسے مہاراجہ کلب میں ایک حسین لڑکی کے ساتھ رقص کرتے ہوئے اور بعد میں اُس کے ساتھ کلب سے جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ مختلف لوگوں نے اُس کا جو حلیہ بتایا تھا اُس میں بڑا تضاد تھا۔ ہر شخص نے مختلف حلیہ بتایا تھا۔

ہم بہرحال محتاط ہو گئے تھے۔ میں اور سیتا تو تین چار روز تک باہر ہی نہیں نکلے۔ اور پھر ہم نے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ہم اکیلے نہیں نکلے۔ کلپنا، شوبھا اور راجیو ہمارے ساتھ تھے۔ جب ہم گھر سے نکلے تو پانچ بج رہے تھے اس لئے ہم نے کسی ہوٹل کا رُخ کرنے کی بجائے گریسر ساگر اور سم جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ دونوں پکنک پوائنٹس تھے۔ گریسر ساگر دراصل ایک بہت بڑی مصنوعی جھیل تھی جو جیسلمیر شہر کے بانی راجہ جیسل نے بنوائی تھی۔ پورے شہر کی پانی کی ضرورت اسی جھیل سے پوری کی جاتی تھی۔ 1965ء میں جب شہر میں پانی کی سپلائی کا باقاعدہ نظام قائم ہوا تو یہ تاریخی جھیل محض تفریح گاہ بن کر رہ گئی۔ اس جھیل کے وسط میں ایک خوبصورت بارہ دری بھی تھی۔ جھیل میں پانی زیادہ ہو تو اُس بارہ دری تک کشتیاں بھی چلتی ہیں۔ جھیل گریسر کے کنارے سے ذرا پہلے پیلے پتھروں کا ایک خوبصورت منقش دروازہ ہے جسے تیلون کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ اس دروازے کے بارے میں ایک دلچسپ کہانی سننے میں آئی ہے۔

تیلون ایک خوبصورت رقاصہ تھی جو سندھ سے جیسلمیر آئی تھی۔ بہت جلد اُس کی خوبصورتی کے چرچے پورے راجستھان میں پھیل گئے۔ بڑے بڑے راجے مہاراجے اُس کی چوکھٹ پر سر نیاز خم کرنے لگے۔ راجستھانی زبان میں تیلون کی حسن پر بہت شاعری کی گئی۔ تیلون کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اُسے سماجی کاموں کا بھی شوق تھا۔ اُس نے 1909ء میں جھیل کے قریب پیلے پتھروں کا ایک خوبصورت دروازہ تعمیر کروا دیا۔ جھیل کی طرف جانے والے لوگ اُس دروازے سے گزرتے تھے۔

جیسلمیر میں اگر تیلون کے چاہنے والے بڑی تعداد میں موجود تھے تو اُس کے حاسدوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ کچھ لوگوں نے راجہ لباہن سنگھ کے کان بھر دیئے کہ معصوم لوگ ایک طوائف کے بنائے ہوئے دروازے سے گزریں گے تو بڑا پاپ ہوگا۔ مہاراجہ نے دروازہ مسمار کرنے کا حکم دے دیا۔ تیلون کو مہاراجہ کے اس حکم کا علم ہوا تو اُس نے چند پنڈتوں کو اپنے ساتھ ملا کر اُس دروازے کے اُوپر وشنو بھگوان کا مندر تعمیر کروا دیا اور اس میں مورتیاں رکھوا دیں۔ مہاراجہ اس دروازے کو مسمار نہیں کرا سکا۔ یہ خوبصورت دروازہ آج بھی جوں کا توں موجود ہے۔

جھیل کے کنارے کچھ وقت گزار کر ہم کرائے کی گاڑی میں سم کی طرف روانہ ہو گئے۔ سم جیسلمیر سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں کوئی جھیل یا

تاریخی عمارت نہیں۔ اُونچے نیچے ٹیلے ہیں اور اُن کے پرے اُفق تک سنہری ریت کا صحرا ہے۔ یہاں لوگ صرف غروب آفتاب کا منظر دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔

اس وقت ہزاروں کی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ اُن میں غیر ملکی سیاح بھی تھے جو یوگا کے سٹائل میں ٹیلوں پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک باقاعدہ میلے کا سماں تھا۔ لوگ اونٹوں کی سواری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں کے لاتعداد سٹالز بھی موجود تھے۔

اُفق پر آہستہ آہستہ ڈھلتا ہوا سورج سرخ گولے کی طرح جیسے فضا میں معلق ہو کر رہ گیا تھا اور یوں گ رہا تھا جیسے تا حد نگاہ پھیلا ہوا صحرا لہو کی لہریں لئے ہوئے سمندر میں تبدیل ہو گیا ہو۔ غروب آفتاب کے تھوڑی دیر بعد تک یہ سرخی برقرار رہی اور پھر سرمئی دھندلکا پھیلنے لگا۔ لوگوں کی واپسی شروع ہو گئی تھی۔

ہم بھی ٹیلے سے اُتر کر اُس طرف چلنے لگے جہاں ہماری کرائے کی گاڑی کھڑی تھی۔ ابھی ہم نے چند گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک کار ہمارے قریب آ کر رُکی، دروازہ کھلا اور ایک آدمی اُتر کر ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا..... وہ چند لمحے باری باری ہمیں دیکھتا رہا، پھر سیتا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

''میرا نام بابوراؤ ہے سیتا دیوی..... انٹیلی جنس آفیسر بابوراؤ۔''

یہ نام سن کر میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... میں نے متوحش نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر بھی ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں.....!

○○○

''انٹیلی جنس آفیسر بابوراؤ۔'' اُس شخص نے اپنا نام دُہرایا۔ میں نے سیتا کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہمارے آس پاس ہزاروں لوگ تھے۔ اس ہجوم میں اگر صرف ایک فائر کی آواز گونج اُٹھے تو اس طرح بھگدڑ مچ جائے گی کہ کسی کو دوسروں کا تو کیا اپنا بھی ہوش نہیں رہے گا۔ اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کہاں کوئی لاش گری ہے اور لاش گرانے والا کون تھا؟ کھوپڑی میں بھیجہ رکھنے والے لوگ ایسے ہی موقعوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں نے دھوتی کے بل میں چھپایا گیا پستول نکالنے کے لئے کرتے کے نیچے ہاتھ ڈالنا چاہا تو وہ شخص بولا۔

''نہیں مسٹر شمروز.....'' اُس کا لہجہ معقول تھا۔ نہ تو میں نے سختی محسوس کی تھی اور نہ ہی ایسی نرمی کہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوا جا سکتا۔ ''کوئی غلط حرکت تمہارے لئے نقصان دہ ثابت ہو گی۔ اس کے برعکس اگر تم چاہو تو میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتا ہوں۔''

''دوستی.....؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اُس کے منہ سے اپنا نام سن کر تو میں سانس لینا بھول گیا تھا۔ اُس نے مجھے پہچان لیا تھا اور اپنے آپ کو ایک انٹیلی جنس آفیسر کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہم سے دوستی کی بات کر رہا تھا۔ اُسے تو چاہئے تھا کہ وہ ہم پر گن تان لیتا اور چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاتا کہ ہم وہ دہشت گرد ہیں جن کے ہاتھوں اب تک سینکڑوں لوگ مارے جا چکے ہیں۔ لیکن وہ ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ ''دوستی.....'' میں نے ایک بار پھر کہا۔ ''اگر تم واقعی انٹیلی جنس آفیسر ہو تو ہمارے لئے تمہارے منہ سے دوستی کا لفظ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اگر تم بلی چوہے کے کھیل سے دل بہلانا چاہتے ہو تو تمہیں یہ کھیل مہنگا پڑے گا۔ بہتر ہے کہ جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہو براہِ راست کر ڈالو۔''

''اگر مجھے کچھ کرنا ہوتا تو اسی روز کر ڈالتا جب میں نے تم دونوں کو مہاراجہ کلب میں انسپکٹر وشواناتھ کے ساتھ دیکھا تھا۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''لیکن اُس وقت مجھے کچھ شبہ تھا۔ سیتا دیوی کی آنکھوں کی رنگت نے مجھے شش و پنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ لیکن اگلی صبح انسپکٹر وشواناتھ کی لاش ملی تو مجھے یقین ہو گیا کہ رات کو اُس کے ساتھ مہاراجہ کلب میں رقص کرنے والی سیتا دیوی ہی تھی اور یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی مشکل نہیں تھا کہ اُس کے ساتھ دوسرا آدمی شمروز کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔'' وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اس کے بعد تم لوگ غائب ہو گئے۔ میں تم لوگوں کی تلاش میں سرگرداں رہا اور آج سہ

پھر اتفاق سے میں دھوبی پاڑے سے گزر رہا تھا کہ تم لوگ نظر آ گئے..... میں تم لوگوں کو وہیں روک سکتا تھا لیکن ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پیچھا شروع کر دیا۔ گریسر سا گر پر بھی تمہارے قریب نہیں آیا۔ ملاقات کے لئے یہ بہترین جگہ تھی اس لئے میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا یا ایسا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

میں چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری باتیں اب تک میری سمجھ میں نہیں آ سکیں۔ تم انٹیلی جنس آفیسر ہو اور ہم ہندوستان کی پولیس، انٹیلی جنس، آرمی اور ہر ادارے کو سب سے زیادہ مطلوب دہشت گرد۔ لیکن دوستی کی باتیں.....''

''اسے میری غرض سمجھ لو!'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''ہند سرکار ہمیں چند ہزار روپے مہینہ پگار دیتی ہے اور ہم اپنی جانیں ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ کئی بیوقوف مارے بھی جاتے ہیں۔ وہ کسی موقع سے فائدہ اُٹھانے کی بجائے اپنی جان دے دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن میں اسے کرانتی (قربانی) یا آتما ہتیا سمجھتا ہوں۔ اور میں ایسے لوگوں میں سے نہیں ہوں کہ جیون میں آنے والے کسی سنہری موقع کو ضائع کر دوں۔ قسمت زندگی میں صرف ایک بار مہربان ہوتی ہے۔ وہ بار بار ایسے مواقع نہیں دیتی۔''

''تو گویا یہ تمہارے لئے ایک سنہری موقع ہے جس سے تم فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''ہاں.....'' وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں کسی جگہ پر بیٹھ کر اطمینان سے بات کرنی چاہئے۔ آؤ! وہاں بیٹھتے ہیں۔'' اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے سیتا کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں اُلجھن تیر رہی تھی۔ ہم بابو راؤ کے ساتھ ایک ٹیلے کی طرف چل دیئے جس کے دامن میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بھیل پوری، فروٹ، چنے، حلیم اور اسی قسم کی چیزوں کے ٹھیلے کھڑے تھے۔ بعض ٹھیلے والوں نے پیٹرومیکس جلا لئے تھے اور بعض ٹھیلوں پر ٹیوب لائٹس لگی ہوئی تھیں جنہیں جلانے کے لئے جنریٹر موجود تھے۔ یہ ٹھیلے مستقل طور پر یہیں رہتے تھے اور ان کے مالکوں نے اپنے لئے بوریا بستر کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، بہت سے لوگ غروب آفتاب کے دلفریب نظارے کے بعد واپس جا رہے تھے اور بہت سے لوگ اُن ٹھیلوں کے آس پاس بینچوں پر بیٹھے ناؤ نوش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا۔ انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ میٹھا بن کر ہمارے گرد کوئی جال تو نہیں بن رہا؟ ایسا تو نہیں کہ اُس کے کچھ اور ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں اور بابو راؤ اس بات کا منتظر ہو کہ تفریح کے لئے آئے ہوئے لوگ واپس چلے جائیں اور یہ لوگ ہمیں گھیر لیں۔ لق و دق صحرا میں وہ ہمیں آسانی سے گولیوں کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ لیکن

بہر حال اگر ایسی کوئی کارروائی ہوئی تو کم از کم بابو راؤ تو زندہ نہیں بچ سکے گا۔

ہم بھیل پوری والے ایک ٹھیلے کے قریب آ گئے۔ ایک بینچ پر ایک جوان عورت اور ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اُن کے ساتھ چھ سات برس کی عمر کا بچہ بھی تھا۔ راجیو، شوبھا اور کلپنا ہمارے ساتھ ساتھ تھیں۔ اُن کے چہروں پر ہلکا سا خوف نمایاں تھا۔

بابو راؤ بینچ اُٹھا کر ٹھیلے سے کچھ دُور لے گیا۔ اُس نے راجیو وغیرہ کو ٹھیلے کے قریب ہی بیٹھنے کو کہا اور مجھے اور سیتا کو اُن بینچوں پر الگ لے گیا۔ اُس نے سب کے لئے بھیل پوری کا آرڈر بھی دے دیا تھا۔

بینچ پر بیٹھنے سے پہلے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وسیع و عریض علاقے میں جگہ جگہ کھڑے ہوئے ٹھیلوں پر پیٹرومیکس جل رہے تھے۔ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ ٹھیلے والا ہمارے ہاتھوں میں بھیل پوری کی پلیٹیں تھما کر چلا گیا۔ میں اور سیتا ایک بینچ پر بیٹھے تھے اور بابو راؤ ہمارے سامنے دوسرے بینچ پر۔ اُس کا چہرہ روشنی کی طرف تھا۔

''کیا میں اسے بلی چوہے کا کھیل سمجھوں یا.....''

''نہیں مسٹر شمروز!'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ قسمت کی دیوی زندگی میں صرف ایک بار مہربان ہوتی ہے۔ مجھے بھی ایک بار موقع مل رہا ہے اور میں اس سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں۔''

''فائدہ تو تمہیں اس طرح بھی پہنچ سکتا ہے کہ ہمیں پکڑ کر قانون کے حوالے کر دو۔'' میں نے کہا۔

''اس سے کیا ہوگا.....؟'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے عہدے میں ترقی ہو جائے گی اور تنخواہ میں چند سو کا اضافہ ہو جائے گا اور اس کے ساتھ بہادری کا ایک سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔ لیکن یہ سرٹیفکیٹ مجھے زندگی کی وہ آسائشیں مہیا نہیں کر سکتا جن کی ایک انسان تمنا کر سکتا ہے۔''

''لیکن تم ایک ذمہ دار آفیسر ہو۔ تمہارے فرائض.....''

''یہ کتھا رہنے دو مسٹر شمروز!'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''وہ لوگ بیوقوف ہوتے ہیں جو فرض کی ادائیگی کے لئے اپنی ہتیا کر لیتے ہیں۔''

بابو راؤ کا یہ جواب میرے لئے انوکھا نہیں تھا۔ اس سے پہلے میں لودروا کیمپ کے سکیورٹی انچارج جگل ناتھ سے بھی ایسی باتیں سن چکا تھا۔ وہ سیتا کے حسن و شباب پر مرمٹا تھا اور محض ایک رات اُس کے ساتھ گزارنے کے لئے ہمارے ہاتھوں کیمپ کی تباہی بھول جانے کو تیار تھا۔ اُس سے پہلے بھی ایسے بہت سے لوگ میری نظروں میں آ چکے تھے۔ ہنومان گڑھ میں ''را'' کے اُس ایجنٹ کو تو میں کبھی نہیں بھول سکوں گا جس نے گیسٹ ہاؤس میں چوری چھپے سیتا سے ملاقات کی تھی اور اگلے روز صبح گیسٹ ہاؤس کے عقب میں ایک ہٹ میں اُس کی لاش ملی تھی۔

وہ بھی سیتا کے ساتھ ایک رات گزارنے کا خواہش مند تھا۔ اور اب انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ..... یہ بھی کسی موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا جس کے لئے وہ ہمیں نظر انداز کرنے کو تیار تھا بلکہ ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بازی اُونچی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ جو لوگ قومی مفادات پر ذاتی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں اُن کا کردار کیا ہوگا۔

''اُس رات مہاراجہ کلب میں ہمیں دیکھ کر تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں سیتا ہوں.....؟'' سیتا نے بابو راؤ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ باتوں کے ساتھ ساتھ ہم بھیل پوری بھی کھاتے جا رہے تھے۔

''میں انٹیلی جنس میں ہوں۔ اور تم بھی انٹیلی جنس میں رہ چکی ہو۔'' بابو راؤ نے جواب دیا۔ ''تمہاری فائل میں تمہاری تصویر بھی موجود ہے جس کی کاپیاں بنا کر ایجنسی کے فیلڈ آفیسروں میں تقسیم کی گئی ہیں۔ میرے پاس بھی تمہاری ایک تصویر موجود ہے۔ اُس رات میں نے تمہیں دیکھا تو چونک گیا تھا۔ تمہارا حلیہ اگرچہ بدلا ہوا تھا۔ آنکھوں کی رنگت مختلف تھی لیکن مجھے شبہ ہو گیا تھا۔ اور اگلے روز جب انسپکٹر وشوا ناتھ کی لاش ملی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ تم ہی تھیں اور تمہارے ساتھ شمروز تھا۔''

''جس رات تم نے ہمیں مہاراجہ کلب میں دیکھا تھا اس سے ایک رات پہلے ہمیں بھی تمہارے بارے میں کچھ بھنک مل گئی تھی۔ یا یوں کہو کہ ہمیں تمہارا نام معلوم ہو گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اوہ..... وہ کیسے؟'' اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''اُس روز لودروا کے مندر میں تہہ خانے اور خفیہ سرنگوں کا انکشاف ہوا تھا اور جنگل ناتھ اور دوسرے سکیورٹی گارڈز کی لاشیں ملی تھیں۔ اور تم نے اپنے ماما مسٹر راؤ کو اس بارے میں بتایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اوہ.. تو تم میرے ماما کو جانتے ہو؟'' اُس نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''تمہارے ماما سے میری دوستی اُسی روز ہو گئی تھی جب ہم جیسلمیر پہنچے تھے۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ اس طرح میں اُسے کسی اور چکر میں ڈالنا چاہتا تھا۔

''بہرحال.....'' میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ ہمارے ہاتھوں ہونے والی تباہیوں کو نظر انداز کر کے تم کیا فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو..... لیکن یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ ہم سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟''

''میں تم لوگوں کو اس ملک سے فرار ہونے کا موقع دینا چاہتا ہوں۔'' اُس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ ''پولیس اور تمام ایجنسیوں کے تمام ایجنٹ شکاری کتوں کی طرح تم لوگوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ تم لوگ زیادہ عرصہ تک چھپے نہیں رہ سکو گے۔ جیسلمیر اور جے پور میں تمہارے تمام رشتے داروں کے گھروں کی نگرانی ہو رہی ہے۔'' یہ آخری جملہ اُس نے سیتا کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''ایسی صورتحال میں تم لوگوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ..... اور میں تمہیں موقع دے رہا ہوں۔''

''تم ہماری محبت میں تو یہ سب کچھ نہیں کر رہے۔'' میں نے ایک بار پھر اُس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ ''مطلب کی بات کرو..... کیا چاہتے ہو؟''

بابو راؤ چند لمحے میری اور سیتا کی طرف دیکھتا رہا..... پھر بولا۔ ''میری گاڑی پوکھران پہنچانی ہے۔''

''پوکھران.....؟'' میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ ''ابھی تم ہمیں سرحد پار بھجوانے کی بات کر رہے تھے۔ اور پوکھران تو سرحد کی طرف نہیں ہے۔ یہ تو مخالف سمت میں ہے..... ہم تو اور اندر کی طرف چلے جائیں گے۔''

''شبہ ہے کہ تم لوگ اُس طرف سے سرحد پار کر کے سندھ میں داخل ہونے کی کوشش کرو گے۔ اس لئے تھر کی سرحد پر کڑی نگرانی شروع کر دی گئی ہے۔'' بابو راؤ نے جواب دیا۔ ''پوکھران سے میرا ایک آدمی تم لوگوں کو انوپ گڑھ یا چندی گڑھ تک پہنچا دے گا۔ وہاں سے تم لوگ آسانی سے پنجاب کی طرف نکل سکتے ہو۔ پنجاب سے سرحد پار کرنا تم لوگوں کے لئے مشکل نہیں ہوگا۔''

''پوکھران تو یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک سو بیس کلومیٹر ہوگا..... تم اپنی گاڑی خود کیوں نہیں لے جا سکتے؟ اور پھر اس گاڑی میں ایسی کیا بات.....''

''تمہارے لئے یہ جاننا ضروری نہیں کہ اس گاڑی میں کیا خاص بات ہے۔'' بابو راؤ نے میری بات کاٹ دی۔ ''اور گاڑی میں خود کیوں نہیں لے جانا چاہتا؟ تمہیں اس سے بھی کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن بہرحال! یہ تمہارے لئے ایک بہت اچھا چانس ہے۔ اور تم لوگ اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو۔''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں ہوگا؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''ضمانت تو اس بات کی بھی نہیں کہ یہاں سے اُٹھنے کے بعد تم لوگ اپنے گھر تک پہنچ سکو گے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے.....'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہمیں تمہاری یہ پیشکش منظور ہے۔ ہمیں کب جانا ہوگا؟''

''میں کل شام تک تمہیں بتاؤں گا۔'' بابو راؤ نے جواب دیا۔ ''شہر سے باہر جانے والوں کو بھی بڑی سختی سے چیک کیا جا رہا ہے۔ جو شخص اپنی شناخت پیش نہیں کر سکتا اُسے روک لیا جاتا ہے۔ اور اُس کے بارے میں تصدیق ہونے کے بعد ہی جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ بسوں اور ٹرینوں سے سفر کرنے والے مسافروں کو بھی بڑی سختی سے چیک کیا جاتا ہے۔ میں تم

لوگوں کو کاغذات بنوا دوں گا اور تم لوگوں کو یہاں سے نکلنے میں پریشانی نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے.....'' میں نے کہا۔ ''کل کہاں ملاقات ہوگی؟''

''دھوبی پاڑے کی مین سٹریٹ پر بمبئی ہوٹل کے نام سے ایک مارواڑی کا ریسٹورنٹ ہے۔'' بابوراؤ نے کہا۔ ''مارواڑیوں کے ریسٹورنٹ عام طور پر نہایت تھرڈ کلاس اور گھٹیا قسم کے ہوتے ہیں۔ ان ریستورانوں میں چرسیوں اور موالیوں کی بھرمار ہوتی ہے اور ہم جیسا کوئی شریف آدمی وہاں قدم رکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن بمبئی ہوٹل ایئر کنڈیشنڈ اور بڑا اچھا ریسٹورنٹ ہے۔ میں کل شام ٹھیک سات بجے تمہیں وہاں ملوں گا۔ اور تم اکیلے آؤ گے۔''

''ڈن.....!'' میں نے اُس سے ہاتھ ملایا۔ ''لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا ہم تو اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھر رہے ہیں، موت سے نہیں ڈرتے۔ لیکن اگر ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا تو تم بھی زندہ نہیں بچ سکو گے۔''

''مجھے اپنا جیون بہت پیارا ہے۔'' بابوراؤ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں بھی کچھ لے کر یہاں سے بہت دُور نکل جانا چاہتا ہوں، تاکہ باقی زندگی آرام اور سکون سے گزار سکوں۔''

میں جواب دینے کی بجائے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ ویرانہ اب ویرانہ لگنے لگا تھا۔ تقریباً سب ہی لوگ جا چکے تھے۔ بہت سارے ٹھیلوں کی بتیاں بھی بجھ چکی تھیں۔ اِکا دُکا لوگ ہی رہ گئے تھے۔ میں بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے مسٹر بابوراؤ!'' میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں کل شام سات بجے بمبئی ہوٹل میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

راجیو وغیرہ ٹھیلے کے قریب بینچوں پر پریشان بیٹھے تھے۔ بابوراؤ ٹھیلے والے کو پیسے دے کر دوسری طرف چلا گیا اور ہم راجیو وغیرہ کو لے کر اُس طرف چل دیئے جہاں ہماری کرائے کی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیور ہمارا منتظر تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے تو اُس نے انجن سٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہاں چند گاڑیاں ابھی تک کھڑی تھیں۔ میں نے ویرانے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ بابوراؤ نظر نہیں آیا۔ وہ اندھیرے میں مدغم ہو چکا تھا۔

جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو ابھی صرف نو ہی بجے تھے۔ ہم نے ایک موڑ پر کرائے کی گاڑی چھوڑ دی اور مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے دھوبی پاڑے کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا؟

ہم راستے بھر خاموش رہے۔ لیکن گھر پہنچتے ہی سب اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ میں نے اور سیتا نے راجیو وغیرہ کو اصل بات نہیں بتائی تھی لیکن اس بات پر سب ہی کو حیرت تھی کہ ایک انٹیلی جنس آفیسر نے ہمیں کیسے چھوڑ دیا تھا؟

شوبھا اُٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ چائے بنا کر لے آئی تو میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہم اُس وقت واقعی چائے جیسی کسی چیز کی طلب محسوس کر رہے تھے۔

بھوک کسی کو نہیں تھی۔ بھیل پوری سے ہی پیٹ بھر گیا تھا اس لئے کسی نے کھانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ چائے کے بعد ہم لوگ ایک ہی کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

بارہ بجے کے قریب شوبھا اور راجیو اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سیتا اور کلپنا دونوں ایک کمرے میں سوتی تھیں اور میں الگ کمرے میں سوتا تھا۔ جس کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے وہ اُن دونوں کا تھا اور کلپنا چارپائی پر لیٹی اونگھ رہی تھی۔

ایک بجے کے قریب میں اپنے کمرے میں آیا تو سیتا بھی میرے پیچھے ہی چلی آئی۔ میں چارپائی پر کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور ہم انٹیلی جنس آفیسر بابوراؤ کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

''میرا خیال ہے ادھر بھی کوئی بہت اُونچا کھیل کھیلا جا رہا ہے.....'' سیتا کہہ رہی تھی۔ ''اور بابوراؤ کچھ لے کر اس کھیل سے نکلنا چاہتا ہے۔''

''اور وہ 'کچھ' بھی اتنا کچھ ہوگا کہ وہ پوری زندگی عیش و آرام سے گزار سکے گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ اس کھیل سے نکلنا چاہتا ہے تو ہمارا سہارا کیوں لے رہا ہے؟ اور وہ اپنی کار ہمارے ذریعے یہاں سے پوکھران کیوں بھیجنا چاہتا ہے؟ کیا وہ سب کچھ اس کار میں ہوگا جس کے لئے وہ یہاں سے فرار ہونا چاہتا ہے؟ نوٹوں سے بھری ہوئی بوریاں، سونا یا کوئی اور ایسی چیز.....؟''

''وہ اتنا بیوقوف نہیں ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کہ نوٹوں سے بھری ہوئی بوریاں اور سونا ہمارے ذریعے یہاں سے باہر بھیجے۔ کار میں یقیناً کوئی ایسی چیز ہوگی جس کے عوض وہ بعد میں کسی اور جگہ نوٹوں کی بوریاں یا سونا وصول کر سکے گا۔''

''اوہ.....!'' میں چونک گیا۔ ''کار میں یقیناً کوئی ایسی چیز ہوگی جسے وہ خود نہیں لے جانا چاہتا۔ مثلاً کوئی بہت ہی اہم راز..... وہ کار ہمارے ذریعے بھجوانا چاہتا ہے تاکہ ہم پکڑے جائیں تو سارا الزام ہم پر گرے کہ ہم سرکاری راز لے کر بھاگ رہے تھے۔ مطلوب تو ہم پہلے ہی ہیں۔ اس بات پر بڑی آسانی سے یقین کر لیا جائے گا۔''

''یقیناً ایسی ہی بات ہوگی۔'' سیتا نے کہا۔ ''اور ہمارا جیسلمیر سے پوکھران کا سفر ہمارے جیون کا آخری سفر بھی ثابت ہو سکتا ہے۔''

''اور میں نہیں چاہتا کہ کلپنا اور راجیو وغیرہ اس سفر میں ہمارے ساتھ ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''راجیو تو اپنا کوئی بندوبست کر سکتا ہے لیکن کلپنا کے لئے پریشان ہوں۔ وہ بہت معصوم لڑکی ہے، اس دنیا میں اُس کا کوئی نہیں ہے۔ اگر وہ اکیلی رہ گئی تو خونخوار بھیڑیئے اُسے کھا جائیں گے۔''

''کلپنا کو میں بھی اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتی۔ لیکن صورتحال اب تبدیل ہو چکی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''ہم زمینی حقائق سے منہ نہیں موڑ سکتے اور نہ ہی ہم کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بابوراؤ نے ٹھیک ہی

کہا تھا۔ ہمارے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم جیون بھر ایک مکان کی چار دیواری میں محصور رہیں۔ اور اس بات کی بھی ضمانت نہیں ہے کہ ہم کسی ایک جگہ پر مقید رہ کر بھی محفوظ رہیں گے۔ ہم ہندسرکار کو یہاں ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکے ہیں۔ تین اسرائیلی ایجنٹ ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں اور تم ان یہودیوں کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہو۔ دنیا میں کہیں ان کا ایک آدمی بھی مارا جائے تو جب تک وہ کم از کم سو بے گناہوں کو موت کے گھاٹ نہ اُتار دیں چین سے نہیں بیٹھتے۔ فلسطین اور لبنان میں یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ بھارت سے اسرائیل کے دوستانہ تعلقات ہیں..... یہاں تو اسرائیل اپنی اس پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا لیکن اپنے آدمیوں کے قاتلوں کی گرفتاری کے لئے وہ بھارت سرکار پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالے گا۔ کیمپ کی تباہی کے سلسلے میں تمہارا نام سامنے آ چکا ہے۔ تمہاری تلاش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جائے گی۔ اس لئے یہاں رہنا اب ہمارے لئے ممکن نہیں..... بابوراؤ نے ٹھیک کہا تھا۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہو جانا چاہئے۔ یہ درست ہے کہ وہ اپنے کسی بڑے مقصد کے حصول کے لئے ہمیں استعمال کرنا چاہتا ہے اور ہمیں فرار کا ایک راستہ بھی دکھا رہا ہے۔ لیکن ہم اُس کے منصوبے پر عمل نہیں کریں گے۔''

''کیا مطلب.....؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہم پوکھران ضرور جائیں گے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''گاڑی اُس کے آدمی کے حوالے کر کے ہم اپنا راستہ الگ کر لیں گے۔''

''لیکن..... ان لوگوں کا کیا ہوگا؟'' میرا اشارہ کلپنا اور راجیو وغیرہ کی طرف تھا۔

''میں ایک اور رُخ پر سوچ رہی ہوں۔'' سیتا نے کہا۔ میں سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ سیتا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میری ماتا جی کے ایک کزن باڑمیر میں رہتے ہیں۔ وہاں اُن کی کھیتی باڑی ہے۔ ہم راجیو اور کلپنا وغیرہ کو باڑمیر بھیج دیتے ہیں، بعد میں ہم بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔ پاکستان کی سرحد وہاں سے زیادہ دُور نہیں۔ ہم راجیو اور شوبھا کو ہندوستان ہی کے کسی شہر کی طرف بھیج دیں گے اور کلپنا کو لے کر پاکستان کی طرف نکل جائیں گے۔ تم ایک کشمیری مجاہد ہو۔ پاکستان میں تمہارا بڑا نام ہے..... وہاں تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔''

''لیکن تم نے شاید بابوراؤ کی باتوں پر توجہ نہیں دی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اُس نے بتایا تھا کہ تھر کی سرحد کی کڑی نگرانی ہو رہی ہے۔''

''سرحد بند ہی کیوں نہ کر دی جائے..... اسمگلروں کے لئے ہمیشہ راستے کھلے رہتے ہیں۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ماما راجندر ناتھ کی ساری زندگی باڑمیر میں گزری ہے۔ وہ خود اسمگلر تو نہیں لیکن ایسے لوگوں سے اُس کے تعلقات ضرور ہوں گے۔ وہ یقیناً ہماری مدد کریں گے۔''

''تمہاری داستان تو وہاں تک بھی پہنچ چکی ہوگی.....'' میں نے کہا۔ ''ممکن ہے باڑمیر میں

بھی انٹیلی جنس کے آدمی موجود ہوں۔ اور وہاں آنے جانے والے لوگوں پر نگاہ رکھی جا رہی ہو۔ یا ممکن ہے تمہارا ماما دیش بھگت ثابت ہو اور خود ہی ہمیں پولیس کے حوالے کر دے۔''

''ماما راجندر ناتھ ایسا نہیں کر سکتا۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اُس کی ایک بیٹی میرے چاچا کے بیٹے سے بیاہی ہوئی ہے۔ میرے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کر کے وہ اپنی بیٹی کے جیون میں کانٹے نہیں بچھائے گا۔''

''تو پھر.....؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا

''کل صبح ہی اُنہیں باڑمیر بھیج دیا جائے۔'' سیتا نے کہا۔

''اور اس دولت کا کیا کرو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ زیور ہم راجیو کو دے دیتے ہیں، باقی اپنے پاس رکھ لیں گے۔ سونا تو سرحد پار بھی ہمارے کام آ سکتا ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔

ہم کچھ دیر تک پروگرام بناتے رہے۔ پھر سیتا، راجیو اور کلپنا کو جگا کر لے آئی اور اُنہیں اپنا منصوبہ سمجھانے لگی۔

O

راجیو، کلپنا اور شوبھا صبح سویرے ہی گھر سے رخصت ہو گئے۔ اُنہیں جو زیورات دیئے گئے تھے وہ کلپنا اور شوبھا نے پہن لئے تھے اور اُن پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بابوراؤ نے بتایا تھا کہ شہر سے باہر جانے والوں کو بھی چیک کیا جا رہا تھا۔ پولیس اور انٹیلی جنس کو سیتا اور شمروز کی تلاش تھی۔ دونوں جوان اور حسین و خوبرو تھے۔ اُن کے حلیے بھی پولیس اور انٹیلی جنس کو کسی حد تک معلوم ہو چکے تھے۔ لیکن کلپنا، شوبھا اور راجیو میں سے کوئی بھی ان حلیوں یا معیار پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ اس لئے توقع تھی کہ اُنہیں شہر سے نکلنے میں زیادہ دُشواری پیش نہیں آئے گی۔ لیکن بہرحال ہماری بے چینی دوپہر تک برقرار رہی۔ اور دوپہر کے بعد ہم نے اپنے طور پر یقین کر لیا کہ وہ خیریت کے ساتھ شہر سے نکل چکے ہوں گے۔

شام ساڑھے چھ بجے میں باہر جانے کے لئے تیار ہوا تو سیتا بھی ضد پر آ گئی کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے گی۔

''دونوں کا جانا مناسب نہیں ہوگا.....'' میں نے سیتا کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر کوئی دھوکہ بھی ہوا تو ہم میں سے کم از کم ایک تو بچ جائے گا۔''

سیتا بڑی مشکل سے پیچھے رہ جانے پر تیار ہوئی تھی لیکن اُس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ میرے فیصلے سے خوش نہیں ہے۔ اُس نے مجھے اس طرح رخصت کیا جیسے یہ ہماری زندگی کی آخری ملاقات ہو۔

مین بازار زیادہ دُور نہیں تھا اور مجھے بمبئی ہوٹل تلاش کرنے میں بھی زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ یہ ریسٹورنٹ ایک بارونق سائیڈ اسٹریٹ کے کارنر پر واقع تھا۔ اس کا ایک دروازہ سائیڈ

اسٹریٹ کی طرف بھی تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی میری نظریں سامنے لگی ہوئی کھڑکی کی طرف اُٹھ گئیں۔ ٹھیک سات بج رہے تھے۔ صاف ستھرا ریسٹورنٹ تھا۔ گاہکوں میں جوان اور خوبصورت لڑکیاں بھی شامل تھیں جو اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ ریسٹورنٹ خاصا بڑا تھا اور سائیڈ اسٹریٹ والے دروازے سے ذرا آگے کیبن بھی تھے اور ہر کیبن کے سامنے پردہ کھنچا ہوا تھا۔

بابوراؤ مجھے نظر نہیں آیا۔ میں سائیڈ اسٹریٹ کے دروازے کے قریب ایک ایسی میز پر بیٹھ گیا جہاں سے دونوں طرف نگاہ رکھ سکتا تھا۔ میرے بیٹھنے کے فوراً ہی بعد ویٹر بھی نازل ہو گیا اور میں نے اُسے چائے کا آرڈر دے دیا۔

ابھی میں چائے پی رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر عورت سامنے والے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اُس نے عقابی نظروں سے ہال کا جائزہ لیا اور نپے تلے قدم اُٹھاتی ہوئی میرے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ صورت ہی سے فاحشہ لگتی تھی اور اُس نے لباس بھی کچھ ایسا پہن رکھا تھا کہ کسی شریف آدمی کو اُس کی طرف نگاہ اُٹھاتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔

''تم اکیلے بیٹھے بور نہیں ہو رہے شریمان جی.....؟'' اُس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے اکیلا ہی رہنے دیں شریمتی جی!'' میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''میرا ایک دوست یہاں آنے والا ہے اور اُس کا تعلق پولیس سے ہے۔ ایسا نہ ہو تمہارے لئے کوئی سمسیا پیدا ہو جائے۔''

اُس کا چہرہ ہونق سا ہو گیا..... وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ گئی اور پھر وہ ریسٹورنٹ میں بھی نہیں رُکی۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

اور پھر وقت گزرتا رہا اور میری بے چینی بڑھنے لگی..... بابوراؤ نے ٹھیک سات بجے کا کہا تھا اور سات بج کر پچیس منٹ ہو چکے تھے۔ میرے ساتھ کہیں دھوکہ تو نہیں ہو رہا.....؟ بابوراؤ نے میرے ساتھ کوئی چال تو نہیں چلی.....؟ کل جب اُس نے ہمیں دیکھا تھا تو وہ اکیلا تھا اور ہم پانچ تھے۔ ظاہر ہے وہ اکیلا ہم پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ وہ ہمارے قریب آ گیا اور اپنے بارے میں ایک فرضی کہانی سنا ڈالی۔ اور میں دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف تھا کہ اُس کہانی پر یقین کر لیا۔

میرے پاس پستول موجود تھا اور مرنے سے پہلے دو چار کو تو گرا ہی سکتا تھا۔ سات بج کر تیس منٹ پر میں اُٹھ گیا۔ بل ادا کر کے ریسٹورنٹ سے نکلا تو مجھے آس پاس کوئی غیر معمولی سرگرمی دکھائی نہیں دی۔ ویسے انٹیلی جنس والے اتنے بیوقوف نہیں ہوتے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کو دوسروں کی نظروں میں آنے دیں۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا واپس چل پڑا۔ میں نے اگرچہ اپنے تعاقب کا خیال رکھا تھا لیکن یہ شام کا وقت تھا۔ سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت تھی اور یہ اندازہ لگانا دُشوار تھا کہ ان میں کوئی میرا

پیچھا کر رہا ہے یا نہیں؟

مکان کے سامنے پہنچ کر میں ٹھٹھک گیا..... دروازے پر تالا لگا ہوا تھا..... میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔ میں مُڑ کر گلی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک طرف سے ایک آدمی اور دو عورتیں آ رہی تھیں۔ قریب پہنچ کر اُن میں سے ایک عورت میری طرف آ گئی۔

''چابی میرے پاس ہے.....''

سیتا کی آواز سن کر میں اُچھل پڑا۔ اُس کا چہرہ چنری سے ڈھکا ہوا تھا اس لئے میں اُس کی صورت نہیں دیکھ سکا۔ اُس نے تالا کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ سیتا نے فوراً دروازہ بند کر کیا اور مجھ سے لپٹ گئی۔

''یہ کیا حرکت تھی..... کہاں گئی تھیں تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہیں اکیلے کیسے چھوڑ دیتی؟'' سیتا نے چہرے پر سے چنری ہٹاتے ہوئے کہا۔

ہم کمرے میں آ گئے۔ سیتا نے پھولدار کپڑے کا گھاگھرا اور چولی پہن رکھی تھی اور سر پر چنری اوڑھ رکھی تھی۔ اور پھر اُس نے بتایا کہ میرے جانے کے چند منٹ بعد ہی وہ لباس پہن کر میرے پیچھے نکل کھڑی ہوئی تھی اور بمبئی ریسٹورنٹ کے قریب سائیڈ سٹریٹ میں کھڑی ہو کر میری نگرانی کرتی رہی تھی۔ اُس کے کہنے کے مطابق میں ایک لمحہ کو بھی اُس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ اُس نے اُس فاحشہ عورت کو بھی دیکھا تھا جو میری میز پر آئی تھی اور جسے میں نے بھگا دیا تھا۔

''اگر کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو تم کیا کر لیتیں؟'' میں نے کہا۔

''دو چار کو تو گرا ہی دیتی۔'' اُس نے کہتے ہوئے چولی میں چھپا ہوا پستول نکال لیا۔ یہ جگل ناتھ کا پستول تھا۔ میرے پاس جو پستول تھا وہ بھی لودر وا کیمپ ہی سے مارا گیا تھا۔

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر کے دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز سن کر اُچھل پڑے..... ''یہ کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں بابوراؤ کا خیال اُبھرا تھا۔ دستک دینے کا انداز دوستانہ تھا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو اس طرح ہلکی دستک نہ دی جاتی۔

ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ سیتا پستول سنبھال کر صحن کے ایک تاریک گوشے میں دبک گئی۔ میں نے بھی اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ اس دوران دستک کی آواز دوبارہ اُبھری تھی۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھول دیا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا..... میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ بابوراؤ ہی تھا اور خالی ہاتھ تھا۔ اُس نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ میں اُس کے سامنے آ گیا۔

''معاف کرنا دوست.....'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تم سے ملاقات کے لئے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا، جس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں۔''

مجھے صورتحال کا اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی۔ وہ مجھ سے ملاقات کے لئے ریسٹورنٹ میں نہیں آیا تھا بلکہ دُور کھڑے رہ کر ریسٹورنٹ کی نگرانی کرتا رہا تھا اور پھر میرا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا۔

''میں نے ریسٹورنٹ میں تم سے ملاقات کرنا مناسب نہیں سمجھا.....'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''اگر میں کل تم سے ملاقات کے لئے اس مکان کا پتہ پوچھتا تو تم کبھی نہ بتاتے۔ اور کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر بات کرنا مناسب نہیں تھا اس لئے مجھے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا۔''

''آؤ..... اندر کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم کمرے میں آئے تو سیتا بھی آ گئی۔ اُس نے پستول دوبارہ چولی میں چھپا لیا تھا۔

''یہ تم دونوں کے کاغذات ہیں.....'' بابو راؤ نے جیب سے دو کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیئے۔ یہ وحید الدین اور رضیہ بیگم کے نام کے کاغذات تھے۔ اور اس امر کی تصدیق کی گئی تھی کہ یہ دونوں جیسلمیر کے شہری ہیں۔ دونوں کاغذوں پر کوتوال کی مُہر اور کوتوال کے دستخط بھی ثبت تھے۔

''یہ کاغذات مسلم ناموں سے اس لئے بنوائے گئے ہیں کہ اس شہر میں مسلمان بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ اور پوکھران میں تم جس شخص کو ملو گے وہ بھی مسلمان ہے۔ میں تمہیں اُس کے بارے میں تفصیل سے بتا دُوں گا۔ ویسے راجستھان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ کسی قسم کی چیکنگ کے وقت مسلمان عورتوں کو زیادہ پریشان نہیں کیا جاتا۔''

بابو راؤ کے خاموش ہونے پر میں نے اور سیتا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سیتا اُس سے مختلف سوالات کرنے لگی۔

''ہمیں کب جانا ہوگا..... اور گاڑی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گاڑی صبح تمہیں اپنے مکان کے دروازے پر کھڑی ملے گی۔ اُس میں چابی بھی لگی ہو گی۔ نیلے رنگ کی سیڈان ہے۔ تم لوگ صبح ٹھیک سات بجے یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے۔'' بابو راؤ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے.....'' میں نے سر ہلا دیا۔ اس دوران سیتا کمرے سے چلی گئی تھی۔ اور تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔ اب ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ بابو راؤ نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ درست تھا..... وہ واقعی کسی بہت خطرناک کھیل میں پھنسا ہوا تھا اور اپنے آپ کو اس سے نکالنا چاہتا تھا۔ اگر ہمیں پھانسنے کے لئے کوئی چکر چلایا ہوتا تو اب تک ہمارا قصہ تمام ہو چکا ہوتا۔ لیکن بابو راؤ کے بارے میں ہمارے شبہات بے بنیاد نکلے اور معاملہ جوں کا توں چلتا رہا۔

''پوکھران میں تم جس شخص سے رابطہ کرو گے اُس کا نام سلامت علی ہے۔'' بابو راؤ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ تمہیں پوکھران کے مین بازار میں واقع کالی بھون ریسٹورنٹ

میں ملے گا۔ اُس سے رابطہ کرنے کے بعد تم لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر سلامت علی کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

گیارہ بجے کے قریب بابو راؤ چلا گیا..... میں اُسے رخصت کرنے کے بعد دروازہ بند کر کے واپس آیا تو سیتا والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔

''سارے سنکھٹ دُور ہو گئے.....'' وہ بولی۔ ''اب آخری مرحلہ رہ گیا ہے۔ جیسلمیر سے نکلنے کے بعد کوئی ہمارا راستہ نہیں روک سکے گا۔''

میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن سیتا مجھے لے کر چارپائی پر گر گئی.....!

ہم اگرچہ رات کو دیر تک جاگتے رہے تھے لیکن صبح ساڑھے پانچ بجے آنکھ کھل گئی۔ سیتا فوراً ہی کمرے سے نکل گئی اور میں کچھ دیر بستر پر پڑا اینٹھتا رہا۔ اور پھر اُٹھ کر میں نے بھی تیاری شروع کر دی۔ مندر کے تہہ خانے سے ملنے والے زیورات، سونے کی مورتیاں وغیرہ ایک سوٹ کیس میں ڈال کر اُوپر کپڑے ڈال دیئے۔ ناشتہ کرنے کے بعد سیتا بھی تیار ہو گئی۔ لباس کے حوالے سے اس وقت اُس نے ساڑھی کا انتخاب کیا تھا اور اُس کا پلو سر پر ڈال رکھا تھا۔

ٹھیک سات بجے میں نے بیرونی دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ گلی میں لوگ آ جا رہے تھے اور دروازے سے چند گز آگے نیلے رنگ کی ایک خوبصورت سیڈان کھڑی تھی۔ میں اندر آ گیا اور سیتا کو کار کے بارے میں بتایا۔

چند منٹ بعد ہم مکان سے نکل آئے..... دروازہ بھیڑ کر باہر سے کنڈا لگا دیا اور کار کی طرف آ گئے۔ کار کے دروازے لاک نہیں تھے۔ اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ سیتا ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے ڈیش بورڈ کا جائزہ لیا۔ فیول بتانے والا میٹر بتا رہا تھا کہ ٹینکی بھری ہوئی تھی۔ سیتا نے سوٹ کیس پچھلی سیٹ پر ڈال دیا تھا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، پچھلی سیٹ پر پانی سے بھرا ہوا ایک مشکیزہ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ کرنے کے لئے اگنیشن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو فوراً ہی ایک خیال ذہن میں اُبھرا اور میں نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔

''کیا ہوا.....؟'' سیتا نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''چابی گھماتے ہی اگر کار دھماکے سے اُڑ گئی تو؟'' میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''ایسی کوئی بات ہونی ہوتی تو بہت پہلے ہو چکی ہوتی۔'' سیتا نے کہا۔ ''تم اللہ کا نام لے کر انجن اسٹارٹ کرو!''

میں نے اُنگلی اور انگوٹھے کی چٹکی میں چابی پکڑ کر اللہ کا نام لیتے ہوئے اُسے گھما دیا..... پہلی ہی کوشش میں انجن جاگ اُٹھا۔ کوئی دھماکہ نہیں ہوا۔ میں انجن کو گیئر میں ڈال کر گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ سیتا مجھے راستہ بتاتی رہی اور میں کار کو مختلف گلیوں اور سڑکوں پر گھماتا ہوا بالآخر اُس سڑک پر نکل آیا جو شہر کے نواحی علاقے سے ہوتی ہوئی پوکھران کی طرف چلی گئی تھی۔

شہر سے تقریباً ایک میل باہر چیک پوسٹ پر مجھے گاڑی روک دینی پڑی۔ ہم سے آگے ایک بس اور دو کاریں تھیں۔ یہ چوکی عارضی طور پر قائم کی گئی تھی۔ سڑک پر بیریئر لگا دیا گیا تھا جس کے دونوں طرف مسلح پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک طرف سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک خیمہ بھی لگا ہوا تھا۔ سیتا نے ساڑھی کا پلو سر پر دوپٹے کی طرح درست کر لیا۔ اُس نے حلیہ بدلنے میں کچھ محنت کی تھی۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں والا چشمہ بھی لگا ہوا تھا۔

اگلی گاڑیوں سے فارغ ہو کر ایک انسپکٹر میری طرف آ گیا اور مجھ سے مختلف سوالات کرنے لگا۔ میں نے وہ کاغذات اُس کی طرف بڑھا دیئے۔

''آپ دونوں نیچے اُتر آیئے..... گاڑی چیک کی جائے گی۔'' انسپکٹر نے کہا۔ میں نیچے اُتر آیا۔ سیتا اپنی طرف کا دروازہ کھول رہی تھی کہ خیمے سے ایک آدمی کو برآمد ہوتے دیکھ کر میں چونک گیا..... وہ انٹیلی جنس آفیسر بابوراؤ تھا۔

''ارے نارائن..... ان دیوی جی کو کیوں پریشان کرتے ہو؟ جانے دو انہیں۔ گاڑی چیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اُس نے قریب آ کر انسپکٹر سے کہا۔

''یس سر.....'' انسپکٹر نے کہا۔

میں شکریہ ادا کرتا ہوا دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کر دیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ سڑک پختہ اور بہت شاندار تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن بھی تھی جو پوکھران، رام ڈیوڑی اور پھالوری ہوتی ہوئی جودھ پور کی طرف چلی گئی تھی۔

آٹھ بج چکے تھے۔ دُھوپ میں ابھی سے تیزی آ گئی تھی اور تپش بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے کار کی رفتار بڑھا دی اور اطراف میں دیکھنے لگا۔ تا حد نگاہ لق و دق صحرا پھیلا ہوا تھا جہاں کہیں کہیں چھوٹی پہاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن کہیں معمولی سا سبزہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

شروع میں چند میل تک تو سڑک بے حد صاف اور ہموار تھی۔ لیکن آگے خاصی ٹوٹ پھوٹ نظر آ رہی تھی۔ کار کو مسلسل ہلکے ہلکے دھچکے لگ رہے تھے۔ سیتا سامنے دیکھتے ہوئے بتا رہی تھی کہ تقریباً پینتالیس میل آگے چندن نام کا ایک قصبہ ہے جو ریلوے سٹیشن بھی ہے۔ چندن سے پینسٹھ کلومیٹر آگے پوکھران ہے۔ لیکن ہمیں پوکھران پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے کی کوئی منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔

کافی دیر خاموشی رہی۔ میں نے گردن گھما کر سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کی پیشانی پسینے سے تر تھی اور چہرے پر وحشت بھی نمایاں تھی۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگا جو صحرا میں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹہ سفر کرنے کے بعد سامنے سے ایک بس کو آتے دیکھ کر میں نے کار سڑک سے ہٹا لی اور ایک اُونچے ٹیلے کے پیچھے لیتا چلا گیا۔ مجھے بابوراؤ کی اس کار کے بارے میں کچھ شبہ تھا اور میں فی الحال کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اگرچہ کوئی ایسی بات ابھی تک

سامنے نہیں آئی تھی لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ سڑک پر بھی پیٹرولنگ نہ ہو رہی ہو۔ اس لئے میں نے سوچا تھا کہ کچھ دیر سڑک سے ہٹ کر سفر کرنے کے بعد دوبارہ سڑک پر آ جاؤں گا۔

میں اُونچے ٹیلوں کے پیچھے ہی پیچھے ڈرائیو کرتا رہا۔ ریت اگرچہ جمی ہوئی تھی اور سخت تھی لیکن کہیں کہیں کار کو آگے بڑھنے میں خاصی دُشواری پیش آ رہی تھی۔ ٹائر کہیں نرم ریت میں دھنستے تو کار کو آگے بڑھانے میں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ٹائر ایک بار پھر ریت میں دھنس گئے۔

میں نے نیچے اُتر کر اِدھر اُدھر دیکھا اور دوسرے ہی لمحہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... آدھا گھنٹہ پہلے تک میں سڑک کو نگاہ میں رکھے ہوئے تھا لیکن اب سڑک غائب تھی..... ہم نجانے کس طرف نکل آئے تھے۔ کسی صحرا میں بھٹکنے کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ تپتے ہوئے ریگزاروں میں ایڑیاں رگڑتے ہوئے مرنے کے تصور ہی سے میں کانپ اُٹھا.....

سیتا بھی کار سے اُتر آئی۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی اور چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ گرمی کی شدت نے اُسے نڈھال کر دیا تھا۔

''کیا ہوا.....؟'' اُس نے مُردہ لہجے میں پوچھا۔

''ٹائر ریت میں دھنس گئے ہیں..... کار تو ذرا سی کوشش سے نکل آئے گی لیکن.....'' میں نے جان بوجھ کر جملہ مکمل نہیں کیا۔

''لیکن کیا.....؟''

''ہم راستہ بھٹک گئے ہیں اور کسی ریگستان میں راستہ بھٹکنے کا مطلب سمجھتی ہو؟'' میں نے کہا۔

سیتا کانپ اُٹھی۔ میں دل ہی دل میں اُس وقت پر لعنت بھیجنے لگا جب بابوراؤ کی پیشکش قبول کی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بابوراؤ کو تو گزشتہ رات ہی گلا گھونٹ کر ہلاک کر دینا چاہئے تھا۔ لیکن اب ایسی باتیں سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔ ہم یونہی کھڑے ویران سی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے رہے۔ دائیں طرف بہت دُور ایک پہاڑی نظر آ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے اگر ہم اُس پہاڑی تک پہنچ جائیں تو راستہ تلاش کر سکتے ہیں۔ لیکن پہلے کار کو نکالنے میں میری مدد کرو!'' میں نے کہا اور کار کے پچھلی طرف پہنچ گیا۔ سیتا بھی میرے ساتھ تھی۔ چند منٹ کی کوشش سے ہم کار کو دھکیل کر تقریباً دو فٹ آگے لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اتنی سی محنت سے ہی ہم دونوں بری طرح ہانپ گئے تھے۔ سیتا کے لئے گرمی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ اُس نے ساڑھی اُتار کر کار میں پھینک دی۔ اب اُس کے جسم پر بلاؤز اور پٹی کوٹ تھا۔ پسینے میں بھیگا ہوا بلاؤز بدن سے چپکا ہوا تھا۔ میں نے بھی ٹی شرٹ اُتار کر کار میں ڈال دی۔

کار اسٹارٹ کر کے میں اُسے آہستہ آہستہ آگے بڑھانے لگا۔ اُس چٹان تک پہنچنے میں تقریباً ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ سورج سر پر چمک رہا تھا۔ دماغ پلپلے ہو رہے تھے۔ آسمان سے جیسے آگ

برس رہی تھی اور ریت بھی انگاروں کی طرح تپ رہی تھی۔ کار میں رکھا ہوا پانی کا مشکیزہ ہمارے بہت کام آیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر کار میں بابو راؤ نے پانی کا یہ مشکیزہ نہ رکھا ہوتا تو ہم پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اب تک ختم ہو چکے ہوتے۔ اس مشکیزے میں بھی اب صرف چند گھونٹ پانی رہ گیا تھا۔ سیتا نے ایک گھونٹ بھر کر مشکیزہ میری طرف ڈال دیا اور نڈھال سی ہو کر سیٹ پر ڈھیر ہو گئی۔

وہ چٹان تقریباً دو سو گز دُور تھی۔ کار کے پہیے ایک بار پھر ریت میں دھنس گئے..... میں نے انجن بند کر دیا اور دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا۔

''اس چٹان پر شاید سائے کی کوئی جگہ مل جائے۔ نیچے اُتر آؤ! ہم کار کو یہیں چھوڑ دیں گے۔'' میں نے کہتے ہوئے سیتا کی طرف والا دروازہ کھول دیا۔

''میں نہیں اُٹھ سکتی..... ایک قدم بھی نہیں چل سکوں گی۔'' سیتا کراہی۔

''ہمت سے کام لو سیتا! صرف چند گز کا فاصلہ ہے۔ وہاں ہمیں یقیناً کوئی سایہ دار جگہ مل جائے گی۔'' میں نے کہتے ہوئے اُسے سہارا دے کر نیچے اُتار لیا۔ سیتا نے دوسرے ہاتھ میں پانی کا مشکیزہ بھی اُٹھا لیا تھا۔ اُس نے سارا بوجھ میرے اُوپر ڈال رکھا تھا اور میں اُسے تقریباً گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔

ہم بمشکل پچاس گز کا فاصلہ طے کر پائے تھے۔ میں نے سیتا کو چھوڑ دیا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح لہرا کر نیچے گر گئی..... میں نے متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اُوپر کی طرف نظریں اُٹھتے ہی میں کانپ گیا..... آسمان پر بہت بلندی پر دو گدھ فضا میں چکر کاٹ رہے تھے۔ میں اس مردار خور پرندے کی فطرت سے واقف تھا۔ یہ شکار کو تاڑ لیتا ہے اور اُس کے مرنے کے انتظار میں منڈلاتا رہتا ہے۔

''سیتا.....!'' میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آسمان پر گدھ منڈلانے لگے ہیں۔ انہیں شاید ہمارے مرنے کا انتظار ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ وہ ہمارے مرنے کا انتظار کئے بغیر ہم پر حملہ کر دیں۔ ہمیں ان سے بچنے کے لئے جلد سے جلد اُس چٹان تک پہنچ جانا چاہئے۔'' میں سیتا کو بمشکل گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔ اس دوران میں نے ایک بار پھر اُوپر دیکھا۔ گدھوں کی تعداد اب چار ہو گئی تھی اور وہ فضا میں چکر کاٹتے ہوئے نیچے آ رہے تھے.....

تقریباً بیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سیتا پھر گر گئی۔ میں نے ایک بار پھر اُوپر دیکھا، گدھوں کی تعداد پانچ ہو گئی تھی..... میں سیتا کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا رہا۔ پہاڑی تقریباً پچاس گز دُور رہ گئی تھی۔ سیتا ایک بار پھر گر گئی۔ میری اپنی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ دماغ جیسے پگھلا جا رہا تھا اور پنڈا جیسے تیز دُھوپ میں جھلسا جا رہا تھا۔

پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سن کر میں نے اُوپر دیکھا اور کانپ اُٹھا..... وہ دس بارہ گدھ تھے جو ہمارے سروں سے تیس چالیس فٹ اُوپر فضا میں منڈلا رہے تھے۔ اور پھر ایک گدھ غوطہ لگاتا ہوا

ہم سے پچیس تیس فٹ کے فاصلے پر ریت پر بیٹھ گیا..... وہ چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

''سیتا اُٹھو.....!'' میں چیخا۔ ''یہ گدھ ہم پر حملہ کرنے والے ہیں۔''

''مم..... میں نہیں اُٹھ سکتی۔'' سیتا کراہی۔ ''مم..... مجھے یہیں چھوڑ دو! تم جاؤ..... اپنے آپ کو بچا لو ان گدھوں سے۔''

میں نے اپنے اُوپر منڈلاتے ہوئے ان گدھوں کو دیکھا، جھک کر سیتا کو کندھے پر اُٹھایا اور چٹان کی طرف دوڑ لگا دی۔ پچاس گز کا فاصلہ میرے لئے پچاس میل بن گیا تھا۔ میرے پیر ریت میں دھنس رہے تھے۔ میں بار بار لڑکھڑا رہا تھا لیکن سر پر پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز مجھے مسلسل دوڑتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ بالآخر میں چٹان کے قدموں میں پہنچ گیا اور سیتا کو ایک بہت بڑے پتھر کے قریب زمین پر لٹا دیا اور ایک پتھر اُٹھا کر گدھوں کی طرف دے مارا۔

شکار کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر شاید گدھ مایوس ہو گئے تھے۔ وہ بتدریج بلندی کی طرف پرواز کرتے ہوئے فضا میں بکھرتے چلے گئے۔ میں بھی سیتا کے قریب زمین پر گر گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پانی کا مشکیزہ اب بھی سیتا کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے مشکیزہ لیا۔ پانی کے ایک دو گھونٹ سیتا کے حلق میں ٹپکائے، ایک گھونٹ خود پیا اور اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

چند منٹ بعد میں اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور بالآخر پہاڑی پر چڑھنے کا ایک راستہ نظر آ گیا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا جس کے پسینے میں تر عریاں جسم پر چپکی ہوئی ریت چمک رہی تھی۔ اُس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اُسے سہارا دے کر اُٹھا دیا۔

''مجھے چھوڑ دو شمروز..... میں نہیں چل سکوں گی۔'' وہ کراہی۔

میں نے پانی کا مشکیزہ اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اُسے ایک گھونٹ پانی پلانے کے بعد میں نے مشکیزہ کندھے پر لٹکا لیا اور سیتا کو تقریباً گھسیٹتا ہوا چٹان پر چڑھنے لگا۔ تقریباً سو فٹ اُوپر دائیں طرف چٹان کا ایک بہت بڑا پتھر سائبان کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا۔ اُس تک پہنچنے کا راستہ بہت تنگ اور مخدوش تھا۔ لیکن صرف وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں چلچلاتی ہوئی دُھوپ سے کچھ دیر کے لئے نجات مل سکتی تھی۔

میں نے سیتا کو کندھے پر لاد لیا اور آہستہ آہستہ اُس تنگ سے راستے پر چڑھنے لگا۔ وہ راستہ تین فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف گہرا کھڈ۔ میرے قدموں کی معمولی سی لغزش ہم دونوں کو موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ میں بہت احتیاط سے قدم اُٹھاتا ہوا سائبان نما پتھر کے نیچے پہنچ گیا۔ وہاں کافی کشادہ جگہ تھی۔ میں نے سیتا کو نیچے لٹا دیا اور خود بھی گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ گرم ہوا کے تھپیڑے ہمارے چہروں سے ٹکرا

رہے تھے مگر سائبان کا سایہ غنیمت تھا۔ حواس پر قابو پانے کے بعد میں صورتحال کا جائزہ لینے لگا۔ یہ جگہ تقریباً آٹھ فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی تھی۔ پیچھے چٹان تھی اور آگے عمودی ڈھلان جو تقریباً اسّی فٹ تک چلی گئی تھی۔ دُور کھڑی ہوئی کار کسی کھلونے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس سے آگے تا حد نگاہ ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ تیز دُھوپ میں صحرا میں آگ کے الاؤ سے دہکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

میں مُڑ کر سیتا کی طرف دیکھنے لگا جو نڈھال سی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے ایک گھونٹ اور پانی پلایا۔ اپنے ہونٹ بھی تر کئے اور سیتا کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

''میں تمہیں ایک بہادر لڑکی سمجھتا تھا لیکن تم تو.....'' میں خاموش ہو کر اُس کے بالوں سے ریت جھاڑنے لگا۔

سیتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے چہرے پر مردنی سی تھی اور آنکھوں سے ویرانی جھانک رہی تھی۔ وہ پلک جھپکے بغیر میری طرف دیکھتی رہی۔ میری نظریں اُس کے چہرے سے پھسلتی ہوئی بلاؤز پر ٹک گئیں..... سیاہ بلاؤز سے جھانکتی ہوئی گھاٹیاں بڑا دلفریب منظر پیش کر رہی تھیں۔

سیتا نے دونوں ہاتھ میری گردن میں حمائل کر دیئے۔ اُس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی تھی اور ہونٹوں پر بڑی خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ میرا چہرہ آہستہ آہستہ نیچے جھکنے لگا اور پھر دونوں کے تپتے ہوئے ہونٹ ایک دوسرے سے مل گئے..... سیتا میرے ساتھ لپٹی جا رہی تھی جیسے مجھے اپنے اندر سما لینے کی کوشش کر رہی ہو۔ اور پھر میں بھی اپنے حواس کھو بیٹھا.....!

ہمیں اس سائبان کے نیچے لیٹے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ میں ایک بار پھر اُٹھ کر سامنے دیکھنے لگا۔ ''ہمیں اس چٹان کے اُوپر چڑھ کر دیکھنا چاہئے۔ ممکن ہے دوسری طرف کسی بستی یا راستے کے آثار نظر آ جائیں۔'' میں نے کہا۔

سیتا لباس درست کرتی ہوئی اُٹھ گئی۔ ہم دونوں سائبان سے نکل کر اُس راستے پر چلنے لگے جس سے یہاں تک پہنچے تھے۔ میں آگے تھا اور ایک ہاتھ سے چٹانی دیوار کا سہارا لے رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے سیتا کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ ابھی ہم نے تقریباً پندرہ فٹ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سیتا کے پیر کے نیچے سے ایک پتھر نے جگہ چھوڑ دی۔ اُس کے مُ[illegible] یب ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ سنبھلنے کی کوشش میں اُس نے مجھے بھی اپنی طرف کھینچ لیا..... میرا پیر بھی پھسل گیا اور دوسرے ہی لمحہ ہم دونوں بڑی تیزی سے اسّی فٹ گہری اُس عمودی ڈھلان پر قلابازیاں کھا رہے تھے..... میرا سر کسی پتھر سے ٹکرایا..... آنکھوں کے سامنے ایک لمحہ کو نیلی پیلی سی چنگاریاں چمکیں اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا.....!!

○○○

آنکھ کھلی تو میرے دماغ پر غنودگی سی طاری تھی۔ گرمی کی شدت اور جسم کے مختلف حصوں سے اُٹھنے والی درد کی لہروں کے سوا کوئی احساس نہیں تھا۔ میں بے حس و حرکت لیٹا بے مقصد نگاہوں سے سامنے گھور رہا تھا۔ میری نگاہوں کا کوئی مرکز نہیں تھا۔ کوئی چیز واضح نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دُھند نے سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو۔ ملی جلی آوازوں کی بھنبھناہٹ میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ آوازیں کسی کنویں کی گہرائی سے آ رہی ہوں۔ ایک مترنم سی آواز ان تمام آوازوں پر غالب آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اپنی تمام تر توجہ اُس آواز پر مرکوز کر دی۔ رفتہ رفتہ یہ آواز واضح ہوتی چلی گئی.....

''اب تم ہوش میں آ رہے ہو..... چند سیکنڈ اسی طرح بے حرکت لیٹے رہو! میں تمہارے خون کا نمونہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''

اسی لمحہ مجھے اپنے دائیں بازو پر نازک سی اُنگلیوں کے لمس کا احساس ہوا۔ میں ابھی اُنگلیوں کے اُس لمس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ منہ سے بے اختیار سسکاری سی نکل گئی۔ بازو میں پیوست ہونے والی سوئی کی چبھن خاصی تکلیف دہ تھی۔

''بس چند سیکنڈ! تمہیں زیادہ تکلیف نہیں ہو گی۔ ٹیسٹ کے لئے خون کے چند ہی قطرے کافی ہوں گے۔'' وہ نرم نسوانی آواز اس مرتبہ میرے کان کے بہت قریب سے اُبھری تھی۔

سوئی بازو سے نکل گئی۔ اب درد کا ہلکا سا احساس باقی رہ گیا تھا۔ لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ خون کے چند قطرے نکلنے سے میرے سر کا درد ہلکا ہو گیا تھا اور میں بڑی حد تک بہتری محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے سر کو دائیں طرف گھمایا۔

درمیانے قد کی ایک دُبلی پتلی سی عورت میرے سامنے کھڑی تھی۔ آنکھوں پر نازک سی اسٹیل فریم کی عینک، کانوں میں ہلکے سے ٹاپس، ناک میں چھوٹی سی نتھنی جس میں بہت ننھا سا نگینہ جگمگا رہا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور کمر تک جھولتے ہوئے سیاہ بال۔ اُس نے گلابی رنگ کی سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی..... مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اُس کے [illegible] مسکراہٹ آ گئی۔ اُس کے اس طرح مسکرانے سے چہرے پر باریک سی لکیریں اُبھر آئیں جس سے وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی نظر آنے لگی تھی۔ لیکن چہرے پر نمودار ہونے والی یہ باریک سی لکیریں بھی اُس کے حسن کو متاثر نہ کر سکیں۔ گردن گھمانے سے میرے سر کے پچھلے حصے میں ایک بار پھر [illegible] ہلکی ٹیسیں اُٹھنے لگیں لیکن میں اُس حسین چہرے کو دیکھتا رہا۔

''کیا تم ڈاکٹر ہو.....؟'' میں نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں.....'' اُس کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ ''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا لیکن اُس وقت تم پر نیم مدہوشی طاری تھی۔ میں تمہاری طرف سے بہت فکر مند رہی ہوں۔ تم جب سے یہاں آئے ہو تھوڑی دیر کو ہوش میں آنے کے بعد پھر بے ہوش ہو جاتے ہو۔ بہر حال! اب میں تمہاری حالت سے قدرے مطمئن ہوں۔''

''جب سے یہاں آیا ہوں.....!'' میں بڑبڑایا۔ میری آنکھیں بھینچ گئیں۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں کب، کیوں اور کیسے آیا تھا..... اور مجھے کیا ہوا تھا؟ ذہن پر زور دینے سے سر کا درد شدت اختیار کرنے لگا۔ دماغ میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ میں نے بے بسی سے سر جھٹک دیا۔

''پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں..... فی الحال دماغ پر بوجھ مت ڈالو! یہ کیفیت وقتی ہے۔ ویسے تم لوگ خوش قسمت ہو کہ جب یہ حادثہ پیش آیا تو اُس کے کچھ دیر بعد ایک شتر سوار اُس طرف سے گزرا جس نے تم لوگوں کو دیکھ لیا۔ چلتے ہوئے اُس صحرا میں بیسیوں میل تک ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں کسی قسم کی طبّی امداد مہیا ہو سکے۔ چندن میں ہمارا یہ ہسپتال اگرچہ بہت چھوٹا ہے لیکن میں کوشش کرتی ہوں کہ یہاں مریضوں کو ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہوں۔ میں یہاں کی واحد ڈاکٹر ہوں۔ گھبراؤ نہیں..... میں تمہاری مناسب دیکھ بھال کروں گی۔ سر میں درد کی تکلیف بھی جلد ہی دُور ہو جائے گی۔ رضیہ کے بارے میں بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ بس معمولی سی چوٹیں آئی ہیں۔''

''رضیہ..... یہ کون ہے؟ اور یہ کون سی جگہ ہے؟'' میں نے وحشت زدہ سی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تمہاری دوست رضیہ..... جس کے ساتھ تم سفر کر رہے تھے۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''تمہاری گاڑی شاید خراب ہو گئی تھی اور تم دونوں صحرا میں بھٹکتے ہوئے اُس چٹان تک پہنچ گئے تھے جہاں تم دونوں کو یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ شتر سوار تم دونوں کے لئے فرشتہ ثابت ہوا تھا۔ وہ سفر کے دوران کچھ دیر ستانے کے لئے چٹان کے سائے میں رُکا تھا۔ اُس نے تم دونوں کو وہاں بے ہوش پڑے ہوئے دیکھ لیا اور اُونٹ پر لاد کر یہاں چھوڑ گیا۔ کیا تمہیں یاد نہیں؟''

''صحرا میں سفر..... حادثہ.....'' مجھے اپنے پیٹ میں گرہیں سی پڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

''نہیں ڈاکٹر! مجھے کچھ یاد نہیں..... مجھے تو اپنا نام تک یاد نہیں ہے۔''

''تمہارا نام وحید الدین ہے۔'' رضیہ نے بتایا تھا۔ ''ڈاکٹر آگے جھک کر میرے سر اور اندھے پر بندھی ہوئی پٹیوں کا جائزہ لینے لگی۔

بڑی شدت کی گرمی تھی۔ ہر چیز دہک رہی تھی۔ یہ لمبا چوڑا کمرہ تندور کی طرح تپ رہا تھا۔ میرے سر میں ایک بار پھر درد کی شدید لہریں اُٹھنے لگیں۔ میرے دانت خود بخود بھنچ گئے اور میں

نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے کندھے اور سر کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے پٹیاں دوبارہ باندھ دیں اور میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''اب تم آرام کرو..... ذہن پر بوجھ مت ڈالو! اس وقت کچھ دیر کی نیند تمہارے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔''

''لیکن میں کہاں ہوں..... یہ کون سی جگہ ہے؟ کیا میری یادداشت.....'' کسی نامعلوم خوف کے تحت میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

''تم چندن میں ہو..... یہ چھوٹا سا قصبہ جیسلمیر شہر سے چالیس میل کی دُوری پر واقع ہے۔ آس پاس میلوں دُور تک کوئی آبادی نہیں۔ تمہارا نام وحید الدین ہے۔ اب تم آرام کرو!'' ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور نجانے اُن نگاہوں میں کیا سحر تھا کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں.....!

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو ماحول نیم تاریک تھا..... وارڈ کے آخری سرے پر چھت سے لٹکا ہوا مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اُس بلب کی بیمار سی روشنی اتنے بڑے کمرے کی تاریکی دُور کرنے کے لئے قطعی ناکافی تھی۔ میں ماحول کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہوئے یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کون ہوں اور راجستھان کے دُور دراز قصبے چندن کے اس ہسپتال میں کس طرح پہنچا؟ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ صحرا میں سفر کے دوران ہماری کار خراب ہو گئی تھی اور ہم بھٹکتے ہوئے اس چٹان تک پہنچ گئے تھے جہاں سے گر کر ہم دونوں زخمی ہو گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ رضیہ کون تھی اور میں اُس کے ساتھ صحرا میں کہاں جا رہا تھا؟ اگر میرے ساتھ رضیہ نام کی کوئی عورت تھی تو وہ اب کہاں ہے؟''

میرے دماغ پر دُھند سی چھائی ہوئی تھی۔ تیز سنسناہٹ کے بعد سر میں ایک بار پھر درد ہونے لگا اور میں سر جھٹک کر رہ گیا۔ میں جو کچھ بھی تھا مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ میری یادداشت کھو چکی تھی.....!!

میرے دماغ میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ سر کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔ اور پھر سسکیوں کی آواز سُن کر میں اپنا سر درد بھول گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ آواز اُس سکرین کے دوسری طرف سے اُبھر رہی تھی جو میرے اور ساتھ والے بیڈ کے درمیان ایستادہ تھی۔ میں اُس بیڈ سے اُٹھ کر سکرین کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ بستر پر بیٹھی ہوئی ایک جوان عورت گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی۔

''کیا ہوا..... تمہیں کوئی تکلیف ہے کیا؟'' میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ اُس عورت نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ سیتا تھی جو چند لمحے حسرت آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بیڈ سے اُٹھ کر والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

''یہ کیا ہو گیا شمروز..... یہ سب کیا ہے؟ تمہاری یادداشت کیوں کھو گئی..... تمہیں کچھ یاد

کیوں نہیں آتا؟ مجھے بڑا خوف لگ رہا ہے۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ ہم کون ہیں تو یہ لوگ ہمیں فوراً پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ اور جانتے ہو پھر کیا ہو گا؟''

''تم کون ہو.....؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میں..... میں سیتا ہوں..... مجھے پہچانو شہروز!'' اُس نے جواب دیا۔ ''اب بھی وقت ہے..... اپنے ذہن پر زور دو اور یاد کرنے کی کوشش کرو! میں نے ریگستان کے سفر کے بارے میں انہیں ایک فرضی کہانی سنائی تھی۔ اُنہوں نے تمہارے شریر کے زخم دیکھنے کے لئے تمہارے کپڑے اُتار دیئے تھے اور سمجھ گئے تھے کہ تم مسلمان ہو۔ میں نے اُنہیں تمہارا اور اپنا وہی نام بتا دیا جو بابو راؤ نے ہمیں بتائے تھے۔ یعنی تم وحید الدین ہو اور میں تمہاری دوست رضیہ۔ میں اُن لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو بہت سادہ لوح، بیوقوف اور ڈرپوک ظاہر کر رہی ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہماری اصلیت زیادہ عرصے تک چھپی نہیں رہ سکے گی اور.....''

ڈاکٹر رادھا کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اے مسٹر وحید! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ڈاکٹر رادھا قریب آ کر بولی۔

''اس عورت کے رونے کی آواز سن کر میں یہاں آ گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''پہچانو اسے..... یہ رضیہ ہے۔ تمہاری دوست۔'' ڈاکٹر رادھا بولی۔

''نہیں..... میں اسے نہیں جانتا۔'' میں نے بے بسی سے سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے..... اب تم اپنے بیڈ پر جاؤ! میں صبح بشیر سے بات کروں گی۔ شاید وہ تمہاری کچھ مدد کر سکے۔''

''بشیر کون؟''

''اسی قصبے کا رہنے والا ہے۔ مسلمان ہے..... اُس سے مل کر تمہیں یقیناً بہت خوشی ہو گی۔'' ڈاکٹر رادھا نے کہا۔

اسی وقت درمیانے قد کا ایک آدمی کھانے کی ٹرے اُٹھائے میرے بیڈ کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے تنگ سی پتلون اور ڈھیلی سی شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر دھاری دار کپڑے کی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ اُس نے ٹرے میرے بیڈ پر رکھ دی جس کے ایک پیالے میں گدلا سا شوربا اور تام چینی کی پلیٹ میں دو چپاتیاں رکھی ہوئی تھیں۔

''یہ میرا اسسٹنٹ جگت سنگھ ہے۔ میری عدم موجودگی میں ہسپتال کی تمام ذمہ داریاں یہی پورا کرتا ہے۔'' ڈاکٹر رادھا نے کہا اور وارڈ کے آخری بیڈ کی طرف دیکھنے لگی جہاں ایک مریضہ کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر رادھا تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اُس کی طرف چلی گئی۔

میں نے بستر پر رکھی ہوئے ٹرے اُٹھا کر سٹول پر رکھ دی اور سامنے دیوار پر نظریں جماتے ہوئے سوچنے لگا کہ میں کون ہوں..... کیا ہوں؟ رضیہ نامی اس عورت کے ساتھ سفر کیوں کر رہا تھا؟ اگر رضیہ میری دوست ہے تو میرے بارے میں سب کچھ بتا کیوں نہیں دیتی؟ لیکن میرے

ذہن میں کوئی بات نہیں آ سکی۔ دماغ کی نسوں میں تناؤ سا پیدا ہونے لگا..... تاریکی کی چادر آنکھوں کے سامنے پھیلنے لگی۔ میں نے سوچنا چھوڑ دیا۔ ٹرے اُٹھا کر اپنے سامنے رکھ لی اور شوربے میں روٹی بھگو کر کھانے لگا۔

ماحول میں ایک عجیب سی پراسراریت تھی۔ میں اجنبی لوگوں میں گھرا ہوا اپنے آپ سے بھی اجنبی تھا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد میں ایک بار پھر اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ ذہن میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ اچانک دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا جیسے کچھ یاد آ رہا ہو..... لیکن پھر ایک دم تاریکی چھا گئی..... کوئی بات ذہن کے تاریک گوشے سے اُبھر کر سامنے آنا چاہتی تھی لیکن ہر مرتبہ دماغ میں سوئیوں کی چبھن سی ہونے لگتی۔ میں نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دماغ میں کبھی بجلی کے کوندے سے لپکنے لگتے اور کبھی تاریکی چھا جاتی۔ پھر نجانے کب میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا.....!!

○

صبح میں بستر پر اپنے اِردگرد کا جائزہ لے رہا تھا کہ رضیہ ناشتے کی ٹرے لے کر پہنچ گئی۔ اُس کے چہرے پر غم اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اُس نے ٹرے سٹول پر رکھ دی اور پلنگ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''مجھے اس حادثے میں بہت معمولی چوٹیں آئی تھیں..... اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور اگرچہ ہسپتال میں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے مگر ڈاکٹر رادھا نے محض تمہاری وجہ سے مجھے یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے اور میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ مریضوں کی دیکھ بھال اور دوسرے کاموں میں اُس کی مدد کرتی رہوں گی۔''

''چلو اچھا ہے..... تمہارا دل لگا رہے گا۔'' میں نے جواب دیا۔ میں جب بھی رضیہ کو دیکھتا میرے دماغ کو جھٹکا سا لگتا لیکن پھر تاریکی چھا جاتی.....

''میں مریضوں کو ناشتہ وغیرہ دے دُوں..... پھر تمہارے پاس آ کر بیٹھوں گی۔'' وہ کہتے ہوئے دوسری طرف چلی گئی۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے ٹرے اپنے سامنے رکھی اور ناشتہ کرنے لگا۔ اسی دوران رضیہ واپس آ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک دراز قامت آدمی وارڈ میں داخل ہوا۔ وہ چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر پنجے تلے قدم اُٹھاتا ہوا بیڈ کے قریب آ گیا۔ اُس کا جسم صحت مند اور آنکھوں میں تجسس کی چمک تھی۔ بڑی بڑی مونچھیں اُس کی شخصیت کو بڑا پروقار بنا رہی تھیں۔ وہ چند لمحے پُرتجسس نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم وحید الدین ہو؟''

''ہاں..... اور تم؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میرا نام بشیر ہے۔'' اُس شخص نے اپنا تعارف کرایا۔ ''ڈاکٹر رادھا نے بتایا تھا کہ تمہاری

یادداشت کھو چکی ہے۔''

''ہاں..... کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں.....'' اُس نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی حادثے کے باعث یادداشت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسا وقتی طور پر ہوتا ہے۔ ممکن ہے کسی اور معمولی حادثے سے تمہاری یادداشت لوٹ آئے۔''

بشیر کچھ دیر میرے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ رضیہ بھی اس دوران کہیں جا چکی تھی۔ میں بستر پر لیٹا سوچتا رہا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ میں اپنے خیالات سے چونکا تو اُس وقت جب ایک اور آدمی میرے بیڈ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چھوٹے قد کا گول مٹول سا آدمی تھا جس نے سفید دھوتی اور کھدر کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ ہندو تھا۔ مٹکے کی طرح پھولا ہوا پیٹ عجیب سا تاثر پیش کر رہا تھا۔

''میرا نام رائے ہے۔'' اُس نے رُومال سے پیشانی اور گردن پر بہنے والا پسینہ پونچھتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ ''میں ڈیزرٹ آفیسر ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم اپنی یادداشت کھو چکے ہو۔ اس ریگستان میں سفر کرنے والوں کی دیکھ بھال کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں..... بتاؤ! اب تمہیں کچھ یاد آ رہا ہے یا نہیں؟''

میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ ویسے یہ شخص مجھے ذرا بھی پسند نہیں آیا تھا اور میری خواہش تھی کہ اُوٹ پٹانگ سوالات سے میرا دماغ خراب کرنے کی بجائے جلد سے جلد چلا جائے۔ چند رسمی باتوں کے بعد اُس نے بتایا کہ وہاں سے چند میل دُور سڑک کے کنارے ایک خالی سوٹ کیس کی شناخت کرانا چاہتا تھا کہ وہ میرا ہے یا نہیں؟ یہ جاننے کے بعد کہ میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں اُس کا یہ سوال بڑا ہی احمقانہ تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ ڈاکٹر نے مجھے آرام کا مشورہ دیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے..... میں ڈاکٹر سے مشورہ کر لیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دے گی۔'' رائے کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ گیا اور میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اطلاع دی کہ ڈاکٹر رادھا نے اُسے کل مجھے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی ہے۔

''مجھے افسوس ہے..... میں کل بھی تمہارے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔ تم اگر کوئی سوٹ کیس شناخت کرانا چاہتے ہو تو اُسے یہاں کیوں نہیں لے آتے؟'' میں نے جواب دیا۔ نجانے کیا بات تھی کہ اُس اجنبی کی نظریں مجھے اپنے جسم پر سوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''سوٹ کیس یہاں لانا درست نہیں ہوگا۔ میں پرسوں آؤں گا یا پھر اُس سے اگلے دن..... میں تمہارے صحت یاب ہونے کا انتظار کر سکتا ہوں..... میں پھر آؤں گا۔'' وہ شخص کہتا ہوا

دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ رائے چلا گیا لیکن میرے لئے کچھ اور اُلجھنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ نجانے کیا بات تھی کہ میں اُس کی موجودگی میں عجیب سی بے چینی محسوس کرتا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وارڈ سے نکل کر ہسپتال کے صحن میں آ گیا۔ سورج اگرچہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا مگر اُس کی حدت برقرار تھی۔ ہسپتال کی شکستہ باؤنڈری وال کے دوسری طرف ایک جوہڑ نظر آ رہا تھا جس کے گندے پانی میں مویشی اور ننگ دھڑنگ بچے نہا رہے تھے۔ کنارے پر ایک طرف چند ہندو عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں اور اُن کے قریب ہی تین چار خارش زدہ کتے پانی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

مجھے وہاں کھڑے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ڈاکٹر رادھا کا اسسٹنٹ جگت سنگھ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں پہنچ گیا..... اُس کے ہاتھ خون آلود دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔

''ارے کیا ہوا..... تمہارے ہاتھ سے خون کیوں بہہ رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا..... یہ میرا خون نہیں ہے۔'' جگت سنگھ کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

اُسی وقت چار آدمی ایک چارپائی کندھوں پر اُٹھائے ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے۔ چارپائی پر ایک موٹے آدمی کی لاش تھی۔ لاش پر کئی گہرے زخم نظر آ رہے تھے۔ اُسے بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا۔ وہ لوگ لاش کو کہیں دُور سے اُٹھا کر لائے تھے۔ سانس لینے کے لئے اُنہوں نے چارپائی برآمدے میں رکھ دی۔

میں بھی قریب آ گیا اور لاش کا چہرہ دیکھتے ہی بری طرح بدحواس ہو گیا۔ وہ مسٹر رائے کی لاش تھی جو ڈیزرٹ آفیسر کی حیثیت سے مجھ سے ملا تھا..... ابھی میں لاش کو اچھی طرح دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ ڈاکٹر رادھا بھی وہاں پہنچ گئی۔

''تم اپنے بیڈ پر جاؤ مسٹر وحید! میں کچھ دیر بعد تم سے ملاقات کروں گی۔'' ڈاکٹر رادھا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور آدمیوں کو لاش اُٹھانے کا اشارہ کیا۔ میں اپنے بیڈ پر آ گیا اور کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ ہسپتال کے برآمدے میں اب قصبے کے بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ رضیہ بھی تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ وہ بھی بدحواس اور کسی قدر خوفزدہ سی نظر آ رہی تھی۔

''تمہارے لئے ایک بری خبر ہے.....'' اُس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''ڈاکٹر رادھا کہہ رہی ہے کہ اب تمہیں ہسپتال سے چھٹی دے دی جائے گی۔''

''کیوں..... اُس نے اچانک یہ فیصلہ کر لیا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ یہ خیال ہی وحشت انگیز تھا کہ مجھے ہسپتال سے چھٹی دی جانے والی ہے۔ کسی جگہ..... اجنبی لوگ... اپنے آپ سے اجنبی..... میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

''رائے مر چکا ہے..... اور لوگوں کا خیال ہے کہ مرنے سے پہلے وہ جس آخری انسان سے ملا وہ تم ہو۔'' رضیہ نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

''میری ملاقات کا اُس کی موت سے کیا تعلق؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔ بس وہ لوگ کہتے ہیں کہ تم آخری شخص ہو جس سے رائے ملا تھا..... میں جا رہی ہوں۔ کچھ دیر بعد آؤں گی۔'' وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

میرا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا..... یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ مجھ سے ملاقات کے بعد رائے اگر مر گیا تھا یا کسی نے اُسے قتل کر دیا تھا تو اس میں میرا کیا قصور تھا؟ میں اپنی اس اُلجھن پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ڈاکٹر رادھا کا انتظار کرنے لگا اور ڈاکٹر رادھا تقریباً آدھے گھنٹے بعد آئی تھی۔

''کیا یہ درست ہے کہ مجھے یہاں سے ڈسچارج کیا جا رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں مسٹر وحید..... ہمیں دوسرے مریض کے لئے بیڈ کی ضرورت ہے اور تمہیں اب کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہے صرف یادداشت کھوئی ہے اور اس کے علاج کے لئے ضروری نہیں کہ ہسپتال میں رہا جائے۔ تمہیں ہسپتال چھوڑنے پر مجبور کرتے ہوئے مجھے افسوس ہو رہا ہے لیکن میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ اگر تم چاہو تو قصبے کے گیسٹ ہاؤس میں تمہارا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ بشیر بھی وہیں رہتا ہے۔''

''گیسٹ ہاؤس میں.....؟'' میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''میرے خیال میں مجھے ہسپتال سے نکالنے کی وجہ وہ نہیں جو تم نے بتائی ہے۔ رضیہ سے معلوم ہوا ہے کہ قصبے کے لوگ مجھ پر کسی قسم کا شبہ کر رہے ہیں۔ ڈیزرٹ آفیسر رائے اپنی موت سے کچھ دیر پہلے مجھ سے مل کر گیا تھا اور اُس کی موت کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جا رہا ہے..... گویا میں کسی شیطانی قوت کے زیر اثر ہوں۔''

''نہیں..... یہ بات نہیں مسٹر وحید۔ ہمیں واقعی دوسرے مریض کے لئے بیڈ کی ضرورت ہے۔ رضیہ بھی اب تمہارے ساتھ گیسٹ ہاؤس میں رہے گی۔'' ڈاکٹر رادھا نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''رائے کی موت کیسے واقع ہوئی تھی.... اُسے قتل کیا گیا تھا یا کوئی حادثہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اُس کی موت کی وجہ کوئی نہیں جانتا۔ اُس کی لاش بستی سے تقریباً ایک میل دُور ریگستان میں اُس کی جیپ کے قریب پڑی پائی گئی تھی جس پر زخموں کے لاتعداد نشان تھے اور زبان بھی کٹی ہوئی تھی۔ آس پاس اُس کی جیپ کے پہیوں کے علاوہ اور کسی قسم کے نشان نہیں ملے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہو کہ اُسے کسی نے قتل کیا ہوگا۔ اس وجہ سے اُس کی موت کو پُراسرار قرار دیا جا رہا ہے اور.....''

''اور اس کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جا رہا ہے۔ کیونکہ آخری مرتبہ وہ مجھ سے مل کر گیا تھا۔'' میں نے اُس کا جملہ مکمل کر دیا۔

ڈاکٹر رادھا نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ چند لمحوں بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں کچھ دیر بعد کسی کو تمہارے پاس بھیج دُوں گی جو تمہیں گیسٹ ہاؤس پہنچا دے گا۔'' یہ کہنے کے ساتھ ہی ڈاکٹر رادھا وہاں سے چلی گئی۔

ڈاکٹر رادھا کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر اُلجھن میں مبتلا ہو گیا۔ بشیر مجھے ہندوؤں کی توہم پرستی کے بارے میں تھوڑا بہت بتا چکا تھا اور میں سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ قصبے کے لوگ مجھے کسی پراسرار شیطانی قوت کے زیر اثر سمجھ رہے تھے اور ظاہر ہے وہ یہاں میری موجودگی کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن میں یہ قصبہ اُس وقت تک نہیں چھوڑ سکتا تھا جب تک میری یادداشت نہ لوٹ آئے۔ اس کے لئے یادداشت کا بحال ہونا بہت ضروری تھا۔ آخر میں کون ہوں..... کہاں سے آیا ہوں اور یہاں کس طرح پہنچا؟ رضیہ سے میرا کیا تعلق ہے؟ اُس نے مجھے ایک عجیب کہانی سنائی تھی۔ مجھے شمروز کے نام سے مخاطب کیا تھا اور اپنا نام بھی سیتا بتایا تھا اور اس خوف کا اظہار کیا تھا کہ اگر قصبے کے لوگوں پر ہماری اصلیت کھل گئی تو وہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ ہماری اصلیت کیا ہے؟ کیا ہم کوئی سنگین جرم کر کے بھاگے ہوئے ہیں؟ سیتا..... اچھا نام تھا..... سیتا..... دماغ پر زور ڈالنے سے میرا سر دُکھنے لگا اور میں کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

یہ قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک لمبی سڑک اور اُسے کراس کرتی ہوئی چند گلیاں جن میں جا بجا کیچڑ پھیلا ہوا تھا۔ قصبے کے عین وسط میں ایک مندر، اُس سے متصل پرائمری سکول اور چند دُکانیں تھیں۔ یہاں ان دیہاتیوں کی ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی۔ بیشتر مکان کچے تھے البتہ چند پیلی اینٹوں کے کچھ پختہ مکان بھی نظر آ رہے تھے۔ قصبے کے آخری سرے پر ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ کسمپرسی کی بنا پر مسجد کی حالت خاصی ابتر تھی۔ مینار ٹوٹ چکے تھے، پیلی اینٹوں کی دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ صحن میں خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ چار دیواری کی اینٹیں لوگ اپنے گھروں کی تعمیر میں استعمال کر چکے تھے۔ اینٹوں کی بجائے اب وہاں بانس کے پودوں کی چار دیواری تھی۔ مسجد کے محرابی دروازے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ برآمدے پر کھپریل کی چھت تھی۔ مسجد سے ملحق وہ چھوٹی سی عمارت تھی جسے گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ دونوں عمارتوں کا برآمدہ ایک ہی تھا۔ بعض اوقات مسجد کو بھی مہمان خانے کے طور پر استعمال کر لیا جاتا تھا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ مسجد ہی دراصل قصبے کا گیسٹ ہاؤس تھی۔ وہ حصہ جو بشیر کے استعمال میں تھا کسی زمانے میں مسجد کے پیش امام کا حجرہ رہا ہوگا۔ یہ حصہ صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔

میں جب سیتا کے ساتھ وہاں پہنچا تو بشیر ہمارے استقبال کے لئے موجود تھا۔ کمرے میں پرانے طرز کی ایک مسہری بچھی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی موجود تھیں۔ اندرونی حصہ میں اس سے ملحق ایک اور چھوٹا سا کمرہ تھا جسے بیک وقت

کچن اور غسل خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ چھوٹا کمرہ بھی اتنا کشادہ تھا کہ بوقت ضرورت اُس میں ایک چارپائی بھی بچھائی جاسکتی تھی۔ بڑے کمرے کی ایک کھڑکی سے دُھوپ کی کرنیں کمرے کے وسط میں پہنچ رہی تھیں۔ رائٹنگ ٹیبل پر ایک پرانے سے ٹائپ رائیٹر کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

''تم لوگوں کے یہاں آنے سے مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ رہائش کے لئے تم لوگ یہ کمرہ استعمال کر سکتے ہو۔ میں مسجد میں سو جایا کروں گا۔ تم لوگ آرام کرو! میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔'' بشیر نے خاموش ہو کر کچھ دیر سیتا کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔

میں عجیب سی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ بشیر کے جاتے ہی سیتا تو کمرے کی چیزوں کا معائنہ کرنے لگی اور میں بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے اپنے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ میں اس وقت عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اس چھوٹے سے قصبے کی تمام آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ بشیر واحد مسلمان تھا۔ وہ تقریباً پینتیس سال کی عمر کا ایک وجیہہ اور خوبرو آدمی تھا۔ مسلمان ہونے کے ناطے اگرچہ ہمیں اُس سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن رضیہ (سیتا) کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں اُبھرنے والی چمک نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

دفعتہً میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا..... ذہن پر گہری تاریکی کی بجائے دُھند سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس دُھند میں کچھ ہیولے سے اُبھر رہے تھے۔ اور پھر اپنے بازو پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے میں اُچھل پڑا..... وہ سیتا تھی۔

''اوہ..... کیا بات ہے؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''باہر ایک آدمی تم سے ملنا چاہتا ہے۔ اُس کا تعلق پولیس سے ہے۔'' سیتا نے کہا۔ اُس کے لہجے میں ہلکے سے خوف کی جھلک تھی۔

''پولیس.....؟'' میں چونک گیا۔ پھر اُٹھ کر باہر آ گیا۔ سیتا بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ لیکن دروازے سے نکلتے ہی وہ دوسری طرف مُڑ گئی۔ مسجد کے سامنے ایک جیپ کھڑی تھی۔ ایک دراز قامت آدمی جیپ سے ٹیک لگائے کھڑا اس طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے جسم پر آدھے آستین کی سرمئی رنگ کی شرٹ اور خاکی نیکر تھی۔ سر پر انڈین پولیس کے بیج والی ٹوپی تھی۔

''میرا نام گوپال سنگھ ہے اور میں پولیس کیپٹن ہوں۔'' اُس شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہارے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن چند ضروری باتیں پوچھنا تھیں جس کے لئے تمہیں زحمت دے رہا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ ہم کمرے میں بیٹھ کر بات کریں۔'' اُس نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور میرے ساتھ چل پڑا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں کچھ بتا سکوں گا۔ تم بھی جانتے ہو کہ ایک حادثے کے بعد میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں اس حادثے کے بارے میں نہیں، رائے نامی اُس شخص کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں جو آج صبح تم سے ملا تھا۔ اور تم سے ملاقات کے تھوڑی ہی دیر بعد اُسے ریگستان میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔'' گوپال سنگھ نے کہا۔

''لل..... لیکن میں اُسے بالکل نہیں جانتا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے ہسپتال آیا تھا اور کسی سوٹ کیس کی شناخت کے سلسلے میں مجھے ڈیزرٹ آفس لے جانا چاہتا تھا۔'' میں نے رُک رُک کر جواب دیا۔ کسی انجانے خوف کی لہر میرے پورے جسم میں سرائیت کر گئی تھی۔

''تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہاں ڈیزرٹ نام کا کوئی محکمہ نہیں ہے..... اس لئے کسی ڈیزرٹ آفس یا ڈیزرٹ آفیسر کا بھی کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔'' کیپٹن گوپال سنگھ نے کہا۔ ''میں نے تمہاری دوست رضیہ سے بھی کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کا کہنا ہے کہ وہ اپنے یا تمہارے بارے میں اُس وقت تک کچھ بتانے کو تیار نہیں جب تک تمہاری یادداشت لوٹ نہیں آتی۔ میں اسے زبان کھولنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ رائے سے تمہاری کیا بات چیت ہوئی تھی؟''

میں میز کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں چند لمحے اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر اُسے بتانے لگا کہ رائے نامی اُس شخص سے میری کیا گفتگو ہوئی تھی؟ میں نے یہ بھی بتایا کہ رائے نے دوبارہ آنے کے لئے کہا تھا۔ کیپٹن گوپال میری بتائی ہوئی باتیں ڈائری پر نوٹ کرتا رہا۔ میرے خاموش ہونے پر اُس نے ڈائری جیب میں ڈال لی۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ضرور.....'' گوپال سنگھ مسکرا دیا۔ ''اُس کا اصل نام بہاری لال تھا۔ عام طور پر اُسے مسٹر رائے کہا جاتا تھا۔ اُس کا کسی محکمے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُس کی جیپ کا رجسٹریشن نمبر بھی جعلی ہے۔ وہ دراصل منشیات کا اسمگلر تھا۔ اُس کی مجرمانہ سرگرمیاں خاصی وسیع تھیں۔ وہ قتل کے ایک کیس میں بھی بمبئی پولیس کو مطلوب تھا لیکن اچانک غائب ہو گیا۔ اُس کا بمبئی سے یہاں آنا اور تم سے ملنے کا مطلب ہے کہ تمہاری ہستی اُس کے لئے بہت اہم تھی۔ وہ اب مر چکا ہے اور تمہیں کچھ یاد نہیں۔ لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم اُس کے لئے اتنے اہم کیوں تھے؟''

''میں کچھ نہیں جانتا..... میں کیا بتا سکتا ہوں؟'' میرے لہجے میں بے بسی تھی۔

''پلیز..... کچھ یاد کرنے کی کوشش کرو! میں نہیں چاہتا کہ تمہاری لاش بھی مسٹر رائے کی طرح ریگستان میں پڑی ہوئی ملے۔'' کیپٹن گوپال سنگھ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں کانپ اُٹھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا بشیر کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے کیپٹن گوپال سنگھ سے جس طرح ہاتھ ملایا اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح

جانتے تھے۔

''ہیلو سنگھ..... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' بشیر نے اُسے گھورا۔

''میں تمہارے اس مہمان سے کچھ ضروری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بقول اس کے اسے کچھ یاد نہیں۔'' کیپٹن گوپال سنگھ نے جواب دیا۔

''یہ درست ہے..... اس کی یادداشت کھو چکی ہے۔'' بشیر نے کہا۔

''بہر حال..... میں پھر آؤں گا۔ اور مسٹر وحید! بہتر ہوگا کہ تم جلد سے جلد اپنی یادداشت واپس لانے کی کوشش کرو۔'' گوپال سنگھ نے کہتے ہوئے اس انداز سے میری طرف دیکھا جیسے اُسے شبہ ہو کہ میں یادداشت کھو جانے کا ڈھونگ رچا رہا ہوں۔

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سیتا کھانے کی ٹرے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ باتوں میں احساس ہی نہیں رہا تھا کہ شام ہو چکی ہے۔ کیپٹن گوپال عجیب سی نظروں سے سیتا کو دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ سیتا نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھ دی اور ہم تینوں کھانا کھانے لگے۔

کھانے کے بعد بشیر ہمیں قصبے کی سیر کو لے جانا چاہتا تھا لیکن سیتا، ڈاکٹر رادھا کی مدد کا بہانہ کر کے ہسپتال چلی گئی۔ بشیر نے اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا مجھے دے دیا اور خود باہر نکل گیا۔ ہم دونوں کا قد و قامت تقریباً ایک ہی تھا اس لئے بشیر کے کپڑے مجھے فٹ آ گئے۔ لباس بدلنے کے بعد میں بیڈ پر بیٹھ گیا اور کیپٹن گوپال سنگھ کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اُس نے بتایا تھا کہ رائے منشات کا اسمگلر ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ منشیات کے ایک اسمگلر کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ رائے میرے پاس کیوں آیا تھا؟ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں سر جھٹکتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ بشیر مسجد کے برآمدے میں میرا منتظر تھا۔ ہم دونوں جیسے ہی بانس کے پودوں کی باڑھ سے نکلے، باہر موجود ایک پولیس کانسٹیبل نے ہمیں روک لیا۔

''یہ آدمی باہر نہیں جا سکتا۔'' کانسٹیبل نے میری طرف اشارہ کیا۔

''کیوں.....؟'' بشیر کے منہ سے ہلکی سی غراہٹ نکلی۔

''کیپٹن گوپال کا حکم ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے۔ میری ڈیوٹی اس لئے یہاں لگائی گئی ہے۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔

''اسے ذرا قصبے تک جانا ہے..... اگر چاہو تو تم بھی ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔'' بشیر نے کہا۔ کانسٹیبل چند لمحے سوچتا رہا، پھر ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ اور ہم سے دو قدم آگے چلنے لگا۔

ہماری واپسی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ کانسٹیبل تو باہر ہی رُک گیا اور بشیر مسجد والے کمرے میں چلا گیا جہاں اُس نے فرش پر ہی بستر لگا لیا تھا۔ میں تنگ سا برآمدہ طے کرتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ دروازہ کھولتے ہی مجھے عجیب سا احساس ہونے لگا۔ دل میں اضطراب اور بے چینی سی تھی۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا دروازے کے قریب کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ میں

نے دیوار ٹٹول کر سوئچ آن کر دیا۔ کمرے میں روشنی ہوتے ہی میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا.....

کمرے میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ بشیر کا سوٹ کیس بستر پر کھلا پڑا تھا۔ کپڑے اور دوسری چیزیں بھی فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ میں چند لمحے متوحش نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر دروازے سے باہر آ کر بشیر کو پکارنے لگا۔

کمرے کی حالت دیکھ کر بشیر بھی چونک گیا..... صورتحال سمجھنے میں اُسے دیر نہیں لگی تھی۔ وہ اُلجھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا، گویا اس کی وجہ جاننا چاہتا ہو۔ لیکن ظاہر ہے میں کیا بتا سکتا تھا؟ میں تو خود اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا جو اپنے آپ کو بھی شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ چند لمحوں تک ہم خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر بشیر آگے بڑھ کر چیزیں سمیٹنے لگا۔ باہر اگرچہ کانسٹیبل موجود تھا لیکن اُس سے کسی قسم کی مدد لینا بیکار تھا۔

بشیر دوبارہ مسجد والے کمرے میں جا چکا تھا۔ میں سیتا کا انتظار کرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ شاید ہماری غیر موجودگی میں یہ تلاشی سیتا نے لی ہو۔ لیکن بہت دیر تک جب سیتا نہیں آئی تو میں یہ سوچتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا کہ سیتا ہسپتال میں سو گئی ہوگی۔

O

صبح ڈاکٹر رادھا نے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔ میں نے خمار آلود نگاہوں سے اطراف میں دیکھا۔ مشرقی کھڑکی سے اندر آنے والی دُھوپ کی کرنیں فرش پر مچل رہی تھیں۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر..... کیا بشیر نے تمہیں رات کے واقعہ کے بارے میں بتا دیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں..... لیکن اس وقت میں رضیہ کے بارے میں پوچھنے آئی ہوں۔ تم نے اُسے کہیں دیکھا تو نہیں؟'' ڈاکٹر رادھا کے لہجے میں پریشانی نمایاں تھی۔

''گزشتہ رات اُس نے کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا تھا، پھر ہسپتال چلی گئی تھی اور واپس نہیں آئی تھی۔ شاید وارڈ کے کسی بیڈ پر سو رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''وہ رات کو کھانا لے کر یہاں آئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اُسے نہیں دیکھا..... وہ غائب ہے۔''

''غائب سے کیا مطلب.....؟'' میں بری طرح چونک گیا۔ ڈاکٹر رادھا کے لہجے نے مجھے اور سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گزشتہ روز کیپٹن گوپال سنگھ کی پوچھ گچھ سے ڈر کر وہ کہیں بھاگ گئی ہو... لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ اس ریگستان میں کہاں جا سکتی تھی؟

''پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ہندو سادھو نے گزشتہ رات اُسے کسی آدمی کے ساتھ کیکر کے درختوں کے جھنڈ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ لباس سے وہ آدمی کوئی ہندو ہی لگتا تھا لیکن تاریکی کے باعث سادھو اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ اس کے بعد سے رضیہ کو نہیں دیکھا گیا۔'' ڈاکٹر رادھا نے بتایا۔

''تم نے مجھے رات ہی کو کیوں نہیں بتایا تھا؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''رات کو تو میں اپنے کوارٹر میں تھی۔ یہ سب کچھ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی معلوم ہوا ہے۔'' ڈاکٹر رادھا نے کہا۔

رائے کی موت کا منظر میری نظروں میں گھوم گیا۔ کہیں رضیہ بھی..... نہیں نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ رضیہ کے بارے میں ایسا نہیں سوچا جا سکتا۔ وہ یہاں جرائم پیشہ افراد کی آلہ کار نہیں ہو سکتی تھی۔ اُسے یقیناً اُن لوگوں نے اغوا کیا ہوگا جو مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔ وہ رضیہ کے ذریعے دباؤ ڈال کر اپنا مقصد پورا کرنا چاہتے ہوں گے..... میں نے سر جھٹک دیا اور ڈاکٹر رادھا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا اُسے ریگستان کی طرف تلاش کیا گیا ہے؟ میرا مطلب ہے.....'' کسی انجانے خوف سے میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں۔'' ڈاکٹر رادھا نے جواب دیا۔ ''یہاں دو تین روز سے کچھ پراسرار واقعات رونما ہونے لگے ہیں۔''

''کیا میرا ان پراسرار واقعات سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''صورتحال خاصی پیچیدہ ہے۔'' بشیر کی آواز سن کر میں دروازے کی طرف گھوم گیا۔ وہ نجانے کب سے دروازے میں کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ ''یہاں کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان پراسرار واقعات کے ذمہ دار تم ہو۔''

میں ایک بار پھر سوچ میں کھو گیا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے صرف دو دن ہوئے تھے اور اس عرصہ میں ایک آدمی پراسرار طریقے سے ہلاک ہو چکا تھا۔ اور میری اپنی دوست لاپتہ تھی۔ بدقسمتی سے وہ دونوں آخری مرتبہ مجھ سے ملے تھے۔ لوگوں کے خیال میں، میں کسی پراسرار شیطانی قوت کے زیر اثر تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ ان پراسرار واقعات کا مجھ سے کوئی تعلق ضرور ہے اور وہ مجھے قصوروار سمجھ رہے تھے۔

''ہسپتال میں ایک آدمی آیا ہے جو تم سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ اگرچہ ہندو ہے لیکن اُس کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ رام داس ملہوترہ کا شمار بمبئی کے امیر ترین آدمیوں میں ہوتا ہے۔ وہ ہسپتال کے سامنے والے میدان میں خیمہ زن ہے۔ اگر تم چاہو تو اُس سے مل سکتے ہو۔'' ڈاکٹر رادھا نے کہتے ہوئے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''اوہ..... اگر وہ میرے بارے میں جانتا ہے تو یقیناً میری مدد کر سکتا ہے۔ میں اُس سے ضرور ملوں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں کیپٹن گوپال سنگھ کی واپسی کا انتظار کر لینا چاہئے۔ وہ رضیہ کی تلاش میں ریگستان کی طرف گیا ہوا ہے۔'' بشیر نے کہا۔

''میں اُس کی موجودگی ضروری نہیں سمجھتا۔'' میں نے اُسے گھورا۔

''تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' بشیر نے کہا۔ اُس نے اپنے طور پر میری حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی تھی اور مجھے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ البتہ یہ اطمینان تو تھا کہ ان حالات میں میرا کوئی ہمدرد بھی موجود ہے۔

کچھ دیر بعد ہم گیسٹ ہاؤس سے نکل آئے اور بشیر کی جیپ میں سوار ہو کر اُس مقام کی طرف چل دیئے جہاں ڈاکٹر رادھا کے کہنے کے مطابق رام داس ملہوترہ خیمہ زن تھا۔

ہسپتال کے سامنے ایک وسیع میدان میں شاندار خیمے نصب تھے۔ اُن خیموں کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا جیسے کوئی مہاراجہ یہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہو۔ تین چھوٹے خیمے تھے اور ایک بڑا جو باہر سے بہت خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ بڑے خیمے کے قریب ہی ایک شاندار شامیانہ لگا ہوا تھا جس کے نیچے تین چار ایزی چیئرز بچھی ہوئی تھیں۔ شامیانے کے بانس پر لگی ہوئی ایک چھوٹی چرخی سے کپڑے کا بنا ہوا ایک بہت بڑا پنکھا لگا ہوا تھا۔ چرخی میں سے گزرنے والی رسّی کا دوسرا سرا ایک آدمی کے ہاتھ میں تھا جسے وہ زور زور سے آگے پیچھے کھینچ رہا تھا اور اُس کے اس عمل سے پنکھا متحرک تھا اور ہوا لگ رہی تھی۔

شامیانے کے قریب ہی ایک ٹرک اور ایک شاندار لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ ٹرک میں ایک چھوٹا سا جنریٹر بھی نصب تھا جس سے ضرورت کے وقت بجلی پیدا کی جا سکتی تھی۔ لینڈ کروزر بھی ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ کرسیوں کے قریب ہی ایک میز تھی جس کے ساتھ ہی ایک آئس باکس بھی رکھا ہوا تھا جس میں کوکا کولا کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔

درمیانی کرسی پر ایک ادھیڑ عمر آدمی پُر وقار انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی اُنگلیوں میں موٹا سا سگار دبا ہوا تھا۔ قیمتی لباس کے ساتھ ہی اُس کا بارُعب چہرہ اور آنکھوں کی چمک اُس کی شخصیت میں بڑا پراسرار تاثر پیدا کر رہی تھی۔ اُس کے قریب ہی دو آدمی مؤدبانہ انداز میں کھڑے تھے۔ وہ دونوں بھی ہندو تھے۔

ہماری جیپ شامیانے سے چند گز کے فاصلے پر رُک گئی۔ میں، ڈاکٹر رادھا اور بشیر کے ساتھ جیپ سے اُتر آیا۔ ڈاکٹر رادھا نے اُس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتا دیا تھا کہ وہی رام داس ملہوترہ ہے جو مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ اُس شخص نے اگرچہ اپنے آپ کو میرا شناسا بتایا تھا لیکن وہ میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا۔

''مجھے افسوس ہے وحید! تم جن حالات سے دوچار ہو وہ میرے لئے بھی پریشانی کا باعث ہے۔ میں اُس وقت بمبئی میں تھا۔ تمہارے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر میں نے اخبار میں پڑھی تھی۔''

''یہ حالات میرے لئے خاصے پریشان کن ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ یہاں ڈاکٹر رادھا اور مسٹر بشیر کا مجھے بہت سہارا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا میں مسٹر وحید سے تنہائی میں بات کر سکتا ہوں؟'' ملہوترہ نے باری باری ڈاکٹر رادھا اور بشیر کی طرف دیکھا۔ اُن دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کندھے اُچکاتے ہوئے وہاں سے دُور ہٹ گئے۔ رام داس ملہوترہ ایک بار پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''اگر تمہاری یادداشت برقرار ہوتی تو تم مجھے فوراً پہچان لیتے۔ میں تھوڑے عرصہ بعد جیسلمیر جاتا رہتا ہوں۔ آخری مرتبہ چند روز پہلے ہم جیسلمیر میں ملے تھے۔ اس وقت تمہاری مدد کرنا میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔ اور یہاں میری آمد کا مقصد بھی یہی ہے۔''

''جیسلمیر.....'' میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔

''میرا خیال ہے اگر تم کوشش کرو تو تمہیں سب کچھ یاد آ سکتا ہے۔'' ملہوترہ کی نظروں میں عجیب سی چبھن تھی۔

''نہیں..... مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا..... میں اپنا ماضی بھول چکا ہوں۔'' میں نے بے بسی سے جواب دیا۔

''تو گویا تم مکمل طور پر اپنی یادداشت کھو چکے ہو؟'' ملہوترہ کی نظروں میں شبے کی جھلک تھی۔

رام داس ملہوترہ کے جارحانہ تیور دیکھ کر ڈاکٹر رادھا اور بشیر قریب آ گئے۔

''ڈاکٹر رادھا کا خیال ہے کہ مسٹر وحید کو آرام اور سکون کی ضرورت ہے..... دماغ پر غیر ضروری بوجھ ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔'' بشیر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''اس اطلاع کا شکریہ.....'' ملہوترہ نے بشیر کو گھورا۔

''تیز دُھوپ اسے نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔'' اس مرتبہ ڈاکٹر رادھا نے کہا۔

''میں آپ لوگوں کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا..... اگر آپ دونوں چاہیں تو واپس جا سکتے ہیں۔ وحید دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائے گا۔ میرا خیمہ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ اسے گرمی کا احساس تک نہیں ہو گا۔'' ملہوترہ نے کہا۔

''وحید میرے زیرِ علاج ہے..... میں اسے ایسا مشورہ نہیں دُوں گی۔ اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ کیوں وحید؟'' ڈاکٹر رادھا نے میری طرف دیکھا۔

''ہاں چلو.....'' میں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ رام داس ملہوترہ اگرچہ اپنے آپ کو میرا شناسا بتا رہا تھا اور کسی ایسے شخص کی موجودگی میرے لئے اطمینان کا باعث ہو سکتی تھی۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ یہ شخص مجھے قطعی پسند نہیں آیا تھا اور یہاں کھڑے کھڑے میرا دل گھبرانے لگا تھا۔

''تو ٹھیک ہے..... میں شام کو گیسٹ ہاؤس آ جاؤں گا۔ مجھے کچھ ایسی باتیں معلوم ہیں جو تمہاری یادداشت لوٹانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔'' رام داس ملہوترہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور رخصت کرنے کے لئے جیپ تک ہمارے ساتھ آیا۔

ڈاکٹر رادھا کو ہسپتال کے سامنے اُتار کر ہم دونوں گیسٹ ہاؤس آ گئے۔ بشیر نے اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا اور میں بستر پر لیٹا موجودہ صورتحال کے بارے میں سوچتا رہا۔

بہاری لال رائے کے قتل اور پھر رضیہ کی گمشدگی نے فضا میں عجیب سی کشیدگی پیدا کر دی تھی۔ رام داس ملہوترہ کی آمد نے مجھے ایک اور اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو میرا شناسا بتا رہا تھا۔ اور چند روز پہلے جیسلمیر میں مجھ سے ملاقات کا دعویدار بھی تھا۔ مجھے یہ سب کچھ یاد نہیں تھا لیکن ملہوترہ کا رہن سہن اور ٹھاٹھ بتا رہا تھا کہ اگر وہ کروڑ پتی نہیں تو لکھ پتی ضرور ہے۔ اُس کی شان و شوکت کسی مہاراجہ سے کم نہیں تھی۔ اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اُس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہو گی..... اور اُس کی آمدنی کا ذریعہ کیا تھا؟

شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ ملہوترہ کی لینڈ کروزر گیسٹ ہاؤس کے سامنے رُکی تو میں اُس وقت بشیر کے ساتھ کمپاؤنڈ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ملہوترہ کا ڈرائیور گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ دوسرے ملازم نے نیچے اُتر کر دروازہ کھولا اور ملہوترہ لینڈ کروزر سے اُتر کر پُر وقار انداز میں چلتا ہوا ہماری طرف آنے لگا۔ ہم دونوں نے اُٹھ کر اُس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے تیسری کرسی کی طرف اشارہ کیا جو باقی دونوں کرسیوں کی طرح خاصی شکستہ تھی۔

''مسٹر بشیر! اگر تم اجازت دو تو میں تنہائی میں وحید سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' ملہوترہ نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد بشیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بشیر نے میری طرف دیکھا اور میری رضامندی پا کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ اُس کے جانے کے بعد ملہوترہ کئی لمحوں تک گہری نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا اور پھر قدرے آگے جھکتے ہوئے بولا۔

''اب تمہیں یاد آ جانا چاہئے کہ چند روز پہلے جیسلمیر میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔''

''مجھے بالکل یاد نہیں ہے۔ ماضی کی کوئی بات میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہی۔'' میں نے جواب دیا۔

''تمہیں اتنا تو یاد ہو گا کہ انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ نے ریگستان میں سم کے مقام پر تم سے ملاقات کی تھی اور تم دونوں کے درمیان ایک نہایت اہم معاملہ طے ہوا تھا۔'' ملہوترہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا گویا اُسے شبہ تھا کہ میں یادداشت کھو جانے کا ڈھونگ رچا رہا ہوں۔

''انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ..... اہم معاملہ..... میں بالکل نہیں سمجھا۔'' مجھے اُس کی باتوں سے اُلجھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

''اب مجھے کھل کر بات کرنی پڑے گی۔'' ملہوترہ نے محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔ ''تم اگر وادی ہو کشمیری مجاہد..... جو اپنے دیش کی آزادی کی جنگ لڑ

رہے تھے۔ تم نے کشمیر میں بھارتی سیناؤں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ تمہاری گرفتاری کے لئے انعامات مقرر کئے گئے لیکن تم بھارتی سیناؤں کے خلاف کامیابی سے کارروائیاں کرتے رہے اور بالآخر انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کی ایک خوبصورت ایجنٹ کو کشمیر بھیجا گیا تاکہ وہ تمہیں اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر تمہیں گرفتار کرنے میں مدد دے سکے۔ وہ تم تک پہنچ تو گئی لیکن خود تمہارے پریم میں مبتلا ہو گئی۔ سیتا اور تم نے دوسرے مجاہدین کے ساتھ مل کر جموں میں کئی اعلیٰ بھارتی فوجی افسروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اور تم دونوں پنجاب سے ہوتے ہوئے جیسلمیر پہنچ گئے اور یہاں بھی تم دونوں نے تباہی پھیلانا شروع کر دی۔ لودروا کیمپ کو تباہ کر کے تم لوگوں نے واقعی ایک اہم کارنامہ انجام دیا تھا۔ تمام انٹیلی جنس ایجنسیاں اور پولیس تمہاری تلاش میں تھی۔ لیکن انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ نے تمہیں کھوج نکالا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''بابو راؤ اپنے دیش کا کھاتا ہے مگر غدار ہے۔ اُس نے لودروا کیمپ کے بارے میں ایک مکمل فلم تیار کی تھی جس میں بھارت اسرائیل معاہدے کا عکس بھی شامل تھا۔ وہ یہ مائیکرو فلم بمبئی میں کلیان رائے جی نامی ایک شخص کو پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ یہ کام خود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے اپنے کسی آدمی پر بھی بھروسہ نہیں تھا۔ ایسے کاموں میں بڑی رازداری برتی جاتی ہے۔ تم لوگ اُس کی نظروں میں آ گئے۔ بابو راؤ نے تم سے فائدہ اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا کہ اگر تم پکڑے بھی گئے اور وہ مائیکرو فلم تم سے برآمد ہو گئی تو سارا الزام تم ہی لوگوں پر آئے گا۔ مجھے تم لوگوں پر کبھی شبہ نہ ہوتا لیکن میرے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ بابو راؤ نے وحید الدین اور رضیہ کے نام سے کاغذات بنوا کر تم لوگوں کو جیسلمیر سے نکلنے کا موقع فراہم کیا ہے اور چیک پوسٹ پر تم لوگوں کی گاڑی بھی چیک نہیں ہونے دی۔ یہ میرے آدمیوں کی حماقت تھی کہ بابو راؤ اُسی دوپہر اُن کے ہاتھوں مارا گیا اور تم لوگ بھی غائب ہو گئے۔ اور پھر میں نے اخبار میں رضیہ اور وحید الدین نامی شخص کو ریگستان میں پیش آنے والے حادثے کی خبر پڑھی تو میں سمجھ گیا کہ حادثے کا شکار ہونے والے سیتا اور شمروز کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتے۔''

''میں نہیں سمجھا کہ تم کیا کہہ رہے ہو..... آج سے پہلے نہ میں نے تمہیں کبھی دیکھا اور نہ ہی مجھے کوئی ایسی بات یاد ہے۔'' میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اور پھر دفعتہً میرے دماغ میں دھماکہ سا ہوا.....

''یاد کرنے کی کوشش کرو مسٹر شمروز!'' ملہوترہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

''اُس مائیکرو فلم میں بھارت سرکار کے اہم ترین راز ہیں۔ اگر وہ فلم پاکستان کے ہاتھ لگ گئی تو ہندسرکار کو پاکستان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔ اور بین الاقوامی برادری میں سبکی الگ ہو گئی۔ مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔ میں ہندسرکار کو کسی دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کی بجائے اپنے سامنے جھکانا چاہتا ہوں۔ اُس فلم کی بدولت ہمیں ہندسرکار سے منہ مانگی رقم مل سکتی ہے۔ اور

میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں بحفاظت سرحد کے پار پہنچا دیا جائے گا۔''

''مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا..... میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے بے بسی سے سر جھٹک دیا۔

''ویسے تمہاری یہ ذہنی کیفیت کب تک درست ہو جائے گی؟'' ملہوترہ نے مشتبہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ڈاکٹر رادھا کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے دو چار روز میں میری یادداشت لوٹ آئے یا اس میں غیر معینہ عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ.....'' ملہوترہ نے کہا۔ ''بہرحال یہ باتیں کسی سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں پھر کسی وقت تم سے ملاقات کروں گا۔ اپنے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کرو..... ہو سکتا ہے تمہیں کچھ یاد آ جائے۔'' ملہوترہ کہتے ہوئے اُٹھ گیا۔ وہ جیسے ہی کمپاؤنڈ سے باہر نکلا بشیر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کسی جگہ چھپ کر ہماری نگرانی کر رہا ہو گا۔

میں اس وقت شدید اُلجھن میں مبتلا تھا۔ دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ بشیر شاید چہرے کے تاثرات سے میری کیفیت بھانپ گیا تھا۔ وہ مجھے سہارا دے کر کمرے میں لے آیا۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میری زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ بالآخر کئی منٹ کی خاموشی کے بعد میں نے اُسے رام داس ملہوترہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا جسے سن کر بشیر بری طرح چونک گیا۔

''دہشت گردی..... مائیکرو فلم.....'' بشیر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''صورتحال خاصی پیچیدہ ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں فوراً کیپٹن گوپال کو اطلاع دینی چاہئے۔ لیکن نہیں..... اس طرح معاملہ کچھ اور بگڑ جائے گا۔''

بشیر تقریباً ایک گھنٹے تک میرے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر اُٹھ کر مسجد والے کمرے میں چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹ گیا..... میرا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ دفعتہً ایک اور خیال میرے ذہن میں اُبھرا۔ صورتحال نہ صرف پیچیدہ بلکہ ہمارے لئے نہایت سنگین ہو گئی تھی۔ اگر پولیس کو پتہ چل گیا کہ میں درحقیقت کون ہوں تو اذیت ناک موت سے مجھے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ رضیہ نے بھی کہا تھا کہ اُس کا نام سیتا اور میں شمروز ہوں اور اب رام داس ملہوترہ بھی ایک ایسی کہانی سنا رہا تھا جو نہایت خوفناک تھی۔ اگر ہم واقعی کچھ اور تھے تو انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ نے ہمارے لئے جن فرضی ناموں سے کاغذات بنوائے تھے وہ فرضی نام ہی ہمیں اب تک بچائے ہوئے تھے۔ رام داس ملہوترہ سب کچھ جانتا تھا اور ہمارے فرضی ناموں سے بھی واقف تھا۔ اسی لئے ہمارے بارے میں اخبار میں خبر پڑھ کر ہمیں تلاش کرتا ہوا یہاں آ گیا تھا۔ بابو راؤ کو اُس کے آدمی اُسی روز موت کے گھاٹ اُتار چکے تھے جب ہم جیسلمیر سے نکلے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو ملہوترہ سے پہلے یہاں پہنچ چکا ہوتا۔ صورتحال کی سنگینی کا اندازہ لگا کر میں کانپ اُٹھا۔ سیتا بھی شاید صورتحال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے غائب ہو گئی تھی اور میرے لئے بھی بچاؤ کا

ایک ہی راستہ تھا۔ فرار.....!

میں وقت گزرنے کا انتظار کرتے ہوئے یہ سوچتا رہا کہ کیا میں واقعی دہشت گرد تھا؟ کیا میرا تعلق کشمیر سے ہے؟ لیکن کشمیر کہاں ہے؟ اور وہ انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ کون تھا؟ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کسی نے مجھے کوئی مائیکرو فلم دی تھی۔ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

نصف شب کے قریب جب مجھے یقین ہو گیا کہ بستی والے سو رہے ہوں گے تو میں آہستگی سے اُٹھ کر کھڑکی کے راستے کمرے سے باہر آ گیا۔ میں مسجد کے سامنے والے رُخ سے کمرے سے باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس طرح مجھے مسجد کے برآمدے سے گزرنا پڑتا اور اس طرح بشیر کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ مزید برآں گیسٹ ہاؤس کے گیٹ پر کیپٹن گوپال سنگھ کا کانسٹیبل بھی موجود تھا۔ بشیر اور کانسٹیبل اگرچہ سو رہے تھے لیکن قدموں کی آہٹ سے کسی کی آنکھ کھل سکتی تھی۔

گیسٹ ہاؤس کی پچھلی دیوار تقریباً آٹھ فٹ اُونچی تھی۔ دیوار کی اینٹیں ٹوٹی ہوئی ہونے کی وجہ سے اس پر چڑھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں دیوار کی ٹوٹی ہوئی جگہوں پر پیر پھنسا کر آہستہ آہستہ اُوپر چڑھنے لگا۔ اُوپر پہنچ کر میں نے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ نیچے گرتے ہوئے میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور میرے دائیں ٹخنے میں ہلکا سا جھٹکا لگا۔ درد کی شدت سے میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں چند لمحوں تک ٹخنہ سہلاتا رہا اور جب درد کسی حد تک کم ہوا تو لنگڑاتا ہوا ایک طرف کو چل پڑا۔

گلی سے نکل کر قصبے کی مین روڈ پر پہنچتے ہی کتوں نے بھونک کر میرا استقبال کیا..... میں جلدی سے ایک اور گلی میں گھس گیا اور دوبارہ مین روڈ پر آنے کی بجائے گلیوں میں چلتا رہا۔

میرے سامنے کسی منزل کا نشان نہیں تھا۔ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک گلی کے آخری موڑ پر پہنچا تو ہسپتال کی عمارت دیکھ کر ٹھٹھک گیا..... اس کے سامنے ہی رام داس ملہوترہ کا کیمپ تھا۔ میں کچھ دیر گلی کے موڑ پر کھڑا کیمپ کی طرف دیکھتا رہا اور پھر واپس مُڑنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ہی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی ناچ اُٹھیں..... سر پر لگنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ میں اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا اور لہراتا ہوا نیچے گر گیا..... اس کے ساتھ ہی میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا.....!

○

جس جگہ میں ہوش میں آیا اُسے باقاعدہ کمرہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ تقریباً بارہ فٹ لمبا اور سات فٹ چوڑا پہاڑی غار تھا۔ غیر ہموار دیواریں اور جھکی ہوئی چھت میرے خیال کی تصدیق کر رہی تھیں۔ چھت اس قدر نیچی تھی کہ قدرے لمبے قد کے آدمی کا سر چھت کو چھو سکتا تھا۔ یہاں فرنیچر نام کی ایک پرانی سی کرسی پڑی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ لکڑی کی چند ٹوٹی ہوئی چیزیں بھی

بکھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے قریب پتھر کا ایک چبوترہ تھا جس پر ٹین کا بنا ہوا ایک دیا جل رہا تھا۔ دیئے میں کیراسین آئل کی بجائے شاید کسی قسم کی چربی استعمال کی جا رہی تھی۔ گاڑھے سیاہ دُھویں کے ساتھ غار میں ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میرے قریب ہی گدلے سے پانی کا ایک جگ رکھا ہوا تھا۔ میری ایک کلائی آہنی کڑے میں جکڑی ہوئی تھی جس سے منسلک زنجیر کا دوسرا سرا دیوار میں لگے ہوئے ایک ہُک میں پھنسا ہوا تھا.....

چند لمحوں تک تو میں کچھ نہ سمجھ سکا اور پھر رفتہ رفتہ صورتحال واضح ہوتی چلی گئی۔ رات کو ہسپتال کے قریب سر کی پشت پر ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کیا گیا تھا اور اب میں ایک قیدی تھا۔ لیکن میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ مجھے قید کرنے والا کون ہے؟

میں کچھ دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہا پھر اُٹھ کر اُس قید خانے کا جائزہ لینے لگا۔ میرے ہاتھ میں پڑی ہوئی زنجیر خاصی لمبی تھی۔ میں اس حد تک آگے بڑھتا رہا جس حد تک زنجیر اجازت دے رہی تھی۔ یہ غار شاید اس سے پہلے بھی قید خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ ایک طرف کپڑے کے چند چیتھڑے اور غلاظت کا ڈھیر نظر آ رہا تھا جس سے شدید تعفن اُٹھ رہا تھا۔ میں دوسری طرف گھومنا ہی چاہتا تھا کہ کونے میں کوئی چمکتی ہوئی چیز دیکھ کر رُک گیا۔ میں نے چبوترے پر رکھا ہوا چراغ اُٹھا لیا اور آگے بڑھنے لگا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... چراغ کی روشنی میں چمکنے والی وہ چیز دُھوپ کا وہ چشمہ تھا جو ڈاکٹر رادھا نے رضیہ یا سیتا کو دیا تھا۔ اُس کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور فریم درمیان سے مُڑا ہوا تھا۔ میرے لئے خوفزدہ ہونے کی بات یہ تھی کہ ٹوٹا ہوا وہ چشمہ ایک انسانی ہاتھ کی گرفت میں تھا جس کا باقی جسم دیوار کے پیچھے تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھا تو مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا..... وہ رضیہ..... سیتا تھی.....!

دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد جب آنکھیں کھولیں تو حقیقت جوں کی توں میرے سامنے موجود تھی۔ سیتا کا مُردہ جسم آڑی ترچھی حالت میں پڑا تھا..... اُس کا لباس تار تار اور جسم پر لاتعداد چھوٹے چھوٹے زخم آ رہے تھے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ مرنے سے پہلے اُس پر بے پناہ تشدد کیا گیا تھا..... میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ رضیہ یا سیتا کی موت کا ذمہ دار صرف اور صرف میں تھا.....

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور دماغ میں تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ سر پر جہاں ضرب لگائی گئی تھی وہاں درد کی شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سر پر دھماکے ہو رہے ہوں۔ پھر اچانک ہی دماغ میں روشنی کا جھماکہ ہوا۔ بجلی کا ایک کوندا سا لپکا اور میں اپنے ماضی کی طرف لوٹنے لگا.....!

میری کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ رہی تھی۔ بیتے ہوئے واقعات تاریکی سے نکل کر سامنے آنے لگے۔ خیالات اور یادوں کے اس ہجوم میں میرا دماغ دُکھنے لگا۔ میں بار بار سر کو جھٹک رہا

تھا تا کہ ذہن کا بوجھ کسی حد تک کم ہو سکے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ماضی کی ایک ایک تصویر ذہن کے پردے پر واضح ہوتی چلی گئی.....!

میرا گاؤں سوپور کم از کم تین مرتبہ درندہ صفت بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا تھا۔ میں اُس وقت کم عمر تھا لیکن ان درندوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میں نے بھی رائفل اُٹھا لی اور مجاہدین کے ایک گروپ میں شامل ہو گیا۔ اور پھر میرا نام بھارتی فوجیوں کے لئے دہشت کی علامت بن گیا..... میں ایک معرکے میں زخمی ہو کر ڈوڈا کی طرف نکل آیا جہاں سیتا نے مجھے ایک غار میں پناہ دی اور چوری چھپے میرا علاج کرایا۔ سیتا ''را'' کی ایجنٹ تھی۔ نہایت خوبصورت، حسین۔ اُسے میری گرفت کے لئے کشمیر بھیجا گیا تھا لیکن وہ میرے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ سیتا ہندو تھی لیکن اپنے کزن کے ہاتھوں اپنی عزت لٹوا بیٹھی۔ اُسے اپنے دھرم ہی سے نفرت ہو گئی تھی۔ کشمیر میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ اُسے ہندو فوجیوں سے نفرت اور کشمیری مسلمانوں سے ہمدردی ہو گئی۔

میں اور سیتا مل کر تباہی پھیلاتے رہے۔ ہم نے ہندو فوج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ جیسلمیر کے قریب دہشت گردی کے ٹریننگ کیمپ کی تباہی ہمارا آخری کارنامہ تھا۔ ہم پکڑے جانے کے خوف سے چھپتے پھر رہے تھے کہ بابو راؤ نامی ایک انٹیلی جنس آفیسر کی نظروں میں آ گئے اور اُس نے ہمیں فرار ہو جانے میں تعاون کی پیشکش کی۔ وہ اپنی گاڑی ہمارے ذریعے پوکھران بھجوانا چاہتا تھا لیکن ہمیں ریگستان میں وہ حادثہ پیش آ گیا اور میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا۔ ہمیں شمروز اور سیتا کی حیثیت سے تو شناخت نہیں کیا گیا لیکن ہمارے لئے کئی اور اُلجھنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اور پھر رام داس ملہوترہ آ گیا..... وہ مجھ سے کسی مائیکروفلم کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور میں ایسی کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

اس دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ سیتا سہمی سہمی سی رہتی تھی۔ اور پھر اُس نے مجھے بتایا بھی تھا کہ وہ میری اور اپنی اصلیت چھپانے کے لئے اپنے آپ کو سیدھی سادھی اور ڈرپوک سی لڑکی پوز کر رہی تھی۔ اور پھر یکایک وہ غائب ہو گئی..... اور اب اُس کی نچی ہوئی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ سیتا بڑی جگرے والی لڑکی تھی۔ اُس نے کٹھن اور سنگین ترین حالات کا مقابلہ کیا تھا اور اس میں کبھی لچک نہیں آئی تھی۔ لیکن وہ اس طرح خاموشی سے مر جائے گی؟ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اور پھر اُن سیکرٹ ایجنٹوں کی زندگی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ان کی سرگرمیاں بڑی خوفناک ہوتی ہیں۔ چٹکی بجاتے میں حکومتوں کے تختے اُلٹ دیتے ہیں اور خود بالآخر گمنامی کی موت مر جاتے ہیں اور سیتا بھی گمنامی کی موت مر گئی تھی۔

مجھے یاد آ گیا کہ میں سیتا کے ساتھ بابو راؤ کی کار پر پوکھران جانے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ اور پھر صحرا میں بھٹکتے ہوئے اس پہاڑی پر پہنچ گئے جہاں سے گرنے کے بعد میری یادداشت گم ہو گئی تھی۔

ہسپتال میں پہلے بہاری لال رائے نے اپنے آپ کو ڈیزرٹ آفیسر ظاہر کر کے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ کسی سوٹ کیس کی شناخت کے بہانے مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد رائے کو پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا تھا۔ پھر رام داس ملہوترہ سامنے آیا وہ اپنے آپ کو میرا اشناسا ظاہر کرتے ہوئے مجھ سے کسی مائیکروفلم کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ اور اب سیتا کی مسخ شدہ لاش میرے سامنے تھی۔ ملہوترہ ہم دونوں کی اصلیت سے آگاہ تھا۔ سیتا کو دھوکے سے اغوا کر لیا گیا تھا اور وہ لوگ تشدد کر کے اُس سے غالباً اُس مائیکروفلم کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے لیکن وہ تشدد کی تاب نہ لا سکی اور ختم ہو گئی۔ خود مجھے بھی قصبے سے اغوا کر کے اس غار میں قید کر دیا گیا تھا۔ لیکن میں اب تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ رائے کو کس نے قتل کیا تھا؟ سیتا کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتارنے والا کون تھا؟ رام داس ملہوترہ یا کوئی اور.....؟

بہاری لال رائے اور رام داس ملہوترہ کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اُن دونوں میں سے کسی کا بھی بابو راؤ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُنہیں کسی طرح علم ہو گیا تھا کہ بابو راؤ نے سرکاری رازوں پر مشتمل کوئی مائیکروفلم بنائی ہے جسے وہ بمبئی کے کلیان جی نامی کسی شخص کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ لوگ وہ فلم ہتھیانا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر رادھا نے بتایا تھا کہ مجھے اور سیتا کو ایک شتر سوار بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال چھوڑ گیا تھا۔ وہ شتر سوار کون تھا اور ہماری کار کہاں تھی.....؟ ہسپتال میں قیام کے دوران کسی نے ایک مرتبہ بھی کار کا ذکر نہیں کیا تھا۔ سیتا نے اُن لوگوں کو بتایا تھا کہ اُن کی کار خراب ہو گئی تھی اور وہ لوگ اُس پہاڑی پر آ گئے تھے جہاں اُنہیں وہ حادثہ پیش آیا تھا۔ لیکن سوال تو یہ تھا کہ کار کہاں گئی؟ جو شخص اُنہیں زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال چھوڑ گیا تھا اُس نے چٹان کے دامن میں کار ضرور دیکھی ہو گی۔ لیکن اُس نے کسی سے کار کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا.....؟

بہت دیر تک سوچنے کے بعد میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تو میں نے سر جھٹک کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔ دیئے میں شاید تیل ختم ہو رہا تھا کیونکہ روشنی کم ہو گئی تھی۔ میری کلائی پر پڑی ہوئی ہتھکڑی خاصی تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ میں اُس ہاتھ کو کم سے کم حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ تکلیف زیادہ نہ ہو۔

سیتا کی موت پر میرا دل دُکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ میں ایک ہمدرد ساتھی سے محروم ہو گیا تھا..... سناٹا میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کر رہا تھا۔ لیکن پھر دفعتہً باہر کسی جگہ دھمک سی سنائی دی۔ وہ بھاری قدموں کی آواز تھی جو لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ بالآخر دروازے کے سامنے پہنچ کر یہ آواز رُک گئی۔ اس کے ساتھ ہی ٹارچ کی تیز روشنی میرے چہرے پر پڑی..... میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ میں نے جلدی سے رُخ پھیر لیا۔

''بہت بہادر بننے کی کوشش کر رہے تھے..... مسجد کے گیسٹ ہاؤس کو بھول جاؤ اور ذرا میرے گیسٹ ہاؤس میں بھی رہ کر دیکھ لو!''

غار کے دہانے کی طرف سے اُبھرنے والی یہ آواز رام داس ملہوترہ کی تھی۔ میں نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ دروازے میں تین آدمی کھڑے تھے۔ ایک ملہوترہ، دوسرا اُس کا دیو قامت ملازم جس نے تیسرے آدمی کو پکڑ رکھا تھا۔ دیو قامت ملازم نے اُس آدمی کو زوردار دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے وسط میں آ کر گرا۔

وہ بشیر تھا جس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا..... بشیر کو اس حالت میں دیکھ کر میں لرز اُٹھا.....!

OOO

بشیر کی پیشانی سے بہتا ہوا خون اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اُس کے ساتھ مار پیٹ بھی کی گئی تھی۔ میں چند لمحے متوحش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا پھر رام داس ملہوترہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تو مجھے اغوا کرنے والے تم ہو..... لیکن بشیر کو یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

''یہ تمہارا سب سے بڑا ہمدرد ہے اور اسے یہاں لانا میرے لئے یوں بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے کہ قصبے میں اب تمہیں تلاش کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ ہندوؤں کو تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ غائب ہو جانے پر اُنہوں نے اطمینان کا سانس لیا ہو گا۔'' ملہوترہ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن سیتا نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ اس معصوم کو اس بے رحمی سے کیوں ہلاک کیا گیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''وہ تمہاری ساتھی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ تمہارے راز سے واقف ہو گی۔ اور ہم وہی راز اُس سے اگلوانا چاہتے تھے۔ وہ ''را'' کی سابق ایجنٹ تھی۔ تمہارے ساتھ مل کر اس نے بڑی تباہی پھیلائی تھی۔ بھارتی حکمران تو اس کے نام سے بھی کانپنے لگے تھے۔ لیکن وہ تو بڑی ٹھس ثابت ہوئی۔ ٹنگو کے چند ہاتھ بھی برداشت نہ کر سکی۔'' ملہوترہ نے کہا اور اپنے قریب کھڑے ہوئے لمبے تڑنگے آدمی کی طرف دیکھا جس نے بشیر کو دھکا دے کر گرایا تھا۔

''نہیں..... وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''گویا تم جانتے ہو۔'' ملہوترہ نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''مم..... میں کیسے جانتا ہوں..... مجھے کچھ یاد نہیں..... تم جانتے ہو میں اپنی یادداشت سے محروم ہو چکا ہوں۔'' میں نے چہرہ جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ میں اُس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ میری یادداشت لوٹ آئی ہے۔

''ہوں.....!'' ملہوترہ نے مجھے گھورا۔ ''میں تم سے علیحدگی میں بات کروں گا۔ کھانا تیار ہو چکا ہے اور تمہیں بھوک بھی لگ رہی ہو گی..... ہماری باقی گفتگو کھانے پر ہو گی۔''

ملہوترہ نے ٹنگو کو اشارہ کیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر بشیر کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا لیکن ہاتھ بندھے رہنے دیئے۔ پھر وہ میرے قریب آ گیا اور میری کلائی میں پڑا ہوا آہنی کڑا کھول دیا۔

''تمہیں یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی ملہوترہ.....'' بشیر نے اُسے دھمکی دی۔ ''کیپٹن گوپال کو وحید کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ اس کی گمشدگی پر وہ خاموش نہیں رہے گا۔ تم کسی طرح بچ نہیں سکو گے۔''

''میرے بچنے اور نہ بچنے کا سوال تو اُس وقت پیدا ہو گا جب مجھ پر بات آئے گی۔ قصبے کے کسی آدمی کو یہ علم نہیں ہے کہ تم لوگوں کو اغوا کرنے والا کون ہے۔'' ملہوترہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب..... کیا تم ہمیں زندگی بھر کے لئے اپنا قیدی بنائے رکھنا چاہتے ہو؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''میں یہ روگ نہیں پالوں گا..... لیکن تم لوگوں کو اس طرح غائب کر دیا جائے گا کہ دنیا میں تمہارا نام تک نہیں رہے گا۔'' ملہوترہ نے کہا۔

''کیا تم ہمیں قتل کر دو گے؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''ہاں..... اور تم لوگوں کی ہڈیاں بھی اس غار میں گل سڑ جائیں گی۔'' ملہوترہ نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

میں نے ایک نظر بدقسمت سیتا کی لاش اور زمین پر بندھے ہوئے بشیر کی طرف دیکھا اور غار کے دہانے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ملہوترہ آگے تھا۔ اُس کے پیچھے میں اور ٹنگو، جس نے میرے بازو پر گرفت جما رکھی تھی۔

مختلف سرنگوں میں چکراتے ہوئے ہم جیسے ہی غار سے باہر نکلے مارے حیرت کے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں..... جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ چاروں طرف چٹانوں میں گھرے ہوئے ایک چھوٹے سے میدان میں خیمے نصب تھے۔ دو مختلف جگہوں پر پیٹرومیکس جل رہے تھے۔ ایک طرف ملہوترہ کا باورچی کھانا تیار کرنے میں مصروف تھا۔

ہم ایک میز کے قریب پہنچ گئے جس کے گرد کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہمارے بیٹھنے کے چند منٹ بعد ملازم نے میز پر کھانا چن دیا۔ ملہوترہ نے کھانے کی طرف اشارہ کیا لیکن میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''میرے ساتھ تعاون کر کے فائدے میں رہو گے۔'' ملہوترہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''بصورت دیگر تمہاری اور بشیر کی موت بڑی اذیت ناک ثابت ہو گی۔ میرا یہ ملازم ٹنگو تشدد اور اذیت کے بیسیوں طریقے جانتا ہے۔''

''کیا تم واقعی ہمیں قتل کر دو گے؟'' میں نے متوحش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اپنے آپ کو احمق ثابت کرنے کی کوشش مت کرو شمروز!'' ملہوترہ نے کہا۔ ''تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ مجھ سے تعاون کرو۔ اور یہ بات ذہن نشین کر لو کہ یہاں نہ تو کوئی تمہاری مدد کو آئے گا اور نہ ہی تم یہاں سے فرار ہو سکتے ہو۔ اور اگر تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو

میں سچ اُگلوانا بھی جانتا ہوں۔ مجھ سے تعاون کر کے فائدے میں رہو گے۔ تم وہ مائیکروفلم میرے حوالے کر دو! اور میں تمہیں سرحد پار کرا دوں گا۔ تم پاکستان میں محفوظ رہو گے۔ یہاں کی انٹیلی جنس، آرمی یا پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔''

''لیکن..... مجھے کچھ یاد نہیں..... میں کچھ نہیں جانتا۔''

''تمہیں سب کچھ یاد آ جائے گا۔'' ملہوترہ نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ عین اُسی لمحہ خیمے کے دوسری طرف کوئی پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں نے چونک کر اُس طرف دیکھا۔ ملہوترہ کے چہرے پر ایک لمحہ کو اُلجھن کے تاثرات اُبھرے تھے۔ پھر یہ تاثرات بدل گئے۔ وہ ٹارچ اُٹھا کر اُس کی روشنی میں چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس وقت مجھے بھی پہلی مرتبہ اس جگہ کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ چٹانوں میں کسی مندر کے کھنڈرات تھے۔ کیمپ کے چاروں طرف اُونچی شکستہ دیواریں تھیں۔ کہیں کہیں کوئی ستون بھی نظر آ رہا تھا۔

''شاید کوئی جانور تھا۔'' ملہوترہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''میں تم سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک ٹھیک جواب دو گے۔''

''تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے جواب دیا۔ میں اب بھی اندھیرے میں اُس طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اور پھر ایک لمحے کے لئے میں نے دو چٹانوں کے درمیان ایک ہیولے کو معلق دیکھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ ملہوترہ کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''تو پھر مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔'' ملہوترہ نے کہتے ہوئے جیب سے سٹین لیس سٹیل کی ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکالی جس میں ایک سرنج اور ایک چھوٹی سی شیشی میں کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔

''یہ ٹروتھ سیریم ہے..... اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ہر ایک کو سچ بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے استعمال سے پہلے میں ویسے ہی تم سے سوالات کروں گا۔ اس کے بعد یہ انجکشن لگا کر وہی سوالات دُہرائے جائیں گے۔ اگر کسی بات میں تضاد پایا گیا تو پھر تمہیں ٹنگو کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور یہ جان لو کہ ٹنگو تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دے گا۔''

''تم سمجھتے کیوں نہیں.....'' میں تقریباً چیخ اُٹھا۔ ''جب میں کچھ جانتا ہی نہیں تو دواؤں کے استعمال اور تشدد کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔'' میں خاموش ہو کر ملہوترہ کے چہرے کو تکنے لگا جس پر درندگی اور بربریت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میری نظروں کے سامنے سیتا کی لاش گھوم گئی جو اُس کی بربریت کا واضح ثبوت تھی۔ لیکن میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو زبان نہیں کھولوں گا۔ اور ویسے بھی اس مائیکروفلم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا جس کے بارے میں وہ کہہ رہا تھا۔

''تمہیں شاید علم نہیں.....'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''بشیر

کیپٹن گوپال کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔ وہ مجھے تلاش کرتا ہوا اس طرف ضرور آئے گا۔''

''یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔'' ملہوترہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کیپٹن گوپال سنگھ کو اطلاع دینے کے بعد بشیر کی نیت بدل گئی ہو۔ ممکن ہے اسے بھی تمہاری اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہو اور وہ تمہیں لے کر فرار ہو گیا ہو۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بشیر نے یہ پروگرام بڑی عجلت میں بنایا تھا۔ کیونکہ اُس کی جیپ میں پانی کی ایک بوتل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کسی خاطر خواہ انتظام کے بغیر ریگستان میں نکلنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ تم لوگ بھی ریگستان میں راستہ بھٹک گئے۔ جیپ کا پٹرول ختم ہو گیا تو تم لوگ تپتے ہوئے صحرا میں گرمی اور پیاس سے مر گئے۔ دونوں کی لاشیں جیپ میں ملیں گی۔ اور ہر کوئی لالچ اور ہوس کے اس انجام پر کانپ اُٹھے گا۔''

میں کانپ کر رہ گیا۔ ملہوترہ کے شیطانی ذہن نے بڑے بھیانک منصوبے تیار کر رکھے تھے۔

''اگر میں یہ کہوں کہ میں..... کچھ جانتا ہوں تو.....؟'' میں نے رُک رُک کر کہا۔

''تم مجھے ہر وہ بات بتاؤ گے جو میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ اور میں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ٹنگو کو بھی مایوس نہیں کرنا چاہتا۔'' اُس نے دیو قامت ٹنگو کو اشارہ کیا۔

میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر سی دوڑ گئی..... میں سمجھ گیا کہ ملہوترہ مجھے کسی حالت میں بھی نہیں بخشے تھا۔ سب کچھ جان لینے کا اعتراف کر کے میں نے گویا اپنے مقدر پر خود ہی بدقسمتی کی مُہر لگا دی تھی۔ ملہوترہ سچ اُگلوانے کے لئے میرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دے گا۔

دیو قامت ٹنگو نے چمڑے کے ایک فیتے سے میری دونوں کلائیاں اس قدر مضبوطی سے باندھ دیں کہ چمڑے کا فیتہ گوشت میں پیوست ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پھر ٹنگو نے میرا سر پکڑ کر گردن کو ایک طرف موڑا۔ میری گردن کی ہڈی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی..... ٹنگو نے ایک زوردار جھٹکا دے کر میری گردن چھوڑ دی۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ میں، جس کے نام ہی سے دنیا کانپتی تھی، اس قدر آسانی سے ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور خاموشی سے تشدد برداشت کر رہا تھا۔

''میں تمہیں ایک موقع اور دے رہا ہوں.....'' ملہوترہ کی آواز سنائی دی۔ ''وہ مائیکرو فلم کہاں ہے؟''

''مجھے کچھ یاد نہیں..... میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

ملہوترہ نے ایک بار پھر ٹنگو کو اشارہ کیا۔ عین اُسی لمحے کسی طرف سے دھب کی آواز سنائی دی..... ملہوترہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور نکال لیا۔ اُس نے ٹارچ اُٹھا کر دوسرے ملازم ارجن کو اشارہ کیا اور وہ دونوں آواز کی سمت دوڑ پڑے۔

میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ آواز کیسی تھی۔ میں تو خوفزدہ سی نظروں سے ٹنگو کو دیکھ رہا تھا جو میرے اوپر جھک رہا تھا۔ اُس نے میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے زمین پر پڑا ہوا پلائر اُٹھا لیا..... میں دہشت سے کانپ اُٹھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ٹنگو پلائر سے میرے ناخن کھینچنا چاہتا ہے۔ لیکن اُسی وقت دھب کی ایک اور آواز سنائی دی..... اور اس کے ساتھ ہی کسی نے جلتا ہوا پیٹرومیکس اُٹھا کر خیمے کی طرف اُچھال دیا۔ ٹنگو میرا ہاتھ چھوڑ کر اُس طرف بھاگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اور پھر دفعتہً پشت کی طرف سے ایک سرگوشی سنائی دی۔

''شمروز..... کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟''

آواز بلاشبہ بشیر کی تھی..... میں کرسی سے اُٹھ کر آواز کی طرف دوڑا۔ اگرچہ خیمے کو آگ لگ چکی تھی لیکن اُس طرف تاریکی تھی۔ میں جیسے ہی ایک ٹوٹے ہوئے ستون کے قریب پہنچا کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے کھینچتا ہوا پہاڑی کے ایک اور غار میں داخل ہو گیا۔

وہ بشیر تھا۔ ہم دونوں اندھوں کی طرح غار میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے بالآخر ایک کھلی جگہ پر نکل آئے۔ یہ بھی مندر کے کھنڈر کا ہی ایک حصہ تھا۔ ہمارے سامنے پتھروں کی کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی مدھم روشنی میں نیچے ایک جیپ کھڑی نظر آ رہی تھی۔ میرا سانس پھول رہا تھا..... میں اپنی کیفیت پر قابو پانے کے لئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

''ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں نکلے۔ نیچے میری جیپ کھڑی ہے۔ اگر ملہوترہ ہم سے پہلے جیپ تک پہنچ گیا تو ہمارے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں گی۔'' بشیر میرا بازو پکڑ کر سیڑھیاں اترنے لگا۔

ایک جگہ ہم ایک دیوار کی آڑ میں رُک گئے۔ بشیر شیشے کے ایک ٹکڑے سے میری کلائیوں پر بندھا ہوا چمڑے کا فیتہ کاٹنے لگا۔ یہ سیتا کی ٹوٹی ہوئی عینک کا شیشہ تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ غار کے اندر بشیر نے اپنے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسّی کس طرح کاٹی ہو گی۔ اور شیشے کے ٹکڑے سے اب وہ میرے ہاتھوں پر بندھا ہوا چمڑے کا فیتہ کاٹ رہا تھا۔ سیتا مرنے کے بعد بھی میری مدد کو پہنچ گئی تھی۔

چند سیکنڈ بعد ہم دیوار کی آڑ سے نکل کر پھر نیچے اُترنے لگے۔ آخری سیڑھی سے زمین کا فاصلہ تقریباً آٹھ فٹ تھا اور وہاں سے پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر جیپ کھڑی تھی۔ بشیر سیڑھی سے نیچے کود گیا۔ میں چھلانگ لگانے کی بجائے سیڑھی کا کنارہ پکڑ کر لٹک گیا اور اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ چھوڑتا فضا دھماکے کی آواز سے لرز اُٹھی..... دائیں طرف بلندی سے آنے والی گولی میرے بالکل قریب پتھر پر لگی۔ پتھر کا ایک ٹکڑا اُڑ کر میری گردن پر لگا اور اُسی وقت میں نے بے چھلانگ لگا دی۔ بشیر مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا دیوار کے ساتھ چپک گیا۔

دائیں طرف دیوار پر کھڑا رام داس ملہوترہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس کے ساتھی مختلف سمتوں

میں کھڑے فائرنگ کر رہے تھے۔

بشیر نے چند لمحے صورتحال کا جائزہ لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ میں اُس وقت اپنے آپ کو دنیا کا سب سے احمق انسان سمجھ رہا تھا۔ ملہوترہ اور اُس کے آدمی اب جیپ پر فائرنگ کر رہے تھے۔ گولی لگنے سے جیپ کی ونڈ شیلڈ میں ایک سوراخ ہو گیا تھا اور مکڑی کے جالے کی طرح شیشے میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔

ہم کچھ دیر دیوار کے ساتھ چپکے رہے پھر تیزی سے جیپ کی طرف دوڑے..... میں جیپ کے پچھلے حصے پر چڑھ گیا اور بشیر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن سٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو مرتبہ غرانے کے بعد تیسری مرتبہ انجن سٹارٹ ہو گیا اور اُسی لمحہ ایک گولی ہڈ کو چیرتی ہوئی میرے پیر کے قریب فرش پر لگی..... جیپ کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ پوری رفتار سے دوڑنے لگی۔

میرے جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت جیپ کے فرش پر لیٹا رہا۔ فائرنگ کی آوازیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں اور جیپ تیز رفتاری سے ریگستان میں اُچھلتی ہوئی جا رہی تھی۔

''ہم کس طرف جا رہے ہیں؟'' میں نے جیپ کے فرش سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ پتہ نہیں.....'' بشیر نے جواب دیا۔ ''اس وقت تو میں ان لوگوں سے زیادہ سے زیادہ دُور نکل جانا چاہتا ہوں۔ رات کے وقت سمت کا تعین مشکل ہے۔ ویسے چندن یہاں سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم صبح ہونے پر ہی راستے کا تعین کر سکیں گے۔ اس وقت تک ہم کسی محفوظ مقام تک پہنچ جائیں گے۔''

''وہ پہاڑی کہاں پر ہے جہاں سے شتر سوار مجھے اور سیتا کو بے ہوشی کی حالت میں اُٹھا کر لایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اسی راستے میں ہے..... چندن سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر۔ وہاں سے تقریباً پانچ میل شمال میں وہ سڑک ہے جو چندن اور پوکھران کی طرف جاتی ہے۔'' بشیر نے کہا۔

''کیا اس پہاڑی میں غار وغیرہ بھی ہوں گے؟''

''راجستھان کے صحراؤں میں نظر آنے والی ہر پہاڑی میں تمہیں خوفناک غار ملیں گے۔'' بشیر نے کہا۔ ''کسی زمانے میں اس علاقے میں کالی دیوی کے ماننے والوں کی اکثریت تھی۔ تباہی و بربادی کی اس دیوی کے پجاری اُسے خوش رکھنے کے لئے انسانی جانوں کی بھینٹ دیا کرتے تھے۔ شہر کے کسی مندر میں چونکہ وہ کسی انسان کو کالی کے چرنوں پر موت کے گھاٹ نہیں اُتار سکتے تھے اس لئے اُن لوگوں نے ریگستان میں ان پہاڑیوں کے غاروں میں کالی دیوی کی قربان گاہیں بنا رکھی تھیں۔ اس طرح وہ قانون کی گرفت سے بھی آزاد رہتے تھے۔ لیکن پھر قانون کی سختی سے یہ رجحان ختم ہوتا چلا گیا۔ جس غار سے ہم فرار ہوئے ہیں وہاں بھی کسی زمانے

میں کالی دیوی کا مندر تھا اور غار کا وہ حصہ قربان گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا جہاں ہمیں قید رکھا گیا تھا۔''

کالی دیوی اور انسانوں کی قربانی کے بارے میں، میں پہلے بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ میں مزید کچھ کہنے کی بجائے صحرا کی تاریکی میں گھورنے لگا۔

تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے ہونے کے بعد جیپ کا انجن خرخرانے لگا..... اس کے ساتھ ہی رفتار کم ہوتی چلی گئی۔ بشیر گیئر بدل بدل کر انجن کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا اور بالآخر جیپ رُک گئی۔ بشیر انجن چیک کرنے کے لئے نیچے اُترا تو لڑکھڑا کر ریت پر گر گیا۔

میں جلدی سے نیچے کود گیا۔ بشیر کو اُٹھانے کے لئے جیسے ہی اُس کا ہاتھ پکڑا، میں بری طرح چونک گیا..... اُس کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ میں نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو ہاتھ چپ چپانے لگا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ جب بشیر کو غار میں لایا گیا تھا تو اُس کی پیشانی زخمی تھی اور غالباً اسی وجہ سے اُسے بخار ہو گیا تھا۔ اور بخار بھی اس قدر شدید تھا کہ اگر فوری طور پر کسی قسم کی طبی امداد نہ پہنچائی گئی تو اُس کی حالت بگڑنے کا اندیشہ تھا۔ مجھے تو حیرت تھی کہ وہ اب تک اپنے آپ پر قابو کیسے پائے ہوئے تھا؟

میں نے بڑی مشکل سے اُسے اُٹھا کر جیپ کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ جیپ میں پانی کی ایک بوتل مل گئی۔ میں نے اپنی قمیض کا دامن پھاڑا اور کپڑا بھگو بھگو کر اُس کی پیشانی پر رکھنے لگا۔ اس وقت اس کے علاوہ کچھ اور کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

رات بیتتی جا رہی تھی۔ بشیر پر غنودگی طاری تھی اور میں اس خیال سے سہما جا رہا تھا کہ اگر بشیر کو کچھ ہو گیا تو آبادی سے میلوں دُور ریگستان میں میری زندگی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر رام داس ملہوترہ اور اُس کے وحشی ساتھیوں کے ہاتھ آنے سے بچ بھی گیا تو دن میں انگاروں کی طرح تپتی ہوئی ریت مجھے موت کی نیند سلا دے گی۔

رات کے آخری پہر بشیر کو کچھ ہوش آیا لیکن وہ اپنی جگہ سے اُٹھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے اُسے لیٹے رہنے کا مشورہ دیا اور دھیان بٹانے کے لئے اُس سے باتیں کرنے لگا۔

''میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں وحید!'' بشیر نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ رام داس ملہوترہ تم سے کسی مائیکرو فلم کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے سیتا کی موت اور مجھ پر تشدد بھی تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے۔ آخر کیوں؟''

بشیر کی اس کیوں کے پیچھے بہت سے سوالات پوشیدہ تھے۔ میں فوری طور پر جواب دینے کی بجائے سوچنے لگا کہ میری وجہ سے یہاں دو قتل ہو چکے ہیں۔ بشیر بھی میری ہی وجہ سے مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اگر وہ مجھے لے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب نہ ہو پاتا تو یقیناً مجھے بھی قتل کر دیا جاتا۔ موجودہ حالات میں ہم دونوں کی زندگیوں کی اب بھی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اگر ملہوترہ ہمیں تلاش کرتا ہوا اس طرف آ نکلا تو ہم چوہوں کی طرح مارے جائیں گے۔ ملہوترہ

اور اُس کے ساتھی مسلح تھے جبکہ ہم دونوں نہتے تھے۔ اور ہماری طرف سے کسی قسم کا دفاع ممکن نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ زندگی کے اس نازک موڑ پر بشیر کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا جائے۔ بالآخر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں مدھم لہجے میں بشیر کو اس خونریزی کا پس منظر بتانے لگا۔

''وہ مائیکرو فلم کہاں ہے؟'' اُس نے میرے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''میں اُس فلم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔ اگر اعتماد نہ ہوتا تو اپنے بارے میں یہ سب کچھ بھی نہ بتاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ نے مجھے کوئی فلم نہیں دی تھی اور نہ ہی میں اس سلسلے میں کچھ جانتا ہوں۔ اُس نے ہمیں اپنی گاڑی پوکھران پہنچانے کے لئے کہا تھا۔ وہ فلم اگر اس گاڑی میں کہیں چھپائی گئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔''

''مجھے تم سے ہمدردی ہے شمروز.....'' بالآخر اُس نے کہا۔ ''اگر کسی ہندو کو تمہاری اصلیت کا پتہ چل گیا تو تم ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکو گے۔ اگر تم دوبارہ ملہوترہ کے ہاتھ لگ گئے تو وہ بھی تمہیں اس وقت تک زندہ رکھے گا جب تک تم سے اس مائیکرو فلم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر لیتا۔''

''اور میں مائیکرو فلم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''اور جب اُسے یقین ہو جائے گا کہ تم واقعی اُس فلم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو اس صورت میں بھی وہ تمہیں موت کے گھاٹ اُتارنے میں دیر نہیں لگائے گا۔'' بشیر نے کہا۔

کچھ دیر بعد موضوع بدل گیا اور ہم باتوں میں اس قدر مگن رہے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

دن کا ہلکا سا اُجالا پھیل رہا تھا۔ بشیر نے جیپ کا بونٹ اُٹھایا اور انجن چیک کرنے لگا۔ بیٹری کا تار لوز ہو گیا تھا۔ اُسے درست کرتے ہی انجن سٹارٹ ہو گیا۔ بشیر کی حالت اگرچہ زیادہ بہتر نہیں تھی لیکن اُس نے جیپ کو تیز رفتاری سے دوڑا دیا۔ بخار کے باعث اسٹیئرنگ پر اُس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

مشرقی اُفق پر سرخی پھیل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد سورج طلوع ہو گیا۔ سورج کا گولا منظر عام پر آتے ہی آسمان سے آگ برسنے لگی۔ ریت تپنے لگی..... رات کے وقت ہوا کے جو جھونکے خوشگوار محسوس ہو رہے تھے اب لو کے تھپیڑے بن کر جسم کو جھلسائے دے رہے تھے۔ ہم صحیح سمت میں جا رہے تھے۔ بشیر کے خیال میں چندن زیادہ سے زیادہ بیس میل دُور تھا۔ جیپ کی ٹینکی میں اتنا پٹرول موجود تھا کہ اگر راستہ بھٹکے بغیر چلتے رہے تو آسانی سے وہاں پہنچ سکتے تھے۔ لیکن صحرا میں بھٹکنے کا خیال ہی رُوح فرسا تھا۔

گرمی کی شدت سے دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ بوتل

میں صرف چند گھونٹ پانی رہ گیا تھا اور ہم دونوں میں سے کوئی بھی اُسے استعمال نہیں کر رہا تھا۔ پانی کے یہ چند گھونٹ ہم نے کسی انتہائی نازک وقت کے لئے محفوظ کر رکھے تھے۔

بشیر کی حالت پھر بگڑنے لگی..... میں نے اُسے ایک گھونٹ پینے کا مشورہ دیا مگر اُس نے انکار کر دیا۔ اسٹیئرنگ اُس کے قابو میں نہیں تھا لیکن وہ اسٹیئرنگ سے ہٹنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ سامنے بہت دُور ایک پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ میرے خیال میں اُس کا فاصلہ تین چار میل سے کم نہیں تھا۔ جیپ کا رُخ اُسی پہاڑی کی طرف تھا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال اُبھرا کہ یہ وہی پہاڑی تو نہیں جہاں مجھے اور سیتا کو حادثہ پیش آیا تھا؟ ہم اب تک تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور بشیر کے کہنے کے مطابق وہ پہاڑی چندن سے آدھے راستے میں تھی۔ اس حساب سے یہ وہی پہاڑی ہونی چاہئے تھی۔

''کیا یہ وہی پہاڑی ہے جہاں ہمیں حادثہ پیش آیا تھا؟'' میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

''ہاں..... اور اس طرف تقریباً پانچ میل دُور پوکھران کی طرف جانے والی سڑک ہے۔'' بشیر نے ایک طرف اشارہ کیا۔ پھر چونکتے ہوئے بولا۔ ''اوہ..... وہ دیکھو! وہ کیا ہے؟''

میں نے بھی چونک کر اُس طرف دیکھا۔ وہ ایک سیاہ نقطہ تھا جو لمحہ بہ لمحہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کوئی جیپ تھی جو بڑی تیزی سے فاصلہ سمیٹ رہی تھی۔ اُس جیپ کو دیکھ کر میرا دل لرز اُٹھا..... مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ رام داس ملہوترہ ہم سے پہلے یہاں پہنچ گیا تھا اور اب بڑی تیزی سے ہماری طرف آ رہا تھا..... ہم ایک بار پھر وہیں پہنچ گئے تھے جہاں سے چلے تھے۔ بشیر نے اُس جیپ کو اپنی طرف آتے دیکھنے کے باوجود اپنی جیپ کی رفتار کم نہیں کی تھی۔

''بشیر! اُدھر دیکھو..... بائیں طرف۔'' میں نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ اُس طرف سے بھی ایک جیپ تیز رفتاری سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ ''شاید وہ ہمیں دونوں طرف سے گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ ملہوترہ کے ساتھی نہیں.....'' بشیر نے جواب دیا۔ ''پولیس جیپ ہے۔ جیپ پر پولیس کا بیج بھی نظر آ رہا ہے۔ شاید کیپٹن گوپال سنگھ ہماری تلاش میں اس طرف آ نکلا ہے۔''

غور سے دیکھنے پر مجھے بھی دوسری جیپ پر ایک چھوٹا سا جھنڈا لہراتا ہوا نظر آ گیا..... اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ ہم ملہوترہ کے شکنجے میں آنے سے بچ جائیں گے۔

بشیر نے جیپ کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ ہماری جیپ دوسری دونوں جیپوں کے درمیانی رخ پر بڑھ رہی تھی۔ ان دونوں جیپوں کی رفتار میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ فاصلے لمحہ بہ لمحہ سمٹنے لگے.....

اب دونوں طرف کی جیپیں اتنا قریب آ چکی تھیں کہ ان میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ دائیں طرف سے آنے والی جیپ میں ملہوترہ اور اُس کے ساتھی تھے اور بائیں طرف سے آنے والی جیپ میں کیپٹن گوپال سنگھ اور تین کانسٹیبل نظر آ رہے تھے۔ بشیر شاید ان دونوں

جیپوں کے درمیان سے اپنی جیپ نکال لے جانا چاہتا تھا۔ اُس کی نظریں ملہوترہ والی جیپ پر تھیں۔ شاید وہ فاصلے کا تعین کر کے فائرنگ رینج سے دُور رہنا چاہتا تھا۔ میری نظریں اچانک ہی سامنے ایک گہرے کھڈ کی طرف اُٹھ گئیں۔ ہماری جیپ تیزی سے اُس کھڈ کی طرف بڑھ رہی تھی..... میں نے چیخ کر بشیر کو اُس طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی..... جیپ کے پہیوں نے زمین چھوڑ دی..... چند لمحے ہوا میں تیرتی رہی پھر قلابازی کھاتی ہوئی ایک زوردار دھماکے سے کھڈ کی تہہ میں گر گئی.....

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے جیپ کے کھڈ تک پہنچنے سے پہلے ہی جیپ سے چھلانگ لگا دی تھی۔ میں لڑھکتا ہوا ایک چھوٹے کھڈ میں گر گیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ تاریکی میں ڈوبتے ذہن کے ساتھ فائرنگ کی آوازیں بھی میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے کان پھاڑ دینے والا ایک آخری زوردار دھماکہ سنا اور اس کے بعد کچھ معلوم نہیں ہو سکا..... میرا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب گیا تھا.....!

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا تھا۔ لیکن گرمی کی شدت سے دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک عجیب سی بو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگتا ہوا کھڈ سے باہر آ گیا۔ سامنے کا منظر دیکھتے ہی میں لرز اُٹھا.....

کیپٹن گوپال کی جیپ کے پرخچے اُڑ چکے تھے۔ اُس کے ٹائروں اور بعض حصوں سے اب بھی دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جیپ پر دستی بم یا ایسا ہی کوئی آتش گیر مادہ پھینکا گیا تھا۔ کیپٹن گوپال سنگھ اور اُس کے کانسٹیبلوں کی جھلسی ہوئی لاشیں جیپ کے قریب ہی بکھری ہوئی تھیں۔

میں نے دوسری جیپ کی طرف دیکھا۔ ملہوترہ کے دونوں ساتھیوں ٹنگو اور ارجن کی لاشیں ریت پر پڑی ہوئی تھیں۔ وہ یقیناً پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہوئے تھے۔ لیکن ملہوترہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں آگے بڑھ کر جیپ کے دوسری طرف چلا گیا اور پھر دوسرے ہی لمحہ مجھے ٹھٹھک جانا پڑا..... ملہوترہ جیپ کے دوسری طرف ریت پر پڑا ہوا تھا۔ اُس کے سینے میں گولیوں کے تین نشان تھے۔ خون سے اُس کا لباس تر ہو رہا تھا۔ ہاتھوں اور چہرے پر بھی خون کے دھبے نظر آ رہے تھے جس سے اُس کا چہرہ کچھ اور بھی بھیانک ہو گیا تھا۔ لیکن..... وہ ابھی زندہ تھا۔ آہٹ پا کر اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند لمحے حقارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اُس کا دایاں ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے ملہوترہ کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ لیا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر ملہوترہ کے ہاتھ پر ٹھوکر مار دی..... ریوالور اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گرا۔ میں نے جھپٹ کر ریوالور اُٹھا لیا اور اُس کا رُخ ملہوترہ کے سر کی طرف کر کے ٹرائیگر دبا دیا..... ایک دھماکہ ہوا اور گولی ملہوترہ کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ میں نے ریوالور اُس کی لاش کے قریب پھینک دیا۔ چند لمحے اُس کی

طرف دیکھتا رہا اور پھر پہاڑی کی طرف چلنے لگا۔

پہاڑی میں غار تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ غار میں ایک خوفناک منظر میرا منتظر تھا..... میری کار تو موجود تھی لیکن اُس کے قریب ہی زمین پر ایک آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی جس کے جسم کی رنگت بالکل سیاہ تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہی شخص تھا جس نے مجھے اور سیتا کو ہسپتال پہنچایا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم دونوں کو ہسپتال لے جانے سے پہلے اُس نے کار غار میں لا کر کھڑی کی ہو گی اور ہمیں ہسپتال پہنچانے کے بعد اُس کی نیت بدل گئی ہو گی۔ اُس نے کار میں رکھے ہوئے سوٹ کیس میں سونے کی مورتیاں اور زیورات دیکھ لئے ہوں گے اور یہ سب کچھ چرانے کی نیت سے آیا ہو گا لیکن کسی زہریلے سانپ نے اُسے ڈس لیا۔ اس علاقے میں ایسے زہریلے سانپوں کی کمی نہیں تھی جن کے کاٹنے سے فوراً ہی موت واقع ہو جاتی ہے اور جسم سیاہ پڑ جاتا ہے۔

میں لاش سے نظریں ہٹا کر کار کی طرف متوجہ ہو گیا جو ریت میں اٹی ہوئی تھی۔ میں کار کا دروازہ کھول کر کچھ دیر باہر کھڑا رہا، پھر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن سٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ کچھ ہی دیر میں انجن سٹارٹ ہو گیا۔ میں ریورس گیئر میں کار کو غار سے باہر نکال لایا اور بشیر کے بتائے ہوئے راستے کی طرف موڑ دیا۔

تقریباً پینتیس منٹ بعد میں سڑک پر پہنچ گیا..... یہ وہی سڑک تھی جہاں سے سیتا کے ساتھ میں نے کار چٹان کی طرف موڑی تھی۔ یہ سڑک ایک طرف چندن سے ہوتی ہوئی پوکھران کی طرف چلی گئی تھی اور دوسری طرف جیسلمیر کی طرف جہاں سے ہم آئے تھے۔ میں نے کار جیسلمیر کی طرف موڑ دی۔

سڑک پر چند میل کا فاصلہ طے کر کے میں نے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے کی طرف دیکھا تو چونک سا گیا..... آئینے میں پچھلی سیٹ پر پڑی ہوئی سیتا کی ساڑھی کا عکس نظر آ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اُس روز جب پہاڑی کے قریب ہم کار سے اُترے تھے تو سیتا اسی کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور گرمی کی شدت سے گھبرا کر اُس نے ساڑھی اُتار کر اس سیٹ پر ڈال دی تھی۔ اور جب ہم چٹان سے گرے تھے تو سیتا کے جسم پر صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ تھا۔ ہسپتال میں ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹر رادھا نے اپنی ایک ساڑھی سیتا کو دے دی تھی جسے وہ آخری وقت تک پہنے رہی تھی۔ میرے خیال میں سیتا کی اُس ساڑھی کو پسنجر سیٹ پر ہونا چاہئے تھا لیکن وہ پچھلی سیٹ پر پڑی ہوئی تھی۔ ممکن ہے اُس شتر سوار نے کار کے سامان کی تلاشی لیتے ہوئے یہ ساڑھی اُٹھا کر پچھلی سیٹ پر پھینک دی ہو۔

سیتا مر چکی تھی۔ اُس کی کسی چیز کا کار میں موجود ہونا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کار کو سڑک سے بہت دُور ہٹا کر روک لیا اور پچھلی سیٹ پر آ گیا۔ ساڑھی کے علاوہ سیتا کا ہینڈ بیگ بھی پچھلی سیٹ پر موجود تھا۔ سیتا کے دو تین اور کپڑے اور کچھ

دوسری چیزیں بھی سوٹ کیس میں موجود تھیں۔ میں نے تمام کپڑے، ہینڈ بیگ اور سیتا سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو سیتا کی ساڑھی میں لپیٹ کر ایک گٹھڑی سی بنائی اور کار سے اُتر آیا۔ کار سے چند گز دُور ریت میں گڑھا کھود کر گٹھڑی کو دفن کر دیا اور ہاتھ جھاڑتا ہوا دوبارہ کار میں آ گیا۔

سوٹ کیس میں سونے کی مورتیاں اور زیورات جوں کے توں موجود تھے۔ میں نے اُن پر اپنے کپڑے ڈال دیئے اور سوٹ کیس بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ میرا رُخ اگرچہ جیسلمیر کی طرف تھا مگر میں جیسلمیر نہیں جانا چاہتا تھا۔ جیسلمیر سے چند میل پہلے ایک کچی سڑک دیوی کوٹ نامی قصبے کی طرف مُڑ گئی تھی۔ یہی سڑک آگے جا کر جیسلمیر سے باڑمیر کی طرف جانے والی پختہ سڑک سے مل جاتی تھی۔ میں نے کار دیوی کوٹ کی طرف جانے والی کچی سڑک پر موڑ دی۔

تین بجے کے لگ بھگ میں دیوی کوٹ پہنچ گیا۔ یہاں زیادہ دیر رُکنا مناسب نہیں تھا۔ چندن کے لوگوں کو صحرا میں پولیس اور رام داس ملہوترہ کے درمیان خونی تصادم کا پتہ چل گیا ہوگا اور کھڈ سے بشیر کی لاش بھی مل گئی ہوگی۔ اور عین ممکن ہے یہ خبر اب تک دیوی کوٹ جیسے چھوٹے قصبے میں بھی پہنچ گئی ہو اور پولیس کو کسی مشتبہ شخص کی تلاش ہو کیونکہ قصبے والوں کے خیال میں رضیہ اور وحید الدین کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ پولیس کو یقیناً اُن کی بھی تلاش ہوگی اس لئے زیادہ دیر یہاں رُکنا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھایا اور جب باہر نکلا تو ایک بھکاری لڑکا کار صاف کر رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ گاڑی کی صفائی کا خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا اور یہ مسئلہ اُس بھکاری لڑکے نے حل کر دیا تھا۔ میں ریسٹورنٹ کے دروازے میں کھڑا لڑکے کی طرف دیکھتا رہا۔ اور جب کار اچھی طرح صاف ہو گئی تو میں نے لڑکے کے قریب آ کر پانچ روپے کا ایک سکہ بھکاری لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا اور کار میں بیٹھ گیا۔ ایک پٹرول پمپ سے ٹینکی فل کرانے کے بعد میں باڑمیر کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں سورج غروب ہونے کے بعد ہی باڑمیر پہنچا تھا۔ یہ اگرچہ بڑا قصبہ تھا مگر زمیندار ورجندر ناتھ کا مکان تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔ راجندر ناتھ کی کھیتی باڑی بھی تھی اور بازار میں آڑھت کی دُکان بھی تھی جہاں عام طور پر اُس کے منشی وغیرہ بیٹھا کرتے تھے۔ یہ مرچوں کا سیزن تھا۔ ان دنوں یہ کاروبار عروج پر تھا۔ ہندوستان بھر سے مرچوں کے بیوپاری اس سیزن میں باڑمیر اور ان قصبوں میں آیا کرتے تھے جو مرچوں کی پیداوار کے لئے شہرت رکھتے تھے۔ مجھے بھی مرچوں کا بیوپاری ہی سمجھا گیا تھا۔ اتفاق سے میں نے جس شخص سے راجندر ناتھ کے بارے میں دریافت کیا تھا وہ بھی مرچوں کا آڑھتی تھا۔ اُس نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی کہ وہ مجھے راجندر ناتھ سے سستا اور بہترین مال دے سکتا ہے لیکن بالآخر اُس نے مجھے راجندر ناتھ کی دُکان کا پتہ بتا دیا۔

راجندر ناتھ تھوڑی دیر پہلے ہی دُکان سے گھر جا چکا تھا۔ میں نے منشی کو بتایا کہ میں راجندر ناتھ کا رشتے دار ہوں اور جودھ پور سے آیا ہوں تو اُس نے ایک ملازم کو میرے ساتھ کر دیا۔

ملازم میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور راستہ بتاتا رہا۔ بالآخر قصبے کے تقریباً آخر میں ایک حویلی نما مکان کے پھاٹک کے سامنے اُس نے گاڑی رُکوائی اور نیچے اُتر کر پھاٹک کے ذیلی دروازے میں داخل ہو گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ ایک آدمی کے ساتھ باہر آیا۔ وہ آدمی دراز قامت اور بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں نے اُس کے چہرے کا خاصا رعب بنا رکھا تھا۔ اُس نے دھوتی اور کرتہ پہن رکھا تھا اور وہ واقعی زمیندار لگتا تھا۔

میں نے ہندوانہ انداز میں اُسے پرنام کیا اور اُسے ذرا الگ لے جا کر کہا۔ ''میں سیتا کا دوست مہابیر سنگھ ہوں۔ کچھ مہمان آپ کے پاس پہلے بھی آ چکے ہیں اور.....''

''سیتا کہاں ہے.....؟'' وہ میری بات کاٹ کر کار کی طرف دیکھنے لگا۔

''وہ جیسلمیر میں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''چند روز بعد آئے گی۔ ویسے وہ خیریت سے ہے اور.....''

''کار کو اندر لے چلو! آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔'' اُس نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی اور ملازم کو پھاٹک کھولنے کا اشارہ کیا۔

میں کار کو پھاٹک کے اندر لے آیا۔ بہت بڑی حویلی تھی۔ بہت وسیع و عریض کمپاؤنڈ تھا۔ سامنے حویلی کی عمارت تھی۔ دائیں طرف درختوں کے نیچے ایک ٹریکٹر اور ایک کار کھڑی تھی۔ میں نے اپنی کار بھی ان کے پیچھے کھڑی کر دی۔

راجندر ناتھ مجھے حویلی کے ایک کمرے میں لے آیا اور سیتا کے بارے میں مختلف سوالات کرنے لگا۔ باتوں کے دوران ایک موقع پر اُس نے مجھے شمروز کے نام سے مخاطب کیا تو میں اُچھل پڑا.....

''میں سب کچھ جانتا ہوں.....'' اُس نے کہا۔ ''بھارت سرکار نے اگر ہمارے خاندان کے ساتھ زیادتیاں نہ کی ہوتیں تو ہمیں سیتا کی اس حرکت پر افسوس ہوتا۔ لیکن اپنے ساتھ سرکار کی زیادتیوں کو دیکھتے ہوئے ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ سیتا نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک کیا، اور جو کچھ بھی کر رہی ہے ٹھیک کر رہی ہے۔ ہمیں کوئی افسوس نہیں۔''

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اُس کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

''سیتا کو تو تمہارے ساتھ آنا تھا..... وہ کیوں نہیں آئی؟'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''کسی وجہ سے اُسے جیسلمیر میں رُکنا پڑ گیا ہے۔ وہ تین چار روز مزید وہاں رہے گی۔ اس

کے بعد شاید وہ جے پور بھی جائے گی۔'' میں نے اُٹھ کر سوٹ کیس کھولا اور سونے کی دو مورتیاں نکال کر اُسے پیش کر دیں۔ ''یہ تحفے آپ کے لئے سیتا نے بھیجے ہیں۔''

''سونے کی ہیں.....؟'' وہ مورتیوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی تھی۔

''جی ہاں..... خالص سونے کی۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر اُن مورتیوں کی تعریفیں کرتا رہا پھر اُٹھ کر اندرونی دروازے میں غائب ہو گیا۔ اُس کی واپسی تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ راجیو، شوبھا اور کلپنا کے علاوہ راجندر ناتھ کی پتنی رجنی اور جوان بیٹی شانتی بھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر تو راجیو اور شوبھا کو بھی خوشی ہوئی تھی لیکن کلپنا کی خوشی قابل دید تھی۔

''سیتا دیوی کہاں ہے؟'' یہ سوال راجیو نے کیا تھا۔

''وہ چند روز بعد آئے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ لوگ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر ایک ملازمہ نے آ کر رجنی کے کان میں سرگوشی کی تو وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''بھوجن تیار ہے..... تم بھی منہ ہاتھ دھولو بیٹا! اور سب لوگ وہیں آ جاؤ۔''

اس کے تقریباً بیس منٹ بعد ہم سب کھانے کے کمرے میں جمع تھے۔ فرش پر پلاسٹک میٹ بچھا ہوا تھا جس پر دستر خوان بچھا کر کھانا چن دیا گیا تھا۔ پیتل کی تھالیوں میں پیتل کی کٹوریاں تھیں جن میں مختلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے اُس وقت واقعی بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں بے تکلفی سے اُن لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔

○

میں نے راجیو کو سیتا کی المناک موت کے بارے میں بتا دیا لیکن کسی اور کو اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔

دو دن میں، میں نے راجندر ناتھ کے بارے میں اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس علاقے کا ایک بڑا زمیندار تھا۔ پاکستان کی سرحد یہاں سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ وہ اسمگلر نہیں تھا لیکن اسمگلروں سے اُس کے تعلقات ضرور تھے۔ اور میں نے اُس کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ہمیں سرحد پار کروا سکتا ہے۔

اور پھر تیسرے روز میں نے راجندر ناتھ سے یہ بات کہہ دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سونے کی ایک اور مورتی اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔

''یہ تحفہ میری طرف سے۔''

راجندر ناتھ کی آنکھوں میں ایک بار پھر چمک اُبھر آئی لیکن مجھے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی۔ مزید ایک دن گزارنے کے بعد راجیو شوبھا کو لے کر جودھ پور روانہ ہو گیا جہاں اُس کے

کچھ رشتہ دار قیام پذیر تھے۔ میں نے سونے کی دو مورتیاں اُسے بھی تھما دی تھیں کہ انہیں بیچ کر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر لے۔ کلپنا میرے ساتھ جانے پر بضد تھی۔ اُس کے ماں باپ ختم ہو چکے تھے۔ بھارت میں اُس کا کوئی قریبی عزیز بھی موجود نہیں تھا۔ اُس نے اپنی قسمت کو میرے ساتھ ہی وابستہ کر لیا تھا۔

راجیو اور شوبھا کے جودھ پور جانے کے اگلے روز میں اور کلپنا راجندر ناتھ کے ساتھ اُس کی پرانی سی گاڑی میں گھورا، شیتل ورنا اور سانچور سے ہوتے ہوئے سوئی گام پہنچ گئے۔ بابو راؤ والی گاڑی میں نے راجندر ناتھ کی حویلی میں ہی چھوڑ دی تھی اور میں نے اُسے گاڑی کے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ بعد میں کسی وقت اُس کے لئے مصیبت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

''اس کی تم چنتا ہی مت کرو.....'' راجندر ناتھ نے کہا۔ ''چار دن بعد مالک بھی دیکھے گا تو اپنی کار کو پہچان نہیں سکے گا۔''

سوئی گام میں ہم نے رام نواس نامی ایک پنڈت کے گھر میں قیام کیا۔ ایک دن ہمیں وہاں بھی رہنا پڑا۔ یہاں بھی سونے کے چند زیور اور سونے کی ایک مورتی پنڈت کی نذر کرنی پڑی تھی۔ اگلے روز دوپہر کے بعد ہمیں کہہ دیا گیا کہ ہم تیار رہیں۔ رات کو کسی بھی وقت ہماری روانگی ہو سکتی ہے۔

سرحد سوئی گام سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ سرحد سے دوسری طرف رن کچھ کا علاقہ تھا۔ اس پورے خطے میں کہیں دلدلیں تھیں، کہیں پہاڑیاں اور کہیں ببول اور کیکر کے چھدرے جنگل پھیلے ہوئے تھے..... نگر پارکر نام کا قصبہ بھی سرحد کے دوسری طرف چند میل سے زیادہ نہیں تھا۔

کلپنا ایک عجیب سی سنسنی محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو میرے ساتھ جوڑ لیا تھا۔ اپنوں کو چھوڑ کر اُس نے مجھے اپنا مان لیا تھا اور اب اپنا دیس بھی چھوڑ رہی تھی۔

سورج ڈھلنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم ایک کھٹارہ سی جیپ پر سوئی گام سے روانہ ہو گئے۔ ہمارے ساتھ راجندر ناتھ کے علاوہ صرف ایک آدمی تھا جو ڈرائیو کر رہا تھا۔

سوئی گام سے سرحد کے دوسری طرف نگر پارکر تک ایک نیم پختہ سڑک چلی گئی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک اُس سڑک پر سفر کرنے کے بعد جیپ ریگستان کی طرف مُڑ گئی اور مزید ڈیڑھ گھنٹوں بعد ٹیلوں کے قریب رُک گئی۔ وہاں ٹیلوں کی آڑ میں پانچ اُونٹ تھے۔ ہر اُونٹ کے ساتھ دو آدمی تھے اور وہ سب کے سب مسلح تھے۔

رات دو بجے کے قریب ایک اور شتر سوار وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے کالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ آتے ہی سندھی زبان میں چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگا۔

''چلو جلدی کرو..... اُونٹوں پر بیٹھو!'' شتر بانوں میں سے ایک نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔

تمام اُونٹوں پر اگرچہ سامان لدا ہوا تھا لیکن ایک اُونٹ پر مجھے اور دوسرے پر کلپنا کو بٹھا دیا گیا۔ اور پھر اُونٹ جس طرح کھڑے ہوئے تھے میں بمشکل اپنے آپ کو سنبھال سکا تھا۔ دوسرے اُونٹ پر بیٹھی ہوئی کلپنا کے منہ سے تو ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

راجندر ناتھ اور جیپ کا ڈرائیور وہیں رہ گئے تھے۔ شتر بان اُونٹوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔ یہ اُونٹ کی سواری کا میرا پہلا تجربہ تھا۔ یہ بے کل جانور جس طرح جھٹکے دے رہا تھا اس سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل کر رہ گیا۔ کلپنا بھی خوف سے چیخ رہی تھی اور میں چیخ چیخ کر اُسے بتا رہا تھا کہ وہ کجاوے کو مضبوطی سے پکڑے رکھے۔ مجھے ان شتر بانوں پر حیرت ہو رہی تھی جو اُونٹوں کی رسیاں پکڑے اُن سے بھی آگے دوڑ رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد اُن کی رفتار کم ہوگئی۔ اب اُونٹ معمول کی چال چل رہے تھے لیکن ہمیں جھٹکے بدستور لگ رہے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ مزید سفر کرنے کے بعد ایک بستی کے آثار دکھائی دینے لگے۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ بستی سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُونٹ بستی میں داخل ہو کر ایک حویلی کے پھاٹک میں داخل ہوگئے۔ احاطے میں اُونٹوں کو جس طرح بٹھایا گیا تھا، میں منہ کے بل گرتے گرتے بچا تھا۔

مجھے اور کلپنا کو عمارت کے اُوپر والے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں صرف ایک جھلنگا سی کھاٹ بچھی ہوئی تھی۔

''اب تم لوگ ادھر آرام کرو سائیں! صبح وڈیرہ تم سے بات کرے گا۔'' ہمارے ساتھ آنے والے شخص نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے میں اس چارپائی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس چارپائی پر بھی صرف ایک رلّی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے باڑمیر سے روانہ ہونے سے پہلے یہ عقلمندی کی تھی کہ سوٹ کیس کا سامان ایک تھیلے میں ڈال لیا تھا۔ اُس میں زیور بھی تھے اور کپڑے بھی۔ اور وہ تھیلا میں نے گلے میں لٹکا رکھا تھا۔

میں نے دروازے کو اندر سے کنڈا لگا دیا اور رلّی اُٹھا کر فرش پر بچھا دی۔

''تم چارپائی پر لیٹ جاؤ! میں یہاں لیٹ جاتا ہوں۔'' میں نے کلپنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور تھیلا کندھے سے اُتار کر تکیے کی طرح رکھ لیا۔ کمرے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا جسے بجھانا میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

رات بھر جاگنے اور اس سفر نے بری طرح تھکا دیا تھا۔ کلپنا چارپائی پر لیٹ گئی اور میں نے بھی رلّی پر دراز ہوتے ہی آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کتنی دیر سویا ہوں گا اور پھر دروازے پر دستک کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی..... آنکھ کھلتے ہی میں اس لئے بھی چونک گیا کہ کلپنا میرے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کا

ایک ہاتھ میرے سینے پر تھا۔

دستک کی آواز دوبارہ اُبھری۔ میں نے کلپنا کا ہاتھ آہستگی سے اپنے اُوپر سے ہٹایا اور اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر وہی آدمی کھڑا تھا جو ہمیں اس کمرے میں چھوڑ کر گیا تھا۔

''سائیں! تم لوگ ناشتہ کر لو..... پھر وڈیرہ تم سے بات کرے گا۔'' اُس نے کہا۔

''منہ ہاتھ دھونے کی جگہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اُدھر غسل خانہ ہے.....'' اُس نے باہر ایک طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے..... ہم تھوڑی دیر میں تیار ہو جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور کلپنا کو جگا دیا۔

ایک گھنٹے بعد ہم اُس شخص کے سامنے موجود تھے جسے وڈیرہ کہا گیا تھا۔ وہ لمبے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی تھا۔ ٹوتھ برش ٹائپ کی بھاری مونچھیں، سفید اُجلے کپڑے، کندھے پر پھیلی ہوئی اجرک اور پیروں میں تلے کے کھسے۔ اُس نے سرسری انداز میں میری طرف دیکھا اور پھر کلپنا پر نظریں جما دیں۔ میں نے کھانس کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''تم لوگ کہاں جانا چاہتے ہو سائیں؟'' اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کراچی۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''اگر تم لوگ بس پر سفر کرو گے تو پولیس جگہ جگہ تنگ کرے گی۔ اور پھر تمہارے ساتھ یہ چھوکری بھی تو ہے نا۔'' اُس نے کہتے ہوئے کلپنا کی طرف دیکھا۔ ''میں ایک گھنٹے بعد کراچی جا رہا ہوں..... تم لوگ چاہو تو میرے ساتھ چلے چلو۔''

''بہتر ہے جی۔ لیکن.....'' میں کہتے کہتے رُک گیا۔

''لیکن کیا.....؟'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''ہمارے پاس روکڑا نہیں ہے جی..... اگر آپ یہ بکوا دیں تو ہمارے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔'' میں نے جیب سے سونے کی ایک چین نکال کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

وہ چند لمحے چین کو دیکھتا رہا۔ اُسے انگوٹھے کے ناخن پر رگڑا۔

''خالص سونے کی ہے جی..... اس میں ذرا بھی کھوٹ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے دیکھ لیا ہے..... کیا لو گے؟'' اُس نے پوچھا۔

''جو مناسب ہو.....'' میں نے جواب دیا۔

اُس نے ایک بار پھر چین کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، پھر جیب سے تین ہزار روپے نکال کر میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے خاموشی سے وہ رقم لے لی۔ مجھے پاکستانی کرنسی کی ضرورت تھی اس لئے میں نے کوئی بھاؤ تاؤ نہیں کیا۔ حالانکہ میرے حساب سے وہ چین آٹھ ہزار سے کم نہیں تھی۔

''تم لوگ ناشتہ وغیرہ کر لو..... ہم ایک گھنٹے بعد یہاں سے چلیں گے۔'' وڈیرے نے کہا اور اپنے ایک ملازم کو اشارہ کیا۔ وہ ملازم ہمیں ایک اور کمرے میں لے آیا۔ یہاں فرش پر قالین

بچھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں بٹھا کر باہر چلا گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد میں اور کلپنا ناشتہ کر رہے تھے۔

اُس وقت صبح کے آٹھ بجنے والے تھے۔ نو بجے کے قریب ہم کراچی کے لئے روانہ ہو گئے۔ پجیرو بڑی شاندار اور ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ایک گن مین بیٹھا ہوا تھا۔ اُس سے پچھلی سیٹ پر وڈیرہ اور آخری سیٹ پر ہمیں بٹھا دیا گیا۔ آخر میں سامان رکھنے کی جگہ پر ایک واٹر کولر بھی رکھ لیا گیا تھا۔

یہ علاقہ بھی ریگستانی تھا۔ کہیں کہیں سبزہ تھا۔ تھوڑی بہت کھیتی باڑی تھی اور چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ میں راجستھان میں ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ ریگستان میں رہنے والوں کی زندگی کتنی کٹھن ہوتی ہے۔

ہم رحیم بازار، بدین، گڑھی، جیٹی، سجاول اور ٹھٹھہ سے ہوتے ہوئے شام کے قریب کراچی پہنچ گئے۔

''تم لوگوں کو کہاں جانا ہے؟'' وڈیرے نے پیچھے مُڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جہاں کہو اُتار دیں گے۔''

''کسی ہوٹل کے سامنے اُتار دیں جناب!'' میں نے جواب دیا۔

''ہوٹل میں ٹھہرو گے اس چھوکری کے ساتھ؟'' اُس نے مجھے گھورا۔ ''کوئی رشتہ دار، کوئی جاننے والا نہیں ہے یہاں؟''

''نہیں جناب..... ہم پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں۔ یہاں ہم کسی کو نہیں جانتے نہ کوئی ہمیں جانتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کراچی بڑا ظالم شہر ہے.....'' وڈیرے نے کہا۔ ''تم اکیلے ہوتے تو مجھے پرواہ نہ ہوتی۔ لیکن اس چھوکری کے ساتھ میں تمہیں کسی ہوٹل میں نہیں رہنے دُوں گا۔''

''تو پھر..... ہم کیا کریں؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا لگتی ہے تمہاری؟'' اُس نے پوچھا۔

''میری پتنی ہے جی۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''تو پھر ایسا ہے کہ.....'' اُس نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''کراچی میں میرا بنگلہ ہے گلشن اقبال میں..... کئی کمرے ہیں۔ میں ایک کمرہ تم لوگوں کو دے دُوں گا۔ جب تک چاہو وہاں رہ لینا میرے مہمان بن کر۔ اور یہ بھی رکھ لو اپنے پاس..... کسی اور وقت کام آ جائے گی۔'' اُس نے جیب سے چین نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

''نہیں جناب..... یہ میں آپ کے ہاتھ بیچ چکا ہوں۔ اگر آپ اسے واپس کریں گے تو آپ کو اپنے پیسے بھی واپس لینے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا، اچھا بھئی.....'' وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ چین اُس نے دوبارہ جیب میں رکھ لی تھی۔ ''تم تو ناراض ہونے لگے۔ ہمارا مہمان بننا بھی منظور ہے یا نہیں؟''

''جب تک کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا آپ کی مہمان نوازی اور مہربانیوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

گزشتہ رات سے اب تک وڈیرے نے ہمارے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اور اب وہ ہمارے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔ اور میں نے بلا تکلف اُسے سب کچھ بتا دیا۔ اب میں پاکستان میں تھا اور میرے دل میں کوئی خوف نہیں رہا تھا۔

''اوہ.....'' میری داستان سن کر وہ اُچھل پڑا۔ ''تم تو ہیرو ہو ہیرو..... بات یہ ہے سائیں کہ ہندوستانی اسمگلروں سے میرے تعلقات ضرور ہے۔ وہ ہمارا کاروبار ہے لیکن اپنے وطن سے محبت ہمارا ایمان ہے۔ ہم نے جیسلمیر والے کیمپ کی تباہی کے بارے میں سنا تھا اور ہم خوش ہوئے تھے۔ اب تم امن کی سرزمین پر آ گئے ہو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ تم سے ملاقات کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ اب تم اور کہیں نہیں جاؤ گے۔ میرا گھر تمہارے لئے حاضر ہے شمروز سائیں! پاکستان کے لوگ بھی کشمیریوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کراچی والوں کو جب پتہ چلے گا کہ تم کون ہو تو وہ تمہارے جلوس نکال دیں گے۔ تمہیں کندھوں پر اُٹھا لیں گے۔ ایک دو روز آرام کر لو سائیں! پھر دیکھنا میں تمہارے کتنے جلوس نکالتا ہوں۔''

وڈیرہ نوازش علی اس طرح خوش ہو رہا تھا جیسے اُسے بہت بڑی دولت مل گئی ہو۔ اس کے بعد تو وہ میرے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اور پھر اُس نے وہ سوال بھی کر ڈالا جس کے بارے میں، میں بہت دیر سے سوچ رہا تھا۔

''شمروز سائیں! اس چھوکری سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' اُس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ یہ تمہاری پتنی ہے۔ لیکن اب یہ بات صاف ہو گئی کہ نہ تم ہندو ہو اور نہ ہی یہ تمہاری پتنی ہو سکتی ہے۔ اگر میری اُلجھن دُور کر دو تو.....''

''نوازش علی صاحب!'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہندوؤں میں سیتا جیسی لڑکی بھی تھی جس نے میری خاطر اپنی جان دے دی اور یہ کلپنا بھی ہے جو میری خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ آئی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''اوہ.....'' وڈیرہ نوازش علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''تو پھر یوں کہو نا کہ یہ لڑکی ہماری بیٹی ہوئی۔ اور اس کا نام کلپنا نہیں زلیخا ہے۔'' اُس نے پیچھے جھک کر کلپنا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر وہی چین جیب سے نکال کر کلپنا کے ہاتھ میں دے دی۔ ''زلیخا بیٹی! اس وقت تو میری طرف سے یہ سلامی سمجھ کر قبول کر لو! باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔''

کلپنا نے میری طرف دیکھا، اُس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔

''لے لو بھئی.....!'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''انہیں یہ زنجیر واپس کرنا تھی سو کر دی۔'' وڈیرہ نوازش علی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پجیرو مختلف سڑکوں پر ہوتی ہوئی گلشن اقبال کے بلاک سکس میں داخل ہو کر ایک بنگلے کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر رُک گئی۔ ہارن بجانے پر ایک

ادھیڑ عمر آدمی نے گیٹ کھول دیا اور پجیرو اندر داخل ہو کر برآمدے کے سامنے رُک گئی۔ یہ خاصا بڑا بنگلہ تھا۔ وسیع اور بہت خوبصورت لان تھا۔ کوٹھی دو منزلہ تھی۔ اُوپر جانے کے لئے اندر ہی سے زینہ تھا۔ اُس بوڑھے ملازم کا نام آچر تھا۔ یہاں اس کے ساتھ اُس کی بیوی حضوری بھی تھی۔ آچر کو معلوم تھا کہ وڈیرہ نوازش علی آج آنے والا ہے۔ اُس نے کھانا تیار کر رکھا تھا۔

بنگلے میں فرنیچر بھی بہت شاندار تھا۔ وڈیرہ نوازش علی کلپنا کا ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے میں لے گیا۔ میں بھی اُن کے ساتھ ہی تھا۔ کمرے میں لمبے چوڑے وارڈ روب اور دوسری چیزوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ کسی خاتون کا کمرہ تھا۔ وارڈ روب میں ہینگروں پر بڑے شاندار زنانہ ملبوسات ٹنگے ہوئے تھے۔

''بیٹی زلیخا! یہ کمرہ اور اس کی ہر چیز آج سے تمہاری ہے۔ یہ وارڈ روب ہے اور وہ باتھ رُوم کا دروازہ..... جو لباس تمہیں پسند ہو نہا کر پہن لو۔ ہم ایک گھنٹے بعد کھانے کی میز پر تمہارا انتظار کریں گے۔'' وڈیرہ نوازش علی نے کہا اور مجھے دوسرے کمرے میں لے آیا۔ ''یہ فی الحال تمہارا کمرہ ہے..... تم بھی نہا کر تیار ہو جاؤ!'' وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گیا۔ میں چند لمحے کھڑا حیرت سے اُس کے بارے میں سوچتا رہا پھر دروازہ بند کر لیا۔ تھیلا کندھے سے اُتار کر بیڈ پر رکھا اور اپنے کپڑے نکالنے لگا۔

ایک گھنٹے بعد ہم تینوں کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کلپنا نے نیوی بلیو رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس رنگ کا دوپٹہ بھی گلے کی زینت بنا ہوا تھا۔ اس لباس میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔

کھانے کے دوران زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔ تاہم وڈیرہ نوازش علی بار بار کلپنا کی طرف دیکھ رہا تھا اور ہر بار کوئی نہ کوئی ڈش اُٹھا کر اُس کے سامنے رکھ دیتا اور بڑے اصرار سے اُسے ہر ڈش میں سے کچھ نہ کچھ لینے پر مجبور کرتا رہا۔

کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں بیٹھ کر چائے کے دوران باتیں کرنے لگے۔ وڈیرہ کلپنا کو زلیخا کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا۔ اور بالآخر جب میں نے اس نام کے حوالے سے ایک سوال کیا تو وہ گویا پھٹ پڑا۔

یہ انکشاف میرے لئے بڑا دلچسپ ہوا کہ زلیخا اُس کی بیٹی کا نام تھا جو کراچی کے ایک کالج میں زیرِ تعلیم تھی اور ایک سال پہلے اس شہر میں کار کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئی تھی۔ اب بات میری سمجھ میں آ گئی کہ وہ کلپنا کو بار بار اس طرح کیوں دیکھ رہا تھا۔ اُسے کلپنا میں اپنی زلیخا کی جھلک نظر آئی تھی اور وہ کمرہ بھی زلیخا کا تھا جس کی ہر چیز اُس نے کلپنا کے حوالے کر دی تھی۔

''میں نے اپنی حویلی میں کلپنا کو دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ تم لوگوں کو اپنی گاڑی پر کراچی لے کر جاؤں گا اور تمہارا گھر دیکھ لوں گا اور بعد میں کسی نہ کسی بہانے تم لوگوں سے رابطہ رکھوں گا۔'' وڈیرہ نوازش علی کہہ رہا تھا۔ ''لیکن راستے میں تم نے جو انکشافات کئے اس سے مجھے اپنے

دل کی بات کہنے کا موقع مل گیا۔ آج میں بہت خوش ہوں..... مجھے میری بیٹی بھی مل گئی ہے اور ایک ایسا شخص بھی جس کی دوستی پر میں فخر کر سکتا ہوں۔''

''ہم اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہمیں آپ جیسا مربی مل گیا۔'' میں نے کہا۔

ہم رات کے تقریباً دو بجے تک باتیں کرتے رہے اور پھر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ بستر پر لیٹتے ہی میں سو گیا اور صبح دس بجے سے پہلے میری آنکھ نہیں کھل سکی تھی۔ کلپنا بھی اپنے کمرے میں سو رہی تھی اور وڈیرہ نوازش علی کہیں جا چکا تھا۔

ہم نے ناشتہ کیا اور وڈیرہ بارہ بجے کے قریب واپس آ گیا۔ اور پھر اُس کا زیادہ وقت مختلف لوگوں سے ٹیلی فون پر باتیں کرتے گزرا۔

چار بجے کے قریب کچھ لوگ آ گئے جنہوں نے کچھ ایسی تیاریاں شروع کر دیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا جیسے کوئی دعوت ہونے والی ہو۔ لان کے آدھے حصے میں ایک طرف مختصر سا سٹیج بنا دیا گیا تھا جس کے سامنے کئی کرسیاں قطار در قطار رکھ دی گئی تھیں جبکہ لان کے باقی حصے میں میزیں لگا کر اُن پر کراکری سجائی جا رہی تھی۔ روشنی کا بھی معقول انتظام کیا جا رہا تھا۔

ساڑھے چھ بجے مہمان آنا شروع ہو گئے..... وڈیرہ نوازش علی نے مجھے اور کلپنا کو ایک کمرے تک محدود کر دیا اور خود باہر جا کر مہمانوں کا استقبال کرنے لگا۔ اور پھر جب سات بجے کے قریب وہ ہم دونوں کو باہر لے کر آیا تو میری آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی.....

لان میں درجنوں پریس رپورٹرز موجود تھے..... کئی فوٹو گرافرز تھے اور نصف درجن سے زیادہ ٹی وی کیمرے مختلف جگہوں پر لگے ہوئے تھے..... رپورٹروں اور فوٹو گرافرز میں مقامی بھی تھے اور غیر ملکی بھی۔ ہم جیسے ہی برآمدے میں نکلے کیمروں کی فلیش لائٹس چمکنے لگیں اور ٹی وی کیمروں کے رُخ ہماری طرف ہو گئے.....

میں اور کلپنا بری طرح بدحواس ہو گئے۔ وڈیرہ نوازش علی ہمیں سٹیج پر لے آیا جہاں تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دو کرسیوں پر ہم بیٹھ گئے اور تیسری کرسی پر وڈیرہ براجمان ہو گیا۔ کافی دیر تک کیمروں کی فلیش لائٹس بجلی کے کوندوں کی طرح چمکتی رہیں اور پھر وڈیرہ نوازش علی اُن سب لوگوں سے میرا تعارف کرانے لگا۔ میں نے اُسے جو کچھ اپنے بارے میں بتایا تھا وہ اُس نے رپورٹروں کو بتا دیا..... اور پھر رپورٹرز مجھ سے سوالات کرنے لگے۔ بعض غیر ملکی رپورٹرز مجھ سے تاریخوں کے حوالے دے کر کشمیر کے اُن واقعات کے بارے میں پوچھتے رہے جو میرے نام سے منسوب تھے۔ میں اُنہیں تفصیل سے سب کچھ بتاتا رہا۔ سیتا کے بارے میں بھی کئی سوالات کئے گئے۔ میں نے اُن سوالوں کے جواب بھی بڑے اطمینان بخش طریقے سے دیئے۔ جیسلمیر کیمپ کی تباہی کے بارے میں بہت سے سوالات کئے گئے اور میں ان کے بھی جواب دیتا رہا۔

ایک گھنٹے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا..... ٹی وی چینلز کے نمائندے تو فوراً ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اخبارات کے رپورٹرز میزوں کے گرد کھڑے ناؤ نوشی کے دوران بھی مجھ سے اور کلپنا سے مختلف سوالات کرتے رہے۔

نو بجے ہم لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے اور پھر خبرنامے میں ٹی وی اسکرین پر اپنے آپ کو دیکھ کر میں اُچھل پڑا..... کشمیر کے حوالے سے وزیراعظم کے ایک بیان کے بعد ہماری اس پریس کانفرنس کی کارروائی نشر کی جا رہی تھی۔

وڈیرہ نوازش علی چینلز تبدیل کرتا رہا۔ ہر چینل کے نیوز بلیٹن میں میری اس پریس کانفرنس کو سب سے زیادہ اہمیت دی جا رہی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری شخصیت اس قدر اہم ہو گی۔ لیکن وہ حقیقت میرے سامنے تھی جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا.....!

○

وڈیرہ نوازش علی اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا۔ کلپنا صوفے پر میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے آپ کو ٹی وی پر دیکھ کر اُس کے چہرے پر بھی سنسنی کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ انٹرویو کے دوران بعض رپورٹروں نے اُس سے چند سوالات پوچھے تھے لیکن وہ زیادہ تر خاموش ہی رہی تھی۔ کشمیر کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ البتہ خود اُس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا یا جیسلمیر میں اُس نے ''را'' کے ظلم و ستم کے جو مظاہرے دیکھے تھے اُن کے بارے میں اُس نے بہت کچھ بتایا تھا۔ کلپنا نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ زندگی میں کبھی اس طرح اُس کی پذیرائی ہو گی یا اس طرح وہ ٹی وی پر آئے گی۔ اور اب وہ اپنے آپ کو ٹی وی کی سکرین پر دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔

لیکن..... میں اس صورتحال سے مطمئن نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ پاکستان میں بھی بھارتی انٹیلی جنس کے ایجنٹ موجود تھے جو مختلف شہروں میں بم دھماکوں اور تخریب کاری کی دیگر وارداتوں کے ذریعے پاکستان میں انتشار پھیلا رہے تھے۔ ان بھارتی ایجنٹوں کا زیادہ زور کراچی میں تھا جہاں آئے دن دہشت گردی کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ بعض ایجنٹ پکڑے جاتے تھے اور بعض انسانوں کے اس جنگل میں غائب ہو جاتے تھے۔

میں ٹی وی پر آ گیا تھا..... اور مجھے تشویش یہ تھی کہ بھارتی ایجنٹوں کو بھی ظاہر ہے پتہ چل گیا ہو گا اور یقیناً وہ خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ میں نے کلپنا کے سامنے اپنے ان خدشات کا اظہار نہیں کیا لیکن گیارہ بجے کے قریب وڈیرہ نوازش علی واپس آیا تو میں نے اُسے اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔

''میں جانتا ہوں سائیں.....'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مجھ سے ایک غلطی تو ہو گئی لیکن میں نے اس کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔''

''وہ کیا.....؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ابھی بتاؤں گا..... تھوڑی دیر میں پتہ چل جائے گا۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور پھر مجھے پتہ چل گیا کہ اُس نے کیا بندوبست کیا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک گاڑی کوٹھی کے سامنے آ کر رُکی۔ وڈیرہ نوازش علی اُٹھ کر گیٹ سے باہر چلا گیا اور میں بھی برآمدے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ سکیورٹی گارڈز کی وردی میں ملبوس چار لمبے تڑنگے آدمی تھے۔ وہ کسی سکیورٹی ایجنسی سے آئے تھے۔ چاروں کے ہولسٹرز میں پستول نظر آ رہے تھے۔ اُن کے ساتھ پانچواں آدمی سادہ لباس میں تھا۔ وہ شاید اس سکیورٹی ایجنسی کا کوئی آفیسر تھا۔ اُس نے گھوم پھر کر کوٹھی کا جائزہ لیا اور اُن چاروں گارڈز کو اس طرح متعین کر دیا کہ اُن کی نظروں میں آئے بغیر کوئی غیر متعلق شخص کوٹھی کے قریب نہیں پھٹک سکتا تھا۔ اُن میں سے دو کی ڈیوٹی تو کوٹھی کے مرکزی گیٹ پر لگا دی گئی تھی۔ ایک کو اُوپر کی منزل پر سامنے کے رُخ پر تعینات کیا گیا تھا اور ایک کی ڈیوٹی کوٹھی کے پچھلے حصے پر لگا دی گئی تھی تاکہ پچھلی گلی پر بھی نگاہ رکھی جا سکے۔

یہ کوٹھی کی حفاظت کا بہترین انتظام تھا۔ کوئی غیر متعلق شخص کوٹھی میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے وڈیرہ نوازش علی اس انتظام سے مطمئن ہو لیکن میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ یہ سکیورٹی گارڈز اگرچہ ریٹائرڈ فوجی تھے اور بڑے چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ لیکن دوسری طرف بھارتی انٹیلی جنس کے ایجنٹ تھے جنہیں اس قسم کی صورتحال سے نمٹنے کی خصوصی تربیت دی گئی تھی اور مجھے ان کا اچھا خاصا تجربہ بھی تھا۔ نجانے کیا بات تھی کہ ان انتظامات کے باوجود میری تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ اگلے روز صبح سویرے ہی وڈیرہ نوازش علی نے اپنے نوکر آچر کو بھیج کر کئی اخبارات منگوا لئے۔ ٹی وی کی طرح اخبارات نے بھی ہمارے بارے میں خبروں کو سب سے زیادہ اہمیت دی تھی۔ ہر اخبار کی ہیڈ لائن یہی تھی۔ ہر اخبار کے صفحہ اوّل پر میری اور کلپنا کی تصویریں بھی تھیں۔ بعض اخبارات نے وڈیرہ نوازش علی کی تصویریں بھی شائع کی تھیں۔ کلپنا اپنی تصویریں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔

گزشتہ رات ٹی وی پر خبر نشر ہونے کے بعد کئی لوگوں کے ٹیلی فون آئے تھے۔ اور اب بھی آٹھ بجے کے بعد ٹیلی فون کالز کا تانتا بندھ گیا..... حالانکہ صرف ایک اخبار نے وڈیرہ نوازش علی کا فون نمبر شائع کیا تھا اور عوام کو اطلاع دی تھی کہ کشمیر کے اس مجاہد اعظم سے اس نمبر پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگ مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کشمیر میں میری کارروائیوں پر مجھے مبارکباد دینا چاہتے تھے۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ میرے ساتھ آنے والی لڑکی کلپنا نہیں سیتا ہے جو کشمیر اور ہندوستان میں میرے ساتھ سرگرم رہی تھی۔ اور شاید بعض وجوہات کی بناء پر اس کا اصل نام نہیں چھاپا گیا تھا۔ بہت سے لوگ تو صرف کلپنا ہی سے بات کرنے کے

خواہش مند تھے۔

اُس روز کئی کشمیری رہنماؤں کے بھی فون آئے تھے جو کراچی میں اپنی تحریک کے سلسلے میں سرگرم تھے۔ یہ سب لوگ مجھ سے ملنا چاہتے تھے لیکن میں مصروفیت کا بہانہ بنا کر اُنہیں فی الحال ٹالتا رہا۔ میں کوئی لائحہ عمل طے کئے بغیر کسی سے ملاقات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ میں کسی ایسے کشمیری رہنما سے ضرور ملنا چاہتا تھا جس کا تعلق کشمیر میں بھارتی فوجیوں کے خلاف برسرِ پیکار اُس پارٹی سے ہو جس سے میں بھی وابستہ رہ چکا تھا۔

تین چار روز گزر گئے۔ میں اخبارات کے ذریعے صورتحال کا جائزہ لیتا رہا۔ اس دوران میں ایک مرتبہ بھی کوٹھی سے باہر نہیں نکلا تھا البتہ وڈیرہ نوازش علی ایک مرتبہ کلپنا کو ساتھ لے گیا تھا۔ اور تقریباً تین گھنٹوں بعد وہ واپس آئے تو کلپنا تحائف سے لدی پھندی تھی۔ وارڈ روب میں اگرچہ وڈیرے کی بیٹی زلیخا کے ملبوسات بھرے ہوئے تھے لیکن اُس نے کلپنا کو اور بھی کئی جوڑے خرید کر دیئے تھے۔

وڈیرہ نوازش علی کے اور بھی کچھ رشتے دار کراچی میں رہائش پذیر تھے۔ وہ لوگ اکثر ملنے کے لئے آتے رہتے تھے۔ اُن کی خواتین تو بس کلپنا کو گھیرے رہتی تھیں۔ وہ سب لوگ اُسے زلیخا ہی کے نام سے پکارتے تھے۔

کئی روز گھر میں بند رہنے کے بعد بالآخر میں نے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا..... میں نے ان کشمیری رہنماؤں کی ایک فہرست بھی تیار کر رکھی تھی جن سے میں ملنا چاہتا تھا۔

کراچی میں لاتعداد کشمیری آباد تھے۔ یہاں مختلف پارٹیوں کے دفتر بھی تھے لیکن مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ یہ لوگ صرف بیانات کی حد تک محدود تھے۔ یہاں میری بعض ایسے خود ساختہ کشمیری لیڈروں سے بھی ملاقات ہوئی جو کشمیر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ کشمیر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے اُن کے اپنے کوئی ذرائع نہیں تھے۔ اُن کا انحصار اخبارات پر ہی تھا۔ تاہم پاکستان کی ایک دینی جماعت جہاد کشمیر کے حوالے سے بہت زیادہ سرگرم تھی۔ اُس جماعت کے رہنما جلسوں میں اپنے پُر جوش خطابات سے لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑتے رہتے تھے۔ یہاں سے مجاہدین کو بھی کشمیر کے محاذ پر جہاد کے لئے بھیجتے رہتے تھے۔ اور مجھے افسوس اس بات کا تھا کہ محاذ پر جانے والے یہ مجاہدین کشمیری نہیں تھے۔ وہ پاکستانی نوجوان تھے جو ہندوؤں سے برسرِ پیکار کشمیری مجاہدین کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے گھر بار اور آرام و آسائش چھوڑ کر جہاد کے لئے جاتے تھے۔ پاکستان کی یہی دینی جماعت کشمیری مجاہدین اور مقبوضہ کشمیر سے لٹ پٹ کر آنے والے مہاجرین کے لئے ضرورت کا سامان جمع کر کے بھی بھیجتی رہتی تھی۔ جبکہ اصل کشمیری باشندوں کو ایسے کاموں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو چندے جمع کر کے اور بیانات کے ذریعے اپنی لیڈری چلا رہے تھے۔

آٹھ دس دنوں کے دوران کسی ایسے کشمیری سے میری ملاقات نہیں ہو سکی جو واقعی کسی کشمیری

تنظیم سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ چند روز بڑے سکون سے گزر گئے تھے۔ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں بڑی حد تک بیزار ہو چکا تھا اور کشمیر کی طرف جانا چاہتا تھا تاکہ اپنی سرزمین پر پہنچ کر اپنی سرزمین کی آزادی کے لئے ایک بار پھر سرگرم عمل ہو سکوں..... لیکن وڈیرہ نوازش علی نے مجھے روک رکھا تھا کہ میں چند روز اور آرام کر لوں۔

اُس رات دو مہمان آئے تھے۔ وہ دونوں کشمیری نہیں تھے لیکن کشمیریوں کے ہمدرد ضرور تھے۔ اُنہوں نے رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھایا تھا۔ کھانے کے بعد کلپنا تو اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور ہم لوگ دیر تک لاؤنج میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

اُن میں رئیس غوث بخش نام کا ایک شخص وڈیرہ نوازش علی کا دُور کا رشتہ دار بھی ہوتا تھا اور دوسرا مقبول احمد اُس کا دوست تھا۔ رات دو بجے کے قریب جب وہ لوگ جانے لگے تو وڈیرہ نوازش علی نے اُنہیں روک لیا۔ آچر نے فوراً ہی اُوپر والے ایک کمرے میں اُن کے لئے بستر درست کر دیئے تھے۔ وہ دونوں ڈھائی بجے کے قریب اُوپر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وڈیرہ نوازش علی بھی اپنے کمرے میں چلا گیا۔

یہاں آنے کے بعد کلپنا اور میں الگ الگ کمروں میں سوتے تھے۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میں نے کلپنا کے کمرے میں جھانکا۔ نیلی مدھم روشنی والا نائٹ بلب جل رہا تھا اور کلپنا کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کا چہرہ میری طرف تھا اور وہ جاگ رہی تھی۔ مجھے دروازے میں دیکھ کر وہ اُٹھ گئی۔ میں بھی آگے بڑھ آیا۔

''کیا بات ہے..... تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''نیند نہیں آ رہی.....'' کلپنا نے جواب دیا۔ ''پتہ نہیں کیا بات ہے..... عجیب سی وحشت طاری ہو رہی ہے۔''

''اپنا گھر یاد آ رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا گھر تو وہی ہے جہاں تم ہو گے.....'' کلپنا بولی۔ ''لیکن آج تو بڑی وحشت سی ہو رہی ہے۔''

''تین بجنے والے ہیں۔ لیٹ کر آنکھیں بند کر لو! نیند آ جائے گی۔'' میں کہتے ہوئے کمرے سے باہر آ گیا۔ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں بھی اپنے بستر پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔ میں دراصل اس صورتحال سے پریشان تھا جس کا مشاہدہ میں کئی روز سے کر رہا تھا۔ کراچی میں لاکھوں کشمیری آباد تھے۔ اُن میں دولت مند بھی تھے، غریب بھی اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے بھی۔ پوش علاقوں میں اُن کے قالینوں اور کاروں کے شوروم بھی تھے اور یہ ٹھیلوں پر سبزیاں بھی بیچتے تھے۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ یہ لوگ مطمئن اور پُرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُنہیں کشمیر میں ہونے والی جنگ سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میں یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی آہٹ محسوس کر کے چونک گیا۔ گردن گھما کر اُس

طرف دیکھا تو کلپنا دروازے میں کھڑی تھی۔ مجھے حرکت کرتے دیکھ کر وہ آگے آ گئی۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی..... اکیلے میں ڈر لگ رہا ہے۔'' کلپنا کے لہجے میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ میں بھی پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''یہاں لیٹ جاؤ.....'' میں کنارے کی طرف سرک گیا۔ ''تمہیں کس بات کی وحشت ہو رہی ہے..... اور یہاں ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

''پتہ نہیں.....'' وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔ ''دو تین دن سے دل میں ہول سے اُٹھ رہے ہیں۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو۔''

''کچھ نہیں ہونے والا..... آنکھیں بند کر لو اور اطمینان سے سو جاؤ!'' میں نے کہا اور اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا۔

کلپنا دھیمے لہجے میں باتیں کرتی رہی اور پھر وہ سو گئی۔ میں نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا اور پلنگ کے کنارے پر کروٹ پھیر کر لیٹ گیا۔ میں کافی دیر تک کلپنا کے بارے میں سوچتا رہا جو اپنا سب کچھ چھوڑ آئی تھی۔ یہاں اگرچہ اُسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اُسے وڈیرہ نوازش علی کے خاندان کی خواتین اور دوسرے لوگوں سے بہت پیار ملا تھا۔ وڈیرہ نوازش علی سے باپ جیسی شفقت ملی تھی۔ لیکن اُسے اپنا دیش اور اُس دیش کے لوگ تو یاد آتے ہوں گے۔ اور میں جانتا تھا کہ ایسی یادیں ہی بعض اوقات انسان کے لئے سوہانِ رُوح بن جاتی ہیں۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھیں بھی بند ہونے لگیں.....

میں پتہ نہیں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ ایک زوردار دھماکہ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی..... دھماکہ ایسا تھا جیسے سر پر بم پھٹا ہو۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا اور دوسرے ہی لمحہ کلپنا بھی چیختی ہوئی اُٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی..... اُسی لمحہ ایک اور زوردار دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ بھی بم کی طرح زوردار تھا۔ اس دھماکے کے ساتھ ہی یوں لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو..... میں پلنگ کے بالکل کنارے پر تھا۔ کلپنا مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اُچھلی تو میں اُس کے دھکے سے پلنگ کے نیچے گر گیا۔ کلپنا بھی میرے اُوپر ہی گری تھی۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔

پے در پے دھماکے ہو رہے تھے..... اس کے ساتھ ہی انسانی چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں..... پھر پستول یا ریوالور سے فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔

جب میں کشمیر میں تھا تو کسی چھاپہ مار کارروائی کے دوران ایسے زوردار دھماکوں، چیخوں اور فائرنگ کی آوازیں سنائی دیا کرتی تھیں۔ ایک لمحہ کو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ لیکن یہ کوئی خواب نہیں حقیقت تھی.....!

اسی لمحہ وڈیرہ نوازش علی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''شمروز..... زلیخا! کہاں ہو تم لوگ.....؟''

''ہم یہاں ہے بابا! یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا۔

ٹھیک اُسی وقت ایک اور زوردار دھماکہ ہوا..... اور پھر یوں لگا جیسے عمارت کا کوئی حصہ گرا ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی وڈیرہ نوازش علی کی چیخ سنائی دی۔ میں اُٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔ راہداری میں پہنچتے ہی میں رُک گیا۔ شدید سردی اور سنسنی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی چلی گئی.....

کوٹھی کا لاؤنج والا حصہ گر چکا تھا..... ایک اور زوردار دھماکہ ہوا اور عمارت کا ایک اور حصہ بیٹھتا ہوا نظر آیا۔ کمرے میں کلپنا کی چیخوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا کمرے میں پہنچ گیا اور کلپنا کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے کے پچھلے دروازے کی طرف دوڑا۔ یہ دروازہ عقبی صحن میں کھلتا تھا۔ اس طرف بھی بہت وسیع و عریض لان تھا۔ میں کلپنا کو کھینچتا ہوا لان کے آخری سرے پر دیوار کے قریب بیٹھ گیا۔

''تم یہاں بیٹھو..... میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے کلپنا کو دیوار کے قریب بٹھا دیا۔

''مجھے چھوڑ کر مت جاؤ..... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' کلپنا چیخی۔

وڈیرہ ملبے کے نیچے دبا ہوا ہے۔ اُس کی زندگی خطرے میں ہے۔'' میں نے بھی چیخ کر کہا۔

''تم یہاں بیٹھی رہو! یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' میں دوڑتا ہوا عمارت میں گھس گیا۔ دھماکوں کی آوازیں اب سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ کوٹھی پر حملہ کیا گیا تھا اور یہ حملہ سامنے کے رُخ پر سڑک کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس حملے میں راکٹ برسائے گئے تھے۔ اگر بم پھینکے گئے ہوتے تو عمارت مکمل طور پر ملبے کا ڈھیر بن چکی ہوتی۔

عمارت کے کچھ حصے گرے تھے۔ وڈیرہ ہال کے دوسری طرف والی راہداری کے ایک کمرے میں تھا۔ وہ دھماکوں کی آواز سن کر ہماری خیریت دریافت کرنے کے لئے اس طرف دوڑا تھا لیکن ایک گرتی ہوئی دیوار کے نیچے دب گیا تھا۔ وڈیرے کی دونوں ٹانگیں ملبے کے نیچے دبی ہوئی تھیں اور وہ مدد کے لئے چیخ رہا تھا۔ میں جھک کر اُس پر سے ملبہ ہٹانے لگا۔ اسی دوران ایک گارڈ بھی دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ہم دونوں نے مل کر وڈیرے کو ملبے سے نکالا۔ اُس کی ایک ٹانگ بری طرح کچلی گئی تھی۔ جبکہ دوسری ٹانگ سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ ہم دونوں نے اُسے لان میں دُور لے جا کر گھاس پر لٹا دیا اور دوبارہ عمارت کی طرف دوڑے۔

اُس عمارت پر سڑک کی طرف کسی گاڑی سے پانچ راکٹ برسائے گئے تھے..... تین راکٹ عمارت کے اُوپر والے حصے پر لگے تھے اور دو نچلے حصے میں۔ اُوپر جانے والی سیڑھیاں سلامت تھیں۔ میں اور گارڈ دوڑتے ہوئے اُوپر پہنچ گئے۔ اُوپر زیادہ تباہی پھیلی تھی۔ اُوپر کی منزل پر سامنے کے رُخ پر جو گارڈ ڈیوٹی دے رہا تھا وہ ختم ہو چکا تھا..... وہ کمرہ بھی ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا جس میں رئیس غوث بخش اور مقبول احمد سوئے ہوئے تھے۔ مقبول احمد ملبے کے نیچے دب کر ختم ہو چکا تھا جبکہ رئیس غوث بخش شدید زخمی ہو گیا تھا۔ ہم کسی نہ کسی طرح اُسے نیچے لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک گارڈ بھی شدید زخمی ہوا تھا۔ جبکہ چوتھا گارڈ معمولی زخمی تھا اور

وڈیرے کے ملازم آچر کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ شاید وہ ملبے کے نیچے دب کر ختم ہو چکا تھا یا بے ہوش تھا۔ پکارنے کے باوجود کسی طرف سے اُس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

مجھے حیرت تھی کہ یہاں اتنی شدید راکٹ بازی ہوئی تھی۔ آس پاس کی کوٹھیاں اگرچہ محفوظ رہی تھیں لیکن کوئی پڑوسی صورتحال معلوم کرنے کے لئے باہر نہیں نکلا تھا۔ اپنی جان تو سب کو عزیز ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں باہر نکلنے کی حماقت کون کر سکتا ہے؟

مجھے ایک اور بات پر بھی حیرت تھی۔ کوٹھی کے اُوپر والا حصہ تقریباً پوری طرح تباہ ہو چکا تھا۔ چند دیواریں کھڑی تھیں۔ نیچے کے حصے میں بھی تباہی پھیلی تھی لیکن بجلی ابھی تک برقرار تھی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُوپر والی ایک دیوار دھڑام سے گری اور اس کے ساتھ ہی تاریکی چھا گئی..... گلی کے کھمبے سے بجلی کی لائن اسی دیوار پر لگے ہوئے ایک بریکٹ سے منسلک تھی۔ وہ دیوار گری تو برقی رو بھی منقطع ہو گئی۔ اور یہ بھی مقام شکر تھا کہ راکٹ بازی یا بجلی کی تاریں ٹوٹنے سے آگ نہیں لگی تھی۔

اندھیرا ہوتے ہی کوٹھی کے پچھلی طرف سے کلپنا کی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں بد حواس ہو کر اُس طرف دوڑا۔ اندھیرے میں ٹھوکریں لگنے سے میں دو تین مرتبہ گرتے گرتے بچا تھا۔

''کلپنا..... کہاں ہو تم؟'' میں کوٹھی کے عقبی لان میں پہنچ کر چیخا۔

''مم..... میں..... میں یہاں ہوں۔'' اندھیرے میں ایک طرف سے کلپنا کی ڈری ڈری چیخ سنائی دی۔

میں دوڑتا ہوا اُس طرف پہنچ گیا۔ عقبی کوٹھی سے بہت مدھم سی روشنی اس طرف پہنچ رہی تھی لیکن واضح طور پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کلپنا نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں کلپنا کو لے کر کوٹھی کے سامنے والے لان میں آ گیا..... ایک گن مین گیٹ کھول کر باہر جا چکا تھا۔ وہ سامنے والی کوٹھی کا گیٹ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ میں نے کلپنا کو وڈیرہ نوازش علی کے پاس گھاس پر بٹھا دیا اور خود بھی باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

سامنے کی کوٹھی کے لوگ ہماری آوازیں سن کر اطمینان کر لینے کے بعد ہی باہر نکلے تھے۔ وہ لوگ بھی ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک آدمی نے بتایا کہ اُس نے فون کر دیا ہے۔ پولیس آنے ہی والی ہو گی۔

کچھ اور کوٹھیوں کے لوگ بھی باہر آ گئے۔ شروع میں جب ہم یہاں آئے تھے تو ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے ہمیں بڑی شہرت ملی تھی۔ اس گلی کے رہنے والے تو ہمارے بارے میں اچھی طرح جان چکے تھے۔ اور اب وہ لوگ بھی سمجھ گئے تھے کہ حملہ ہم پر ہوا تھا۔

پولیس آدھے گھنٹے بعد پہنچی تھی اور اس کے مزید آدھے گھنٹے بعد دو ایمبولینس گاڑیاں بھی پہنچ گئیں۔ زخمیوں اور لاشوں کو ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ پہلے پولیس کی صرف ایک موبائل آئی تھی۔

اُس پولیس پارٹی کے انچارج نے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے کر مزید پولیس منگوالی تھی۔

کلپنا کو سامنے کی کوٹھی میں رہنے والی عورتیں اپنے ساتھ لے گئیں اور میں پولیس کے ساتھ ٹارچوں کی روشنی میں وڈیرے کے ملازم آچر اور چوتھے گن مین کو تلاش کرنے لگا۔ رات کی تاریکی رخصت ہو رہی تھی اور دن کا اُجالا دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ دن کے اجالے میں تلاش کا کام آسان ہو گیا۔ دونوں کی لاشیں ملبے کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔ اُنہیں بھی ایک ایمبولینس کے ذریعے بھیج دیا گیا۔

ملگجا اُجالا اب دن کی تیز روشنی میں بدل رہا تھا۔ گلی میں بیسیوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ پولیس والوں کو جب یہ پتہ چلا کہ یہ حملہ ایک معروف کشمیری مجاہد اور اُس کی ساتھی کو ہلاک کرنے کے لئے کیا گیا تھا تو اُنہوں نے فوراً ہی اپنے افسرانِ اعلیٰ کو اطلاع دے دی اور دن کی روشنی پھیلنے تک پولیس کے بعض اعلیٰ افسران بھی پہنچ گئے اور اخبارات کے فوٹو گرافروں اور رپورٹروں نے بھی وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

پولیس کے ایک ذمہ دار آفیسر نے فوراً ہی پریس کو یہ بیان دے دیا کہ یہ بھارتی انٹیلی جنس ''را'' کے ایجنٹوں کی کارروائی ہے جنہوں نے ایک کشمیری مجاہد کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کشمیری مجاہد کے بارے میں ٹی وی پر بھی بہت کچھ آ چکا ہے اور اخبارات میں بھی بہت کچھ چھپ چکا ہے۔

ایک اخباری رپورٹر نے پولیس آفیسر کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پولیس کو معلوم تھا کہ وہ مجاہد کشمیر میں اور پھر راجستھان میں پاکستان کے خلاف بھارتی انٹیلی جنس کے نیٹ ورک کو بھاری نقصان پہنچا کر یہاں آیا تھا۔ یہ بھارتی انٹیلی جنس کے لئے موسٹ وانٹڈ آدمی ہے۔ یہاں بھی ''را'' کے تربیت یافتہ ایجنٹ موجود ہیں۔ اسے یہاں بھی خطرہ تھا اور پولیس بھی اس خطرے سے آگاہ تھی اس کے باوجود سرکاری طور پر اس مجاہد کی حفاظت کے لئے کوئی انتظامات کیوں نہیں کئے گئے؟''

''ہم سے اس کے لئے کوئی درخواست نہیں کی گئی تھی۔'' پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ ''لیکن میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ حملہ آوروں کو بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔''

میں خاموش کھڑا پولیس اور پریس رپورٹروں کی بحث سنتا رہا۔ فوٹو گرافروں نے میری تصویریں بھی کھینچی تھیں۔ پولیس نے تباہ شدہ کوٹھی کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ نصف درجن کانسٹیبل اس کوٹھی پر بھی تعینات کر دیئے گئے جہاں کلپنا موجود تھی۔ اور پھر میں ایک پولیس پارٹی کے ساتھ ہسپتال روانہ ہو گیا۔

ہسپتال میں عجیب سماں تھا..... افراتفری مچی ہوئی تھی۔ وڈیرہ نوازش علی کا دوست مقبول محمد اور دو گن مین ہلاک ہو چکے تھے۔ دوسرا گن مین معمولی زخمی ہوا تھا جسے مرہم پٹی کے بعد فارغ کر دیا گیا تھا۔ رئیس غوث بخش کا ایک بازو اور کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ وڈیرہ نوازش کی

بھی ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ وہ دونوں آپریشن تھیٹر میں تھے۔

مجھے آپریشن تھیٹر میں نہیں جانے دیا گیا۔ وڈیرہ نوازش علی کی گلی میں رہنے والے چند لوگ بھی اپنی گاڑیوں پر ہسپتال پہنچ چکے تھے۔ وڈیرے کے اُن سے اچھے تعلقات تھے اور وہ لوگ اُس کی ہمدردی اور محبت میں چلے گئے تھے۔

پولیس کی بھاری نفری بھی ہسپتال میں موجود تھی۔ چند مسلح پولیس والوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ پہلے میں بینچ پر بیٹھا رہا پھر مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ میں وہ پورا دن ہسپتال میں ہی رہا۔ اس دوران دو تین مرتبہ وڈیرہ نوازش علی کے پڑوسی کو فون کر کے کلپنا کے بارے میں بھی دریافت کر لیا تھا۔ اگرچہ اُس کی حفاظت کے لئے نصف درجن پولیس والے اُس کوٹھی پر تعینات تھے۔ اُن کے علاوہ بھی پولیس کی بھاری نفری نے وڈیرے کی تباہ شدہ کوٹھی کو گھیرے میں لے رکھا تھا لیکن کلپنا خوفزدہ تھی۔

دوپہر کے گیارہ بجے کے قریب بعض ایوننگ پیپرز مارکیٹ میں آ گئے تھے۔ ہر اخبار کی ہیڈ لائن ایک ہی تھی۔

''کشمیری مجاہد کی کوٹھی پر حملہ..... چار افراد ہلاک۔''

تفصیلات تو وہی تھیں جو آپ جان چکے ہیں۔ لیکن اخبارات نے خوفناک حد تک سنسنی پھیلانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

وڈیرہ نوازش علی اور رئیس غوث بخش کو پرائیویٹ رومز میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ اُن دونوں کے جسم پلاسٹر اور پٹیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ مجھے تھوڑی ہی دیر اُن کے پاس رہنے دیا گیا۔ وڈیرے کے کئی رشتے دار بھی ہسپتال میں موجود تھے۔ مجھے ہسپتال سے جانے کے لئے کہا گیا تو وڈیرے کا ایک قریبی عزیز رئیس سلطان بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ اکثر کوٹھی پر آتا رہا تھا اور مجھ سے خاصا بے تکلف بھی تھا۔ ہم کار پر ہسپتال سے روانہ ہوئے تو میری حفاظت کے لئے پولیس کی ایک موبائل بھی ہمارے ساتھ تھی۔

کوٹھی کا بالائی حصہ اگرچہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا لیکن گراؤنڈ فلور کے کچھ حصے رہائش کے قابل تھے۔ لیکن وہاں نہ تو بجلی تھی اور نہ ہی گیس۔ حفاظتی نکتہ نظر کے تحت مین لائن سے ان کے کنکشن کاٹ دیئے گئے تھے۔

میرے لئے واقعی پریشانی کی بات تھی کہ کہاں جاؤں..... کلپنا بھی خاصی پریشان تھی۔ ایسے موقع پر رئیس سلطان ہی ہماری مدد کو آگے آیا تھا۔ اُس نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کی تو میں انکار نہیں کر سکا تھا۔ رئیس سلطان کا بنگلہ گلشن اقبال کے بلاک نمبر دو میں تھا۔ دو سو چالیس گز کا یہ بنگلہ بھی دو منزلہ تھا۔ نچلی منزل کا ایک کمرہ ہمارے لئے خالی کر دیا گیا۔ نصف درجن پولیس والے بھی ہماری حفاظت کے لئے بنگلے پر تعینات ہو چکے تھے۔

اُس رات میں اور کلپنا دیر تک جاگتے رہے اور اس صورتحال پر غور کرتے رہے۔ اس میں

شبہ نہیں تھا کہ کوٹھی پر راکٹوں سے حملہ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کے ایجنٹوں ہی نے کیا تھا۔ پچھلے چند روز سکون سے گزرے تھے تو میں ''را'' کو بھول گیا تھا۔ لیکن ''را'' والے مجھے نہیں بھولے تھے۔ پاکستان میں بھی اُن کا مضبوط نیٹ ورک قائم تھا اور کراچی میں تو وہ بہت عرصہ سے بڑے منظم طریقے سے اپنی مذموم سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ وہ لوگ میرے خلاف کارروائی کے لئے موقع کی تلاش میں تھے۔ اور بالآخر انہیں موقع مل گیا تھا۔

کوٹھی کے گیٹ پر تعینات گن مین کے کہنے کے مطابق صبح چار بجے کے قریب کوٹھی سے تقریباً پچاس گز دُور سڑک پر ایک کار آ کر رُکی تھی۔ کوٹھی پر اُسی کار سے راکٹ برسائے گئے تھے۔ گن مین نے گیٹ پر موجود اپنے دوسرے ساتھی کے ہمراہ پوزیشن سنبھال کر اُس کار پر فائرنگ بھی کی تھی لیکن وہ کار پستولوں کی رینج سے دُور تھی۔ اور وہ دہشت گرد کوٹھی پر یکے بعد دیگرے پانچ راکٹ برسانے کے بعد کار میں فرار ہو گئے تھے۔ اس خوفناک حملے میں، میں تو بچ گیا تھا لیکن چار بے گناہ مارے گئے تھے اور ہمیں پناہ دینے والا وڈیرہ نوازش علی شدید زخمی ہوا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ شاید وہ اب کبھی بھی اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔

یہ جو کچھ بھی ہوا تھا بہت افسوس ناک تھا۔ اور مجھے اس پر بہت دُکھ تھا کہ میری وجہ سے چار بے گناہ انسان اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور وڈیرہ نوازش علی جیسا مخلص اور انسان دوست شخص نہ صرف زندگی بھر کے لئے مفلوج ہو گیا تھا بلکہ اُس کی کوٹھی بھی تباہ ہو گئی تھی۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ افسوس اور دُکھ اس بات کا تھا کہ کراچی میں کشمیریوں کی کئی تنظیمیں تھیں۔ ہر تحریک جہاد کی دعویدار تھی لیکن کسی کشمیری لیڈر نے اس خوفناک واقعہ کے بعد مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

کراچی میں ان تنظیموں کے بارے میں شروع میں میرا جو تجزیہ تھا وہ درست ثابت ہوا تھا۔ ان تنظیموں کے لیڈروں میں آپس میں ہی اتنے شدید اختلافات تھے کہ وہ کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آ سکتے تھے۔ کبھی ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ ان میں کبھی اتفاق رائے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ کشمیر میں جہاد کے حوالے سے چندے جمع کرنے کے معاملے میں تو یہ لوگ بڑے فعال تھے لیکن عملی طور پر یہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں کشمیری عوام اور کشمیری مجاہدین کی ہمدردی میں جو کچھ بھی کیا جا رہا تھا وہ مقامی باشندوں کی طرف سے ہو رہا تھا۔ اسی حوالے سے میں یہ بات کہنے میں حق بجانب تھا کہ کشمیر کی آزادی کی جنگ کشمیری نہیں پاکستانی لڑ رہے تھے۔

میں ایک بار پھر محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ مقامی انتظامیہ کی طرف سے میری سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ تاہم میری حفاظت کے لئے نصف درجن مسلح پولیس والے چوبیس گھنٹے بنگلے کے سامنے موجود رہتے تھے۔ کلپنا بھی میرے ساتھ قید ہو کر رہ گئی تھی۔ گھر کی خواتین نے کئی مرتبہ برقعہ پہنا کر اُسے اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہا تھا لیکن اُس نے ہر مرتبہ انکار کر دیا۔

اُن دہشت گردوں کا ابھی تک سراغ نہیں لگایا جا سکتا تھا جنہوں نے وڈیرہ نوازش علی کی

کوٹھی پر راکٹ برسائے تھے۔ بعض مشتبہ لوگ حراست میں لئے گئے تھے لیکن پولیس ان سے کچھ معلوم نہیں کر سکی تھی۔

وڈیرہ کی کوٹھی پر حملہ کرنے والے ''را'' کے ایجنٹ تربیت یافتہ تھے۔ مجھ سے زیادہ اُنہیں کون جانتا تھا؟ یہ حملہ بڑی پلاننگ سے کیا گیا تھا۔ یقیناً تمام انتظامات پہلے ہی مکمل کر لئے گئے ہوں گے۔ حملے کے بعد وہ لوگ اپنے کسی نہ کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے اور ان کا سراغ لگانا اب آسان نہیں تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا..... میں وڈیرہ نوازش علی کو دیکھنے کے لئے ہسپتال بھی نہیں جا سکا تھا۔ میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

اُس رات دس بجے کے قریب ایک گاڑی کوٹھی کے سامنے آ کر رُکی۔ اس کے چند منٹ بعد رئیس سلطان میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور کلپنا بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُسے دو دن سے ہلکا سا بخار ہو رہا تھا۔

''دو آدمی تم سے ملنے کے لئے آئے ہیں سائیں شمروز!'' رئیس سلطان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کے ساتھ ایک پولیس آفیسر بھی ہے۔''

''کون ہیں وہ لوگ؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تم ڈرائنگ رُوم میں آ جاؤ! وہ لوگ وہاں بیٹھے ہیں۔'' سلطان کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔

میں کچھ دیر اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ پھر کمرے سے نکل کر ڈرائنگ رُوم میں آ گیا۔ وہاں صوفوں پر رئیس سلطان کے علاوہ تین آدمی اور تھے۔ ایک اعلیٰ پولیس آفیسر تھا، دوسرا درمیانے قد کا آدمی جس کے چہرے پر چھوٹی نوکدار داڑھی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اور تیسرے آدمی کی صورت دیکھ کر میں اُچھل پڑا.....!!

○○○

وہ غازی عبدالحق تھا..... کئی مرتبہ کشمیر کے مختلف علاقوں میں بھارتی فوجیوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں میں ہمارے ساتھ حصہ لے چکا تھا۔ ہم کئی محاذوں پر شانہ بشانہ لڑے تھے۔ عبدالحق کئی مرتبہ زخمی ہوا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے اکیلے ہی بھارتی فوجیوں کی ایک چوکی تباہ کر دی تھی۔ اس کارروائی میں وہ خود بھی شدید زخمی ہوا تھا اور کم از کم تین مہینے سرینگر سے تیس میل دُور ایک پہاڑی غار میں زیرِ علاج رہا تھا۔ اُس کی اس کارروائی پر ہی اُسے غازی کا خطاب دیا گیا تھا۔

غازی عبدالحق مجھے دیکھ کر صوفے سے اُٹھ گیا۔ ہم نے بڑے پُر جوش انداز میں ایک دوسرے سے معانقہ کیا۔ پولیس آفیسر نے بھی مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ برکت اللہ نام کے دوسرے آدمی نے بھی مجھ سے معانقہ کیا تھا۔

اس ملاقات کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم رئیس سلطان کے بنگلے سے رخصت ہو رہے تھے۔ بنگلے کے سامنے نیلے رنگ کی پجیرو کھڑی تھی جس کے شیشے سیاہ رنگ کے تھے۔ قریب ہی ڈرائیور کے ساتھ سادہ لباس میں ایک اور آدمی بھی کھڑا تھا جس نے آٹومیٹک رائفل اُٹھا رکھی تھی۔ وہ بڑا چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اُس نے پجیرو کا دروازہ کھول دیا۔ پجیرو کی سیٹ پر ہم اس طرح بیٹھے کہ میں اور کلپنا درمیان کی سیٹ پر تھے، غازی عبدالحق اور اُس کا ساتھی برکت اللہ پچھلی سیٹ پر۔ گن مین ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈیوٹی پر متعین پولیس والے بھی اپنی موبائل میں بیٹھ گئے۔ پیچھے کچھ دُور ایک جیپ کھڑی تھی۔ پولیس آفیسر ہم سے ہاتھ ملانے کے بعد جیپ کی طرف چلا گیا تھا۔

پجیرو حرکت میں آ گئی..... گلی کے موڑ پر ایک پک اپ بھی کھڑی تھی جس کے پچھلے حصے پر فرش پر چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن چاروں کے پاس آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ ہماری پجیرو گلی سے نکلی تو وہ پک اپ بھی ہمارے پیچھے لگ گئی۔

آگے ہماری گاڑی تھی، اُس کے پیچھے پولیس کی موبائل اور آخر میں وہ پک اپ۔ مین روڈ پر آ کر گلشن چورنگی سے پولیس موبائل بائیں طرف مُڑ گئی اور پک اپ ہمارے پیچھے لگی رہی۔ نیپا چورنگی سے پجیرو یونیورسٹی روڈ پر بائیں طرف مُڑ گئی۔ وہ پک اپ بھی ہمارے پیچھے ہی تھی۔ میں نے دو تین مرتبہ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو غازی عبدالحق نے بتایا کہ اس پک اپ میں اپنے ہی آدمی ہیں۔

ہماری گاڑی یونیورسٹی سے بہت آگے نکل کر دائیں طرف ایک سڑک پر مُڑ گئی۔ اس علاقے میں ابھی ڈویلپمنٹ کا کام ہو رہا تھا۔ کئی رہائشی پراجیکٹ زیرِ تعمیر تھے۔ اُس سڑک پر نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پجیرو بائیں طرف ایک اور سڑک پر مُڑ گئی۔ اس مرتبہ فاصلہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ پجیرو ایک بہت بڑے آہنی پھاٹک کے سامنے رُک گئی۔

پھاٹک کھلا اور پجیرو کے پیچھے وہ پک اپ بھی اندر آ گئی۔ یہ بہت وسیع و عریض احاطہ تھا۔ کئی ایکڑ رقبہ اُونچی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا۔ اندر کی طرف چار دیواری کے ساتھ ساتھ ناریل کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ احاطے کے اندر بھی جگہ جگہ ناریل کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ بہت بڑے حصے میں سرسبز اور دبیز گھاس لگی ہوئی تھی۔ احاطے کے ایک طرف حجرہ نما کئی کمرے تھے جبکہ دوسری طرف ایک بنگلہ نما خوبصورت عمارت تھی۔

پجیرو اُس بنگلے کے سامنے رُک گئی جبکہ پک اپ دوسری طرف کمروں کے سامنے ایک جگہ رُکی تھی۔ ہم پجیرو سے نیچے اُترے تو تین آدمی برآمدے میں نمودار ہوئے اور اُنہوں نے آگے بڑھ کر بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔

یہ انکشاف میرے لئے خاصا دلچسپ ثابت ہوا کہ یہ دینی مدرسہ تھا۔ یہاں دینی تعلیم کے ساتھ جہاد کی تبلیغ بھی ہوتی تھی۔ یہاں تقریباً پچاس طالب علم ان حجروں میں اقامت پذیر تھے جبکہ دن کے وقت شہر کے مختلف علاقوں سے بڑی تعداد میں طلباء یہاں آتے تھے۔ مولوی برکت اللہ اس مدرسے کا مہتمم تھا۔ وہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ اسی احاطے میں رہائش پذیر تھا۔ اُس کی رہائش گاہ اسی بنگلہ نما عمارت کے پچھلی طرف ایک احاطے کی عقبی چار دیواری کے قریب ایک کشادہ مکان میں تھی۔ پانچ چھ فٹ اُونچی ایک دیوار اُٹھا کر اُس کا صحن بالکل الگ کر دیا گیا تھا۔ کلپنا کو فوراً ہی اُس مکان میں خواتین کے پاس بھیج دیا گیا اور ہم بنگلے کے ایک وسیع کمرے میں آ گئے جہاں فرش پر سینتھیٹک قالین بچھا ہوا تھا اور گاؤ تکیے بھی رکھے ہوئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے سامنے چائے کی پیالیاں رکھ دی گئیں اور گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ غازی عبدالحق کے کہنے کے مطابق انہیں کراچی میری آمد کا اُسی روز پتہ چل گیا تھا جب میں ہندوستان کی سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہوا تھا اور اُس سے اگلے روز وڈیرہ نوازش علی کے ساتھ کراچی پہنچا تھا۔ مولوی برکت علی نے اُسی رات کشمیر میں میرے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔ وہ مجھ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا لیکن ہماری پارٹی کی ہائی کمان نے اُسے روک دیا تھا اور مجھ سے دُور رہنے کی ہدایت کی تھی۔ اس کے دو دن بعد ٹی وی پر میرا انٹرویو نشر ہوا تھا۔

غازی عبدالحق کے کہنے کے مطابق ہماری پارٹی کی کمان اس وقت کمانڈر رگلریز کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اگرچہ بہت جوشیلا نوجوان تھا لیکن بڑی سمجھداری سے کام لے رہا تھا۔ اُس نے بھارتی فوج کو کشمیر میں کئی محاذوں پر لوہے کے چنے چبوا دیئے تھے۔ وہ چھلاوے کے نام سے مشہور ہو

گیا تھا۔ ایک رات سرینگر میں کوئی چھاپہ مار کارروائی کرتا تو صبح باندی پورہ میں اُس کی موجودگی کی اطلاع ملتی۔

میری عدم موجودگی میں کشمیر میں آزادی کی تحریک میں بڑے نشیب و فراز آئے تھے۔ ہمارے کئی پرانے مجاہدین اپنی سرزمین کی حرمت پر قربان ہو چکے تھے۔ لاتعداد نئے پُرجوش اور ولولہ انگیز نوجوان تحریک میں شامل ہو کر بھارتی فوجیوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے ہوئے تھے۔

غازی عبدالحق کے کہنے کے مطابق کشمیر میں مجاہدین کی تین چار تنظیمیں مل کر ایک بڑی کارروائی کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔ اور اس کے لئے اُنہیں چند ایسے نوجوانوں کی ضرورت تھی جو وادی سے باہر رہ کر اس منصوبے پر کام کر سکیں۔ اس سلسلے میں میرا نام بھی اُن کے سامنے تھا۔ لیکن وہ لوگ ابھی اس منصوبے کو حتمی نہیں دے پائے تھے کہ اُنہیں وڈیرہ نوازش علی کی کوٹھی پر راکٹوں سے حملے کی اطلاع ملی۔ میں اس حملے میں بچ گیا تھا اور پولیس کی ایک پارٹی میری حفاظت پر معمور کر دی گئی تھی۔ لیکن مولوی برکت اللہ نے بھی اپنے آدمیوں کے ذریعے خفیہ طور پر میری نگرانی شروع کرا دی تھی۔

ادھر سرینگر میں ہماری ہائی کمان نے بھی اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اسلحہ اور گولہ بارود کی ضرورت تھی۔ روس کے شکنجے سے آزاد ہونے والی وسطی ایشیائی اسلامی ریاستوں میں اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ان ریاستوں کو اپنی اقتصادی اور مالی حالت کو سہارا دینے کے لئے سرمائے کی ضرورت تھی اور بعض ریاستیں یہ اسلحہ فروخت کر کے مختلف ممالک سے سرمایہ اور ضرورت کی چیزیں حاصل کر رہی تھیں۔

ہماری ہائی کمان نے بھی ایسی ہی ایک وسط ایشیائی ریاست سے اسلحہ اور گولہ بارود کا بندوبست کر لیا تھا اور اس گولہ بارود کو کشمیر تک پہنچانے کے لئے کم از کم دو ایسے آدمیوں کی ضرورت تھی جو وادی کے چپے چپے سے واقف ہوں اور ہوائی جہاز میں اس علاقے کی نشاندہی کر سکیں جہاں اسلحہ گرایا جانا تھا۔ اس مقصد کے لئے میرا اور ترمیز نامی ایک نوجوان کا انتخاب کیا گیا تھا۔ ترمیز ان دنوں بارہ مولا میں تھا۔ اُسے اطلاع بھجوا دی گئی تھی کہ وہ آزاد کشمیر کی طرف سے ہوتا ہوا کراچی پہنچ جائے۔

غازی عبدالحق مجھ سے رابطے کے لئے خود کراچی آ گیا تھا اور اُس نے مجھ سے رابطہ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اور اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھا اس منصوبے کی تفصیلات بیان کر رہا تھا۔ منصوبہ بڑا خوفناک تھا۔ غازی عبدالحق کی اطلاع کے مطابق بھارت کارگل کی طرف سے پاکستانی علاقے میں واقع چند ایسی پہاڑی چوٹیوں پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا جو دفاعی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔ ان چوٹیوں پر قبضہ کر کے پاکستان کو اس طرف سے مفلوج

کیا جا سکتا تھا۔ پاکستان بھی بھارت کے اس منصوبے سے بے خبر نہیں تھا اُس نے بھی کارگل کے دوسری طرف اپنے علاقے میں دفاعی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

سرینگر سے کارگل پہنچنے کا واحد راستہ وہ ہائی وے تھا جو درّہ زوجی لا، دراس اور لداخ سے ہوتا ہوا کارگل تک پہنچتا تھا۔ ہمارے مجاہدین کا منصوبہ یہ تھا کہ بھارت جیسے ہی کارگل کی طرف اپنی کارروائی شروع کرے اُس ہائی وے کو بلاک کر کے اُس کی سپلائی لائن کاٹ دی جائے اور اس سے پہلے مجاہدین کی ایک بڑی تعداد لداخ سے آگے پہنچا دی جائے تا کہ بھارتی فوج کے لئے زیادہ سے زیادہ مشکلات پیدا کی جا سکیں۔

ہائی کمان نے منصوبے کی منظوری دے دی تھی۔ اسلحہ لانے کے لئے ایک چھوٹے طیارے کا بھی بندوبست ہو چکا تھا جس کا پائلٹ ایک اطالوی تھا۔ اُس کا تعلق اٹلی کے ایک ایسے گروہ سے تھا جو دنیا بھر کے چھوٹے ممالک کو اُن کی ضرورت کے مطابق اسلحہ اور گولہ بارود سپلائی کرتا تھا۔ ہماری تنظیم کے لئے بھی اسلحہ کا بندوبست اُسی گروہ نے کیا تھا۔

منصوبہ اگرچہ بڑا خوفناک تھا۔ اُس کی کامیابی سے بھارت کی کمر ٹوٹ سکتی تھی۔ اُس کے فوجی بڑی تعداد میں مجاہدین کے گھیرے میں آ جاتے تو مجاہدین بھارتی حکمرانوں سے اپنی بات منوا سکتے تھے اور بھارت کو یقیناً اُن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑتے۔

ہم رات کو دیر تک بیٹھے اس منصوبے کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ مجھے کلپنا کی بھی پریشانی تھی۔ میں نے جب غازی عبدالحق سے اس کا ذکر کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اس کی تمہیں فکر نہیں کرنی چاہئے..... وہ یہیں رہے گی مولوی برکت اللہ کی فیملی کے ساتھ۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''سونا مارگ کے قریب مقررہ مقام پر اسلحہ گرانے کے بعد تمہارا جہاز واپس چلا جائے گا اور اس کے بعد تم کراچی واپس آ جاؤ گے۔ اس کے بعد صورتحال بڑی حد تک تبدیل ہو چکی ہو گی۔ تم اگر چاہو تو یہاں رہ کر بھی تحریک کے لئے خدمات انجام دے سکو گے۔''

اگلے روز میں نے کلپنا سے اس منصوبے کا ذکر کیا تو وہ پریشان ہو گئی۔

''کیا تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟'' اُس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''مجبوری ہے.....'' میں نے کہا۔ ''تم جانتی ہو میں نے اپنی زندگی اپنے وطن کی آزادی کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ میں کشمیر سے باہر بھی رہا تو اپنے کاز کے لئے کام کرتا رہا۔ اور اب مجھے ایک اور موقع مل رہا ہے۔ مجھے اپنے مشن کی کامیابی کے لئے تمہاری دُعاؤں کی ضرورت ہے۔ میں واپس آؤں گا۔ اور پھر ہم دونوں.....''

''کیا میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی؟'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔

''نہیں.....'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر کوئی زمینی مشن ہوتا تو میں تمہیں کبھی بھی یہاں نہ چھوڑتا۔ لیکن مجبوری ہے۔''

اُس روز شام سے ذرا پہلے ایک فوٹو گرافر میری تصویریں کھینچ کر لے گیا۔ اس کے اگلے روز ترمیز بھی کراچی پہنچ گیا۔ وہ بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ملا۔ ہم کشمیر میں کئی معرکوں میں اکٹھے رہ چکے تھے۔

ایک ہفتے میں ہمارے پاسپورٹ تیار ہو گئے اور ویزے بھی لگ گئے۔ ہماری تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ہمیں ہر طرح کی بریفنگ دی جا چکی تھی۔ اور جب میں کلپنا سے مل کر رخصت ہونے لگا تو وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے میری آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں..... میرے دل میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ میرے اس مشن کا انجام نجانے کیا ہو..... میں زندہ واپس آتا بھی ہوں یا نہیں۔ میرے بعد کلپنا کا کیا ہو گا؟

میں یہ سب کچھ سوچتا ہوا کلپنا سے رخصت ہو گیا.....

جہاز نے ٹیک آف کیا تو میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں زندگی میں پہلی مرتبہ ہوائی جہاز میں بیٹھا تھا۔ میں دیر تک آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا اور اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پرواز ہموار ہوئی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

ہماری منزل الماتا تھی۔ ایئر پورٹ پر دو آدمی ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ ہم رات نو بجے کے قریب الماتا پہنچے تھے۔ وہ دونوں ہمیں شہر کے نواح میں واقع ایک مکان میں لے گئے۔ پہلے کھانا اور پھر اس کے بعد سبز قہوے سے ہماری تواضع کی گئی۔

''اب تم لوگ آرام کرو! ہم صبح چھ بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔'' اُن دونوں میں سے ایک نے کہا اور وہ ہم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

اس مکان میں صرف ایک بوڑھا رہ گیا تھا۔ اُس کی عمر ستر سے کچھ اُوپر ہی رہی ہو گی۔ چہرے پر جھریوں نے مکڑی کا جالا سا تان رکھا تھا۔ بوڑھے نے ہمیں صبح پانچ بجے جگا دیا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو اطراف کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ مکان ایک چھوٹی سی پہاڑی پر تھا۔ چاروں طرف اُونچے درخت اور سبزہ تھا۔ دُور پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں تھیں۔ مجھے کشمیر کی وادی یاد آ گئی..... ایسے حسین مناظر وہیں دیکھے جا سکتے تھے۔

ہم ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر تیار ہو گئے۔ ہمارے دونوں میزبان ٹھیک چھ بجے پہنچ گئے اور ہم بوڑھے سے رخصت ہو کر اُن کے ساتھ کھلی چھت والی جیپ پر سوار ہو گئے۔ پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک اگرچہ پختہ تھی لیکن بعض مقامات پر نہایت خطرناک موڑ اور گھاٹیاں تھیں۔ اس لئے جیپ کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ ہمارا سفر تقریباً دن بھر جاری رہا۔ ہم فردنزے، اندژان اور قوقند سے ہوتے ہوئے بالآخر شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد مرغاب پہنچ گئے۔

مرغاب کو شہر نہیں ایک بڑا قصبہ کہا جا سکتا تھا۔ اُس کی آبادی سرسبز پہاڑیوں پر اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھی۔ ہماری جیپ شہر کے مرکزی بازار سے ہوتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی اور

بالآخر ایک بہت بڑی حویلی میں داخل ہو کر رُک گئی۔ اُس حویلی کی دیواریں کسی قلعے کی فصیل کی طرح بہت مضبوط اور اُونچی تھیں۔ چاروں کونوں پر واچ ٹاورز کی طرح برج بنے ہوئے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہاں کسی زمانے میں قبیلے کے سردار کی رہائش ہوا کرتی تھی۔ جب کمیونزم کا تسلط ہوا تو اس حویلی پر حکومت نے قبضہ کر لیا اور سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد یہ ریاست آزاد ہوئی تو یہ حویلی اس علاقے کے ایک بااثر آدمی کے قبضے میں آ گئی۔

حویلی کی عمارت بہت شاندار تھی۔ اُس میں کئی کمرے تھے۔ یہاں تین آدمی پہلے سے موجود تھے۔ ہم دن بھر کے سفر سے بری طرح تھک گئے تھے۔ گرم گرم قہوے سے ہماری تواضع کی گئی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم جلد ہی سو گئے۔

صبح سات بجے میں بیدار ہو گیا۔ ترمیز ابھی تک سو رہا تھا۔ میں حویلی کی عمارت سے نکل کر لان میں آ گیا۔ بڑی دبیز اور ملائم گھاس تھی۔ کئی اقسام کے پھولوں کے پودے تھے۔ ایک طرف گلاب کے پھولوں کا تختہ تھا۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ گلاب کے اتنے حسین پھول میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ یہ حویلی بھی کسی قدر بلندی پر تھی۔ اطراف میں دُور دُور تک بلند پہاڑوں کی چوٹیاں تھیں۔ بعض چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور صبح کی نرم دُھوپ میں برف اس طرح چمک رہی تھی کہ ان پر نگاہ ٹکانا مشکل ہو رہا تھا۔

ہمارے دونوں میزبان بھی رات اُسی حویلی میں رہے تھے۔ نو بجے کے قریب ہم سب نے ناشتہ کیا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دو اور آدمی وہاں پہنچ گئے۔ اُن میں ایک بہت ہی بارُعب شخصیت کا مالک تھا وہ ناصر تھا۔

ہمیں ایک بہت بڑے کمرے میں لے جایا گیا اور اُس کمرے کو دیکھ کر میری آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں..... یہاں ہر قسم کے اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ناصر ہی وہ شخص تھا جس نے یہاں ہمارے لئے اسلحہ کا بندوبست کیا تھا۔ اُس نے ہمیں اسلحہ کی دو پیٹیاں بھی دکھائیں جو ہمیں لے جانی تھیں۔ اُن میں آٹومیٹک رائفلیں، مارٹر گنیں، لائٹ مشین گنیں، اینٹی ایئر کرافٹ گنیں، راکٹ لانچر، لاتعداد راکٹ، مارٹر گنوں کے گولے اور بڑی مقدار میں ایمونیشن شامل تھا۔

حویلی کے دوسرے کمروں میں بھی اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگے ہوئے تھے۔ شام سے ذرا پہلے اسلحہ کی کچھ پیٹیاں ایک ٹرک پر لاد کر کسی طرف روانہ کر دی گئیں اور اس کے ایک گھنٹے بعد ہم بھی جیپ پر روانہ ہو گئے۔ آڑھے ترچھے بل کھاتے ہوئے پہاڑی راستوں پر ایک گھنٹے کا یہ سفر خاصا دُشوار ثابت ہوا تھا۔

ہماری منزل پہاڑیوں میں گھرا ہوا وہ چھوٹا سا میدان تھا جہاں ڈکوٹا قسم کا ایک طیارہ بھی کھڑا تھا۔ دراز قامت ناصر اور ایک اور آدمی پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے۔ اسلحہ کی پیٹیاں جہاز پر لادی جا چکی تھیں۔ جہاز کا پائلٹ ایک نوجوان اطالوی تھا۔ سلوانو اس قسم کے کئی خطرناک

مشن انجام دے چکا تھا۔ اُسے ایسے کاموں کا خاصا تجربہ تھا۔

میدان میں دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی عمارت بھی تھی اور ناصر اُس عمارت کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے پرانی سی میز پر ایک طاقتور ٹرانسمیٹر رکھا ہوا تھا۔ دس بجے کے قریب اُس ٹرانسمیٹر پر سگنل موصول ہوا۔ ناصر نے کال ریسیو کی، چند منٹ تک بات کرتا رہا پھر ٹرانسمیٹر بند کر کے اُٹھ گیا۔

''کلیرنس سگنل مل گیا ہے.... اب تم لوگ روانہ ہو جاؤ!'' وہ ہمیں اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

ہم عمارت کے سامنے کھڑے ہوئے جہاز کے قریب آ گئے۔ جہاز میں پائلٹ کی سیٹ کے پیچھے صرف دو سیٹیں تھیں۔ باقی حصے میں اسلحہ اور گولہ بارود کی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے بیٹھتے ہی پائلٹ سلوانو نے بھی اپنی سیٹ سنبھال لی۔

''اُوپر ریک پر پیراشوٹ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ باندھ لو!'' اُس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم نے پیراشوٹ اُتار لئے۔ سلوانو کو اپنی سیٹ سے اُٹھنا پڑا۔ پیراشوٹ باندھ کر اُس نے ہمیں سمجھا دیا کہ ضرورت پڑنے پر انہیں کس طرح کھولا جا سکتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

وہ میدان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چاروں طرف پہاڑیاں تھیں۔ اور مجھے حیرت تھی کہ یہ طیارہ یہاں کس طرح اُترا ہو گا۔

انجن سٹارٹ ہوا اور طیارہ میدان میں دوڑنے لگا..... اُس کی رفتار بڑھتی گئی اور پھر وہ مینڈک کی طرح پھدک کر فضا میں بلند ہو گیا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... میرا خیال تھا کہ طیارہ کسی بھی وقت کسی پہاڑی سے ٹکرا جائے گا۔ لیکن سلوانو ماہر پائلٹ تھا وہ بڑی ہوشیاری سے طیارے کو اُوپر اُٹھاتے ہوئے پہاڑیوں کے اس حصار سے نکالتا ہوا لے گیا۔ فضا میں ایک دو چکر لگانے کے ساتھ طیارہ بدستور بلندی اختیار کرتا رہا اور بالآخر اُس کا رُخ پامیر کے بلند سلسلہ کوہ کی طرف مُڑ گیا۔

ہم پامیر کی پچیس ہزار فٹ بلند چوٹی پار کر کے پاکستان کی فضائی پٹی سے ہوتے ہوئے کشمیر کی فضا میں آ گئے تھے۔ ہمیں زمین پر اُس جگہ کی تلاش تھی جہاں ہمیں اسلحہ کی پیٹیاں گرانی تھیں۔ پیٹیوں کے ساتھ پیراشوٹ لگے ہوئے تھے اس لئے پیٹیوں کے زمین پر گر کر ٹوٹنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ہمیں زمین سے روشنی کے مخصوص سگنلز کی تلاش تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم اپنی منزل کا سراغ لگاتے ہمارا طیارہ ایئر پاکٹ میں پھنس گیا..... ہوا کے قیامت خیز جھونکے طیارے کو اُس کے راستے سے ہٹا کر کسی اور طرف لے گئے۔ نوجوان پائلٹ سلوانو طیارے کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن جہاز اُس کے قابو میں نہیں رہا تھا۔ ہمارے دونوں طرف چٹانیں تھیں اور خطرہ تھا کہ جہاز کسی بھی وقت کسی چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے گا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا..... جہاز تیزی سے ایک طرف جھک رہا تھا۔ کڑک کی ایک خوفناک آواز کے ساتھ جہاز کا دروازہ ٹوٹ گیا اور اسلحے کی بھاری پیٹیاں اِدھر اُدھر لڑھکنے لگیں..... اور پھر وہ پیٹیاں ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر گرنے لگیں۔ جہاز کا توازن بگڑ چکا تھا اور وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اِدھر اُدھر غوطے کھا رہا تھا.....

''اب جہاز کو بچانا ممکن نہیں۔'' سلوانو نے چیخ کر کہا۔ ''چھلانگ لگا دو..... ہری اپ! ورنہ جہاز کے ساتھ ہم سب کے بھی ٹکڑے ہو جائیں گے۔''

میں نے ترمیز کی طرف دیکھا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ہم دونوں تیزی سے جہاز کے پچھلے حصے کی طرف لپکے۔ اُسی وقت کڑکڑاہٹ کی ایک اور زوردار آواز سنائی دی..... دروازے کے قریب جہاز کا فرش اس طرح ٹوٹ رہا تھا جیسے زلزلے سے زمین پھٹ رہی ہو۔

اسلحے کی ساری پیٹیاں غائب ہو چکی تھیں۔ صرف دو پیٹیاں ایسی تھیں جو دروازے کے بالکل قریب پڑی تھیں۔ جہاز کو ایک جھٹکا لگا اور وہ دونوں پیٹیاں بھی دروازے سے نکل کر تاریک خلا میں غائب ہو گئیں..... میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مجھے چھلانگ لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے جیسے ہی راڈ کو چھوڑا خود بخود پھسلتا ہوا دروازے سے باہر گرا اور ہوا میں قلابازیاں کھانے لگا.....

جہاز سے گرنے کے بعد میں زمین تک کس طرح پہنچا تھا اس کی تفصیل آپ میری اس کہانی کے شروع میں پڑھ چکے ہیں۔ یہاں میں انہیں دُہرانا ضروری نہیں سمجھتا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اسلحہ کی پیٹیاں کس جگہ گری تھیں؟ ترمیز کہاں تھا اور میں کہاں ہوں؟ لیکن سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ ہمارا مشن ناکام ہو گیا تھا اور کروڑوں ڈالر مالیت کا وہ اسلحہ اور گولہ بارود بھارتی درندہ صفت فوجیوں سے برسرِ پیکار مجاہدین تک پہنچنے کی بجائے ضائع ہو گیا تھا۔

اس مشن کی ناکامی سے جہاں ایک طرف بھاری مالی نقصان ہوا تھا وہاں مجاہدین کی سرگرمیاں بھی متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ یہاں سے بچ کر کسی محفوظ جگہ تک پہنچ سکتا ہوں یا ان پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا؟

پیراشوٹ سے اُترتے ہوئے میں نے دُور کسی بستی کی روشنیاں دیکھی تھیں۔ اس بستی والوں نے جہاز کی آواز سنی ہو گی اور جہاز کو گر کر تباہ ہوتے بھی دیکھا ہو گا۔ اگر وہ کوئی عام بستی تھی تو ممکن ہے کسی نے توجہ نہ دی ہو لیکن اگر وہ کوئی فوجی کیمپ تھا تو اُنہیں ضرور تشویش ہوئی ہو گی۔ رات کے وقت وادیٔ کشمیر کے کسی بھی حصے میں کسی ہوائی جہاز کے آنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ دہلی پٹھان کوٹ سے سرینگر کے لئے انڈین ایئر لائن کی پرواز دن کے وقت آتی تھی اور یہی پرواز کارگل اور لیہہ کا چکر بھی لگاتی تھی۔ لیکن رات کے وقت تو کسی پرواز کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ روشنیاں کسی فوجی کیمپ کی تھیں تو ممکن ہے کوئی پارٹی تباہ ہونے والے جہاز کی تلاش میں روانہ ہو چکی ہو یا روانہ ہونے والی ہو.....

میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کر پہاڑی پر چڑھتا چلا گیا۔ ایک جگہ رُک کر نشیب میں دیکھنے لگا۔ لیکن ظاہر ہے تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ترمیز کا نام لے کر پکارنے لگا۔ میری آواز پہاڑوں میں بازگشت پیدا کرتی رہی لیکن جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ ترمیز شاید مجھ سے بہت دُور نکل گیا تھا۔ میں دوسری طرف نشیب میں اُترنے لگا۔

دو گھنٹوں تک چلتے رہنے کے بعد میں رُک گیا۔ اس طرح تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا اس لئے میں نے دن کی روشنی پھیلنے کا انتظار کرنا مناسب سمجھا اور ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

میرے چاروں طرف سناٹا تھا۔ اس سناٹے میں جھینگروں اور دیگر حشرات الارض کی آوازیں بڑا خوفناک تاثر دے رہی تھیں۔ میں پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا صورتحال پر غور کرتا رہا۔ اسلحہ اور گولہ بارود کے اس نقصان سے اس علاقے میں مجاہدین کی سرگرمیاں متاثر ہو سکتی تھیں اور عین ممکن ہے ہماری ہائی کمان کا وہ منصوبہ بھی ناکام ہو جائے جس کے لئے اتنی محنت کی گئی تھی۔ کراچی میں غازی عبدالحق نے بتایا تھا کہ محبِ وطن کشمیریوں کی اوورسیز انجمن نے یورپ میں آباد کشمیریوں سے چندہ جمع کر کے کروڑوں ڈالر مالیت کا یہ اسلحہ خریدا تھا جو اس طرح ضائع ہو گیا تھا۔

میں پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا یہی کچھ سوچتا رہا اور پھر میری آنکھ لگ گئی.....!

تیز روشنی سے میری آنکھ کھل گئی..... سورج طلوع ہو چکا تھا اور چمکتی ہوئی تیز دُھوپ براہِ راست میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ میں کچھ دیر اپنی جگہ پر بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔

پہاڑیاں زیادہ تر بنجر اور ویران تھیں۔ چھوٹی جھاڑیاں تو بکثرت تھیں لیکن بڑے پودے اور درخت کہیں کہیں نظر آ رہے تھے۔ نشیب میں ایک چشمے کے کنارے میں رُک گیا۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر چند گھونٹ پانی پیا اور ایک بار پھر کسی بستی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

ہر طرف بنجر ویرانہ تھا۔ میں دوپہر تک پہاڑیوں پر گھومتا رہا لیکن نہ تو کوئی بستی دکھائی دی نہ ہی ترمیز ملا اور نہ ہی کسی جگہ تباہ شدہ جہاز کا ملبہ دکھائی دیا۔ پائلٹ سلوانو کے بارے میں میرا خیال تھا کہ اُس نے بھی جہاز سے چھلانگ لگا دی تھی لیکن وہ بھی کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

اس بنجر اور ویران پہاڑی علاقے کو دیکھ کر میرا اندازہ تھا کہ میں درّہ زوجی لا سے آگے لداخ کی طرف کسی جگہ نکل آیا ہوں اور اسلحہ کی پیٹیاں پتہ نہیں کس علاقے میں گری تھیں۔

ایک تنگ سی پہاڑی میں ایک چٹان نما پتھر کے دوسری طرف آتے ہی میں ٹھٹھک کر رُک گیا۔ وہ منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... پیراشوٹ اُونچی جگہ پر جھاڑیوں میں

پھنسا ہوا تھا اور قریب ہی پائلٹ سلوانو پتھروں پر اوندھا پڑا ہوا تھا..... میں دوڑ کر سلوانو کے قریب پہنچ گیا اور اُس پر جھکتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں تھا..... اُس کا سر پھٹا ہوا تھا اور خون بہہ کر جم چکا تھا۔ پیراشوٹ کی ڈوریاں اُس کے پیروں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ نیچے آتے ہوئے پیراشوٹ کی ڈوری اُس کے پیروں سے لپٹ گئی تھی اور وہ سر کے بل پتھروں پر گرا تھا اور اُس کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی تھی.....

میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور پھر آگے چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ تباہ شدہ جہاز کا ملبہ بھی آس پاس ہی کہیں ہو گا لیکن دُور دُور تک کسی ایسی چیز کا سراغ نہیں ملا۔ بھوک اور پیاس سے میری بری حالت ہو رہی تھی۔ تھکن سے نڈھال ہو کر میں ایک جگہ پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور فوراً ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں.....!

پتہ نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور دوسرے ہی لمحہ میں اُچھل پڑا..... تین رائفلیں میری طرف اُٹھی ہوئی تھیں..... اور میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا تھا۔

تیز دُھوپ کی چمک سے میری آنکھوں میں چکا چوندسی ہو رہی تھی۔ میرے سامنے تین آدمی تھے جو میری طرف رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ دُھوپ کی چمک کی وجہ سے اُن کے چہرے تو صاف نظر نہیں آ رہے تھے البتہ اُن کے جسموں پر فوجی وردیاں نہیں تھیں اور یہی بات میرے لئے اطمینان کا باعث بنی تھی۔

میں نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔ میں اس وقت پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز پڑا ہوا تھا۔ سیدھا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی تو ایک خوفناک غراہٹ میری سماعت سے ٹکرائی۔

''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا..... ورنہ گولی مار دُوں گا۔''

میں پھر بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا۔ چند سیکنڈ گزر گئے۔ اور پھر اُس آدمی نے مجھے اُٹھنے کا حکم دیا لیکن ساتھ ہی یہ وارننگ بھی دے دی کہ اگر میں نے کوئی غلط حرکت کی تو نتیجہ میرے حق میں نہیں نکلے گا۔

میں محتاط انداز میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ لوگ میرے وطن کے مجاہدین ہی تھے..... لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی اُبھرا تھا۔ پہاڑوں میں مجاہدین کے خفیہ ٹھکانوں کا سراغ لگانے کے لئے بھارتی فوج کے انٹیلی جنس والے بھی مجاہدین کے بھیس میں پہاڑوں میں گھومتے رہتے تھے اور اگر یہ واقعی مجاہدین تھے تو میرے بارے میں اُن کے ذہن میں بھی شاید ایسا ہی کوئی خیال ہو گا۔

''عباسی..... تلاشی لو اس کی۔'' اس شخص نے اپنے کسی ساتھی کو حکم دیا۔

میں اُس وقت چٹان کی طرف رُخ کئے ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھائے کھڑا تھا۔ ایک آدمی آگے بڑھ کر میرے لباس کو تھپتھپانے لگا۔ اور پھر اُس نے میری جیب سے پستول نکال لیا۔ اُس وقت

کہیں دُور سے ایک آواز سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا عباسی کا نام لے کر پکار رہا تھا۔

''ہم یہاں ہیں..... ادھر آ جاؤ مہر ولی!'' اُس شخص نے چیخ کر جواب دیا جس نے میری تلاشی لی تھی۔

دو تین منٹ گزر گئے۔ پھر پتھروں پر چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کم از کم دو آدمی تھے۔ وہ ہمارے قریب آ کر رُک گئے۔ اور پھر ایک آواز سن کر میں اُچھل پڑا.....

''یہ کون ہے؟''..... یہ آواز شناخت کرنے میں مجھے کوئی دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔

''یہاں سو رہا تھا..... میرا خیال ہے انٹیلی جنس کا کوئی آدمی ہے۔'' یہ اُس شخص کی آواز تھی جس نے مجھے شروع میں وارننگ دی تھی۔ پھر اُس نے مجھے اپنی طرف مُڑنے کا حکم دیا۔

میں بڑے اطمینان سے پیچھے گھوم گیا۔ اُس نئی آواز کے بارے میں میرے ذہن میں جو خیال اُبھرا تھا وہ درست نکلا۔ وہ کمانڈر عثمان تھا..... ہم طویل عرصے تک ساتھ رہے تھے۔ اننت ناگ کے قریب ہم دونوں نے مشترکہ کارروائی کر کے ایک بہت بڑا فوجی کیمپ بھی تباہ کیا تھا۔

کمانڈر عثمان چند لمحے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر چیختا ہوا والہانہ انداز میں دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا.....

''شمروز..... میرے دوست..... تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ کیا یہ واقعی تم ہو؟''

''تمہیں اپنی آنکھوں پر یقین کر لینا چاہئے۔'' میں نے جواب دیا۔ صورتحال بدل گئی تھی۔ میری طرف تنی ہوئی رائفلیں ہٹ گئی تھیں۔ وہ سب باری باری مجھ سے گلے مل رہے تھے۔

''آؤ..... ادھر سائے میں بیٹھتے ہیں۔'' کمانڈر عثمان نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں مجھے تقریباً سو گز کے فاصلے پر چند درخت نظر آ رہے تھے۔

ہم درختوں کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ کمانڈر عثمان کے ایک ساتھی نے کندھے پر لٹکی ہوئی چھاگل اُتار کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے پانی کے دو تین گھونٹ پیئے اور چھاگل دوسرے کی طرف بڑھا دی۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ اور جب اُنہیں یہ پتہ چلا کہ میں بھوکا ہوں تو ایک مجاہد نے اپنے لباس کے اندر سے ایک تھیلی نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ اُس میں کوئی پاؤ بھر بھنے ہوئے چنے ہوں گے جن میں گڑ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ملے ہوئے تھے۔ کشمیر کی آزادی کے لئے لڑنے والے حریت پسندوں کی یہی خوراک تھی۔ اور کبھی تو کئی کئی روز فاقوں میں گزارنے پڑتے تھے۔ ہماری زندگی آبادیوں سے دُور جنگلوں اور پہاڑوں میں گزر رہی تھی۔ کبھی کسی آبادی میں جانے کا اتفاق ہوتا تو کوئی اچھی چیز کھانے کو مل جاتی تھی۔

میں نے ایک مٹھی چنے کھائے اور ایک دو گھونٹ پانی پی کر رب کا شکر ادا کیا۔

کمانڈر عثمان کی باتوں سے یہ انکشاف ہوا کہ ان لوگوں کو اسلحہ لے کر آنے والے ایک جہاز کے بارے میں اطلاع ملی تھی۔ مجاہدین کی کئی پارٹیاں سونا مارگ کے آس پاس کی پہاڑیوں پر پھیلا دی گئی تھیں تا کہ اگر غلطی سے جہاز سے اسلحہ کی پیٹیاں کسی اور جگہ گرا دی جائیں تو اُنہیں تلاش کر کے قبضے میں لیا جا سکے۔ اُنہوں نے جہاز کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجاہدین کی دو تین پارٹیاں اُس طرف روانہ ہو گئی تھیں۔ وہ لوگ پوری رات اور پھر پورا دن پہاڑوں میں سفر کرتے رہے۔ اُنہیں اسلحہ کی چند پیٹیاں مل گئی تھیں جنہیں محفوظ مقام پر پہنچا دیا گیا تھا اور اب وہ لوگ پہاڑوں میں مزید پیٹیاں تلاش کر رہے تھے کہ میں نظر آ گیا۔

اُنہیں سلوانو کی لاش بھی مل گئی تھی اور ایک جگہ جہاز کا ملبہ بھی مل گیا تھا لیکن اسلحہ کی مزید پیٹیاں نہیں ملی تھیں۔ اور پھر باتوں میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ ہم اس وقت درّہ زوجی لا کے آس پاس موجود ہیں اور ہائی وے ہم سے چند میل سے زیادہ دُور نہیں جو دراس، لیہہ اور لداخ سے ہوتی ہوئی کارگل کی طرف جاتی ہے۔

کمانڈر عثمان کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ ہائی کمان سے اُن کا ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم ہے۔ ہائی کمان کو اسلحہ کی پیٹیوں کی بازیابی کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ بیشتر گولا بارود ضائع ہو جانے کے باوجود ہائی کمان کے منصوبے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور مجاہدین کی مختلف پارٹیوں کو دو دن کے اندر اندر دراس کے قرب و جوار میں جمع ہونے کا حکم دے دیا گیا تھا۔

رات ہم نے اُنہی پہاڑوں پر گزاری اور صبح ہوتے ہی روانہ ہو گئے۔ ہماری منزل وہاں سے میلوں دُور وہ غار تھا جہاں کمانڈر عثمان کی پارٹی نے اپنا عارضی ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ اسلحہ کی دستیاب ہونے والی پیٹیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ وہ چھ پیٹیاں تھیں۔ کچھ مجاہدین اس طرف بھی آس پاس کے پہاڑوں میں گھومتے رہے لیکن مزید اسلحہ نہیں ملا اور نہ ہی ترمیز کا کوئی سراغ ملا۔ میرا خیال تھا کہ یا تو وہ کسی اور طرف نکل گیا تھا یا وہ بھی جہاز کے پائلٹ سوانو کی طرح.....

کمانڈر عثمان کے ساتھ بائیس آدمی تھے۔ ہم لوگ اگلے روز صبح سویرے ہی دراس کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسلحہ کی پیٹیاں اگرچہ خاصی وزنی تھیں لیکن مجاہدین نے اُنہیں پھولوں کے ٹوکروں کی طرح اُٹھا رکھا تھا۔ اسلحہ اور گولہ بارود ہمارے لئے خوراک سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اس لئے اس کے وزن کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

ہم لوگ ہائی وے سے دُور رہ کر سفر کر رہے تھے۔ ہائی وے کے آس پاس رہنے سے کسی جگہ بھارتی فوجیوں سے بھی تصادم کا اندیشہ تھا۔

پورا دن اور اس کے بعد نصف رات تک سفر کرنے کے بعد ہم نے ایک غار میں پڑاؤ ڈال دیا۔ وہاں چند مجاہدین پہلے سے موجود تھے جن سے پتہ چلا کہ مجاہدین کی دوسری پارٹیاں بھی قرب و جوار میں پہنچنا شروع ہو گئی ہیں۔ پہاڑوں میں پورا دن اور آدھی رات تک کا سفر اگرچہ تھکا دینے والا تھا لیکن مجاہدین ان مشکلوں اور تکلیفوں کے عادی ہو چکے تھے۔

اس کیمپ میں پہلے سے موجود مجاہدین کے پاس کھانے پینے کا سامان بھی موجود تھا۔ اُنہوں نے قہوے سے ہماری تواضع کی۔ کچھ مجاہدین تو قہوہ پینے کے تھوڑی ہی دیر بعد سو گئے۔ میں، کمانڈر عثمان اور چند مجاہد ایک طرف بیٹھے صورتحال پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔

صبح سویرے دو اور مجاہدین وہاں پہنچ گئے۔ اُنہوں نے بتایا کہ بھارتی فوج کے ٹرکوں کے قافلے دراس کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی میں اور کمانڈر عثمان غار سے نکل کر اُن مجاہدین کے ساتھ پہاڑی کے اُوپر پہنچ گئے۔ وہاں سے تقریباً ڈیڑھ میل دُور نشیب میں ہائی وے نظر آ رہی تھی۔ کمانڈر عثمان دُوربین آنکھوں سے لگائے کچھ دیر اُس طرف دیکھتا رہا پھر اُس نے دُوربین میری طرف بڑھا دی۔ میں دُوربین آنکھوں سے لگا کر ہائی وے کی طرف دیکھنے لگا۔ اطلاع دینے والے مجاہدین کے مطابق بیس ٹرکوں پر مشتمل ایک قافلہ گزر چکا تھا۔ یہ دوسرا قافلہ تھا جس میں چوبیس ٹرک شامل تھے۔ میں کافی دیر تک اُس قافلے کو دیکھتا رہا پھر گہرا سانس لیتے ہوئے دُوربین کمانڈر عثمان کی طرف بڑھا دی۔

فوجی قافلہ پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ہم پہاڑی سے اُتر کر غار میں آ گئے۔ کمانڈر عثمان نے فوراً ہی ٹرانسمیٹر پر ہائی کمان سے رابطہ کیا اور اُن فوجی قافلوں کے بارے میں اطلاع دی۔

''ہمیں اطلاع مل چکی ہے۔'' دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔ ''ان قافلوں کو گزر جانے دیا جائے اور اُس وقت تک کوئی کارروائی نہ کی جائے جب تک ہائی کمان سے حکم نہ دیا جائے۔''

کمانڈر عثمان دیر تک باتیں کرتا رہا، پھر میری بات بھی کرائی گئی۔ اس وقت مجاہدین کی کئی تنظیموں نے ایک مشترکہ محاذ قائم کر رکھا تھا جس کا سپریم کمانڈر نورغنی تھا۔ اور اس وقت وہ خود ٹرانسمیٹر پر موجود تھا اور مجھے پہلی بار اُس سے براہِ راست بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ اُس نے میرے کام کی تعریف کی۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اسلحہ کی کچھ اور پیٹیاں بھی مل چکی ہیں، اور پھر یہ افسوس ناک اطلاع بھی دی کہ ترمیز بھی پہاڑوں میں زخمی حالت میں پڑا ہوا مل گیا تھا جسے محفوظ جگہ پر پہنچا دیا گیا ہے۔

سپریم کمانڈر نورغنی سے اس محاذ کے بارے میں تفصیل سے بات ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ کارگل کے محاذ پر بھارتی اور پاکستانی فوج میں گھمسان کی جنگ جاری ہے۔ بھارتی فوج پاکستانی علاقے میں گھس گئی تھی جہاں سے اُسے بھگا دیا گیا اور اب پاکستانی فوج بھارتی علاقے میں پیش قدمی کر رہی ہے۔ ٹائیگر ہل نامی پہاڑی چوٹی پر قبضے کے لئے دونوں فوجوں میں زبردست لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ پہاڑی چوٹی دفاعی اعتبار سے دونوں کے لئے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

اور پھر شام کو ہمیں ہائی کمان کی طرف سے اطلاع ملی کہ پاکستانی فوج نے ٹائیگر ہل پر قبضہ کر لیا ہے۔ بھارتی فوج پسپائی اختیار کر کے ٹائیگر ہل سے بہت دُور واپس آ چکی ہے۔ لیکن وہ

اس پہاڑی پر قبضہ کرنے کے لئے نئی حکمت عملی تیار کر رہے ہیں اور اس کے لئے سرینگر سے مزید کمک طلب کر لی گئی ہے۔

ہائی کمان کی طرف سے ہمیں حکم دیا گیا کہ اب ہم کسی فوجی قافلے کو دراس سے آگے نہ آنے دیں۔ اگر ہم اس ہائی وے پر بھارتی فوج کی سپلائی لائن کاٹنے میں کامیاب ہو گئے تو کارگل کے محاذ پر بھارتی فوج کے قدم مکمل طور پر اُکھڑ جائیں گے اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں شکست سے نہیں بچا سکے گی۔ اور یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ کارگل کے محاذ پر شکست کھانے کے بعد کشمیر کے دوسرے محاذوں پر بھی بھارتی فوج کے قدم اُکھڑنا شروع ہو جائیں گے۔

ہم درّہ زوجی لا اور اُس کے درمیانی علاقے میں تھے۔ یہ پورا علاقہ دونوں طرف سے مجاہدین کے گھیرے میں تھا۔ یہ وہ شہ رگ تھی جسے اگر کاٹ دیا جائے تو کارگل کی طرف موجود بھارتی فوجی اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ درّہ زوجی لا اور اُس کے آس پاس موجود تمام مجاہدین کو ہائی کمان کی طرف سے فوجی قافلوں کے خلاف کارروائی کے احکامات مل چکے تھے۔ مجاہدین کی تعداد اگرچہ کم تھی لیکن اُن کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔

ہم رات ہی کو غار سے نکل کر ہائی وے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمارے پاس اتنا اسلحہ اور گولہ بارود موجود تھا کہ ہم کئی روز تک بھارتی فوج کے قافلوں کو آگے جانے سے روک سکتے تھے۔ کمانڈر عثمان نے بارہ مجاہدین پر مشتمل ایک پارٹی کی کمان مجھے سونپ دی تھی۔ اس طرح تمام مجاہدین کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔

ہائی وے سے تقریباً سو گز دُور ہم نے پہاڑیوں میں پوزیشن سنبھال لی اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ کمانڈر عثمان نے ٹرانسمیٹر پر دوسرے کمانڈروں سے بھی رابطہ رکھا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا اور ہم صبح ہونے کا انتظار کرتے رہے..... رات کی تاریکی دم توڑنے لگی اور دن کا اُجالا پھیلنے لگا۔ سورج طلوع ہو گیا اور دُھوپ پھیلنے لگی۔ آٹھ بجے کے قریب ٹرانسمیٹر پر سگنل موصول ہوا۔ کمانڈر عثمان نے فوراً ہی کال ریسیو کی۔ مجاہدین کی ایک پارٹی سے اطلاع ملی کہ تقریباً چالیس ٹرکوں پر مشتمل ایک فوجی قافلہ درّہ زوجی لا میں داخل ہو رہا ہے۔ مجاہدین کی یہ پارٹی زوجی لا درّے کے دوسری طرف تھی اور فوجی قافلے کو اُس طرف سے گزر کر ہماری طرف آنا تھا۔ ہم سے آگے دراس کی طرف مجاہدین کی دوسری پارٹیاں بھی مورچے لگائے بیٹھی تھیں۔ ہمارے حملے کے بعد فوجی ٹرک اگر واپس جانے کی کوشش کرتے تو درّہ زوجی لا کے دوسری طرف موجود مجاہدین کی پارٹی اُن کا راستہ روک لیتی۔

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک گھنٹے بعد ایک جیپ نظر آئی جس پر آگے لائٹ مشین گن نصب تھی۔ اُس کے پیچھے ٹرکوں کی طویل قطار تھی۔ بعض ٹرکوں پر ترپال پڑے ہوئے تھے اور بعض میں فوجی بھرے ہوئے تھے۔ ایسے ٹرکوں پر سامنے اور دائیں بائیں لائٹ مشین گنیں بھی نصب تھیں..... ٹرک ہمارے سامنے سے گزرتے رہے اور پھر اچانک ہی فضا میں اللہ اکبر

کی فضا گونج اُٹھی.....

یہ حملہ کرنے کا سگنل تھا۔ پہاڑوں میں اس آواز کی بازگشت ختم ہونے سے پہلے ہی فضا تڑتڑاہٹ کی آوازوں سے گونج اُٹھی۔ قافلے پر یہ حملہ اگرچہ اچانک ہی ہوا تھا مگر قافلے والے غالباً اس قسم کی صورتحال کے لئے تیار تھے۔ اُدھر سے بھی جوابی کارروائی شروع ہو گئی۔ لیکن بھارتی فوجیوں کے مقابلے میں ہم بہتر پوزیشن میں تھے۔

بھارتی قافلہ شاہراہ پر تھا جس کے دونوں طرف کھلی جگہ تھی۔ جبکہ ہم بڑے بڑے پتھروں اور چٹانوں کے پیچھے پوزیشن لئے ہوئے تھے۔ ہماری کارروائی زیادہ مؤثر ثابت ہو رہی تھی۔ جلد ہی فضا دھماکوں سے گونجنے لگی..... ٹرکوں میں بھرا ہوا گولہ بارود خوفناک دھماکوں سے پھٹنے لگا..... ٹرکوں کے ٹکڑے اور انسانی جسموں کے چیتھڑے فضا میں اُڑ اُڑ کر چاروں طرف پھیلنے لگے..... پیچھے کے چند ٹرک مُڑ کر پیچھے کی طرف دوڑنے لگے۔ ہم نے اُنہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ درّہ زوجی لا کے دوسری طرف مجاہدین کی پارٹی موجود تھی اور ہمیں توقع تھی کہ وہ ان ٹرکوں میں سے کسی کو بھی بچ کر جانے نہیں دیں گے۔

ہمارا یہ معرکہ تین گھنٹوں تک جاری رہا۔ ہم نے بھارتی ٹرکوں کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ ہمارے دو ساتھی شہید ہوئے تھے۔ سگنل ملتے ہی ہمارے مجاہدین آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ دو گھنٹوں میں ہم وہاں سے بہت دُور نکل آئے۔ لیکن پہاڑوں میں دھماکوں کی آوازیں اب بھی گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔

ہم غار میں پہنچ چکے تھے۔ ہم اپنے صرف ایک شہید ساتھی کی لاش اپنے ساتھ لا سکے تھے۔ دوسرے کو ایک راکٹ لگا تھا اور اُس کا جسم ٹکڑے ہو کر بکھر گیا تھا۔ اُسے سمیٹنا ممکن نہیں تھا۔

ہم اپنے شہید ساتھی کی تجہیز و تکفین کی تیاری کر رہے تھے کہ فضا میں پھڑپھڑاہٹ کی آوازیں سنائی دینے لگیں..... اُسی وقت ہمارے دو ساتھی دوڑتے ہوئے غار میں داخل ہوئے۔

''گن شپ ہیلی کاپٹر آ رہے ہیں.....'' ایک نے چیخ کر بتایا۔

تمام مجاہدین کو خبردار کر دیا گیا کہ کوئی بھی غار سے باہر نہ نکلے۔ یہ غار بہت بڑا تھا اور اندر بہت دُور تک چلا گیا تھا۔ سب کو پیچھے بھیج دیا گیا۔

میں کمانڈر عثمان کے ساتھ غار کے دہانے کے قریب پتھروں اور جھاڑیوں میں چھپ کر صورتحال کا جائزہ لینے لگا۔ وہ چار گن شپ ہیلی کاپٹر تھے جو بہت بلندی پر فضا میں مردار خور گدھوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ وہ چاروں طرف گردش کرتے ہوئے غالباً مجاہدین کو تلاش کر رہے تھے جو قافلے کو تباہ کر کے پہاڑوں میں غائب ہو گئے تھے۔

ایک ہیلی کاپٹر دیر تک ہمارے سروں پر منڈلاتا رہا، پھر وہ ہائی وے کے ساتھ ساتھ درّہ زوجی لا کی طرف جانے لگا۔ وہ ہیلی کاپٹر ہم سے اتنا دُور جا چکا تھا کہ ایک چھوٹا سا نکتہ بن کر رہ گیا تھا اور دفعتہً وہ نکتہ شعلہ بن کر فضا میں بکھر گیا.....

''گڈ.....!'' کمانڈر عثمان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ زوجی لا درّے کی طرف وہ گن شپ ہیلی کاپٹر مجاہدین کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد اُس نواح میں باقی تین ہیلی کاپٹر بھی دکھائی دیئے لیکن وہ بہت بلندی پر تھے۔ فضاؤں میں دھماکوں کی ہلکی ہلکی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً وہ تینوں ہیلی کاپٹر اُن پہاڑوں پر بمباری کر رہے تھے۔

ہم شام تک اس قسم کے مناظر دیکھتے رہے۔ سہ پہر کے قریب تو ہائی وے کے آس پاس کئی ہیلی کاپٹر پرواز کرتے ہوئے دکھائی دیئے تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر شاہراہ پر کسی جگہ اُتر گئے تھے۔ لیکن آدھے گھنٹے بعد وہ دوبارہ فضا میں بلند ہو گئے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی فضا میں گن شپ ہیلی کاپٹروں کی پروازیں شروع ہو گئیں۔ یہ ہیلی کاپٹر تعداد میں ایک درجن سے بھی زیادہ تھے۔ اُنہیں مجاہدین کی تلاش تھی۔ کہیں کہیں یہ ہیلی کاپٹر راکٹ اور گولے بھی برسا دیتے لیکن اُن کا یہ گولہ بارود ضائع ہی جا رہا تھا۔ مجاہدین اتنے لاپرواہ نہیں تھے کہ اُن کی نظروں میں آ جاتے۔ یہ سلسلہ شام تک جاری رہا۔ ہم غار کے دہانے کے قریب دبکے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔

اس سے اگلے روز صبح چار بجے کے قریب ٹرانسمیٹر پر ہائی کمان کی طرف سے اطلاع ملی کہ ایک اور فوجی قافلہ سرینگر سے روانہ ہونے والا ہے جو نو بجے کے قریب ہمارے ٹھکانے کے قریب سے گزرے گا۔ اس قافلے کو فضائی تحفظ فراہم کرنے کے لئے چار گن شپ ہیلی کاپٹر بھی فضا میں پرواز کرتے رہیں گے۔

ہائی کمان سے یہ اطلاع ملتے ہی ہم غار سے نکل کر شاہراہ کے قریب اپنے مورچوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ ہم نے جگہ بدل لی تھی اور دراس کی طرف کچھ آگے نکل گئے تھے۔ ہیلی کاپٹروں کی موجودگی میں قافلے پر حملہ کرنا اگرچہ انتہائی خطرناک تھا لیکن خطرے کی پرواہ کسے تھی؟ ہم تو جان ہتھیلی پر لئے پھر رہے تھے۔ ہم اپنے وطن کی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے۔ ہمارے سامنے ایک ہی مقصد تھا، غاصبوں سے وطن کی آزادی.....

صبح ہونے سے پہلے پہلے ہم نے ایسی جگہوں پر مورچے بنا لئے کہ فوری طور پر ہیلی کاپٹروں کی نظروں میں بھی نہ آ سکیں۔

صبح ساڑھے آٹھ بجے کے قریب دو ہیلی کاپٹر شاہراہ کے اُوپر بہت بلندی پر پرواز کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ مجاہدین کو حکم دے دیا گیا تھا کہ جب تک پارٹی کے کمانڈر کی طرف سے حکم نہ ملے گولی نہ چلائی جائے۔

بہت آگے جانے کے بعد وہ دونوں ہیلی کاپٹر واپس پلٹ آئے۔ اس مرتبہ ایک ہیلی کاپٹر سڑک کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف تھا۔ تاکہ وہ سڑک کے دونوں طرف آس پاس کی پہاڑیوں کو بھی چیک کر سکیں۔

سوا نو بجے کے قریب قافلے کا پہلا ٹرک نظر آ گیا..... دو ہیلی کاپٹر آگے اور دو ہیلی کاپٹر قافلے کے پیچھے پرواز کر رہے تھے۔ انتہائی خطرناک صورتحال تھی۔ غلط حکمت عملی ہم سب کو موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ فضا میں پرواز کرتے ہوئے گن شپ ہیلی کاپٹرز پر نہ صرف ہیوی مشین گنیں نصب تھیں بلکہ راکٹ اور گولے بھی برسائے جا سکتے تھے۔ لیکن ہم پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے۔

اُس وقت میں کمانڈر عثمان کے ساتھ ہی تھا۔ اُس نے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے جو مشورہ دیا قریب بیٹھے ہوئے ایک اور مجاہد نے بھی اس کی تائید کر دی۔ اور پھر ٹرکوں کا وہ قافلہ جیسے ہی ہمارے سامنے پہنچا کمانڈر عثمان نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور حملہ شروع ہو گیا.....

آگے والے دونوں ہیلی کاپٹر کافی آگے نکل چکے تھے۔ دھماکوں کی آواز سنتے ہی وہ چکر کاٹتے ہوئے پلٹے اور ہم پر مشین گنوں کی بارش ہونے لگی..... لیکن ہم لوگوں نے اپنے مورچے نہیں چھوڑے۔ قافلے کی طرف سے بھی ہم پر ہیوی مشین گنوں سے زبردست فائرنگ کی جا رہی تھی۔ گولیاں ہمارے آس پاس پتھروں اور چٹانوں میں لگ رہی تھیں۔

میری پوری زندگی بھارتی بھیڑیوں کے خلاف ایسے ہی معرکوں میں گزری تھی۔ لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ایسا زبردست معرکہ اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ ہمارے سامنے سے بھی گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور اُوپر سے بھی شعلے برسائے جا رہے تھے۔ لیکن ہمارا کوئی بھی ساتھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا تھا۔

ہیلی کاپٹر سے مارا جانے والا ایک راکٹ ہمارے پیچھے چٹان پر لگا۔ کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا..... اُس ہیلی کاپٹر سے ہیوی مشین گن سے گولیاں بھی برسائی جا رہی تھیں۔ ایک گولی مجھ سے کچھ دُور میرے ایک ساتھی کے بازو پر لگی۔ وہ چیخ کر پہلے پیچھے گرا پھر سنبھل کر اُس نے اپنی لائٹ مشین گن اُٹھا لی اور فائرنگ کرتا ہوا کھلی جگہ پر نکل گیا..... اُس کی گن کا رُخ ہیلی کاپٹر کی طرف تھا اور ہیلی کاپٹر بھی اُس وقت ذرا نیچے تھا۔ مجاہد نے ہیلی کاپٹر کو تو نشانہ بنا لیا لیکن ہیلی کاپٹر سے چلائے جانے والے ایک راکٹ نے اُس کے بھی پرخچے اُڑا دیئے..... ہیلی کاپٹر فضا میں لڑکھڑاتا ہوا قافلے کے ایک ٹرک کے اُوپر گرا اور خوفناک دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

ڈھائی گھنٹوں کے اس معرکے میں ہماری پارٹی کے تین مجاہد شہید اور چھ زخمی ہوئے تھے۔ یقیناً مجاہدین کی دوسری پارٹیوں میں بھی اسی طرح کے جانی نقصان ہوئے ہوں گے۔

قافلہ تباہ ہو چکا تھا۔ مجاہدین کو واپسی کا حکم دے دیا گیا۔ قافلے کے علاوہ ہم نے دو ہیلی کاپٹر بھی تباہ کئے تھے۔ باقی دو ہیلی کاپٹر فضا میں گردش کرتے ہوئے پہاڑوں میں بکھرے ہوئے مجاہدین پر گولیاں اور راکٹ برساتے رہے۔

ہم اپنے زخمی مجاہدین کو لے کر وہاں سے میلوں دُور اپنے ایک اور ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ کچھ اور ہیلی کاپٹر بھی فضا میں نمودار ہوئے تھے جو شام کا اندھیرا پھیلنے تک پہاڑوں پر پرواز کرتے

رہے۔ وقفے وقفے سے دھماکوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں۔

میں غار کے اندر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میرے آس پاس بیٹھے ہوئے ساتھی آج کی صورتحال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی کے پاس ریڈیو ٹرانسسٹر بھی تھا اُس نے خبریں سننے کے لئے ریڈیو آن کر دیا۔

خبروں میں اپنا نام سن کر میں اُچھل پڑا..... دوسرے ساتھی بھی قریب آ گئے۔ وہ خبر زیادہ تفصیلی نہیں تھی لیکن اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے اور پورے بدن میں سنسنی کی لہریں سی دوڑنے لگیں۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا آزاد کشمیر ریڈیو پر نشر ہونے والی وہ خبر سنتا رہا.....!

نیوز کاسٹر کا ایک ایک لفظ میرے دل و دماغ پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہا تھا..... اس خبر کے مطابق بعض نامعلوم دہشت گردوں نے ایک دینی مدرسے پر حملہ کر کے آٹھ افراد کو ہلاک کر دیا تھا جن میں مدرسے کے مہتمم کے گھر کی دو خواتین کے علاوہ کلپنا نام کی وہ ہندو لڑکی بھی شامل تھی جو کچھ عرصہ پہلے کشمیر کے نامور مجاہد شمروز کے ساتھ ہندوستان سے آئی تھی۔ کراچی پولیس کے مطابق مدرسے پر یہ حملہ ''را'' کے ایجنٹوں نے کیا تھا۔ کیونکہ اُنہیں یہاں شمروز کی موجودگی کا شبہ تھا۔ لیکن شمروز چند روز پہلے یہاں سے جا چکا تھا تاہم اُس کی راجستھان سے آنے والی ہندو دوست یہاں موجود تھی جو دہشت گردوں کے اس حملے میں جاں بحق ہو گئی۔

ریڈیو بند کر دیا گیا۔ غار میں موجود تمام مجاہدین میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھ سے اظہار ہمدردی کرنے لگے۔

اُس رات میں ایک لمحے کو بھی نہیں سو سکا تھا۔ کلپنا کا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے گھوم جاتا۔ کتنی معصوم تھی وہ..... وہ میرے ساتھ زندگی بتانا چاہتی تھی اور میری خاطر اپنی زندگی ہار گئی.....!

وقت گزرتا رہا..... میرے دل پر کئی زخم تھے جن میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔

بھارتی فوجیوں کے خلاف ہماری کارروائیاں جاری رہیں۔ پندرہ دنوں تک ہم نے درّہ زوجی لا اور دراس کے درمیان کارگل کی طرف جانے والی شاہراہ کی ناکہ بندی جاری رکھی۔ ہمارے کئی ساتھی شہید اور زخمی ہو چکے تھے لیکن ہم نے بھارتی فوج کی ایک گاڑی کو بھی آگے نہیں جانے دیا۔ ہم نے اُس شاہراہ کو بھارتی فوجی قافلوں کا قبرستان بنا دیا تھا۔

کارگل کے محاذ پر بھی گھمسان کی جنگ جاری تھی۔ ٹائیگر ہل پر پاکستانی فوج کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ بھارتی فوج زبردست ہزیمت اُٹھا رہی تھی۔ اور پھر اچانک ہی وہ خبریں آنے لگیں جنہوں نے مجھے ہی نہیں تمام مجاہدین کو بھی دہلا کر رکھ دیا.....

اب تک کی اطلاعات کے مطابق کارگل کے محاذ پر ہمارے مجاہدین اور پاکستانی فوج کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ بھارتی فوج پر دونوں طرف سے دباؤ تھا۔ وہ چکی کے دو پاٹوں کے بیچ

میں پس رہے تھے۔ اپنے مورچے چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے۔ اُنہیں کسی کمک اور رسد کی توقع نہیں تھی۔ یہاں سے ہم نے اُن کی سپلائی لائن مکمل طور پر کاٹ دی تھی۔ لیکن پھر اچانک یہ خبر آئی کہ پاکستانی فوج ٹائیگر ہل سے واپس جا رہی ہے۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر بھارت کی بکھری ہوئی فوج نے متحد ہو کر ٹائیگر ہل پر بھرپور حملہ کر دیا۔ پسپا ہوتی ہوئی پاکستانی فوج کو زبردست نقصان اُٹھانا پڑا.....

صورتحال بدل گئی تھی۔ کارگل کے محاذ پر مجاہدین کو بھی زبردست نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ وہ بھی مورچے چھوڑ کر منتشر ہو رہے تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا تھا..... شاندار فتح شکست میں کیسے بدل گئی تھی؟ ہم نے زوجی لا اور دراس کے مقامات پر شاہراہ کی ناکہ بندی کر کے بھارتی فوج کی سپلائی لائن کو مکمل طور پر کاٹ دیا تھا۔ یہ صورتحال ایسی تھی کہ اگلے چند روز میں بھارت کو پورے کشمیر میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ لیکن..... یہاں وہ کچھ ہو گیا تھا جو میری تو کیا کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کارگل میں ہمارے مجاہدین کو بھی زبردست جانی نقصان اُٹھانا پڑا اور یہاں بھی مجاہدین بھی شدید بددلی پھیل گئی تھی۔

اُس روز دراز کے قریب شاہراہ پر ایک اور فوجی قافلے پر حملہ کرتے ہوئے مجاہدین میں وہ جوش و خروش نہیں تھا۔ قافلے کے فوجیوں نے بھی زبردست جوابی کارروائی کی اور تقریباً ایک درجن گن شپ ہیلی کاپٹر بھی ہم پر آگ برساتے رہے۔

یہ محاذ بھی ہمارے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ ہمارے کئی مجاہدین شہید ہو چکے تھے اور کئی زخمی ہوئی تھے۔ کمانڈر عثمان نے پسپائی کا حکم دے دیا..... میں نے بھی اپنا مورچہ چھوڑ دیا۔ ہمارے سروں پر پرواز کرتا ہوا ہیلی کاپٹر ہیوی مشین گن سے ہم پر گولیوں کی بارش کر رہا تھا۔ میرا ایک ساتھی چھلنی ہو کر گرا۔ میں نے چھلانگ لگا کر ایک بڑے پتھر کے پیچھے پناہ لے لی۔ ہیلی کاپٹر کچھ آگے نکل گیا تھا۔

میں نے اپنے شہید ساتھی کی طرف دیکھا، اُس کے پاس لائٹ مشین گن تھی جو اُس کے قریب ہی پڑی تھی۔ گن میں بیلٹ بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے دوڑ کر لائٹ مشین گن اُٹھا لی اور پتھر کے پیچھے دبک گیا۔

ہیلی کاپٹر واپس آ رہا تھا..... اس وقت وہ بہت نیچے تھا۔ شاید پائلٹ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو گیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ہم نے مورچے چھوڑ دیئے ہیں تو ہمارے حوصلے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے ہوں گے۔

ہیلی کاپٹر بہت نیچے آ گیا..... اُس کا پائلٹ اب مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں لگی ہوئی گن مسلسل گولیاں برسا رہی تھی۔ میں اچانک ہی لائٹ مشین گن سنبھالے پتھر کی آڑ سے

نکلا اور ڈرائیگر دبا دیا.....

میری یہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ کم از کم دو گولیاں کاک پٹ کا شیشہ توڑتی ہوئی پائلٹ کو لگیں۔ ایک پہلو میں اور دوسری گردن پر..... پائلٹ اپنی سیٹ پر اوندھا ہو گیا اور ہیلی کاپٹر کٹی ہوئی پتنگ کی طرح فضا میں لہرانے لگا..... اور ٹھیک اُسی لمحے ہیلی کاپٹر کی مشین گن کا رُخ میری طرف ہو گیا.....

مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کے مختلف حصوں میں انگارے بھر گئے ہوں..... میں چیخ کر لہراتا ہوا گرا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک اور زوردار دھماکے کی آواز سنی۔

میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی..... اور پھر میں نے ایک آدمی کو اپنے اُوپر جھکتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ کمانڈر عثمان تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا.....!!

○

اس واقعے کو چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ اور شاید وہ میری زندگی کا آخری معرکہ تھا.....

میں آزاد کشمیر کے ایک ہسپتال میں مفلوج پڑا ہوں..... مجھے نہیں معلوم کہ میرے مجاہد ساتھی مجھے یہاں تک کس طرح لائے تھے؟ لیکن اُنہوں نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ اپنی زندگیاں، خطرے میں ڈال کر میری زندگی بچانے کے لئے مجھے یہاں تک لے آئے۔ میری زندگی تو بچ گئی لیکن میں اس قابل نہیں رہا کہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکوں..... میری دائیں ٹانگ اور بایاں بازو کندھے کے قریب سے کاٹ دیا گیا ہے..... میرے دائیں ہاتھ پر بھی گولی لگی تھی لیکن وہ زخم اتنا خطرناک نہیں تھا کہ وہ ہاتھ بھی کاٹنا پڑتا۔ میرا یہ ہاتھ بھی خاصا کمزور ہو گیا ہے اس میں اتنی سکت نہیں کہ رائفل اُٹھا سکوں۔ لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ اب بھی پُرعزم ہوں اور اُس وقت کا انتظار کر رہا ہوں کہ رائفل اُٹھا کر دشمن کے سینے چھلنی کر سکوں۔

میں آزاد کشمیر کے اس شہر یا ہسپتال کا نام نہیں بتاؤں گا جہاں میں زیرِ علاج ہوں۔ میرے صرف چند ہی مجاہد دوست جانتے ہیں کہ میں کہاں ہوں۔ وہ لوگ وقتاً فوقتاً میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ اُن کی باتوں سے مجھے بڑا حوصلہ ملتا ہے۔

کمانڈر عثمان ہی کے کہنے پر میں نے اپنی یہ سرگزشت لکھنی شروع کی تھی جو کسی نہ کسی رسالے یا اخبار کے توسط سے آپ تک پہنچے گی۔ اس خودنوشت کا اہم مقصد عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرنا بھی ہے۔ میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن اس خودنوشت کے اختتام پر میں بڑی طاقتوں سے یہ سوال ضرور کروں گا کہ کیا اپنا حق مانگنے والی قومیں اسی طرح ظلم و بربریت کا شکار ہوتی رہیں گی؟ کیا کشمیر، بوسنیا اور چیچنیا کے مظلوم عوام اسی طرح استحصال کی چکی میں پستے رہیں گے.....؟

آخر میں اپنے پڑھنے والوں سے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ وہ بارگاہِ ایزدی میں ہاتھ